کلیاتِ
ملّا رموزی

(جلد سوم)

مرتب

خالد محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ ملّا رموزی

(جلد سوم)

مرتب

خالد محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

کلیات مُلّا رموزی

(جلد سوم)

مرتب

خالد محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پیش لفظ

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو طنزیات و مضحکات کا سرمایہ جن چراغوں سے منور ہے، ملا رموزی ان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا طرز خاص ''گلابی اردو'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے قدیم مذہبی اور فقہی کتب کے طرز بیان میں اپنے عہد کے حساس موضوعات اور مسائل کی ناہمواریوں کو نشانہ بنایا۔ اردو ادب میں طنز اور مزاح کو عموماً ایک اسلوب یا کم از کم لازم و ملزوم خیال کیا جاتا ہے جبکہ ناقدین ادب نے دونوں کی نفسیات کو جداگانہ طور پر خود مکتفی اساس کا حامل بتایا ہے۔

ملا رموزی کی طنزیات و مضحکات کو اپنے عہد میں بہت سراہا گیا۔ عہد اور اس کے بعد بھی ان کے رنگ تحریر کی تقلید کی گئی اور اسے ایک کامیاب مزاحیہ حربے کی حیثیت حاصل رہی۔ عوامی ادب (Popular Literature) کی فراہمی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اشاعتی پالیسی کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ ملا رموزی کی کلیات کی یہ پیش کش کونسل کے اسی اشاعتی پروگرام کا حصہ ہے۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ بھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں شائع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر

علم وادب کے شائقین تک پہنچاتا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول، اس ہر دلعزیز زبان میں معیاری کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

پروفیسر خالد محمود دنیائے ادب میں نمایاں نام رکھتے ہیں۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خود طنز و مزاح کے تخلیق کار ہیں اور اس فن کے ابعاد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ ملا رموزی پر ان کا یہ کام ملا رموزی کی شش پہلو شخصیت اور ان کے فکاہی کارناموں کی تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا، طنزیات و مضحکات سے متعلق عمومی طور پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح 'کلیات ملا رموزی' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

ترتیب

◆ مقدمہ — خالد محمود VII
◆ صبحِ لطافت 1
◆ لاٹھی اور بھینس 159
◆ شفاخانہ 243
◆ مضامینِ رموزی 351
◆ شرح کلام اکبر الٰہ آبادی 467
مشاہیرِ بھوپال 513
خطوطِ رموزی 579

مقدمہ

بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو کا قصرِ ادب جن چراغوں سے منور تھا ان میں طنز ومزاح کی ایک طرز خاص ''گلابی اردو'' کے موجد اور خاتم ملا رموزی کا نام نامی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ملا رموزی اپنے عہد کے کثیر الجہات اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ یوں تو انھوں نے ادب کے مختلف اسالیب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں مگر ان کا اصل میدان طنز ومزاح تھا۔

اردو ادب میں طنز اور مزاح دونوں کو عموماً ایک ہی اسلوب یا کم از کم لازم وملزوم خیال کیا جاتا ہے حالانکہ ایسا ہے نہیں۔ طنز اور مزاح اپنا الگ الگ مستقل اور مستحکم وجود رکھتے ہیں اور ان کی الگ الگ پہچان بھی ہے۔ ناقدین ادب نے دونوں کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تعریف وتوضیح کی ہے۔

مزاح کا بنیادی تعلق ہنسی یا خندہ یا ہنسنے ہنسانے سے ہے۔ ایک ماہر نفسیات کی رائے میں ''ہنسی عدم تکمیلیت اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان اس وقت ہنستا ہے جب اس کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہو۔'' ایک اور ماہر نفسیات کے مطابق ''ہم ایسی باتوں پر ہنستے ہیں جو ہمارے یقین سے بالاتر ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں پر بے اختیار ہنس دیتے ہیں جو عقل سے بہت دور نظر آتی ہیں۔'' ان کے علاوہ بھی ہنسی کے کئی عوامل ہیں مثلاً میکانکی

نظامِ حیات اور یکسانیت کے خلاف ردِعمل، پریشانیوں سے وقتی نجات کی خواہش، نفسی توانائی کی حفاظت اور کفالت اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے درد کا شعوری احساس وغیرہ۔ یہی عوامل مزاح تخلیق کرتے ہیں اور یہی وہ مزاح ہے جو پژمردہ، فسردہ اور بے رنگ و نور زندگی میں رنگ و نور لاتا ہے۔ مسرت و شادمانی فراہم کرتا ہے اور خوش دلی کو فروغ دیتا ہے اسی لیے مولانا الطاف حسین حالی نے اسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا قرار دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ اور حکما بلکہ اولیا اور انبیا نے بھی کیا ہے اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہو جاتا ہے۔''

یہ ایک مہذب انسان کے لطیف و شائستہ مزاح کی جامع اور بلیغ تعریف ہے اس مزاح میں طنز، تشنیع، تلخی، ترشی، تمسخر، لعنت، ملامت، دل شکنی، حقارت، فحاشی، عریانیت یا کسی کی دلآزاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا اسی لطیف و شائستہ مزاح کو حالی نے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور خوشبو کی لپٹ سے تعبیر کیا ہے۔

طنز کا معاملہ مختلف ہے۔ ادب میں طنز کے لیے کئی اصطلاحیں مستعمل ہیں مثلاً ہجو، تعریض، تنقیص، لعن طعن، استہزا، تمسخر، مضحکہ وغیرہ۔ اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے مطابق ان تمام اصطلاحات میں صرف طنز ہی وہ لفظ ہے جو بڑی حد تک انگریزی کے لفظ Satire کی ترجمانی کرتا ہے اس لیے اردو میں اسی اصطلاح کا چلن ہے۔ طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہے جس کا مقصد اصلاح اور تنقیدِ حیات ہے۔ اسی خیال سے طنز کے لیے مقصدیت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اگر طنز میں اصلاح کا پہلو نہ ہو تو یہ محض ہجو یا تنقیص بن کر رہ جاتا ہے۔

جب ہم طنز و مزاح دونوں کو یکجا کر کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں بیشتر طنز نگاروں نے پرانے حکیموں کی طرح طنز کی کڑوی کسیلی دوائیں مزاح کی مٹھائی میں لپیٹ کر کھلانے

کی کوشش کی ہے تاکہ منہ کا ذائقہ بھی نہ بگڑے اور علاج بھی ہو جائے اسی لیے اردو میں خالص طنز اور خالص مزاح کی بہ نسبت طنز و مزاح کے مشترک نمونوں کی مقدار زیادہ ہے۔

ہمارے عہد کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرز نگارش کا معنی خیز تجزیہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''وار ذرا اوچھا پڑے اور بس ایک آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ مزاح''

طنز و مزاح نگار کے بارے میں ان کی رائے ہے:

''ایک اچھا طنز نگار تنے ہوئے رسّے پہ کرتب نہیں دکھاتا بلکہ تلواروں پر رقص کرتا ہے اور مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اور اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔''

طنز و مزاح کے انھیں خوش گوار و خوش اطوار اوصاف کو اردو کے جن ادیبوں نے اعتبار بخشا ہے ان میں بہ اعتبار شہرت و مقبولیت ریاست بھوپال کے مشہور طنز و مزاح نگار، کالم نویس، خاکہ نگار، ادیب و شاعر ملا رموزی منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ملا رموزی کا وطن بھوپال ہے جو اپنے محل وقوع اور تاریخی عوامل کی وجہ سے وسط ہند کی چھوٹی مگر اہم ریاست تھی۔ اس کی سرسبز و شاداب پہاڑیاں، وسیع جھیلیں، صاف شفاف سڑکیں، خوشنما اور کثیر مساجد، جن میں ایک مسجد موسوم بہ ''تاج المساجد'' ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد خیال کی جاتی ہے۔ اور بھوپال کا ایک تالاب بھی ہندستان میں وسیع تر ہونے کا دعوے دار ہے۔ ان تمام دلکش و دلفریب مناظر کے درمیان بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب، اتحاد و یکجہتی کی فضا، حسن مزاح، تواضع، رواداری، علم پروری اردو زبان و ادب سے قلبی لگاؤ اور مخصوص لب و لہجہ بھوپال کی پہچان کے خاص وسیلے ہیں۔

بھوپال میں اردو شعر و ادب کا آغاز اٹھارھویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ابھی خود دلّی میں فارسی کا بول بالا تھا اور وہاں اردو شاعری محض تفنن طبع کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔

ادبیات بھوپال کے پہلے محقق ڈاکٹر سلیم حامد رضوی بھوپال میں اردو کے آغاز و ارتقا کا

جائزہ لیتے ہوئے اپنی معروف کتاب ''اردوادب کی تاریخ میں بھوپال کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ سمجھنا کہ بھوپال میں اردوادب کا آغاز ریاست بن جانے کے بعد حکومت کی سرپرستی کی بدولت ہوا درست نہیں ہے۔ عام بول چال کی زبان بعض مخصوص رجحانات اور تقاضوں کی بدولت خود بخود ادب کے زینے طے کرنے لگتی ہے یہاں بھی انھیں تقاضوں کی بدولت سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہی اردو نے ادبی منزلیں طے کرنا شروع کردی تھیں۔ نظم کے جو قدیم نمونے مجھے ملے ہیں انھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان علاقوں میں یہ مخلوط زبان دہلی سے تقریباً پچاس سال قبل اپنے مخصوص معاملات کے لحاظ سے شعروشاعری کے میدان میں قدم رکھ چکی تھی۔ دہلی میں اردو میں شعر کہنے کا رجحان اگرچہ محمد شاہ کے عہد میں بھی پیدا ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ آغاز اٹھارھویں صدی کے ربع اول کے خاتمے پر ہوا بلکہ عام خیال کے مطابق یہ کہنا بھی درست ہے کہ اپنی عام بول چال کی زبان کی ادبیت اور شعری صلاحیتوں کا اندازہ اہل دہلی کو اس وقت ہوا جب ولی اورنگ آبادی نے 1700 کے لگ بھگ دہلی آکر اپنا کلام سنایا جو دکنی اردو میں تھا لیکن ولی کا کلام سن کر بھی شعرائے فارسی نے عام طور پر اردو میں شعر گوئی کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں کی۔ 1722 میں جب ولی دکنی کا دیوان دلّی آیا تب وہاں اردو شاعری کی طرف توجہ کی گئی اس طرح دلّی میں اردو شاعری کا آغاز 1722 کے بعد ہوا جبکہ ریاست بھوپال کے علاقوں میں ہم کو اردو شاعری کے وہ نمونے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہی مل جاتے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تقریباً نصف صدی کے ارتقا کا نتیجہ ہیں اور یہاں کی شاعری ولی اورنگ آبادی کی تحریک شعری کی مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ مقامی حالات اور تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔''

تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ دہلی کی شاعری پر فارسی کے غلبے کی وجہ سے اہل دہلی اردو زبان کو شاعری کے قابل نہیں سمجھتے تھے جبکہ دکن، گجرات اور ہندستان کے بعض دوسرے صوبوں میں جن میں بھوپال بھی شامل ہے اردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا، ڈاکٹر مسعود حسین خاں

''اردو زبان وادب'' میں لکھتے ہیں:

> ''سیاسی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسرو کی زبان دہلوی نے گجرات، دکن اور ہندستان کے دوسرے صوبوں میں ادبی حیثیت اختیار کر لی تھی البتہ خود دہلی میں فارسیت کے غلبے کی وجہ سے اسے ادبی حیثیت اختیار کرنے اور فارسی کی جگہ لینے میں دیر لگی۔''

بھوپال میں اردو شاعری کا اوّلین دور جو اٹھارہویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوتا ہے اس میں بیرسیہ کے قاضی محمد صالح اٹیٹھوی کی مثنوی ''اخلاق حسنہ'' کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ مثنوی زائد از تین سو سال قبل یعنی 1707 میں تخلیق ہوئی اور لطف یہ ہے کہ اتنی قدیم ہونے کے باوجود اس کی زبان حیرت انگیز طور پر صاف وسادہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے دھوکا یہ دنیا کا سب کاروبار	نہیں اس میں کچھ بھی ثبات وقرار
ہے کچھ آج اور کل تماشا ہے کچھ	کہوں کیا کہ اس کا سراپا ہے کچھ
طریقہ عجب اس کا دیکھا یہاں	کہ اس میں گرفتار ہے گا جہاں
نہ آسودہ اس میں ہوا ہے کوئی	گرفتار خواری رہا ہے کوئی

اس دور کے دوسرے شعرا میں مفتی خیراللہ صدیقی، سید اصغر علی اصغر، شیخ امان اللہ حسینی، سید مقصود عالم دیدار، عنایت اللہ نادان، مولوی نظام الدین، شیخ رحمت علی مجرم، امیر علی امیر گوالیاری اور بدیع الدین خورد وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور میں غزلوں سے زیادہ مثنویاں لکھی گئیں جو اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہیں اور جن کے توسط سے اٹھارہویں صدی میں بھوپال کی ادبی ترقی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس کے بعد نواب قدسیہ بیگم، نواب جہانگیر محمد خاں اور نواب سکندر جہاں کا عہد آتا ہے اس عہد کے مزاج میں رنگارنگی اور تنوع ہے جس کے تحت تصوف، تعشق اور سوز وگداز کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی اور چٹخارے کی زبان کا لطف بھی موجود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نواب جہانگیر محمد خاں جو ریاست بھوپال کے آٹھویں فرماں روا اور نواب سکندر بیگم کے شوہر تھے خود بھی شاعر تھے دولہ تخلص تھا اور لکھنوی انداز میں شعر کہتے تھے اس دور کے شعرا میں شیخ عبدالواحد خاں مسکین تلمیذ جرأت، شاہ رؤف احمد رافت، قدرت اللہ قدرت بناری، منشی غلام ضامن کرم، منشی جگل کشور سیراب،

سید یوسف علی یوسف، منشی عبدالعلی تونگر، شاہ فرید الدین، سید مولوی امداد علی امداد خیر آبادی، مولوی یمین الدین احمد، حکیم اخگر علی اخگر فرخ آبادی اور عبدالحمید خاں عاجز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست بھوپال کی ادبی سرگرمیوں کا اگلا دور نواب شاہ جہاں بیگم کا زمانہ ہے عُلیا حضرت خود بھی شعر کہتی تھیں، شیریں اور تاجور تخلص تھے۔ ان کے ذوق شعری کے بارے میں مولانا سید امجد علی اشہری تقریظ "مُخانہ جادید" میں رقم طراز ہیں:

"حضور ممدوحہ کی بدولت نہ صرف بھوپال میں شعروشاعری کا چرچا عام ہوا بلکہ محل خاص پر اکثر مشاعرے کی محفلیں منعقد کرتی تھیں جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں شرفا کی بیویاں شریک ہوا کرتی تھیں۔ ان میں بعض اعلیٰ درجے کی شاعرات تھیں۔ بھوپال کی عورتوں میں شعروشاعری کی اشاعت حضور ممدوحہ کی بدولت عام ہوئی۔"

نواب شاہجہاں بیگم کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں "دیوان شیریں" اور "تاج الکلام" ایک طویل مثنوی "صدق البیان" بھی مطبوعہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

پاس بیٹھے ہیں عدو دور کھڑے ہیں عاشق
یہی شاید تری محفل کا قرینہ ہوگا

واہ واہ کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہوا
دل ہمارا لے لیا اک عمر کا پالا ہوا

عُلیہ حضرت کے ذوق شعری سے حوصلہ پا کر اس عہد کی جن خواتین نے شعر گوئی میں حصہ لیا ان میں ایک اہم نام حسن آرا بیگم نمکین کا ہے جو نواب یار محمد شوکت کی اہلیہ تھیں اور مکہ والی بی بی کے نام سے مشہور تھیں۔ دیگر شاعرات میں منور جہاں بیگم مسرت کلثوم بی بی ممتاز، سکندر بیگم ضیا، سلطان جہاں بیگم حیا اور آمنہ بیگم کے نام خاص ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں عربی اور فارسی کے تبحر عالم اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے توفیق تخلص تھا۔ شاعری تو روایتی انداز کی ہے مگر عالمانہ شان اور قدرت زبان وبیان کا پتہ دیتی ہے۔ دو شعر پیش ہیں:

فلک کی خیر ہو یارب کہ اس ستم گر نے　　نگاہ گرم سے پھر سوئے آسماں دیکھا

لیا ہے رعد نے انداز میرے نالے کا　　اڑائی برق نے آہ شرر فشاں کی طرح

ان کا دیوان ''گل رعنا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ اس دور میں صابر علی صبا سہسوانی شاگرد غالب منشی ارشاد احمد میکش ایک اور شاگرد غالب خان محمد شہیر، بھوپال میں شاعر گر کے نام سے شہرت پانے والے مولوی محمد احسن بلگرامی سید امجد علی اشہری، سلیم سندیلوی، نواب صدیق حسن خاں کے بڑے صاحبزادے سید نورالحسن خاں کلیم اور چھوٹے بیٹے سید علی حسن خاں سلیم، ذوق کے شاگرد صفدر علی ہاشمی، تاریخ گوئی کے ماہر فدا علی فارغ مرادآبادی جیسے اہم نام شامل ہیں۔یہ وہ حضرات تھے جو دربار سے وابستہ رہے اور جو دربار سے وابستہ نہیں تھے ان میں نیاز خیرآبادی، قمر سندیلوی، بزم اکبرآبادی، امیر مینائی کے شاگرد عبدالکریم خاں برہم، غالب کے شاگرد جوہر شاہجہاں پوری غالب کے ایک اور مشہور شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت، محمد عباس رفعت شیروانی راسخ رام پوری جیسے اساتذۂ فن بھی موجود تھے۔سراج میر خاں سحر کا نام نامی بھی اسی عہد کے شعرا میں شامل ہے جن کی ایک غزل نے دنیائے شعر وادب میں دھوم مچادی تھی آج بھی اہل اللہ کی مجالس ہوں یا عشاق کی محافل یہ غزل ہر دل کی صدا بنتی ہے:

سینے میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز وساز عشق

پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا راز عشق

اس دور میں قصیدہ گوئی کا بھی بول بالا رہا، مولوی حکیم سید اعظم حسین سلیم سندیلوی نے اچھے قصیدے لکھے۔قصیدے کے علاوہ وہ مزاح کا شوق بھی رکھتے تھے اور اس رنگ میں اکبرآبادی کا تتبع کرتے تھے۔

عہد شاہجہانی کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کا دور آتا ہے اس عہد کے شعر وادب پر مغربی اثرات رونما ہونا شروع ہوتے ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم روشن خیال اور سرسید کی ہم نوا تھیں انھوں نے ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی کوششوں کا خیر مقدم کیا۔بیگم صاحبہ کے اصلاحی مزاج سے حوصلہ پاکر بھوپال میں شعر وادب کی روش یکسر تبدیل ہوگئی۔اب شاعری میں تصنع اور تکلف کی جگہ سادگی اور حقیقت بیانی کا رجحان تقویت پانے لگا اور وصل وہجر کی جگہ فلسفیانہ خیالات

کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے شعرا میں عیش بھوپالی، انور بھوپالی، عبدالواسع صفا، عبدالشکور اخلاص، نکہت سہسوانی، سید محمد میاں شہید، ذکی وارثی، پیرزادہ محمد اسمٰعیل رخشاں، قدسی بھوپالی، سید حامد حسین ترمذی، نیر بھوپالی، صفدر مرزاپوری، شریف محمد خاں فکری، عبدالجلیل مائل نقوی جیسے شاعر موجود تھے۔ اس دور میں اصلاحی رجحانات کو فروغ دینے والوں میں کچھ نئے تعلیم یافتہ اور علم دوست شعرا بھی شامل تھے۔ سید محمد یوسف قیصر، رشید احمد ارشد تھانوی، علامہ محمد حسین محوی صدیقی، مولوی محمد اسحاق ماہر، ذکا صدیقی، سعیداللہ خاں بیزی، ''مطالب الغالب'' کے مصنف ممتاز احمد سہا مجددی، محمود اعظم فہمی بھوپالی، رمزی ترمذی، منشی لکھمی نرائن افسر، منشی جنگل کشور مہر، گوبند پرشاد آفتاب اسی قبیل کے بزرگ تھے۔ بھوپال میں نئی شاعری کو فروغ دینے اور نئے خیالات کو پھیلانے میں جن شعرا کا سب سے بڑا ہاتھ ہے ان میں سید محمد یوسف قیصر بھوپالی اور احمد علی شوق کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ انھوں نے شہر غزل بھوپال میں غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھیں۔ نظم طباطبائی اور اسمٰعیل میرٹھی کے انداز میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی کیے۔ بھوپال کے دو مشہور مزاحیہ شاعر قاضی فصیح الدین فُقفُس اور حاجی قمر علی خاں ڈھینڈس اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد نواب حمیداللہ خاں کا عہد شروع ہوتا ہے جس میں ہمارے نرالے طنز و مزاح نگار ملا رموزی جلوہ گر ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت ذکاوت اور ندرت بیان کے ذریعہ پوری اردو دنیا سے خراج تحسین وصول کیا اور چہار جانب بھوپال کا نام روشن کیا۔

بھوپال میں طنز و مزاح کی روایت نئی نہیں تھی ادبی تاریخ سے یہ بات تو ثابت ہے کہ یہاں اردو شعر و شاعری کا چلن ریاست کے قیام یعنی 1722 سے پہلے ہی عام ہو چکا تھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ نوابین اور بیگمات بھوپال کی اردو دوستی اور ادب نوازی کے سبب اس کی ترقی کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے گئے۔ فرماں روایان بھوپال کی علم دوستی اور ادب پروری کے زیر سایہ اردو زبان و ادب کو پھلنے پھولنے کے بہترین مواقع میسر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں سے مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے ہر طبقے کے لوگ یہاں خود بھی آئے اور بلائے بھی گئے۔ دلّی اور لکھنؤ کی محفلیں اجڑنے کے بعد ان مراکز اور ان کے اطراف و جوانب سے بہت سے ادیبوں،

شاعروں، عالموں اور فاضلوں نے بھوپال کا رخ کیا۔ آزادی سے قبل ایک دور ایسا بھی آیا کہ تقریباً ہر مسلم دانشور کسی نہ کسی حوالے سے بھوپال میں موجود ہوتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اقبال اور بھوپال کے رشتے سے بھی سب واقف ہیں، ان نابغۂ روزگار ہستیوں کے علاوہ شبلی، عبدالرزاق البرامکہ، ظہیر دہلوی، عبدالرحمٰن بجنوری، سر راس مسعود، اسلم جے راجپوری، سید سلیمان ندوی، مانی جائسی، نیاز فتح پوری، امیر مینائی وغیرہ کے نام بھی علم و ادب کی دنیا میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ تمام لوگ کسی نہ کسی طور پر بھوپال سے وابستہ رہے۔

وسط ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے بھوپال کو یہ سہولت میسر تھی کہ شمالی ہند کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق جنوبی ہند خصوصاً دکن کی مسلم ریاستوں سے بھی قائم رہا اور ان علاقوں کی تہذیب و ثقافت اور ادبی روایت سے بھوپال نے کسب فیض بھی کیا۔ بھوپال کے حکمراں ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ بھوپال کے فطری حسن نے اہالیانِ بھوپال کے مزاج میں زندہ دلی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی کے جوہر پیدا کردیے تھے۔ چنانچہ ہر عہد کے ادب میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ریاست بھوپال کے جن شعرا کے کلام میں طنز و مزاح کے اثرات ملتے ہیں ان میں قاضی فصیح الدین تخلّص اور حاجی قمر علی خاں ڈھینڈس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی حکیم سید اعظم حسین سلیم، قمر الدین قمر سندیلوی چھتر سال چھتر، عبدالعزیز خاں عزیز، حکیم سید معظم حسین خاں فیضی، حکیم احسن قادری احسن وغیرہ کے نام بھی اس فہرست میں شامل ہیں مگر طنز و مزاح کے حوالے سے بھوپال کو جن حضرات نے دنیائے ادب میں روشناس کرایا ان میں ملا رموزی اور تخلص بھوپالی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ تخلص بھوپالی نے غفور میاں اور پاندان والی خالہ جیسے کردار تخلیق کیے اور ان کے ذریعے بھوپالی تہذیب کو متعارف کرایا۔ انھوں نے بھوپال کی زبان اور لب و لہجے سے مزاح پیدا کیا۔ ان کے کردار نہایت جاندار، زندہ اور مکالمے حد درجہ برجستہ ہیں، خالہ اپنے دلچسپ تبصروں سے ہر موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں اور قاری کو ہنسنے ہنسانے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ ملا رموزی ایک بالکل نئی طرز کے موجد اور خاتم تھے۔ اپنی ''گلابی اردو'' کے وسیلے سے وہ ساری ادبی دنیا میں جانے اور مانے جاتے ہیں۔ ان کا انداز منفرد اور کینوس وسیع تر ہے۔ یوں تو انھوں نے اپنے عہد کے مقامی، غیر مقامی، علاقائی، غیر

علاقائی، ملکی، بین المملکتی، قومی، بین الاقوامی، تہذیبی، تمدنی، ادبی، سماجی، تعلیمی اور خانگی ہر موضوع کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا مگران کا اصلی ہدف سیاست اور مغربی تہذیب تھی۔ ان موضوعات پر ان کا قلم بے تکان چلتا ہے ان کے قلم کی دھار تیز ہے مگر انداز میں لطافت ہے اس لیے تکلیف کا احساس ذرا بعد میں ہوتا ہے۔ ان کے لطفِ زبان اور ندرتِ بیان میں ایسا جادو ہے کہ وہ سخت سے سخت بات کہہ گزرتے ہیں مگر قاری ہنستا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی تحریروں میں ایسے غیر ملائم اور غیر فصیح الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا ایسا کرے تو اس کی گرفت کی جا سکتی ہے مگر ملا رموزی کا فن ان تمام الفاظ کو نہ صرف گوارہ بلکہ خوشگوار بنا دیتا ہے اور ایسی لطافت پیدا کر دیتا ہے کہ اپنے سیاق و سباق کے درمیان وہ الفاظ حسین تر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ خود ملا رموزی کو بھی اپنے طرز تحریر کی انفرادیت اور مقبولیت کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ طرز تحریر میرا سب سے پہلا طرز تحریر ہے جس کے ذریعے میں ملک میں روشناس ہوا ہوں اور میرے قدر داں بھائیوں اور بہنوں میں ایسے بے شمار بہن بھائی موجود ہیں جو میرے اس طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ان کے طرز تحریر کو عوام و خواص سبھی نے پسند کیا ہے۔ مشہور طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''طنزیات و مضحکات'' میں ملا رموزی کی ظرافت اور تخیل کی بلند پروازی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ملا صاحب کی تصنیفات بعض حیثیت سے بے مثل ہیں ان کو ایسی ایسی ظرافتیں بھی سوجھ جاتی ہیں جہاں بہ مشکل کسی کی رسائی ہو سکتی ہے جو نہایت درجہ دلکش اور پر لطف ہوتی ہیں اور جہاں تک ہر شخص کا پہنچنا قطعاً آسان نہیں۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''ملا رموزی میں ادبیت کی فراوانی اتنی زیادہ ہے کہ ایک بھی ہم عصر کو حاصل نہیں، دوسری چیز غور و فکر اور خیال کی پرواز اس درجہ بلند اور موزوں ہے کہ ان کی تحقیق اور فکر کا ہر نتیجہ حیرت انگیز اور مخاطب کو ششدر بنا دینے والا ہوا کرتا ہے۔ مثلاً گلابی اردو میں جب وہ خالص موضوعات پر لکھتے تھے تو ان کی بین الاقوامی معلومات اس درجہ مستند اور

بلند ہوتی تھیں کہ اردو کے پختہ کار اخبار نویسوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ سیاسیات میں جو معرکہ خیز نکتے ملا رموزی بیان کر جاتے ہیں دوسرے کے بس کی بات نہیں۔"

پروفیسر عبدالقادر سروری مزید لکھتے ہیں:

"ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف، ظرافت کی خاطر کا اصول مدِ نظر رکھا گیا ہو۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کا استیصال ہے، کسی کے ذریعے ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہیں اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں جو باتیں مصلحین کی زبانوں پر بھی نہیں آتیں وہ ان کے زبان قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی ادرا کی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔"

ملا رموزی کا نام محمد رشاد ہے۔ انھوں نے 21 مئی 1898 کو بھوپال کے ایک معزز متوسط خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ اولاً قرآن پاک حفظ کیا، اس کے بعد مدرسہ سلیمانیہ بھوپال میں ابتدائی تعلیم مکمل کی، پھر کانپور کی معروف درسگاہ دارالعلوم الٰہیات سے "فاضل الٰہیات" کی سند حاصل کی۔ ملا رموزی فطرتاً طباع، ذہین اور بذلہ سنج تھے۔ مطالعے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے علمی ادبی اور مذہبی کتب کے ساتھ معاصر اخبارات و رسائل کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کیا جو ان کی معلومات میں اضافے کا سبب بنا۔ ان دنوں بھوپال میں اچھا علمی اور ادبی ماحول تھا جو ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا آزاد سبحانی اور علامہ محوی صدیقی جیسے مستند اہل قلم کی صحبتوں نے ان کے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔

ملا رموزی نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون "ایک سفریہ" میں عبدالحلیم صدیقی کا تعارف اپنے مخصوص انداز میں کرایا ہے:

"علامہ عبدالحلیم صدیقی نہ صرف ایک جادو بیان مقرر اور ایک تبحر عالم ہیں بلکہ وہ ملا رموزی کے وہی استاد ہیں جن کے فیض علم و فن نے آج ملا رموزی کو حضرت

ملا رموزی صاحب بنادیا ہے۔ ورنہ موصوف کی محنت وتوجہ سے پہلے بھی آج کل کے
ملا رموزی صاحب تھے جو پہلوانوں کے دنگل دیکھتے پھرتے تھے اور کریما و ماسقما
بھی مشکل سے پڑھ سکتے تھے۔ پس اگر وہ علامہ عبدالحلیم صدیقی کے زیر سایہ نہ
آجاتے تو آج کسی نہ کسی شہر میں غنڈا ایکٹ کے تحت دھرے ہوتے اور ضمانت
دینے والے بھی نہ ملتے۔"

ملا رموزی محض طنزیہ اور مزاحیہ شاعر و ادیب ہی نہ تھے ایک سنجیدہ کالم نویس اور صاحب طرز انشاپرداز بھی تھے چنانچہ 1917 میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز کالم نویسی سے ہی ہوا تھا۔ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت غلام ہندستان مختلف سیاسی، سماجی، معاشی مسائل اور اس کے نتیجے میں اخلاقی زوال میں مبتلا تھا۔ انگریزوں کے ظلم وستم نے غریب ہندستانیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے نہایت چالاکی اور چال بازی سے ہندستانیوں کے دلوں میں تفریق کے بیج بو دیے اور ہندستان کی ریاستوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار کر دیا مگر عوام الناس کی اکثریت بلاتفریق مذہب و ملت انگریزوں کے خلاف اپنے دلوں میں نفرت کا جذبہ رکھتی تھی ہر سچا ہندستانی ان غیر ملکی حکمرانوں سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کا خواہش مند تھا اسی مقصد کے تحت مختلف سیاسی اور سماجی تنظیموں نے صدائے احتجاج بلند کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس طرح ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔

ملا رموزی کو خدا نے قلم کی دولت عطا کی تھی وہ حساس اور غیرت مند انسان تھے۔ ان کا دل وطن کی محبت سے سرشار تھا چنانچہ ملک وقوم کی زبوں حالی، نکبت، بے بسی، بے حسی، بے کسی، تہذیبی اور مذہبی اقدار و روایات کی پامالی اور زوال پذیری ان کی برداشت سے باہر ہوگئی تو انھوں نے اصلاح قوم کی خاطر قلم اٹھایا اور پورے جوش وخروش اور جرأت مندی کے ساتھ حق کی آواز بلند کرنے لگے۔ قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے بعض وقت اس کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے زیادہ تیز ہوجاتی ہے۔ اور اس کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔ اگر جذبہ صادق اور نیت میں خلوص ہو تو فنکار کا قلم ملک وملت کے دلوں پر دستک دینے لگتا ہے اور جلد یا بدیر اس کی محنت مستجاب ہوکر رہتی ہے۔ ملا رموزی نے بھی اسی مقصد سے قلم ہاتھ میں لیا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے اسلوب کو عام روش سے ہٹا کر شگفتگی کی

راہ پر لگا دیا تا کہ روتی بسورتی ہوئی مایوس قوم کے چہرے پر مردنی کی جگہ مسرت، خوشی اور خوش طبعی کی جھلک نظر آئے اور اس میں جینے اور ہنسنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

''میرا مقصد تحریر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قوم میں زوال و غلامی، غیر قومی علوم اور غیر قومی تربیت سے جو افلاس انگیز اور موت آور ذہنیت پیدا ہوگئی ہے ملازمت کی لعنت اثر زندگی اور اولاد کی کثرت سے جو مالی تباہی پھیلی پڑی ہے اور اس سے جو بدمزاجی، خستگی اور دماغی پریشانی ہوئی ہے اس کا یہ مولویانہ اثر ملاحظہ ہو کہ ہندستانی لوگ اپنی تفریحی مجالس اور تفریحی تقاریب میں بھی اتنے گاڑھے اور موٹے واللہ چنانچہ بنے رہتے ہیں گویا قہقہہ انھیں دس سال کی سزا دے دی جائے گی اگر وہ تفریحی محفل میں کہیں ہنس پڑے۔ پس چاہتا ہوں کہ رونے والی قوم میرے ذخیرہ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی ہنسی اور خوش طبعی کی امنگ اور مسرت اندوز زندگی کی بہاریں حاصل کرے اور منشی نولکشور کے مولویوں نے جتنی کتابیں قیامت اور دوزخ کے عذابوں سے ڈرانے اور رلانے کے لیے لکھی ہیں ان کے مقابل جنت کی بہاروں کا کوئی تحریری نمونہ بھی موجود رہے۔''

ملا رموزی کے جس طرز تحریر پر لوگ اتنے فدا تھے اور جسے خود ملا صاحب نے ''گلابی اردو'' کے نام سے موسوم کیا اور دعویٰ کیا کہ:

''ملا رموزی نے بھی ''گلابی اردو'' کے نام سے وہ طرز تحریر اختیار کیا کہ اچھے اچھے مر گئے مگر سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہے۔''

بطور نمونہ یہاں ان کی ایک کتاب ''گلابی اردو'' سے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کتاب میں ملا صاحب نے اپنا نام ابوالقدوس حافظ صدیق رشاد توحیدی لکھا ہے جیسا کہ وہ ابتدا میں لکھا کرتے تھے یہ کتاب نقیب پریس بدایوں سے طبع ہوئی تھی۔ سنہ اشاعت 1921 اور قیمت آٹھ آنے ہے۔ پہلا اقتباس بعنوان ''سبب تالیف کتاب'' ہے۔

''امابعد۔ اے وہ ہم ملا رموزی صاحب کہ نہیں لکھتے ہیں ہم سبب تالیف کتاب کا مگر موافق رسم قدیم مصنفوں ہمارے اور تاریک خیال علما ہمارے کے کہ صرف کیں

عمریں تمام اپنی انھوں نے بیچ لکھنے حاشیوں کتابوں عربی کے مگر نہ سکے وہ یہ کہ لکھتے
وہ کچھ اور تحفظ اور خلافت ایجی ٹیشن کے تا کہ ذریعے سے تحریروں اور کتابوں ان کی
کے بیداری بیچ مسلمانوں ہند کے پیدا ہوتی بس البتہ تحقیق ایک دن موافق مادیت
اپنی کہ ہمراہ دوست پرانے اپنے کے بیچ ملک عراق کے گئے ہم واسطے دیکھنے ان
مقامات مقدس کے کہ فوجیں اتحادیوں کی رہتی ہیں بیچ ان کے اور فروخت ہوتی
ہے۔ بیچ ان کے شراب ناگاہ بیچ نظر کے پڑے آنریبل وزیرحسن کہ گئے ہیں وہ بیچ
مقامات مقدس کے واسطے کرنے ملازمت انگریزوں کی کے بس قسم ہے چودہ
اصولوں پریزنٹ ولسن کی کہ جب برابر ہمارے آئے وہ تو جھڑکا ہم نے ان کو اس
طرح کہ اے وہ تم آنریبل وزیرحسن شاگرد شریر ہمارے کہو کہ کیونکر ترک کی تم نے
ملازمت آل انڈیا مسلم لیگ کی شاید کہ ناراض ہوئے تم اس سے کہ مخالفت کی عدم
تعاون کی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے سبب سے لالچ ملازمت حیدرآباد
کے پنشن کردے اللہ ان کی اور مولوی عبداللہ عمادی کی یا گھبرا گئے تم گرفتاریوں سے
علمائے دین اسلام کے بیچ ملک ہندستان کے کیونکہ حکیم لقمان نے بیچ کتاب ''پریس
ایکٹ'' کے لکھا ہے کہ نہیں گرفتار اور ذلیل ہورہے ہیں علمائے دین اسلام کے مگر
ہاتھوں سے ان مسلمانوں کے کہ ملازم ہیں وہ بیچ محکموں خفیہ پولیس اور آبکاری اور
سائر کے طاعون پھیلادے اللہ بیچ خاندانوں ان کے کے اور بیچ فوجوں یونان کے یا
خفا ہوئے تم ان اخباروں اردو سے کہ مخالفت کی انھوں نے تحریک ترک موالات کی
مثل اخبار وطن لاہور اور آزاد کانپور کے۔''

دوسرا اقتباس:

شاہ نادر خاں صاحب کا حادثہ:

''اے عجب وہ گھڑی کہ سنی ہم نے اور بیوی بچوں ہمارے نے خبر حادثہ شاہ نادر خاں
صاحب کی مگر یہ کہ اوپر فقط سماعت اس خبر ہذا کے پھر سوال کیا اور کانپے ہم، اے
لرزے ہم، خوف سے خدا حکمت والے کے، پھر سوال کیا ہم سے بیوی عرف زوجہ

ہماری نے، یہ کہ کیا ہوا اے شوہر میرے، کہ شہادت پائی بادشاہ افغانستان نے اور
گواہی دی ہم نے سامنے زوجہ اپنی کے، اوپر اس بات کے، کہ تحقیق اللہ قادر ہے اوپر
ہر بات کے۔"

تیسرا اقتباس:

"اے سینما میں جھانکنے والو!
نہ چاہیے اور البتہ نہ چاہیے تم کو، یہ کہ جھانکو تم، بیچ سینما کے، طرف پردہ نشین عورتوں
کے کہ تحقیق ہیں وہ عزت تمھاری، اگرچہ بہ سبب جہالت سخت کے، غافل ہیں مسلمان
ترقی اور تعلیم اپنی سے، مگر نہ دیکھا تم نے بیچ زمانہ جنگ کے، کہ کام آئیں عورتیں بیچ
لڑائی چین و جاپان کے، موافق حق کام آنے اپنے کے۔"

بھوپال کے تانگے والوں کا لب ولہجہ اور انداز گفتگو کی نقشہ کشی بھی ملاحظہ کیجیے:

اگر آپ نے سفر سے پہلے کرایہ طے نہیں کیا اور منزل پر پہنچ کر کچھ دینا چاہا تو تانگے والا بے عزت کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس کی زبان سے "ایک سفریہ" سے ماخوذ کچھ اس طرح کی باتیں سننے کو مل سکتی ہیں:

- "میں نے تو آپ کو اشراف آدمی سمجھا تھا اس لیے سواری کے وقت کچھ نہ کہا۔"
- "اس میں کیا ہوگا میں تو پورے دس آنے لوں گا۔"
- "کیا؟ قرآن کی قسم ایک پیسہ کم نہ لوں گا۔"
- "خدا پاک کی قسم صبح سے گھوڑا الگ بھوکا ہے اس پر یہ دس پیسے دے رہے ہیں"
- "اچھا تو جب جیب میں دام نہیں تھے تو تانگے میں قدم کیوں رکھا آپ نے۔"
- "میں سامان تو نہیں اتارنے دوں گا اب چاہے آپ میرا تانگہ ہی بند کرا دینا اور کیا تو۔"
- "اچھا تو آپ بیچ میں بول رہے ہو تو آپ ہی رکھ دیجیے دس آنے میرے اور کیا تو۔"
- "بس منہ چلانا آتا ہے آپ کو جیب میں دام بھی نہیں اتنے۔"
- "جی ہاں۔ دام کے دام کھا جائیے اور ہم ہی گدھے بدتمیز ہیں آپ تو بڑے کہیں کے...... تمیزدار آدمی ہیں۔"

''جی ہاں سرکار بھی آپ ہی کی ہے بس تو پھر ہمارے بچوں کو سولی پر چڑھا دیجیے۔ ارے ہاں تو۔''

ملا رموزی فطری طنز و مزاح نگار تھے انھوں نے اس میدان میں جو کمالات دکھائے ہیں اردو کی مزاحیہ ادبی تاریخ میں کسی ایک شخص کی تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتے انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ''گلابی اردو'' کے تو خیر وہ موجد ہی تھے اور اس فن میں کوئی ان کا حریف تو کیا مقلد و پیروکار بھی نہ بن سکا، اس کے علاوہ وہ ایک سنجیدہ مضمون نگار، دلچسپ خاکہ نگار، شگفتہ کالم نویس، شاعر اور سادہ، سلیس اور بامحاورہ نثر کے بھی بہترین طنز و مزاح نگار اور اسی کے ساتھ مقرر، مفکر، محقق، مدبر، فلسفی اور سیاسی مبصر بھی تھے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست کے مسائل نیز مذہبی سماجی اور تہذیبی امور پر ان کے تبصرے جرأتمندانہ اور بے باکانہ ہوتے ہیں۔ مختلف اخباروں کے مدیران کے نام ان کے خطوط بھی خاصے کی چیز ہیں۔ مگر ان کی تمام شہرت ''گلابی اردو'' کے دائرے میں سمٹ کر رہ گئی اور آہستہ آہستہ اس کا اثر بھی زائل ہوتا گیا۔ حالانکہ ان کے دوسرے مضامین بھی کچھ کم نہ تھے مگر ان کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی۔ انھوں نے نکات، لقمے، تھرڈ کلاس اور زنانہ کے عنوانات سے جو معرکۃ الآرا کالم اور مضامین قلم بند کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اخوۃ (لکھنؤ) حقیقت (لکھنؤ) خلافت (بمبئی) البرید (کانپور) مدینہ (بجنور)، الجمعیۃ (دہلی)، قوم (دہلی)، اور زمیندار (لاہور) جیسے اہم اخبارات میں ان کے مضامین اہتمام سے شائع ہوتے تھے اسی طرح ملاپ، تیج، دیر بھارت، بھیشم اور پارس کے صفحات بھی گلابی اردو سے مزین نظر آتے ہیں۔

ملا رموزی میں خاص بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت کئی اسالیب پر قادر تھے ان کے مکالمے حد درجہ برجستہ اور کرداروں کی فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں جس طرح آپ نے بھوپال کے تانگے والے کے مکالموں کا انداز دیکھا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحبان کے کردار، تصنع، تکبر، تفکر اور خالی پن کا خاکہ اس طرح اڑایا گیا ہے کہ ان کی مصنوعی شخصیت اور اداکاری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ موقع یہ ہے کہ ملا رموزی کہیں تقریر کے لیے مدعو کیے گئے ہیں اور دوران سفر اپنے ذہن میں تقریر کے داؤ پیچ مرتب کر رہے ہیں۔ اس تقریر کی پلاننگ ملاحظہ کیجیے اور

طرز بلیغ کی داد دیجیے۔ لکھتے ہیں:

- اس مرتبہ تقریر سے پہلے وہاں کے لوگوں سے بہت زیادہ اور مصنوعی طور پر پھول کر بات کروں گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہاں کے باشندے تقریر سے پہلے ہی آدھے کے قریب مجھ سے دب جائیں گے۔
- جاتے ہی وہاں کے لوگوں سے اتنے موٹے موٹے اور گاڑھے عربی الفاظ بولوں گا جس سے وہ سہم جائیں گے کہ بلا کے ذی علم مولوی صاحب آئے ہیں۔
- جاتے ہی کہوں گا کہ میں آج کل پرہیزی کھانا کھاتا ہوں جب لوگ کہیں گے فرمایئے فرمایئے وہ بھی تیار ہوسکتا ہے تو ایک آدھ عمدہ قسم کی غذا تیار کراؤں گا۔
- مذہبی مسائل پر گفتگو کرتا رہوں گا جس سے میری مذہبی معلومات کا رعب طاری ہوجائے۔
- بہت کم مسکراؤں گا اور ہنسی کو بالکل ہی چھپاتا رہوں گا۔
- بے وقت تازہ پھل کھانے کا عادی ظاہر کروں گا۔
- تحفے اور ہدیے دینے کا ثواب بتاتا رہوں گا۔
- تقریر سے پہلے کھانسی سے کام لوں گا اور پھر ادھر اُدھر دیکھوں گا پھر مسلسل سفر اور مسلسل تقریروں سے تھکن ظاہر کروں گا پھر پینے کو پانی طلب کروں گا۔ پھر مجمع سے درود شریف پڑھواؤں گا پھر کہیں تقریر شروع کروں گا۔ پھر تقریر یوں کرون گا کہ اصل معاملے پر دو چار جملے بول کر خلاف عقل و یقین حکایات قصے اور بے بنیاد روایات سے لوگوں کو رلانے کی کوشش کروں گا اگر وہ نہ روئیں گے تو خود رونے لگوں گا اور درود شریف پڑھواتے ہوئے اپنے لیے پانی پھر چائے طلب کروں گا۔
- جب مجمع رونے لگے تو یہ بھی ترکیب سے کہہ دوں گا کہ اگر کوئی اور صاحب میرے وعظ کا بندوبست کراسکیں تو دو دن اور قیام کروں گا۔

ملا رموزی اپنی تحریر میں لفظی اور معنوی تضادات سے نہایت دلچسپ اور گہرے معنی پیدا کرنے میں طاق ہیں باتیں کرتے کرتے نہایت سادگی کے ساتھ اچانک ایسا برجستہ جملہ چسپاں کردیتے ہیں کہ بس سوچتے ہی رہ جایئے تمثیل، تشبیہہ اور استعارے اپنی الگ بہار دکھاتے

ہیں۔ جیسے یہ اقتباس:

''جامعہ الٰہیہ کانپور میں ہمارے وطن کے ایک بزرگ بھی آباد تھے خود کو ہمارا استاد کہتے تھے بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ملا صاحب خبر ہے کہ وطن عزیز میں طاعون کا دورہ شروع ہوگیا ہے طبیعت کو کسی طرح چین نہیں۔ ہم نے ادب سے فرمایا کہ اگر وطن میں طاعون آجانے سے آپ ایسے ہی پریشان ہیں تو چلیے کچھ دن کے لیے وطن ہو آئیں وہاں عزیزوں اور احباب کے جنازوں میں شرکت سے کسی قدر طبیعت بہل جائے گی اور روزانہ بڑے قبرستان تک بھی چہل قدمی ہو جائے گی۔ اس فقرے کو سن کر اور تو کچھ نہیں مولوی صاحب قبلہ ہمارے پاس سے عربی کی وہ دعا پڑھتے ہوئے چلے گئے جسے جماہی آتے وقت مسلمان منہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھتے ہیں۔''

ملا رموزی کی نثر خصوصاً ''گلابی اردو'' سے محظوظ ہونے کے لیے ان کے قاری کا وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے ورنہ ان کی تحریر سے لطف اندوز ہونا تو کجا سمجھ ہی میں آنا مشکل ہوگا۔ انھوں نے عربی اصطلاحات کے استعمال اور صنائع بدائع کے پیرائے میں ایسے ایسے سیاسی، سماجی اور دقیق فلسفیانہ نکات بیان کیے ہیں کہ قاری پر حیرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی نکتہ رسی، نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی قابلِ رشک ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے جس میں ملا صاحب ان قلیوں سے مخاطب ہیں جو انگریزوں کو سلام کرتے ہیں اور ہندستانیوں سے جھگڑتے ہیں:

''امابعد اے محترم قلی مزدورو!

البتہ تحقیق گواہی دیتے ہیں ہم اوپر اس بات کے کہ اگرچہ مزدوری کرتے ہو تم اور بستر سوار کرتے ہو اوپر ریل کے۔ وقت آنے اور جانے ریل کے مسافروں انگریز اور مسافروں ہندستان کے مگر وقت لینے مزدوری کے سلام کرتے ہو تم انگریز مسافروں کو ٹیڑھے ہو کر۔ اے جھک جھک کر مگر قسم ہے تمہارا کو فروشوں ہند کی کہ لڑائی لڑتے ہو تم ساتھ ہندستانی مسافروں کے اور جھگڑتے ہو تم اوپر مزدوری کے ساتھ مسافروں غریب اور افلاس کے مارے ہوئے ہندستانی کے اور جو کم دے مزدوری کوئی مسافر ہندستان کا تم کو بستر اس کا اوپر فرش زمین پلیٹ فارم اسٹیشن کے پھینک دیتے ہو تم اور

ڈانٹ دیتے ہو تم اس غریب مسافر کو یا پھر چھوڑ دیتے ہو اوپر پلیٹ فارم کے لوٹا اس کا یا مبلغ ایک صندوق اس کا یا انکار سخت کرتے ہو تم اٹھانے سے بستر کسی غریب مسافر ہندستانی کے۔ پس تحقیق سبب سے ایسی زیادتیوں تمھاری کے غالب لایا ہے اللہ انصاف کرنے والا اوپر تمھارے انگریزوں کو۔''

گلابی اردو کا یہ منفرد اسلوب ملا صاحب نے اس وقت اختیار کیا تھا جب سادہ تحریر میں کڑوی بات کہنا قانوناً دوبھر ہو گیا تھا۔ 1917 میں جب ملا رموزی نے لکھنا شروع کیا ہندستان نازک دور سے گزر رہا تھا۔ انگریزوں کے ظلم واستبداد نے ہندستانیوں کا جینا مشکل کر رکھا تھا آزادانہ اظہار پر پابندی عائد تھی۔ اسی دوران جرمنی کے حملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پابندیاں مزید سخت ہو گئیں پریس ایکٹ کے نفاذ نے صحافیوں کے قلم کو قانونی شکنجوں میں کس کر بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ صحافیوں پر گہری نظر رکھی جانے لگی حکومتیں جانتی ہیں کہ قلم کی دھار تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے، اس لیے اس کی دھار کو کند کرنے کے تمام سامان کیے گئے۔ ملا رموزی چونکہ ایک آزاد خیال صحافی تھے اپنی بات آزادی کے ساتھ کہنا چاہتے تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ کم از کم حکومت وقت کی بے اعتدالیوں، ستم شعاریوں اور فریب کاریوں کے بارے میں وہ اپنی بات سنجیدہ پیرائے میں کھل کر نہیں کہہ سکتے تو انھوں نے طنز ومزاح کا سہارا لیا اور اپنی تحریر کو ظرافت کا رنگ دے کر دل کی بھڑاس نکالی۔ طبیعت میں جودت اور جدت تھی اس لیے اس میدان میں بھی عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کا اہتمام کیا اور ایک بالکل نئی راہ ڈھونڈ نکالی اور اس طرح اپنی ''گلابی اردو'' کی بنیاد ڈالی۔ گلابی اردو دراصل طرز قدیم میں عربی زبان کی قدیم کتب خصوصاً آسمانی صحیفوں کے لفظی اردو ترجموں کی پیروڈی ہے۔ یہ ترجمے اس قدر پیچیدہ اور گنجلک ہوتے تھے کہ نہ صرف ان کا سمجھنا آسان نہ تھا بلکہ اسلوب بھی مضحکہ خیز ہو جاتا تھا حالانکہ ان مترجمین کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں ابتدا میں قرآن حکیم کے ترجموں کی بھی سخت مخالفت ہوئی لیکن ہندستان کے مجتہد اعظم حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے اجتہاد کر کے اولاً فارسی پھر اردو میں اس کام کا آغاز کر ہی دیا۔ چونکہ عربی اور اردو قواعد میں بڑا فرق ہے۔ صیغے تک یکساں نہیں۔ اس لیے بامحاورہ ترجمے میں معنی ومفہوم کے تبدیل ہو جانے کا اندیشہ رہا ہوگا۔ اس وقت اردو نثر نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ہر طرح کے بیان پر قادر

ہو سکے۔ چنانچہ بزرگوں نے لفظی تراجم ہی میں عافیت سمجھی اور کسی نہ کسی طرح عوامی زبان یعنی اردو میں قرآن حکیم کے معنی و مفاہیم کو اردو داں طبقے تک پہنچانے کی مخلصانہ کوشش کی۔ ملا رموزی کی جودت طبع نے اسی لفظی ترجمے میں عصری مسائل کے بیان کے ذریعے مزاح پیدا کر کے اپنی اردو کو زعفران زار بنا دیا۔ ملا رموزی خود بھی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے اس لیے عربی مصطلحات تک انھیں رسائی حاصل تھی بلکہ ان پر دسترس بھی رکھتے تھے جو اس طرز جدید میں ان کے کام آئی۔ گلابی اردو میں البتہ، تحقیق، اے وہ، مگر، بیچ، شیطان راندا ہوا، پیچھے تمھارے، موافق، پس، نہیں سکتے ہو، اوپر سڑکوں ٹھنڈی کے، عجب کیا، نہیں دیکھا تم نے، مجل موتیوں کے ملیں تم کو بھی وغیرہ اسی قبیل کے الفاظ و اصطلاحات ہیں۔ جملوں کی نحوی ترکیب اسم، ضمیر، فاعل، فعل اور مفعول کا فصل، حروف جار، اضافتیں، کا، کی، کے سب کچھ بدل کر جملوں کی ساخت میں مضحکہ خیزی پیدا کی گئی ہے اور یہ سب کچھ اس خوبی سے ہوا ہے کہ ہر بات کہنے کے باوجود کسی قانونی، سماجی اور اخلاقی گرفت سے بھی محفوظ رہے گویا سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔

ملا رموزی نے 1917 سے 1922 تک پورے جوش و خروش کے ساتھ طنز و ظرافت کے پھول کھلائے۔ اس طرز خاص نے انھیں پورے ملک میں مقبول بنا دیا۔ خاص و عام میں ان کی مقبولیت دیکھتے ہوئے ہر اردو اخبار ان سے مضمون کی فرمائش کرتا، ملا صاحب چونکہ پیشہ ور قلم کار تھے اس لیے معاوضہ بھی لیتے تھے جو اس وقت ایک روپیہ فی صفحہ تھا اخبارات ان کے مضامین انھیں کی شرائط پر وی پی سے حاصل کر کے شائع کرتے اس کے علاوہ ان کے قارئین بھی انھیں تحائف بھیجتے رہتے۔ ریاست بھوپال سے انھیں ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے اردو دوست وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد بھی ان کی تحریروں کے مداح تھے اور انھیں تحفے بھیجتے تھے۔ اس دور میں ملا رموزی جیسی مقبولیت کسی اور کو حاصل نہ تھی۔ ملا رموزی نے 1922 میں گلابی اردو چھوڑ کر سادہ تحریر لکھنا شروع کر دیا۔ گلابی اردو ترک کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے نکات کے کالم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اکثر احباب کو شکایت ہے کہ ہمارے مخصوص طرز تحریر'' گلابی اردو'' میں اب وہ پہلی سی شگفتگی باقی نہیں رہی ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے مگر ایسا قصداً کیا گیا وجہ یہ ہے کہ

گلابی اردو کی جان شگفتگی اصل میں وہ سیاسی تنقید و نکتہ چینی ہوا کرتی تھی جو اس وقت اس
کا حقیقی نصیب العین تھی مگر یہ نصب العین تابع تھا مسلمانانِ ہند کے اس عظیم الشان اور
متفقہ مقصد کا جو منصب خلافت کے حفظ و بقا کے لیے آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند نے طے
کیا تھا۔''

مگر یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور ترکی کی خلافت ختم ہوتے ہی ہندستان کی خلافت تحریک بھی
دم توڑ گئی اور اسی کے ساتھ گلابی اردو کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

''گلابی اردو'' کے بعد انھوں نے سادہ اور بامحاورہ زبان میں مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے
اور ان میں بھی رنگین پھول کھلائے۔ مزاح کے علاوہ ان کے سنجیدہ مضامین بھی فکر انگیز ہیں۔ یہ
مضامین ان کے مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی باریکی سیاسی شعور کی پختگی اور فکر کی بلندی کا
احساس دلاتے ہیں۔ نکات کے عنوانات سے انھوں نے جو مختصر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں ان میں
سیاسی سماجی، مذہبی، تہذیبی اور انسانی نفسیات سے تعلق رکھنے والے ایسے ایسے نکتے بیان کر دیے
ہیں کہ ان کی فکر عالی اور تحریر مثالی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے جس میں اپنے عہد کے نئے
اردو اخباروں کے مدیران کی ذہنی کج روی اور طرزِ عمل کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''1914 میں جنگ یورپ کی خبروں کی اشاعت سے مالی فائدے اٹھانے کے لیے
> زبان اردو کے بے شمار اخبارات جاری ہوئے چونکہ ان نئے اخبارات کا مقصد پیسہ
> کمانا تھا نہ کہ عوام کی اصلاح و فلاح اس لیے ان اخباروں میں اخباری اصول و ضوابط
> کا کامل فقدان رہا مثلاً ایسے اخباروں کے ایڈیٹروں کا زیادہ حصہ نیم تعلیم یافتہ
> نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اصول رہنمائی سے خود بے خبر تھے اور اسی لیے ان کی اخبار
> نویسی سے بجائے اصلاح کے عوام کا ذوق تباہ ہو گیا مگر اس نوجوان اخبار نویس
> جماعت نے اس کمزوری کو عوام کے سر یہ کہہ کر تھوپ دیا کہ ''عوام ہند بدمذاق ہیں''
> حالانکہ عوام کی بدمذاقی کی اصلاح ہمیشہ اخبار نویس کے ذمے عائد ہوتی ہے۔''

اپنے عہد کے اخبار نویسوں کی اس طرح خبر لینا بڑی جرأت کی بات ہے اور ملا رموزی
میں اس طرح کی اخلاقی جرأت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ایک اور جرأت مندانہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اخبارات اردو زیادہ تعداد میں چونکہ نااہل لوگوں کے ہاتھ میں رہے اور ان کی تحریر پر حکومت نے سوائے اپنی حکومتی مصالح کے کوئی اخلاقی احتساب وسزا عائد نہ کی اس لیے ان کی اخلاقی بے راہ روی کے مضر اثرات قوم کے ہر حصہ زندگی پر پڑے اور قوم کی اجتماعی زندگی بھی ایک مرکز یا متحدہ مقصد کے تابع نہ ہوئی اور یہی وہ عظیم الشان خسارہ ہے جو اخبارات سے قوم کو پہنچا۔''

ملا رموزی باتوں باتوں میں اکثر پتے کی بات کہہ جاتے ایسی ہی کچھ اور پتے کی باتیں ملاحظہ کیجیے:

- ''جس ملک میں کثیر المقاصد انجمنیں بکثرت ہوں اس امر کی علامت ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں وحدت خیال نہیں اور جن باشندوں میں وحدت خیال نہ ہو ان میں وحدت عمل نہیں اور جن لوگوں میں وحدت عمل نہ ہو ان کی قومی موت یقینی ہے۔''
- ''جو قوم کسی دوسری قوم کے اخلاق، تمدنی، معاشرتی اور فکری آثار واثرات کو پسند کرتی ہو وہ اس کی غلامی کو باعث عار نہ سمجھے گی۔''
- ''جو شخص کسی ادنیٰ بے غیرتی کو پسند یا گوارہ کر سکتا ہے وہ وقت آنے پر بڑی سے بڑی بے حیائی کو بھی برداشت کر سکتا ہے۔''
- ''دوست کے معنی ہیں ایک فریب دینے والا انسان جو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے ہمارے ساتھ ہے مگر ہم اپنی بے ذوقی سے اسے پہچانتے نہیں۔''
- ''جو شخص وقت کا پابند نہ ہو سمجھو یہ ہندستانی ہے اور جو شخص پچاس روپے ماہوار تنخواہ پر قابو سے باہر نظر آئے سمجھو یہ ہندستانی افسر ہے۔''

ملا رموزی نے رسالہ جامعہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) دہلی میں اپنا مضمون بعنوان ''رائے'' اشاعت کے لیے بھیجا اس کی تمہید دلچسپ اور معلوماتی ہے طرز تحریر میں وہی شگفتگی پائی جاتی ہے جو ان کے نیم مزاحیہ مضامین کی جان ہے۔ لکھتے ہیں:

''1927 کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ

ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ یکا یک موصوف کی نظر ہمارے اوپر آپڑی (یہ دور بیٹھنے والے پر جاپڑی کی ضد ہے)، (آپڑی) ہم نے فوراً ادب سے سلام کیا تو اخاہ فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے فرمایا:

ابی یہ ہیں ملّا رموزی

تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اٹھے اور ہم سے مصافحہ فرمایا۔ (حالانکہ موقع معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ میں تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا آج آپ کی صورت بھی دیکھ لی۔''

ہم یہ سمجھے کہ اوہو اب تو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ''پیام مشرق'' اور مثنوی وغیرہ سے بھی بڑھ گئے اور ان کی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے کہ وہ جرمنی کی زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز تردید بھی ہوگئی کہ جرمنی میں مضامین پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ کہ زبان جرمنی۔ ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید تو پڑی ہوگی مگر ہم نے خود کو سنبھال کر رسالہ جامعہ کا تذکرہ شروع کردیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان جتایا کہ ہم نے جامعہ کے علی گڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں جو اصطلاح میں ''معرکتہ الآرا'' کہلاتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''مگر اب تو آپ نے جامعہ کو بھلا ہی دیا تو ہم نے بھی فی البدیہہ یہ عرض کیا، جامعہ تو اب بالکل ہی متین اور علمی رسالہ ہوگیا ہے اور ہمیں متانت سے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے جتنی ہندستانی پولیس کو ہڑتالیوں سے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ اپنے ہی رنگ میں لکھیے۔ اس لیے بالفاظ اخبار ریاست دہلی ان اوپر کے حالات کی وجہ سے جامعہ میں یہ بدعتی مضمون پیش کرتے ہیں خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر سے بچائے کہ کہا ہے: گر قبول افتد زہے عزّ وشرف۔''

ایک اور مضمون ''پیشاور تک مگر علی گڑھ تک'' کا یہ دلچسپ اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

''28 نومبر 1927 کو مفتی اعظم حضرت علامہ محمد مفتی کفایت اللہ جمعیۃ العلما ہند کا

گرامی نامہ ملا کہ جمعیۃ کے سالانہ اجلاس پیشاور کی شرکت کے لیے آپ کا نام پیشاور کی مجلس استقبالیہ کو بھیج دیا گیا ہے تیار رہو۔ ننھے میاں کی والدہ سے پیشاور تک سفر کا تذکرہ جو کیا تو انھوں نے جو طویل جوابات عطا فرمائے ان کے جملہ حقوق بحق راقم الحروف محفوظ رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ بستر باندھ دیا، کپڑے رکھ دیے، کھانا پکانے بیٹھ گئیں۔ صرف ہم سے خندہ پیشانی سے بات کرنا ترک کر دیا۔ ننھے میاں پر بات بات میں جھنجھلانے لگیں۔ برتن کو زمین پر رکھنے کی جگہ پٹک دیتی تھیں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک تازہ پان بھی نہ کھایا۔ ہر بات میں آگ لگ جائے کا استعمال زیادہ ہونے لگا بس ان تیوروں سے ہم تاڑ گئے کہ یہ سب کچھ ہمارے سفر پر نہیں بلکہ سفر خرچ پر اظہار ناراضگی ہو رہا ہے اور چونکہ اس سے قبل بھی انھیں روپے پیسے کے معاملوں میں آزمائے ہوئے ہیں اس لیے آہستہ سے کھانستے ہوئے اٹھے اور اپنے علم پرور و معارف نواز کرم فرما حضرت رشدی سے کرایہ کو کہہ دیا۔"

ملا رموزی نے شاعری بھی کی ہے ان کی شاعری کے موضوعات میں نثری موضوعات جیسا تنوع تو نہیں ہے مگر اس میں ہندستان کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے نقوش زیادہ گہرے اور تہذیبی صورت حال زیادہ توجہ طلب ہے۔ ملا صاحب کی تعلیم و تربیت مشرقی تہذیب میں ہوئی تھی۔ یہ تہذیب ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دوراندیش اور تعلیم یافتہ انسان بھی ہیں چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تہذیب و ثقافت کو مغرب کی تہذیب و معاشرت نگلنے کے درپے ہے تو انھیں سخت تکلیف ہوتی ہے وہ اس غیر ملکی تہذیب کو اپنے لیے ضرر رساں خیال کرتے ہیں۔ انھیں ہم وطنوں پر بھی غصہ آتا ہے جو آنکھیں بند کر کے مغرب پرست ہوئے جاتے ہیں اور اپنی تہذیبی اور معاشرتی اقدار و روایات کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ملا رموزی نے طنز و مزاح کے پردے میں ان احساس کمتری کے ماروں کی خوب خبر لی ہے اس معاملے میں وہ پوری طرح اکبرالہ آبادی کے ہم خیال ہیں۔ اس قبیل کی نظموں میں "کوٹھیاں میرے نام کیجیے الاٹ" بدھو کی عید، رگیدے جائیں گے سب کالے نفع خوار ابھی، نرخ حد سے سوا جزاک اللہ، بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں، خیال ویال، فتح مقامات وغیرہ جیسی نظموں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

''کوٹھیاں کیجیے میرے نام الاٹ'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار سے عہد رموزی میں ہندستانی معیشت کی صورت حال واضح ہوتی ہے۔

میرے افسانے کا لکھے جو پلاٹ   یاد آئے گا اس کو خود ارارات
یاد کرتے ہیں گیہوں مکا کو   روز رو رو کے میری چکی کے پاٹ
بیر بھی اس طرح نہیں ملتے   جیسے ملتے تھے پہلے سیب و کاٹ
اب تو اللہ ہی درست کرے   اصلی گھی کا بگڑ چکا ہے جو ماٹ
بارہ آنے کے گھر میں کیا لکھوں   کوٹھیاں کیجیے میرے نام الاٹ

اس نظم سے اشیائے خورد ونوش کی قلت اور مہنگائی کی شدت پر روشنی پڑتی ہے۔''بدھو کی عید بھی'' اسی انداز کی ہے اس میں بھی عام آدمی گرانی سے گراں بار ہے شعر دیکھیے:

بدھو یہ کہہ رہا تھا کہ کل میٹھی عید ہے   بیوی یہ کہہ رہی تھی کہ گرانی شدید ہے
خرچے میں بیوی بچوں کے یہ خاص بات ہے   ان کا نہ کوئی کھاتہ نہ کوئی رسید ہے
فرمائشوں سے بیوی کی مقروض ہوگیا   رمضان بھر کا حاصل گفت و شنید ہے
کچھ شعر اس میں میرے ہیں کچھ میری بیوی کے   یہ فیض خاص مالک ''عصر جدید'' ہے

مغربی تہذیب جو مغربی تعلیم کے زیر سایہ ہندستان میں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہو رہی تھی مشرقی تہذیب کے دلدادگان اس کی درآمد سے بہت مفکر رہا کرتے تھے ان میں جو شاعر و ادیب تھے اور جنھیں ہندستان کے اقدار و روایات اور مذہبی اخلاق کے زیاں کا شدید احساس تھا وہ اپنی فکرمندی کا اظہار قلم کے ذریعہ کرتے تھے اور بعضوں نے اس راہ میں طنز کی روش اپنائی اور طنز کو خوشگوار بنانے کے لیے اس کی تلخی کو مزاح کی شیرینی میں لپیٹ کر پیش کیا اردو میں منشی سجاد حسین کا اخبار ''اودھ پنچ'' اس نظریے کا سب سے بڑا نقیب تھا۔ اس کے پاس لکھنے والوں کا ہجوم جمع ہوگیا تھا جن میں سب سے بڑا نام اکبر الہ آبادی کا ہے جو اردو شعرا میں طنز و مزاح نگاروں کے سرخیل ہیں ملا رموزی بھی چونکہ انھیں کے ہم خیال تھے اس لیے انھوں نے اکبری روش اختیار کی ان کی ایک نظم ''بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں'' اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ نظم یہ ہے:

بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں   یورپ کی پی ہے جب تو ہیں ہشیار اب کہاں

توبہ کے بعد پھر نہ کبھی توڑتے تھے عہد — بی اے کے عہد میں وہ گنہگار اب کہاں
سائنس سے قریب ہوئے اور خدا سے دور — ہم اس کی نعمتوں کے سزاوار اب کہاں
جب عشق بی اے پاس ہے اور حسن بی بی پاس — اک دوسرے کا کوئی وفادار اب کہاں
شعر زوال و شعر گدائی گلی گلی — اقبال کے جلال کے اشعار اب کہاں

ایک اور نظم ''فلک کے پاس پہنچ کر بھی خدا سے ہے دور'' کے چند شعر اور ملاحظہ کیجیے:

ملا تو ہے تجھے سائنس میں غضب کا شعور — فلک کے پاس پہنچ کر مگر خدا سے ہے دور
بنا چکا ہے تو راکٹ چڑھے گا چاند پہ تو — یہ حق ہے تجھے چاہے کرے تو جتنا غرور
کمال سب سہی لیکن سکون قلب بتا — قدم قدم پہ حوادث اور ان پہ فسق و فجور
سمجھ سکے تو بتاؤں کہ مادے سے تجھے — ملی تو عقل مگر مل سکا نہ عقل کا نور
یہ نور دیتے ہیں اس کو جو خود کو بندہ کہے — اسی کے حق میں حقائق کا علم اور ظہور
بلند تر ہے مقام خیال و فکر اس کا — یہ ہے وہ دل سے جو کہتا ہے ہاں خدا ہے ضرور
جو کہہ رہا ہے رموزی بہ طرز شعر و سخن — ہے اس میں اصل میں پوشیدہ قلب و جاں کا سرور

نظم ''خیال وبال'' بھی خوب ہے۔ ردیف میں جھنجھلاہٹ پیدا کی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

کہاں کا شعر کہاں کا حسیں خیال وَبال — کہاں جدائی کا محبوب کی ملال وَلال
مجھے تو گیہوں کا غم کھائے جا رہا ہے ابھی — کہاں کا غمزۂ جانانہ اور جمال وَمال
جوار اور وجی ٹیبل کے گھی کے کھانے سے — سسک رہا ہے مرے شعر کا کمال وَمال
اب اس پہ ٹیکس کی کثرت قوی غذاؤں کا قحط — وہ جائے بھاڑ میں اب ہر حسیں مقال وقال
اب ایسے حال میں جینے کی اک ہی حکمت ہے — رہوں نہ میں کبھی اک لمحہ کو نڈھال وَڈھال

ملا صاحب کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع وطن دوستی ہے انھیں اپنے وطن ہندستان سے محبت ہے۔ ان کا شمار متحدہ قومیت کے حامیوں میں ہوتا ہے۔ جس کے علمبرداروں میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسے اولوالعزم قائدین شامل تھے۔ اسی لیے ملا صاحب ہمیشہ ہجرت کے خلاف رہے۔ انھوں نے یہ کبھی نہ چاہا کہ مسلمان اپنے وطن کو خیر باد کہیں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ

مسلمانوں کو ہر حال میں یہیں رہنا چاہیے خواہ انھیں کتنی بھی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ شاید ان کی آنکھیں بھی وہی سب کچھ دیکھ رہی تھیں جس کی پیشن گوئی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی اور بعد کے حالات نے جسے صد فیصد درست ثابت کر دیا۔ ایک نظم ملاحظہ کیجیے جس میں ملا رموزی نے بغیر کسی شاعرانہ تکلف کے راست بیانی کا انداز اختیار کیا ہے۔ عنوان ہے:

''للہ بھاگئے نہیں ہندستان سے''

للہ بھاگئے نہیں ہندستان سے ... مارے بھی جائیں آپ اگر اپنی جان سے
ڈٹ ڈٹ کے رہیے آپ اب آن بان سے ... ہندو کا ہند ہے تو ہے مسلم کا بھی یہ ہند
اک لاکھ میل دور ہے مسلم کی شان سے ... جغرافیہ میں میں نے پڑھا ہے کہ بھاگنا
جاتے رہیں ہمارے بھی وہم و گمان سے ... اتنا نہ بھاگتے ہی چلے جایئے کہ آپ
مرجائیں گے نہ جائیں گے ہندستان سے ... ملا رموزیوں نے کہا ڈٹ کے آج شب

مسلسل غزل کی ہیئت میں یہ نو اشعار کی نظم ہے۔ جس میں سے پانچ شعر بطور مثال اوپر نقل کیے گئے ہیں باقی اشعار بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

اسی قبیل کی ایک اور نظم جس میں اور زیادہ سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے قوم کو غیرت دلانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں لعن طعن سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ ہیئت وہی غزل کی ہے عنوان ہے ''بھگوڑے'' جو غیرت دار انسان کے لیے سخت ترین حربے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نظم کے ہر شعر میں طنز کے کوڑے برستے رہتے ہیں۔ یہ نظم ہمیں احساس دلاتی ہے کہ ملا رموزی تقسیم ملک اور ملک سے ہجرت کرنے والوں کے کس قدر خلاف تھے۔ نظم ملاحظہ ہو:

بے عقل ہر اک ملک میں ہوتے ہیں بھگوڑے ... اب کون ہے جو بھاگنے کی راہ سے موڑے
اعصاب کی کمزوری سے ان سب کے دلوں پر ... خطرات کی دہشت کے پڑا کرتے ہیں کوڑے
ان کے لیے ہے خانہ بدوشی ہی مقدر ... پھرتے ہی رہا کرتے ہیں یہ دیس کو چھوڑے
خود ڈرتے ہیں اور دل کو ڈرانے میں ہیں استاد ... ہر بستی کے حق میں ہیں یہ بیماری کے پھوڑے
اس طرح کی وحشت سے دھڑکتے ہیں یہ اکثر ... جس طرح بدک جائیں سڑک پر کبھی گھوڑے
یہ روٹی کے بندے ہیں یہ عادت ہے انھیں کی ... جس سمت ملی گرم ادھر ہی کو یہ دوڑے

آتا نہیں ان کو کہ یہ اس طرح رہیں اب ملتے رہیں گھر بیٹھے انھیں پوری پکوڑے
رہ جائیں وطن ہی میں رموزی جو فلک سے
پڑ جائیں ذرا وزنی سے دوچار ہتھوڑے

اس غزل نما نظم میں مشکل قوافی کو بڑی خوبی اور برجستگی سے نبھایا گیا ہے مگر تلخی بھی کم نہیں ہے۔ ملا رموزی کی نثر میں بلیغ طنز اور لطیف ظرافت کے امتزاج سے ضیافتِ طبع کے لیے اصلاحِ نفس کا جو سامان کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری میں نظر نہیں آتا اور اپنی شاعری میں وہ خود بھی اس کے دعوے دار نہیں۔ ان کی نثر اور شاعری میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نثر خصوصاً گلابی اردو کی نثر سے لطف اندوز ہونے کے لیے علم وادب کا گہرا مطالعہ اور اعلیٰ ادبی ذوق درکار ہے۔ اس کے برعکس ان کی شاعری ہر مذاق کا آدمی سمجھ سکتا ہے اس کے لیے علم وادب سے واقفیت بھی شرط نہیں۔ فنی اعتبار سے بھی ان نظموں کو اعلیٰ معیاری نظموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا مگر شاعر کا جذبہ صادق ہے اس لیے کوئی بھی شخص اس کے پیغام کے مقصد اور مقصد کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اس انداز کی نظموں میں ''للہ بھاگ نہیں ہندستان سے''، ''دہلی سے کیوں فرار ہو دہلی کے دوستو''، ''جس شرط پر رکھے تجھے ہندستان رہ''، ''مرد اور وطن''، ''مسلمان کو کس نے مارا'' اور ''بھگوڑے''، جیسی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ملا رموزی نے اصلاحی مقاصد کے تحت جو طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں کہی ہیں ان کا انداز بالکل مختلف ہے ان کے علاوہ کچھ ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں بھرپور شاعری ہے فکری اور فنی اوصاف سے معمور ان نظموں میں خیال کی نزاکت، فکر کی بلندی اور فن کی نزاکت بھی دیدنی ہے ''ماہ گل افروز'' ایسی ہی ایک خوبصورت برجستہ اور رواں دواں نظم ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

میں صبح کے تارے کے تبسم میں ہوں بیدار — تو ریشمی بستر پہ نہ بیدار نہ ہشیار
میں مطلعِ برجیس ہوں تو ماہ دو ہفتہ — اس پر ہیں ترے حال میں افسردہ کے آثار
اک میں ہوں کہ طوفان کے منہ پھیر رہا ہوں — اک تو ہے کہ گھر تک سے نکلنے سے ہے بیزار
اس ماہِ گل افروز میں آ دیکھ مرے ساتھ — جنت کی جوانی کا تماشا سرِ کوہسار
آ دیکھ مری دیکھنے کی آنکھ سے ظالم — بارش سے بہاروں پہ جو پرجوش ہیں گلزار

بھیگی ہوئی شاخوں کے تموج سے ہے پیدا دلہن سی لجائی ہوئی اک شوکت رفتار
پھولوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندوں میں ہے ابتک وہ تیرے پسینے میں تیری طلعتِ رخسار
چٹکی ہوئی کلیوں میں وہ اک موج تبسم جو پہلی نظر میں تری شرمائی تھی اک بار
جس طرح تری زلفیں ہیں بکھری ہوئی ظالم ان کالی گھٹاؤں میں انھیں کا تو ہے کردار
ابھرے ہوئے غنچوں کے تکبر سے ہے ظاہر وہ تن کے ترے چلنے کے اور باتوں کے اطوار
ویسی ہی چٹانوں پہ پھسلنے کی ہے ترکیب اٹھلانے میں جیسے تھی تری لغزش رفتار
وہ چور سا احساس بھی غنچوں میں ہے بیتاب جو تیرے خیالات میں رہتا ہے نگوں سار
کچھ اور میں کہنے کو تھا تجھ سے زرہ شوق یعنی میں وفادار ہوں یا تو ہے وفادار
وہ بات مگر کان میں اک غنچہ نے کہہ دی قربان مری نظم مری ثروت افکار

اس خوبصورت نظم میں ملا رموزی نے موسم بہار کے حوالے سے حسن محبوب کی محبوبیت کا اس خوبی سے تعارف کرایا ہے کہ ہر تصویر متحرک اور ہر پیکر گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات میں تازہ کاری ہے۔ ملا صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ نثر ہو یا نظم، طنز ہو یا مزاح یا سنجیدہ انداز گفتگو انسانی نفسیات ہو یا فطرت نگاری ہر قسم کے موضوعات قلم بند کرنے کے لیے نئے مضامین باندھنے اور ہر اسلوب میں داد سخن دینے پر قادر ہیں۔ یہ وہ جوہر ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ البتہ اپنی محنت اور ریاضت سے قلم کی شمشیر کو صیقل کیا جا سکتا ہے چنانچہ ملا رموزی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ حصول علم و آگہی سے ان پر جلا کرتے رہے اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

ملا رموزی کا زیر نظر کلیات جو تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے اور ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کلیات میں پانچ جلدیں ہیں <u>جلد اول</u> میں 934 صفحات ہیں اس میں ''گلابی اردو'' کے (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) مضامین نیز عورت ذات کے عنوان سے شائع ہونے والی تمام تحریریں شامل ہیں۔ <u>جلد دوم</u> میں نکات ملا رموزی حصہ اول و دوم، شادی، خواتین انگورہ اور زندگی کے عنوانات پر مشتمل 788 صفحات ہیں۔ <u>جلد سوم</u> کی ضخامت 748 صفحات ہے اس میں صبح لطافت، لاٹھی اور بھینس،

آتا نہیں ان کو کہ یہ اس طرح رہیں اب ملتے رہیں گھر بیٹھے انھیں پوری پکوڑے

رہ جائیں وطن ہی میں رموزی جو فلک سے

پڑ جائیں ذرا وزنی سے دوچار ہتھوڑے

اس غزل نما نظم میں مشکل قوافی کو بڑی خوبی اور برجستگی سے نبھایا گیا ہے مگر تلخی بھی کم نہیں ہے۔ ملا رموزی کی نثر میں بلیغ طنز اور لطیف ظرافت کے امتزاج سے ضیافتِ طبع کے لیے اصلاحِ نفس کا جو سامان کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری میں نظر نہیں آتا اور اپنی شاعری میں وہ خود بھی اس کے دعوے دار نہیں۔ ان کی نثر اور شاعری میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نثر خصوصاً گلابی اردو کی نثر سے لطف اندوز ہونے کے لیے علم وادب کا گہرا مطالعہ اور اعلیٰ ادبی ذوق درکار ہے۔ اس کے برعکس ان کی شاعری ہر مذاق کا آدمی سمجھ سکتا ہے اس کے لیے علم وادب سے واقفیت بھی شرط نہیں۔ فنی اعتبار سے بھی ان نظموں کو اعلیٰ معیاری نظموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا مگر شاعر کا جذبہ صادق ہے اس لیے کوئی بھی شخص اس کے پیغام کے مقصد اور مقصد کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اس انداز کی نظموں میں ''لللہ بھاگئے نہیں ہندستان سے''، ''دہلی سے کیوں فرار ہو دہلی کے دوستو''، ''جس شرط پر رکھے تجھے ہندستان رہ''، ''مرد اور وطن''، ''مسلمان کو کس نے مارا'' اور ''بھگوڑے''، جیسی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ملا رموزی نے اصلاحی مقاصد کے تحت جو طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں کہی ہیں ان کا انداز بالکل مختلف ہے ان کے علاوہ کچھ ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں بھرپور شاعری ہے فکری اور فنی اوصاف سے معمور ان نظموں میں خیال کی نزاکت، فکر کی بلندی اور فن کی نزاکت بھی دیدنی ہے ''ماہ گل افروز'' ایسی ہی ایک خوبصورت برجستہ اور رواں دواں نظم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

میں صبح کے تارے کے تبسم میں ہوں بیدار — تو ریشمی بستر پہ نہ بیدار نہ ہشیار

میں مطلع برجیس ہوں تو ماہ دو ہفتہ — اس پر ہیں ترے حال میں افسردہ کے آثار

اک میں ہوں کہ طوفان کے منہ پھیر رہا ہوں — اک تو ہے کہ گھر تک سے نکلنے سے ہے بیزار

اس ماہِ گل افروز میں آ دیکھ مرے ساتھ — جنت کی جوانی کا تماشا سرِ کوہسار

آ دیکھ مری دیکھنے کی آنکھ سے ظالم — بارش سے بہاروں پہ جو پر جوش ہیں گلزار

بھیگی ہوئی شاخوں کے تموج سے ہے پیدا — دلہن سی لجائی ہوئی اک شوکت رفتار
پھولوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندوں میں ہے ابتک — وہ تیرے پسینے میں تیری طلعت رخسار
چٹکی ہوئی کلیوں میں وہ اک موج تبسم — جو پہلی نظر میں تری شرمائی تھی اک بار
جس طرح تری زلفیں ہیں بکھری ہوئی ظالم — ان کالی گھٹاؤں میں انھیں کا تو ہے کردار
ابھرے ہوئے غنچوں کے تکبر سے ہے ظاہر — وہ تن کے ترے چلنے کے اور باتوں کے اطوار
ویسی ہی چٹانوں پہ پھسلنے کی ہے ترکیب — اٹھلانے میں جیسے تھی تری لغزش رفتار
وہ چور سا احساس بھی غنچوں میں ہے بیتاب — جو تیرے خیالات میں رہتا ہے تگوں سار
کچھ اور میں کہنے کو تھا تجھ سے ز رہ شوق — یعنی میں وفادار ہوں یا تو ہے وفادار
وہ بات مگر کان میں اک غنچہ نے کہہ دی — قربان مری نظم مری ثروت افکار

اس خوبصورت نظم میں ملا رموزی نے موسم بہار کے حوالے سے حسن محبوب کی محبوبیت کا اس خوبی سے تعارف کرایا ہے کہ ہر تصویر متحرک اور ہر پیکر گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات میں تازہ کاری ہے۔ ملا صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ نثر ہو یا نظم، طنز ہو یا مزاح یا سنجیدہ انداز گفتگو انسانی نفسیات ہو یا فطرت نگاری ہر قسم کے موضوعات قلم بند کرنے کے لیے نئے مضامین باندھنے اور ہر اسلوب میں داد سخن دینے پر قادر ہیں۔ یہ وہ جوہر ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ البتہ اپنی محنت اور ریاضت سے قلم کی شمشیر کو صیقل کیا جاسکتا ہے چنانچہ ملا رموزی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ حصول علم و آگہی سے ان پر جلا کرتے رہے اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔

ملا رموزی کا زیر نظر کلیات جو تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے اور ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے شائع کیا جارہا ہے۔ اس کلیات میں پانچ جلدیں ہیں جلد اول میں 934 صفحات ہیں اس میں ''گلابی اردو'' کے (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) مضامین نیز عورت ذات کے عنوان سے شائع ہونے والی تمام تحریریں شامل ہیں۔ جلد دوم میں نکات ملا رموزی حصہ اول و دوم، شادی، خواتین انگورہ اور زندگی کے عنوانات پر مشتمل 788 صفحات ہیں۔ جلد سوم کی ضخامت 748 صفحات ہے اس میں صبح لطافت، لاٹھی اور بھینس،

شفاخانہ، مضامین رموزی، شرح کلام اکبر الٰہ آبادی، مشاہیر بھوپال جیسے موضوعات اور خطوط رموزی جمع کیے گئے ہیں۔ جلد چہارم حقائق و لطافت، نوادر و لطائف، رموز و لطائف، رمز و لطیفہ اور مختلف کالموں کو محیط ہے۔ اس جلد کے کل صفحے 914 ہیں اور یہ سب سے ضخیم کتاب ہے۔ پانچویں اور آخری جلد 466 صفحات کے ساتھ گلابی شاعری، مجموعہ کلام، نظریات غزل، اخباری شاعری اور جنگ جیسی شعری اور نثری تحریروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان سب مضامین کے علاوہ ہر جلد میں مقدمہ بھی شامل ہے۔

ملا رموزی نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ ان کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کا دعوا نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کلیات میں ان کی وہ تمام تخلیقات، جن تک رسائی ممکن ہو سکی یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں اپنی نارسائی کا احساس ہے اور اس پر افسوس بھی ہے کہ ان کی کچھ مطبوعات کے صرف نام ملتے ہیں مگر کتابیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ زیر نظر کلیات میں شامل تمام کتابیں ملا رموزی کے فرزند ارجمند جناب رفعت اقبال کی ذاتی لائبریری سے حاصل کی گئی ہیں۔ موصوف نے اپنے والد محترم کی اس بیش قیمت وراثت کو سینہ سے لگا کر رکھا اور اس کی دیکھ ریکھ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھیں کی بدولت ادب کا یہ سرمایہ باقی رہا اور انھیں کے تعاون سے کلیات کی زینت بنا۔ میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کا احسان مند اور اس کلیات کے مرتب کے طور پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسی شکریے کے مستحق میرے عزیز دوست پروفیسر محمد نعمان خاں بھی ہیں، سچ پوچھیے تو برادرم محمد نعمان خاں نہیں ہوتے تو میں یہ کلیات مرتب نہیں کر سکتا تھا اور شاید کرتا بھی نہیں۔ کلیات سے متعلق سارا مواد فراہم کرنے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی تھی۔ ان کے تعاون خاص کی وجہ سے یہ کام میرے لیے آسان تر ہو گیا۔ رسمی طور پر شکریہ ادا کرنے سے اگرچہ حق معاونت ادا نہیں ہو سکتا مگر اخلاقیات کے بھی اپنے حقوق اور تقاضے ہوتے ہیں اس لیے میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں مگر دراصل سب سے پہلے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا شکریہ واجب آتا ہے کہ اگر اس نے اس کتاب کو چھاپنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو نہ رموزی صاحب کے فرزند ارجمند کی کوشش بارآور ہوتی اور نہ کسی کا دست تعاون کام آتا۔ میں کونسل کی اشاعتی کمیٹی کے اراکین، اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام صاحب اور وائس چیرمین

جناب وسیم بریلوی صاحب سب کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہارون صاحب جو اس کتاب کے کمپوزر ہیں انتہائی مخلص اور بے نیاز قسم کے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں منتہی بھی ہیں، انھوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی ہے میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ ملا رموزی جیسے کثیرالجہات اور کثیرالتصانیف بلند پایہ ادیب کا یہ کلیات بہت پہلے شائع ہونا چاہیے تھا مگر وقت نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان پر اتنا کام بھی نہیں ہوا جتنا چھوٹے موٹے قلم کاروں پر ہو جاتا ہے جبکہ ان کے عہد کے بلند پایہ ادیبوں نے ان کی ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا تھا۔ کسی شخص کی عظمت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بالکل نئے طرز کا موجد بن جائے اور وہ بھی ایسے طرز کا جس کی نقل بھی آسان نہ ہو مگر اب لوگ انھیں تقریباً فراموش کر چکے ہیں خود ان کے وطن میں بھی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی عمارت ''ملا رموزی بھون'' کی وجہ سے ہی لوگ ان کے نام سے واقف ہیں مگر کارناموں سے شاید وہ بھی واقف نہ ہوں۔ امید ہے کہ ان حالات میں اس کلیات کی اشاعت نیک فال ثابت ہوگی۔

خالد محمود

صبحِ لطافت

از

مُلا رموزی

فہرست مضامین

- انتساب 5
- مقدمہ (از شفاعت بی۔اے) 7
- گلابی اردو 17
- متانت اور ظرافت 19
- مطالعہ 27
- عید کے ارکانِ ثلاثہ 37
- ہڑتال 51
- بے وقوفی 61
- جاڑا 69
- پھر ذرا علی گڑھ تک 83
- علی گڑھ سے شاندار پسپائی 99
- شیر کا شکار 111
- ہندستانی لباس کیسا ہو 121
- چائے کی پیالی 129
- رقعہ بنام ایڈیٹر اخبار ''پیغام'' دہلی 139
- رقعہ بنام اخبار ''پارس'' لاہور 143
- موٹر میں دو راتیں 149

انتساب

یہ انتساب ہے صغریٰ، صابرہ، صغیرہ، صالح، صادق، ساجد اور خلیق کے نام جو میرے والدین اور بہن بھائیوں کے وہ کائنات عالم سے زیادہ عزیز نام ہیں جن کے بے غرض و بے معاوضہ احسانات ان کے بے بدل خلوص ان کی جاں نثارانہ خدمات اور ان کے میرے لیے ہر لحظہ دھڑکنے والے دلوں کی معصوم دعاؤں سے پل کر میں جوان ہوا ہوں۔

پس میں اگر خدمتِ اسلام و ملت سے کبھی عہدہ برآ ہو سکا تو کہوں گا کہ یہی وہ جان سے پیاری ہستیاں ہیں جنھوں نے میری ناکام زندگی کے تلخ ترلمحات کو اپنے صبر اور وفادارانہ حوصلہ سے اس درجہ خوشگوار بنائے رکھا کہ مشکلات و مصائب میں خود مجھے صبر کرنے کا سلیقہ آ گیا۔

پھر اگر نظر کو ذرا بلندی نصیب ہو جائے تو کہوں کہ یہ سب کچھ فضل و انعام ہے زمینوں اور آسمانوں کے اس خدا کا جس نے مجھے ان برتر از شکر و سپاس ہستیوں کا سایہ عطا فرمایا۔

و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ نبی المصطفیٰ و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

آپ کا مرہونِ کرم

ملّا رموزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(از شفاعت بی۔اے)

عشق در اول و آخر ہمہ وجدست و سماع

ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش ست

(صائب مرحوم)

''وقت آ گیا ہے کہ ہم نظم ونثر کے عہد قدیم کا تذکرہ چھوڑ کر عہدِ حاضر کی نظم ونثر سے استناد واستفادہ کریں تا کہ زبانِ اردو کے عہدِ جدید کا آغاز ہو''۔

(نکاتِ رموزی، جلد اول، صفحہ 125)

مُلّا رموزی اور ان کی تحریر پر اظہارِ خیال کے لیے میں نے انھی کا ایک قول اوپر نقل کیا ہے اور اسی کو غایت مجھیے ملا رموزی پر میرے اظہارِ خیال کی کسی زبان کی علمی، ادبی اور تاریخی تنقید لکھتے وقت سب سے پہلے اس کی تحریروں کی زمانی اور مکانی حالت اور اس وقت کے تاثرات کا اندازہ کر لینا نہایت ضروری چیز ہے تا کہ صاحبِ تحریر اور تحریر زیرِ بحث پر جامعیت سے کچھ لکھا جا سکے۔ لہٰذا ملا رموزی موجدِ گلابی اردو کی تحریر پر تنقید وتبصرہ لکھتے وقت ہمیں 1917 سے 1929 تک کے ہندستان کی ذہنی اور فکری حالت پر ایک نظر ڈالنا ہوگا۔

1917 جنگ یورپ کا وہ قیامت خیز دور ہے جب جرمنی کی فوجیں ملک فرانس کے دارالحکومت پیرس پر (70) میل تک گولہ مارنے والی توپوں اور میدانی توپوں سے آگ برسا رہی تھیں اور اس کے قلعہ ورڈن پر شبانہ روز آتش فشانی کے لیے جرمنی توپوں کے دہانے یوں کھلے ہوئے تھے کہ ان کی شدت سے زمین سے پانی کے چشمے اُبل آنا بعید نہ تھا۔ ہندستان کی حکمراں حکومت برطانیہ بھی اسی زد میں تھی۔ خوف و ہراس اور اضطراب و وحشت سے عالمِ انسانیت کا ذرہ ذرہ کانپ رہا تھا۔ آزاد سے آزاد اور گرم سے گرم دماغ کے دلوں پر اگر خوف نہیں تو سکوت ضرور طاری تھا اور آزاد لوگوں میں بہت کم تھے جو ہمت و اولوالعزمی و جرأت و شہامت سے کام کر رہے تھے۔ مگر وہ تھے ہی اتنے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ پس خوف و ہراس اور یاس و افسردگی کے اسی عہد میں ملا رموزی نے ایک لطیف و ظریف طرزِ تحریر کا آغاز کیا۔

حالانکہ لطیف تحریروں کے لیے عہدِ عیش و ایامِ فراغت ازبس لازم و ضروری ہیں، مگر دہشت و خوں ریزی کے اس دور میں مُلا رموزی کا ایک ہنسانے والی تحریر کا آغاز کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کا دماغ مصائب و مشکلات کی شدت سے متاثر نہیں ہوتا اور اگر اس ذہنیت کے انسانوں کو کوئی جنگی اور حربی ماحول یا کوئی ملکی مدافعت کی خدمت سپرد ہو تو وہ یقیناً کسی خوفناک میدانِ جنگ میں بڑے اطمینان سے فوجوں کی کمان کریں، مگر غنیم کو کبھی دھیان میں نہ لائیں، لیکن ملا رموزی کا ماحول چونکہ محض فکری تھا اس لیے انھوں نے شعبۂ تحریر و خطاب کو اختیار کیا۔ اب اگر اس شعبۂ عمل کی ستائش کی جاسکتی ہے تو اس لیے کہ اس میں جرأت و بے باکی اور خوش دلی کی روح کے ساتھ جدت و ندرت آفرینی اور لطافت و خطابت کے شباب اور طریقے اختیار و ایجاد کیے گئے۔

اس کے بعد ملا رموزی کا دوسرا ماحول اس سے بھی زیادہ سخت اور مخالفِ عمل نظر آتا ہے اور وہ ان کا ''خاندان'' ہے یعنی کسی ایسے شخص کو جو ذہن و دماغ سے حکمت و ہدایت کے اچھوتے نکتے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ یقیناً ایک خالص علمی اور نہایت فارغ و خوشحال خاندان میں پیدا ہونا چاہیے تاکہ اس کا دماغ خاندانی مشکلات اور ذمہ داریوں کی بجا آوری سے متاثر نہ ہو، لیکن ملا رموزی کے خاندان میں یہ بات نہیں بلکہ وہ ایک نہایت درجہ غریب گھرانے کے نہایت فاضل اور بڑے حساس رکن ہیں۔ اس گھرانے کی عام تعلیم و تربیت اور ذہنی وجدان قطعاً پرانے زمانے

کے تاثرات اور اصول سے متاثر ہے اور گھرانے میں کوئی نہیں جو ان کے کام کی نزاکت کو محسوس کر کے انھیں دماغی راحت بہم پہنچائے۔

ان کا سب سے آخری مگر دماغ سوز ماحول خود صحافت ہے، جس کے اندر وہ لطافت و حکمت کی سوہزار بہاریں پیدا کرنے پر بھی افسردہ خاطر رہتے ہیں اور یقیناً اخبارات اردو اور رسائلِ اردو میں ان کی وہ حوصلہ افزائی نہ ہوئی جس کے وہ کسی متمدن اور ترقی یافتہ صحافت میں مستحق قرار دیے جاتے اور یہ تنہا میرا ہی خیال نہیں بلکہ خود صحافت اردو کے بعض نہایت ذمہ دار ارکان نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ صوبہ جات متحدہ کا نامور ترجمان اخبار ''الخلیل'' میرٹھ لکھتا ہے کہ:

> ''ملا رموزی صاحب کا مہذب ظرافت آمیز طرزِ نگارش اہلِ قلم میں اس درجہ مقبول ہو چکا ہے۔ جس کی داد سے ہم بالکل قاصر ہیں۔ ہمیں اس امر کا اعتراف بھی ہے کہ ملک ہند کی بدمذاق پبلک کی طرف سے آپ کے ساتھ کوئی موزوں حسنِ سلوک نہیں کیا گیا بلکہ اخبارات کے ایڈیٹر بھی اپنی ناگفتہ بہ مجبوریوں کے باعث آپ کی مفید اعانتوں کا بہترین اعتراف کرنے سے قاصر رہے ہیں''۔

(ملاحظہ ہو اخبار ''الخلیل'' میرٹھ، 8/اپریل 1928، ص:4، جلد 3، نمبر 27)

اب حوصلے، استقلال، خوش ذوقی اور خوش فکری کی قوتوں کو ہمیشہ کے لیے برباد کر دینے والے اس قدر عظیم الاثر حالات میں ملا رموزی کا صحافتِ اردو میں مذہب مقدس، ادب و اخلاق، سیاست و معاشرت اور اجتماعیات پر نہایت دلکش مضامین کا لکھنا اور پیاپے لکھنا بجائے خود ان کی ذہنی برتری اور مافوق الفطرت فضیلت کا جس درجہ اہم ثبوت ہے وہ اربابِ علم و تمیز سے پوشیدہ نہیں۔ پھر حقائق و معارف سے لبریز مضامین کی سطر سطر کا لطافت و شگفتگی سے مالا مال رہنا ملا رموزی کا وہ دلنواز و دلفریب کارنامہ ہے جس کی صحیح عظمت و منزلت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذاقِ سلیم کے ساتھ ہی علم و فضل کی دولت کے مالک ہیں۔ ان سے کیا غرض جو علم و انشاء کے زندگی بخش رموز و نکات سے بے بہرہ اور کورے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ملا رموزی کی تحریروں نے بحیثیت مجموعی زبان و ادب کے لیے خصوصیت سے کیا اثرات پیدا کیے، جن کی بنا پر ان کی تحریریں بحیثیت ایک ادیب کے لائق تنقید قرار پاسکتی ہیں؟

اس کے جواب میں اصولاً ہمیں ملا رموزی کے جملہ اسالیب انشاء پر ایک نظر ڈالنا پڑے گی۔ گو مختصر ہی سہی۔ پس ملا رموزی کی تحریروں میں چند خصوصیات ہیں:

1۔ ملا رموزی ایک ہی وقت میں تین خاص قسم کی طرز کے مالک اور موجد ہیں۔ ایک گلابی اردو دوسری نکاتی اردو اور تیسری اخباری اردو۔ گلابی اردو اور نکاتی طرز کے مضامین تو جس درجہ مخصوص ہیں وہ سب کے سامنے ہیں لیکن ان کی اخباری اردو سے بہت لوگ ناواقف ہیں مگر جن حضرات نے ان کے متین اور سنجیدہ مضامین پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ سادہ طرز تحریر ایک خاص قسم کے انداز اور پر جوش خطابت کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے جو ان کے معرکتہ الآرا اور تاریخی مضامین بہ عنوان ''اقطاب انگورہ'' اور ان کی تاریخی تالیف ''خواتین انگورہ'' میں موجود ہے۔

2۔ ان کے جملہ اسالیب انشاء میں پہلی چیز ایجاد یا جدت ہے اور اس ملکے میں وہ یہاں تک بڑھے ہوئے ہیں کہ ہر مضمون ایک نئے اور اچھوتے ذخیرۂ ادب و لطافت کا سرمایہ دار ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے پُر کیف مضامین سے جو بات پہلی مرتبہ سکھائی وہ مقابل یا حریف پر نہایت دل پسند اور شریفانہ رنگ میں اعتراض و نکتہ چینی کا ایسا سلیقہ ہے جس سے دشمن کبھی افسردہ نہ ہوا۔ دوسری بات تفنن کے ساتھ ساتھ واقعات نگاری کی کثرت اتنی کہ مضمون کی ظرافت مقصدِ تحریر نہ بن سکی اور مضمون میں کم بھی نہ ہوئی اور ان کا یہی وہ طریق نگارش ہے جو زبانِ اردو کے آنے والے اہلِ قلم حضرات کا مسلکِ تحریر قرار پا کر رہے گا اور آج بھی اس طرز کے متعدد مقلد پیدا ہو چکے ہیں۔

3۔ ادب و زبان نام ہے ان حالات و خواص اور افکار و تاثرات کا جو کسی خاص قوم کے حرکات و سکنات ہی سے پیدا ہوں نہ کسی دوسری قوم سے اخذ و نقل کیے گئے ہوں۔ پس اس لحاظ سے ملا رموزی کا ہر مضمون خالص ایشیائی یا ہندستانی مذاق و حالت کا وہ صحیح اور دل نشیں نمونہ ہوا

کرتا ہے جو ملٹن اور غزالی کی کتابوں کے حوالوں سے پاک ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے خالص ہندستانی مذاق و خیال ہوا کرتا ہے اور یہی نکتہ ان کی انشا کے قبولِ عام و خاص کا سبب بنا ہے اور صحیح معنی میں اسی کو ادب کہتے ہیں۔

4۔ کسی زبان یا ادب کی صحیح تعریف جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ کسی ملک کے باشندوں ہی سے بنے اور پیدا ہو۔ ملا رموزی کے اسالیبِ نگارش کی بلند تر کامیابی اور حسنِ قبول کا راز یہ ہے کہ ان کی تحریریں کسی مغربی ادیب کی تقلید نہیں بلکہ مشرقی خصوصاً ہندستانی خواص و تاثرات کا ایک نہایت فطری اور صحیح عکس ہوا کرتی ہیں۔ ان تحریروں میں نہ کسی غیر ہندی ادیب کا مقولہ ہے نہ کسی غیر ہندی کتاب کا حوالہ بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہی جو خود اہلِ ہند کے اعمال و کردار سے پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے اس کی تاثیری قوت بلند سے بلند تر ہوتی ہے۔ پھر ان تحریروں میں لطافت و ظرافت کی حلاوت اپنی جگہ پر ایک دلنواز حسن ہے جو بہرحال ناظر کو اپنی طرف شدت سے مائل کرتا ہے۔

5۔ مُلا رموزی ملک کے ان چند مگر کثیر الاعمال اہلِ قلم سے ہیں جو بہت سوچتے ہیں اور بہت لکھتے ہیں۔ کسی وقت یہ خصوصیت حضرت خان بہادر سلطان حیدر صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کو حاصل تھی، لیکن مُلا رموزی کے مضامین میں یہ خصوصیت سب پر غالب ہے کہ وہ سب سے دلچسپ ہوتے ہیں۔

6۔ زبانِ اردو میں مضمون نگاری نے ابھی ''واقعات نگاری'' تک ترقی نہیں کی ہے۔ پھر واقعات نگاری میں جان اصول یہ ہے کہ اصلیت نگاری ہو اور اصلیت نگاری میں یقیناً مُلا رموزی ہی کی تحریریں نمونہ اور مثال کہی جا سکتی ہیں اس لحاظ سے کہ ''اصلیت نگاری'' کا جو رنگ ان کی تحریروں میں موجود ملتا ہے اس کے مقابل دوسری لطیف تحریریں اس حسن سے عاری ہیں۔ اصلیت نگاری اس لیے ایک مفید اور ضروری چیز ہے کہ ناظرین ایک مضمون سے اس کے لکھنے والے کے اخلاق و کردار کو محسوس کر سکیں اور اس سے تحریر کا تاثیری پہلو اور اس کے مفہوم کی صداقت مسلم و مؤثر ہو جاتی ہے۔

کہنے کو بعض ایسی کتابیں ابھی طبع ہوئی ہیں جو بعض مشاہیر کی خود نوشتہ سوانح عمریاں ہیں اور

ان میں لکھنے والوں نے اپنے حالات وواقعات کے من وعن لکھ دینے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اگر انھیں غور اور نفسیاتی تحلیل کے ساتھ پڑھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اصل واقعہ نگار اس تحریر سے بہت دور ہے اور اگر یہ تحریر غلط نہیں تو صحت نگارش کا یہ کوئی واقعی نمونہ بھی نہیں۔ مگر ملا رموزی نے اصلیت نگاری سے ہمارے عہد کے فسانہ نگاروں اور دوسرے ارباب قلم کو جرأت دلائی ہے کہ وہ اپنے حالات وواقعات کو ان کے اصل رنگ میں پیش کریں۔ اس لیے کہ اب تک ہوتا یہ ہے کہ ہر مضمون نگار کسی واقعہ کو ایک شاندار کوٹھی، ایک اعلیٰ درجہ کے ڈرائنگ روم، فرسٹ کلاس ریل کے ڈبے اور عالی شان ہوٹل سے شروع کرتا ہے، لیکن ملا رموزی اگر ریل کے سفر پر کچھ لکھتے ہیں تو وہ خود کو تھرڈ کلاس کا مسافر لکھنے میں کبھی نہیں چوکتے۔ انھیں تھرڈ کلاس مسافر خانے میں بستر لگا کر بیٹھ جانے سے کوئی حجاب نہیں۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کسی واقعہ کو سمجھا سکتے ہیں تو اسی گھر میں شاندار ڈرائنگ روم پیدا نہیں کرتے، بلکہ بارش میں اپنے مکان کی ایک دیوار منہدم ہونے کے واقعہ کو گھر والوں کے استفسار پر یوں بیان کر دیتے ہیں کہ ''ہوا کیا؟ وہی کھڑکی والی دیوار گر گئی''۔ یہ ہے وہ اصلیت نگاری جس پر حسنِ نگارش بھی قربان ہے۔

مُلا رموزی کی اصلیت نگاری چونکہ ایک مؤثر طرزِ نگارش اور اصولِ انشاء کا ایک اچھوتا نکتہ ہے اس لیے اس نے ادب اردو کو ایک سلیقۂ بیان دیا ہے، جس کے اعتراف پر ملک کے ممتاز تر اربابِ فکر و فضل مجبور ہو گئے۔ چنانچہ منجملہ دوسرے جرائد و رسائل کے صوبہ جات متحدہ کا نامور علمی رسالہ ''نگار'' لکھنؤ لکھتا ہے:

> ''ملا رموزی صاحب کا مزاج تصنع سے بالکل پاک ہے۔ اس لیے ان کی تحریر میں جو کچھ ہوتا ہے اور ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں اصلیت بہت زیادہ ہوتی ہے''۔ (ملاحظہ ہو مجلّہ ''نگار'' لکھنؤ، ماہ مئی 1929 جلد 15، صفحہ:86)

7۔ ملا رموزی کے مضامین کو شہرت عام اور بقائے دوام دینے والی چیزوں میں ان کی ''قوتِ مطالعہ'' میں ''حسنِ مطالعہ'' ہے۔ یعنی وہ ایک معمولی سی معمولی اور ایک ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کو اس تکمیل اور خوبصورتی سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں کہ بے وجہ بھی ناظر اور مخاطب اس کو پڑھنے اور سننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ عام اور پیش پا افتادہ حالات پر اس خوش

اسلوبی سے قلم اٹھاتے ہیں کہ مخاطب پر حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ملا رموزی کی تحریروں میں نہایت بلند اور طاقتور سبب ہے جذبِ نگاہ اور حسنِ خطاب کا۔

8۔ ایک انشاء پرداز کا وسیع المعلومات ہونا تو ایک عام سی بات ہے لیکن دنیا کے ہر موضوع کو اپنا ذوق بنالینا ایک خاص بات ہے۔ ملا رموزی میں یہ بات ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس علم و واقفیت اور شانِ خصوصی سے گویا وہ برسوں اسی موضوع کے مطالعہ میں مصروف رہے ہیں۔ ان کی گلابی اردو کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ ملک کے ممتاز سیاست داں یا خالص سیاسی آدمی ہیں، لیکن جب ان کی ''نکاتی تحریریں'' پڑھیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اجتماعیات و اخلاقیات کے ماہر خصوصی ہیں۔ پھر زبان و ادب کے متعلق ان کی تحریروں میں جو تبحر اور بلند نظری نمایاں ہے وہ ان کے ادیب کامل ہونے کی دعویدار ہے اور ان کی تحریروں کی کچھ اتنی ہی خوبیاں ہیں جو آج ان کا شمار زبان و ادب کے ان ارکان یا مشاہیر میں ہونے لگا جن کے قلم سے زبانیں اور ادب زندگی پاتے ہیں اور اب کوئی محقق زبان اردو کی تاریخ یا اس کے اسالیب انشاء پر نہیں لکھتا، مگر یہ کہ وہ ملا رموزی اور ان کے اسالیب بیان کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اب تک جو بلند پایہ اور محققانہ تبصرے شائع ہوئے ہیں ان میں ملا رموزی کی تحریروں کے مبسوط حوالے موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے رسائل:

رسالہ ''الناظر'' لکھنؤ، جلد 34، صفحہ 22، جنوری 1928، رسالہ ''تحصیل'' علی گڑھ جلد 1، صفحہ 120، ستمبر 1926، رسالہ 'خضرِ راہ' لکھنؤ جلد 1، صفحہ 11 جون 1929

جنگ یورپ کے خاتمہ پر طبعی طور پر جماعت کے حالات میں انقلاب اور اخلاق و اجتماعیات میں فرق پیدا ہونا تھا جو ہوا۔ 1923 سے خصوصیات کے ساتھ عالم انسانیت میں امن و سکون کا دور شروع ہوا اور اس وقت دنیا کے کسی ملک میں ایسی خوں ریزی باقی نہ رہی اِلّا ریف کا جہاد اس لیے ملا رموزی کی گلابی اردو کو ختم ہو جانا چاہیے تھا جب کہ وہ ایسے ہی ہنگامہ گستر حالات کی سرمایہ دار ہوا کرتی تھی یا اسے مضمحل ہو جانا چاہیے تھا لیکن ملا رموزی نے قلم و انشاء کے اس میدان

میں بڑی آسانی سے ہٹ کر ادب واخلاق کا شعبۂ عمل اختیار کرلیا۔ یہ ان کے علم و دماغ کا ایک بہت ہی نازک امتحان تھا کہ آیا وہ ایک مخصوص طرزِ نگارش کے مالک ہونے پر کسی دوسرے طرزِ تحریر کے بھی واحد اور خصوصی مالک ہو سکتے ہیں؟ مگر سارے ملک نے تسلیم کرلیا کہ ملا رموزی میں یہ ملکہ خداساز ہی ہے کہ وہ جس طرزِ تحریر کو اختیار کرتے ہیں اس میں شانِ امتیاز واختصاص کو بڑی قابلیت سے پیدا کر کے چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ملا رموزی گلابی اردو کے طرزِ خاص کو چھوڑ کر مروجہ اردو یا روزمرہ اردو میں بھی اس درجہ مخصوص طرزِ تحریر مان لیے گئے کہ آج ان کی اس دوسری طرزِ نگارش کا یہ تیسرا مجموعہ میرے زیرِ نظر ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کے مخصوص مضامین کا یہ پانچواں مجموعہ ہے۔ یعنی ان کے تمام ایسے مضامین جو ایک ایک مرتبہ اخبارات اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، حسنِ خطاب کے اثر سے دوبارہ کتابی شکل میں لائے گئے ہیں مگر دوبارہ اشاعت پر بھی حسنِ قبول کا یہ عالم رہا ہے کہ آج یہ بھی نہیں مل سکتے اور ملک میں ان کی مانگ یا طلب برابر باقی ہے۔

اس دوسرے طرزِ تحریر میں جو اس وقت زیرِ بحث ہے ملا رموزی کے طرزِ نگارش کے وہ تمام خصائص موجود ہیں جو یا گلابی اردو میں پائے گئے یا صرف ان کے قلم ہی میں موجود ہیں لیکن جدت نگاری کے جو خاص پہلو اس دوسرے طرزِ نگارش میں موجود ملتے ہیں ان میں سب سے نمایاں ایک لفظ ''ننھے میاں کی والدہ'' ہے۔ یہ اصل میں ملا رموزی کی ایک تخیلی بیوی ہیں جن کے ذریعہ حق یہ ہے کہ ملا رموزی نے زبانِ اردو میں کردار نگاری، سیرت نگاری یا نفسیات پر لکھنے کا ایک ایسا بھی اچھوتا سلیقہ پیش کیا ہے کہ اس کی تقلید تو کی جا سکتی ہے مگر جواب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ''ننھے میاں کی والدہ'' سے منشاء فقط مسلمانوں کی معاشی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے نہایت نازک عیوب اور کمزوریوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح کرنا ہے۔ ایک بالکل ہی فرضی ''ننھے میاں کی والدہ'' کے نام سے وہ اخلاقیات پر جس حکیمانہ رنگین واقعات کو سلجھاتے ہیں اور جو اصلاحی مشورے دیے جاتے ہیں وہ محض انھی کی انشاء کا ایک کمال ہے جو بے انتہا لطیف و دلفریب ہے اور ان کی ایسی تحریریں اب عوام وخواص سے نکل کر خواتین میں بے حد مقبول ہو رہی ہیں۔

9۔ ملا رموزی کی تحریروں میں ایک دلکشا نکتہ ان کی قادر الکلامی ہے اور یہی مافوق الفطرت قوت

ہے کہ اگر وہ کہیں مترادف الفاظ کو لکھنے پر آجائیں تو اس مفہوم کا شاید لغت میں بھی کوئی لفظ باقی نہ ملے۔ ایسی تحریریں ادبی لحاظ سے زبان کی اصولی زندگی کو بڑھانے والی ہوا کرتی ہیں، جس سے اس میں بیان واظہار کی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ایک قوت ان کی تحریروں میں ''وضع الفاظ واشارات'' کا ایک خزانہ ہے لیکن وضع الفاظ میں کوئی مہمل اور بعید الفہم انداز اور ترکیب صرف نہیں کی جاتی بلکہ مفہوم اور معروف چیز کے ساتھ ان کا وضع کردہ لفظ کچھ اس موزونیت سے چسپاں ہوتا ہے گویا وہ لفظ اسی موقع کے لیے پیدا ہوا تھا۔ مثلاً کسی کی موت کے سلسلۂ بیان میں ان کا لفظ اِنّا لِلّٰہِ کا یوں استعمال کس قدر عام فہم مگر بے حد لطیف اور اچھوتا ہے کہ فلاں صاحب اِنّا للہ ہو گئے۔ اس طریقے سے حقیقت میں زبانیں وسعت پاتی ہیں اور ان میں حسنِ بیان کی مقدرت پیدا ہوتی ہے۔

10۔ ملا رموزی کی تحریر کا سب سے زیادہ قابلِ تعریف حسن یہ ہے کہ وہ جب نہایت گندے اور ناگفتہ بہ حالات کو بیان کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو وہ اپنے بیان کو اس حالت کی فحشیت سے اس خوبصورتی سے بچا لیتے ہیں کہ آفریں کہے بغیر چارہ نہیں۔

11۔ بے باکی، بے خوفی اور فاش گوئی ان کی تحریر کا وہ گرانمایہ جوہر ہے جس کی داد نہ دینا اصولی تعریف کی توہین ہے۔ وہ اپنے مخاطب کے عیوب کو اس شدت، اس جوش اور اس بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں کہ باید و شاید مگر بیان و اظہار میں جو سلیقہ ان کی تحریروں میں موجود ملتا ہے وہ زبانِ اردو میں اصلاح واعتراض کا ایک نہایت پسندیدہ ضابطہ ہے۔ وہ دشمن کے مقابل پورے جوش اور شدت سے لکھتے ہیں مگر حفظِ مراتب کا وہ لحاظ کہ دشمن بھی ان کے احترام پر مجبور ہو جائے۔

12۔ ان کے مضامین میں ''گریز'' ایک ایسی نمایاں خصوصیت ہے جس نے معلومات کا ایک انبار زبانِ اردو کو بخشا ہے۔ وہ کبھی اپنے مقرر کردہ موضوع کے تابع نہیں رہتے بلکہ اس کو پورا کر دینے کے سلسلہ میں وہ غیر متعلق باتیں اس کثرت سے بیان کر جاتے ہیں کہ ناظر کو خواہ مخواہ ایک موضوع میں دس موضوعات کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں پھر وہ بھی اس وسعت سے کہ تصور ان کے احاطہ سے مجبور رہ جاتا ہے۔

13۔ اگر ملا رموزی کی تحریروں کو اس لیے دیکھا جائے کہ ان کے دیکھنے سے ملا رموزی کے ''ادیب کامل'' ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے تو ان کی تحریروں میں ایسی اصولی چیزیں نہایت کافی تعداد میں موجود ہیں مثلاً ادیب کی یہ تعریف کبھی نہیں کہ وہ بہت زیادہ لکھنے والا ہو۔ اس کی بے شمار تصنیفات ہوں بلکہ ادیب کی تعریف یہ ہوگی کہ اس کی تحریریں زبان کے مسلمہ قواعد کے تحت نہایت صحیح ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرے خیال میں ملا رموزی کی تحریریں نہایت درجہ صحیح اور معتبر ہوتی ہیں۔

تحریر کی فصاحت، سلاست اور برجستگی کے ساتھ قادرالکلامی بھی ادیب کی شرط لازم ہے۔ ملا رموزی اس لحاظ سے بڑی شخصیت اور قابلیت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریروں میں آمد اور روانی کا ذخیرہ اس درجہ وافر ہے کہ اسے جانِ ادب کہا جائے تو غلط نہیں۔ محاورات بے حد صحیح اور افصح، تشبیہات و استعارات نہایت حسین اور باموقع جس کثرت سے ان کی تحریریں بہم پہنچاتی ہیں دوسری تحریریں یقیناً اس سے خالی ہیں۔ ان کے مضامین آئے دن ایسے لطیف الفاظ ڈھالتے رہتے ہیں جو زبان میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کے ادیب ہونے کا ایک راز ان کی تحریر کی تاثیری یا تقلیدی قوت ہے یعنی ملک کا ایک خاص طبقہ ان کی تحریروں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ وہ ان کی تقلید پر گامزن ہو چکا ہے اور آج بکثرت لکھنے والے ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ان کے اسالیب انشاء کی حرف حرف تقلید کر رہے ہیں۔ پس جو تحریریں اس درجہ وزن رکھنے والی ہوں کہ ان کے انداز پر دوسری تحریریں پیدا ہوں تو جس طرح یہ کارنامہ کسی زبان کی تعمیر و ترقی کا باعث ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے لکھنے والے کے ''ادیب'' ہونے کا نہایت کامیاب ثبوت بھی ہے۔

مجھے اطمینان ہے کہ میری بیان کردہ خصوصیات کو آپ اس مجموعہ کی سطر سطر میں جلوہ گستر پائیں گے۔ دعا کیجیے کہ خدا جلیل و مہربان ملا رموزی کو ایک فارغ اور خوشگوار ماحول اور شباب عطا فرمائے۔ آمین!

یکم جولائی 1929 از کوہ منصوری

◆◆◆

گلابی اردو

فیروزی دیباچہ

(از حضور مُلّا رموزی بقلم خود)

لمّا بعد! اے محترم سگریٹ پینے والو!!

خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمھارے اور واسطے اولاد اسکول میں پڑھنے والی تمھاری کی کے کہ نہیں ہے سگریٹ پینا تمھارا اگر امداد کرتے ہو تم یورپ والوں کے ساتھ دولت اپنی کی کے۔ پس بیڑی اور حقہ ہندستانی پیو تم اور پلاؤ تم دوستوں تمام اپنے کے کو تاکہ بیچ آخرت کے بدلہ پاؤ تم اس کا حق بدلے اپنے کے کا۔ پس البتہ تحقیق گواہی دیتے ہیں ہم اوپر اس کے کہ اللہ ایک ہے اور نہیں ہے کوئی شریک اس کا۔ پس جس کو کہ چاہتا ہے وہ بناتا ہے وہ مصطفیٰ کمال پاشا اور جس کو چاہتا ہے وہ بناتا ہے وہ مصطفیٰ کمال پاشا اور نہیں ہیں نبی پاک اس کے مگر نبی آخر زمانے کے بھی برحق۔ پس قربان ہو جیو جانیں ہماری اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

اب کیا کیا نعمتیں اس کی جھٹلاؤ گے تم؟

اما بعد! سنو تم اور اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں تمھاری کہ کیا زمانہ آ گیا زوال کا واسطے قوم مسلمان کے کہ ہو گئی ہے وہ ہر جگہ ذلیل اور خوار سبب سے بےعلمی اور نااتفاقی اپنے کے۔ مگر یہ ہے نتیجہ حاصل نہ کرنے تعلیم دین اسلام کا سبب سے کثرت کالجوں اور اسکولوں کے۔ پس جو مسلمان کہ نہ حاصل کریں گے تعلیم دین اسلام کو مکمل وہ فقط نصاب مذہبی اسکولوں سے نہ چھٹکارا پائیں گے

آگ سے دوزخ کی اور سوراج طلب کرنے والے کوتوالیوں سے اگر چہ بہت دن گزرے کہ مسٹر لائیڈ جارج شاگرد قدیم ہمارے نہ ہوئے وزیراعظم برطانیہ اونچی کے آئے عظمی کے۔ پس یہ ہے نتیجہ مظالم ان کے کا کہ کیے انھوں نے اوپر قوم مسلمان ترکی کے۔ پس تحقیق کہ گواہی دیتے ہیں ہم اوپر اس بات کے کہ جب تک کہ آزاد ہیں زنانِ بازاری کون حاصل کرے گا تعلیم اور کون حاصل کرے گا تہذیب اخلاق اور کون تجارت کرے گا بدلے غلامی ملازمت کے اور کون قدر پہچانے گا ملا رموزی صاحب کی حق پہچاننے قدر ان کی کا بھی۔ کون خطاب دے گا ملا رموزی صاحب کو بدلے خدمتوں ادبی ان کی کے بھی۔ کون موٹر دے گا ملا رموزی صاحب اور بیوی نیک بخت ان کی کو واسطے تفریح کے کہ نہیں ہے یہ سرزمین ملک ہندستان کی قدر دان کمال کی۔ مگر اچھے ہیں تاجرانِ چرم کانپور کے بہ سبب اس کے کہ تجارت کرتے ہیں وہ چمڑے کی اور قائم کیے ہیں انھوں نے مدرسے بڑے واسطے تعلیم مسلمانوں کے۔ اگر چہ مفید ہے ورزش دیسی واسطے ہندستانیوں کے بدلے ورزش انگریزی کے، مگر جب تک کہ زندہ ہیں پتلون پہننے والے ماسٹر اور پروفیسر ہندستانی تو نہیں ترک کریں گے مسلمان چائے پینا وقت صبح کے اور افیونی وقت دوپہر کے ساتھ کثرت بہت کے۔ پس تحقیق کہ یہ ہے وہ روگردانی ان کی طرف سے اخباروں مادری زبان اپنی کی کے۔ پس تحقیق کہ یہ ہے روگردانی ان کی طرف سے اخباروں مادری زبان اپنی کی کے۔ پھر کیا فائدہ تعلیم ایسی سے کہ نفرت کرے انسان چیزوں قومی باپ دادا اپنے کے سے۔ پس اگر ہو تم رکھنے والے عقل کے بیچ دماغوں اپنے کے تو غور کرو تم کچھ اوپر اس بات کے کہ کس طرح دور ہوگی عادت مسلمانوں سے مقدمہ بازی کی۔ اگر ہو تم ایمان لانے والے اوپر دوزخ اور آگ جلانے والی اس کی کے۔ اگر چہ بہت دن گزرے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نہ ہوئے صدر کانگریس کے باوصف دوستی سخت ہندو بھائیوں کے۔ مگر یہ ہے نتیجہ بند کر دینے اخبار "الہلال" ان کے کا۔ پس قسم ہے مس گوہر جان کلکتے والی کی کہ بڑی تکلیف پہنچتی ہے بیچ سفر تھرڈ کلاسوں ریل کے تمام ہندستانیوں کو روزانہ مگر نہیں توجہ کرتی آل انڈیا کانگریس ان کی۔ پس موت بہتر ہے زندگی ایسی کانگریس کی سے۔ اب دعا کرو کہ محبت دے اللہ مہربان قدرت والا ہندو مسلمانوں کو ساتھ ایک دوسرے کے محبت مضبوط اور زندہ رکھے اللہ ہم کو ساتھ فراغتوں تمام کے کہ کہا ہے: "یہ دعا ہم سے اور جملہ جہان سے آمین ہو جیو"۔

(16/ اگست 1926—10/ ربیع الاول 1348 اسلامی)

متانت اور ظرافت

متانت ایک ایسی قوت کا نام ہے جو انسان کو ہزل و یاوہ گوئی اور لہو پسندی سے باز رکھتی ہے اور جماعت یا معاملاتی زندگی کے لیے اس قوت کا ہونا بے حد مفید اور ضروری ہے۔ جن لوگوں میں متانت کی جگہ ہزل کا ی چھچھورا پن اور لہو پسندی کی قوت غالب ہوتی ہے وہ جماعت میں کوئی وزن اور اعتبار نہیں پا سکتے۔ ایسے لوگوں کے متعلق تجربہ کار لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کم عقل اور بے ذہن بھی ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل ایک قوت ظرافت بھی ہے جو اصل میں دماغ کی بہترین اور اعتدالی حالت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت سے انسان میں خوش ذوقی، خوش فہمی اور خوش فکری اور خوشگوئی بھی پیدا ہوتی ہے لیکن جب خوش گوئی حد اعتدال سے گزر جائے تو وہی ہزل یاوہ گوئی کہلاتی ہے اور جو خوش گوئی اعتدال کی حد میں رہے اور خوش فکری کسی لغو اثر کو شامل نہ کرے تو اس سے ہمت، شجاعت اور استقلال و عزم کامل کی قوتیں بھی بیدار ہوتی ہیں۔ کیونکہ خوش دلی اور خوش فکری کی کمی سے جبن، بے دلی اور بزدلی پیدا ہوتی ہے اور جہاں ظرافت و متانت حد اعتدال سے مل جائیں اصل میں شائستہ تر متانت اسی کا نام ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندستانیوں میں متانت کس عمل کو کہا جاتا ہے اور ظرافت کی کیا علامت ہے؟

سواس کے لیے آپ کو زندہ قوموں کے افراد پر نظر ڈالنا پڑے گا۔ ہم نے یورپ میں جرمنی اطالوی، آسٹروی، فرانسیسی، ترکی اور انگلستانی لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان میں کا جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم انسان بے حد متین اور بردبار ہونے کے ساتھ ہی بے حد لطیف اور ظریف بھی ہوتا ہے۔ ایک سولجر جو کبھی بندوق لے کر پہرہ دیتے وقت متانت اور بردباری کا مجسمہ بنا کھڑا رہتا ہے۔ وقت آتا ہے کہ وہ نوکری کے بعد کسی ہوٹل اور کلب میں اپنے بے تکلف احباب کے ساتھ انتہائی خوشدلی سے اپنے لمحاتِ فرصت کو رنگین بناتا ہے۔ یہی خوش فکری یا ظرافت اسے میدانِ جنگ کی تنگ و تاریک اور موت آور خندقوں میں شاد و مسرور اور دشمن کے مقابل اسے بہادر بناتی ہے بخلاف اس کے جس ہندستانی کو دیکھو فوراہی روتا آجاتا ہے۔ کیوں؟ اس میں زیادہ اثر ان کی قومی حکومت کا زوال ہے اور ایک زوال یافتہ قوم سے شادمانی اور خوش دلی قدرتاً چھین لی جاتی ہے۔ وہ غلامی کے عجیب العجیب مصائب واثرات میں یا محو ہوجاتی ہے یا حیران رہ جاتی ہے۔ اس کے افراد کی بعض نہایت صحیح قوتیں بے کار ہوجاتی ہیں۔ خصوصاً احساس و تمیز کی قوت کافی حد تک متاثر یا ماؤف ہوجاتی ہے۔ اس طرح کہ اس فقدان کو فقدان اور اس نقصان کو نقصان ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جیسے ہندستانیوں سے ان کا قومی اور ملکی لباس جاتا رہا مگر اسے ہندستانی اپنا نقصان ہی نہیں تصور کرتے۔ یا جس طرح ہندستانیوں نے اپنی ملکی اور مادری زبان اردو کو ترک کر کے انگریزی زبان کو اختیار کیا، مگر اسے اپنی غلطی ہی نہیں سمجھتے۔ زوالِ حکومت کے بعد اساتذہ یا تعلیم وتربیت کا اثر متانت کو ایک مکروہ اور غلط صورت میں ذہن نشین کرتا ہے۔ چنانچہ وقت آیا کہ ہندستان میں زوالِ حکومت کے بعد دینی مصلحین کی حکومت قائم ہوئی اور آج بھی اگر عوام ہند کی زیادہ تعداد کسی کے زیر اثر ہے تو وہ یہی دینی مقتدیٰ اور رہنما ہیں۔ پس مذہبی رہبروں نے یہ اندازہ کر کے کہ حکومت مذہبی کے احتساب واقتدار کے فقدان سے ہمارے احکام وارشادات کی تکمیل میں کوئی تامل نہ کیا جائے، ایک خاص قسم کا طریقِ ربط اختیار کیا جس سے مخاطب ہو کر مرعوب کرنا مقصود تھا۔ انھوں نے بقول مجلّہ علمیہ "نگار" بابت ماہ جون 1929 اپنے لیے ایک خاص قسم کا لباس اور ایک خاص قسم کی زبان ایجاد کی اور ان کی تحریر اور گفتگو میں ایک مخصوص رعب اور ایک بلند قسم کا غرور استعمال ہونے لگا، جس کے اندر لطافت، نرمی، خوش خلقی اور خوش ذوقی کی جگہ موٹے موٹے الفاظ

اور جملے ان کے مفہوم وخطاب کوادا کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ کہیں مخاطب ہمارے خطاب کی نرمی سے ہمارے مقابل شوخ اور دلیر نہ ہو جائے اور اسی جابرانہ اور حاکمانہ خطاب وتحریر کا نام انھوں نے وقار ومتانت رکھا اور آج بھی دینی رہبروں کی تحریر اور تقریر میں جو ملہمانہ اور پیغمبرانہ انداز و اقتدار پایا جاتا ہے وہ اسی اقتدار کو ظاہر کرتا ہے جس کے یہ لوگ عادی چلے آئے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کی تربیت میں رہنے والوں کے چہرہ پر خشکی اور نخوت نمایاں رہتی ہے، اسے کہتے ہیں متانت اور بردباری۔

ہندستانیوں کی موجودہ خشکی یا متانت کا ایک سبب تعلیم وتربیت کا غلط تر طریق بھی ہے۔ اگرچہ موجودہ تعلیم میں ایسے مشاغل بھی شامل ہیں جن میں دوستوں کو ایک جگہ جمع ہوکر تفریح وتفنن کے مواقع تعلیم سے بھی زیادہ بہم پہنچتے ہیں، مگر ان مواقع سے کوئی ایسا دل کشا اور تفریحی فائدہ اٹھایا نہیں جاتا اور یہ اسی لیے کہ تعلیم وتربیت میں نقائص موجود ہیں اور خود اساتذہ کے اندر ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں بخلاف اس کے طلبا میں ایسے مواقع پر بھی کبر، نخوت، رعونت، بناوٹ اور اکڑفوں کے جذبات کا اظہار اس لیے ہوا کرتا ہے کہ خود اساتذہ ان ذلیل حالات کے نمونے بنے پھرتے ہیں اور یہی تو ہے کہ ایک سوٹ پہننے والا ہندستانی ایک انگرکھا پہنے ہوئے ہندستانی کو ہنس کر سلام نہیں کرتا۔ سب غریب قسم کے جاہلوں کا تو ذکر ہی کیا؟ اس لیے تفریحی مواقع پر بھی شانِ انانیت دکھانے کو خلاصۂ متانت قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ متانت یہ بھی نہیں بلکہ رعونت ونخوت ہے۔

خشکی بڑھانے کا ایک سبب اشیاء خورد ونوش کی گرانی بھی ہے جس کا لازمہ افلاس تنگدستی اور محتاجی ہے اور افلاس کا نتیجہ بزدلی، بے شرمی، بے حیائی، غلامی اور فکرمندی ہے۔ پھر بے روزگاری جس کا لازمہ کسل، افسردگی، پستیِ خیال اور رنجیدگی۔ پھر امراض کی کثرت جس کا لازمہ یاس ونوامیدی، وحشت اور خطر اندیشی۔ پھر معاشرت اور معاش کی بے تہذیبی اور فضولی اس طرح کہ کمانے والا ایک اور کھانے والے دس۔ پھر بے علمی اور بے ہنری جس کا اثر بے حسی، غلامی اور گداگری۔

پس ان حالات میں رہنے والوں کے دماغوں میں ظرافت اور تفریح کا پیدا ہونا جس طرح مخل و غیر قدرتی بات ہے اسی طرح وہ نفسِ ظرافت یا معیارِ ظرافت کے سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں اور اسی لیے ہندستانیوں میں ظرافت کے دو حصے کر دیے گئے ہیں ایک صرف اس قدر کہ بس ہونٹوں پر ایک تبسم سا نمایاں ہو جائے۔ دوسرا حصہ یہ کہ ہنستے ہنستے لوٹ جایئے۔ حالانکہ اصل ظرافت معیاری اور اختیاری نہیں بلکہ فطری ہے، جس جگہ تبسم پیدا ہو تبسم کیا جائے اور جہاں بے اختیار ہنسی آئے ہنسا جائے۔

یہی ضابطہ ظرافت نگاروں اور ظریفوں کا ہونا چاہیے تھا کہ جس جگہ کوئی ظریف تر جملہ ادا ہو اسے روکا نہ جائے اور جہاں ان کی ظرافت تبسم سے زیادہ اثر پیدا نہ کر سکے وہاں قہقہہ پیدا کرنے کے لیے زور نہ دیا جائے۔

ظرافت یا لطیف تحریروں کو تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ عزیز و مقبول ہونا چاہیے تھا، لیکن ہندستان کا تعلیم یافتہ ہی اس سے نفور ہے اور جو شخص جس قدر زیادہ صاحبِ علم و فضل ہے اتنا ہی وہ خشک اور خاموش اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ظرافت کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ ایک فضول اور ذلیل سی بات ہے جس سے انسان کا وقار کم ہوتا ہے اور یہ اس لیے کہ وہ خود ایک مردہ اور خود پسند قسم کے ماحول کا صاحبِ فضل و علم انسان ہے۔ اور ظرافت کی یہی نسبت عہدِ حاضر کی تحریروں میں موجود ملتی ہے۔

چنانچہ جو اخبار یا رسالہ زیادہ بلند حیثیت کے اربابِ فضل کی ترتیب و تدوین سے شائع ہوتا ہے اتنی ہی اس کی تحریریں لطافت سے خالی اور خشک ہوتی ہیں۔ حالانکہ بلند سے بلند تحریر کو بلند سے بلند علمی ظرافت سے مؤثر اور دلکش بنانا انشاء و خطابت کا ضابطۂ مسلم ہے، مگر ایسا جو نہیں ہوتا تو اس کا ایک نہایت صحیح سبب یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے ہندستانیوں میں ظرافت اور لطافت کا مفہوم ہی ایک ذلیل اور نا قابلِ اعتنا سی بات سمجھا گیا ہے۔ پھر ظرافت اور لطافت کو ذلیل ملکہ قرار دینے کا سبب بھی دریافت کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ آج سے چند دن پہلے یا یوں کہیے کہ اربابِ ذوق و تفنن کی ازلی بد قسمتی سے سلاطینِ سلف کے درباروں میں ظرافت عروج پایا کرتی تھی اس لیے کہ یہ عیش پسند

لوگ اپنے اوقات کو رنگین و پرکیف بنانے کے لیے جن اسباب و وسائل کو جمع کرتے تھے ان میں شراب و کباب کے ساتھ ہی مطرب و مغنی اور خوش گو درباری بھی ہوا کرتا تھا اور اس کی خوش گوئی اور بذلہ آفرینی سے مسرور و شاد کام ہو کر یا خود سلاطین و روٴسا اسے مالا مال کر دیتے تھے یا خود ایسے لطیفہ گو لوگ اپنی ضروریات سے تنگ آکر سوال کی ذلت گوارا کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اور اسی وقت سے ظرافت و بذلہ سنجی نے ایک ذلیل پیشہ کی صورت اختیار کی اور ایسے بہار آفریں بذلہ سنجوں کو "مسخرے" کا بازاری خطاب ملا۔

پھر بادشاہوں کی بے ذوقی اور علم دشمنی سے تنگ آکر بعض اصحابِ علم وفضیلت نے اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر جب ان بادشاہوں تک رسائی کے لیے اپنے علمی تبحر اور سیاسی و ادبی کمالات کو پیش کیا تو علم شناسی اور ادب پروری سے ان ازلی بدنصیبوں نے ان کی ایک نہ سنی، لیکن جب یہی اربابِ علم وادب اور اصحابِ تمیز و فراست ان کے درباروں میں ایک ظریف اور بذلہ سنج کی حیثیت سے داخل ہوئے تو ان ادب ناشناسوں نے انھیں اپنے دل میں جگہ دی۔ چنانچہ شاہانِ بدمذاق کی اسی جہل ولہو پسندی سے متاثر ہو کر قاضی القضاۃ حضرت علامہ عبید زاکانی نے ان کی بدمذاقی اور مردم ناشناسی پر یہ تاریخی پھبتی کہی ہے کہ:

رو مسخرگی پیشہ کن و ہزل بیاموز
تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

پھر درباری ظرافت نے آخر عہد میں اس سے بھی ذلیل حیثیت جو اختیار کی وہ شاہانِ ہند کے درباروں میں جاہل اور بازاری ذوق کے "بھانڈ" تھے۔ حضرت بھانڈ کی پیداوار سے تو ہم بھی ناواقف ہیں مگر یہ ضرور معلوم ہے کہ امراء کے ذوق کو یا ملکۂ ظرافت کو ذلیل سے ذلیل تر بنانے میں ان بھانڈوں کا بہت زیادہ اثر ہے اور آج جو سنجیدہ طبقوں میں ظرافت پسند نہیں سوانھی گدھوں اور جاہلوں کی ناشائستہ حرکات اور فحش گوئی کے باعث ان بھانڈوں نے مجامع اور مجالس میں جن فحش اور لبریز ہزل حرکات اور لطائف کو رواج دیا، حق تو یہ کہ انھی نے آج ظرافت کی بلند پائیگی کو تباہ کر دیا اور اسی لیے آج ایک ظریف انسان کا تصور ایک نقال اور بھانڈ سے زیادہ نہیں۔ مگر یہی وہ موقع بھی ہے جب کہ ظریفوں کا نہیں بلکہ ظرافت کو سمجھنے والوں کے علم ذوق کا بھی اندازہ ہو جاتا

ہے کہ آیا وہ علمی ظرافت کے دلدادہ ہیں یا فحش اور بازاری ظرافت کے؟

یہ امر واقع ہے کہ علمی مذاق کے فقدان اور علمی مشاغل کی کمی کے باعث آج 95 فیصدی بازاری ظرافت اور فحش کو ظریف پسند کیے جاتے ہیں اور یہ محض تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ علمی ظرافت یا لطیف تحریروں سے لطف اندوزی اور ان تحریروں کی عالمانہ ظرافت سے جماعت میں اسی وقت لطف اٹھایا جائے گا جب خود جماعت کا ذوق علمی ہو جائے اور یہ تعلیم کے عام ہونے پر موقوف ہے اور وہ بھی ملکی ماحول کے مذاق کو پیدا کرنے والی تعلیم ہے۔

لیکن درباری ظرافت کی ذلت اور رسوائی نے علمی ظرافت کو بہت کافی حد تک متاثر کیا اور ظرافت اور ظریف کا جب مفہوم ہی ذلیل قرار دے دیا گیا اور اس لطیف تر ملکہ کو وقار و متانت کا دشمن سمجھا گیا تو اس عقیدہ اور خیال نے قدرتاً صاحب علم و فضل ظریفوں اور ظرافت نگاروں کو بھی متاثر کیا۔ اور ایسی مثالیں آج موجود ہیں جب عہد حاضر کے بعض نہایت بلند مرتبہ ظرافت نگاروں نے لطیف اور تفریحی تحریر اور مضمون نگاری کے ساتھ ہی خشک اور علمی تحریریں اس لیے زیادہ لکھی ہیں تاکہ عوام انھیں نرا ظرافت نگار ہی نہ سمجھیں بلکہ ان کی سنجیدہ تحریروں سے ان کی سنجیدگی اور علمی حیثیت کا بھی اندازہ کر لیں۔ ظرافت نگاروں کے اس عمل سے ادب اردو یا زبان اردو لطیف تحریروں سے کافی حد تک خالی رہ گئی۔ بدقسمتی سے خود ملا رموزی کے ایسے ''ملاقاتی'' یا شناسا موجود ہیں جنھوں نے بڑے عالمانہ انداز میں مشورہ دیا کہ آپ کوئی متین کتاب لکھیے یا متین مضمون لکھا کیجیے مگر اسے لوگ وہی ہیں جن کا علمی مطالعہ بس اپنی اپنی ملازمت کے دفتری کاغذات یا افغانستان کی بغاوت کی اخباری خبروں تک ہے۔ انھیں کیا خبر کہ لطیف تحریریں کسی علمی زبان کی روح اور ایک بالکل اصولی حصہ ہوا کرتی ہیں اور بغیر ان کے کوئی ایک زبان اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور اسی لیے یورپ کی حکیم دماغ قوموں کے ہاں ان کے ظرافت نگاروں کی وہ قدر و عزت ہے جو ہندستان کے بڑے سے بڑے افسر کو حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس لیے ضرورت اور قاعدہ ہے کہ لطافت نگاروں کو کبھی خشک یا ٹھوس علمی موضوع پر کبھی قلم ہی نہ اٹھانا چاہیے۔ جب کہ ظرافت نگاری کی دولت عام نہیں اور علمی تحریریں تو ہندستان کے بدھوا اور کلّو بھی بی۔ اے پاس ہو کر لکھ سکتے ہیں مگر عوام و خواص کی بدمذاقی سے جب فطری اور علمی ظرافت نگاروں نے سنجیدہ تحریروں پر زیادہ وقت

صرف کیا تو تحریری ظرافت ان لوگوں نے اختیار کی جنھیں صحیح معنی کی ظرافت چھو کے بھی نہ نکلی تھی اور یہ ایسے ہی کج مج مذاق کے ظریف ہیں جو آج کل اپنی بھونڈی ظرافت نگاری سے ادبِ اردو یا زبانِ اردو کی لطافت نگاری کو پست سے پست اور ذلیل کرتے جا رہے ہیں جس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام وخواص میں اب ظرافت کا صحیح مذاق ہی نہ رہا بلکہ آج انھیں جس قسم کی ظریف تحریر بھی مل جاتی ہے وہ اس سے اتنے ہی مسرور اور شاد ہو لیتے ہیں۔ جتنا وہ اکبر الٰہ آبادی یا مولانا سالک بٹالوی ایسے بلند مرتبہ ظریفوں کی تحریر سے خوش دل ہو سکتے ہیں اور اسی لیے ہے کہ نہ خریدارانِ جرائد ورسائل اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں سے کسی مخصوص اہلِ قلم کے مضامین کا مطالبہ کرتے نہ خود مدیرانِ جرائد اپنے اپنے پرچوں میں ظرافت کا کوئی امتیازی معیار قائم رکھتے۔ بعض نے ظرافت کا معیار یہ قائم کیا ہے کہ ہر اشاعت میں ایک نئے ظریف کا مضمون چھاپ دیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ دوسرے ظریف مضمون سے بہتر ہو یا نہ ہو۔ اس ترکیب سے فائدہ یہ ہے کہ کسی خاص مضمون نگاروں کو مسلسل معاوضہ ادا کرنا پڑے، مگر ایسے تجارتی مالکانِ جرائد کو خبر نہیں کہ ان کے اس طریق کا اسے زبانِ اردو میں لطیف تحریروں کا کوئی صحیح معیار ہی قائم نہیں ہو سکتا۔

اب ایک نظر ظرافت اور خوش دلی کی ضرورت پر بھی ڈال لیے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان پچھلی نصف صدی سے جن فکری اور ذہنی مصائب سے گزر رہا ہے اور اس کے اعمال ومشاغل میں جو تھکا دینے والی اذیتیں موجود ہیں ان سب کا لازمہ اور اثر ضعف اور افسردگی ہے اور ظاہر ہے کہ ضعف وافسردگی عمل وعملیت کے لیے زہرِ قاتل سے کم نہیں، اس لیے ضرورت اور بے حد ضرورت ہے ہمارے دماغوں کو تفریح وفرحت کی اور یہ تفریح ذہنی اور علمی تفریح ہو سکتی ہے جو خصوصیت سے ان لوگوں کے لیے مفید ولازم ہے جو قیادت ورہنمائی اور اصلاح وہدایت کی دماغ سوز ذمہ داری کے حامل ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ جب ہندستان محض ذہنی اور فکری میدان جہد وسرگرمی میں گامزن ہے تو اس کے ہر فرد کو ذہنی تفریح ہی شجاع اور حوصلہ مند بنا سکتی ہے اور اس لیے شدید ضرورت ہے ہماری صحافت وخطابت میں تفریح وتفنن کے رواج کی۔

اس کے بعد ادب وزبان کے لحاظ سے زبانِ اردو کا یہ حصہ ابھی ایسی بے شمار تحریروں کا

محتاج ہے جو لطیف اور پُر کیف ہوں۔ پھر ان تحریروں میں ایک سلیقہ ہو جو لطافت نگاری کو اصولی وقعت دے سکے اور اس کا بہتر طریق یہی ہے جسے ملا رموزی اپنی تحریروں میں رواج دے رہے ہیں۔ یعنی نری ظرافت نگاری سے مقدم واقعات نگاری ہے۔ یعنی تحریر کی غایت کوئی کام کوئی مقصد یا کوئی اصلاح و ہدایت اور ظرافت تحریر کا جزوی مقصد ہو اور یہ مقصد اسی وقت پورا ہوگا جب اردو میں بلند مرتبہ اربابِ علم و واقفیت اور اصحابِ فضل و فضیلت اس شعبۂ تحریر کو اختیار کریں مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اخبارات و رسائل اور خصوصیت سے ملک کی علمی و ادبی انجمنیں ایسے یکتائے روزگار ظرافت نگاروں کو تلاش کریں، ان کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنا بہت کچھ خرچ کریں۔ ایسے لطافت نگاروں کو قومی خطابات، انعامات، وظائف اور عطایا سے زندہ اور پیدا کیا جاسکتا ہے، لیکن کوئی ظریف ادیب ملا رموزی کی طرح دن بھر نوکری اور بندگی کی حاضری دے کر نہ زبان و ادب کے لیے کچھ کرسکتا ہے نہ دس پندرہ روپیہ فی مضمون کے حساب سے جرائد و رسائل میں زندہ رہ سکتا۔ لطیف تحریریں اگر زبان کا اصولی حصہ ہیں تو مضمون نگاروں کو اپنی تحریر کا علمی و ادبی وقار بھی بلند سے بلند تر رکھنا از بسکہ ایک اصولی ضرورت ہے۔ لطیف تحریر کو زبان و محاورہ کی اغلاط سے یکسر پاک ہونا زبان و ادب کی صحیح ضرورت کو پورا کرتا ہے، جو لوگ بکثرت لکھنے والے ہیں۔ مگر ان کی تحریر قواعدِ زبان کی رو سے غلط ہے تو وہ ادیب نہیں کہے جاسکتے بلکہ غلط اور مہمل نگاروں سے زبان ہلاک اور برباد ہوتی ہے۔

لطافت نگاری کو فحش الفاظ، گندے اشارات و استعارات اور مذموم و دل آزار جملوں اور فقروں سے قطعاً پاک ہونا چاہیے اور لطیف تحریر کا بلند سے بلند معیار یہی ہے کہ لکھنے والے وہی ہوں جو فطری اور طبعی ظریف ہیں اور انھی کا ذوقِ صحیح معنی کی بہاریں پیدا کرسکتا ہے۔

ان اعتبارات سے اب ملاحظہ فرمائیے تو اپنے ملا رموزی صاحب کے مضامین کو۔

◆◆◆

مطالعہ

لغت میں مطالعہ کے معنی معلوم نہیں کیا ہوں، لیکن اللہ بخشے اپنے بڑے مولوی صاحب کو وہ فرمایا کرتے تھے کہ مطالعہ کے معنی ہوئے دیکھنا اور مطالعے کے معنی ہوئے قوتِ حافظہ اور مطالعہ کے معنی ہوئے وسیع المعلومات ہونا اور مطالعہ کے معنی ہوئے واقفیت۔ مثلاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ جلاہوں کے متعلق آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ یعنی آپ جلاہوں سے بہت واقف ہیں، لیکن ہم یہاں مطالعہ کے معنی کریں گے دیکھنا اور اسی سے آئندہ بحث ہوگی خواہ آپ کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں یا وہ چیز آپ کو دیکھ رہا ہو یا دیکھ رہی ہو۔ اب مطالعہ کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً:

مطالعۂ نظر: یہ اس طرح واقع ہوتا ہے کہ کوئی چیز آپ کو جھانک کر ہٹ جائے اور آپ اسے بڑ بڑ کر دیکھا کریں مگر وہ پھر نظر نہ آئے۔ یا قدرتی مناظر کا دیکھنا یا باغ کے سبز زاروں اور لالہ زاروں پر آپ کا نظر ڈالنا اور خوش ہونا یا مہاراجہ صاحب محمود آباد کی لکھنوی کوٹھی کو اندر جا کر دیکھنا یا محلہ رائے سینا دہلی کے مکانات قیمتی 14 کروڑ روپیہ نقد کا معائنہ کرنا یا علی گڑھ کالج کی مسجد کو دیکھنا جس میں کالج کے تمام پروفیسروں کو نماز باجماعت کی نہ کوئی حاجت نہ سرکاری تاکید یا آگرے والی کا مجرا یا کلکتے والی کا رنگا رنگ لباس ملاحظہ فرمایا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے مطالعہ سے گو جذبات بھی متاثر ہوتے ہیں لیکن ان کا پہلا نظر سے ہے یعنی اگر کوئی:

نجریاں لاگی رے

کی ٹھمری کو اونچے اور صاف لہجہ میں گا رہا ہو، لیکن اگر اس کا لباس عمدہ نہیں تو مطالعہ مکمل نہ ہوگا۔

دوسرا مطالعہ جذباتی کہا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیکھنے کا کام بجائے آنکھ کے جذبات کرتے ہیں بلکہ جس چیز کے دیکھنے سے جذبات متاثر ہوں اسے جذباتی مطالعہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں آل انڈیا تنظیم کانفرنس کے سالانہ ڈنگل، دیوانِ داغ، طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدوں کا مطالعہ بھی داخل ہے۔ یا پھر جذباتی مطالعہ یہ بھی ہے کہ آپ کسی دوست کے دسترخوان پر کھانا کھانے سے انکار تو کر دیں، لیکن کھانے کی طرف چور نظروں سے دیکھتے بھی جائیں یا پھر دوست کے دسترخوان کو دیکھ کر آپ کو بھوک کی دوبارہ خواہش ہو تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے کھانے کا مطالعہ نہایت صحیح فرمایا۔ ایک مطالعہ یہ بھی ہے کہ آپ صبح کے وقت ''اشنان گھاٹ'' پر جا کر بیٹھ جائیں یا کھڑے ہو جائیں یا کسی درخت کی اوٹ میں چھپ جائیں اور پھر محلّہ کے کسی دوست سے بھی کہیں۔

''اماں اشنان گھاٹ پر چلا کرو بڑا مزا آتا ہے''۔

یہ بھی مطالعہ ہے کہ آپ کلاس میں ہیڈ ماسٹر کو بار بار اس لیے دیکھیں کہ وہ اونگھ رہا ہے یا سو چکا ہے۔ اور کیا یہ مطالعہ نہیں کہ کوئی تانگہ آپ کے پاس سے گزرے اور آپ اپنا چلنا بند کر کے اسے دور تک دیکھتے رہیں۔ یہ بھی مطالعہ ہے کہ آپ کسی چیز کو سڑک پر یوں دیکھتے جائیں کہ بجائے سیدھے چلنے کے آپ ترچھے چلنے لگیں اور کوئی سائیکل سوار آپ سے ٹکرا کر سائیکل کو تیزی سے چلا دے پھر آپ اٹھ کر کبھی کپڑے صاف کریں اور کبھی بھاگتے ہوئے سائیکل والے کو غصہ سے دور تک گھورتے رہیں، مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ یہ بھی مطالعہ ہے کہ بازار میں کنجڑوں اور جلاہوں کی لپاڈگی اور ہاتھاپائی پر آپ کھڑے تماشہ دیکھیں مگر ان کے درمیان صلح اس لیے نہ کرائیں کہ کہیں ایک آدھ ہاتھ ہمارے نہ پڑ جائے اور صرف دور سے آپ یہ کہتے رہیں:

''اماں بس بس تو اب جانے بھی دو''۔

یہ بھی مطالعہ ہے کہ آپ بندر کا ناچ دیکھتے رہیں لیکن جب وہ منہ کھول کر آپ کی طرف بڑھے تو گھبرا کر نالی میں جا گریں یا مداری کے تماشہ میں اس قدر محو ہو جائیں کہ اسکول میں

غیر حاضری ہو جائے۔

مطالعہ کی مذکورہ اقسام جذبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب اس جذباتی مطالعہ کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً کوئی ایسا مطالعہ جس سے خوف پیدا ہو جیسے رات کو سوتے سوتے آپ چارپائی سے گر پڑیں اور لاحول ولا پڑھتے ہوئے پھر چارپائی پر جا بیٹھیں یا بحالت خواب آپ چلائیں: ''ارے ہائے رے مار ڈالا۔ کھا گیا دوڑنا یہ آیا''۔ اس کے بعد آپ اپنے ننھے میاں کی والدہ سے کہیں: ''اجی کیا بتاؤں خواب میں دیکھا کہ ایک بڑا سا سانپ میرے اوپر حملہ کر رہا ہے''۔

یا کسی دوست کی بارات سے آدھی رات کو واپس آتے ہوئے کسی ویران سڑک پر آپ کو پولیس والے نظر آ جائیں اور آپ بے تحاشا اس لیے بھاگ کھڑے ہوں کہ یہ بھوت ہیں۔ یا کسی سانپ کو دیکھ کر آپ اپنے ساتھیوں سے کہیں: ''اماں مارتے کیوں نہیں ہو''۔ اور خود پیچھے ہٹتے جاؤ یا اپنے کسی عزیز کے آپریشن میں شفاخانے اس لیے نہ جائیں کہ ''خون دیکھ کر کہیں مجھ کو چکر آ گیا تو؟ یا میں خود چکر بن گیا تو؟ یا بے ہوش ہو گیا تو؟''۔

یا کسی کو بندوق چلاتے دیکھ کر پہلے سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا یا کسی بیمار کی چارپائی سے نزع کے وقت یہ کہہ کر چل دینا کہ ''ذرا حکیم کریم الدین کو اور لے آؤں''۔ یا قبر میں مردے کا منہ دیکھتے وقت یہ کہنا کہ:

''اشہد اللہ الہ۔ چلو چلو منہ ڈھانپ دو۔ خدا غریق رحمت فرمائے۔ سبحان اللہ چہرے پر کیسا نور تھا''۔

جذباتی مطالعہ کی ایک قسم مسرت خیز بھی ہے۔ مثلاً مکہ شریف سے کسی عزیز کو واپس آتا دیکھ کر مارے خوشی کے اس سے جھوم جانا۔ انتہائی بھوک کے وقت دسترخوان پر کسی لذیذ کھانے کو دیکھ لینا یا کوئی نیا سوٹ پہن کر اسکول جانا اور اپنے سایہ کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں سوٹ سے خوش ہونا یا کسی عطار کی دکان پر کسی دوا کو بھول آنا اور پھر وقت تلاش دوا کی پڑیا پر نظر پڑ جانا یا اپنے ننھے میاں کا گھر سے غائب ہو جانا اور آپ کا تلاش کرتے کرتے کوتوالی پہنچ جانا اور وہاں سپاہی کی گود میں

ننھے میاں کا بیٹھا ہوا نظر آ جانا۔

ان اقسام مطالعہ کے بعد اب علمی مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ گو اس میں بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً کوہ ہمالہ کی چوٹی پر صرف اس لیے چڑھ جانا کہ دیکھیں اگر انسان صاحب کو سطح ارض سے اس قدر بلندی پر رہنے کا موقع مل گیا تو از روئے حفظانِ صحت وہ وہاں مکان بنا کر رہے گا یا درختوں پر لٹک جائے گا اور اس قدر بلند جگہ پتلون کس قسم کی استعمال کی جائے گی؟ علمی مطالعہ اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب آدمی کتاب کو کامل شوق اور غور وفکر سے پڑھے اور سمجھے لیکن اصولِ زندگی یہ ہے کہ ابتدائی عمر ہی سے قاعدہ بغدادی مطالعہ کے لیے سامنے رکھ دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مطالعہ میں شوق کی جگہ حافظ جی کا لٹھ کام لیتا ہے اور اسی لیے مطالعہ کرنے والا مطالعہ کے اوقات میں بھاگ جانے، بیمار ہو جانے یا رونے کی کوشش کرتا رہتا ہے، مگر ماں باپ اسے ہر طرح مطالعہ پر آمادہ کر کے چھوڑتے ہیں اور وہ ''الف دوز براَن'' پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہونے کے بعد مطالعہ ماسٹر کی مار پیٹ کی مقدار کے موافق شروع ہوتا ہے۔ مثلاً جس ماسٹر کی مار پیٹ بحساب ایک درجن بید فی گھنٹہ ہے اس کے سبق کا مطالعہ بھی ایک گھنٹہ پابندی سے کیا جاتا ہے، مگر اس بھاگ جانے کے عادی نہیں ہوتے۔ ایسے طلبا کا مطالعہ نہایت کامیاب ہوا کرتا ہے۔

یہ بھی مطالعہ ہے کہ سال بھر ٹینس، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے آل انڈیا ٹورنامنٹ میں مارے پھرے اور امتحان سے ایک مہینہ پہلے کتابیں لے کر کبھی بیٹھے کبھی نہ بیٹھے اور کامیابی کی تمام ذمہ داری اللہ میاں پر ڈال دی۔ ایسے طلبا صرف عبارت کو یاد کرتے ہیں، مطالب کو نہیں سمجھتے اور پاس ہونے کے بعد کہیں کے کلرک ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی مطالعہ ہے کہ اپنے کمرے میں لگے ہوئے یا لٹکے ہوئے یا چپکے ہوئے نقشوں، آئینوں اور تصاویر کو کسی کرسی پر بیٹھ کر دیکھتے رہے اور کبھی اٹھ کر ہاتھ کے رومال سے کسی تصویر کے غبار کو صاف کر دیا۔ بوٹ پمپ اور سلیپر کو نہایت خوشنما قطار میں رکھتے رہے۔ میز پر کتابوں کا ایک خوبصورت حلقہ بنا دیا اور کوئی بڑی بھاری کتاب سامنے رکھ کر اس کے بیچ میں ایک پنسل رکھ دی

تا کہ لوگ سمجھیں کہ آج کل آپ اس زبردست کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں اور نصف کے قریب ختم بھی کر چکے ہیں۔

اصل مطالعہ یوں شروع ہوتا ہے کہ کوئی کتاب لی اور کمرے کے دروازے کو بند کیا۔ یا نیم بند کیا۔ یا کچھ بند کیا۔ یا کچھ کچھ بند کیا۔ یا بند ہی نہ کیا۔ یا بند کیا تو کیا ورنہ چھوڑ دیا۔ یا بند کرنا ہی بھول گئے اور کسی گزرنے والے سے کہا اور انگریزی زبان میں کہا کہ مہربانی فرما کر ذرا اس دروازے کو بند کرتے جایئے۔ یا خود بند کرنے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہ بڑھی تو بیٹھے بیٹھے دروازے کو تاکتے رہے۔ پھر کتاب اور پہلے سبق کا مشکل حصہ نکالا اور غور کیا کہ اس حصہ کو یاد بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پھر اس بات کا اندازہ کیا کہ اس کے مشکل الفاظ کے لیے ڈکشنری کو پاس رکھ کر بیٹھنا ضروری ہے یا نہیں؟ پھر ایک پنسل بھی پاس رکھ لی کہ جو معنی سمجھ میں آئیں گے ان پر نشان لگا کر صبح ماسٹر صاحب سے دریافت کرلیں گے۔ اس اہتمام کے بعد کتاب کو گنگنا کر شروع کیا، پھر چلا چلا کر پڑھنے لگے۔ پھر چپ ہو گئے اور پھر چلا پڑے، پھر اس شور کو تال اور سُر میں لائے، پھر آہستگی اختیار کی او پھر گنگنانے لگے اور پھر چلائے کہ دوسرے کمرہ والے سمجھ گئے کہ آپ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ اتنے میں عربی لہجہ میں عشا کی اذان شروع ہوگئی تو سینہ پر کتاب رکھ کر لیٹ گئے اور لیمپ برابر جلتا رہا۔ اُدھر اذان ختم ہوئی کہ اِدھر اتفاقاً آپ سو گئے اور صبح اس وقت بیدار ہوئے جب پڑوس کے کسی طالب علم نے آکر آپ کو بیدار کیا۔

اس قسم کا مطالعہ صرف کالجوں سے متعلق ہے، لیکن مدارس اسلامیہ عربیہ کا مطالعہ اس سے مختلف ہے۔ ان مدارس میں افغانی ذات کے وہ سن رسیدہ طلبا ہوا کرتے ہیں جو چوبیس گھنٹے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے کمروں میں بیٹھ کر مطالعہ کے عادی نہیں ہوتے بلکہ صحنِ مکان یا صحنِ مسجد انھیں پسند ہے۔ چارپائی میز کرسی وغیرہ کا انتظام تو ان کے لیے اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ان کی طرف رؤسا و امرائے اسلام متوجہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ علم دین کے طلبا ہوتے ہیں اور اب ترکوں کی طرح ہندستان کے مسلمان بھی علم دین سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اس لیے یہ غریب طلبا چند موٹی موٹی کتابوں کو تکیہ بنا کر ان پر سر کو جما دیتے ہیں اور کتاب کو سینہ پر تان کر یوں مصروف مطالعہ ہو جاتے ہیں گویا دنیا میں اب انھیں صرف یہی ایک کام کرنا باقی رہ گیا۔ اصل میں

یہی طلبا ہوتے ہیں جن کا مطالعہ صحیح معنی کا مطالعہ اور نفع بخش مطالعہ ہوتا ہے۔

اس مطالعہ کے بعد ایک مطالعہ دکانوں اور بازاروں میں بھی ہوتا ہے۔ کسی دکان پر دس بارہ حضرات گول میز بن کر بیٹھ گئے اور ایک قاری صاحب نے بیچ میں بیٹھ کر طلسم ہوشربا کو اس زور سے پڑھنا شروع کیا کہ راہگیر بھی کھڑے ہو جائیں۔ یہ قاری صاحب کبھی کبھی کتاب کے ساتھ سامعین کے اس بھرے مجمع میں لیٹ بھی جایا کرتے ہیں۔ کتاب اس بری طرح پڑھی جاتی ہے گویا اُسے رگیدا جا رہا ہے۔ شور اور تال دُسر کا سلسلہ بہت کم ٹوٹتا ہے۔ سامعین میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی بلکہ جس کا دل چاہے اور جب چاہے کتاب کی سماعت کے ساتھ ہی کسی پاس والے کے زانوؤں پر سر رکھ کر یا اس کے کاندھے کا سہارا لے کر سو بھی سکتا ہے۔ اس پر سامعین اس وقت معترض ہوتے ہیں جب یہ سونے والا خواب میں ڈر کر چلا پڑے یا اُس کی نیند کا خراٹا دکان سے باہر جانے لگے۔ سامعین کا شور تحسین و آفریں کبھی بلند ہوتا ہے کبھی پست، مگر اس شور سے قاری پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ بہت دیر میں صرف حقے یا بیڑی کے لیے سانس لیتا ہے اور پھر 75 میل فی گھنٹہ رفتار سے کتاب شروع کر دیتا ہے۔ سامعین کے حلقہ میں ایک شخص کے ذمہ حقہ تازہ رکھنے اور ایک کے پنکھا جھلنے کی خدمت ہوا کرتی ہے۔ بعض سامعین کتاب کی سماعت کے ساتھ ہی کپڑے بھی سیتے جاتے ہیں۔ اکثر سامعین پر غنودگی اور کھانسی کا غلبہ زیادہ ہوا کرتا ہے، مگر ان باتوں کا اثر کتاب پڑھنے والے پر نہیں پڑتا نہ اسے اس کا احساس کہ کتاب پر کافی روشنی بھی ہے یا نہیں؟ یا تازہ ہوا بھی آتی ہے یا نہیں؟ یا کتاب کی جلد بھی بندھی ہوئی ہے یا اوراق پریشاں ہیں؟۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ سامعین لکھے پڑھے بھی ہوں۔ اکثر سامعین گھٹنوں کے اندر سر ڈالے ملتے ہیں، مگر وہ آنکھ کھل جانے پر یہ ضرور کہتے ہیں سبحان اللہ واہ حضرت۔ اس پر کوئی پاس والا اگر ہوشیار ہوا تو اتنا کہہ دیتا ہے:

''اماں میر صاحب کتاب سننے آتے ہو یا سونے؟ لو ذرا پنکھا جھلو تو نیند جائے''

یہ بھی مطالعہ ہے کہ جب تمام کاموں سے فارغ ہو گئے یا شام کو تفریح کے لیے نکلے تو کسی لائبریری یا مفت کے ریڈنگ روم عرف پبلک روم میں جا بیٹھے۔ دس پانچ اخبار الٹے سیدھے کیے اور چلے آئے اور جو یہ ریڈنگ روم کسی دو منزلہ عمارت پر واقع ہوا تو ایک اخبار سامنے رکھ لیا اور

سڑک پر سے گزرنے والوں کا تماشہ دیکھتے رہے۔ دوستوں سے آ کر کہہ دیا:

''آج تو کوئی خبر ہی نہیں تھی''۔

گویا سوائے خبر کے اخبار میں اور تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔

یہ بھی مطالعہ ہے کہ کسی اخبار فروش کی دکان پر پان کا ڈبہ لے کر جا بیٹھے۔ اخبار فروش کو پان پیش کیا خواہ مخواہ کی دو چار باتیں کیں اور کوئی اخبار آہستہ سے کھینچ کر سامنے رکھ لیا۔ اگر اخبار فروش کسی گاہک سے مصروف ہو گیا تو آہستہ سے عینک نکالی اور اخبار لے کر دیوار کو سہارا دے کر اس طرح پڑھنے لگے گویا یہ اخبار براہ راست انھی کے پاس آیا ہے۔ چلتے وقت اخبار فروش سے کہہ دیا آج کے ''زمیندار'' میں کوئی عمدہ خبر نہیں۔ آپ تو ''سیاست'' منگایا کیجیے۔ ان لوگوں کی صورت سے اخبار فروش بہت بیزار رہا کرتے ہیں۔ ایسے مطالعہ کرنے والے صرف ہندو مسلم فسادات کی خبریں پڑھنے کے شائق ہوا کرتے ہیں۔

ایک مطالعہ یہ بھی ہے کہ اپنے محلے کے کسی ایسے ملا رموزی صاحب سے دوستی بڑھالی جن کے پاس بہ کثرت اخبارات اور رسالے آتے ہیں۔ ڈاک کے وقت آئے اور بڑے دوستانہ غرور سے حکم دیا:

''لاؤ یار آج کے اخبارات کہاں ہیں''۔

ملا رموزی صاحب نے مروت سے اخبارات سامنے پٹک دیے تو مطالعہ یوں شروع ہو گیا کہ اخبار کی ایک آدھ سطر پڑھی اور ملا رموزی صاحب سے فرمایا:

کیوں ملا صاحب آخر یہ افغانستان بھی ترکوں کی طرح کافر ہو کر رہے گا؟

اور کیوں ملا صاحب یہ اسمبلی کیا بلا ہے؟

اچھا اچھا تو یہ دہلی کی اسمبلی میں قوانین بنا کرتے ہیں۔ لاحول ولا میں تو آج تک اس اسمبلی کو کچہری سمجھا کرتا تھا۔

اور کیوں ملا صاحب یہ وائسرائے تو بس بیٹھا سرخ روشنائی سے دستخط کرتا رہے گا؟

اس طرح دو گھنٹہ ملا رموزی کا مغز کھا کر ایک ایسی لمبی سی جمائی اور ایک زور و شور کی انگڑائی لے کر اٹھے اور فرمایا۔

''اچھاتو آج صرف یہ پانچ اخبار ہی لے جاتا ہوں کل واپس کردوں گا''۔

ایک مطالعہ یہ بھی ہے کہ شام کو دوستوں کے مجمع میں کوئی اخبار منہ کے سامنے تان کر بیٹھ گئے اور لگے چلا چلا کر پڑھنے۔ان کو پڑھنے کا سلیقہ اتنا ہی ملتا ہے کہ ہر خبر کو لندن 4 راکتوبر سے شروع کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ گویا بغیر لندن اور 4 راکتوبر کے صرف اصل خبر کو پڑھ ہی نہیں سکتے۔ایسے اخبار پڑھنے والے اپنے مجمع کے تمام اندھوں میں راجہ ہوا کرتے ہیں جو چاہتے ہیں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر رائے ظاہر فرمادیتے ہیں۔

ایک مطالعہ یہ ہے کہ گھر سے دفتر جاتے وقت دو چار اخبار جیب میں ٹھونس لیے اور تمام راستہ پڑھتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ کہیں کہیں تانگے، موٹر، گاڑی، نالی، دیوار، بجلی کے کھم اور آدمی سے ٹکرا گئے تو صرف ارے لاحول ولا کہا اور پھر اخبار پڑھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

سب سے آخری مطالعہ یہ ہے کہ ایک منٹ میں چوبیس اخبار کھولے اور پڑھ کر پھینک دے۔ مگر تمام اہم امور کو ذہن نشین کر لیا۔ یہ مطالعہ لیڈروں اور ایڈیٹروں کا ہوا کرتا ہے۔

مذکورہ اقسامِ مطالعہ میں بہت کم ایسی قسمیں ہیں جن سے مطالعہ کا پورا فائدہ ناظر کو ہو سکتا ہے ورنہ تمام قسم کے مطالعے بے کار ہیں۔ یہ تمام قسمیں اُس وقت تک بے کار ہیں جب تک کہ آپ مطالعہ کا کوئی خاص مقصد مقرر کر کے مطالعہ نہ کریں۔

پس آپ ہر ایسی تحریر کا مطالعہ نہ کیجیے جس سے آپ کو کوئی علمی، ادبی، تاریخی، تجارتی، مذہبی یا اخلاقی و سیاسی معلومات حاصل نہ ہوں اور مطالعہ سے ذیل کے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کیجیے:

(1) اخبار یا کتاب پڑھتے وقت کامل سکون کی حالت پیدا کیجیے۔

(2) ایک پنسل لے کر مطالعہ کیجیے اور تحریرِ مطالعہ میں جو نئے الفاظ، محاورے اور مصطلحات ایسی ملیں جن کے معنی اور مطلب سے آپ نا آشنا ہوں، ان پر نشان لگا کر کسی سے ان کے معنی دریافت کر لیجیے۔اس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

(3) جس قدر شائستہ اور نئے الفاظ آپ کو ملیں انھیں گفتگو اور اپنی تحریر میں خود بھی استعمال کی کوشش کیجیے۔اسی سے آپ کی زبان اور تحریر طاقتور ہوگی۔

(4) اخبار میں جس قدر مقامات آپ کو ملیں انھیں نقشہ میں دیکھ کر یاد کر لیجیے اس سے آپ کی جغرافی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

(5) ہر خبر کو اس کے اسباب سے جانچ کر اُس پر رائے قائم کیجیے۔ بغیر اسباب کے سمجھے ہوئے رائے غلط قائم ہوتی ہے۔

(6) ہر پسندیدہ خبر یا عبارت پر کوئی خاص نشان لگا دیجیے تاکہ دوسرے موقع پر وہ آسانی سے مل سکے۔

(7) سوتے وقت محض نیند بلانے کے لیے کوئی مطالعہ نہ کیجیے یہ مفید ہونے کی جگہ مضر ہوتا ہے۔

(8) مطالعہ ہمیشہ اس وقت کیجیے جب مزاج میں اعتدال اور بحالی ہو۔ فرحت کے وقت مطالعہ نہایت مفید ہے۔ ہمیشہ اپنی مادری زبان کی کتابوں، رسالوں اور اخبارات کا مطالعہ کیجیے، اس سے آپ کا قومی اعتبار اور وقار بڑھے گا۔ فقط۔

◆◆◆

عید کے ارکانِ ثلاثہ

وہ جو کہا ہے کہ ساون کے اندھوں کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے سو مسلمانانِ ہند لاکھوں مصائب کا شکار ہو چکے ہیں۔ افلاس، تنگدستی، جہالت، نااتفاقی، فضول خرچی اور غلامی نے ان کے بل نکال دیے ہیں، ان کے بڑے بول کا سر ہر طرح نیچا ہو چکا ہے اور ان کی شہنشاہی اور حکمرانی کی رسی جل چکی ہے، مگر ان کے دماغوں اور مزاجوں سے ابھی وہ بل نہیں نکلے ہیں جو علامت ہوا کرتے ہیں کسی صاحبِ مقدرت اور شاہانہ اقتدار والی قوم کے۔ مسلمانانِ ہند چونکہ زوال نصیب ہیں، غلامی کی تربیت ہے ایک فاتح اور شاندار قوم کے افراد سے میل جول رکھتے ہیں، جہالت زدہ ہیں، ذہن و دماغ میں ایجاد و اختراع کی جگہ تقلید و نقل کی قوت پر زور پکڑ چکی ہے نیز خود ان کی پچھلے زمانے والی تاجدارانہ قومیت کی خو کبھی کبھی یوں تازہ ہو جاتی ہے گویا ابھی ابھی وہ ساری خدائی پر حکومت کا جھنڈا اڑا کر فارغ ہوئے ہیں۔ پھر وہ اب بھی دیکھتے ہیں کہ ترکی، مصر، افغانستان، یوکرین، بخارا، عراق اور یمن وغیرہ ایسی طویل و عریض زمینوں پر ان کے دینی بھائی آج بھی حکمراں ہیں تو ان کے دماغ میں تفاخر اور علو و سربلندی کے جذبات پھر تازہ ہو جاتے ہیں، مگر غلامی اور جہالت ان لائق احترام جذبات کو بجائے کسی مفید مقصد کے فضولی اور خانماں خرابی کی قوتوں سے بدل دیتی ہے۔ اس لیے عید کے موقع پر بھی وہ ہر طرح کی قیامت ڈھانے کو

تیار ہو جاتے ہیں۔

عید کا دینی اور شرعی مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان ایک عظیم الشان اجتماع کے ذریعے اپنے خدا کے رحیم ورحمان کی حمد وثنا اور رسولِ اسلام علیہ السلام پر درود وسلام کے بعد اپنے ملکی، بین الاقوامی، تجارتی، زراعتی، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور فکری حالات وقضایا اور ربط وتعلق کی خوشگواریوں میں استحکام پیدا کرنے کے وسائل سوچیں اور اس اجتماع سے کوئی اہم فائدہ اٹھا کر اٹھیں۔ جس طرح حجاز میں بعد فریضۂ حج سلطان شریعت نشان ابن سعود نے ایک ''آل مسلم کانفرنس'' منعقد کرنے کا طریقہ آغاز فرمایا ہے۔ یہی مقصد عید گاہ کے امام کے خطبے کا ہوا کرتا ہے کہ اس موقع پر قوم کا کوئی نہایت جلیل القدر اور صاحبِ علم وتدبر آدمی عید کی نماز پڑھائے اور اس اجتماع عظیم کے ایک ایک فرد کو خدائے عرش وفرش، نبی گرامی قدر اور قرآن حکیم کے وہ حکمت اثر احکام وضوابط بتائے جو ضامن ہیں دینی و دنیوی عروج وسربلندی کے۔ پھر ان احکام کے بعد وہ مسلمانوں کی سال بھر کی زندگی پر ایک جامع تبصرہ کر کے ان کی پچھلی غلط کاریوں پر تنبیہ اور آئندہ زندگی کے لیے کوئی ایسی منفعت بخش سبیل پیش کرے جو ان کی ملکی، دینی، بین الاقوامی، ادبی اور معاشی روایات وضروریات کو استوار و کامگار بنا سکے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عیدین کی امامت در یاست ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی، محمد علی، سر علی امام، شعیب قریشی، حسرت موہانی، ڈاکٹر اقبال اور آزاد سبحانی کو کرنا چاہیے تھا کیونکہ عید کے دن ہر وہ مسلمان امام ہو سکتا ہے جس کا دماغ خدائی احکام وضوابط کے ساتھ ساتھ دنیوی حالات وضروریات اور بین الاقوامی اسباب حفظ وعروج کی حکمتوں سے روشن ہو، لیکن مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ان کے ایسے اربابِ فکر وتدبر اصحاب عقل وتمیز ''نہرو رپورٹ'' پر تو تبصرے لکھیں، تقریریں کریں اور عید گاہوں کے اہم اسلامی اجتماعات کی صدارت اور رہنمائی کریں وہ جنھیں صدقہ، زکوٰۃ اور نیا لباس مع سرمہ اور کاجل لگا کر عید گاہ میں آنے کے احکام سنانے کے سوا کچھ نہیں آتا۔

پس اسی لیے ہے کہ 99 فیصدی مسلمان عید کا مقصد فقط سوئیاں کھانا اور بڑھیا لباس پہن لینا سمجھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایسے خیال اور عقیدے کے لوگوں کو اس دن جن لوگوں سے سابقہ پڑتا

ہے ان میں سب سے اول نمبر ''دھوبی'' کا ہے۔ لفظ ''دھوبی'' کا اطلاق بظاہر تو صرف اس حقیر انسان پر ہوتا ہے جو کپڑے دھوتا ہے اور بس، لیکن بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دھوبی کی ذات جماعت یا سوسائٹی میں نہایت اثر انداز اور تہلکہ ڈالنے والی ذات ہے۔ اس کے اثرات سے نہ فقط عوام بلکہ خواص اور خواصوں کے بھی خواص متاثر ہوتے ہیں۔ آپ یہی دیکھ لیجیے کہ یہ دھوبی جس طرح ہمارے آپ کے گھروں میں کپڑے لینے آجاتا ہے اسی آسانی اور بےفکری کے ساتھ وہ وائسرائے اور ملک معظم کے گھر بھی ڈٹ جاتا ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ پھر یہ کہ بظاہر تو دھوبی سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ:

''ابے میرے کپڑے اگر کل نہ لایا تو مارے جوتوں کے سر پر اٹھا کر دوں گا''۔

مگر بہ باطن وقت آنے پر اس کی خوشامد بڑے سے بڑا آدمی یوں کرتا ہے کہ:

''لو یہ تمھارا عید کا انعام اور اگلے مہینہ سے تمھاری تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیں گے، مگر دیکھو کپڑے وقت پر لانا۔ اچھا''۔

یہ بھی ثابت ہے کہ ''دھوبی'' عوام کی حیات وزندگی کا وہ جزو لاینفک ہے، جس سے قطع تعلق کرنا گویا اپنی شرافت اور ظاہری عزت پر دھبہ اور داغ لگانا ہے کیونکہ انسانی ضوابط نے ہر شخص پر اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوکر پہن لینا جب سے ممنوع اور مکروہ قرار دے دیا ہے اس وقت سے اس دھوبی کے اقتدار میں ''سائمن کمیشن'' ایسی شہنشاہی مقدرت پیدا ہوگئی ہے جو لاکھوں مرتبہ ''گو بیک'' کہنے پر بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے پارلیمنٹری جی میں سمائی ہوئی ہے۔ یہی حال دھوبی کا ہے۔ آپ اس سے لاکھ بار کہہ دیجیے کہ جمعہ کے دن صبح آٹھ بجے کپڑے لے آنا، مگر وہ لاتا بھی ہوگا تو اب نہ لائے گا۔ پھر دھوبی کے اس اقتدار اور غرور کا تو جواب ہی نہیں کہ وہ آپ کے کپڑوں میں سے جس کپڑے کو صاف اور شاندار پالیتا ہے اسے ایک ہفتہ پہلے تک وہ خود بھی پہن کر اکڑتا پھرتا ہے، مگر نہیں ڈرتا۔

دھوبی کی شان یہ ہے کہ وہ ایک تنگ وتاریک گلی کے ایک تیرہ وتار مکان میں رہتا ہے۔ اس مکان میں سب سے پہلے اس کا ''پارچہ بردار ٹٹو'' یا گدھا یا نیلام شدہ خچر بندھا ہوتا ہے۔ آپ کے اور تمام شریف لوگوں کے کپڑے دھوبی کے دالان اور کمرہ سے لے کر اس گدھے اور ٹٹو کے

''تھان'' یا ''اصطبل'' اور اس کی بول و براز و گھاس تک یوں بکھرے پڑے رہتے ہیں کہ اگر ٹٹو اور گدھا چاہے تو ان میں سے ہر قیمتی قمیض اور شیروانی کو آسانی سے کھالے یا چاب ڈالے۔ دھوبی کپڑے دھونے سے پہلے اپنے گھر میں انھیں یوں استعمال کرتا ہے کہ ان میں بازار سے سودا سلف لاتا ہے، انھیں بچھاتا ہے، اوڑھتا ہے، دھوپ رکنے کے لیے تان لیتا ہے اور انھیں پر اس کے ''ننھے میاں'' کھیلتے ہیں، کودتے ہیں، اچھلتے ہیں، دوڑتے ہیں اور پیشاب بھی فرما دیتے ہیں مگر دھوبی کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اگر کبھی نظر پڑ گئی تو اپنی 'اُن' سے کہہ دیا۔ ''اری دیکھ وہ لونڈا کپڑے خراب کر رہا ہے'' اور بس۔ دھوبی کے گھر میں بڑا اہتمام اس ''فیکٹری'' کا ہوتا ہے جسے دیسی قسم کے لوگ بھٹی یا بھٹہ کہتے ہیں۔ یہ بھٹی جب گرم ہو جاتی ہے تو پھر ٹھنڈا ہونا نہیں جانتی۔ جب کپڑوں کا تقاضا کیجیے یہی جواب ملے گا کہ ''میاں ابھی بھٹی چڑھی ہوئی ہے''۔

دوسری چیز دھوبی کا ''گھاٹ'' ہے جہاں وہ کپڑے دھوتا تو کیا ہے پھاڑتا ہے اور دھجیاں اڑاتا ہے۔ اس گھاٹ کی رونق یا مالکہ وہ ''دھوبن'' ہوتی ہے جو دھلے ہوئے کپڑوں پر نہایت بے فکری سے لیٹ کر اپنے بچوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلاتی ہے اور اسی حالت میں وہ ان کپڑوں ہی پر سو بھی جاتی ہے۔

حقیقت میں دھوبی کی ساری کائنات میں یہی دھوبن نہایت خطرناک چیز ہے۔ یہ دھوبی سے ہمیشہ چار ہاتھ آگے یا تین قدم آگے بولتی ہے اور بہت تیز اور تند بولتی ہے۔ اس کا پہلا ہی فقرہ انسان کی ازالہ حیثیت عرفی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ جب کہتی ہے تو صرف یہ کہ:

''دھرے ہیں کپڑے۔ وہ پچھلے مہینے کے دام تو دو۔ پھر کپڑے لینا۔ تو آپ کے ہاتھ کون جوڑتا ہے۔ اور کہیں دھلوالو''۔

ہمارے خیال میں دنیا کا بڑے سے بڑا مقرر، لیکچرر، فلسفی، منطقی اور وکیل دھوبن کے ''تقریری مقابلہ'' سے عاجز ہے کیونکہ اس کے ہر فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی آپ اس کے قرضدار ہیں اور اس کے اس فقرہ کا جواب دلوائیے کسی بڑے سے بڑے ''سرعلی امام'' سے کہ:

''میاں ایک روپلّی میں سارے گھر کے کپڑے کون دھو سکتا ہے؟''

اور جو دھوبن ذات ہے خوانخواستہ 'چھوٹی عمر' تو پھر پناہ ڈھونڈیے اس کی گفتار سے اور

''کردار'' کا عالم تو امیر خاندانوں کے افراد ہی سے دریافت کیجیے۔

اِن حالات کے ساتھ دھوبی عید کے زمانے میں نہایت جابر و ظالم حاکم کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ گویا اس زمانہ میں وہ بھی ایک قسم کا چھوٹا موٹا بچہ سقہ ہوجاتا ہے جس سے آج کل اپنے بڑے مولوی صاحب بھی پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ نصف رمضان ہی سے اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ:

''دیکھ بے یہ میرے عید کے کپڑے ہیں۔ ان پر استری نہایت عمدہ کرنا اور دیکھ یہ شیروانی ریشمی ہے۔ سنا کہ نہیں کہیں اسے بھٹی کی نذر نہ کردینا۔ اور دیکھ ''الوداع'' کے دن لے آنا اور یہ لے یہ سلک کا سوٹ ہے اسے بہت سنبھال کر دھونا اور سن ان دونوں پتلونوں پر استری ترچھی نہ ہوجائے اور میرے پاس اور پتلون نہیں ہے۔ ہاں ہاں انعام پہلے لے لینا۔ مرا کیوں جاتا ہے؟ اور دیکھ کہے دیتا ہوں اگر ''الوداع'' کے دن نہ لایا تو پھر تو ہے اور میں۔ گھاٹ ہی پر سے مارتا ہوا لاؤں گا۔ او لے یہ ''ننھے میاں'' کا کوٹ ہے۔ دیکھ لے یہ بھی ریشمی ہے۔ بس اس کے پھول خراب نہ ہوں ورنہ جان ہی سے مار ڈالوں گا۔ ابے تو پھر گن لے، ایک کم چالیس ہیں۔ نہیں ایک اوپر چالیس۔ ہاں ہاں چالیس اور یہ کیا ہے۔ اب تو ہوئے اکتالیس؟ لاحول ولا یہ تو ''اُن'' کا دوپٹہ ہے۔ بس اس کا رنگ نکال دینا تا کہ وہ لہریا رنگ لیں۔ اسے بھی ساتھ ہی لانا۔ لے یہ اُس مہینے کے سوا دو روپے اب دیکھ صرف چار آنے باقی رہ گئے۔ واللہ اب نہیں ہیں۔ اونہہ جیب یہ دیکھ چابیاں بول رہی تھیں جیب میں ہوتے تو دے نہ دیتا ہاں ہاں کوئی کوٹ ہوا تو وہ دے دوں گا۔ چل چل اس وقت تو دفتر جا رہا ہوں مگر سن کپڑے مرضی کے موافق ہوں۔ دیکھ پھر کہتا ہوں تہوار کا موقع ہے تنگ نہ کرنا''۔

ان تمام نصائح اور ہدایات کے بعد جب ''الوداع'' کا دن آیا تو آپ ہی کو فکر ہوگی کہ دھوبی نہیں آیا، مگر دھوبی کو آپ کی فکر نہ ہوگی اور وہ برابر دوسروں کے کپڑے دھو رہا ہوگا اور دے رہا ہوگا یہاں تک کہ جب چاند رات سر پر آجائے گی تو آپ اپنے نوکر کو دھوبی کی خدمت میں بھیجیں گے تو یہ دھوبی اس سے کہہ دے گا۔

''میاں بس تم چلو میں ابھی لایا۔ بس یہ ایک شیروانی اور رہ گئی ہے''۔

نتیجہ یہ کہ عشا کی نماز پڑھ کر آپ خود اس کے غریب خانہ پر جائیں گے تو یہ آپ سے ہنس کر کہے گا۔

''میں نے کہلا تو دیا تھا کہ ابھی لاتا ہوں۔ کیا کروں حضور ایک جان ہے۔ بس یہ حویلی والے حاجی جی کے اور رہ گئے تھے۔ انھیں بنا کر آپ ہی کے تیار کرتا تھا۔ ارے نہیں حضور آپ بھی تنخواہ دیتے ہیں۔ چلو چلو جانے بھی دو۔ نجوا کی قسم ابھی دو منٹ میں لایا۔ آپ چلیے تو بس ابھی لایا۔ کیا ہوں حضور وہ یہ نجوا کی ماں بیمار پڑ گئی کل؟ میاں روزی کی قسم کل تو برادری میں میت ہوگئی تھی نہیں تو میں کل ہی فارغ کر چکا ہوتا''۔

اب یہاں سے معاملہ دو ہی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یا آپ خون کے گھونٹ پی کر گھر چلے آئے یا وہیں بیٹھ گئے کہ بس اپنے سامنے بنوا کر لے جاؤں گا۔ گھر پر کپڑے دیکھ کر معلوم ہوا کہ کسی کپڑے کے داغ اپنی اصلی حالت پر ہی باقی ہیں۔ کسی کی استری ترچھی کی ترچھی ہی دھری ہوئی ہے۔ دوپاجامے دھوبی ہے کے گھر رہ گئے۔ کسی پر استری ہی ندارد۔ خلاصہ یہ ہاتھ آئے گا کہ آپ عیدگاہ تک اور عیدگاہ سے گھر تک کپڑوں کی خرابی پر تاؤ کھاتے جائیں گے اور تاؤ کھاتے ہی آئیں گے اور پھر لطف یہ ہے کہ آئندہ بھی اسی دھوبی سے کپڑے دھلوائیں گے کہ محلّہ میں اس کے سوا دوسرا دھوبی بھی کوئی نہیں رہتا۔

درزی:

ہندستان میں جب تک مشرقی تہذیب اور ملکی معاشرت کی حمیت اور عصبیت باقی رہی اس وقت تک ''درزی'' کی قیمت اتنی ہی تھی کہ گھروں کی ''مغلانیوں'' سے اگر کوئی کپڑا رہ گیا تو بازار میں درزی کے پاس چلا گیا، لیکن جب سے یہ یورپ کی ''سنگر مشینیں'' آئیں اور علوم جدیدہ نے ہندستانیوں کے قومی اور آبائی رسوم کے دیکھنے والے دیدوں کو بالکل ہی پٹم کر دیا یا گرلز اسکول قائم ہوئے تو ''بہو بیٹیاں'' تو رہ گئیں صرف زنانہ نمائشوں کی کشیدہ کاری کے لیے اور درزی صاحب ہو گئے ''ٹیلر ماسٹر''۔ اب نہ وہ آبائی لبادے رہے نہ شلوکے، نہ انگرکھے رہے نہ کرتے۔ اس لیے ماں بہنیں سوٹ تیار کریں تو کس طرح اس لیے درزی صاحب کی شان خواہ مخواہ دوبالا ہوگئی۔ پس

ہندستان کا درزی بھی اپنے وقت کا ''گورنر جنرل باجلاس کونسل'' ہوا کرتا ہے جسے شہری آبادی کے ہر حصہ پر ''درزیانہ مارشل'' جاری کرنے کے اختیارات حاصل ہوا کرتے ہیں۔

درزی نہایت شاندار آدمی ہوتا ہے۔ اس کی دکان کا ادنیٰ نمونہ تو یہ ہے کہ ایک پرانی سی مشین لے کر بازار یا کسی سڑک کے کنارے چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھ گئے اور اس طرف سے جس قسم کا گنوار اور کسان گزرا اس کے کپڑوں پر ''بخیہ'' کر دیا۔ ایسے تھرڈ کلاس درزیوں کے پاس کبھی کبھی محلے کے ایسے مفلوک الحال بوڑھے بھی چلے جاتے ہیں جو اپنے اسکول میں پڑھنے والے فیشن زدہ لڑکے کی شیروانی چاروناچار سلواتے ہیں۔ ان کی ناواقفیت سے یہ درزی فائدہ اٹھا کر کپڑا بھی چراتا ہے اور اجرت بھی دونی لیتا ہے، مگر شیروانی اس قدر غلط سیتا ہے کہ اسکول میں تمام فیشن شناس لڑکے اس شیروانی پر اعتراضات اور پھبتیوں کے جھاڑ باندھ کر اس بے چارے لڑکے کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔

درزیوں کا دوسرا طبقہ ''طبقۂ متوسط'' ہے کیونکہ طبقۂ اعلیٰ تو لندن میں رہتا ہے یا پیرس میں۔ پس یہی طبقۂ متوسط ہوتا ہے جو شب و روز ہندستانیوں کی گاڑھی کمائی کا خون پیتا رہتا ہے۔ مگر کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا اس قسم کے درزی کی دکان میں ایک سے لے کر دس تک سنگر مشینیں ہوتی ہیں اور برقی پنکھے نہیں تو برقی روشنی ضرور ہوتی ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کی سلائی آتی ہے۔ اس لیے ذرا مالداری کا نخرہ مزاج میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ درزی مسلمانوں کے لیے ماہِ رمضان کے آغاز ہی سے اذیت رساں ہو جاتا ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی عید کا خیال ابھی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر رمضان کی پہلی ہی تاریخ کو آپ کوئی معمولی کپڑا لے اس کے پاس چلے گئے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ بھی عید ہی کا کپڑا ہے، اس لیے اس کی اجرت دوگنی وصول کرتا ہے اور جو آپ اجرت کی زیادتی پر اس سے حجت کریں تو یہ کپڑا سینے ہی سے انکار کر دیتا ہے اور دوسرے درزی بھی چونکہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اسی لیے چاروناچار اسی سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ درزی سے خفا ہو کر کپڑا گھر میں لے آئیں۔ کیونکہ اب ''گھر کے لوگ'' تو سوٹ سینا جانتے ہی نہیں۔ اب جو آپ نے درزی سے کہا کہ:

''اچھا تو یہ لو دس روپیہ کا نوٹ اور باقی دوں گا کپڑے تیار ہونے پر مگر دیکھو بھئی

28 رمضان تک سب لے لوں گا اور ہاں اس شیروانی کا گلا ذرا ڈھیلا رکھنا کہیں پہلی شیروانی کی طرح تنگ نہ کر دینا۔ واللہ میں نے اسے کریما کو دے دیا۔ مجھ سے تو نہ پہنا گیا۔ نہیں نہیں ننھے میاں کی قمیض پہلے سینا ورنہ کیا گھر میں...

واللہ عید کے لیے ہے۔

ہاں تو پھر پرسوں آؤں؟

کیا بٹن؟ اماں بٹن وٹن تم اپنے طرف سے لگا دینا دام میں دے دوں گا''۔

آپ اس بکواس سے بھی کچھ زیادہ کہہ کر آ گئے اور اب اطمینان ہو گیا کہ عید سے تین دن پہلے کپڑے تیار ہو جائیں گے۔ اُدھر درزی صاحب نے لمبی سی انگڑائی لی اور آپ کے کپڑوں کو الماری میں یوں رکھ دیا گویا انھیں بارش بعد سینا ہے۔ اتفاق سے اگر ایک دن پہلے آپ درزی کی دکان کے سامنے سے گزرے اور آپ نے یاد دہانی کر دی تو درزی صاحب نے نہایت یقین اور زور سے فرمایا:

''بس کل اسی وقت آ کر لے جایئے گا۔ سب تیار ہیں۔ صرف شیروانی کا کالر رہ گیا ہے۔ مگر کچھ روپے ہوں تو دے جایئے۔ آج ضرورت ہے اور کوئی گاہک بھی نہیں آیا ورنہ میں آپ سے ہرگز نہیں مانگتا''۔

اس پر آپ نے بقیہ دام بھی ادا کر دیے اور اب آپ کو بالکل قطعی حتمی یقینی اور آخری اطمینان ہو گیا کہ کل تو کپڑے ہر حال میں مل ہی جائیں گے مگر درزی صاحب دوسرے گاہکوں سے کپڑے برابر لیتے رہے اور سیتے رہے لیکن آپ کے کپڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اب آپ عین وعدہ کی تاریخ پر پہنچے تو درزی صاحب نے بڑی آؤ بھگت اور بڑے تپاک سے آپ کو بٹھایا مگر فوراً ہی آپ سے سوال فرمایا:

''کیا آپ چوک کی طرف جا رہے تھے؟

ہاں تو میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ چوک تک تفریحاً جائیں تو اس وقت میں بٹن بھی لگا دوں گا کیونکہ وہ دھاری والے کوٹ میں بس بٹن رہ گئے ہیں''۔

روزہ کی حالت میں شام کے وقت چوک تک جانا ویسے بھی داخلِ ثواب ہی سمجھا گیا ہے۔

اس لیے آپ نے بھی سوچا کہ چلو چوک تک ویسے ہی ٹہل آئیں۔ وقت بھی گزر جائے گا اور کپڑے بھی تیار ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر آپ چوک تک گئے اور واپس جو آئے تو دکان ہی بند یا درزی صاحب ندارد۔ دکان کے دوسرے ملازمین نے کہہ دیا زرا وہ بھی چوک تک چلے گئے ہیں۔ اب وہ آپ کا عید سے تین پہلے کا اطمینان تو گیا گزرا۔ عید کی شب کو آپ نے درزی صاحب کو دیکھا۔ اِدھر درزی صاحب نے آپ کو دیکھتے ہی انتہائی شریفانہ لہجہ میں گفتگو شروع کی آپ نیچی نظروں سے سنتے رہے اور پھر آپ سے جس طرح بھی ہوا تین گھنٹہ کی فرصت یا مہلت اور طلب کر لی اور آپ پھر تاؤ کھاتے ہوئے گھر آگئے تو آپ کی ''وہ'' بولیں:

''کیا اب بھی کپڑے نہیں لائے؟

تو آخر سبب؟

تو کیا بچہ اس عید پر بھی ننگا ہی رہے گا؟

اجی چولھے میں جائے اس کا وعدہ میں تو بیٹھی تھی کہ اس وقت وہ جاگ رہا ہے، اسے ایک مرتبہ پہنا کر دیکھ لوں گی۔

تو پھر دکان ہی پر بیٹھے رہتے۔ یہاں آنے کی کون سی ضرورت تھی۔

تو میں نے کہا تھا کہ تم اس بے ایمان کو کپڑے دے آؤ۔ ہزار بار تو اس کا تجربہ کر لیا۔ خدا جانے تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟

اور وہ میری شلوار؟

اچھا کھانا قسم، سب دام دے دیے؟

ہاں ہاں مجبور تو ہوں کہ شیروانی سینا مجھے نہیں آتا ورنہ میں تو اب تک ایسی دس شیروانیاں سی کر پھینک دیتی۔ بھلا بچہ کی شیروانی بھی کوئی شیروانی ہوتی ہے جو اس بے ایمان نے اتنی دیر کی۔''

والدۂ ننھے میاں کی اس جرح اور بدظنی سے آپ کو درزی پر پھر تاؤ آیا اور سگریٹ پھینک کر آپ پھر اس کی دکان پر پہنچے۔ درزی نے پھر تپاک سے آپ کو بٹھایا۔ اب فرق یہ ہوا کہ دو چار کپڑے تو تیار پیش کر دیے اور بقیہ کے لیے پھر وہی ایک گھنٹہ اور کی مہلت۔ اب آپ کے قابو سے باہر ہونے کے لیے کون سی رُکاوٹ تھی، اس لیے آپ نے بھی...

اے مردود تو نے مجھ سے وعدہ ہی کیوں کیا تھا؟
رکھ یہاں کپڑوں کی قیمت
اب میرے کس کام کے تیرے کپڑے۔نہیں نہیں مجھے نہیں لینا۔
تو تو نے سمجھا کیا تھا؟
اور یہ تو دیکھ بے ایمان یہ تو نے شیروانی کا گلا تو ویسا ہی رہنے دیا۔
اب کیا خاک درست کرے گا۔وہ تو ہوگئی غارت۔
کیا میں۔اے میں تیرے باوا سے وصول کرلوں گا۔کیوں زبان خراب کراتا ہے۔
حضور کا بچہ۔بے حیا کہیں کا۔اے تو میں کہتا ہوں کہ پھر آخر تو نے یہ پہلے ہی کیوں نہیں کہہ دیا تھا۔''

درزی کی دکان ظاہر ہے کہ بازار میں ہوا کرتی ہے۔اب آپ کی اس لب سڑک تو تو میں میں سے دو چار منٹ ہی میں خاصا ہجوم ہوگیا اور اب علاوہ درزی کے آپ کو راہگیروں کے سوالات اور جرح کا بھی مقابلہ کرنا پڑا:

''اماں قصہ وصہ کیا ہے۔اس اللہ کے بندے کو میں نے پندرہ دن پہلے یہ کپڑے دیے تھے اور تاکید کردی تھی کہ ''الوداع'' کے دن سب دے دینا،مگر یہ آج تک ٹالتا رہا۔
آپ ہی بتایئے کہ یہ صبح ہے عید اور کپڑوں نے ابھی تک سلنے کا نام نہیں لیا۔یہ کلہم پانچ کپڑے تیار ہوئے ہیں اور دیکھیے تو ذرا یہ اس نے شیروانی سی ہے؟
مجھے اپنے کپڑوں کا تو اتنا خیال نہیں جتنا کہ بچے کے کپڑوں کا ملال ہے۔آپ ہی کہیے کہ اُس معصوم بچے کو آج کے دن کیا یہی شیروانی پہنا دوں؟
ارے صاحب یہ کون نہیں جانتا،مگر آپ ہی انصاف کیجیے کہ اس میں بھی کیا میری ہی خطا تھی؟
اس وقت تو روزہ دوزہ بھی نہیں ہے۔
میاں چھ روپے فی شیروانی دیے ہیں۔
اونہہ یہ دیکھیے بخیہ تک نہیں کیا۔

جی نہیں آپ نے بولیے میں تو آج اس مکار کو درست کر کے چھوڑوں گا۔

دیکھیے تو آپ بالکل نہ بولیے۔ اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ ہاں ہاں میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تو اس سے بھی تو کہیے کہ اس نے ابتدا کی یا میں نے۔

اجی حضرت یہ یوں تھوڑا ہی باز آئے گا۔ وہ پیش کار صاحب بھی ابھی یہی شکایت لیے کھڑے تھے۔

ہاں ہاں تو وہ تو اس نے اپنی عادت ہی بنالی ہے۔

اماں بس بے غیرت آدمی ہے۔

لاحول ولا۔ استغفر اللہ!

خدا گواہ ہے اس کے ماموں کی آنکھوں کا خیال ہے۔ وہ بے چارہ اس قدر بے زبان آدمی ہے کہ آپ سے کیا بیان کروں، مگر یہ میاں نکلے ہیں اپنے وقت کے تیس مار خاں۔ ملنے لگے ہیں نہ اب دو پیسے"۔

غرض سرِ بازار اس قدر تو تو میں میں پر جب بازار کے لوگ آپ کو ٹھنڈا کر چکے تو آپ خاموشی سے دکان پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں درزی صاحب نے کپڑے الٹے سیدھے کر کے آپ کے حوالے کیے، مگر اس طرح کہ کپڑوں میں دو چار عیب ایسے ضرور باقی رہ گئے جن کو دیکھ دیکھ کر عید گاہ تک آپ کا خون کھولتا رہا۔

بعض مواقع پر یہ بھی ہوتا ہے کہ درزی صاحب عید سے دو ایک دن قبل ہی کپڑے لے کر کسی دوسرے شہر کو بھاگ جاتے ہیں اور اسی طرح بعض تیز قسم کے روزہ دار مع درزی کو توالی میں بھی دیکھے گئے ہیں۔

چمار:

اب تو کیا، مگر ہاں آج سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ چمار بھی بڑی چیز ہوا کرتا تھا۔ اس کے اقتدار کا زور بھی عید کے موقع پر بے حد اذیت رساں ہوا کرتا تھا، لیکن جب سے ہندستان میں یورپ کے علوم جدیدہ اور فنونِ لطیفہ آئے دیسی چمار کا زور کسی قدر گھٹ گیا۔ ڈاسن کی چمار گردی نے ہندستان میں "چماری ذوق" کو بیدار کیا۔ اِدھر غلامانہ تربیت نے ہر غیر ملکی چیز

سے محبت کرنا سکھادیا۔ اس لیے ڈاسن کے جوتے آئے اور بڑی سے بڑی قیمت پر ہندستانیوں کے ''سرمنڈھے گئے''۔ پھر ہائی اسکولوں اور اسلامیہ کالجوں سے جو نوجوان ''تعلیم یافتہ'' ہوکر نکلے انھوں نے ماسٹروں اور پروفیسروں کی غلامانہ یورپ پسندی کے صدقہ سے اپنے ہاں کا دیسی تیرہواں، چودھواں اور پندرھواں چھوڑ کر ''چھ چار۔ سات اور آٹھ چار'' خریدنا شروع کردیا تو ''چرم سوادا کبرآباد'' میں ''فٹ ویئر'' اور ''ویلیتھ فیکٹری'' قائم ہوگئی۔ اُدھر پنجاب کو ''دی بھلّہ شو فیکٹری'' نے ان انگریزی جوتوں سے مالا مال کردیا پھر اپنے ہاں کے چماروں نے بھی یورپ کے جوتوں کی تعلیم جو دینا شروع کیا تو ہزاروں بی۔ اے پاس اشراف ہند ''جوتا ساز''، ''جوتا گر''، ''جوتا شناس'' اور ''جوتادان'' ہوگئے، لیکن جس طرح شادی کے پیغام میں علاوہ تعلیم و تنخواہ کے سارے خاندان کے ارکان کا تذکرہ بھی اس روشنی کے زمانہ میں کہیں کہیں ضروری سمجھا جاتا ہے اُسی طرح آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اب بھی دیسی جوتا ہی پسند کرتے ہیں اور تعداد کے لحاظ سے ایسے ہی جوتا پسند افراد زیادہ ہیں۔

پس ایسے لوگوں کے لیے ''دیسی چمار'' عید کے موقع پر اذیت اور نقصان کا خاصا سامان فراہم کردیتا ہے۔

اس دیسی چمار کی شان یہ ہے کہ یہ شہر کے ایک ایسے گندے اور تاریک حصہ میں رہتا ہے جہاں شہر کی میونسپلٹی کا ایک ''کوراکرکٹ گھر'' بھی ہوتا ہے۔ اس کا کمرہ یا کوٹھری تاریکی اور تعفن اور غلاظت کا چھوٹا سا کارخانہ ہوتی ہے۔ اس کے اہل وعیال کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ الاماں کہیں جسے اور پھر اس کے بال بچوں کا میلا پن اور شوروغوغا وہ کہ ''والحفیظ'' کہیں اسے۔ بقدر ستر دھوتی کے سوا ''یہ چمار'' دوسرا کپڑا اسی وقت استعمال کرتا ہے جب اسے کسی قومی پنچایت میں جانا از بس کہ لازم وضروری ہوجاتا ہے، مگر اس کے لال پیلے جوتوں سے آج ہندستان کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ اشراف ہند کی بھی بات بنی ہوئی ہے۔ یہ بہتر سے بہتر جوتے کے دام آج بھی سوا چار روپے سے لے کر پانچ روپے تک ہی لیتا ہے اشراف ہند تنگدستی کے باعث۔ اس دیسی چمار کا خاصۂ فطرت یہ ہے کہ گاہکوں کی کثرت سے بھی دل تنگ نہیں ہوتا بلکہ اس کے جس قدر گاہک آئیں یہ سب کی فرمائشیں قبول کرتا جاتا ہے۔ یہ ہر گاہک سے

چار دن کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کے ہاں تیار شدہ جوتے نہیں ملتے بلکہ تازہ بہ تازہ اور نو بنو بہم پہنچاتا ہے۔ یہ جب جوتا بنانے کے لیے ''زبان کر لیتا ہے'' یا ''زبان ہار دیتا ہے'' تو اسے اسی وقت بیعانہ کے طریق پر کچھ رقم دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ درزی اور دھوبی کی طرح یہ بھی عید سے ایک دن قبل جوتا دینے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ اس کے ہاں غریب لوگ اپنا، اپنے ننھے میاں کا، ننھی کا، والدہ کا، خالہ کا، دادی کا، نانی کا، چچی کا، پھوپھی کا، بہو کا اور موقع ملا تو ملازمہ کا بھی جوتا بنواتے ہیں۔ چونکہ یہ چمار ان جوتوں پر طلائی اور نقرئی رنگ کے ستاروں کے پھول بیل اور نقش و نگار فرماتے ہیں اس لیے غریبوں کے بچے عید پر ایسے جوتوں کا بڑے شوق سے انتظار کرتے ہیں اور تقریباً روزانہ ہی اپنے ''ابا میاں'' سے تقاضا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے ابا میاں چمار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو وہی ''درزیانہ رنگ'' نظر آتا ہے۔ بس کل لے جانا حضور مگر یہ ''کل لے جانا حضور'' بھی عین عید کی رات ہی کو پورا ہوتا ہے۔ پھر اضافہ یہ کہ جوتا جو گھر لائے تو یا ''بالکل تنگ۔ یا بالکل ڈھیلا''۔ درزی اور چمار کی لڑائی میں صرف اتنا فرق ہے کہ چمار کی تو تو میں میں اس کے ''ننھے کی ماں'' بھی حصہ لیتی ہے اور دھوبن سے کچھ زیادہ بول لیتی ہے۔ چمار کے تحمل کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر گالی پر وہ ہنس کر ''بس بس حضور'' کہہ دیتا اور سر نیچا کیے جوتا سینے میں مصروف رہتا ہے۔

یہ ہیں عید کے وہ ''ارکانِ ثلاثہ'' جن سے ہزار بار توبہ کے بعد بھی ہر عید پر معاملہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی ذات سے علاوہ بے شمار بداخلاقیوں کے بے قیاس و بے اندازہ مالی نقصان بھی پہنچ رہا ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہندستانیوں نے اپنے باپ دادا کی معاشرت اختیار کر لی ہے اور یہ وبا اصل میں پھیلی ہے اسکولوں اور کالجوں کے ان غلام طینت اور غلام سرشت ماسٹروں اور پروفیسروں سے جو اپنی بے دماغی کی وجہ سے کم عمر اور کم سمجھ طلبا کے سامنے ہر وقت پوری وضع و قطع میں موجود رہتے ہیں۔ ہندو بھائیوں کے رہنما اور لیڈر تو ''لجس لیٹیو اسمبلی'' میں بھی اپنی قومی دھوتی پہن کر جاتے ہیں مگر ایک پچاس روپے کے مسلمان ماسٹر صاحب سے اسکول میں بھی بغیر سوٹ پہنے جانا محال ہے۔

دھوبی، درزی اور چمار جو کل سے آج دس گنا اجرت لیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا

کام اب وہ نہیں جو کل تھا۔ پس ملک کی فراغت اسی امر پر موقوف ہے کہ تمام پڑھے لوگ اس مضمون کو پڑھ کر اپنے باپ دادا کے رنگ کا کم قیمت اور سادہ لباس استعمال کرنے کی قسم کھالیں، مگر دیکھنا یہی نہ کریں گے بلکہ ہنس کر "نیرنگ خیال" کو الماری یا میز پر پٹک دیں گے۔ کرنے دیجیے اپنا کیا لیں گے۔ ان پر پھر ان ہی دھوبیوں، درزیوں اور چماروں کا غلبہ رہے گا۔

عید مبارک۔

◆◆◆

ہڑتال

جون1928 سے ہندستان میں ہڑتالوں کی جو کثرت پائی گئی ہے اس کے لحاظ سے یہ خیال ہوا کہ جس طرح یورپ میں ہر قسم کے مرض کا علاج آپریشن سے کیا جانے لگا ہے، ہندستان میں کہیں ہر مطالبہ کے لیے ہڑتال ہی ضروری نہ ہو جائے، لہٰذا اس چیز کو عام طور پر سمجھ لینے اور سمجھا دینے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ واضح ہو کہ ہڑتال انسان کا ایک قدرتی جذبۂ عمل ہے جو کسی مقصد کے حاصل کرنے سے عاجز آ کر یا مایوس ہو کر اس طرح اختیار کیا جاتا ہے کہ خود کو یا اپنے کام کو یکا یک معطل یا بند کر دیا جاتا ہے تاکہ فریق مقابل اس ترکِ تعلق یا ترکِ عمل سے تنگ آ کر اس مطالبہ کو پورا کر دے، اس لیے یہ غلط ہے کہ ہڑتال صرف گاندھی جی کی ایجاد ہے یا وہ صرف کارخانہ لال املی کے مزدور ہی کر سکتے ہیں یا وہ بارودلی کے علاقہ ہی میں واقع ہو سکتی ہے یا اسے جنرل ڈائر کی غیر قانونی گولہ باری یا لندن ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا کے مضامین فنا کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہڑتال اصل میں جانوروں کی ایجاد ہے جس کا محرک گھوڑا ہے اور موید گاڑی کا بیل۔ البتہ گھوڑے اور بیل کی ہڑتال میں صرف اس قدر فرق ہے جتنا کہ مسٹر تلک آنجہانی اور مسٹر گاندھی ایں جہانی کے حصول سوراج میں نمایاں ہے۔ مثلاً گھوڑا جب اپنے سوار کے خلاف ہڑتال کرتا ہے تو وہ بجائے سیدھا چلنے کے اونچا چلتا ہے جسے گھوڑوی اصطلاح میں اَلِف آنا یا اَلِف ہونا کہتے

ہیں۔(لفظ گھوڑ وی مشہور شاعر حضرت اصغر گونڈوی سے بنا ہے) اور بیل ہڑتال کے وقت نیٹ جاتا ہے، جس طرح مدراس کے ہڑتالی انجن کے سامنے لیٹے ہوئے پائے گئے۔آپ یوں سمجھ لیجیے کہ جب آپ تھانیدار صاحب بن کر کسی گاؤں میں جائیں گے تو آپ کا جی خواہ مخواہ چاہے گا کہ اس گاؤں سے دوسرے گاؤں تک ایک بیل گاڑی لے لیں اور کرایہ نہ دیں کیونکہ تھانیداروں کو بیگار میں مفت کی گاڑی لینے کا ہر وقت حق نہیں تو اختیار ضرور حاصل رہتا ہے۔ پس اس غرض کے لیے آپ اس گاؤں سے ایک کسان کو بلا کر کہیں گے:

''لابے ذرا اچھے سے بیل اور گاڑی لا مجھے تھانے جانا ہے''۔

اِدھر ہندستان میں بے شمار بالشویک لوگوں کے آجانے سے کسانوں میں جو بیداری پیدا ہوگئی ہے اس کی وجہ سے یہ کسان بے کرایہ گاڑی لانے سے انکار کرے گا تو آپ پہلے اسے چند سیدھی سیدھی باتیں سنائیں گے پھر اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہیں گے:

''ابے سر توڑ ڈالوں گا۔

اچھا تو اب تجھے بتا ہی دوں۔

ہاں ہاں تجھے اور تیرے باوا کو گاڑی دینا ہوگا''

اس پر بھی اگر کسان کوئی عذر کرے گا تو آپ اپنے ساتھ کے سپاہیوں سے کہیں گے:

''دیکھتے کیا ہو۔ لے جاؤ اس درخت سے باندھ کر اس کے پچاس جوتے مارو''۔

اب اس قدر تھانیداری سے یہ باعزت کسان ڈر کر آپ کو بیل گاڑی تو لا دے گا، مگر اس میں ایک بیل ایسا بھی دے گا جو ہڑتالی ہوگا۔ مثلاً یہ بیگار کے بیل گاؤں سے تو آپ کی گاڑی کو بہت تیز رفتاری سے لے کر روانہ ہوں گے، لیکن گاؤں سے باہر ہوتے ہی ایک بیل یوں ہڑتال شروع کر دے گا کہ اپنے آگے کے دونوں ہاتھ یا پاؤں زمین پر ٹیک دے گا اور منہ کو زمین پر رکھ کر پیچھے کے دونوں پاؤں پر کھڑا رہے گا۔ اب جو آپ اس حرکت پر اسے ماریں گے تو وہ پیچھے کے دونوں پاؤں بھی زمین پر بچھا کر بیٹھ جائے گا۔ اب جو مار کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوگا تو وہ لیٹ جائے گا۔ اس وقت بھی ہندستانی آب و ہوا کی نفاق پسندی کا ثبوت آپ کو یوں ملے گا کہ اس ہڑتالی بیل کے ساتھ اس کا دوسرا ساتھی بیل کبھی نہ لیٹے گا بلکہ وہ برابر کھڑا رہے گا اور اطمینان سے

حوائج ضروری سے دُم اٹھا اٹھا کر فارغ ہوتا رہے گا۔ غرض جب یہ ہڑتالی بیل کسی طرح بھی آپ کی گاڑی لے کر نہ چلے گا تو آپ اسے سوراج دے کر پیدل ہی گاؤں سے تھانے چلے جائیں گے۔

بس بالکل یہی طریقہ انسانوں نے اختیار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یورپ کے انسان جب ہڑتال کرتے ہیں تو وہاں سوڈا واٹروں کی بوتلوں سے ہوٹلوں اور مکانوں کی صرف کھڑکیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور ہندوستانی ہڑتالوں میں جب تک کہ پولس اپنا زور صرف نہ کرے ہڑتال پوری نہیں ہوتی جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر ہندستانی بہادر نہیں تو بے غیرت ضرور ہیں۔ کبھی کبھی ہڑتال کو مالک کارخانہ بھی ریوالور چلا کر دفع کر دیتا ہے۔

ہندستان میں ہڑتال کی پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی بڑا حاکم بیماری سے نہ سہی تو قلب کی حرکت کے بند ہو جانے سے مرجائے یا مر کر رہ جائے یا مر چکے تو پولیس کے ذریعے سے تمام شہر کی دکانیں بند کرادی جاتی ہیں۔ صرف کہیں کہیں دکاندار خود بھی دکان میں بند ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور پولیس کی آنکھ بچا کر کسی سوراخ سے لوگوں کو سودا سلف دیتا رہتا ہے۔ بازاروں کی سڑکیں سنسان ہو جانے کی وجہ سے بازاری بکریاں اور سانڈ سڑکوں پر بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے لمبی لمبی جمائیاں لیا کرتے ہیں اور بچے لوہے کے چکر دوڑاتے پھرتے ہیں۔ بند دکانوں کے سائبانوں کے نیچے لوگ باگ بیٹھے قصے کہانیاں اور گپ شپ کرتے رہتے ہیں اور افسر لوگ گورنمنٹ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ تمام شہر ماتم منانے میں مصروف ہے۔

دوسری صورت ہڑتال کی یوں واقع ہوتی ہے کہ ہندستان میں کوئی کارخانہ ہو جس میں مزدور تو ہوں ہندستانی اور مالک ہو یورپ کا وہ مزدوروں کو چار آنہ یومیہ سے زیادہ اجرت نہ دیتا ہو تو مزدور اجرت کی اس کمی سے تنگ آ کر تنخواہ میں اضافہ کی درخواست کرتے ہیں، مگر یورپ کا یہ مالکِ کارخانہ جب ایک پائی بھی اضافہ نہیں کرتا تو یہ مزدور لوگ اتفاق کر کے ایک دن کارخانہ میں کام کرنے سے انکار کر کے کارخانہ کے اندر والے یا سامنے والے میدان میں جمع ہو کر دن بھر شور غوغا، بات چیت اور جلسہ کرتے رہتے ہیں اور اس تمام اجتماع میں چلم پینے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور

کبھی کبھی یہ مزدور مالکِ کارخانہ کے بنگلے کی طرف بھی جاتے ہیں تو مالک کارخانہ گھبراہٹ میں ریوالور لے کر نکل آتا ہے اور اُدھر کی طرف سے پولیس کو ٹیلی فون کے ذریعہ اطلاع دے دیتا ہے کہ ''مزدور لوگ حملہ کو آیا ہے'' اس پر پولیس آجاتی ہے اور جنگ یورپ کے تمام اسلحہ لے آتی ہے۔ اور اُدھر کی طرف سے پریشان مزدور بڑھتے ہیں پھر پتھر، اینٹ، لاٹھیوں اور ہوائی فیر کا معاملہ شروع ہوتا ہے جس میں مزدور اور پولس کے لوگ زخمی ہو کر جب شفاخانے چلے جاتے ہیں تو لیڈر لوگ گھروں سے باہر آ کر مزدوروں کی حمایت میں جلسے کرتے ہیں اور ان کی امداد کے لیے چندہ کا فنڈ کھولتے ہیں جس میں قصائی اور جُلاہے خوب خوب چندے جمع کرتے ہیں۔ ایسے ہنگاموں میں ڈاکٹر محمد عالم مولوی مظہر علی اظہر قسم کے وکیل لوگ بغیر اجرت کے وکالت کر کے مزدور ملزموں کا مقدمہ لڑتے ہیں تو پھر مزدور لوگ بھی انھیں کونسل کا ممبر بنانے کے لیے ووٹ دیتے ہیں۔ ایسی ہڑتال پر عام ہندستان میں کوئی افسوس نہیں کیا جاتا صرف اخباروں میں تذکرہ ہوتا ہے۔

تیسری صورت ہڑتال کی یوں پیدا ہوتی ہے کہ جنوبی ہند کے کارخانہ ہائے ریل سازی میں ہندستانی کام تو کرتے ہیں یورپ والوں کے برابر مگر تنخواہ پاتے ہیں کم یا دس اوپر پچاس روپیہ تو ایک مرتبہ یہ لوگ ایجنٹ صاحب سے کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہ بھی یورپ والوں کے برابر کیجیے تو وہ انکار کرتے ہیں۔ اس پر یہ تمام ملازمین کام بند کر دیتے ہیں۔ ریلوے میں ہڑتال کا عام وقت آدھی رات ہے۔ اب یہ لوگ کام بند کر کے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں، اُدھر ایجنٹ صاحب پولیس کو بلا کر کھڑا کر دیتے ہیں مگر ہندستانی نااتفاقی کا رنگ یہاں بھی یوں نظر آتا ہے کہ بعض ہندستانی ملازمین کام بند کر کے ہڑتال میں شریک نہیں ہوتے تو ہڑتالی مزدور انھیں کام پر جانے سے روکتے ہیں، اس پر جھگڑا ہوتا ہے۔ پھر بعض مزدور پولیس سے آنکھ بچا کر کسی جگہ سے ریل کی پٹری اکھاڑ دیتے ہیں اور ریل گر جاتی ہے یا جا پڑتی ہے۔ پھر یہ مزدور کسی ایسے چھوٹے سے اسٹیشن پر جاتے ہیں جہاں پولیس نہیں ہوتی تو اس اسٹیشن کو آگ لگا دیتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی کام بھی نہیں ہوتا تو پھر یہ لوگ کسی اسٹیشن پر انجن کے سامنے جا کر لیٹ جاتے ہیں اور اس لیٹ جانے کو گاندھی صاحب بہت پسند فرماتے ہیں۔ ریلوے کے مزدوروں کی ان حرکتوں پر دوسرے صوبوں کے ریلی مزدور اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں اور جلسہ بھی کرتے ہیں۔ (یہاں لفظ ریل سے

ریلی مزدور اسی طرح بن گیا جس طرح تیل سے تیلی بن چکا ہے) اسی عرصے میں لندن کے اخبارات معائنہ کے لیے یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ ان ریلی مزدوروں کی ہڑتال میں بالشویک لوگ امداد دے رہے ہیں اور ملک روس کی ٹریڈ یونین انھیں افغانستان کے راستے سے روپیہ بھی بھیج رہی ہے، اسی لیے ایک صاحب اخبار' سول اینڈ ملٹری گزٹ' لاہور میں شمشیر زن غازی امان اللہ خاں شاہ افغانستان کو لکھ دیتے ہیں کہ:

''آپ بالشویک لوگوں سے دوستی نہ رکھنا کیونکہ ان سے دوستی کرنا شرعاً حرام ہے اور یورپ والوں سے مباح''۔

اس قسم کا مضمون لکھنے والے کو عام طور پر نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب کہتے ہیں اور تمام سیاست داں لوگ ان کے اس مشورہ پر مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں۔

چوتھی صورت ہڑتال کی اس وقت واقع ہوتی ہے جب لندن سے کوئی ایک آدمی یا بہت سے آدمی مع دو چار عورتوں کے ہندستان اس لیے آتے ہیں کہ ملک اگر چہ ہے ہندستانیوں کا مگر طریقۂ حکمرانی مرتب کریں گے۔ وہ بس ان کے اس کام پر ہندستانیوں کو تاؤ آجاتا ہے۔ اور جس وقت یہ لوگ ہندستان میں آتے ہیں تو تمام ہندستانی ہڑتال کر دیتے ہیں اور جس اسٹیشن پر یہ لوگ اترتے ہیں وہاں یہ ہڑتالی کالے کالے جھنڈے لے کر پہنچ جاتے ہیں، جن پر لکھا ہوتا ہے:

''ہندستان ہندستانیوں کے لیے''

''سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے''۔

''سائمن گو بیک''۔

اسٹیشن ماسٹر ان ہڑتالیوں کو پلیٹ فارم کا ٹکٹ نہیں اور پولیس ان لوگوں کو اندر قدم دھرنے نہیں دیتی تو یہ ہڑتالی مال گودام میں گھس جاتے ہیں یا تانگے والوں کی جگہ پر قطاریں باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جس وقت لندن کے یہ انتظار کرنے والے لوگ پلیٹ فارم پر قدم دھرتے ہیں تو بعض خطاب یافتہ ان لوگوں کو پھولوں کے ہار پہناتے ہیں اور بعض والیانِ ریاست جھک کر مصافحہ کرتے ہیں پھر جب یہ لوگ اسٹیشن کے باہر موٹروں میں سوار ہو کر نکلتے ہیں تو ہڑتالی لوگ چلا چلا کر کہتے ہیں' سائمن گو بیک''،'' سائمن گو بیک'' اس کے بعد یہ ہڑتالی شہر میں جاتے

ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ اکثر ہندستانی دکانیں کھولے مزے سے بیٹھے ہیں تو یہ ہڑتالی انھیں مجبور کرتے ہیں تو اس پر جھگڑا ہوتا ہے۔ اس موقع پر ایک ہندستانی نسل کے بقراط یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہڑتالی اصل میں ڈاکو ہیں لہٰذا ان کے پاس ایک صاحب بندوق تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر یہ بزرگ مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر ستیہ پال پر ڈاکے اور بلوہ کا مقدمہ چلا ڈالتے ہیں۔ مگر عدالت میں ہڑتالی لیڈر نہایت بہادری سے اس مقدمہ کے دائر کرنے والے پر جرح کرتے ہیں تو دعویٰ دائر کرنے والوں کو اسی حال میں بخار آ جاتا ہے۔ اس سے اکثر لوگ ایسے آدمیوں کو 'لالہ لچھے شاہ' کہتے ہیں تو وہ بھی مقدمہ واپس لے لیتے ہیں۔ پھر جن انگلستانی لوگوں کے خلاف یہ ہڑتال کی جاتی ہے ان کی موجودگی میں اگر رمضان شریف کا مہینہ آتا ہے تو انھیں عین روزے کی حالت میں جو لوگ چائے کی دعوت دیتے ہیں انھیں بھی لوگ مارے غصے کے نواب سر ذوالفقار علی خاں اور سر محمد شفیع کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ہڑتال کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لندن ٹائمز لکھ دیتا ہے کہ:

"کمیشن کامیاب ہو گیا اور ہندستانی روٹی بند ہو جانے کے خوف سے کبھی باہم متفق نہیں ہو سکتے"۔

اس ہڑتال کے بعد ایک اور ہڑتال ہوتی ہے جسے اردو زبان میں بھی "آل انڈیا ہڑتال" کہتے ہیں۔ یہ اس وقت واقع ہوتی ہے جب انگریز بھائی ہندستانی بھائیوں کے مزاج اور فائدے کے خلاف کوئی قانون بناتے ہیں یا بنانے کا ارادہ کرتے ہیں یا بنانے کے ارادہ کا اعلان اخبار ٹائمز میں کر دیتے ہیں یا بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ ہڑتال ایک دن کی ہوتی ہے اور ہندستان کے تمام شہروں میں کاروبار بند کر دیا جاتا ہے، مگر ہر شہر میں نااتفاقی بھی ساتھ رہتی ہے اور بعض دکاندار اس دن بھی سودا سلف فروخت کر کے چھوڑتے ہیں۔ کہیں کہیں گدے لے مسلمان اس دن گاندھی صاحب کے حکم سے روزے بھی رکھ مارتے ہیں۔ اس دن ایک سے لے کر دس بارہ شہروں میں ہڑتالیوں کے ساتھ پولیس والوں کی لڑائی ضرور ہوتی ہے اور دونوں طرف کے آدمی مارے جاتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں یا گرفتار ہوتے ہیں یا پھانسی پاتے ہیں مگر ان فسادات میں کوئی ہندستانی لیڈر شہید یا زخمی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا کام لڑائی نہیں بلکہ تقریر کرنا ہے اور تقریر بھی ایسی کرنا ہے جس سے بجائے جوشِ عمل پیدا ہونے کے رونا ہی رونا آتا ہے اور لوگ آنسو صاف کرتے ہوئے جلسہ سے سیدھے

گھر چلے آتے ہیں۔

اس کے بعد ایک ہڑتال اسکولوں اور کالجوں میں واقع ہوتی ہے۔ یہ ہڑتال اکثر اس صورت میں واقع ہوتی ہے کہ بورڈنگ کا افسر طلبا کو ہمیشہ ماش کی دال کھلاتا رہے یا اس لیے کہ کوئی ذی اثر طالب علم کسی قومی جلسہ میں شرکت کی سزا میں اسکول سے نکال دیا جائے۔ اس ہڑتال میں اسکول کی میز، کرسی، دروازے اور پرنسپل کا موٹر توڑ ڈالا جاتا ہے۔ رئیسوں کے بچے اس میں بھی شریک نہیں ہوتے بلکہ وہ اس عرصہ میں وطن واپس چلے جاتے ہیں اور مصیبت اٹھاتے ہیں وہی غریبوں کے نادار طلبا۔ اس کے نتیجے میں اور طلبا بھی ہمیشہ کے لیے خارج از اسکول ہو جاتے ہیں یا ان پر جرمانہ ہوتا ہے کیونکہ اتفاق طلبا کے جملہ والدین میں بھی نہیں ہوتا۔ بعض والدین طلبا کی ہڑتال کو خود برا کہتے ہیں اور ارکان اسکول سے جا کر ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ:

''میرا لڑکا واقعی نالائق ہے، بس آپ تو اسے ایسی سزا دیجیے کہ یاد ہی کرے۔ کیونکہ اس کے جسم کی ہڈی تو ہماری ہے اور گوشت آپ کا''۔

بعض اسکولوں میں اذان بند کرا دینے سے مسلمان طلبا ہڑتال کر دیتے ہیں اور اس ہڑتال کا نتیجہ اکثر کامیاب رہتا ہے کیونکہ مذہب کی وجہ سے اس میں طلبا کے والدین ارکان اسکول سے ذرا کم ڈرتے ہیں۔

سب سے خطرناک قسم کی ہڑتال جیل خانوں میں کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قیدی روٹی کھانا ترک کر دیتا جسے مسلمان اخبارات ''مقاطعۂ جوعی'' اور ہندو اخبارات ''بھوک ہڑتال'' کہتے ہیں۔ ایسے قیدی کے لیے گورنمنٹ کی انگریزی دوائیں اور ڈاکٹر کی فیس بہت خرچ ہوتی ہے۔ یہ ہڑتال اس وقت واقع ہوتی ہے جب کسی قیدی کو اس کے بیوی بچوں سے ملاقات کی اجازت نہ ملے یا اسے خط و کتابت کے لیے عید کارڈ نہ دیا جائے یا کھانے میں قورمہ، انڈے اور چائے نہ دی جائے یا سونے کے لیے مسہری نہ ملے یا مطالعہ کے لیے پائنیئر اور تفریح کے لیے ٹھنڈی سڑک پر جانے نہ دیا جائے یا قیدی کو مشاعرہ کی اجازت نہ دی جائے اور غزل کہنے سے منع کیا جائے۔ چاہے اس قیدی کا نام اور تخلص حسرت موہانی ہو یا محمد علی جوہر یا ظفر علی خاں ہو یا احمق پھپھوندوی یا ابوالکلام آزاد ہو یا قبلہ محمود الحسن شیخ الہند علیہ الرحمہ۔ یا پھر قیدی کو جیل میں رہتے

رہتے بخار آ جائے اور پھر وہ تپ دق بن جائے۔ مگر اسے گل بنفشہ، عناب، سپستان، بادیان اور عرق گاؤزبان پینے کی اجازت نہ ہو اور چاہے اس کا نام ''سبھاش چندر بوس'' ہی کیوں نہ ہو۔ پھر قیدی کا مارے غصے کے جسمانی وزن ہی کیوں نہ کم ہو اور چاہے وہ دُبلا ہو جائے یا لاغر مگر گورنمنٹ اسے رہا نہ کرے تو وہ مقاطعۂ جوعی کر گزرتا ہے خواہ ایسا قیدی مولانا شوکت علی کے نام سے مشہور ہو یا گاندھی جی کہا جائے۔ اس ہڑتال میں جیل کے جملہ قیدی شریک نہیں ہوتے بلکہ اخبارات میں اطلاعات شائع ہوتی ہیں اور مساجد میں دعا۔

یہ تھے نمونے ان ہڑتالوں کے جو ہندستان میں واقع ہوا کرتی ہیں، لیکن ان تمام اقسام کی ہڑتالوں کے مضر نتائج بہت زیادہ تعداد میں خود ہڑتالیوں کے لیے برآمد ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً پولیس کی گولی سے مرجانا یا مرنے کے قابل ہو جانا یا نہ مرنا نہ جینا اور شفاخانے میں پڑا رہنا یا پولیس کی گولی سے کانا ہو جانا یا لنگڑا ہو جانا یا کمر ٹوٹ جانا یا حسین چہرے کا مرہم پٹی سے بدنما ہو جانا یا ہڑتال کے غصہ سے ملازمت سے علاحدہ ہو جانا یا افسر کا دل ہی دل میں ناراض رہنا اور موقع ملتے ہی موقوف کر دینا۔

پس ان حالات میں سوچنا چاہیے کہ ہڑتالیوں پر ان مصائب کا اثر کیوں کر پڑتا ہے؟ حالانکہ ہڑتال عین ذریعۂ کامیابی ہے لہٰذا حالات سے ثابت ہے کہ ہڑتال کے یہ نقصانات ان لوگوں کے ہیں جو ہڑتال کے اصول سے ناواقف ہیں۔ مثلاً پولیس سے خواہ مخواہ لڑنا یا لڑنے کی نیت سے ان کو دانت دکھانا یا اس پر دانت پیسنا یا فریق مقابل پر پتھر پھینکنا یا پتھر مارنا یا حملہ کی نیت سے ہڑتالیوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کرنا یا ریل کے سامنے بغیر ٹکٹ کے لیٹ جانا یا گولی چلتے وقت بجائے بھاگ جانے کے ''گاندھی جی کی جے'' کہہ کر پولیس والوں پر ٹوٹ پڑنا یا پولیس پر ''یا علی'' کہہ کر حملہ کرنا یا مالک کارخانے کے بنگلہ پر جا کر اسے گالی دینا یا ہڑتال شدہ کارخانے ہی کے سامنے بیٹھ کر چلم پینا یا کوتوالی کے سامنے سے جلوس نکالنا یا غیر ہڑتالی دکانداروں سے طمانچے مار کر دکانیں بند کرانا یا موٹر سائیکل اور گھوڑا گاڑی چلانے والوں سے ان سواریوں کا بیگار کرانا اور اوپر سے ان کے چانٹے بھی مارنا یا انگریزوں کی موٹروں کو محاصرے میں لے کر انھیں لاٹھیوں پر دھر لینا چاہے وہ مدراس میں ملیں یا دہلی میں۔ یہ ہڑتال کے دن چاندنی چوک کی دکانوں سے

کھانے پینے کی چیزیں لے بھاگنا یا لے بھاگنے کے ارادہ سے دکاندار کو جوتا پھینک کر مار دینا یا گھونسہ دکھا کر اس کے منیجر کو ڈرانا یا ہڑتال کے دن کچہری کے منشیوں کو راستہ میں روک کر ان سے عرضی نویسی کا قلم دوات چھین لینا یا ہوٹل بند کرانے کے لیے قورمے اور پلاؤ کی رکابیاں توڑ ڈالنا یا اس کے ساوار کی تمام چائے خود پی جانا یا سڑک پر پھینک دینا یا تھیٹر کا تماشا بند کرانے کے لیے تھیٹر پر پتھر پھینکنا یا اندر گھس کر اس کے ایکٹروں کو پیٹنا اور ایکٹرنیوں کو مارنا اور کبھی کبھی گھسیٹنا یا ریل پر جاتے ہوئے مسافروں کا تانگہ روک لینا۔

پس ان تمام حالات کا نتیجہ تصادم یا اشتعال ہوا کرتا ہے جو ہڑتال کے اصول اور مقاصد نیز فوائد کے لیے مضر اور نقصان رساں ہیں اس لیے ہڑتال کی حالت میں ذیل کی چیزوں کی ضرورت ہے:

وحدتِ خیال، اتفاقِ کامل، ہڑتال تک کے لیے سامانِ زندگی کا کافی ذخیرہ، خاموشی، نظم کامل، ضبط و برداشت اور استقلال و حوصلہ اور بس۔

صرف دیوبند کے طلبا ان اصول سے مستثنیٰ ہیں، وہ جس طرح چاہیں ہڑتال کریں اور چاہیں تو علی گڑھ کے طلبا کو بھی ورغلا کر اپنے ساتھ لے جائیں یا کم از کم انھیں رضا کار بنالیں۔ فقط۔

◆◆◆

بے وقوفی

اس زمانے میں جب کہ سنہ عیسوی چلتا ہے اور مسلمان سنہ ہجری کو بھول چکے ہیں، اپنا ملکی و مذہبی لباس ترک کر چکے ہیں، اپنی زبان سے نفرت کر کے پانیئر اخبار کی زبان پسند کرنے لگے ہیں، داڑھی مونچھوں کے حساب سے مجوس و یہود سے ان کو صورتیں مشابہ ہو چکی ہیں تو یہ سب کچھ نتیجہ ہے ان کی ''بے وقوفی'' کا لہٰذا ضرورت ہے کہ ''بے وقوفی'' کے اسباب اور نتائج سے سب کو خبردار کر دیا جائے۔

پس واضح ہو کہ ''بے وقوفی'' ایک ایسا ملکہ یا قوت ہے جو عقل و خرد کی کمی سے پیدا ہوتا ہے اور لازم نہیں کہ یہ ملکہ صرف مسلمانوں ہی میں پیدا ہو بلکہ اس میں ہمارے ہندو بھائی اور انگریز بھائی بھی بکثرت مبتلا ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ جس شخص کے اندر ''بے وقوفی'' پیدا ہو جائے وہ مشہور و مقبول بہت ہو جاتا ہے یا ہو جاتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ محض شہرت اور مقبولیت کے لیے خواہ مخواہ ''بے وقوف'' ہی بن جائیں یا بے وقوف ہو جانے کی کوشش کریں یا بے وقوف ہونے پر فخر کریں۔

بے وقوفی پیدا ہوتی ہے فطری کم عقلی سے پھر جہالت سے، پھر جسمانی صحت کی خرابی سے، پھر بری صحبت سے، پھر افلاس سے، پھر انتہائی عیش اور بے فکری سے، پھر شراب خوری سے پھر

چانڈو چرس گانجے اور بھنگ سے اور افیون سے تو اس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ جواب ہی نہیں، لیکن سب سے پُر لطف بےقوفی وہ ہے جو "حکومت کرنے سے" پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہندستانیوں کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ یہ جو انگریز ہندستان پر جبراً حکومت کر رہے ہیں سو یہ ہیں "بےقوف" کیونکہ اس کا نتیجہ ایک نہ ایک دن بہت خراب نکلے گا؟۔ ہمارے خیال میں کبھی کبھی لمبے قد سے بھی بے وقوفی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال تجربہ یہ ہے کہ بے وقوف انسان ذی ہوش اور قابل آدمی سے کہیں زیادہ صاحب عزت و صاحب اقبال ہوا کرتا ہے اور اسی لیے اس مضمون میں ہر قسم کی بیوقوفی کو ظاہر کیے دیتے ہیں تا کہ ناظرین جس قسم کی "بےقوفی" چاہیں اختیار کر کے صاحب عزت و اقبال بن جائیں۔

خانگی بےوقوفی:

یہ بےوقوفی اصل میں حقیقی یا صحیح بےوقوفی ہے جو بغیر گانجے اور چرس کے صرف عمر اور صحت کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ہر خاندان میں دو چار نہیں تو ایک بے وقوف صاحب ضرور موجود ملتے ہیں، جنھیں عام طور پر "بزرگ" یا "بڑا بوڑھا" کہتے ہیں اور گو فارسی زبان میں کہا ہے کہ:

خطا بزرگوں کی پکڑنا خطا ہے

مگر معاملہ یا واقعہ عرض کرنا خطا نہیں لکھا۔ اس لیے صاف سن لیجیے کہ جہاں کسی صاحب کی عمر ساٹھ ستر برس سے زیادہ ہوئی اور وہ "گھر کے بزرگ" مشہور ہو گئے اور یہ اس لیے بھی کہ وہ خود پچاس برس کے ہو کر تمام خاندان پر اپنی بزرگی کی دفعہ 144 نافذ کر کے سب کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ انھیں بڑا گھمنڈ اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ "تجربہ کار" ہیں اور دنیا کو بہت دیکھے ہوئے ہیں اور یہ جو باقی کے ارکانِ خاندان ہیں یہ ہیں سب ابھی "لونڈے"۔ اِدھر ہندستانی معاشرت میں داخل ہے کہ جب تک یہ "بزرگ صاحب" اِنا للہ نہ ہو جائیں اس وقت تک تمام خاندان کے مصارف انھی کے سر، خاندان کا تمام سودا سلف انھی کے سر، باورچی خانے کا تمام انتظام انھی کے سر، خاندان کے تمام معاملات کا تصفیہ اِنھی کے سر، خاندان بھر کے شادی بیاہ کا مدار انھی کے سر، محلے والوں کی تجہیز و تکفین کے اصول بتلانا انھی کے سر، قدیم تر رسوم پر فتویٰ دینا

انھی کے سر، مسجد میں نماز کے اوقات کا تقرر انھی کے سر، اولاد کو تعلیم دلانا یا آوارہ کرنا بھی انھی کے سر، لباس کی وضع قطع کا نمونہ بتلانا بھی انھی کے سر، ناریل کے حقے یا قینچی چھاپ سگریٹ پینے کا انتخاب بھی انھی کے سر۔

غرض ان کا سر کیا ہوتا ہے مرکزی خلافت کمیٹی ہوتا ہے جس کے احکام کے بغیر تمام صوبہ جاتی کمیٹیاں کوئی حرکت ہی نہیں کر سکتیں اور جس نے آپ کے احکام کے خلاف حرکت کی فہوالبیوقوف اور یہ جو آج کل نوجوان لڑکیوں کی شادی جلد نہیں کی جاتی یہ بھی انھی بزرگ صاحب کے وجود سے جن کے نزدیک سوائے خاندان کے تمام مسلمان لڑکے ''بیوقوف'' ہوا کرتے ہیں۔

ان کے گھرانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی یا علی گڑھ کالج کے ایم۔اے پاس نوجوان اور جدید تمدن سے واقف افراد ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں گے مگر ان کے نزدیک یہ سب کے سب بے وقوف ہوا کرتے ہیں۔ان کے جیتے جی نئی تعلیم یافتہ اولاد کا اعلیٰ ملازمت کے لیے ترک وطن کرنا، تجارت کے لیے باہر جانا، تجربے کے لیے یورپ جانا یہاں تک کہ اخبار تک کا پڑھنا بیوقوفی میں داخل سمجھا جاتا ہے۔بس انھیں مسرت اس بات سے ہوتی ہے کہ تمام خاندان والے انھیں ابا میاں یا نانا جان کہتے پھرتے ہیں اور محض ایسے ہی الفاظ پر آپ یہ تمام خاندانی جھگڑے اپنے سر مول لیے بیٹھے رہتے ہیں۔پس ایسے ہی خضاب زدہ بزرگوں کی گرفت سے جو خاندان آج آزاد نہیں وہ ہیں بے وقوف.....

<u>سیاسی بے وقوفی:</u>

سیاسیاتِ عالیہ کی صحیح اہمیت کا اندازہ کر لینے کے بعد آپ معلوم کر لیں گے کہ اس کی پہلی ذمہ داری بادشاہ پر عائد ہوتی ہے اور اسی لیے خدا غریقِ رحمت کرے اپنے چچا سعدی نے گلستاں بوستاں میں سیاسیات کے جس قدر اصول لکھے ہیں وہ سب کے سب بادشاہ کے لیے ہی لکھے ہیں۔مگر اب زمانہ آگیا ہے عیش و آرام سے حکومت کرنے کا،اس لیے اس کا نام رکھ دیا ہے ''دستوری حکومت''یعنی اب بادشاہ لوگ تمام کاغذات پر صرف اپنے انگوٹھے کا نشان لگا دیتے ہیں اور معاملات طے کرتا پھرتا ہے وزیرِ اعظم اور اسی لیے ہر قسم کی سیاسی بے وقوفی کا مرتکب وزیرِ اعظم ہی سمجھا جاتا ہے۔البتہ وزیرِ اعظم کی بے وقوفی کی دو قسمیں ہیں ایک تو رعایا کے نقطۂ نظر سے دوسری

بادشاہ کے نقطۂ خیال سے۔ پس رعایا کے نقطۂ نظر سے غلام ممالک میں وزیراعظم کی بے وقوفی اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب سے وہ وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالتا ہے اور اسی وقت سے تمام انجمنیں اور اخبارات اسے قوم کا غدار کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے وزراء میں حکومتِ مصر کے سابق وزیراعظم زیور پاشا اول نمبر کے بے وقوف مانے گئے ہیں جنھوں نے مرحوم زغلول پاشا کی وزارت کے بعد اس عہدہ کو قبول کیا تھا۔

وزیراعظم کی دوسری بے وقوفی یہ ہے کہ وہ فرماں روا حکومت سے اپنی حکومت کا کوئی معاہدہ طے کرے یا گفت وشنید کے لیے کسی مجلس میں چلا جائے یا اس معاہدہ برضا و رغبت خود اور بے مشارکت غیرے واحدے اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان لگا دے یا نام لکھ دے یا سرخ پنسل سے انگریزی کے حروف بنا دے یا دستخط کر دے یا دستخط کا ارادہ کرے یا اس ارادہ کی اطلاع اخبارات کو دے دے۔

تیسری بے وقوفی یہ کہ وہ ایسے معاہدے کی تصدیق کے لیے اپنی پارلیمنٹ کی تقریر کرے یا تقریر سے دوسرے وزراء کو اپنا ہم خیال بنائے یا بنانے کا قصد کرے یا اس قصد کا اخبار والوں سے اظہار کر دے جیسا کہ مصر کے وزیر ثروت پاشا نے کیا تھا یا عراق کے جعفر پاشا کرنے والے تھے۔

چوتھی بے وقوفی یہ کہ وزیراعظم ایسے معاہدے کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے کے لیے رات کے وقت بادشاہ سے تمام وزیروں کے خلاف چغلی یا دھمکی سے کام لے کر انھیں مرعوب کرے یا مرعوب کرنے کا ارادہ کر کے انھیں اپنے مکان کی چھت پر جمع کرے یا جمع کرنے کی زحمت کرے یا انھیں استعفاء دینے کا حکم دے یا حکم دینے کا ارادہ کرے یا اس سلسلہ میں کوئی ٹی پارٹی یا گارڈن پارٹی دے یا دینے کا ارادہ کرے یا اس ارادہ سے ٹی پارٹی کا سامان خریدے یا خریدنے جائے یا خرید کرلائے۔

بادشاہ کے خیال سے وزیراعظم کی سیاسی بے وقوفی یہ ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کو زیادہ موٹریں خریدنے سے منع کرے یا منع کرنے کی نیت سے موٹر کے نقصانات بادشاہ سے بیان کرے یا موٹروں کا بجٹ منظور کرنے میں تاخیر کرے یا تاخیر کرنے کے ارادہ سے کہیں تفریح کو چلا جائے۔ دوسری بے وقوفی یہ ہے کہ وہ بادشاہ کو پیرس یا لندن کی سیاحت سے باز رکھے یا باز

رکھنے کے ارادہ سے یہ کہہ دے کہ جہاز کا سفر خطرناک ہوا کرتا ہے یا اس سفر کے مصارف پر کوئی اعتراض کرے یا دوسرے وزراء کو اس اعتراض کے لیے اشارہ کرے یا آنکھ مارے یا انگلی سے بتلائے۔

تیسری بے وقوفی یہ کہ وہ بادشاہ کو ایک سے زیادہ شادی کرنے سے منع کرے یا شادی کرانے والوں کو گرفتار کرا دے یا اس شادی کے مصارف کا بجٹ خود بیٹھ کر نہ لکھے یا اس سے گریز کرے یا پہلوتہی یا اعراض یا اغماض یا انحراف کرے یا ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو یا ارتکاب کا قصد کرے۔

چوتھی بے وقوفی یہ کہ وہ رعایا کے مطالبات کی تائید میں بادشاہ کے کسی ظالمانہ قانون کو منسوخ کر کے رعایا کی ہاں میں ہاں ملائے یا ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کرتا ہوا پکڑا جائے یا رعایا کے لیڈروں سے دوستی رکھے یا لیڈروں کے پاس بیٹھا ہوا پایا جائے جیسا کہ مرحوم زغلول پاشا کو دیکھا گیا۔

پانچویں بے وقوفی یہ کہ وزیراعظم اپنی ماتحت نوآبادی کو اپنی حکومت کے برابر حق دینے پر آمادہ ہو جائے یا اس آمادگی کا ارادہ کرے، مگر اس وقت اس قسم کا وزیراعظم دنیا میں ایک بھی نہیں ہے صرف مارشل عصمت پاشا وزیراعظم حکومت ترکی ہی وہ پہلے بے وقوف وزیراعظم ہیں جنھوں نے حکومت مصر اور صوبہ جات عراق کی آزادی کو خوشی سے تسلیم کر کے لوزان کانفرنس میں اعلان بھی کر دیا۔

یہ سیاسی بے وقوفیاں تو خاص تھیں وزیراعظم کے ساتھ۔ اب رعایا کے لیڈروں کی سیاسی بیوقوفیاں یہ ہیں کہ بے وقوف وہ جو قوم کو کسی دوسری قوم سے آزاد کرانے کے لیے کوئی تقریر کرے یا تحریر لکھے یا بات چیت کرے یا جلسہ کرے یا جلوس نکالے یا نعرہ لگائے یا جے پکارے یا کھدّر پہنے یا عدم تعاون کرے یا چرخہ چلائے یا حاکم لوگوں سے سودا سلف لینا چھوڑ دے یا کوتوالی میں بڑی خوشی سے بیٹھا رہے یا جیل میں روٹی کھانا چھوڑ دے یا کم از کم کونسل سے روٹھ کر بازار کی طرف چل دے یا سرکار کی مخالفت کے لیے بیماری کی حالت میں بھی دلّی سے کونسل تک چلا آئے اور پھر کونسل کے پاس والے شفاخانے میں دوسرے ہی دن مر بھی جائے فہوالبیوقوف۔

مذہبی بے وقوفی:

مذہبی بے وقوفی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک خود علمائے کرام کے نقطۂ نظر سے دوسری غیر علما کے نقطۂ خیال سے۔ چنانچہ غیر علما کے نقطۂ نظر کی مذہبی بے وقوفیاں یہ ہیں طلبا کا سیاسیات میں حصہ لینا، مسلمانوں کا خلیفۃ المسلمین کی تصویر کا دکانوں پر لٹکانا، شاہ افغانستان کے استقبال کے لیے بمبئی اور کراچی پہنچ جانا، ترکی ٹوپی پہن کر یا لگا کر یا چڑھا کر یا اوڑھ کر کسی جلسہ میں شریک ہونا۔ خلافت جزیرۃ العرب غازی عبدالکریم ریفی کے لیے چندہ فراہم کرنا مگر اب یہ بے وقوفی صرف مولانا شوکت علی میں باقی رہ گئی ہے یا مولوی محمد شفیع داؤدی میں۔ قوم میں کامل بیداری پیدا کرنا اور انھیں کسی مسئلہ میں متحد کرنا وہ مذہبی بے وقوفی ہے جس میں مولوی ظفر علی خاں اور لالہ لاجپت رائے اور گاندھی جی تک بدنام ہو چکے ہیں۔ عوام کے نقطۂ نظر سے مذہبی بے وقوفیاں یہ ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو اسکولوں میں تعلیم دلانا، عورتوں کو پردہ سے آزادی دے دینا، کسی پیر صاحب کا مرید نہ ہونا، حاکم ضلع کی تعریف نہ کرنا، مساجد کی بے حرمتی پر ہندوؤں سے ہاتھاپائی نہ کرنا، کوٹ پتلون سے نفرت کرنا، پانچ وقت نماز پڑھنا، پانیئر اخبار کے عوض اردو کا اخبار خریدنا پڑھنا یا کسی دکان پر بیٹھ کر اس کی خبریں سن لینا، مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو کافر لکھ دینا، مسلمانوں میں نفاق پیدا نہ کرانا، دیوبند میں تعلیم پانا، مسلمانوں کا سا لباس پہننا، سر پر انگریزی بال نہ رکھنا، داڑھی رکھنا، باپ کے سامنے بیٹے کا انگریزی ٹوپ پہن کر نہ آنا، تمام خاندان سے انگریزی زبان میں بات چیت نہ کرنا، کتا نہ پالنا، انگلستان تعلیم کے لیے نہ جانا، موچھوں کا رکھنا کبھی بالکل اور کبھی نصف تک صاف نہ کرنا، کبھی بڑھانا کبھی گھٹانا اور پھر بالکل نہ منڈوانا۔

ملازمانی بے وقوفی:

حکیموں کے نزدیک تو ملازمت ہی ''بے وقوفی'' کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ تعریف کسی قدر پرانی ہو چکی ہے لہٰذا آج کل جو ملازمانی بے وقوفیاں تسلیم کی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے دفتر میں حاضر نہ ہونا، مقررہ وقت پر کام ختم کر کے گھر چلا نا جانا، حاکم صاحب کو رشوت اور ڈالی دلانے کی کوشش نہ کرنا، حاکم کے گھر صبح کی اذان کے وقت سلام کو نہ جانا، حاکم صاحب کے خانگی امور اور سودا سلف لانے سے گریز کرنا، تعطیلات میں حاکم صاحب کے گھر حاضر نہ ہونا، حاکم

صاحب کو تمام کاغذات پر احکام لکھنے کا سلیقہ و طریقہ نہ بتلانا، تنخواہ میں اضافے کی درخواست دینا، رخصتِ اتفاقیہ کی خواہش کرنا، دفتر کے اوقات میں نماز کی اجازت طلب کرنا، دوسرے حکام سے میل جول پیدا کرنا، حاکم صاحب کی تعریف اخبار میں نہ لکھنا اگر شاعر ہو تو قصیدہ نہ لکھنا، ان کے غلط تر احکام پر اصلاح دینا، ان کے ظالمانہ برتاؤ کی شکایت دوسرے افسروں سے کرنا، دفتر اور راستہ میں انھیں جھک کر سلام نہ کرنا، اجلاس پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالی سے ناراض ہو جانا، قانون کے دیے ہوئے حقوق کو ان کے غلط طریقِ عمل کے مقابل میں کام لانا، ان کے مقابل خود کو ہر کام میں بے وقوف ثابت نہ کرنا، ان کے خاندان کے تمام ارکان کو خوش نہ رکھنا، ان کے سفید سفید لڑکوں کا بستہ لے کر اسکول تک نہ چھوڑ آنا۔

ہماری بے وقوفی:

پہلی بے وقوفی یہ کہ ہم پیدا ہی کیوں ہوئے۔ پھر پیدا ہی ہونا تھا تو انسان کیوں بنے جانور کیوں نہ ہوئے۔ اور انسان ہی ہونا تھا تو عقل احساس کیوں پایا، نرے کندۂ ناتراش ہی کیوں نہ رہے؟ اور صاحبِ عقل و تمیز ہی ہونا تھا تو مضمون نگار کیوں ہوئے اور مضمون نگار ہی ہونا تھا تو زبانِ اردو کے کیوں ہوئے۔ اور زبانِ اردو میں ہی لکھنا تھا تو جدت طراز و ندرت نگار کیوں ہوئے، ندرت نگار ہی تھے تو ملک و ملت کے خیر خواہ کیوں بنے اور ملک و ملت کے خیر خواہ ہی ہونا تھا تو خطاب یافتہ طبقہ کے رنگ میں خیر خواہی کیوں نہ کی؟ دوستوں میں سب سے زیادہ مقبول و مشہور کیوں ہوئے؟

یہ تھیں وہ بے وقوفیاں جو ہمارے خیال میں ہمارے اندر آج بھی موجود ہیں لیکن ان کے خیال میں ہمارے اندر جو بے وقوفیاں ہیں وہ یہ ہیں کہ بعد نکاح ہم مالدار کیوں نہ ہوئے؟ زیور سے ہمیں دلچسپی کیوں نہیں؟ اپنے عزیزوں سے ہمیں محبت کیوں ہے؟ پردہ کے مخالف کیوں ہیں؟ کلب میں شرکت کے مخالف کیوں ہیں؟ عورتوں کی مضمون نگاری اور شاعری کے مخالف کیوں ہیں؟ تمام گھر کی کنجیاں ان کے قبضہ میں کیوں نہیں دے دیتے؟ بھڑک والے کپڑوں کے مخالف کیوں ہیں؟ ننھے میاں کو گود میں لے کر سڑک پر کیوں نہیں ٹہلتے؟ بدمزہ کھانوں پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ نماز کی پابندی کا حکم کیوں دیتے ہی؟ گھر کی صفائی پر کیوں چلایا کرتے ہیں؟ تھیٹر

اور سنیما کی برائی کیوں کرتے ہیں؟ اور سب سے آخری بے وقوفی یہ کہ مضامین کے اندر ''اُن'' کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں؟؟

امید ہے کہ ناظرین مذکورہ بے وقوفیوں میں کوئی بے وقوفی پسند کر کے اختیار فرمائیں گے تاکہ حسب دستور دنیا انھیں عزت وعروج حاصل ہو کہ کہا ہے:

بے ہنر ارجمند و عاقل خوار

◆◆◆

جاڑا

یہ ایک موسمی بحث ہے کہ "جاڑا" کیا ہے، کون ہے، کیسا ہے، کیوں ہے، کس لیے ہے، کس کام کا ہے، کس کے لیے ہے اور اگر ہر حال میں ہے تو ہو، ہمیں اس سے کیا کام؟ اور اسے ہم سے کیا؟

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ اگر جاڑا نہ ہوتا یا نہ تھا یا نہ ہو تو کیا ہو؟ تو یہاں آ کر انسان کے "آنکھ، کان، ناک، چہرے، حلق، گردن، سینے، پیٹ، پاؤں اور تلوؤں کی مجموعی درخواست ہوتی کہ "خدا کرے اب تو ایسا جاڑا نہ پڑے"۔

بعض کم مایہ محققین کا یہ خیال ہے کہ جاڑا فصل ربیع کے لیے بے حد مفید و ضروری ہے۔ تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کہاں کا گیہوں یا چنا تھا جو اس پر جاڑا مسلط ہوتا ہے؟ تو اس موقع پر ادنیٰ درجے کے محققین کی یہ تحقیق ہے کہ اگر گیہوں نہ ہوتا تو پھر انسان مر جاتا، مگر انسان کی عقل کہتی ہے اور کس قدر بجا کہتی ہے کہ: "انسان کو گیہوں کے ساتھ جاڑا کھانے کی ہدایت کہاں لکھی تھی" یا اگر گیہوں پر ہی مدارِ حیات تھا تو یہ کہاں ثابت کیا کہ گیہوں سے پہلے چار چار ماہ تک جاڑا کھاتے پھریے پھر گیہوں ملے گا۔

غرض ایسے بے شمار منطقی سوالات ہیں جو جاڑے کے متعلق کیے جا سکتے ہیں، لیکن امید نہیں

کہ فیصلہ بغیر ''کوتوالی'' یا گھوڑا سوار پولیس کے ہو سکے، اس لیے اس حصہ تحقیق وتلاش کی خشکی سے باہر نکل کر عملی دنیا میں ''جاڑے'' کے ''حقائق ومعارف'' عرف ''مصائب ومظالم'' کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ پس واضح ہو کہ جاڑا اس مزاجی کیفیت کا نام ہے جس کے تحت انسان یکا یک ''افوہ'' کہتا ہے ''سی سی'' کرتا ہے یا آگ کے پاس جا بیٹھتا ہے یا لحاف پر لحاف اوڑھے چلا جاتا ہے مگر نہیں شرماتا یا جسم پر کپڑے پر کپڑا پہنے چلا جاتا ہے مگر نادم نہیں ہوتا۔

جاڑا اس خاص لرزش یا کیفیت کو بھی کہتے ہیں جو ظالم و جابر افسر کے سامنے جانے سے ملازم کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی جاڑا ہوتا ہے کہ آپ کوکین چرا کر لے جا رہے ہوں اور لاہور اسٹیشن پر پولیس آپ کو دھر لے۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ آپ کو دفتر جاتے ہوئے راستہ میں دیر ہو جائے اور دفتر میں افسر آ چکا ہو۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ لکھنا پڑھنا آتا نہ ہو اور کسی رسالہ کو جاری کر دیں اور مہینہ بھر کوئی مضمون وصول نہ ہو۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ آپ کے پاس ریل کا ٹکٹ نہ ہو اور ٹکٹ کلکٹر سامنے آ جائے۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ آپ فوج میں ملازم ہوں اور یہ فوج لام پر جانے لگے۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ آپ کسی محلہ والے کی گواہی میں عدالت جائیں اور وکیل لوگ آپ کو جرح پر دھر لیں۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ آپ کی ''اُن'' کا زیور سود میں گھل جائے۔ یہ بھی جاڑا ہے کہ گھوڑ دوڑ میں آپ کا گھوڑا پیچھے رہ جائے۔ وعلیٰ ہٰذا۔ ہوا میں سردی پیدا ہو جانے سے یا سردی میں ہوا پیدا ہونے سے جاڑا بنتا ہے اور جب بن جاتا ہے تو اس کا اثر انسانوں پر اور انسانوں کے کاروبار پر یا انسانوں کی صحت پر جس طرح پڑتا ہے وہ ملاحظہ ہو:

یورپ والوں کا جاڑا:

یورپ میں جو جاڑا پڑتا ہے وہ ہندستان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً وہاں بعض ممالک میں جاڑا پڑتا ہے تو پڑتا چلا جاتا ہے۔ اس میں چھ ماہ سے آٹھ ماہ بھی صرف ہو جاتے ہیں اور بارہ بھی۔ اس لیے وہاں اس کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے بے شمار تدابیر بھی اختیار کر لی گئی ہیں اور یورپ کے اس ششماہی جاڑے سے یہ کلیہ غلط ہو جاتا ہے کہ جاڑا محض غلہ پیدا کرنے کے لیے پڑتا ہے ورنہ آپ ہی بتلایئے کہ یہ بارہ مہینے دنیا کے کس ملک میں گیہوں پیدا ہوتے ہیں تو ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔

بہر حال جاڑا یورپ میں شروع ہوتا ہے تو وہاں کے لوگ باگ گرم سے گرم کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ شراب کی مقدار میں بقدر ڈیڑھ چھٹانک اضافہ کر کے جسم میں حرارت کو بڑھا لیتے ہیں۔ انڈے معمول سے زیادہ کھاتے ہیں اور چائے تو اسی لیے ایجاد کی ہے کہ یورپ کی دن رات کی سردی سے خون میں جو جمود پیدا ہوا سے چائے کی حرارت سے متحرک کر دیا جائے۔ پھر بھی اگر جاڑا زیادہ ہو جاتا ہے تو یورپ کے لوگ گھروں سے باہر نکل کر کھیت پر، کارخانوں میں، ریلوں پر، ٹراموں پر، موٹروں پر، بازاروں میں اور دفتروں میں کام کاج میں پوری تیزی کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں لیکن جاڑے کی وجہ سے کوئی کام بند نہیں ہوتا اور یہ تمام سامان ان کے پاس اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ہمت واستقلال سے اپنی جانیں قربان کر کے ایشیا کے ممالک فتح کیے ہیں اور اب وہ بے شمار دولت ایشیا سے لے جاتے ہیں۔

مالداروں کا جاڑا:

ہندستان میں جاڑے کے مختلف اثرات ہوتے ہیں جس کے نمونے یہ ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے جاڑا ہندستان کے مالداروں کو محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ہندستانی مالدار لوگ عوام سے بالکل جداگانہ مزاج اور اعضا لے کر پیدا ہوئے ہیں یا جاڑے ہی کو ان سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ یہ لوگ جاڑا دور کرنے کے لیے جو ہتھیار فراہم کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

گاجر کا حلوا، چیٹھے کا حلوا، انڈے کا حلوا، مرغ کا حلوا، موصلی کا حلوا، کبوتر کا حلوا۔

فلالین کی پتلون، کشمیرے کا کوٹ، اون کی بنیان، مانچ من روئی کا لحاف، لال املی کانپور کے گرم دستانے، گرم موزے، گرم مفلر۔

ان لوگوں کے پختہ اور ہوا سے محفوظ مکانات سردی شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل آگ کی مشینوں سے گرم کر دیے جاتے ہیں اور یہ سردی کے وقت لحاف اوڑھ کر یا تان کر یا لپیٹ کر لیٹ جاتے ہیں۔ ان مکانوں میں جو خدام ہوتے ہیں وہ ہر وقت آگ روشن رکھتے ہیں، مگر خود ان کے پاس مالک کی طرح گرم کپڑے نہیں ہوتے اور وہ رات بھر آگ کے پاس پڑے ''سی سی'' یا ''سوں سوں'' یا ''ارے ارے'' یا ''ارے ہائے رے'' یا ''ارے اللہ'' کرتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی ارے ہائے رے مار ڈالا بھی کہہ دیتے ہیں مگر ان کے مالکوں کو ان کی پروا نہیں ہوتی۔ ہندستانی مالداروں

میں سے اکثر شراب بھی پی لیتے ہیں اور چونکہ مسلمانانِ ہند پچاس برس سے علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں اس لیے دینی مسائل ذرا بھول سے گئے ہیں۔

مزدوروں کا جاڑا:

ان لوگوں کے پاس جاڑا یا تو آتا ہی نہیں یا آتا ہے تو یہ لوگ اسے پہچانتے ہی نہیں یا پہچانتے تو ہیں مگر اس کے لیے کسی تیاری کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ لوگ عین اس وقت جب بڑے مولوی صاحب کے مرغے اذان دینا شروع کرتے ہیں نیند سے فارغ ہوکر بڑی بڑی جمائیاں لینا شروع کردیتے ہیں۔ جسم پر کھادی کی ایک ایسی میلی اور پھٹی ہوئی چادر ہوتی ہے جسے وہ کبھی اوڑھ لیتے ہیں اور کبھی چادر انھیں اوڑھ لیتی ہے۔ اس چادر سے صرف ان کی پشت کا حصہ تو چھپا رہتا ہے باقی حصہ ''عیاں راچہ بیاں' کی تفسیر ہوتا ہے۔ یہ جمائیاں لے کر اٹھے اور لوٹا لے کر میونسپل بورڈ گئے، وہاں سے آکر رات کی نیم مردہ آگ کی کسی بڑی سے بڑی لکڑی کو ذرا ٹھونکا اور دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھا کر بیٹھ گئے کہ اتنے میں ان کے ''ننھے میاں'' کی والدہ بیدار ہوئیں اور ''حوائج صحی'' سے کبھی فراغت حاصل فرمائی اور کبھی بغیر فراغت ہی چکی پر جو بیٹھیں تو ''سیاں تورے نیناں'' کی قوالی سے صبح صادق تک سب کچھ پیس کر دھر دیا اور پھر جو چولہا سنبھالا تو طلوع آفتاب سے پہلے پہلے سب کچھ پکا پکوا کر رکھ دیا۔ اب یہاں سے مزدور جماعت کا ''ناشتہ سحری'' مختلف فیہ ہے۔ بعض کا یہ عمل ہے کہ ناشتہ کے یہ موٹے موٹے ہاتھی کے روٹ میتھی کی بھاجی سے اسی وقت تناول فرمالیے جاتے ہیں اور پھر مزدوری کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہیں اور اکثر کا عمل یہ ہوتا ہے کہ ناشتہ مع اہل وعیال لے کر گھر سے نکلے اور ''کام پر'' پہنچ کر کام شروع کر دیا اور ٹھیک اس وقت جب دوپہر کو آفتاب ہندستانیوں کے دماغوں سے عقل وخرد، ہوش وحواس کی چربی پگھلاتا ہے یہ کثیر العیال وقلیل المعاش مزدور صاحبان کام سے ذرا ہٹ کر او نچے نیچے پتھروں، چٹانوں اور نالیوں کے کنارے بیٹھ کر ''روٹ'' چٹنی دال اور بیگن کا بھرتا یوں تناول فرماتے ہیں کہ ''بکنگھم پیلس'' کے شاہی ڈنر اور ''لندن'' کے لارڈ میئر کی سرکاری ضیافت کا سارا لطف اللہ پاک انھیں عطا فرما دیتا ہے یا یہ اللہ پاک سے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ کھانا کبھی ''مولی لنچ'' کبھی ''بھاجی لنچ''، کبھی ''چٹنی لنچ'' اور نہیں تو ''خالی روٹی لنچ'' کہلاتا ہے۔ ان تمام ترکاریوں اور ''اغذیہ تیلیہ''

میں گھی کا کہیں شبہ بھی نہیں ہوتا البتہ سردی کا کبھی خفیف سا احساس بھی ہو گیا تو کسی ترکاری میں ''تلی کا پٹرول'' ذرا زیادہ ڈال دیا جاتا ہے اور جس دن یہ ''پٹرول'' زیادہ ہو جاتا ہے اس دن بھر اس گھمنڈ کے ساتھ سرد ہواؤں میں چہل قدمی ہوتی رہتی ہے کہ ''آج تو گرمائی کھائی ہے''۔

غرض ''ناشتۂ سحری'' لے کر گھروں میں یہ جماعتیں اس وقت تک کام پر پہنچ جاتی ہیں جب مالک کارخانہ ''آرام میں ہوتا ہے''۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے ''ننھے میاں'' ہوتے ہیں اور بہ تعداد کثیر ہوتے ہیں گویا وہ مزدور ہی نہیں جس کے ساتھ ایک سے لے کر سات آٹھ ولیعہد نہ ہوں۔ اسی مقدار میں ان کی ''ولی عہد نیاں'' بھی ہوا کرتی ہیں جو سب کے سب یا ''ننگ دھڑنگ'' یا ''نیم دھڑنگ'' ضرور ہوتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ یہ تمام ''شیر خوار'' ان مزدوروں کے ساتھ ہی رہتے ہیں کیونکہ مزدوری میں ان کی ''بیگمات'' بھی ان کی معاون ہوتی ہیں۔ گھر پر کوئی نہیں رہتا، اس لیے مزدوروں کے یہ ننھے جانشین و قائم مقام لوگ گھر میں کس طرح رہیں۔ جب یہ ننھے ننھے بچے ان مزدوروں کے ساتھ صبح سویرے ٹھنڈی ہواؤں میں کودتے ہوئے کانپتے ہوئے اور روتے ہوئے نکلتے ہیں تو دوسرے راہگیر ان کے جاڑے کے تصور سے ان کی حالت پر افسوس کرتے ہیں مگر ان کے مزدور ماں باپ ان سے صرف اتنی ہمدردی فرماتے جاتے ہیں کہ:

''ارے چل رے''

''چلے ہے کہ نا ہیں''

'نا ہیں چلے تو مر''۔

یا زیادہ ناراضگی پر ان کے جاڑے سے مرے ہوئے نیلے اور کالے گالوں پر دو چار چانٹے رسید کر کے کچھ دور تک گھسیٹ لیا۔ بعض مزدوروں کے ''ولی عہد'' اگر سات مہینے کے ہی ہوئے تو انھیں کسی ''ٹوکری'' میں رکھ لیا اوپر سے کوئی ہلکا سا کپڑا ڈال دیا اور ''کام'' پر پہنچ کر کسی جگہ دھوپ میں رکھ کر ''ٹوکری حافظ'' کہہ دیا اور خود کام میں مصروف ہو گئے۔ کبھی کبھی ان کے ''ننھے میاں کی والدہ'' کوئی مصرعہ گنگناتی ہوئی آئیں اور ٹوکری میں سے ''ننھے میاں'' کو نکال کر ذرا پیار کیا اور دو چار مرتبہ اوپر کو اُچھالا اور ٹوکری کو درخت میں لٹکا کر:

''سو مورے بھیا''

''ارے موئے نتا''

کہہ کر پھر کام پر تشریف لے گئیں۔

شام کی سرد ہوائیں شروع ہوئیں تو انھوں نے پھر کوئی ہلکا سا کپڑا ڈالا اور سینہ سے لگا کر گھر لے آئیں اور آگ کے پاس ڈال دیا اور ''چکی کی مشقت'' شروع فرما دی۔ رات کو نہ بستر ہے نہ تکیہ نہ پردے ہیں نہ لحاف 308 قبل مسیح کے پھٹے ہوئے گودڑ اور چیتھڑے جمع کر کے ایک نے دوسرے پر ڈال دیے اور آگ کے قریب یوں لیٹ گئے گویا دنیا میں اب کوئی فکر ہی نہیں۔ شب کی سردی نے جو اثر شروع کیا تو کبھی کروٹ لیتے میں ''ارے رام'' منہ سے نکل گیا تو نکل گیا ورنہ یہ بھی نہیں۔

پس ان حالات کا ایک ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے کہ ہندستان میں ہر سال نہایت خاموشی سے کئی لاکھ مزدور صرف ذرا مر جایا کرتے ہیں اسی لیے مالداروں کو بھی ان بے پروا لوگوں کی کبھی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

ملازمین کا جاڑا:

ملازمین سے یہاں دس روپے سے لے کر پچاس روپیہ تک کے ملازمین مراد ہیں۔ کیونکہ ان سے زیادہ تنخواہ کے ملازمین جاڑے کو تسلیم نہیں کرتے۔ پس ملازمین کا جاڑا ایک ماہ قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ پتہ یوں چلتا ہے کہ ان کے نئے نئے لحاف اور اُون کی صدریوں کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے اور معمولی قسم کے کمبلوں کی خریداری بھی شروع ہو جاتی ہے۔ بعض پچھلے سال کے کوٹ خصوصاً ''ترکی اور یورپ کے مستعمل کوٹ'' نیلام سے خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ نیلام سے خریدے ہوئے کوٹ پر ان لوگوں کو اس قدر ناز ہوتا ہے کہ تمام محلّہ والوں کو فخریہ دکھائے جاتے ہیں اور ہر آن یہ گھمنڈ دماغ پر سوار رہتا ہے کہ اب ''جاڑا اس کوٹ میں کیا کر سکتا ہے'' اور نہیں تو ''نیم آستین کا شلوکا'' تو از بس تیار ہی رہتا ہے۔ ان حضرات کا شام سے دس بجے شب تک کا وقت ''چولھے کے پاس'' اور صبح سے دس بجے تک کا وقت ''دھوپ میں'' کٹتا ہے۔ یہ جب دفتر جاتے ہیں تو ان کے سر سے پاؤں تک ٹوپ، گلوبند، صدری، لبادا،

لحاف، کوٹ، گرم پاجامہ جکڑا ہوتا ہے اور اگر ان کا بس چلے تو یہ چار پائی اور چولھا تک دفتر میں لے جائیں۔ یہ دن بھر لحاف بدون کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کھانسی، زکام کی شکایت اکثر رہتی ہے۔ یہ جاڑے کے موسم میں اگر دو چار آنے کی ''گرم غذائیں'' کھالیں تو مارے اطمینان کے لحاف بھی نہیں اوڑھتے اور جو کہیں ''انڈے کی ٹکیاں'' مل جائیں تو ان کی گرمی اور گرم مزاجی محلہ میں مشہور ہو جاتی ہے۔ یہ خوف محلہ والوں پر کسی نہ کسی طرح ظاہر فرما دیتے ہیں کہ آج کل انڈے کھا رہا ہوں۔ ایسے لوگوں کے ''ننھے میاں'' کو اس موسم میں زکام شروع ہو جاتا ہے اور اس موسم میں ہر مرض کو یہ لوگ سردی کا اثر کہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے صبح کی ورزش، صبح کی عبادت، صبح کی چہل قدمی ترک ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس پارسال کے گرم کپڑے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ان ''پارسالی گرم کپڑوں میں'' اگر کسی کے پاس ''رنگین یا ریشمی شال'' بھی ہوا تو یہ پھر ''چلے کے جاڑوں'' کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

بوڑھوں کا جاڑا:

ان لوگوں کو جاڑے سے قبل ہی کھانسی کا دورہ شروع ہو جاتا ہے اور جوں جوں جاڑا قریب آتا جاتا ہے کھانسی کی رفتار 75 میل فی گھنٹہ تک ترقی کرتی جاتی ہے۔ ان کی کھانسی میں بعض کھانسیوں کا تار کسی لحہ نہیں ٹوٹتا۔ بعض کا شب کو زور ہو جاتا ہے۔ ان کی کھانسی اکثر بلغمی ہوتی ہے، جس سے گھر بھر پریشان اور نفور رہتا ہے اور محلے والے ترس کھاتے کھاتے ان پر تاؤ کھانے لگتے ہیں۔ جب یہ لوگ کھانسی کی پہلی ''اونہہ'' یا ''آخ'' شروع کرتے ہیں تو پڑوسی فوراً لاحول ولا کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ آگ دے دو، پانی پلا دو، چار پائی ہٹا دو، دھوپ میں بٹھا دو، تکیہ لگا دو، اوپر لے چلو، ٹوپ ڈھونڈ دو کا تقاضا ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جاڑے کی مقدار چاہے جتنی ہو مگر ان لوگوں کے اعضاء میں درد ضرور ہوتا ہے جس کے لیے ''موصلی سفید، بادیان خطائی، اجوائن...'' کا نسخہ ہر وقت ''کوفتہ بیختہ'' موجود رہتا ہے۔ یہ صبح سے دوسری صبح تک لحاف، صدری، لبادے، موزے اور روئی کے پاجامے میں لپٹے رہتے ہیں گویا جو جاڑا صبح سے شروع ہوتا ہے وہ کسی وقت کم ہی نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثر حضرات ''ذرا سی بے

احتیاطی'' سے خدا گنج چلے جاتے ہیں۔ حکیم اور ڈاکٹر ان لوگوں کے علاج سے بے حد تنگ اور گھر کے تیمارداراز حد پریشان رہتے ہیں۔ انڈے کا حلوا، پیٹھے کا حلوا ان کی شبانہ روز کی غذا ہوتا ہے۔

طلبا کا جاڑا:

یہ جاڑا نہایت تحقیق طلب ہے۔ یعنی طلبا کو اصل میں جاڑا محسوس بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اور محسوس ہوتا ہے تو وہ اس کی پروا کرتے ہیں یا نہیں؟ یا یہ کہ واقعی جاڑا ان کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا اور ہوا ہے تو صرف اسکول کے لیے؟ پھر جو جاڑا اسکول کے وقت محسوس ہوتا ہے وہ ہاکی اور فٹبال کے وقت کیوں محسوس نہیں ہوتا؟ یا تعطیل کے دن یہ محسوس تو ہوتا ہے مگر بہت کم کیوں یا پھر یہ کہ جس طرح موسم گرما کی چھٹی ہوتی ہے جاڑے کی کیوں نہیں؟ یا یہ کہ اگر جاڑا طلبا کو محسوس ہوتا تو ہو لیکن یہ ماسٹر انھیں کیوں چھٹی لینے پر اُکساتے ہیں؟ اور جاڑے کے زمانے میں گھر پر ماسٹر صبح و شام پابندی سے کیوں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو شب کا پڑھایا ہوا صبح سویرے کیوں سنتا ہے؟

غرض اسی قسم کے بے شمار سوالات ہیں جو طلبا سے جاڑے کے متعلق کیے جاسکتے ہیں یا طلبا جاڑے کے متعلق کر سکتے ہیں، لیکن سوالات سے چونکہ ہمیشہ منطق پیدا ہوتی ہے اور اب سائنس کے ہوتے ہوئے منطق ایک فضول سا علم رہ گیا ہے اس لیے آپ صرف یہ معلوم کیجیے کہ جاڑا شروع ہوتے ہی طلبا کو ذیل کی انگریزی اشیا کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

اعلیٰ درجہ کا گرم چیسٹر، سوئٹر، مفلر موزے، گرم اونی ٹوپ یا ہیٹ اور دستانے۔ پھر ان سب چیزوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور گرم ہونے کے علاوہ رنگین ہونا بھی از بس ضروری ہے۔ اور ان چیزوں کی فراہمی ایسے طلبا کے والدین پر بھی فرض ہے، جنھوں نے خواب میں بھی ان چیزوں کو نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا پھر یہ بھی ضروری ہے کہ چاہے والدین میں ان قیمتی چیزوں کی فراہمی کی مقدرت ہو یا نہ ہو مگر اسکول کے طالب علم کی سردی دور نہیں ہوسکتی اس وقت تک جب تک اس کو یہ سب ''انگریزی وضع کے گرم کپڑے'' نہ مل جائیں۔

یہ صبح سویرے پلنگ سے اٹھنے کے نہ عادی تھے نہ عادی ہوں لہٰذا جاڑے میں کون ہے جو انھیں حرکت تو دے دے۔ گو نیند سے یہ صبح ہی فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس طرح کہ کبھی کبھی لحاف سے منہ باہر نکال کر ماں باپ کو دیکھ لیا۔ اگر ماں باپ کو سوتا پایا تو عید کے برابر خوشی ہوگئی اور فوراً

لحاف کو منہ پر ڈال لیا۔ اس سلسلہ سے ایک آدھ گھنٹہ گزار لیا مگر کب تک؟ جب گھر میں کوئی ایک بھی پلنگ پر باقی نہیں رہا تو انھوں نے زور سے تڑاتا لینا شروع کر دیا۔ گویا ابھی نیند آئی ہے۔ ان حیلوں سے چھوٹی عمر کے بچے بہت زیادہ کام لیتے ہیں، مگر ماں باپ بھی چونکہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں اس لیے وہ بھانپ جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ جاڑا نہیں ہے بلکہ ''پڑھائی کا جاڑا ہے'' اس لیے وہ پوری بے دردی سے اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تو ادھر سے نہایت بیمار لہجہ میں جواب ملتا ہے ''سر میں سخت درد ہے'' جب یہ بھی نہ مانا گیا تو کہہ دیا ''رات کو کھٹملوں کی وجہ سے نیند نہیں آئی ابھی تو سوئے ہیں''۔ جب یہ بھی نہیں تو صاف کہہ دیا کہ آپ کو کیا خبر آج اسکول میں تعطیل ہے اور ساتھ ہی تعطیل کی کوئی ایسی وجہ بتلا دی جسے ماں باپ کے ماں باپ بھی نہ جھٹلا سکیں اور سو گئے۔ پھر جب یہ بھی ہو گیا اور تقاضا جاری ہی رہا تو اٹھے مگر اس طرح کہ ایک ہی کروٹ میں نصف گھنٹہ خرچ ہو گیا گویا ساری دنیا کی سستی کاہلی بیماری یا تھکن آج انھیں پر ختم ہو کر رہ گئی۔ بڑی ناراض صورت لے کر اسکول کے نام سے باہر گئے اور راستہ میں کسی باغ، پارک، پرانی مسجد یا اسکول کی کسی علاحدہ اور محفوظ عمارت میں دھوپ کا رُخ دیکھ کر بیٹھ گئے اور ایک گھنٹہ بعد ہاتھ کا رومال سر سے باندھ کر گھر میں آ کر کتابیں ذرا زور سے دے ماریں اور کہہ دیا بخار آ گیا۔ اس اطلاع پر والدہ نے تشخیص فرمالیا کہ بچہ پر سردی کا اثر ہو گیا۔ دوڑیں تو ہاتھ دیکھے، پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور بستر کر دیا۔ یہ بارہ بجے تک تو جس طرح ہوا بستر میں رہے لیکن جونہی والد صاحب نوکری پر چلے گئے سارا بخار دور کر کے باورچی خانہ میں آ گئے۔ والدہ نے روٹی پانی سے تواضع کی۔ کسی قدر بیمار لہجہ میں والدہ کے سوالات کے جوابات دیے اور پھر بستر میں۔

والد کے آنے سے پہلے اگر موقع پایا تو بستر میں ورنہ ہاکی یا فٹبال کی فیلڈ پر کھیلنے نہیں بلکہ ''طبیعت بہلانے'' چلے گئے اور خوب دل کھول کر کھیلے۔ والدہ سے کہہ دیا:

''دن بھر بخار رہا ابھی ابھی میں نے بہت کہا تو باہر گیا ہے تاکہ طبیعت بحال ہو جائے''۔

والد نے بھی تائید کی کہ ''ضرور سردی کا اثر ہو گیا ہے۔ کل سے ذرا اسے دیر سے اٹھایا کرو''۔ لیجیے کل کی غیر حاضری کا بھی پدری بندوبست ہو گیا۔ یا پھر اسکول پہنچ گئے۔ جس ماسٹر کا گھنٹہ نرم ہوا تو جاڑا محسوس نہیں ہوا لیکن جہاں کسی سخت ماسٹر کا گھنٹہ آیا اور طالب علم صاحب کے

ہاتھ پاؤں پر جاڑا شروع ہوا اور ماسٹر کے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ہی بید کی طرح لرزنے لگے۔ ماسٹر نے پہلی ہی نظر میں کہہ دیا "اچھا جاؤ جاؤ — دیکھو آج کا سبق کل سن لوں گا"۔ بڑی مستعدی سے فرمایا "جی ہاں سن لیجیے گا" اور گھر آ گئے۔

اب اگر بورڈنگ میں ہوئے تو آٹھ نو بجے بڑی جمائیاں لے کر اٹھے اور دھوپ میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئے دو چار ساتھیوں کے ساتھ اور انھیں وطن کے قصے یوں سنانا شروع کیے کہ دس اور گیارہ کا وقت ہو گیا۔ گھنٹی پر گھنٹی بج گئی تو آہستہ سے کہہ دیا کہ میرا پہلا گھنٹہ تو آج ختم ہی ہو گیا آپ جایئے اب تو میں کل ہی جاؤں گا۔

یہ تو وہ جاڑا تھا جو تمام قسم کے طلبا کو مختلف صورت میں محسوس ہوتا ہے لیکن طلبا کے لیے شب کا جاڑا اپنے اندر بہت خاصی یکسانیت رکھتا ہے۔

ماسٹروں، پروفیسروں اور ماں باپ کی سختی کا تقاضا ہوتا ہے کہ شام ہی سے کتابیں لے کر بیٹھ جائیں اور چاہے دل کہیں ہو، کسی خیال میں ہو، کسی تھیٹر یا سنیما کی یاد میں ہو مگر صبح کے لیے شام کو پڑھنا ہر حال میں فرض ہو جاتا ہے تو جاڑے کی راتوں میں روشنی کے پاس میز پر بیٹھے اور کمبل یا لحاف اوڑھ کر بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد بغیر کسی مشورہ کے "چارپائی" پر آ کر ذرا لیٹ گئے اور لحاف کو صرف پاؤں پر ڈال لیا اور کتاب برابر پڑھتے رہے لیکن ایسے بھی چلائے کہ تمام گھر نے سن لیا کہ "میاں پڑھ رہے ہیں" اور کبھی یوں گنگنانے لگے گویا ایک مصیبت ہے جسے گنگنا کر ٹال رہے ہیں، مگر ٹلتی نہیں۔ اسی عرصہ میں لحاف خود بخود گھٹنوں تک آ جاتا ہے۔ یہاں سے دوسری کتاب بدل لی جاتی ہے اس کے سبق کو ایک آدھ مرتبہ پڑھتے ہیں کہ لحاف پیٹ تک بڑھ آتا ہے، یہاں پہنچ کر پھر دو چار نعرے لگائے کہ لحاف سینہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اب یہاں سے یہ تحقیق بہت محال ہے کہ سینہ سے منہ پر لحاف پہلے آ جاتا ہے یا نیند؟ بہر کیف صبح سویرے کتاب یا بستر میں ملتی ہے یا چارپائی کے نیچے۔

اسی لیے تو یورپ کے جفاکش طلبا کے مقابل ہندستان کے کامیاب طلبا کا اوسط 5 فیصدی چلا آ رہا ہے۔

ہمارا جاڑا:

اس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ مثلاً موسم سے ایک ماہ پہلے ہی سے ''وہ'' کہنا شروع کر دیتی ہیں:

''اب کی تو جاڑا بہت کافی پڑے گا۔ خدا خیر سے لائے۔ ننھے کے لیے اب کی تو فلالین کی صدری بناؤں گی'' وغیرہ۔

ان اطلاعات کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''روپیہ کا بندوبست کرلو جاڑا شروع ہونے والا ہے''۔ دوسرا طریقہ جاڑا معلوم ہونے کا یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتی ہیں کہ:

''میرے لحاف کے لیے آج فلالین کے نمونے لیتے آنا''۔

گویا انھیں ہماری مالداری پر نہیں بلکہ ''شوہرانہ فرماں برداری'' پر اس قدر اطمینان ہوتا ہے کہ ہم ہر حال میں ان کے ''لحافی نمونے'' لاکر ہی رہیں گے اور یہ امر واقع بھی ہے کہ لانا ہی پڑتا ہے ورنہ چارا۔ اور بیس گھنٹے کا ''اہلیانہ عذاب'' کون خریدے۔ عام طور پر جاڑے کا ابتدائی مہینہ لوگ ہاگ لطف اور بغیر کسی تیاری کے گزارتے ہیں، مگر ہمارے یہاں ایک ماہ پہلے ہی ''لحاف ہائے رنگ رنگ'' کی تیاری اس لیے شروع ہو جاتی ہے کہ ''اُن'' کے خیال کے موافق کہیں سردی کا اثر بچوں پر نہ ہو جائے۔ ''لحافی مصارف'' میں جب نصف تنخواہ وضع ہونے لگی تو پھر ''ذرا بچوں کے لیے'' ''حلوے'' تیار ہوتے ہیں۔ آپ غور تو فرمایئے کہ پانچ پانچ سات سات برس کے بچوں کو کب یہ سلیقہ کہ وہ گرم حلوؤں اور مرکبات کا مطالبہ کریں۔ صرف ترکیب یہ ہے کہ بچوں کے نام سے وہ اپنا بھلا چاہتی ہیں اس لیے وہی سفید موصلی والا حلوا مع انڈے، اخروٹ، بادام، چلغوزہ، کشمش، گھی، خوبانی، مغز، انجیر، دودھ وغیرہ کے یوں تیار ہوتا ہے کہ پانچ سیر وزن کے دو مرتبان بھر لیے جاتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ حلوا اس وقت یاد آتا ہے جب پھول چند بقال کی تنخواہ سے قسط لے جا کر پیش کرتے ہیں اور جو کہیں درمیان میں جاڑا ذرا معمول سے سوا ہو گیا تو اس حقیر فقیر حلوے کا دوسرا ایڈیشن بھی تیار کیا جاتا ہے۔

اس حلوا بازی کے بعد ''ننھے میاں'' جمیلہ بیگم، اختر آرا بیگم اور خود ''اُن'' کے لیے اعلیٰ درجہ کے رنگین اونی موزے، گلوبند، گرم اونی شال اور بنیان از بس ضروری ہیں ورنہ ان میں سے ہر ایک پر ''سردی کے اثر کا خطرہ'' یقینی ولابدی ہے۔

اس کے بعد صرف بچوں کے لیے گرم ادویہ از قسم ہینگ سوہا کہ زعفران، جائفل، اجوائن، بیر بھوٹی وغیرہ کا ذخیرہ ہر وقت ڈبوں میں بھرا رکھنا پڑتا ہے کیونکہ 'اُن' کے حکیمانہ خیال کے مطابق کیا خبر بچوں پر سردی کا اثر کب ہو جائے۔

ادویہ کے بعد ایندھن کا ایک انبار چولھے کے پاس ہر وقت اس لیے جمع رکھنا پڑتا ہے کہ شب کو ہر پلنگ کے پاس متعدد چولھے روشن کیے جاتے ہیں ورنہ سردی کا اثر بچوں پر ہو جائے تو؟۔

یہ تمام چیزیں ''ہمارا جاڑا'' کہلاتی ہیں۔ یعنی اگر یہ تمام چیزیں فراہم کردی جائیں تو صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہمیں جاڑے سے کوئی خطرہ نہیں رہتا، لیکن ان سب سے جاڑا دور یا کم نہیں ہوتا۔ پہلے زمانہ میں تو ہم ایک روئی کا ٹوپ ایک مرزئی اور ایک چادر اوڑھ کر جاڑے کا موسم گزار دیتے تھے مگر اب ہے زمانہ ''علوم جدیدہ'' کا اور علوم جدیدہ کے معنی ہندستانیوں نے فقط یہ سمجھے ہیں کہ ''اپنی آبائی زبان'' آبائی لباس، آبائی کھانے، آبائی ورزش، آبائی طور طریقے ترک کر کے اگر عین یورپین بن جائیں تب تو ''تعلیم یافتہ'' ورنہ ''ابوجہل''۔ پس لازم ہے کہ بجائے لبادے کے چسٹر، مفلر، جرزی، گرم ترموٹ اور موزے ہوں۔ پھر لطف یہ کہ آبائی، قومی اور ملکی وضع کے خلاف شدید تر جاڑے میں بھی سر اور کان برہنہ رکھے جاتے ہیں تو تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ ابوجہل۔

اس لیے جاڑے ہونے پر یہ تمام 'یورپی کپڑے'' پہن لینے پر سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل ورنہ دیسی اور ملکی لبادے۔ مرزئی، صدری اور لکھنوی فرد کے استعمال سے گنوار یا مفلس سمجھے جاتے ہیں اور سمجھتا کون ہے۔ یہی 'نیم مہذب ہندستانی''۔

پس ہمارے لیے بھی ان کپڑوں کا استعمال از بس ضروری ہوتا ہے۔ نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ''تین تنخواہیں گھر میں نہیں لا سکتے'' کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے۔ صرف دوستوں میں ''بڑے شاندار فیشن ایبل سمجھے جاتے ہیں'' اور بس۔ ان سب کے بعد اصل جاڑا یوں شروع ہوتا ہے کہ صبح سویرے سے کہا جاتا ہے:

''لو اس لونڈے کو'' یعنی ننھے میاں کو

میرے تمام کپڑے تر بتر کر دیے۔ اب نماز کیسے پڑھوں اٹھے کہ نہیں۔

بڑی مشکل سے کہا۔ لاؤ تو انھوں نے ننھے کو بستر میں داخل کر دیا۔ اب کاہے کو نیند آتی ہے۔ وہ رونے لگے اور ہم سمجھانے لگے۔ مگر صحن کی طرف دیکھتے رہے کہ دھوپ آئی کہ نہیں؟ نیند کا یہ زور کہ بس سو جاؤ تو اٹھنے کا نام بھی نہ لو کہ آواز آئی۔

''بستر ہی میں اسے گھونٹ رہے ہو

ذرا دھوپ ہی میں لے کر کھڑے ہو جاؤ''

اٹھے تو اب نہ چسٹر پہن سکتے ہیں نہ سوٹ۔ کیونکہ کوئی شخص یورپی لباس میں کسی دیسے ننھے میاں کا باپ قیامت تک نہیں رہ سکتا۔ اس لیے دیسی چادر ہی میں گود میں لیے صحن میں آ گئے لیکن وہ جاڑے کی نسیم سحری بھی اپنے وقت کی ''مارشل لاء'' ہوا کرتی ہے جہاں غلطی ہوئی ''گولی ماردی'' خلاصہ کے طریق پر اب صحن سے چولھے کی طرف دیکھا تو کریما کی ماں عرف ملازمہ ابھی خراٹے ہی لے رہی ہیں پھر بچے کے بہلانے اور کھلانے میں ایک ادیب کے اگر کوئی تکلیف دہ کام ہے تو صرف یہ ا کہ اس نا سمجھ کم فہم ''گوشت کے لوتھڑے'' سے آخر علم و ادب، تاریخ و فلسفہ یا معاش و اخلاق کے کس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ آہا، اوہو، وہ دیکھ میاں، وہ چڑیا اُڑی، وہ کبوتر آیا ایسے مہمل اور غیر مربوط جملے ادا کرنے سے تو ضمیر جس قدر شرماتا ہے دل ہی خوب جانتا ہے، لیکن مشکل یہ کہ اگر خاموشی سے گود لیے رہیے تو پھر ''گونگے بہرے'' اور خدا جانے کیا کیا مشہور ہوتے ہیں اور جس دن یہ ''ملازمت'' نہیں ملتی اس دن ''نسیم سحری'' کے جھونکوں سے نہ لحاف میں سیدھی طرح نیند آتی ہے نہ کمبلوں میں البتہ صبح سویرے تھکن کی جو بے ہوشی طاری ہوتی ہے اس کے اثر سے صرف نو دس بجے دن تک لحاف سے باہر آتے تو ہیں مگر آتے نہیں بنتا پھر لطف یہ کہ اگر دن کے نو دس بجے تک کوئی تقاضا بھی نہ کرے تب بھی ''حوائج صبح گاہی'' کے تقاضے جسمانی نظام کو جس بے دردی سے برہم کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ سب پر عیاں ہے۔ ان کا بیان کیا؟ کاش جاڑے کے موسم میں انسان پر کھانے پینے کی ''آمد نہیں تو برآمد'' ہی بند کر دی جاتی تو محکمہ چنگی کا کیا نقصان تھا؟ سمجھے بھی؟ بڑی دشواری سے منہ پر سے لحاف دور کیا کہ... پھر ہمت کی اور لحاف ہٹایا کہ... اس کوشش میں پندرہ بیس منٹ کی نیند بھی ہو گئی اور آنکھ کھلی تو چاہا کہ اب اٹھ ہی بیٹھیں کہ... پھر لحاف کو خوب

سا سنبھالا اور ہلکی سی نیند لے کر جو سر کھولا کہ... اب نیند کہاں تک جب تک یہ ذخیرہ ختم ہو گیا تو اب لحاف کے اندر سے اندازہ کیا کہ کون کون اٹھ بیٹھا ہے؟ اور کون کون باتیں کر رہا ہے؟ ہاں والدہ صاحبہ بھی اُٹھ گئیں۔ ارے یہ تو ابا میاں کی کھانسی کی آواز ہے لاحول ولا اٹھو بھی خدا جانے کیا بجا ہے؟ تو آخر کب تک پڑے رہو گے؟ استغفر اللہ جاڑا کیا ہو گیا بلا ہو گئی۔ اجی بس ہمت کر کے اٹھو، زیادہ دیر تک سونا بھی نحوست لاتا ہے۔ اس سے صحت بھی خراب ہوتی ہے۔

ان تمام علمی وفنی مذاکروں کے بعد نہایت غصہ سے چاہا کہ اٹھیں اور جو لحاف علاحدہ کیا ہے کہ... یہاں تک کہ اب وہ گھڑی آ گئی جو اچھے اچھوں کے حواس باختہ کر دیتی ہے۔ یعنی ''نوکری کا وقت'' اور اسی موسم میں پتہ چلتا ہے کہ ملازمت بہتر ہے یا تجارت؟ بس اس خیال کا آنا گویا جاڑے کا تمت بالخیر ہوتا ہے۔ سیدھے اٹھے اور مصروف ہو گئے ''اللہ ہمیں تمھیں'' اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔

جاڑے کے فوائد یہ ہیں:

1۔ اقسام وانواع کے حلوے کھانے کو ملتے ہیں۔

2۔ رات کو بستر میں آنکھ کھل جانے پر جب دیکھو رات ہی رات نظر آتی ہے۔ اس سے کاہل اور مجہول روح کو بے حد لطف آتا ہے۔

3۔ دوستوں کے ساتھ دن رات مارے پھرنے سے نجات ملتی ہے اور انسان اپنے گھر کے چولھے سے آگے نہیں جاتا۔

4۔ مضمون لکھنے کو خوب وقت ملتا ہے۔

5۔ مغرب کے بعد جب دیکھو گھڑی میں سات ہی بجے ہیں۔

6۔ گھر میں رہنے سے عورتیں سال بھر کی باتیں پوری کر لیتی ہیں۔

7۔ دماغ خوب سوچتا ہے اور خوب کام کرتا ہے۔

(دعا) مگر خدا صبح سویرے لحاف چھوڑ دینے کی تکلیف دشمن کو بھی نہ دے۔ آمین۔

◆◆◆

پھر ذرا علی گڑھ تک

خدائے فیاض وکرم گستر کی عطا کی ہوئی قوتوں میں ایک قوت کا نام ''ذوقِ سلیم'' بھی ہے۔ پس جس شخص کو ذوقِ سلیم عطا ہو جائے اس کو دنیائے رنگ و بو میں کسی رہبر و رہنما کی ضرورت نہیں۔ ایسا شخص اصل وحقیقت میں کائناتِ عالم کی ہر چیز کی خاصیت سے بغیر کسی وسیلے اور واسطہ کے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص کا ذہن فطرت و قانونِ فطرت کی نازک سے نازک گہرائیوں تک پہنچتا ہے اور تمام ادنیٰ واعلیٰ کیفیتوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا دماغ گو بظاہر ''ترکی ٹوپی'' کے اندر نہایت حقیر نظر آتا ہے، مگر اصل میں یہی دماغ ہوتا ہے جس کی رسائی کا تخت فرش زمین کی کشادگیوں سے بڑھ کر ہوا کی ان نازک روانیوں پر پرواز کرتا ہے جو پھولوں کی عطر بار اور عطر بیز کلیاں چٹکانے پر مامور ہیں۔ یہی دماغ ہوتا ہے جو کبھی کم خواب وریشم کے رنگ و رنگین بالش سے بھی گراں بار اور پریشان ہو جاتا ہے اور یہی وہ دماغ ہوتا ہے جو حسن و ملاحت کی بے پایاں نزاکتوں پر بھی اعتراض ونکتہ چینی کر گزرتا ہے۔ یہی دماغ دنیا میں نظم وحکمرانی کا سلیقہ سکھاتا ہے، اسی سے قوانین وضوابط منضبط ہوتے ہیں اور یہی ہوتا ہے جو کبھی صدائے نیم شبی سے بھی برہم و بے چین ہو جاتا ہے اور اربابِ مذاق سلیم کی اسی نازک دماغی پر ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے ایک روز بیٹھے بیٹھے یہ شعر لکھ دیا تھا:

صدائے نیم شب شاعر کے بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بے خوابی

پس واضح ہو کہ ایسے معارف آگاہ اور حکمت شناس دماغ دفاتر کے کسی ہیڈ کلرک، کسی سکریٹری یا پولیس کے گھوڑ اسواروں کو نہیں ملتے۔ یہ ملتے ہیں انھیں جن کی ایک جنبشِ قلم ہزاروں فلسفہ ہائے حیات مرتب کرتی ہے جو اقوام وملل کے عروج و کمال اور دنیائے انسانیت کی تہذیب اور اصلاح کے ذمہ دار ہو کر آئے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو یا ''بادشاہ'' کہتے ہیں یا ''شاعرو مضمون نگار'' پس اگر ان تینوں اقسام کے نازک دماغوں کو آپ سفر کے وقت بجائے وائسرائے کے سیلون کے ''تھرڈ کلاس'' میں ٹھونس دیں۔ تو ان کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ کر کے آپ ایک قہقہہ لگائیں یا رنج وافسردگی کے ایک بحرنا پیدا کنار میں غرق ہو کر رہیں گے۔ اب رنج وقہقہہ کی یہ متضاد کیفیت محض آپ کی قابلیت اور نااہلیت پر موقوف ہے کہ ان میں سے جسے چاہیں آپ اختیار کریں۔ اس کے بعد آپ کو یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ ''اپنے ملارموزی'' جو ادب وصحافت کے میدان میں چار اوپر دس برس سے سیاست ومعاشرت اور اخلاق و مذہب کے ہر شعبہ پر لکھ رہے ہیں ان کا ''تھرڈ کلاس'' میں سفر موزوں ہے یا غیر موزوں؟

28 نومبر 1929 کو ادب اردو کے شہرۂ آفاق محسن اور شعر وتصنیف کے استاد کامل حضرت مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی پروفیسر علی گڑھ کالج نے ایک لفافہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اذن بھیجا۔ غیر مطبوعہ اس لیے کہ اس مطبوعہ کے بیچ میں ممدوح نے ہولڈر سے بھی کچھ رقم طرازی فرمائی تھی۔ اس لفافہ کے اندر کاغذ میں علی گڑھ کالج کے اس سالانہ مشاعرہ کی شرکت کا اذن تھا جو جاڑے ہی کے موسم میں منعقد ہوا کرتا ہے۔ گویا سارے شعرا کی طبیعت اور موزونیت خیال کے لیے یہی موسم مناسب سمجھا گیا ہے۔ اس خط اور خط والے کے خلوص سے یقیناً محبت و مسرت ہی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن خط پڑھ کر آگ سی لگ گئی کیونکہ اس پر لکھا تھا'' کچھ کہہ کر بھی لائیے گا'' جس کے صاف معنی یہ تھے کہ ہم کبھی نہیں تو کم از کم 1928 میں شاعر ہو گئے یا ہو جائیں گے یا ہو کر رہیں گے یا جو ہوئے تو پھر ہوئے ہی ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں یہ بھی بتایا تھا کہ اس مشاعرہ میں شعرا کے ساتھ ادبا بھی شرکت فرمائیں گے اور چونکہ ہمارے ادبا ہونے میں

وائسرائے بہادر تک کو شبہ نہیں اور نہ آج تک وائسرائے نے کبھی ہمیں جھٹلایا اس لیے اپنے سفر کی آمادگی کا اظہار محترمہ ''والدہ ننھے میاں'' سے کیا تو جھنجھلا کر بولیں اور کرایہ کے لیے بولیں:

''تو آخر کہاں سے لاؤں؟

کیا میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ دھرا ہے؟

تو تم بھی لا دیا کرو دو سو روپیہ ماہوار

یہ تھرڈ کے دام ہیں، لیتے ہو تو لے لو''۔

ایک سوٹ کیس، دری سات من پانچ سیر تین چھٹانک دو لحاف، ایک گدا، ایک تکیہ اور ایک چادر کو پارسل کے بستر بند میں چری تسموں کے عوض ناریل کی رسی سے جکڑا تو مجموعی 34 سیر ہوا۔ گویا صرف ایک سوٹ کیس اور بستر کے بعد تانگہ میں ہمارے بیٹھنے کی جگہ باقی نہیں رہتی تھی، اس لیے تانگہ والے نے خود کہا: ''مولوی صاحب صندوق پر ہی بیٹھ جایئے''۔

ننھے میاں طول عمرہٗ ساتھ ہوئے کہ اسٹیشن پر ہم بھی چلیں گے۔ اس عمر کے تمام ''طول عمرہٗ'' کا مقصد اسٹیشن جانے سے ''خدا حافظ'' کہنا نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اسٹیشن جانے والے سے پیسہ اور روپیہ وصول کرنے جاتے ہیں اور تقریباً کروڑ روپیہ ہوتا ہے جو آئے دن اسٹیشنوں پر رخصت ہونے والوں کو اپنے چھوٹے بچوں کو دینا پڑتا ہے اور اس فضولی اور فضول خرچ کو علی گڑھ کے مولوی طفیل احمد سودی بھی برا نہیں کہتے۔ نہ لاہور کی ''انجمن اصلاحِ رسوم'' میں روپیہ دینے کی اس ''اسٹیشن رسم'' کے خلاف کچھ کہا جاتا ہے۔ عزیزم حامد خاں صاحب رفیقِ سفر تو کیا رفیقِ صندوق بھی تھے، اس لیے وہ گاڑی آتے ہی ہمارا صندوق لے کر ایک ایسے ڈبے میں گھس گئے جس میں مسافروں کی تعداد کھچا کھچ تھی۔

حامد صاحب ایک قابل سخن سنج اور شیوا بیان شاعر ہونے کے علاوہ دو متضاد قوتوں کے مالک ہیں۔ یعنی جس طرح ان کی شعری تخییل اپنے معاصرین میں گہر بار و گہر ریز ہے اسی طرح وہ جسمانیت کے لحاظ سے بھی چشم بددور خاصے ''فیلڈ مارشل'' ہیں۔ عمر اور دل کے بروقت نوجوان ہیں۔ ہمارے ہم سبق و ہم مکتب رہے ہیں اور اسی رشتہ کی نسبت سے انھیں جب ہمارے اوپر غصہ آتا ہے تو خاصا آتا ہے اور ترس آتا ہے تو بھی خاصا ہی آجاتا ہے۔ صرف سوال موقع اور مزاج کا

ہے۔ بارے آج کا موقع ''ترس اور رحم'' کا تھا، اس لیے انھیں فکر تھی کہ جس طرح بھی ہو' اپنے ملا رموزی' صاحب کو بہت آرام کی جگہ مل جائے، مگر ہم بہت حیران تھے کہ حامد صاحب ہم سے پہلے ہمارے طویل وعریض صندوق کو کیوں آرام پہنچا رہے ہیں؟ کرایہ ملا تھا سیکنڈ کلاس کا مگر حامد صاحب نے تھرڈ کا ٹکٹ لیا۔ خیر سے حامد صاحب صندوق لے کر ڈبے کے ایک ایسے ''کھچا کھچ حصہ'' میں پھنس گئے کہ جہاں تل تو تل ایک مسافر تک کے رکھنے کی گنجائش نہیں تھی، مگر حامد صاحب کی قوت ملاحظہ ہو کہ جھنجھلا کر صندوق کو ایک سوتے ہوئے مسافر کے کسی جسمانی حصہ پر یوں دھر دیا کہ وہ اپنی جگہ پر تڑپ کر بیدار ہو گیا۔ یہ ''تڑپ کر مسافر'' صاحب شہر سیالکوٹ پنجاب کے ایک ایسے ہندو عطار تھے جن کا مزاج ذرا گرم تھا اس لیے حامد صاحب سے انھوں نے بجائے صلح و مصالحت کے ''جنگ'' کی ٹھہرادی، مگر یہاں کس کا ڈر۔ حامد صاحب پہلے ہی ہر قسم کی فوجداری پر آمادہ تھے، اس لیے ریل کی روانگی سے قبل ہی دونوں کی ٹھن گئی اور چونکہ ہم بھی پلیٹ فارم پر ''ننھے میاں'' کو چہل قدم کرا رہے تھے اور مطمئن تھے کہ گاڑی میں حامد صاحب مل جائیں گے، جس کے صاف یہ معنی تھے کہ جگہ مل کر ہی رہے گی۔ ادھر ڈبے کے کھچا کھچ ہونے کے سبب حامد صاحب کی خیریت وخیر وعافیت کی اطلاع ہم تک پہنچنا محال ہو چکا تھا نیز ہم ریل کی سیٹی، اسٹیشن کی گھنٹی اور گارڈ کی ہری جھنڈی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے اور اگر ان چیزوں سے ہمارے اندر بھی عام مسافروں کی طرح گھبراہٹ پیدا ہو جائے تو پھر ہم ملا رموزی ہی کیا؟ اس لیے ریل کی روانگی تک ہم حامد صاحب کے ہندو مسلم فساد سے خبردار ہی نہ ہونے پائے۔ اِدھر ریل میں حامد صاحب کا یہ حال کہ جس طرح وہ مارے قہر وغضب کے سکتے کی حالت میں خاموشی کا منارہ بنے ہوئے کھڑے تھے کہ کب ملا رموزی صاحب آئیں اور میں اس مسافر بچہ کو کھا جاؤں۔ بس جب ریل روانہ ہوئی تو ہم نہایت ''وقارالملکانہ'' انداز میں یوں سوار ہوئے گویا تمام پلیٹ فارم ہماری سلامی کو حاضر ہے اور ہم ریل کا دروازہ کھولے ایک ایک کا سلام لیتے جا رہے ہیں اور اسی لیے جب پلیٹ فارم گزر جانے پر بھی ہم نے ڈبے کے اندر نہ دیکھا تو حامد صاحب سے رہا نہ گیا اور بولے:

''اماں اب سیر وتفریح تو رہنے دو، ذرا اِدھر تو آؤ''۔

موصوف کی اس جھنجھلاہٹ کے معنی یہ تھے کہ ذرا تم آکر میرے ہاتھ سے اپنا صندوق تو

لے لوتا کہ میں ''مسافر'' کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھادوں۔ ہم نے جو دیکھا تو دروازے سے حامد صاحب تک پہنچنا کارے دارد' اس لیے تھا کہ یہاں سے وہاں تک صرف ایک کے اوپر ایک مسافر ہی نہیں بیٹھے ہوئے تھے بلکہ گزرنے والے راستہ میں بستر پر بستر اور صندوق پر صندوق بھی یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے جنگ کے زمانے میں پلیٹ فارم پر ریل سے ہندستانی ریکروٹ اتر کر بھنے ہوئے چنوں کا حصہ لینے دامن پھیلا کر برابر برابر بیٹھ جایا کرتے تھے، اس لیے ہم نے اشارہ سے کہا کہ کس طرح آئیں تو فرمایا:

''بستروں پر ہی سے آجاؤ میں دیکھ لوں گا''۔

یہاں ''میں دیکھ لوں گا'' کا مطلب اور بھی وسیع ہو گیا تھا یعنی یہ کہ تمام بستر والوں سے میں جنگ کرنے پر تیار ہوں، مگر تم جس طرح ہو آجاؤ ان کے اس جرمنی ''الٹی میٹم'' سے اب تمام مسافروں نے ہماری طرف دیکھا اور اس طرح دیکھا کہ ''بھلا آؤ تو ہمارے بستر پر سے''۔

اس وقت ہماری حالت قابلِ دید اس لیے ہو گئی تھی کہ ادھر حامد صاحب تک جلد نہ پہنچنے پر ان کی خفگی کا ڈر اور اِدھر مسافروں کے بستروں اور سروں سے گزرنے میں مسافروں کے ''چمٹ جانے کا خطرہ'' اس لیے ہم نے بہت جلد سوچ ساچ کر دوسری طرف سے جانے کا جو ارادہ کیا تو حامد صاحب نے فرمایا:

''استغفر اللہ عجب احمق ہو''۔

یہاں احمق کے معنی بے وقوف کے نہیں بلکہ ڈرپوک کے تھے۔ مراد یہ تھی کہ جب میں کہہ رہا ہوں کہ اِدھر ہی سے آجاؤ میں سب کو سمجھ لوں گا تو تم دوسری طرف سے کیوں آرہے ہو۔ اس لیے چاروناچار کہیے یا ہمت و جرأت سے سمجھیے ہم نے دل میں ''یا علی''، ''مولا مشکل کشا علی'' کہہ کر جو بستروں پر قدم بڑھایا تو اس پار مگر اس ''بستری سڑک'' پر سے گزرتے ہوئے آہستہ آہستہ ہر مسافر سے کہتے جاتے تھے ''معاف فرمایئے گا''۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اس ''معاف فرمایئے گا'' کو حامد صاحب نے نہ سنا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اس مرتبہ ''امام الحمقا'' ہی کہہ دیتے۔ ہمارے پہنچتے ہی حامد صاحب نے صندوق تو کیا ہمارے حوالے اور اس لیٹے ہوئے گاماں پہلوان مسافر کا گلا پکڑ کر فرمایا:

''اٹھتا ہے یا پھینک دوں باہر؟''

لطیفہ یہ کہ اس جنگ کو تقریباً پندرہ بیس منٹ گزر چکے تھے مگر دوسرے مسافروں کا ''ہندستانی پن'' یہ تھا کہ ایک کو بھی ان دونوں میں صلح و مصالحت کرانے کی توفیق حاصل نہیں تھی۔ بس اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے گردنیں اٹھا اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھ تو لیتے تھے مگر بچانے کی ہمت جو نہیں ہوتی تھی سو کچھ تو ''ہندستانی نفاق پسند فطرت کی وجہ سے'' اور زیادہ اس لیے کہ دونوں تھے خاصے ''شنواری مزاج'' اور ''آفریدی تن و توش کے'' اس لیے ہر مسافر کو خطرہ تھا کہ ان دونوں کی گھمسان میں ہماری گاڑی پٹری سے نہ اتر جائے۔ بعض مسافر کبھی کبھی حامد صاحب سے کہہ دیتے تھے ''اجی خاں صاحب یہاں آجایئے، جانے بھی دیجیے'' یہاں ''خاں صاحب'' سے مراد جھگڑالو بہادر یا خطرناک آدمی ہے مگر حامد صاحب اس وقت کسی کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے۔ اُدھر لیٹے ہوئے فریقِ مقابل کی یہ ادا بھی کس قدر دلکش و دلنواز تھی کہ وہ لیٹے ہی لیٹے حامد صاحب سے نہایت وقار اور اطمینان سے کہہ دیتے تھے کہ:

''اٹھاؤ تو؟ اچھا اٹھا تو دیکھو''؟

اور جب وہ اس اطمینان اور سکون کا اظہار فرماتے تو حامد صاحب کا پارہ یوں کھول جاتا کہ بس آستین چڑھا لیتے۔ تنگ آکر ہم نے دہلی ایکسپریس کے ذریعے ان دونوں شنواریوں کے درمیان خاصا ''امان اللہ خاں'' کا کام دیا۔ کبھی حامد صاحب سے عفو و درگزر کی درخواست کی اور کبھی فریقِ مقابل کو ڈانٹا مگر جناب تو یہ وہ ہماری ڈانٹ کو کب خاطر میں لانے والے تھے، اس لیے تھک کر وہی پرانا ضابطہ اختیار کیا یعنی ''تنگ آمد بہ اٹھا پٹک آمد'' حامد صاحب کو جو آنکھ ماری تو انھوں نے گلے سے پکڑ کر ایک مرتبہ بھائی صاحب کو یوں بٹھا دیا گویا وہ اس سے پہلے کبھی لیٹے ہی نہ تھے۔ بس ان کا اٹھنا اور ہمارا اچک کر ان کی جگہ پر بیٹھ جانا ان کے لیے جس درجہ اذیت کا باعث ہوسکتا تھا ظاہر ہے مگر وہ جو کہتا ہے کہ ''مٹی کے دو برے ہوتے ہیں'' کیا کرتے۔ آہستہ سے کچھ گنگناتے رہے، مگر ہم تھے پھر ایک قسم کے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اس لیے مزاجوں کی اس ناخوشگوار فضا کو درست کرنے کے لیے بات کو یوں ٹال دیا کہ فوراً زمیندار کا ''سنڈے ایڈیشن'' اور مولوی ظفر علی خاں صاحب کی ایک ''بہار آرا نظم'' کا ایک شعر زور سے پڑھ کر حامد صاحب سے کہا:

''ظفر علی خاں بھی کس قیامت کا کہنے والا انسان ہے''۔

حامد صاحب چونکہ شاعر ہیں اور شاعر کے لیے کتابوں میں آیا ہے کہ:

شاعر را ہوئے بس است

فوراً ہی فرمایا۔ ذرا پھر پڑھنا۔ سبحان اللہ واہ واہ ارے بھئی پھر پڑھیو! اے سبحان اللہ واقعی ملا صاحب ظفر علی خاں تو مستقل شعر ہیں۔ ہم نے جب دیکھا کہ ان کا ملٹری جذبہ سول جذبہ سے بدل رہا ہے تو آہستہ سے اخبار ان کو دے دیا اور وہ مزے لے لے کر اشعار پڑھنے لگے اور ہم نے فریق مخالف سے نہایت لیاقت کے ساتھ گفتگو شروع کر دی اور ان سے حامد صاحب کے متعلق کہا کہ:

''بھائی صاحب یہ تو ہیں لونڈے (یعنی حامد صاحب) آپ کو خدا نے بزرگی دی ہے۔ آپ کو ہمیشہ دو باتوں کی برداشت کرنا چاہیے''۔

یہ گفتگو ہم نے اس قدر آہستہ کی کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی، مگر وہ چونکہ ہم دونوں کی زیادتی پر بھرے بیٹھے تھے۔ چیخ کر بولے:

''اجی خیال کر گیا ورنہ رستم بھی نہ اٹھا سکتا تھا''۔

ان کی اس چیخ پر حامد صاحب نے فوراً اخبار پٹک کر فرمایا:

''کیا ہوا؟''

تو ہم نے سمجھ لیا کہ ''اب نہیں رُکتی'' مگر فوراً حامد صاحب کو ہم نے یوں اشارہ کیا گویا ہم ان سے مذاق کر رہے ہیں، لڑائی نہیں۔ تو حامد صاحب نے کسی قدر مہربانی سے پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا اور یوں دوسری مرتبہ کی ''بلائے رسیدہ'' خیر و عافیت سے ٹل گئی۔ مگر ہم باز رہنے والے کب تھے اس لیے کہ صلح پسندی تو خاموش بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ چاہتے یہ تھے کہ ان ہندستانیوں میں جس طرح بھی ہو صلح ہو جائے، اس لیے سلسلۂ گفتگو کو سانس روک کر شروع کیا اور کہیں کہیں ہلکی ظرافت کی پھنکری جو استعمال کی تو مسافر صاحب کے تیوروں سے جنگی پالش کا رنگ اُڑنا شروع ہو گیا اور نوبت جینڈ بہ انجار سید کہ دونوں کی صلح ہو گئی اور تمام ڈبے والوں نے اب میدان صاف پا کر ہماری تعریف شروع کی۔ اب جو صلح صفائی کی فضا پیدا ہوئی تو ہر شخص کو اپنی ''دیکھ بھال'' کا

موقع ملا۔ کسی نے بیڑی سلگائی، کسی نے چلم۔ کسی نے نشست کا پہلو بدلا، کسی نے دل کھول کھانسی شروع کی۔ حامد صاحب نے اس ہنگامہ گستری میں ہمارا بستر سیٹوں کے درمیان یوں ٹھونس دیا کہ وہ ایک قسم کی نرم اور گداز سیٹ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے اسے جو آہستہ سے ذرا کھینچا تو تر بتر۔ ارے لاحول ولا کہہ کر جو نیچے جھانکا تو ایک لوٹا اوندھا پڑا تھا۔ ہمارے لوٹے والے مسافر صاحب گھبرائے کہ شاید اب یہ دونوں مجھ پر نہ ٹوٹ پڑیں تو بے چارے نے پہلے ہی دانت نکال کر کہا:

''حضرت جی لوٹے میں پانی تھا۔ آپ کے بھائی صاحب نے بستر کو اس کے اندر رکھا تو وہ گر گیا، میری خطا نہیں اور میں کہنا بھول گیا، معافی چاہتا ہوں''۔

چونکہ اس غریب کے لہجہ میں کسی قسم کا ''شنواری پن'' نہ تھا اس لیے ہم نے ان سے تو کہہ دیا:

''خیر کوئی پروا نہیں''

مگر دل میں بستر کی اس ''تری'' سے جس قدر تاؤ کھایا وہ ہم جانتے ہیں۔ فوراً یہ مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو گئے:

''ایں ہم اندر اکسپریس بالائے غم ہائے دگر''

عام قاعدہ ہے کہ ریل میں سوار ہونے کے بعد چاہے رفقائے سفر کی تعداد ہزار ہی کیوں نہ ہو ایک ڈیڑھ گھنٹے کی تفریح، ہنسی مذاق، گفتگو یا غزل خوانی کے بعد سب پر غنودگی یا خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا منہ تکتا ہے، مگر کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم لوگوں کا بھی یہی حال ہونے والا تھا کہ ہم نے ایک پاس والے مسافر کو گدگدایا جو بمبئی سے آرہے تھے اور ضلع مراد آباد کے کسی قصبہ کی پیداوار تھے۔ بمبئی میں ایک ''روٹی ہوٹل'' کے مالک تھے مگر تیور اچھے تھے، اس لیے ہمارے چھیڑتے ہی گلا صاف کیا۔ دو چار مرتبہ مرے ہوئے شاعروں کے اشعار سنائے اور ذرا سی خوشامد کے بعد گانا شروع کر دیا اور روشن خیالی ملاحظہ فرمایئے کہ اخبار پڑھتے پڑھتے جو غنودگی پیدا ہوئی تو اپنے ہی سوٹ کیس پر سر جو رکھا تو ہوٹل والے مسافر

صاحب کی قوالی ختم ہونے پر بھی بیدار نہیں ہوئے، اس لیے اس قوالی کے بعد ہم بھی:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب

کہہ کر سونے پر آمادہ ہو گئے اور بمقدار گنجائش سو بھی گئے۔

ہمیں علی گڑھ سے پہلے دہلی جانا تھا اس لیے حامد صاحب آگرہ سے علی گڑھ یوں چلے گئے کہ ہمارا ایک لحاف اور چادر یہ کہہ کر لے گئے کہ:

''اگر لحاف نہ دو گے تو میں علی گڑھ تک سردی کے کام آ جاؤں گا''۔

اور چونکہ ہم حامد صاحب کو کسی طرح سردی میں خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے:

قہر درویش برجان لحاف

سمجھ کر لحاف حامد صاحب کو دے دیا اور صبح ساڑھے سات بجے دہلی یوں پہنچ گئے گویا قطب جنوبی کی تلاش میں ہم ہوائی جہاز سے کسی ''برفستان'' میں گر پڑے ہیں۔ دسمبر میں دہلی کا جاڑا ویسے ہی کہاں کا حسب ضابطہ جاڑا ہوتا ہے، اس پر رات کو یہاں بارش بھی ہوئی تھی، اس لیے کہرا اور سرد ہوا سے ہر قدم پر ''دواخانہ یونانی'' دہلی یاد آ رہا تھا اور یقین تھا کہ آج دہلی کے تانگوں میں آگ سے دہکتے ہوئے چولھے بھی رکھے ہوں گے مگر افسوس کہ ابھی ہندستان نے اتنی ترقی نہیں کی۔ دروازہ پر میلی چادر اوڑھے ہوئے تانگے والوں نے ہمیں دھر لیا اور دہلی کے ہر محلّہ کا یوں نام لینا شروع کر دیا گویا ہم دہلی ہی کے قدیم باشندے ہیں اور یہاں کے ہر محلّہ سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام تانگوں والوں کے ''دیرینہ'' دوست بھی ہیں۔ آخرکار ایک تانگے والے نے بڑھ کر قلی کے سر سے ہمارے بستر اپنے تانگے کی طرف یوں کھینچ لیا گویا اصل میں یہ بستر انھی کی جائیداد تھا۔ ہم نے بھی تانگہ والوں کے نرغے یا جلوس سے یوں نجات پائی کہ فوراً اس ''بستر گھسیٹ تانگہ'' میں بیٹھ گئے یا تانگہ پر بیٹھ گئے اور کہا چل بھائی ''دفتر جمعیۃ العلما''۔ پہنچے تو دفتر کا دروازہ اس لیے بند تھا کہ ابھی صبح کے صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ دروازہ خوب ساٹھونک ڈالنے کے بعد آئے بھی تو کون کہ ایک عرب صاحب اور آتے ہی اردو زبان میں تانگے والے کو ڈانٹا۔ آپ ایک نئے عرب صاحب کی اردو اور پھر اس اردو میں ان کی ڈانٹ کا اندازہ فرما لیجیے، اس لیے جس قدر بھی عربی آتی

تھی مارے غصہ کے ہم نے ان سے سب کی سب بول ڈالی۔ تب جا کر انھوں نے ''اندر آنے کی سخت ممانعت ہے'' کا بورڈ ہٹایا اور ہم نے یہاں بستر ٹیک کر حضرت گرامی قبلہ مولوی حافظ حاجی احمد سعید خاں ناظم جمعیۃ العلما کے گھر کا رُخ کیا۔ آواز دی تو دریچہ سے جھانک کر آہا اور وعلیکم السلام کہہ کر جو دریچہ بند فرمایا تو پندرہ منٹ تک سناٹا طاری رہا۔ ہم سمجھے کہ حضرت مولانا چاہتے یہ ہیں کہ جب چائے تیار ہو کر سامنے آجائے تب ملا رموزی کو اندر آنے کی اجازت دیں تا کہ ملا رموزی سمجھیں کہ مولانا صاحب ہر وقت چائے ہی پیتے رہتے ہیں، مگر پندرہ منٹ بعد یوں اوپر بلا لیا کہ کھڑے ہو کر عمامہ سر پر باندھ رہے تھے۔ یاد بھی نہیں کہ ہم سے گلے بھی ملے یا نہیں مگر یہ یاد ہے کہ فرمایا:

''ملّا صاحب ترجمہ کے لیے جا رہا ہوں''۔

تو ہم نے بھی کہا ہم بھی حضرت اقدس قبلہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، صدر جمعیۃ العلما کے گھر جا رہے ہیں۔ فوراً ہی فرمایا کہ اچھا تو جمعیۃ کے دفتر میں آجایئے گا میں ترجمہ سے سیدھا وہاں پہنچوں گا۔

اتنے رقعہ میں ہم نے ایک ایڈیٹر صاحب ''پیشوا'' حضرت بقائی مدظلہ کی شان میں بھیجا جو اب آیا کہ ہوا خوری کو گئے ہوئے ہیں۔ کہنے والے نے یہ بھی کہا تھا کہ ''سو رہے ہوں گے''۔ رعب ڈالنے کو ہوا خوری کا کہہ دیا مگر دہلی سے واپسی پر معلوم ہوا کہ نہیں واقعی ہوا خوری کو گئے ہوئے تھے۔

اس وقت حضرت گرامی قبلہ مفتی صاحب چائے سے فارغ ہو کر مدرسہ کی تیاری فرما چکے تھے۔ جوں ہی کہ ہمیں دیکھا اٹھا فرما کر ارشاد ہوا کہ:

''اوپر کمرہ میں چلو چائے لاتا ہوں''۔

ہم نے بہت معذرت کی کہ حضور ہم چائے پی کر آئے ہیں مگر گرامی قدر مفتی صاحب کا اصرار غالب رہا اور ہم اوپر جا کر بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں ایک بڑی سی کشتی خود ہی لے کر تشریف لائے تو آنکھوں میں اس گرامی مراتب نائب رسول کے اسلامی اخلاق و تواضع اور مہمان نوازی کا وہ منظر آ گیا جو آج مسلمانانِ ہند سے اس طرح فنا ہو گیا گویا مسلمان خلیق و متواضع اور مہمان نواز تھے ہی نہیں اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسلامیہ کالج پشاور کا۔

دستِ اقدس سے ہمارے لیے چائے بنانے کا ارادہ فرمایا مگر ہمیں کہاں جرأت تھی کہ دین و مذہب کی اس آسمان جاہ اور فلک پائیگاہ ہستی کو اس درجہ زحمت دیں اور حقیقت یہ کہ حضرت گرامی کی دینی عظمت و جلالتِ قدر سے خود ہمارے جسم پر رعشہ تھا اور جب ایک مرتبہ ہم اپنی آلودۂ معصیت ہستی کو آٹھ کروڑ مسلمانوں کے اس ''مقتدیٰ اعظم'' کے سامنے پاتے تھے تو اس کے منصب و اقتدار کے تصور سے قلب پر ایک لرزش و ہیبت پیدا ہوتی تھی، مگر وہ اپنے اسی وقار و جلال کے ساتھ ہمارے ساتھ یوں کرم گستر تھے گویا ایک شفیق و مہربان باپ اپنے بچہ کو بہ صد اصرار کھانے پر مجبور کر رہا ہے۔ چائے نوشی کے وقفہ میں بہ کمال شفقت ہمارے متعلقین کی خیریت دریافت فرماتے رہے۔ ہمشیرہ کی علالت کی خبر سن کر علاج کے لیے کافی غور و تامل سے قیمتی مشورے عطا فرمائے۔ ہم نے دست بستہ دعا کی درخواست کی۔

فراغت کے بعد ارشاد ہوا کہ مدرسہ چلیے۔

جب حضرت گرامی دولت کدہ سے برآمد ہوئے تو دہلی کی تنگ و تاریک گلیوں سے اس جلیل العظمت ہستی کا ہزاروں سادگیوں کے ساتھ گزرنا ہمارے لیے تعجب، رنج و افسردگی کی متضاد کیفیات کا باعث تھا اور دل پر چوٹ لگی کہ آج جہالت آباد ہند کسی اسلامی شہنشاہی کے زیر نگیں ہوتا تو صدر جمعیۃ العلما کے جلو میں اس وقت عقیدت گزاروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہی ہوتے بلکہ شاہی حشم و خدم کے جملہ لوازم بھی ہمراہ رکاب ہوتے۔ پھر کس قدر بلند نصیب ہیں مسلمانانِ دہلی جن میں یہ عظیم المراتب ہستی روز یوں گزارا کرے گویا وہ ان کا کوئی دیرینہ پڑوسی ہے۔

مدرسہ امینیہ کی شاندار عمارت میں داخل ہوتے ہی حضور اقدس ''دارالحدیث'' میں داخل ہوئے۔ محترم طلبا نے سروقد تعظیم ادا کی۔ یہ حضور کی دینی حکمت آموزی اور نکاتِ شریعت کی وہ درسگاہ ہے جس سے ابراہیمؑ و محمدؐ اور خدائے عرش و فرش کی تعلیمات و الٰہیات کے وہ شیریں سوتے جاری ہیں جن سے تشنہ کامانِ عشقِ ایزدی کے لیے کوثر و تسنیم کے حیات افروز و روح آرا جُرعے تیار ہوتے ہیں۔ یہی وہ درسگاہ ہے جو کفر و فساد اور حرص و ظلمت کے اس مردود و ملعون دور میں انسان و انسانیت کی امن و عافیت اور صلح و مصالحت، اصلاح و ترقی اور تہذیب و اخلاق کے وہ مرتب اور مکمل ضوابط تیار کرنا سکھاتی ہے جن کی نظیر و مثال سے دنیا کا جامع سے جامع قانون و ضابطہ عاجز

ہے اور بے شک وشبہ عاجز ہے مگر مسلمانوں کو کہاں فرصت کہ وہ ایل۔ ایل۔ بی اور ایم۔ ایس۔ سی کے امتحانوں کے بعد کبھی دین و دنیا کی مکمل روشنی کی ان شعاعوں سے مستفید ہوں جو دہلی کے اس گوشہ سے پھیل رہی ہیں۔ طلبا میں تقریباً دنیا اور ہندستان کے ہر گوشہ کے باشندے موجود تھے، مگر وہی جن کے دماغ خدائی عرفان والفت اور مصطفوی عشق وشیفتگی کے جذبات سے لبریز و مالا مال ہیں۔ طلبا کی حاضری 180 ہے۔ سنہ افتتاح 1315ھ ہے۔ مدرسہ امینیہ ایک شاندار اور پختہ عمارت میں ہے جس کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ اس کے در و دیوار کی قدامت وتعمیر بتا رہی ہے کہ مسلمانانِ ہند تو ایک طرف مسلمانانِ دہلی ہی کو اس میں نماز کی فرصت نہیں۔ اس کا سنہ تعمیر 1138ھ ہے۔ اس کے جنوبی حصہ پر وہ مہمان خانہ ہے جس میں عالم اسلام کے علما اور فقہا کرام حضور اقدس صدر جمعیۃ العلما کے مہمان ہوا کرتے ہیں۔ سمت شمالی کے زیریں حصہ میں طلبا کے قیام کے کمرے ہیں اور انھیں حصوں کی دوسری منزل مدارج درس و تدریس ہیں۔ ہونا چاہیے تھا کہ حضور مفتی اعظم کے درس میں مسلمان فوج شریک ہوتے، مگر زمانہ ہے ''اسلامیہ کالجوں کا'' اور چندہ بھی کالجوں ہی کے لیے ہے۔ اس لیے پُرنم آنکھوں نے اس یادگار روزگار دارالعلوم کو اتنا ہی دیکھا اور بس پھر کیا ہوگا کہ اسلام کے آٹھ کروڑ نام لیوا کبھی اس اسلامی دارالعلوم کو دیکھنے ہی کی آرزو کریں۔

یہاں سے جمعیۃ العلما کے دفتر میں پہنچے۔ حضرت احمد زبیری ایڈیٹر اخبار ''الجمعیۃ'' رقمطرازی میں مصروف تھے۔ عملۂ جمعیۃ العلما کاتبوں سمیت جھوم گیا۔ خیریت خیر صلاً کے بعد حضور اقدس ناظم جمعیۃ العلما یعنی ''اپنے مولانا احمد سعید صاحب'' تشریف لائے۔ دیر تک شرف کلام عطا فرمایا اور ہماری استدعا پر حضرت حکیم حاذق مولوی محمد احمد صاحب برادر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم سے وقت ملاقات کے لیے خط دے کر روانہ کیا۔ حضرت حکیم محمد احمد خاں صاحب ایک حاذق، جید اور بے انتہا خوش اخلاق طبیب ہیں۔ امراض کی تشخیص کا ملکہ خداداد و خدا ساز ہے۔ اطلاع پر حضرت حکیم صاحب نے فوراً طلب فرمایا۔ حاضر ہوئے تو بکمالِ نوازش حالات دریافت فرماتے رہے۔ چند قیمتی نسخے عطا فرمائے۔ ارادہ تھا کہ یہاں سے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی آزاد مسلم یونیورسٹی دہلی عرف ''جامعہ ملیہ'' کو دیکھیں گے۔ ہلال صاحب نے فرمایا کہ میں اس وقت کالج جانے والا ہوں جس کے صاف معنی یہ تھے کہ میں بی۔ اے ہونے والا

ہوں۔ مجھے سمجھا کیا ہے؟ اس لیے بخدمت شریف جناب ایڈیٹر صاحب اخبار ''الامان'' حاضر ہوئے۔ پہلے تو نہ پہچانے پھر پہچانے تو ''جان کو آ گئے''۔

''میرے ہاں کیوں نہ ٹھیرے؟''

''جی ہاں اب ہمارے یہاں کیوں آؤ گے؟''

''بس بستر اٹھالاؤ''

''اجی بس یہاں ٹھیرو۔ میں خلافت کے جلسے سے ہو کر آتا ہوں۔ پھر گفتگو ہوگی۔ ہاں وہ کتاب کا مسودہ تو درست کر جاؤ تاکہ پریس میں دے دوں''۔

''ہاں اب تو پریس اپنا ہی ہے۔ لاؤ جس قدر کتابیں ہیں''۔

مگر ہم جو یہاں سے ''پھر آؤں گا'' کہہ کر اٹھے تو سیدھے علی گڑھ کی ریل میں بیٹھ گئے اور سات بجے شام کے علی گڑھ کے اسٹیشن پر یوں اتر گئے گویا ہم کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ استقبالیہ کمیٹی کے ارکان تھے نہ حضرت نواب مزمل اللہ خاں صاحب نظر آئے۔ نہ کسی نے ''گو بیک سائمن'' کہا نہ کسی نے سیاہ جھنڈی بلند کی۔ یہ سب کچھ نتیجہ تھا بغیر تار دیے داخل ہونے کا۔ یہاں سے تانگہ پر سوار ہو کر حضرت گرامی نواب زادہ کپتان رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ نواب زادے کے قیام و داخلہ سے حقیقت میں کالج کی عملی و ادبی تحریکات میں ایک تازہ روح کا پھر دور شروع ہو گیا ہے۔ خصوصاً آپ یہاں کی ''انجمن خیابانِ اردو'' کے سالانہ مشاعرہ کی از سر گرفتہ جوانی کا باعث ہیں۔ آپ نہایت خلیق، متواضع، وسیع المعلومات اور مردم شناس نوجوان ہیں۔ آپ نے پچھلے سال اور اس سال بہت سے نامور شعرا اور ادبا کو اپنی شاہانہ مہمانی سے نوازا تھا۔ اس لیے جب آپ کی کوٹھی میں داخل ہوئے تو لطفِ کلام و طعام کی نعمتوں سے متمتع ہونے پر خیال ہوا کہ ہم اب ''فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہیں''۔

دوسری صبح کو جمعہ تھا۔ یونیورسٹی کی مسجد میں نمازِ جمعہ کو حاضر ہوئے تو کالج اور یونیورسٹی کے ''تمام میں'' اطلاع ہوگئی کہ ''اپنے ملا رموزی صاحب'' آ گئے۔ دوستوں کے حلقۂ ادبیہ و علمیہ میں غل ہوا ''لو ملا صاحب بھی آ گئے'' حسود اور مخالفوں میں تہلکہ پڑ گیا کہ ''لیجیے وہ میاں ملا رموزی بھی تو آ دھمکے''۔ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی کا علم نہیں کہ اسے خبر ہوئی یا نہیں۔ حضرت نواب سر محمد مزمل اللہ خاں

صاحب" عدیم الفرصت تھے"۔

جامع مسجد میں داخل ہوئے تو طلبا نے بھی دیکھ لیا اور فوراً ایک دوسرے سے کہنی مار کر کہا:

"آہا یہ ملا رموزی کھڑے ہیں ملا رموزی"

دوسرے نے کہا ہوگا" کیا گلابی اردو والے ملا رموزی؟"

تیسرے نے کہا ہوگا" ہاں ہاں گلابی اردو والے"۔

چوتھے نے کہا ہوگا" چلو یار مصافحہ کریں"۔

پانچویں نے کہا ہوگا اور محض اپنے بوٹ سوٹ کے گھمنڈ پر کہا ہوگا" ملا صاحب ہیں تو کھڑا رہنے دو وہ کہاں کے سُرخاب کے پر ہیں"۔

چھٹے نے کہا ہوگا اور اردو اخبارات و رسائل میں مضامین پڑھ کر کہا ہوگا" تم بے چارے پائنیر اخبار کے پڑھنے والے ملا رموزی کی ظریفانہ سیاست آگاہی اور ادبی عظمت کو کیا خاک سمجھ سکتے ہو؟"۔

ساتویں نے کہا ہوگا" اماں یہ تو ہیں ابھی خود طالب علمی کے گنبد میں، چلو ہم تم چل کر ملا صاحب سے ملیں"۔

اس لیے کثیر طلبا نے معانقہ اور مصافحہ کیا۔ یہی حال پروفیسروں کا ہوا۔ بعض نے گھر پر بلایا، بعض خود قیام گاہ پر آئے اور بعض نے کہا ہوگا:

"آنے دو ملا رموزی کو وہ کہاں کے افلاطون ہیں"۔

یہی حال دوستوں کا ہوا۔ بعض نے دوڑ کر معانقہ کیا، بعض مارے مسرت کے اٹھا کہہ کر اُچھل پڑے، بعض نے مارے خلوص کے ہماری چار پائی اپنے کمرہ میں خود بچھادی اور سفر کے حالات دریافت کرتے رہے اور بعض نے یہ بھی نہ سوچا ہوگا کہ ملا رموزی کے آنے سے مسرت کیوں ہو؟

ٹھیک یہی حالت محکمہ پولیس کی ہوئی جس کے ایک سپاہی نے بھی سوال نہ کیا کہ آپ کو سفر میں کوئی زحمت تو نہ ہوئی۔ آپ کے پاس روپیہ بھی کافی ہے یا کچھ اور چاہیے؟

غرض جامع مسجد ہی سے حضرت محترم مولوی علی احسن صاحب مارہروی کے صاحبزادے

ہمیں اپنے گھر یہ کہہ کر لے چلے کہ حضرت قبلہ آپ کے منتظر ہیں، یونیورسٹی کے بنگلہ نمبر 5 میں مولانا احسن یوں مقیم ہیں گویا وہ آپ ہی کی جائیداد ہے۔ حضرت مولانا احسن چونکہ خود ادب اردو کے ایک قابلِ عظمت اور پختہ کار رکن ہیں اور ایک معنی آگاہ ''شعر باز'' بھی اس لیے ہمیں دیکھتے ہی یوں جھوم گئے کہ جو جھومے تو جھومے ہی جھومے۔ پھر بڑی شفقت سے آرام کرسی پر بٹھایا اور جو صاحب باتیں شروع ہوئی ہیں تو کامل دو نمازوں کا وقت گزر گیا جو آج کل کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے پس جو کچھ فرماتے تھے اس خلوص و شفقت سے گویا آپ اس دنیا میں ہماری ذات سے جو محبت فرماتے ہیں وہ علی گڑھ کالج سے بھی نہیں۔ مولانا سے ہماری دلچسپی کا سبب یہی کہ ہم کیا دنیائے ادب مانتی ہے کہ مولانا ایسے ادیب شہیر اور وقادطبع اور نقادنظر بزرگ کا ہر تجربہ اصل میں ایک قابل تقلید سبق ہوا کرتا ہے اور ایسے ہی تو ہیں ''جن کے سایہ میں پل کر ادب اردو جوان ہوا ہے'' یہاں سے حضرت مولانا نے فرمایا:

''ہمارے پرنسپل صاحب تمھاری ملاقات کے بے حد شائق ہیں''۔

اور یہ کہہ کر اس طرف ہمیں لے چلے کہ پرنسپل صاحب کا دولت خانہ کہیں جسے۔ اطلاع پر حضرت پرنسپل صاحب تشریف لائے تو حضرت مولانا احسن نے فوراً ہی تو کہا کہ ''یہ ہیں حضرت ملا رموزی''۔

حضرت گرامی قدر عبدالمجید صاحب قریشی ایم۔ اے علیگ ایک بلند وقار متین اور اسلامی خلق و تواضع کے قابلِ عزت اور لائقِ احترام بزرگ ہیں۔ آپ کے ادبی ذوق و دلچسپی کے لیے یہ جملہ بہت کافی ہے کہ آپ پنجاب کی اس سرزمین کے ایک فرد ہیں جس نے اپنی ادب نوازی اور ادب پروری سے ہندستان کے دوسرے صوبوں کو سوائے ہماری ذات کے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بڑی تواضع سے اپنے پاس والی کرسی پر بلا کر بٹھایا اور مضامین و ملاقات کے شوق بے نہایت کا اظہار فرما کر ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ گفتگو میں حضرت مولانا احسن کی موجودگی کی رعایت سے حقہ کا دور چلتا رہا، جس سے ہم بھی ''بہ مقدار کھانسی'' مستفید ہوتے رہے۔ ساری گفتگو ادبِ اردو، شعرِ اردو اور ''اصولِ مشاعرہ'' پر ہوتی رہی جس سے حضرت محترم پرنسپل صاحب کے ادبی ذوق اور علمی تبحر کا قابلِ تعریف اندازہ ہوتا رہا۔

جب ہم نے نماز مغرب بھی قضا کر ڈالی اور نہ اٹھے تو موضوع کلام یوں بدلا کہ حضرت محترم پرنسپل صاحب نے ہماری ملاقات کے لیے حضرت پروفیسر محمد فاروق صاحب ایم۔ایس۔سی کو بلایا جو اخبار ''ہمدرد'' میں بغلول کے نام سے مضامین کے ناشر رہے ہیں۔ حضرت بغلول تشریف لائے تو حضرت پرنسپل صاحب نے بڑے شوق سے فرمایا ''بھائی یہ ہیں ملا رموزی''۔

حضرت بغلول نے ہم سے بے ساختہ فرمایا ''جیسے لکھتے ہو ویسا بولتے بھی ہو؟''

اس سوال اور سوال کے تیوروں کے بہت سے معنی تھے۔ مثلاً اس میں کچھ کچھ بے تکلفی بھی تھی اور کچھ کچھ بزرگی بھی۔ پھر فرمایا پہلے آپ کی تحریر میں نری ملائیت تھی مگر موجودہ تحریر میں آپ نے بہت شاندار ترقی کی ہے۔

دیکھیے اس میں بھی بزرگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اب پھر گفتگو نے وسعت اختیار کی یہاں تک کہ حضرت محترم پرنسپل صاحب نے ازراہ عنایت و قدر افزائی ہم سے اور حضرت بغلول سے مشاعرہ میں ''تقریر'' کرنے کی فرمائش کی۔ گفتگو میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا جوں جوں حضرت بغلول کا خلق، تبحر، خلوص اور برادرانہ جذبہ ترقی کرتا گیا۔ اب اگر حضرت بغلول میں کوئی خرابی ہے تو صرف اس قدر کہ وہ مغرب سے پہلے ہی کمبل اوڑھ لیتے ہیں اور مشاعرہ میں بھی یہ کمبلی سلسلہ جاری و طاری رہتا ہے۔ حضرت قبلہ مولوی سید سجاد حیدر یلدرم، حضرت قبلہ مولوی ابرار حسین فاروقی، مولوی فاضل حضرت برادرم جلیل احمد قدوائی، حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے اور بے شمار علی گڑھ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بھی علالت کے باعث نہ مل سکے۔ یہاں علی گڑھ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے مراد کالج اور یونیورسٹی کے وہ طلبا اور ارکان ہیں جن سے مل کر کالج اور یونیورسٹی بنی ہے کیونکہ عمارتوں کو کالج اور یونیورسٹی نہیں کہتے۔

حضرت گرامی نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ کا بہت بہت شکریہ کہ ممدوح گرامی کی نوازشوں سے ہمیں ہر طرح کا آرام و اطمینان حاصل رہا۔ فقط۔

◆◆◆

علی گڑھ سے شاندار پسپائی

واپسی کی بے شمار اقسام سے ایک قسم ''پسپائی'' بھی ہے۔ پھر پسپائی کی بھی بے اندازہ قسمیں ہیں۔ ایک قسم ''شاندار پسپائی'' ہے اور اسی کو انگریزی پسپائی بھی کہتے ہیں اور کہتے ہی نہیں بلکہ جنگ یورپ میں لوگوں نے اس پسپائی کو اخبارات میں بھی دیکھا ہے اور سمجھ بھی لیا ہے۔ اپنے یہاں کے لوگ اس پسپائی کو ''واپسی''، ''پشت دکھانا''، ''منہ پھیر جانا''، ''بھاگ جانا''، ''بھاگ کھڑا ہونا''، ''چل دینا''، ''چمپت ہونا'' اور ''فرار'' بھی کہتے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمایئے کہ علی گڑھ سے گھر تک واپس آنے میں ہمارے اندر کون سی قسم پائی جاتی ہے؟

8/دسمبر 1928 کو علی گڑھ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کو گئے تھے کل شب کو کالج میں وہ مشاعرہ ہے جس میں ہندستان کے نامور شعرا و ادبا جمع ہونے والے ہیں۔ ہمیں بھی ''لیکچر'' تیار کرنا ہے۔ علی گڑھ کی کوتوالی تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ ملا رموزی صاحب کا لیکچر بھی ہوگا۔ اس لیے پولیس بھی تیاری میں مصروف ہے۔ دہلی سے توپ خانہ بلائے جانے اور 'مارشل لاء' کی اجازت بھی طلب ہوگئی ہے۔ کارخانوں کے مزدور بھی ''ہڑتال'' پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ شعرا ہیں کہ اپنی اپنی غزلیں اصلاح و مشورہ کے لیے لیے پھر رہے ہیں۔ شعرا کی حجامت بھی بن رہی ہے۔

لونڈر اور تیل سے سر کے بال سنوارے جارے ہیں۔ آنکھوں کے چشمے صاف ہورہے ہیں۔ پروفیسر لوگ ایک سوٹ اٹھاتے ہیں، ایک رکھتے ہیں "مشاعرہ گاہ" اور نہیں تو "یونین جیک" ہی سے سجائی جارہی ہے۔ غرض پورا علی گڑھ تیار ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم بھی دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر "لیکچر" لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ دوست تو سو سا گئے مگر ہم نے کوئی نصف لیکچر تیار کر لیا جس میں رات کا کوئی ایک بج گیا۔ تو نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں صاحب (بھوپال) کا خادم آیا اور کہا "کیا کھانا بالکل ہی نہ کھایئے گا" ہم نے کہا "ہاں احتیاطاً آج ناغہ کریں گے، اگر دودھ ہو تو پلا دو"۔ غریب نے ایک گلاس دودھ دیا۔ پیا اور سو گئے۔ کوئی ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ اس کی اذیت سے خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ یہ جب تک رہتا ہے "ارے ہائے رے مار ڈالا" کے نعرے لگانا پڑتے ہیں اور اچھا ہو جانے کے بعد آٹھ دن تک فاقے کرائے جاتے ہیں۔ گویا ہمارے لیے ڈاکٹروں اور طب یونانی نے بس اسی قدر ترقی کی ہے کہ یہ مرض نہیں جا سکا۔ اٹھے اور صندوق سے دوائیں نکال کر کھائیں مگر کچھ نہ ہوا۔ لگے ٹہلنے پھر نصف گھنٹہ کے بعد دوا کھائی، مگر کچھ نہ ہوا تو پھر نصف گھنٹہ تک ٹہلتے رہے مگر کچھ نہ ہوا تو اب دوا سے بھی مایوس ہو گئے۔ گھڑی بھی پاس نہ تھی کہ وقت معلوم کرتے۔ پاس ہی نواب زادے صاحب کے بھائی میاں منصور علی خاں صاحب سو رہے تھے اس لیے ان کی گراں خوابی کے ڈر سے "ارے ہائے رے" کا نعرہ بھی نہ لگا سکے، اس لیے دو بجے شب سے صبح کے سات بجے تک جس طرح ضبط و خاموشی سے کام لیا خدا ہی جانتا ہے یا ہم۔ بس ہر لحظہ "وہ" یاد آ رہی تھیں۔ اب جو صبح ہوئی تو احباب بیدار ہوئے اور علاج سے پہلے سوالات شروع ہوئے جن میں سے ہر ایک کا تفصیلی جواب دینا درد کی حالت میں بھی ہمارا فرض قرار دیا گیا۔

ایک بولے: ارے کیوں ملا صاحب؟

دوسرے بولے: اف وہ تو کب سے شروع ہوا؟

تیسرے بولے: تو کیا اس سے پہلے بھی ہوا تھا؟

چوتھے بولے: اماں تم بھی اتنے سے درد سے مرے جارہے ہو۔

پانچویں بولے: تو کیا ہوا اب حضور نواب زادے کے لیے ڈاکٹر آئیگا تو تمھیں بھی

دکھادیں گے۔

گویا براہِ راست ہمارے لیے ڈاکٹر کا بلانا تو ضرور تھا ہی نہیں۔

چھٹے بولے: کیوں کیا ہوا؟

ساتویں بولے: ارے لاحول ولا تو تم نے مجھے کیوں نہیں اٹھادیا۔

آٹھویں بولے: تو کیا دوا لائیں؟

نویں بولے: تو کس طرف سے دیکھوں؟

اشارے سے بتانے پر انھیں تسکین نہ ہوئی تو تمام لحاف اٹھا کر انھیں درد کا موقع دکھایا گیا۔ علاج صرف یہ کیا کہ "افسوس" کہہ کر خاموش بیٹھ گئے۔

دسویں بولے: لاؤ بھائی ہاتھ پاؤں دبا دوں۔

دل تو یہی چاہتا تھا مگر غیروں پر حکومت کرنے سے فطرت روکتی ہے اس لیے کہہ دیا "جی نہیں آپ کی مہربانی ہے بس دعا کیجیے"۔

اس کے بعد سخت لرزہ شروع ہوا۔ تو عزیزم حامد صاحب نے بکمال ہمدردی اور شفقت ہمیں دبائے رکھا اور بے چارے پاؤں دبانے لگے مگر انھیں بھی شکریہ کے ساتھ روکنا پڑا۔ اب پورے جسم کو درد ہی نے کیا ہزاروں دردوں نے جکڑ لیا۔ لرزہ کی وہ شدت تھی کہ موٹر سائیکل کا انجن چل رہا تھا جس سے جسم کا ہر حصہ کانپ رہا تھا۔ برادر گرامی میاں منصور علی خاں کی شفقت کے قربان جایئے آپ پر ہماری تکلیف کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ ہر فکر اور ہر تدبیر کے لیے تیار اور بے چین ہو رہے تھے، مگر یہی وہ موقع تھا جب "خدائے رحیم و رحمن اور انسان ضعیف" کی قوتوں کا امتحان ہو رہا تھا اور انسانی تدبیر کی ہر بلند سے بلند قوت خدائی قوت سے شکست کھا رہی تھی اور ہمیں ایک پل کو چین نہ آتا تھا۔ اس وقت ہمارے اوپر دو قسم کی تکلیف تھی۔ ایک درد کی دوسرے اس تصور کی کہ "یہ سب کچھ نتیجہ ہے خدا سے سرتابی اور سرکشی اور اس کے احکام و فرائض سے بے خبری و بے اعتنائی کا"۔ اس لیے کس قدر مبارک و مسعود ہیں وہ جو خدائے عرش و فرش کی غلامی کی ہر شرط بجالانے میں تیار و مستعد رہتے ہیں اور ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جنکا دل و دماغ گناہ کی ملامت آفرین اذیت سے محفوظ رہتا ہے اور اسی اندیشہ سے اس وقت ہم "بڑی فرماں برداری" سے

''ارے اللہ''، ''ارے اللہ'' کے سوا کچھ منہ سے نہیں کہہ رہے تھے کہ:

گیارہویں بولے: اماں تم تو دم ہی چھوڑے دیتے ہو، آخر ڈاکٹر صاحب آتو رہے ہیں۔

بارہویں بولے: لاؤ لاؤ ہم سر دبائے دیتے ہیں۔

تیرہویں بولے: اچھا کچھ کھاتے ہو؟ چائے تو پی لو۔

چودھویں بولے: یہ درد تو میرے بھی ہوا تھا۔ واقعی بڑا موذی درد ہوتا ہے۔ سنو تو ملا تم ایک پٹی بنوالو، اسے ہر وقت کمرے سے باندھے رہا کرو یہ درد اکثر پاؤں کے اونچا نیچا پڑ جانے سے ہوتا ہے۔

پندرہویں بولے: کیوں بھائی کیا ہوا؟ اچھا درد ہے۔ اماں نہیں یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو واللہ درد ہے۔ ارے توبہ واللہ میں تو سمجھا مذاق کر رہے ہو، اسی لیے تو میں نہ آیا اچھا اچھا بھیا تو لیٹے رہو۔

سولہویں بولے: افسوس بے چارے ملا پر اور مصیبتیں کیا کم ہیں جو یہ درد بھی کم بخت پیدا ہو گیا۔

سترہویں بولے: (اور بڑی مہربانی سے بولے) لو یہ گرم پانی کی تھیلی ہے اس سے سینک لو ابھی درد جاتا رہے گا۔

اٹھارہویں بولے: آگ لاؤں۔

انیسویں بولے: اچھا اچھا رات کو جو دودھ پیا تھا اسی سے ہوا ہے۔

بیسویں بولے: یار آج تو تمھارا لیکچر تھا تو کیا اب لیکچر نہ دو گے۔

اکیسویں بولے: ماشاء اللہ کیا اندھے ہو گئے ہو۔ وہ تو غریب جان سے جا رہا ہے آپ کو لیکچر ہی کی فکر ہے۔

بائیسویں بولے: بھائی ملا تم تو دس بارہ ڈنڈ کر لو ابھی جاتا رہے گا۔

تیئیسویں بولے: گھبراتے کیوں ہو ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔

تو گویا آدمی کسی تندرستی کی حالت میں گھبراتا ہے۔

غرض احباب تو تھے کل دس بارہ مگر بولنے میں یہ سب کے سب کوئی سوا سو آدمیوں کا کام

دے رہے تھے، مگر ان تمام ہمدردیوں پر ہمیں اگر کوئی یاد آتا تھا تو وہ قبلۂ دوجہاں والدۂ محترمہ مدظلہا اور پھر اپنے ''ننھے میاں کی والدہ'' کہ ایسے اوقات میں یہی دو ہستیاں قلبی اطمینان اور روحانی تسکین کا سبب ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم جب بولتے تھے تو صرف یہ کہ:

''وطن جانے دو''۔

مگر ہمارا یہی مطالبہ احباب کو بے حد و بے نہایت ناگوار تھا۔ اس پر ہزاروں ڈاکٹری مشورے دیے جاتے تھے۔ کوئی راستہ کی تکالیف سے ڈراتا تھا کوئی سردی کے حملے سے، کوئی نمونیہ سے تو کوئی فالج سے، کوئی بخار میں ہوا لگ جانے سے تو کوئی درد میں اضافے سے۔ خدا خدا کر کے کوئی سوا آٹھ بجے حضور نواب زادہ بہادر کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور موصوف نے ازراہِ نوازش انھیں پہلے ہمارے ہی پاس بھیجا۔ ڈاکٹروں کے عام خصائص کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے بڑی مہربانی اور توجہ سے ہمارے درد کو ٹٹولا کیونکہ درد نظر نہیں آتا ہے۔ پھر نسخہ تجویز فرمایا اور اپنی دوا کے اطمینان پر یا محض ''ڈاکٹری ضابطہ سے'' فرمایا ابھی ابھی جاتا ہے اور دیر تک تشفی فرماتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دوا آنے سے پہلے ہی الحمدللہ درد تو چلا گیا، مگر بخار رہ گیا، جس نے دن بھر چارپائی سے اترنے کی اجازت نہیں دی۔ بس یوں پڑے رہے گویا کسی لاوارث کا صندوق کسی ریلوے پلیٹ فارم پر ڈال دیا گیا ہو۔ کبھی آواز دیتے تو حضور نواب زادے بہادر کے ایک چھوڑ چار خادم خصوصاً میاں سعادت جلد حاضر ہو جاتے اور کبھی آواز دیتے تو کوئی پاس بھی نہ پھٹکتا۔ اس عرصہ میں ہم برابر کوشش کرتے رہے کہ ہمیں وطن جانے کی اجازت ہو مگر احباب یہ سن کر فوراً اپنی ڈاکٹری شروع کر دیتے تھے اور ہمیں چاروناچار خاموش ہونا پڑتا تھا، اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ چپ رہو اور جب موقع پاؤ چل دو۔ شام ہی سے مشاعرہ کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ کوئی سوٹ بدلتا تھا تو کوئی غسل فرماتا، کوئی شیو کرتا تو کوئی چشمہ پہنتا، موٹر پر موٹر آنے لگا تو ہم نے بھی آہستہ سے کہا کہ ہم بھی مشاعرہ میں چلیں گے الحمدللہ طبیعت اچھی ہے۔ سب کے سب ہی تو بول پڑے کہ ''ضرور ضرور''۔

یہ ضرور ضرور اس توقع پر تھا کہ ملا صاحب کا لیکچر سننے میں آئے گا۔

میاں منصور علی خاں نے فرمایا ملا صاحب آپ تو میری موٹر میں چلیے میں بہت آہستہ آہستہ لے چلوں گا۔ ہم حضور نواب زادہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مع لحاف کے حاضر ہوئے تو ممدوح نے ازراہ غایت ہمدردی فرمایا۔

''آپ مشاعرہ میں نہ جایئے گا کیونکہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں اور سردی بہت ہے''۔

مگر ہم نے فائدہ اسی میں دیکھا تھا کہ مشاعرہ سے فرار آسان ہے اس لیے مشاعرہ میں گئے۔ یہاں سے مشاعرہ کی روداد معلوم کرنا ہو تو یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے 1928 کے مشاعرہ کی روداد یوں فرمایئے کہ:

''بخدمت شریف مولانا باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھ''۔

مشاعرہ میں کوئی دو گھنٹہ بیٹ کر ہم اس بہانے سے اٹھے جس بہانے سے بڑے بڑے مہذب لوگ جلسہ سے اٹھ کر باہر جا کر جمائیاں لے آتے ہیں یا سگریٹ پی آتے ہیں یا باہر آتے ہی دیکھا تو موٹر کا ڈرائیور خود ''مشاعرہ'' بنا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری کو غنیمت ہی جانا اور فوراً تانگہ والے کو آواز دی اور تانگہ آ گیا۔

اب یہاں سے علی گڑھ کے تانگے کی ''کارگزاریاں'' معلوم کیجیے۔ صوبہ جات متحدہ میں جو تانگے چلتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اول وہ تانگہ جس میں ''خاصی انسانیت'' سے تین آدمی یوں سوار ہوتے ہیں کہ ایک آگے اور دو پیچھے۔ قسم دوم وہ تانگہ جسے عرف عام میں ''اِکّا'' کہتے ہیں۔ یہ اِکّا کسی غریب آدمی کے اس ''محرمی تعزیہ'' کی شکل کا ہوتا ہے جو افلاس کے باعث بڑے تعزیوں کے مقابل بنایا جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے گویا دو پہیوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد اٹھا کر رکھ دیا گیا ہو اور بس۔ اس گنبد نما اِکّے سے اصل میں صوبہ جات متحدہ کے باشندوں کی ''پست ذہنیت'' اور ان کی ''کسی قدر جہالت'' کا یوں اندازہ ہو سکتا ہے کہ گو ان کے بے شمار تعلیم یافتہ اور بے قیاس وہ افراد جو ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی ہو کر صوبہ جات متحدہ کی ''میونسپلٹیوں'' میں داخل ہو چکے ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو اب تک ان ''اِکّوں'' کی ہیئت ترکیبی بدلوانے کا احساس نہیں اور یہ غدر 57 والے اِکّے برابر زندہ ہیں اور یوں زندہ ہیں کہ بے شمار بھلے مانسوں کو آئے دن ذلیل کرتے ہیں مگر کوئی نہیں جو ان کی طرف متوجہ ہو۔ مثلاً اس اِکّے پر سوار ہونے

کا طریقہ یہ ہے کہ بجائے کسی ''زینہ'' کے اس کے پہیے پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے ہیں۔ اگر پہیے پر پاؤں رکھتے ہی گھوڑا کوئی خفیف سی حرکت بھی کر گزرے تو پہیہ فوراً گھوم جاتا ہے اور پاؤں رکھنے والا سوار یا دھڑام سے سڑک پر گرتا ہے یا گرتا نہیں تو اس کا پاؤں زور سے جھٹکا کھاتا ہے اور اس جھٹکے سے اس کا ''سر'' اِکّے کی لکڑی سے لگ کر دو یا چار یا آٹھ ٹکڑے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب جو سوار ہو جایئے تو نشست کی ترکیب یوں ہوتی ہے گویا کسی کو بہت سخت جاڑا محسوس ہو رہا ہے اور وہ اپنے گھٹنوں کو سر سے لگائے گول مول بیٹھا ہوا ہے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کو اکّے سے اس طرح باہر رکھا جاتا ہے کہ ان کے جمانے کے لیے کوئی زینہ یا روک نہیں ہوتی بلکہ پاؤں پہیے کے اوپر معلق رہتے ہیں جن سے نہ فقط سخت درد پیدا ہوتا ہے بلکہ مزا اس وقت آتا ہے جب کسی تنگ راستہ سے ایک اِکّا یا تانگہ مقابل سے گزرتا ہے۔ تو دونوں اِکّوں کے سوار اپنی اپنی ٹانگیں آسمان کی طرف بلند کر کے ایک دوسرے کی ٹکر یا رگڑ سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ ''ٹانگ اٹھا'' منظر نہایت پرلطف ہوتا ہے جس میں مہذب سے مہذب اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص نہایت بے تکلفی سے اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کے بعد اس اکّے میں چونکہ کمانیں نہیں ہوتیں اس لیے اس میں سوار ہو جانے کے بعد جسمانی نظام کا ایک ایک پرزہ یوں ہل جاتا ہے کہ آدمی اکے سے اتر کر چار پائی کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر اس اِکّے کا گھوڑا ''برق رفتار ہو'' تب تو اعضائے جسمانی کا خاصا مسہل ہو جاتا ہے۔ اس اِکّے کے وہ ڈنڈے جو اس کی گنبد نما چھت کو قائم رکھتے ہیں سوار کے منہ اور پیٹ کی وہ تواضع کرتے ہیں کہ پھر اسے ہاتھ پاؤں دبانے کے لیے کسی خادم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ان اعضاء شکن اِکّوں کی اس لغو و نقصان رساں ترکیب اور ساخت سے اس وقت تک باشندوں کا بیزار نہ ہونا اور صوبہ جات متحدہ کی میونسپل جماعتوں کا متوجہ نہ ہونا اصل میں باشندگان صوبہ جات متحدہ کی ذہنی پستی، بے حسی، قدامت پسندی اور بدذوقی کا نہایت صاف اور ناقابلِ رد ثبوت ہے۔ کہا یوں جاتا ہے کہ اِکّے غریبوں کے لیے اور تانگے امیروں کے لیے، مگر یہاں سوال غربت اور ثروت کا نہیں بلکہ سوال ''آرام'' کا ہے۔ مانا کہ اِکّے کم دام لیتے ہیں مگر ان کم داموں کا 95 فیصدی یہ نفع بھی تو ہے کہ سوار ''شفاخانہ'' پہنچانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ''کم دام بہتر یا زندگی''؟ اسی

طرح یہ دلیل بے شمار لغویتوں سے لبریز ہے۔ مثلاً کیا صرف ایک گنبد نما اِکّے ہی پر ساری کفایت منحصر ہو چکی ہے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر ہندستانیوں میں موٹر، سائیکل، بگھی، تانگے، ٹراموے کا اضافہ بھی فضول خرچی ہے۔ مگر ان کا کوئی انسداد نہیں اور پھر وہ کتنے ہیں جو ان اِکّوں میں محض کفایت شعاری کے خیال سے سوار ہوتے ہیں؟ اور اگر کفایت ہی ہے تو سوال تو اس کی ساخت اور خطرناک وضع کا ہے۔ اس ترکیب کو اگر تانگوں کی شکل میں بدل دیا جائے تو کہاں کا اسراف ہوگا۔ بس اصل یہ کہ ہندستانیوں میں ابھی مکمل بیداری اور خوش ذوقی نہیں اس لیے وہ تانگوں اور اکوں میں کوئی فرق محض اس لیے محسوس نہیں کرتے کہ آباء واجداد ہی کی گود سے ان رسوم وعادات سے مانوس ہیں مگر ہم ''سائمن کمیشن'' سے کہے دیتے ہیں کہ وہ ان اِکّوں میں خوشی خوشی سوار ہونے والوں کی پست ذہنیت پر انھیں ہرگز ہرگز سوراج دینے کی سفارش نہ کریں۔ بارے اس قسم کا اِکّا ہمارے بلانے پر آ گیا تو ہم چار و ناچار شب کے دس بجے اس میرس ہال سے سوار ہوئے اور نواب زادے بہادر کی کوٹھی کو روانہ ہوئے۔ اس وقت ہمیں دہرہ دون کے فاقے اور بخار کا بے حد ضعف تھا اور ایک طویل سفر سامنے، اس لیے ضرورت تھی کہ یہ اِکّا ''برق رفتار'' ہو جائے مگر ہمارے اس ''اڑن کھٹولے'' کا یہ حال تھا جیسے کوئی سوا سو برس کا بوڑھا کسی دیوار کے سہارے بیٹھا کھانس رہا ہو اور جو لچک ایک بوڑھے کی کھانسی میں پائی جاتی ہے وہ اس اِکّے کی ہر حرکت سے پیدا ہو رہی تھی۔ ''مشاعرہ گھر'' سے کوئی فاصلہ بس اس قدر طویل تھا کہ یہ اِکّا چالیس منٹ میں پہنچا۔ راستہ میں تنہائی اور ضعف سے جو وحشت پیدا ہوئی تو اِکّے والے سے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے مگر سردی کی شدت سے اس کا یہ حال کہ ایک جواب بھی صحیح نہیں دیتا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ اس اکّے میں روشنی بھی نہ تھی۔ راستہ میں ہندستانی پولیس سارجنٹ ملے تو پورے غصہ سے اکے کو روکا تو سرچ لائٹ ڈالی تو انھیں ''قفس در قفس'' نظر آیا۔ یعنی اس پنجرے کے اندر ہم لحاف اوڑھے یوں بیٹھے تھے گویا ہم خود ایک مستقل اِکّا ہیں۔ اس اِکّے والے کے لباس سے صاف ظاہر تھا کہ علی گڑھ میں افلاس خاصا ہے اور حضرت مولوی طفیل احمد صاحب کی موجودگی سے بھی یہ دور نہیں ہوتا۔ علی گڑھ کی سردی اور اس اِکّے والے کی صرف ایک عدد کھدری چادر کو دیکھ کر مضبوط نہ ہوا تو اس سے کہہ دیا کہ:

''اگر افلاس دور کرنا چاہتے ہو تو کبھی کالج اور یونیورسٹی کی طرف اِکا نہ لے جانا کیونکہ اصل افلاس یہ طلبا ہیں جنھوں نے غیر ملکیوں کی دو وقتہ چائے، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، کرکٹ، ٹورنامنٹ اور غیر ملکی لباس کو اختیار کر کے ہماری آمدنی اور دولت کے مصارف کو دادا جان کے زمانے سے آٹھ گونہ زیادہ کر دیا ہے''۔

بڑی خوشی سے کوٹھی میں داخل ہوئے اور بستر لے کر اسٹیشن اس تہذیب سے چل دیے جس طرح اپنے ''سائنس کمیشن صاحب'' ہڑتالیوں اور ''گو بیک'' کی وجہ سے کسی طرف سے نکال دیے جاتے ہیں۔ ایک جلیل القدر نواب زادے کی مہمانی سے بھاگے تھے۔ اس لیے الحمد للہ روپیہ تھا کافی اس لیے خیال آیا کہ آج تو ''تھرڈ کلاس'' ہی میں سفر کریں، اس لیے ٹکٹ بابو سے آگرہ تک کا ٹکٹ طلب کیا تو اس نے غلطی سے ''سیکنڈ کلاس'' کا ٹکٹ دے دیا۔ تقاضدی اس لیے ٹکٹ کے نرخ میں کوئی کمی نہیں بلکہ آگرہ تک کا جو کرایہ پہلے اس نے بتایا اسی پر جما رہا ایک روپیہ بھی کم نہ کیا۔ حالانکہ اپنے ہندستانی سودا سلف کا عام قاعدہ یہ ہے کہ چیز کے دام جو پہلے بتاتے ہیں گاہک کے اصرار پر پھر وہی چیز آدھے داموں دے دی جاتی ہے۔ امید ہے کہ سوراج کے مل جانے پر ریلوے ٹکٹ اور ڈاکخانوں کے لفافوں اور کارڈوں کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہا کرے گی۔ آج کل ایسی ''انگریزی'' تو نہ ہوگی کہ جو دام مانگے جائیں وہی دو ورنہ ''جائیے نہیں دیتے'' کی دھمکی موجود ملتی ہے۔

اسٹیشن پر بمقدار ٹکٹ قلی نے ایک ایسی کوٹھری میں بستر رکھ دیا جسے ''ویٹنگ روم'' کہہ کر عزت بڑھا دی جاتی ہے۔ یہ کوٹھری انگریزوں کی ہوتی ہے اور سنا ہے انگریز بڑے وقار، بڑے دولت مند اور بڑے فاتحانہ ٹھاٹ کے لوگ ہوتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ یہ لوگ ریلوے اسٹیشنوں کے ہر ویٹنگ روم میں اس کی حیثیت کے مطابق چراغ جلاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں ''گھاس لیٹ'' کا وہی دیا جل رہا تھا جو عام ہندستانیوں کے جھونپڑوں میں جلتا رہتا ہے لیکن فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بجلی کی روشنی تھی۔ اب بتائیے اگر انگریز دولت مند اور فاتحانہ وقار کے لوگ ہوتے تو یہ کنجوس، یہ بخیل اور یہ گداگرانہ دیا کیوں جلاتے۔ انھیں ہر جگہ اپنی شان دکھانا چاہیے تھی اور کوئی ہندستانی راجہ مہاراجہ اگر ریلوے کا مالک

ہوتا تو وہ ہر اسٹیشن پر گھی کے چراغ ہی جلوا کر چھوڑتا چاہے رعایا بھوکی مرجاتی مگر وہ اپنی شان دکھانے میں کمی نہ کرتا۔ یہاں علی گڑھ کی طرف سے مشاعرہ کی ''استقبالیہ'' کمیٹی کے ارکان مہمانوں کے استقبال کو موجود تھے، ہمیں خیال بھی نہ تھا مگر ان معزز بھائیوں نے ہمیں پہچان لیا اور فوراً ہی ہمارے پاس آ کر دریافت کیا کہ:

''کیا آپ مشاعرہ میں تشریف لائے ہیں؟''

ہم نے اپنی بیماری اور مشاعرہ سے واپسی کا ذکر کیا تو بے چارے ہماری امداد کے لیے وقف ہو گئے۔ ہمیں گلاس لا کر دوا پلائی۔ پاس بیٹھ گئے۔ ہاتھ پاؤں دبانے کو کہا۔ غرض ان عزیز طلبا نے علی گڑھ کالج کے اُن قابل صد عظمت اخلاق کی یاد تازہ کر دی جنکا دعویٰ کبھی سرسید علیہ الرحمہ نے کیا تھا اور جواب اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کے طلبا میں کیا خود علی گڑھ کالج کے جملہ طلبا میں موجود نہیں، ممکن ہے یہ اثر ہو نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر کی مصروفیت کا۔ ان عزیز طلبا میں برادرم عزیز الرحمٰن خاں اور برادرم لطافت علی خاں گاڑی کے روانہ ہونے تک ہمارے ہمراہ رہے۔ ریل آنے پر ہمارے لیے جگہ تلاش کی، بستر لگایا اور چلتے وقت الٹی ہم سے معافی چاہی کہ خدمت نہ کر سکے۔ ان میں برادر عزیز عبدالحبیب خاں صاحب بریلوی سب سے پیش پیش تھے اور مزاج اور اخلاق سے وہ پیارا اسلامی اخلاق ٹپک رہا تھا جو دلوں کو مسخر کر کے ''بغیر گھوڑا پولیس'' کے حکومت کرتا ہے۔ خدا ان پیارے اسلامی بھائیوں کو خیریت سے ایم اے، پی ایچ ڈی کرے۔ آمین!

اب یہاں سے ہم ریلوے کی اس لنکا میں داخل ہو گئے جہاں کا ہر ہندستانی ملازم باون گز ہی کا ہوا کرتا ہے۔ ریلوے ملازمین میں اخلاق، قومی ہمدردی، ملکی جانب داری، رحم وعفو اور خوش خلقی کا جو کوسوں پتہ نہیں چلتا اس کا سبب یہ نہیں کہ اس طبقہ میں تمام ملازمین قوم و خاندان کے جُلا ہے، دھوبی، حجام یا کُنجڑے ہوا کرتے ہیں بلکہ ان کی بداخلاقی، بدتہذیبی اور فرعونیت کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ سب کے سب اسکولوں کی پانچویں اور چھٹی جماعت کے بھاگے ہوئے طلبا ہوتے ہیں۔ پھر ان سے ''قوم یا قومیت'' یا خوش اخلاقی، ہمدردی اور تواضع کی امید ایسی ہی ہے جیسی انگلستان کے مزدوروں سے ہندستانی سوراج کی توقع۔ اس لیے ہم ریلوے ملازم کے لیے

اپنی آبائی عرف افغانی عادات سے کام لیتے ہیں۔تو آرام سے سفر پورا ہو جاتا ہے۔

آگرہ کے اسٹیشن پر شب کے ساڑھے چار بجے اترے، یہاں سے گھر تک کا ٹکٹ بدلوانا تھا۔ دروازہ پر دیکھا تو ایک قحط زدہ صورت کے ہندستانی ٹکٹ کلکٹر آگرہ کے محلہ نائی کی منڈی سے خریدا ہوا ٹوپ یوں اوڑھے ہوئے تھے جیسے کوئی ایکٹر کسی تھیٹر میں مردے کا پارٹ ادا کر رہا ہو۔ ہم نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ٹکٹ گھر کدھر ہے؟ تو برنکھنڈی لہجہ میں بولے:

''پہلے اپنے آنے کا ٹکٹ دکھاؤ''۔

اس فقرہ پر ہماری تمام بھولی ہوئی منطق ابھر آئی اور ہم نے انھیں جرحی اور منطقی سوالات پر دھر لیا تو مزاج سرخ و سفید قارورہ ہو گیا۔ تکرار کرتے کیا ایک پولیس ہیڈ کانسٹبل نے جب دیکھا کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب کی کلکٹری قبا کے تمام بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں تو درمیان میں پڑ کر معاملہ یوں طے کر دیا کہ ہمیں لے جا کر ویٹنگ روم میں آرام سے بٹھا دیا۔ قلی سے بستر کرا دیا اور بے چارہ خود ٹکٹ لینے چلا گیا۔ دیر جو ہوئی تو ہم سمجھے کہ اس کانسٹبل نے اپنے ٹکٹ کلکٹر کی شکست کا ہم سے یوں بدلہ لے لیا کہ ہمارے ٹکٹ کے دام لے کر آگرہ میں گم شدہ عزیز کی تلاش بن کر رہ گیا۔ اس لیے خود ٹکٹ گھر کی طرف گئے تو ہمارے وطن کے ایک حافظ جی نظر آئے جو علی گڑھ جا رہے تھے اور ریل کے انتظار میں مارے جاڑے کے ''استغفر اللہ'' بنے کھڑے تھے، اُن سے ملاقات ہوئی اور انھیں کو پولیس والے کے پیچھے لگا دیا۔ بارے ٹکٹ آ گیا۔ ادھر ریل آ گئی۔ یہاں سے ضعف اس درجہ بڑھا کہ ہم ریل میں سوار ہوتے ہی بے ہوش ہو گئے اور پتہ بھی نہ چلا کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ کہیں کہیں آنکھ کھل جاتی تھی مگر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس وقت پانچواں علاجی فاقہ تھا اور قدرے بخار اس وقت خیال آیا کہ اگر ہم آج کو یورپ کی زندہ قوموں کے اتنے بڑے ادیب ہوتے تو اس حالت میں ہمارے علی گڑھ سے گھر تک پہنچانے کے لیے ایک اسپیشل ٹرین چھوڑی جاتی اور ہر اسٹیشن پر ڈاکٹر اور خدام اور عوام ہمارے استقبال اور مزاج پرسی کو حاضر رہنے میں اپنی سعادت مندی سمجھتے مگر یہاں یہ حال کہ اب بھی ایسے ایسے موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ:

''ملا رموزی چیز ہی کیا ہیں''

بارے خدائے رحیم وکارساز اور شفیق مہربان کی رحمتوں کے سہارے گھر پہنچے۔ والدہ محترمہ مدظلہا نے تو بے ساختہ گلے لگالیا'' وہ'' بھی پریشان سی ہوگئیں مگر ذرا افاقہ ہوتے ہی بولیں:

''اور جاؤ سفر میں''

معلوم نہیں اس فقرہ میں کرایہ کے روپیہ کا غم تھا یا جوشِ محبت سے ہمارے اوپر طعن؟ اپنے اللہ میاں کا بڑا احسان کہ ہمیں بغیر پٹڑی سے اترے ریل میں گھر تک پہنچادیا اور کسی ٹکٹ کلکٹر نے نہ دیکھا۔

◆◆◆

شیر کا شکار

آج سے یہ کوئی سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک قابل صد عظمت مقصد کے حصول کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد میں مصروف تھے یعنی بقائے خلافت۔ اور بقائے خلافت چونکہ مسلمانانِ عالم کا ایک اجتماعی اور قومی مقصد تھا اس لیے ہم بھی اس وقت اپنے قلم سے جو کچھ کر گزرے دوستوں کو یاد ہے۔

لیکن ابھی کہ یہ اجتماعی مقصد حاصل نہ ہوا تھا کہ مسلمانِ عالم کی شامت آگئی یا حضرت شاہ مدار نے مرے ہوئے مسلمانوں کو یوں مار کر رکھ دیا کہ ان کے رجحان کو ''فتنۂ نجد و حجاز'' کی طرف مائل کر کے اصل میں منتشر و پراگندہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسلمانوں کے سامنے کسی اجتماعی اور ٹھوس مقصد کی جگہ صرف اخبارِ خلافت اور مولانا شوکت علی تو بمبئی میں باقی رہ گئے اور وہ خلافت ولافت کا قومی مرکز و جلسۂ عامہ اس طرح ہمیشہ کے لیے جاتا رہا جس طرح اللہ بخشے اپنے بڑے مولوی صاحب۔ پس اس وقت ہندستانی مسلمانوں کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی ایسی تحریک جسے صحیح معنی میں کوئی بین الاقوامی یا اجتماعی تحریک کہا جائے۔ اب کوئی تحریک تنظیم لیے پھرتا ہے تو کوئی تبلیغ، کوئی مسلم لیگ لیے پھرتا ہے تو کوئی علمی غول۔ پس انتشار و برہمی کے اس خطرناک دور میں کیا خطا کی جو ہم مضمون نگاری کو طاق پر رکھ کر شکار کھیلنے میں مصروف ہو گئے یا ہو رہے ہیں یا

ہونے والے ہیں یا ہو کر رہیں گے یا ہونے ہی والے ہیں یا ہو بھی چکے ہیں یا ہو چکے تو ہو ہی چکے یا ہوئے تو ہوئے ۔اب یہ اور بات ہے کہ ان سب صورتوں کا منطقی حاصل ضرب یہ نکل آئے کہ ہوئے تو نہ سہی۔

لیکن اس حساب سے کہ ہم آدمی ہیں ہر حال میں تعلیم یافتہ اس لیے جو کام کرتے ہیں کسی مقصد و قاعدے کے تحت ہی کرتے ہیں۔لہٰذا شکار کا مقصد وضع کرنا بھی ہمارا فرض تھا مگر ایک علمی وادبی آدمی کے لیے شکار کا مقصد وضع کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا ہندو مسلمانوں کا دائمی اتفاق۔اس لیے ہم نے شکار کے ان مقاصد کو سامنے رکھ لیا جو اس وقت تک دنیا میں مختلف خواص کے انسانوں نے وضع کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

1۔ شکار کا پہلا مقصد جو تاریخ سے قبل والے انسانوں نے وضع کیا یہ تھا کہ جانور مارو اور گوشت کھا کر بھوک سے محفوظ رہو۔

2۔ دوسرا مقصد جو کسی قدر تہذیب کے زمانہ میں وضع ہوا یہ تھا کہ نقصان رساں جانوروں کا شکار کر کے مضرت سے محفوظ رہو۔

3۔ تیسرا مقصد جو کسی قدر تجارتی دور کی ترقی نے پیدا کیا یہ تھا کہ جانوروں کے ناخن، دانت، ہڈی اور کھال جمع کرو اور دولت کماؤ۔اس مقصد کے حصول کے لیے انسانوں کا وہ بے وقوف تر اور کور دماغ طبقہ ٹوٹ پڑا جسے خواہ مخواہ فوجی آدمی کہتے ہیں اور ان کی عقل و فراست میں اور شکاری جانوروں میں دو چار ہی گز کا فرق ہوا کرتا ہے۔

چوتھا مقصد جو ہم نے وضع کیا وہ یہ ہے کہ اپنے اور متعلقین کے مصائب و افکار سے اگر ذرا سی آزادی چاہو تو شکار کو چلے جاؤ۔یہاں قدرے دھیان بٹ جاتا ہے مگر گھر واپس آؤ تو مصائب کا ہجوم پھر ٹوٹ پڑتا ہے کیونکہ ایک ذی حسن آدمی میں اور شکار میں خاصا ''ارے لاحول ولا'' کا فرق موجود ہے۔

ان مقاصد کے بعد شکار کے تاثرات بھی ہوا کرتے ہیں۔مثلاً ایک ذی مقدرت شکاری شکار کے بعد دل میں کہتا ہے کہ اب کباب کھائیں گے اور ایک مصیبت زدہ شکاری کہتا ہے کہ آج میں نے اس قدر جانور مارے تو؟ اور ایک ادبی انسان سوچتا ہے کہ اور جو آج جانوروں نے مجھی کو

مارڈالا تو؟ اور یہ اس لیے کہ اُس کی نظر میں درندہ بہرحال جنگل میں ہوتا ہے اور جنگل یقیناً کسی چاندنی چوک کو نہیں کہتے، جہاں پولیس چاہے تو ہندو مسلم فساد تک کو روک دے، اس لیے اثر دوم کے تحت اگر ہم شکار گاہ میں ڈرتے ہیں تو کون سی علمی وادبی غلطی کرتے ہیں۔

ہمارے مخدوم زادہ حضرت محمد بشیر صاحب کانپوری کام (لندن) بارایٹ لاء خلف خان بہادر مولوی حافظ حاجی محمد حلیم صاحب تاجر اعظم کانپور ملک کے ان ذی ہوش نوجوانوں میں ہیں جنھیں باوصف ہزاراں ہزار فراغتوں کے قوم کا درد ازل سے ودیعت ہوا ہے۔ وہ کانپور کے فیض بخش وفیض رساں قومی مدارس حلیم ہائی اسکول اور دارالعلوم الٰہیات کے ناظمِ اعزازی ہیں، مگر ان کا قومی احساس اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ کانپور میں ایک عظیم الشان صنعتی اور تجارتی کالج کے قیام کے لیے آج کل ملک کا دورہ کرنے کا قصد رکھتے ہیں اور اسی سلسلہ میں وہ ہمارے ایک محترم کرم فرما کے مہمان ہوئے تھے۔ چونکہ ہم نے بھی دارالعلوم الٰہیات کانپور کے علمی فیضان سے استفادہ کیا ہے اس لیے ہماری اور بشیر صاحب کی ملاقات عرف دوستی از بس ضروری ولازم تھی اور یہ دارالعلوم الٰہیات کانپور ہی کا اولڈ بوائے پن تھا کہ ہم ان کو بجائے بشیر صاحب کے ''بھائی بشیر'' کہتے ہیں اور وہ بھی ہم کو ملا صاحب کی جگہ ''اماں ملا'' کہتے سنے گئے ہیں۔

واضح ہو کہ یہاں اردو کی محبت میں لفظ ''اولڈ بوائے'' پر لفظ ''پن'' لگا دینے سے ایسی تمام انگریزی اصطلاحات خالص اردو ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بالشوزم سے بالشویک پن، اسلام ازم سے اسلام پن، جلا ہا ازم سے جلا ہا پن۔

الغرض بشیر بھائی بولے ''اماں مُلا! چلتے ہو تو پھر شیر ہی کے شکار کو چلو، یہ ہرن ورن کا شکار بھی کوئی شکار میں شکار ہے''۔

ہم نے کہا ''یہاں کسے انکار ہے''۔

بھائی بشیر ہیں چونکہ بیرسٹر اس لیے موصوف نے تو فوراً ہی شکار کا حسب ضابطہ لباس پہن لیا اور یہاں وہی علی گڑھ کا چست پاجامہ، نفیس شیروانی، کلائی پر گھڑی اور آنکھوں پر وہ چشمہ جس کے بغیر آج کل نوجوان لوگ خود کو علمی وادبی آدمی ہی نہیں سمجھتے۔

یہ دیکھ کر بھائی بشیر بولے:

''اماں مُلا! یہ کپڑے تو شکار کے لیے موزوں نہیں'' اس لیے گھر گئے اور خاکی رنگ کے کپڑے طلب کیے''وہ''بولیں:

چلو رہنے بھی دو شکار نہ ہوا عید ہوگئی۔ میرا ننھا تو چیتھڑے لٹکائے پھرے اور حضور کے لیے روزانہ ایک نیا جوڑا لا دیا جائے''۔

لوگ باگ تو کہیں گے کہ اس جواب میں ایک عورت ذات نے کفایت شعاری کی پوری کتاب بیان کر دی مگر راز یہ تھا کہ ایک دن پہلے ہم نے ان کے ننھے میاں کے لیے نئی ٹوپی لانے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا آج یہ اس کا ''بیویانہ انتقام'' تھا۔ پھر یہ کہ اس جواب میں لفظ حضور کا استعمال جن معنی میں ہوا ہے اسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کی رفاقت میں اسکول یافتہ بیویاں عطا کی گئی ہیں۔

الغرض اسی لکھنوی لباس میں شیر کے شکار کو جب چلے تو بھائی بشیر نے ایک مرتبہ پھر اعتراضی نظر سے گھورا تو مگر مارے غصہ کے یہ نہ کہا کہ اپنے شکاری کپڑے اتار کر ہمیں پہنا دیتے یا واپسی پر ایک خاکی کوٹ کا انتظام فرما جاتے۔

14/مئی 1928 کی شام کو جب کہ آفتاب غروب ہوتے وقت ایک گھنا جنگل، ہلکی ہلکی تاریکی سے خوفناک ہوتا جا رہا تھا ہم چار آدمی دو بندوقیں دے کر ایک درخت پر بٹھا دیے گئے یا چڑھا دیے گئے یا سوار کرا دیے گئے یا لٹکا دیے گئے کیونکہ نشست کی صورت میں کوئی ترتیب نہ تھی اور لبوں پر انگلی رکھ کر یہ بھی کہہ دیا گیا کہ بس حرکت ہی نہ کرنا کیونکہ معاملہ ہے شیر کا۔

لیفٹننٹ نعمت علی خاں صاحب ہمارے دوست بھی ہیں اور بھائی بھی، مونس و غمگسار بھی ہیں اور استاد بھی، اس لیے وہ ہمیں ساکت و خاموش پا کر کبھی ہمارے چٹکی لیتے، کبھی گدگداتے مگر کمال یہ کہ ان کی اس چھیڑ چھاڑ سے بھائی بشیر غصہ ہوتے ہمارے اوپر اور یہ محض اس لیے کہ ہماری تنخواہ ہے کم اور کہیں کے افسر بھی نہیں ورنہ کیا وجہ تھی کہ بھائی بشیر نے لیفٹننٹ صاحب کو ایک مرتبہ بھی غصہ سے نہ گھورا؟؟ اس لیے نعمت بھائی کی چھیڑ چھاڑ کو تو سمجھا قہر درویش اور اپنی جان کو سمجھا جان درویش اور بیٹھے رہے خاموش۔

اِدھر گاؤں والوں کو کہا گیا کہ شور کرو تا کہ شیر ہماری بندوق کی زد میں آجائے۔ اب خدا گنواروں کو اگر شور مچانے کا موقع دے دے تو یہ کب کسر اٹھا رکھتے ہیں۔ فوراً ہی اس سنسان جنگل کو ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ بنا ڈالا۔ جہاں یہ اپنے تھرڈ کلاس مسافر نہ خاموش بیٹھتے ہیں نہ بیٹھنے دیتے ہیں۔ اِدھر ہم یہ سوچ بیٹھے تھے کہ شیر میں دھرا ہی کیا ہے۔ بس بھاگتا ہوا ہمارے سامنے آئے گا اور بھائی بشیر یا حضرت محترم اس کو شہید کر ڈالیں گے اور فاتحہ کی رسم ہم ادا کر دیں گے۔ ابھی یہ خیال کیا ہی تھا کہ جھاڑیوں میں سے شیر برآمد ہوا اور معاً اس کی نظر ہمارے محترم پر جو پڑی ہے اور حضرت سلامت جو وہ بولا ہے، جو غرایا ہے، جو دہاڑا ہے، جو چیخا ہے، جو چلایا ہے، جو چنگھاڑا ہے تو اس وقت ہماری آنکھیں تو ضرور کھلی ہوئی تھیں مگر یہ یاد نہیں کہ ہم کیا دیکھ رہے تھے۔ اسی طرح طرح شیر کو خبر نہ ہونے پائی کہ ہم لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ابھی تک ڈرے ہی نہیں، اس لیے شیر نے برق رفتاری کے ساتھ جست کی اور بھائی بشیر نے اس پر بندوق کا فائر کیا تو کیا خاصی موت شیر پر پھینک ماری اور یہی نہیں بلکہ کوئی نصف سیکنڈ کے قلیل تر وقفہ میں ایک گولی اور بھی رسید فرمائی تو شیر انھی قدموں اناللہ ہو کر رہ گیا، مگر اس تہذیب و خاموشی سے گویا وہ اسی جگہ حملہ کیے دب گیا اور گولیاں اس کے لگی ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس غضبناک شیر پر اس کی برق رفتاری میں اس قدر صحیح نشانہ پر گولیاں مارنا کچھ بھائی بشیر ہی کا کام تھا، جس پر ہم لوگ حیران و مبہوت ہو گئے تھے۔ چونکہ غروب آفتاب سے اب تمام جنگل میں اندھیرا ہو گیا تھا اور شیر ایک جھاڑی میں گر کر مر گیا تھا لہٰذا ہم میں سے کسی کو شیر جو نظر نہ آیا تو یقین ہو گیا کہ بندوق کے فائر تو گئے خالی اور اب شیر ہمارے اوپر حملہ آور ہونے ہی والا ہے، اس لیے ہر لمحہ یہ تصور کہ وہ کودا یہ آیا اور یہ دوڑا۔ یہ اچھلا، یہ لپکا، یہ جھپٹا، یہ کھایا، یہ مارا، یہ نگلا، یہ چیرا، یہ پھاڑا، یہ نوچا، یہ کھینچا، یہ دبوچا یہ سوار ہوا، یہ زخمی کیا اور لو یہ مار ہی ڈالا۔ اس وقت ہم لوگوں کی خاموشی اور تہذیب کا نقشہ آ کر دیکھتا۔

یادش بخیر وہی حضرت لیفٹنٹ صاحب گو ہمارے سر پر ہی سوار تھے مگر اس وقت ہمیں چھیڑنا یا گدگدانا ایسا بھول گئے تھے کہ اگر یاد بھی دلاؤ تو نام نہ لیں اور اسی حالت میں ہمیں بھی یقین آ گیا کہ اسے کہتے ہیں کہ مرگ اتفاقیہ بوقتِ شام بہ صحرائے لق و دق بر درخت مولسری بہ حماقت خود۔

بہر حال رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی مجبور کر رہی تھی کہ جو بھی ہو اس درخت سے اتر کر گھر جانا چاہیے لیکن نازک ترین سوال یہ تھا کہ اس کام کی ابتدا کرے کون؟ اس وقت ہمیں بیٹھے بیٹھے یہ سوجھی کہ اگر آج کو ہندستانی غلام نہ ہوتے تو ان میں حربی قوت اس قدر کمزور کبھی نہ ہوتی۔ وہ جب رات دن ملکی مدافعت کے سلسلہ میں فوجی تعلیمات میں مصروف رہتے۔ تو ان کے حوصلے کی قوت آج اس قدر ضعیف نہ ہوتی۔ یہ تصور دل میں آیا ہی تھا کہ شکار گاہ کے مہتمم صاحب اس طرح ہمارے درخت پر چڑھ آئے۔ جیسے بندوق بند خضر علیہ السلام نمودار ہو رہے ہوں۔ آتے ہی فرمایا ''چلیے نیچے اتر آیئے۔ اب شیر کو صبح ڈھونڈھ لیں گے''۔

اب تو جناب ہم میں کا ہر شخص بہادر تھا اور پہلے بھی ہم لوگ کیا کچھ کم بہادر تھے۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ شیر کے ڈر سے ذرا درخت کے نیچے نہیں اترتے تھے سو وہ بھی اس لیے کہ شیر کے زخمی ہونے کا خیال جو غالب تھا۔

درخت سے موٹر تک آتے وقت دوستوں کا تو علم نہیں مگر ہاں ہماری رفتار بہ حساب 75 میل فی گھنٹہ سے کم نہیں تھی۔ اب جنگل کو گھٹا ٹوپ تاریکی نے گھیر لیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ جس طرح جلد ہو شہری حدود میں داخل ہو جائیں ورنہ کہیں شیر کی آواز آ گئی تو؟ لیکن ہمارے ساتھیوں پر تو کوئی اس قسم کا خوف طاری ہی نہ تھا اس لیے حضرت بشیر یا بھائی بشیر نے ہمارے محترم سے کہا کہ حضرت اس سامنے نظر آنے والے گاؤں میں چلیے وہاں سے پانی پینا ہے۔

فوراً ہی موٹر کا رُخ گاؤں کی طرف پھیر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے فرشتوں نے جنت لے جاتے لے جاتے یکا یک دوزخ کی طرف ہمیں موڑ دیا ہو، مگر کرتے کیا؟ حضرت گرامی نے ہماری وحشت کو دیکھ کر ایک ہلکی سی ڈانٹ بتا دی:

''اماں مرے کیوں جاتے ہو؟ چلتے تو ہیں اور اب یہاں شیر تھوڑا ہی تمھیں کھا جائے گا''۔

آپ سمجھ لیجیے کہ گاؤں میں پہنچے تو بھائی بشیر نے فوراً مغرب کی نماز کے لیے نیت باندھ لی۔ اُس وقت خیال آیا کہ جن گھرانوں میں خدائے عرش و کرسی کی عظمت و پرستش بادہ پرستی کے اس گمراہ کن دور میں بھی باقی ہے۔ ان کی صاحب سعادت اولاد مغرب کی فضاؤں میں رہ کر صحیح معنی

میں مسلمان رہ سکتی ہے اور یہی وہ نوجوان ہیں جنھیں عرف اصطلاح میں "فرزندانِ توحید" کہہ سکتے ہیں مگر اس مصیبت کو کہاں لے جایئے کہ اردو اخبارات ہر اسلامیہ ہائی اسکول کے کرکٹ باز اور بے نماز کو "فرزندانِ توحید" کہتے ہی نہیں چھاپ بھی دیتے ہیں۔ اب اس کے بعد ذرا ہماری خدادانی اور خداپرستی ملاحظہ ہو کہ بھائی بشیر تو تھے ماشاءاللہ پہلے ہی سے باوضو، اس لیے اب ہم نے موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے سوچا کہ اب اگر ملا صاحب تم بھی یہاں وضو اور نماز کی ٹھیراتے ہو تو یہ تمام باقی کے احباب بھی بھائی بشیر ہی کی نماز پر کہاں کے مسرور ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سب کے سب تمھارے اوپر برس پڑیں گے اور کہیں گے کہ اب میاں تم تو پڑھو دل کھول کر نماز ہم جاتے ہیں اور یہ عام قاعدہ ہے کہ احباب میں شدید یا جا و بے جا اعتراضات اسی دوست پر ہوتے ہیں جو تنخواہ کے لحاظ سے کم ہو۔ بس جناب محض دل کے اسی خطرے پر ہم نے یہ کیا کہ نماز مغرب کو صاف اڑا گئے، مگر دل میں اتنا اثر ضرور تھا کہ آخر یہ محض احباب کے ڈر سے زمین و آسمان کے خدا سے جو سرکشی کی ہے اس کا بدلہ کہیں اسی جنگل میں نہ مل جائے۔ اب ہم تو تھے اس وقت اسی قسم کے خیالات میں مگر احباب میں گفتگو یوں ہی ہو رہی تھی:

"اجی وہ تو گولی سے بچ گیا، صرف ہمیں نظر نہیں آیا"۔

"نہیں بھائی میں نے اسے اپنی آنکھوں سے وہیں گرتے دیکھا ہے"۔

"اور اگر گولی لگ جاتی تو کیا وہ ایک مرتبہ بھی آواز نہ دیتا"۔

"اماں یہ بھی ہوتا ہے کہ شیر گولی کھا کر آواز نہیں دیتا"۔

"تم کیا جانو؟ گدھے ہو، اگر گولی اس کے جسم کو چھو بھی جاتی تو جنگل سر پر اٹھا لیتا!!"

"اچھا تو اگر بہادر ہو تو چلو ابھی چل کر دکھا دیتے ہیں۔ خدا کی قسم! ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا ہوگا مگر وہ تو کہو کہ شام ہو گئی۔ اِدھر یہ میاں ملاجی مارے خوف کے مرے جا رہے تھے"۔

دیکھا یہاں بھی طعن و غصہ کے تیور ملا صاحب ہی کے حصہ میں آئے!!

اس وقت موٹر میں آگے والی نشست پر بھائی بشیر اور ہمارے محترم بیٹھے تھے اور پیچھے کی نشست پر ہم اور ہمارے استاد لیفٹننٹ صاحب تھے۔ لیفٹننٹ صاحب تو بندوق کو سینے سے لگائے لیٹے ہوئے سے تھے اور ہم اس فکر میں مستغرق تھے کہ اب جو گھر پہنچیں گے تو یا تو "ان" سے بات

ہی نہ کریں گے یا پھر کہہ دیں گے کہ آج شکار جانا ہی نہ ہوا ورنہ ''وہ'' آج علاوہ خراب ترکاری عطا فرمانے کے گھنٹوں مذاکرہ اور جرح فرما کر ہمارے دماغ کی تمام لطافت کو تباہ کر کے رکھ دیں گی۔

یہ خیال ابھی زیر بحث ہی تھا کہ موٹر کی روشنی میں یکا یک ایک زبردست شیر جاتا ہوا نظر آیا، مگر ہم اپنے خیال میں اس قدر محو تھے کہ سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی بھینسا ہے جو جنگل میں بھٹک گیا ہے اور اب بے چارہ اکیلا اپنے گھر جا رہا ہے۔ ہمارے خیال کے اس ضعف کو اِدھر دیکھیے اور بھائی بشیر اور محترم کی مستعدی کو اُدھر دیکھیے کہ معاً موٹر رُکا اور آنا فاناً بندوق کے دو فائر اس طرح ہو گئے کہ شیر اسی وقت جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ مگر شیر موٹر کی روشنی سے ہٹ کر ذرا تاریکی میں جا گرا جس سے تمام موٹر والوں کو وہی اندیشہ لاحق ہوا جو پہلے شیر کے متعلق تھا کہ یا تو شیر گولی سے بچ گیا یا زخمی ہوا۔ بس اس خیال سے جو جناب موٹر کو چلایا ہے یا دوڑایا ہے یا اُڑایا ہے یا بھگایا ہے تو کوئی چار میل دور جا کر دم لیا۔ اب ہونے دیجیے تعریفیں۔ کوئی کہتا ہے سبحان اللہ! ایسا ازغیبی شیر کا شکار تو وائسرائے ہند کو بھی نہ نصیب ہوا ہوگا۔ گویا وائسرائے ہند ایسے ہی تو راتوں کو جنگلوں میں مارے پھرتے ہیں۔ کوئی کہتا وہ تو پہلے میری ہی نظر پڑی۔ واللہ! گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ دو چار قدم ہی پر گر گیا ہے۔ اچھا اچھا تو صبح دیکھ لینا۔ یہاں ہم نے صرف اپنے محترم سے اتنا کہا کہ:

''مگر سبحان اللہ موٹر خوب بھگایا''۔

ان حالات کے ساتھ بشیر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے تو جان میں جان آئی اور ہم نے اپنے گھر جانے کے لیے پر تولے، مگر یہ کسے خبر تھی کہ بھائی بشیر ان دونوں شیروں کی تلاش کی خوشی میں آج رات کو سونا ہی نہیں فرمائیں گے بس جناب فوراً ہی تو میز پر بیٹھ گئے اور یہ یقین دلانے کے لیے کہ دونوں شیر مر گئے ہیں۔ نشانہ خطا نہیں گیا۔ کبھی کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دیتے، کبھی اپنی آنکھوں سے شیر کو گرتا ہوا دیکھ لینے پر بہ حلف مذہبی بیان دیتے، کبھی اس کے گرنے کا نمونہ یوں دکھاتے کہ خود دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر خفیف سے گر بھی جاتے، کبھی کلمہ کی انگلی سے فرش قالین پر لکیروں سے نقشہ بنا دیتے اور تقریر کا زور تو اس وقت بیان و شرح سے باہر تھا۔ اِدھر ہمارا یہ حال کہ جوں جوں گھر پہنچنے میں دیر ہوتی ویسے ہی ''اُن'' کے غصہ کا اندیشہ قوی ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ہم

نے بغیر بات کاٹے بھائی بشیر سے کہا السلام علیکم اور چل دیے مگر بھائی بشیر نے بھی دروازے تک تقریر کو یوں جاری رکھا:

''تو دیکھا ملا صاحب! صبح بہت جلد آنا۔ میں بغیر تمھارے چائے نہیں پیوں گا۔ نہیں نہیں یار بغیر تمھارے مزہ نہیں آئے گا''۔

گویا ہم سے تمام خلوص محض مزے کے لیے تھا، کسی علمی و ادبی شہرت یا قابلیت کی بنا پر نہیں۔

اب خدا ہی جانے بھائی بشیر رات کو کتنے سوئے، کب سوئے، کس طرح سوئے، کہاں سوئے اور سوئے بھی یا نہیں۔ صبح سویرے جو ہم پہنچے تو بشیر بھائی نے وعلیکم السلام کہہ کر رات والی تقریر کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ اتنے میں موٹر آیا کہ چلو شیروں کی تلاش کریں۔

دیکھا تو موٹر کے سابقہ ساتھیوں میں ایک صاحب کا اور اضافہ ہو گیا۔ یہ ہمارے کرم فرما مسٹر عبدالغفور صاحب بی۔ اے علیگ تھے اور چونکہ یہ سکریٹری ہیں اس لیے ہم سے کہا گیا کہ تم موٹر کے مڈگارڈ پر بیٹھ جاؤ، موٹر پر تو کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ اس وقت ثابت ہوا کہ محض بڑی تنخواہ اور عہدے کی وجہ سے قانون کے جائز حقوق پامال نہیں ہوتے بلکہ حقدار بھی پامال ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ ہم کو موٹر میں اس جگہ بٹھایا گیا جہاں سیٹ پر بیٹھ کر پاؤں دراز کر لیے جاتے ہیں اور سب صاحبوں نے ہماری طرف سے خود بخود اطمینان کر لیا کہ ملا صاحب ناراض نہیں ہیں۔ تب ہم نے دل میں کہا کہ ''یوں کرتے ہیں تو ہین بالقصد بہ موٹر بوقت دن بر سر سڑک بہ حیلۂ بے تکلفی''۔

◆◆◆

ہندستانی لباس کیسا ہو؟

دو چار برس پہلے کانپور میں جو کانگریس ہوئی تھی یا اس کا اجلاس ہوا تھا تو ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوئی تھی کہ ہم اس میں جا شریک ہوئے تھے اور وہ بھی اس لیے کہ یا تو کانپور ہمارے مکان سے قریب ہے یا ہمارا مکان کانپور سے قریب ہے۔ اس اجلاس کی شرکت سے ہمیں ہندستانی ذات کے لوگوں کی ذہنی، علمی، ادبی، قولی، معاشرتی اور اخلاقی جذبات و احساسات کا تماشہ مل گیا تھا اور یہی غرض ہوا کرتی ہے بغیر ریزولیوشن پیش کیے ہوئے کسی ادیب کی شرکت کی اور یہ بھی یاد رہے کہ اس شرکت سے ہمیں صدر کانگریس نے روکا بھی نہیں تھا۔ پھر ہم نے اس کانگریس پر تمام اخبارات اور رسائل میں ایک نہایت ''معرکتہ الآرا'' اور ''بصیرت افروز'' بھی لکھ دیا تھا جو باوا آدم کے ہندستانی جانشینوں کے آج تک کام آرہا ہے یعنی ہمارا مضمون۔

لہٰذا اسی خیال سے کہ 1928 کو لکھنؤ میں تمام ہندستانی انجمنوں کی نمائندہ مجلس کا اجلاس ہو رہا ہے اور گو اس کے صدر نے پنجاب کے مولانا سید حبیب عرف ایڈیٹر صاحب اخبار ''سیاست'' لاہور کو اس مجلس میں اندر کی طرف ایک قدم بھی نہیں دھرنے دیا تھا مگر ہم نے اپنا ارادہ اس لیے ترک نہیں کیا کہ تقریر کے درمیان حضرت جالب دہلوی ایڈیٹر اخبار ''ہمدم'' لکھنؤ کی کھانسی کی آواز عرصہ دراز سے نہیں سنی تھی اور یہ موقع خاص تھا ان کے کھانس پڑنے کا۔ پس اس ارادے کے پختہ

ہوتے ہی سامان سفر کی تیاری جو شروع کی تو معلوم ہوا کہ سوٹ کیس مرمت کے لیے درزی یا موچی کے یہاں گیا ہے اور وہ پرسوں ترسوں تک آئے تو آئے کیونکہ موچی کا بھانجہ بے چارہ فصلی یا موسمی بخار میں چار دن سے مبتلا ہے۔ اس لیے دکان اس کی بند ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ موچی بچہ نہایت معصوم، پیاری صورت، غریب، سعادت مند، نیک اطوار اور سب کے دل کا پیارا ہے۔ اس کے بخار سے اکثر صاحبان محلّہ و حاکمان انگریز کہ نصف جن کے ہمیشہ ہندستانی ہوا کرتے ہیں سب اس پر متوجہ رہتے آئے ہیں۔

واضح ہو کہ موچی کے سلسلہ میں موچی بچہ کا یہ بے محل تذکرہ ویسا ہی ہے جیسا کہ بریلوی اور مرادآبادی واعظ اور میلاد میں اپنے بیان اور تقریروں میں قصہ اندر قصہ اور داستان اندر داستان پیدا کر کے سامعین کو کئی گھنٹہ عذاب میں مبتلا رکھتے ہیں اور اصل مطلب کبھی صاف اور سیدھی طرح بیان نہیں کرتے، اس لیے سوٹ کیس جب نہ ملا تو ہم نے بھی مشرقی آداب سفر کے موافق کپڑوں کو گٹھری میں باندھا یا گٹھری کو کپڑوں میں باندھا۔ موٹر لاری کے ذریعہ اسٹیشن پر جانا اس لیے پسند نہ کیا کہ مبادا ہمارا موٹر کہیں الٹ جائے اور ہم مفقود الخبر میں تو کم از کم شفاخانے جانے کے قابل ہو کر وطن ہی میں دھرے رہ جائیں۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ سید جالب صاحب کی تقریر کھانسی سے محروم رہتے بلکہ شفاخانہ میں انگریز مزاج ہندستانی ڈاکٹروں کو نہیں دیتے اور گورنر خصلت ہندستانی کمپاؤنڈروں کی خوشامد کرتے کرتے تاشفایابی مرتے نہیں تو مرنے کے قریب ضرور ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی یہ غلام طینت ہندستانی کہے جاتے ہیں کہ یونانی علاج سے ڈاکٹری علاج عمدہ ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا کہ شفاخانے میں زخموں کو دھوتے وقت کوتوال صاحب کو لاری الٹ جانے کے متعلق بیان بھی لکھوانا پڑتا اور وہ ایک مرتبہ بھی یہ نہ دریافت کرتے کہ زخموں میں سوزش کتنی ہے؟ اس لیے کریما تانگہ والے سے شام ہی سے کہہ دیا کہ:

''دیکھو بھئی بڑی فجر سے تانگہ لے آنا''

''ہاں ہاں اسٹیشن جائیں گے''۔

''ہاں ہاں سویرے والی ٹیم سے جائیں گے''

''ابے ہاں لکھنؤ والی ریل سے''

''ہاں بھائی ایک سواری ہی ہوگی''

نہیں نہیں زنانہ نہیں ہوگی یا نہ ہوگا''۔

''دیں گے کیا؟''

''اے احمق وہی اڑھائی آنہ حسب دستور''

''لاحول ولا بھائی آخر تو تانگہ والا ہے یا ہماری خانگی اسمبلی کا کوئی آنریبل ممبر ہے جو بار بار سوالات کر رہا ہے؟ بس جاہاں دیکھ کھڑکی کے پاس سے آواز دینا اور سن زیادہ شور نہ کرنا۔

''اُن'' سے کہہ دیا تھا کہ علی گڑھ جارہے ہیں۔ وہاں کچھ بیان کرنا ہے، اس لیے انھوں نے چاروناچار تمام ضروریات سفر فراہم کر دیں کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھے بیٹھی ہیں کہ ہم کوئی 308 قبل مسیح کے مولوی صاحب ہیں اور علی گڑھ میں چونکہ نیچری لوگ ہیں اس لیے ہم وہاں کبھی کبھی وعظ کہنے چلے جاتے ہیں، جس سے بڑا ثواب ملتا ہے۔ مگر 'اُن' کو کیا خبر کہ ہم ہمیشہ ایسے جلسوں میں جا شریک ہوتے ہیں جو گورنمنٹ آف انڈیا اور پنجاب کے مشہور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سر مائیکل اوڈائر کے مزاج کے خلاف منعقد ہوا کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ صبح کے کوئی پانچ بجے ہوں گے اور ابھی ہمارے ہاں کے مرغے نے اذان بھی نہ دی تھی کہ کریا تانگہ والا چیخا:

''مولوی صاحب تانگہ حاضر ہے''

''اجی مولوی صاحب''

''او مولوی صاحب''

''تانگہ لے آیا ہوں تانگہ''

''بستر بھیج دیجیے''

تمام ہندستانی واقف ہیں کہ دنیا جہان کی غفلت، کاہلی، سستی، غنودگی اور آرام کا وقت صبح صادق ہی سے شروع ہوتا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کو اس وقت بہت زیادہ غفلت ہوا کرتی ہے جن کے گھروں میں مچھر اور کھٹمل کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے تانگہ والے کی آواز کو سنا تو مگر یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ:

''آتے ہیں بھائی''

یا ''آرہے ہیں، بستر تو باندھ لیں''

یا ''ابے آتو رہے ہیں چیختا کیوں ہے؟''

یا ''ٹھہرنا ہو تو ٹھہرو ورنہ رستہ لے''

ہارے ''انھوں'' نے ہمارا شانہ دبا کر کہا:

''علی گڑھ جاتے ہو کہ نہیں وہ تانگہ والا کب سے پکار رہا ہے''۔

تب غفلت دور ہوئی اور ہم سمجھ گئے کہ ہمیں لکھنؤ جانا ہے جسے یہ علی گڑھ سمجھے بیٹھی ہیں۔ فوراً مع بستر تانگہ پر سوار ہو گئے مگر مزاج کا ہندستانی جلاہا پن کہاں جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفری گھبراہٹ میں ناشتہ دان گھر ہی میں بھول گئے۔ اب جناب شروع ہونے دیجیے ریل میں بھوک کا زور اور وہ بھی تھرڈ کلاس ڈبے میں۔

واضح ہو کہ ریل کے تھرڈ کلاس میں ڈنر، بریک فاسٹ، لنچ اور ہر قسم کا کھانا کھانے کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر کھانا کھانے والا مسافر کسی بڑے اسٹیشن سے ایک لوٹا پانی پیشگی لے کر بیٹھ جاتا ہے اور تمام راستہ اس پانی کی حفاظت کرتا جاتا ہے کیونکہ انگریزوں کے خیال میں ریل کے تھرڈ کلاس میں مسافروں کو پیاس معلوم ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے نزدیک تھرڈ کلاس کے تمام مسافر راستہ بھر ''حوائج ضروری'' ہی میں رہتے ہیں اور اسی لیے انگریزوں نے تھرڈ کلاس میں اسی کوٹھری میں پانی کا نل لگا دیا ہے جس کا پٹ کھل جانے سے تمام مسافروں کو لکھنؤ کے محمد علی عطر فروش یاد آ جاتے ہیں۔ دوسرا ضابطہ یہ کھانے کا یہ ہے کہ کھانا کھانے والا تمام مسافروں کی طرف سے اس طرح رُخ بدل کر بیٹھ جاتا ہے گویا وہ کھانا نہیں کھا رہا بلکہ اخبار سیاست لاہور کے ''راز و نیاز'' والا کالم لکھ رہا ہے اور وہ دل میں یہ خیال کر لیتا ہے کہ ڈبے کے مسافر مجھے دیکھ تو رہے ہیں مگر یہ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔

واضح ہو کہ ریل کے تھرڈ کلاس کے مسلمان مسافر عام طور پر پراٹھے، انڈے، گوشت اور حلوے کے لڈو کھاتے ہیں اور ہندو مسافر مونگ کے خشک لڈو اور اڑھائی آنے پاؤ والی پوریاں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں خشک ہوتی ہیں جن کا بغیر ایک گھونٹ پانی حلق سے اترنا محال ہے۔ اس

لیے لامحالہ ایک لوٹا پانی لے کر بیٹھنا ہر مسافر پر فرض ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں اپنا ناشتہ یاد آیا جسے ہم تانگہ والے کی گھبراہٹ میں گھر بھول کر آئے تھے ناگاہ ہماری نظر ڈبے کے ایک ایسے بزرگ پر پڑی جو ذرا تر چھے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے مگر ہم سے بہت دور بیٹھے تھے، اس لیے فکر ہوئی کہ یہ پوریاں خور انسان مسلمان ہے یا ہندو؟۔

ظاہر ہے کہ دور سے نظر آنے والے یا آنے والی کی قومیت کا اندازہ اُس کے لباس ہی سے ہوسکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس کا رنگ کالا کالا ہو، یا ذرا کالا ہو، یا کچھ کچھ کالا ہو، یا بہت کالا ہو، یا نرا کالا ہو، یا بہت ہی کالا ہو، یا بالکل کالا ہو، یا قطعی کالا ہو، یا نہایت کالا ہو، یا بے حد کالا ہو، یا انتہائی کالا ہو، یا سرتاپا کالا ہو۔ دیکھا تو حضرت پوری خور سر پر کھادی کی گول ٹوپی انگریزی وضع کا کوٹ اور دھوتی فرمائے ہوئے مصروف کھا تھے۔

(اردو میں کبھی کبھی آدھا مصدر بھی پورے مصدر کا کام دے جاتا ہے۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ فلاں صاحب سرگرم چل تھے یعنی چل رہے، یا فلاں صاحب محوِ دیکھ تھے یعنی دیکھ رہے تھے۔ یا دیکھنا کر رہے تھے۔ اس قسم کے جدید افعال بنانے سے یو۔ پی اور پنجاب و بنگال کے اہلِ قلم حیدرآباد کے حسب ذیل افعال کا توڑ کرسکتے ہیں۔ مثلاً جہاز چلانا سے جہازنا یا اردو بنانا سے اردوانہ وغیرہ)

غرض اس لباس سے ہم حیران رہ گئے اور سوچا کہ پوری کھانے والا گول ٹوپی سے مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور ہندو بھی اور قمیص سے بھی دونوں ہوسکتا ہے، لیکن ٹوپی اور قمیص کے ساتھ دھوتی نے تمام معاملہ الٹ کر رکھ دیا۔ پھر یہ بھی سوچا کہ اس ''مع دھوتی انسان'' کو مسلمان بھی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یوپی میں مسلمان بھی دھوتی فرمانے کے عادی ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی کہ اگر ایسے احتمالات کے ساتھ ہم ان کی پوریوں پر جھک گئے یا ٹوٹ پڑے یا پل پڑے یا جا گرے یا بسم اللہ بول اٹھے اور یہ نکلے قوم کے ڈاکٹر مونجے یا لالہ لاجپت رائے تو بجائے پوریاں کھلانے کے یہ ہمارے اوپر کہیں ''ازالۂ حیثیت پوری'' نہ دائر کردیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تو ان کے لباس سے ان کی قومیت کا اندازہ ہی کرتے رہے اور اس رنگا رنگ اور مختلف وضع کے لباس سے ابھی انھیں پہچان

بھی نہ سکے تھے کہ انھوں نے پانی کا لوٹا اٹھا کر جو منہ سے لگایا تو تمام پوریاں شکم نشیں ہو کر رہ گئیں۔
یہ پہلا نقصان پہنچا ہمیں ہندستانیوں کے یکساں اور ایک وضع کے لباس نہ ہونے سے۔

خیر جوں توں کر کے ریل گاڑی بغیر پٹری سے اترے ہوئے سیدھی لکھنؤ کے اس اسٹیشن پر جا کھڑی ہوئی جو اس لیے شاندار بنایا گیا ہے کہ اگر "نہرو رپورٹ" کی وجہ سے تمام انگریز ہندستان سے چلے بھی گئے تب بھی برسوں تک ہندستان میں ان کی عمارتیں ان کی یادگار رہیں گی۔ اب اس اسٹیشن سے ہندستانیوں کے انواع واقسام کے لباس نے ہمیں اور بھی پریشان کر دیا۔ یہاں سے ہم جس تانگہ پر سوار ہو گئے گو وہ تانگہ والا حضرت واجد علی شاہ غفران مکان کے دور میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر نفاست اور رنگینی میں آج بھی وہ نیلم پری سے کم نہ تھا۔ سر پر انگریزی وضع کے بال تھے جو بدبودار تلی کے تیل ہی سے سہی پر آراستہ ضرور تھے۔ ایک واہی تباہی قسم کا کوٹ اور میلی سی دھوتی مگر تھے صاحب ذوق اس لیے راستہ بھر تانگہ چلاتے وقت سیٹی بجاتے رہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ جناب کا اسم شریف محمد حسین ہے یعنی مسلمان۔ ابھی نظام الدین بیرسٹر کی کوٹھی تک ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک موٹر آیا اور بہ یک نظر موٹر والوں نے ہمیں اور ہم نے موٹر والوں کو پہچان لیا۔ اس موٹر میں ہمارے دو محترم دوست تھے جن میں سے ایک تو پورے آنریبل ممبر ہیں اور دوسرے بھی آنریبلی کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ دعا سلام اور موٹر میں تاخیر کی عذر خواہی کے بعد تانگہ سے اتر کر موٹر میں بیٹھے اور سگار پیتے ہوئے جب امین آباد پارک میں پہنچے جہاں ہندو مسلمانوں کی قابلیت سے محفل میلاد کا انعقاد بند کا معاملہ ہوا تھا تو اس عظیم الشان بازار میں ہزاروں ہندستانی اس طرح نظر آئے کہ ان میں سے ہر ایک کے سر پر ذیل کی مختلف اور رنگ برنگ ٹوپیاں تھیں۔

ترکی ٹوپی، مصطفیٰ کمال کیپ، فلیٹ کیپ، امیر کیپ، افغان کیپ، ایرانی کیپ، انگلش کیپ، گاندھی کیپ، انصاری کیپ، پشاوری لنگی کلاہ دار عمامہ غرض سر تو سب ہندستانی تھے مگر ٹوپی ہر قوم کی اس پر سوار تھی۔ یہی اختلاف اور رنگا رنگی دوسرے کپڑوں میں نظر آ رہی تھی۔ کوئی شیروانی فرمائے ہوئے تھا تو کوئی انگرکھا۔ کوئی سادھوانہ نیچا کرتا تو کوئی کرتے پر بمبئی کی صدری۔ کوئی کوٹ پتلون تو کوئی خلافتی عبا۔ پاجاموں کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی اس قدر چست کہ تلوار کا نیام کہیں اسے اور کوئی اس قدر ڈھیلا کہ تکیہ کے غلاف کہیں جسے۔ کوئی برنچس تو کوئی شلوار کوئی نرا نیکر تو کوئی جلوہ

نما دھوتی۔ غرض ان ہزاروں ہندستانیوں کے ہجوم میں سو ہندستانی بھی نہیں تھے جن کا لباس یکساں نظر آیا ہو اور یہی وہ نازک علامت ہے ہندستانیوں کی اختلاف پسند طبیعت اور غلام طینت ذہنیت کی جس نے تمام ہندستانیوں کو قومیت کے معنی اور مفہوم سے بیگانہ بنا رکھا ہے۔

آل پارٹی کانفرنس کا لکھنوی اجلاس ہندستان کے نظم حکمرانی کا تجویز کنندہ اجلاس تھا، اس لیے ہمارے درجہ سوم دماغ پر اس کا بہت کافی اثر تھا اور اسی عظمت نشان اجلاس کی اہمیت سے ہم اس میں ہر شریک ہونے والے رام لال اور مولا بخش کو ہندستان کا بلند پایہ صاحب عقل وفکر سمجھ لیتے تھے اور یہ خیال تھا بھی صحیح کیونکہ اسی اجلاس میں ہندستان کے وہ تمام دماغ سمٹ آئے تھے جن پر ہندستانی عقل ودانش ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے قدرتاً دماغ اور نظر ان بالغ نظر ارباب حل و عقد کی ہر ادا میں ہندستانی قومیت اور ہندستانی خواص وخصوصیات کو ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ ہندستانی قومیت کا یک رنگ ویک وضع لباس تو گیا بھاڑ میں دیکھا یہ کہ ہندستانی قومیت کے یہ غلام سرشت معمار انگریزی لباس ہی نہیں بلکہ اجلاس کی کارروائی میں بعض انگریزی زبان بھی استعمال فرما رہے تھے اور ٹوپی اور پاجامہ کے اختلاف کا تو عالم ہی جدا تھا۔ کوئی ڈھائی انچ کی کھدری دھجی سر پر چسپاں کیے ہوئے تھا تو کوئی برگنڈی اور سائنس بال سنوارے ہی تقریر کے لیے ڈٹا ہوا تھا۔ کوئی پنجابی عمامہ کو ہندستانی لباس کا پرچم سمجھ رہا تھا تو کسی نے آخر وقت تک محمود آبادی کیپ کو سر سے نہ جانے دیا۔ غرض جتنے جسم تھے اتنی ہی وضع کے لباس بھی نظر آ رہے تھے اور اسی لیے اس عظیم الشان اجلاس میں کوئی وزن تھا نہ وقار بہ خلاف اس کے پولیس کے ان چند سپاہیوں کا خاصا اثر پڑ رہا تھا جو یکساں وضع کی وردی مع ڈھائی گزی لٹھ پہنے کہیں کہیں نظر آ جاتے تھے۔

پس ان حالات میں اگر خاکسار ملا رموزی عفی عنہ غفرلہ اور کان اللہ لہ کی یہ صوفیانہ اور مولویانہ آواز کانگریس کے ایک رکن کے کان تک بھی پہنچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ آئندہ کلکتہ کے اجلاس میں یہ تحریک کردے کہ تمام ہندستانیوں کے لیے ایک ہی وضع کا لباس وضع کرنا بھی کانگریس کے داخلی فرائض میں داخل ہے اور اگر یہ تحریک کی جائے تو ساتھ ہی ہندستانی قومی لباس کا حسب ذیل نمونہ بھی پیش کر دیا جائے۔

مردوں کے لیے ترکی کوٹ جس کا طول گھٹنوں تک ہو، پاجامہ جو نہ زیادہ چست ہو اور نہ زیادہ بریلوی۔ مسلمانوں کے لیے لال ترکی ٹوپی اور ہندوؤں کے لیے سفید کھدری گاندھی کیپ۔

عورتوں کے لیے شیروانی کے برابر لمبا کوٹ، چست یا شلوار نما پاجامہ۔ سر پر ہاتھ کا رومال یا اس کے مقابل کوئی اس سے بھی زیادہ خوبصورت لباس وضع کر کے کانگریس کو منظور کر لینا چاہیے اور اعلان کر دیا جائے کہ آئندہ سے یہ یک رنگ لباس ہندستان کا قومی لباس سمجھا جائے گا اور ہر ہندستانی اس قومی لباس کے استعمال پر ویسا ہی مجبور ہوگا جیسا ہندستانیوں کے خلاف لندن ٹائمز میں مضامین لکھنے پر سر مائیکل اوڈوائر مجبور ہیں۔ زیادہ حد فقط۔

◆◆◆

چائے کی پیالی

(مندرجہ ذیل مضمون میں ملا رموزی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں چائے کی پیالی کے متعلق جو کچھ حقائق تحریر فرمائے ہیں وہ ہم مدراسیوں کے لیے قابل توجہ ہیں۔ آج کل چائے نوشی کی کثرت سے ضعف معدہ کے جو کچھ عوارض پیدا ہوتے ہیں ان پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے چیف ایڈیٹر صاحب بھی شاید اس میں ہماری ہموائی فرمائیں گے کہ کثرت چائے نوشی کی وجہ سے معدہ کی باقاعدہ دباغت ہو جاتی ہے۔ اب رہا چائے خانوں کا مسئلہ وہ بھی توجہ کے قابل ہے جو کچھ ملا صاحب نے بمبئی کے متعلق لکھا حرف بہ حرف مدراس پر صادق آسکتا ہے۔ ع۔ ج)

آج کل ہندستانیوں کی تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں چائے کی پیالی کو جو دخل حاصل ہو گیا ہے اس کی مالی اور طبی اہمیت اس امر کی محرک ہے کہ اس عنوان پر نہایت لیاقت سے بحث کی جائے۔ اب یہ اور بات ہے کہ چائے کے اس مقطع میں کہیں کہیں سخن گستری کا معاملہ بھی کیا جائے تو اس سے عداوت مقصود نہ ہوگی۔ لفظ چائے کا معاملہ اسی جگہ سے نازک ہوا جاتا ہے کہ ہمیں تحقیق نہیں کہ یہ لفظ اصل میں ''چائے'' ہے یا ''چاء'' یا صرف ''چا''؟ البتہ اس کے اہم پہلو یہ ہیں یعنی چائے کے متعلق صاف اور سیدھی تحقیق یہی ہے کہ چائے ہندستان میں یورپ والوں کے فاتحانہ میل جول کے اثر سے آئی۔ اب یورپ میں چائے کے رواج کے لیے یورپی ارباب قلم

نے سائنس اور فلسفے کے چاہے جتنے بھی نکات اور اسرار بیان کیے ہوں مگر آپ ایک پر بھی یقین نہ کیجیے کیونکہ ان لوگوں کی اکثر باتیں جھوٹ، لغو، مہمل اور لایعنی ہوتی ہیں۔ البتہ عقل سلیم کے نزدیک اصل معاملہ یوں ہے کہ یورپ والے سرد ملک ہونے کی وجہ سے جاڑے میں مرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سردی کی شدت سے محفوظ رہنے اور جاڑے کو کم کرنے کے لیے گرم پانی پینا چاہا مگر گرم پانی چونکہ ''کوچہ حکیماں دہلی'' کا مسہل ہوا جاتا تھا، اس لیے اس کے ''مسہلی اثر'' کو دور کرنے کے لیے یورپ والوں نے ایک درخت کے پتے تلاش کیے جو مضر اثر سے بھی پاک تھے اور پانی کے اصل رنگ میں سرخ رنگ کی نظر فریبی پیدا کر دیتے تھے۔ اس لیے ان کا نام رکھ دیا ''چائے''، لیکن ان پتوں کو جوش دے کر پی جانے سے دل و دماغ کی تمام تازگی اور تری کافور ہوئی جا رہی تھی تو کسی نے اس میں دودھ ڈال لینے کا مشورہ دے دیا۔ اب رہی شکر سو یہ ہر شخص کی مقدرت پر موقوف تھی۔ جو مالدار تھے انھوں نے شکر کا انتظام کیا باقی نے بغیر شکر ہی ''اللہ شافی اللہ کافی'' کہہ کر پی لی، مگر غلام طینت ہندستانیوں نے یورپ والوں کو بغیر شکر کے چائے پیتا دیکھا تو یہ بے چارے عقل اور حکومت کے مارے سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ بھی کوئی بہت ہی بڑا فیشن ہے اس لیے ان میں بھی بعض بغیر شکر ہی کے پینے پر اتر آئے اور مصیبت یہ کہ اس حماقت پر خوش اور مطمئن بھی۔

چائے کی یہ تو وہ اصل اور نہایت صحیح سوانح عمری تھی جو یورپ والوں سے متعلق ہے، لیکن ہندستان میں چائے بغیر کسی ضرورت اور تحقیق کے محض غلامانہ تقلید کی ذیل میں آئی اور اب یہ حال ہے کہ ٹالے نہیں ٹلتی اور آج شریف آدمی وہی سمجھا جاتا ہے جو صبح و شام نہایت ٹھاٹھ سے چائے پی لے یا پیتا رہے یا پی کر اٹھے یا پیے تو پیتا ہی چلا جائے۔ آج سے صرف پچاس برس الٹے چلے جائیے تو آپ کو ہندستانی زندگی میں چائے کا کہیں پتہ بھی نہ ملے گا مگر آج چائے کی یہ کثرت ہے کہ اپنے بڑے مولوی صاحب تو رہے ایک طرف یہ اپنے اپنے محلّہ کے حمال اور دھوبی تک ایک پیالی چائے سے نہیں چوکتے۔ اور بازاروں میں تو اس کی کثرت کا کیا کہنا؟

فرق صرف یہ ہے کہ یورپ والوں نے چائے ایک خاص غرض اور مقصد کے لیے استعمال کی اور ہندستان کے لوگوں نے صرف نظری رعب اور اثر کو قبول کر کے اس کا استعمال شروع کیا۔

یورپ والوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کی ہر چیز سے فائدہ اٹھانے اور اسے دنیا جہاں کی نظروں میں مقبول بنانے کے لیے عجیب غریب چالاکیوں اور ترکیبوں سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی پیش کی ہوئی ہر چیز نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھی اور استعمال کی جاتی ہے اور یہی وہ اثر ہے جس کے تحت یورپ کی بے شمار چیزوں کی تحقیق اور اصلیت معلوم کرنے سے ہندستانی آج تک بے پروا بنے ہوئے ہیں۔ چائے کے متعلق بھی ہندستانیوں میں کوئی تحقیق نہیں۔ بس اس فائدہ پر لٹو ہیں کہ چائے پینے سے ''جوش'' پیدا ہوجاتا ہے مگر اس جوش کی اصلیت کو آج تک نہ کلکتہ کے ڈاکٹر ایس کے برمن نے معلوم کیا نہ دہلی کے حکیم نابینا صاحب نے۔

پیٹ یا معدہ کے اندر جب گرم پانی جاتا ہے تو وہ ایک قسم کی واقعی حرارت پیدا کرتا ہے جس سے تمام اعضا متاثر ہوتے ہیں جو چند لمحہ کے لیے مزاج میں بحرانی یا ہیجانی یا جوشیلی کیفیت پیدا کردیتا ہے، لیکن چائے میں دودھ اور شکر کی حلاوت اور لذت بھی شامل ہوتی ہے اس لیے انسان صاحب سمجھتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ کوئی بڑی ہی مقوی چیز ہے جو فوراً جسم کے اندر تازگی اور امنگ پیدا کردیتی ہے، اس لیے اسے پیے جاؤ پیتے ہی رہو۔

لیکن اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایسے تمام حضرات جو چائے کے عادی ہیں چائے پینے سے کچھ دیر قبل اور کچھ دیر بعد دنیا جہاں میں صرف جمائیاں لینے کے قابل رہ جاتے ہیں اور جسمانی اعتبار سے ان کی ذہنی اور قدرتی طاقت اس درجہ پست، سست اور بے کار اور جامد ہوجاتی ہے کہ جب تک اس پر چائے کا گرم چھڑکاؤ نہ کیا جائے وہ کارآمد نہیں ہوتی پر نہیں ہوتی اور چائے کی بھی وہ لعنت ہے جس کے اندر 33 کروڑ ہندستانی یوں گرفتار ہوچکے ہیں کہ انھیں اپنی اس ''چائے بندی'' کی خبر تک نہیں۔ چائے کے پینے کے مروجہ طریقے یہ ہیں:

امرائے ہند میں صبح وشام چائے کا پینا از بس کہ لازم قرار پاچکا ہے۔ ان کے ہاں صبح سویرے بغیر از تلاوت قرآن کے بڑی بڑی کشتیوں میں چائے اس اہتمام سے پی جاتی ہے گویا ان کے ہاں کسی کی ''دعوتِ ولیمہ'' ہے، جس کے ساتھ سوائے پلاؤ اور قورمہ کے دنیا بھر کے میوے، مٹھائی اور بے حد ثقیل غذائیں موجود ہوتی ہیں، جن کے طبی اور ڈاکٹری ہضم کے لیے چار گھنٹے کی

سخت محنت یا ورزش ضروری ہے، مگر نہیں کی جاتی بلکہ چائے کے بعد ممکن ہوتا ہے تو تاش کھیلا جاتا ہے اور معدہ کو بغیر حرکت فوجی جبری بھرتی کی طرح بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے ان تمام ثقیل غذاؤں کو ہضم کرنا پڑتا ہے۔ ایسے امراء اکثر معدہ کی شکایت میں مبتلا ہوکر بقول اخبارات طبعی عمر سے پہلے ہی انتقال پُر ملال فرما جاتے ہیں۔

دوسری چائے احباب کی ہوتی ہے، جسے انگریزوں کی زبان میں ''ٹی پارٹی'' کہتے ہیں اور اب غلامی کے اثر سے زبانِ اردو میں بھی ''ٹی پارٹی'' ہی کہا جاتا ہے۔

ہندستانیوں میں یہ ٹی پارٹی ہر ادنیٰ اور اعلیٰ موقع پر دی جاتی ہے۔ مثلاً ہاکی میں جیت گئے تو ٹی پارٹی، تنخواہ میں اضافہ ہوا تو ٹی پارٹی، کوئی دوست کسی کام میں کامیاب ہوا تو ٹی پارٹی، کوئی مہمان آیا تو مع احباب ٹی پارٹی، لڑکا پیدا ہوا تو ٹی پارٹی اور لیڈروں کو اُلّو بنانا ہوا تو ٹی پارٹی۔ غرض سوائے وفات کے باقی تمام موقع پر ٹی پارٹی دی جاتی ہے اور دی جاسکتی ہے۔ ان ٹی پارٹیوں میں ذرا سلیقہ سے یا بہت زیادہ سلیقہ سے یا ذرا اہتمام سے یا بہت زیادہ اہتمام سے چائے کے ساتھ مٹھائی، میوے اور انگریزی غذائیں اس کثرت اور افراط سے حاضر کی جاتی ہیں کہ شرکت کرنے والوں کی آئندہ نسلیں تک ان سے سیر ہو جائیں، مگر یہ غذائیں ختم نہ ہوں۔ اس قسم کی ٹی پارٹی میں ہندستانی بڑے پُر تکلف لباس پہن کر تشریف لے جاتے ہیں۔ انگریزی فیشن کی ہر ادا اکمل کی جاتی ہے اور غلام ہوکر بھی خود کو لارڈ برکن ہیڈ اور لائیڈ جارج کا ہم پایہ تصور کر کے موٹر میں جاتے ہیں اور تانگے سے تو چوکتے ہی نہیں۔ ورنہ چھڑی ہلاتے ہوئے پیدل ہی۔ پارٹی میں داخل ہوتے ہی انگریزی زبان میں گفتگو شروع کی جاتی ہے اور چائے یوں پی جاتی ہے گویا 308 قبل مسیح کے قحط زدہ عیسائیوں کو یکا یک کھانا مل گیا ہے۔ سامنے کی ایک رکابی بھی خالی نہیں رکھی جاتی البتہ ایسی پارٹیوں میں علی گڑھ قسم کے افسر لوگ ذرا کم کھاتے ہیں سو وہ بھی دوسرے شرکا پر اثر ڈالنے کے لیے ورنہ بھوک انھیں بھی اتنی ہی ہوتی ہے کہ اگر مجمع آنکھیں بند کرے تو سب کا صفایا بول کر چھوڑیں۔ بعد فراغ وفراغت بیش قیمت سگریٹ اور سگاریوں پیتے ہیں گویا ہر شخص کے گھر میں ایک عظیم الشان کارخانۂ سگریٹ سازی موجود ہے۔ سگریٹ نوشی کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے جنھیں سوائے ہوحق، فضولیات، ٹینس، کرکٹ اور گھوڑ دوڑ وغیرہ کے ادب اردو، خلافت، مسلم لیگ، جمعیۃ العلما،

مسلم یونیورسٹی، نہرو رپورٹ، اخبار زمیندار، عراق میں سرگلبرٹ کلیٹن، مسٹر قلبی، کرنل لارنس۔
مئی 1929 میں انگلستانی وزارت کے انقلاب وتغیر کے اثرات، فرانس کے فوجی گورنر جنرل گوراڈ
کے سیاحت ہند بابت 1929 کے اغراض ونتائج اور افغانی بغاوت کے عواقب کا کوئی تذکرہ ہی نہیں
ہوتا۔ گویا یہ تمام چیزیں قابلِ ذکر ہی نہیں۔ ایک دوسرا ایک دوسرے کو دفتری یا خانگی حالات پر
گدگداتا ہے اور ٹی پارٹی دینے والے سے تھینک یو کہہ کر آجاتے ہیں اور ہاں کبھی کبھی گروپ بھی لیا
جاتا ہے یعنی سب کا اکٹھا فوٹو۔ ایک قسم چائے پینے کی یہ ہے کہ اگر آپ نے کسی مڈل اسکول میں تعلیم
پائی ہے اور کہیں کے معمولی سے افسر بھی ہوگئے ہیں تو اب آپ اپنے عزیز سے عزیز دوست سے اس
کے گھر پر ملنے نہیں جائیں گے بلکہ اس سے زبانی تحریری طریقہ سے کہیں گے کہ آج میرے ہاں
چائے پر تشریف لائیے۔ ایسی چائے میں بھی کھانے کا انبار ضرور لگادیا جاتا ہے۔ البتہ اس قسم کی
چائے بنانے میں خانساماں کی جگہ ''ننھے میاں کی والدہ'' ہی حصہ لیتی ہیں۔ ایک ٹی پارٹی وہ ہوتی ہے
جس میں عظیم الشان مدبرین اور ارکانِ سلطنت شریک ہوتے ہیں اور بعد چائے نوشی ملک وقوم کے
کسی اہم ترین معاملہ پر بات چیت کرتے ہیں مگر اس میں بھی کھانے کی چیزیں اس افراط سے ہوتی
ہیں کہ گھر آکر دوبارہ کھانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ ایک ٹی پارٹی وہ ہوتی ہے جو اسکولوں اور کالجوں
میں امتحان کے بعد ٹورنامنٹ میں کپ جیت جانے کے بعد دی جاتی ہے۔ اس میں صرف اسکولی
لوگ حصہ لیتے ہیں اور ٹی پارٹی میں چائے بھی طلبا پکاتے ہیں یا بناتے ہیں اور چولھا بھی طلبا ہی
جلاتے ہیں۔ اس پارٹی میں بھی میوے، مٹھائیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی پوریاں اور کچوریاں
بھی منگائی جاتی ہیں۔ چائے پینے کے بعد گروپ لیا جاتا ہے۔ ایسی ٹی پارٹی میں اسکول کے ماسٹر اور
پروفیسر انگریزی لباس یوں پہن کر آتے ہیں گویا اس زمانے میں صرف وہی انگلستان کے وزیر اعظم
ہیں۔ ان کی ہر بات میں نخرہ، غرور، اکڑ اور فیشن ہوتا ہے۔ ایک چائے وہ ہوتی ہے جو شہر بمبئی میں پی
جاتی ہے اور بس۔ خدا اس چائے سے ہر شریف آدمی کو محفوظ رکھے۔ بمبئی کے چائے پینے کا طریقہ یہ
ہے کہ یہاں گلی میں چائے، سڑک پر چائے، اٹاری پر چائے، دکان پر چائے، گھر پر چائے، تھیٹر میں
چائے اور ہوٹل کا تو ذکر ہی کیا۔ گویا وہ شریف ہی نہیں جو دن اور رات میں بقدر بارہ ہزار ٹن وزن کے
چائے نہ پی لے۔ چائے کی یہ وہ عام اقسام ہیں جو ہندستان میں پائی جاتی ہیں اور ان میں روز بروز

اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے بعد چند خاص اقسام بھی ہیں۔ ان میں پہلی قسم وہ چائے ہے جو حد سے سوا گندی، غلیظ اور تاریک دکانوں میں تیار ہوتی ہے اور پی جاتی ہے اور بدقسمتی سے ان دکانوں کو قہوہ خانہ کہتے ہیں۔ اس قسم کی دکانوں میں "چائے کا قوام" یوں تیار کیا جاتا ہے کہ چولھے کا تمام دھواں اس تنگ و تاریک کوٹھری میں بند رہتا ہے جس میں شائقین والا تمکین اور شار بین جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف چولھا دوسری طرف آٹھ دس پیالیاں اور دھواں کھائی ہوئی دیوار پر مکہ شریف کا نہیں تو تاج بیوی کے روضہ کا نقشہ لگا ہوا، چائے کے ساوار کے آس پاس پیالیوں کے دھوئے ہوئے پانی کا غلیظ کیچڑ اور وسط دکان میں یا دکان کے حاشیہ پر چائے نوش حضرات کا وہ مجمع جس کے جسم اور لباس سے کھیاں کسی حال میں جدائی پسند نہیں کرتیں۔ ان چائے نوشوں کی مالی حالت کا یہ عالم کہ یہ سنگل کے سوا کوپ تک نہیں پی سکتے۔ بس ایک سنگل لیا اور کوئی نصف گھنٹے میں یوں پیا کہ داستان امیر حمزہ، قصہ گل و بکاؤلی، حاتم طائی یا پھر فتوح الشام کا کوئی واقعہ اس فصاحت سے بیان کر دیا کہ دوسروں نے اپنے اپنے سنگل منہ تک لا کر چھوڑ دیے اور قصہ سننے میں محو ہو کر رہ گئے۔ ان لوگوں پر ہر گھونٹ کے بعد شگفتگی، تازگی اور جوش کے بجائے غنودگی غالب آتی رہتی ہے۔ اور بعض گردن کو گھٹنوں کے بیچ میں گرا دیتے ہیں گویا مراقبے کے ذریعہ افغانی بغاوت کے اسباب معلوم کر رہے ہیں۔ ان کا سارا دن اسی دکان پر یوں گزر جاتا ہے کہ قصہ گوئی کی بدولت احباب کی طرف سے بھی کبھی کبھی "سنگل" مل جاتا ہے اور اس سنگل سے ان کے اندر پھر جان سی آجاتی ہے۔ ان کی گفتگو میں لوچ، لچک، تہذیب اور نرمی یا شیرینی حد سے سوا ہوتی ہے۔ دکاندار میں بھی غنودگی سے لے کر قصہ گوئی تک کے جملہ اثرات موجود ہوتے ہیں۔ ان لوگوں سے دکاندار کا قرضہ کبھی پورا ادا نہیں ہوتا ایک آدھ سنگل کے دام ضرور باقی رہ جاتے ہیں۔ قارئین یہ سن کر بے حد محظوظ ہوں گے کہ ایک ایسی ہی دکان پر ملا رموزی صاحب بھی جاتے رہتے ہیں اور یہ اس لیے کہ صبح سویرے اتنی تاب نہیں رہتی کہ ڈاکیہ ڈاک خانے سے ڈاک گھر لے آئے لہٰذا خود ڈاک خانہ جاتے ہیں تو سامنے ہی حافظ جی کا قہوہ خانہ ہے۔ یہ دکان سڑک کے ایسے کنارہ پر واقع ہے جسے عام طور پر "لب سڑک" کہتے ہیں۔ ایک لمبی بینچ سامنے پڑی ہے اور اندر ایک ایسا کشادہ چبوترہ ہے جس پر پانچ سے لے کر دس آدمی شانہ بشانہ بیٹھ سکتے ہیں۔ اسی چبوترے کے ایک گوشے میں چائے بنانے یا پکانے کا چبوترہ ہے جس

کے دھوئیں کے اخراج کے لیے صدر دروازہ تو ہے اور کوئی راستہ نہیں، اس لیے سارا دھواں چائے نوشوں کی آنکھوں کو متاثر کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ عام راہ گیر اور عجلت پسند لوگ تو باہر والی بنچ پر بیٹھ کر چائے پی جاتے ہیں، لیکن مخصوص لوگ دکان کے اندرونی حصہ میں بیٹھ کر پیتے ہیں اور اصولی چائے نوشی بھی اندر ہی ہوتی ہے۔

چونکہ ہمارے اور ننھے میاں کی والدہ کے تعلقات کچھ دن سے ''ذرا غیر خوشگوار'' ہو گئے ہیں اس لیے صبح سویرے کون ہے جو ہمیں چائے تیار کردے۔ پس ڈاکخانہ سے اخبار لے کر اسی قہوہ خانہ میں چلے جاتے ہیں۔ ابتداً یہاں دو تین جہاں گرد عرب بھی آتے تھے اور ہمیں عربی زبان میں گفتگو کا کرنل لارنس اور مسٹر فلبی کی طرح جو ملکہ حاصل ہے، اس نے ہمیں ان لوگوں میں بے حد مقبول بنادیا تھا، لیکن جب سے یہ عرب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں تو پارٹی میں یوسف زلیخا ہونے لگی۔ ایک بزرگ ہیں جنھیں صبح سات سے دن کے بارہ بجے تک یوسف زلیخا سنانے میں کوئی چیز مانع نہیں آتی اور وہ صرف ایک سنگل اور پلا دینے کے بعد یوسف زلیخا پھر سے شروع فرما دیتے ہیں اور یہی ہیں جو ہر وقت رونق میخانہ بنے رہتے ہیں۔ دکاندار حافظ جی بھی ان کی تواضع کرتے ہیں اور یہ غنودگی کی حالت میں کبھی کبھی چہک کر قصہ میں جوز ور پیدا کر دیتے ہیں اس پر ہر طرف سے سبحان اللہ کے نعروں سے ان کا دل و دماغ گونج اٹھتا ہے اور اس سے ان کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہونے پاتا تھا کہ بدقسمتی سے ہم اس محفل میں جو پابندی سے داخل ہونے لگے تو ہمیں کب یہ سلیقہ کہ ہم قصہ یوسف زلیخا یا قصہ علی بابا چالیس چور سن سکیں۔ ہم نے ترکیب یہ اختیار کی کہ رفتہ رفتہ اس پارٹی میں اخبار ''زمیندار'' سنانا شروع کر دیا۔ پارٹی میں ہوتے ہیں کچھ کچھ لکھے پڑھے بھی اس لیے تھوڑے دن میں یہ ہونے لگا کہ اخبار سے دلچسپی ہوگئی۔ ادھر ہم نے یہ ترکیب کی کہ کبھی کبھی ''زمیندار'' پڑھا اور پارٹی ہی میں چھوڑ کر چلے آئے تو وہ دن بھر پڑھا جانے لگا کیونکہ پڑھنے کی تیز رفتاری میں قہوہ خانے کی غنودگی بہت بڑی حد تک حائل رہی ہے۔ اس لیے ایک اخبار دن بھر میں بھی پورا نہیں ہوسکتا مگر جس طرح ہوتا ہے پڑھ لیا جاتا ہے اور دوسرے دن ہمیں واپس دے کر تازہ زمیندار لے لیا جاتا ہے۔ یہ تو تھا قصہ جب کا کہ ملا رموزی صاحب ابتداً قہوہ خانہ کے رکن بنے تھے لیکن ہماری مقبولیت اور بے تکلفی اس قہوہ خانہ کے وضعداروں میں یوں ہے

یا اس حد تک ہے کہ ہمارے قدم دھرتے ہی:

جگہ دینا یار جگہ دینا۔

آیئے مولوی صاحب۔

ہاں صاحب تو پھر آج کچھ پتہ چلا وہ گاے کی کشتی کا؟

اماں بیٹھنے تو دو بے چاروں کو۔

بڑے اخبار کے شوقین جانو نہ بوجھو، بے چاروں کو دم تو لینے دیا ہوتا۔

بھئی تو اگر استادر یافت کر ہی لیا تو کیا خطا کی؟

نہیں نہیں مولوی صاحب یہاں، یہاں یہاں۔ ارے صاحب میں وہاں تو کبھی بیٹھنے نہ دوں گا تو بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

آپ لوگ ٹھہرے ''اُلما''۔

ہمارے دین کے سرتاج۔

اور مولوی صاحب ہم تو ہیں سیہ کار دنیا کے کتے۔

بے شک بے شک حق ہے، ہاں صاحب اللہ نے آپ کا رتبہ ایسا ہی کیا ہے۔ آہ سچ ہے علم دریا ہوتا ہے۔ لاؤ بھئی حافظ جی اپنے مولوی صاحب کو چائے دو۔

کیوں مولوی صاحب ہم نے سنا تھا کہ کوئی جنرل ولایت سے آیا ہے اور وہ افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے گا؟

ہاں ہاں صاحب بے شک اس میں بھی کوئی چال ہی ہوگی۔ اے صاحب یہ انگریز بڑی چالاک ذات ہوتا ہے اور اسی لیے یہ بارہ ٹوپی والے مشہور ہی ہیں۔ مولوی صاحب اب آپ ہی سنایئے۔

تم خود تو بیچ میں بول اٹھے۔ انسانیت تو ہے نہیں آخر وہ آئے تھے تو... غنودگی... غنودگی... غنودگی لیجیے یہ چائے... غنودگی۔ غنودگی۔ غنودگی۔

افوہ یہ چال تھی۔ اللہ اکبر۔

اب دیکھیے ہماری اور مولوی صاحب کی بات میں کتنا فرق ہے۔

ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی چال ہے جرنیل ورنیل تو کیا کوئی لاٹ واٹ گزرا ہوگا،

لوگوں نے اُڑا دیا کہ جرنیل ہے۔

تم تو بے وقوف ہو، کل خود پڑھ رہے تھے کہ... تو اتنا پہچانے کہ... غنودگی... غنودگی... غنودگی۔

اچھا تو یوں تھا واہ مولوی صاحب ماشاء اللہ ہاں صاحب آپ کی بات پھر آپ کی بات ہے کون؟

اماں یہ قاسم خاں نے کہا تھا اور ہم سے پوچھو تو مولوی صاحب یہ سب قصے واہیات ہیں۔ پیسہ کمانے کی باتیں ہیں۔ کیوں صاحب ذرا ٹھہرنا تو ذرا چپ تو رہو میری بات کیوں کاٹ دی، میں تم سے تو نہیں بولا تھا۔

اماں چائے بھی پینے دیتے ہو بے چاروں کو لاحول ولا تمھارے فرشتوں نے بھی کبھی پڑھا تھا۔ سنا تو ہم نے بھی ہے کہ ہوائی جہاز پر صاحب لوگ اُڑتے ہیں اور یوں صاحب غیب کی خبر خدا جانے ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آخر اخباروں کو یہ خبریں کون دیتا ہے۔ واہ واہ مولوی صاحب دیکھیے کس طرح سمجھایا ہے۔ سبحان اللہ!

نہیں نہیں مولوی صاحب یہی بات سچ ہے۔ بے شک ہم یہ جانتے ہیں کہ اب تو نماز ہی پڑھو اور توبہ کرو، وہ دیکھو جمعہ کے دن جو میلاد شریف میں مولوی صاحب صاحب نے کہا تھا وہ حق ہے۔ ہمیں کل کی تو خبر نہیں۔ بھئی وہ ہے نکتہ نواز چاہے تو ذرا سی بات پر بخش دے۔ آخر وہ یوسف علیہ السلام کا قصہ سنا ہی ہو گا تم نے؟

اماں وہ جو انھوں نے اپنے بھائیوں کی خطائیں معاف کیں حالانکہ...

اب یہاں سے پھر قصہ یوسف زلیخا شروع ہو گیا اور ہم اٹھ کر چلے آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چائے کے مضر اثرات کو قبول کر کے اب نہ دنیا کے رہے اور نہ مافیہا کے دین کا تو ذکر ہی کیا۔ ان لوگوں کی چائے نوشی کی حد آخر یہ ہے کہ خود چائے نے انھیں پی لیا ہے۔ اب وہ بغیر چائے حرکت کر سکتے ہیں نہ کوئی کام ان لوگوں میں چائے نے ''نصف افیون'' کی وہ کیف آور اور کسل افزا تاثیر پیدا کر دی ہے کہ انھیں اب ضرورت ہی نہیں رہی کہ وہ سوائے چائے کے دنیا میں اور کام بھی کریں۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن چائے کا یہ خمار آور اثر ہندستان کے ہر طبقے نے یوں قبول کیا ہے کہ کوئی نہیں جو بغیر چائے دنیا میں کوئی کام کر سکے اور ایسے ہی لوگوں کی صحبت کا اثر کہیے کہ اپنے

ملا رموزی صاحب بھی اس مرتبہ کے چائے نوش ہو چکے ہیں کہ خود ننھے میاں کی والدہ ان کی چائے بازی سے تنگ ہیں، جہاں صبح ہوئی اور ننھے میاں کی والدہ نے چولھا سنبھالا اور چائے تیار کی ورنہ ملا صاحب کسی کام کے ہی نہیں۔ سر میں درد ہو رہا ہے تو کبھی انگڑائی کا دورہ پڑتا ہے اور ''جمائی کے ترنم کا'' تو تار ہی ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ غرض چائے بغیر ایک ایک آدمی کے دس دس آدمی نظر آتے ہیں۔ مزاج میں تیزی، تلخی اور ترشی وہ کہ غضبنا کی کہیں اسے، کسل اور سستی جمود اور کاہلی وہ کہ مردنی کہیں جسے۔

اور اگر وہ قصہ اس جگہ مختصر کر دیجیے تو کہنا پڑتا ہے کہ اگر چائے کے خلاف شدید جہاد شروع نہ کر دیا گیا تو وقت گزرنے پر معلوم ہو جائے گا کہ کام کے نام سے بھی ہندستانی جی چرائیں گے۔ پھر یہ مردوں کے ذمہ کا کام صنفِ نازک کرے تو کرے۔ مرد تو انشاء اللہ قہوہ خانوں سے باہر نہیں آنے کے مگر سوال یہ ہے کہ قہوہ خانوں کی اصلاح کرے تو کون؟ مسلمان لیڈروں کو تو فرصت ہی نہیں کہ وہ چندے، تقریر، جلوس اور کانگریس کی صدارت کی کوشش کے سوا کوئی اور کام کریں۔ حالانکہ ضرورت تھی اس امر کی۔ لیڈروں میں تقسیم عمل کا طریق طریق کار ہوتا اور ابوالکلام نہیں تو حسرت موہانی نہیں تو مولانا شوکت علی آتے اور ہر قہوہ خانے کے سامنے کھڑے ہو کر چائے کے نقصانات پر یوں تقریر کرتے اور ساتھ ہی قہوہ خانوں کے ارکان کے چند ایسے فوٹو بھی دکھاتے جن کے اندر چائے نوشوں کا گندہ اور غلیظ لباس ہوتا ہے۔ اور کرسی پر انھیں غنودگی کے عالم میں جمائیاں لیتے ہوئے دکھایا جاتا اور صاف صاف کہتے کہ بھائیو خدا ہی پناہ دے چائے کی جمائی سے کیونکہ یہی اور صرف یہی وہ جمائی ہوتی ہے جس کے آجانے سے انسان کا چہرہ دو کوڑی کا ہو جاتا ہے۔ بڑی مصیبت اس جمائی میں یہ ہے کہ اس کا تار نہیں ٹوٹتا اور یہ آہستہ لی ہی نہیں جاتی۔ رہا معدے اور ہاضمہ کا سوال تو اس کے لیے بھی شفاخانوں سے وہ اعداد فراہم کر لیے جاتے جو چائے نوشوں کی وفات کے متعلق ان کے رجسٹروں میں درج ہوئے ہیں۔ بھلا ستم تو دیکھیے ایک تو گرم تر ملک پھر افلاس زدہ آبادی اور اس پر قہوہ خانوں کی یہ کثرت کہ ہر قدم پر دس بارہ جمائیوں کی آوازیں پیدا۔ فقط۔

◆◆◆

رقعہ بنام ایڈیٹر صاحب اخبار 'پیغام' دہلی

بعد سلام مسنون آنکہ

معلوم ہوا کہ الحمدللہ ہمارے جسم کے اندر کسی قسم کا خفیف، یا شدید، یا ثقیل، یا کڑوا، یا میٹھا، یا ہلکا، یا کم کم، یا کچھ کچھ، یا کسی قدر، یا معمولی، یا ادنیٰ سا، یا تھوڑا سا، یا ذرا سا، یا قدرے قلیل بھی درد نہیں۔ کھانسی، زکام، نمونیہ، بخار، درد گردہ، درد قولنج، گٹھیا، طاعون، ہیضہ، ذیابطیس جس کے علاج کے لیے مولانا محمد علی لندن، پیرس، جرمنی، اٹلی، انگورہ، بیت المقدس، بغداد، بصرہ اور مصر ہوتے ہوئے پھر ہندستان کے ہندستان ہی میں آگئے۔ خدا ایسا مرض ہر مسلمان کو دے۔ دمہ، طحال اور کسی قسم کا خفیہ مرض نہیں ہے یعنی ہم خیریت سے ہیں اور تندرستی افسر کی خوشنودی ملازمت سے آزادی، بال بچوں کی ذمہ داریوں سے چھٹکارے، بہترین کوٹھی، سواری میں موٹر، چند لوگوں پر حاکمانہ اقتدار، مسلمانوں کی ساری دنیا پر حکومت، اشیائے خوردنی، نوشیدنی اور پوشیدنی کی ارزانی، ایک حسین و جمیل 'وہ'، دنیا جہان کی سیر و سیاحت، حج بیت اللہ شریف، زیارت مدینہ، دو چار بے فکرے باوفا دوست، مفت کے اخبارات اور رسالوں اور ان میں اپنی تعریف کے قصیدوں کے درگاہ خداوند کریم سے شب و روز طالب ہیں۔ اور ہم اکیلے ہی کیا؟ آپ کی دہلی کے رئیس اعظم بھی یہی چاہتے ہیں گو زبان سے نہیں کہتے۔ اب اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو صرف چاہنے کی مذکورہ بالا اشیا کی فہرست سے مثلاً بعض ہندستانی دولت مند لوگ شب و روز تھیٹر، سنیما، گھوڑ دوڑ

کے ساتھ ہی مجرا، رقص و سرور، قوالی اور پیانو باجا چاہتے ہیں اور کبھی کبھی سیماب صاحب اکبر آبادی کے بعد کا نام بھی، سو بھی ہلکے سے خمار کے لیے۔

دیگر احوال تو ہوا کرتا تھا گزرے ہوئے زمانے کے نقشہ نویسوں، پٹواریوں، منشیوں، مولویوں اور تاریک خیال لوگوں کے خطوط میں یہاں تو سیدھا سادا معاملہ اور واقعہ یہ ہے کہ اخبارات میں آپ کے اخبار موسومہ 'پیغام' کے دہلی سے جاری ہونے کی خبر سن کر محض اس لیے خوشی ہوئی کہ چلو ایک روزانہ اخبار مفت میں اور آئے گا اور اس میں مضمون لکھنے سے اگر معاوضہ نقد بھی نہ ملا تو کیا؟ شہرت تو ہوتی رہے گی، مگر ساتھ ہی اردو کے اخباروں کی ناقدر دانی، حوصلہ شکنی، پندار گھمنڈ، خودغرضی اور تجارتی دوستی سے تھے خاصے واقف اس لیے آپ کو پہلے سے ہی لکھ دیا کہ دیکھو بھائی ہمیں نہ بھولنا کیونکہ ذرا دوست قسم کا ایڈیٹر بعد میں یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ:

''مولانا معاف فرمایئے گا میں بھول گیا ورنہ استغفر اللہ ایک کیا دس پرچے آپ کے نام اسی وقت روانہ کر دیتا''۔

الحمدللہ کہ آپ نے ایسا نہ کیا اور اپنے اخبار ''پیغام'' کا صرف تیسرا نمبر بھیج دیا جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اخبار پیغام کے پہلے دو نمبروں کی عبارت اور مضامین تو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ معلوم نہیں یہ آخر ابتدائی دو نمبر کیوں ندارد اور فقط تیسرا نمبر دارد؟ واللہ مذاق نہیں ایسا ہی ہوا اور پھر اخبار ہمارے نام بند ہے۔ خیر منیجر و مجر کی غلطی ہوگی؟

اب جو یہ تیسرا نمبر ملا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اخبار ماشاءاللہ نہایت عمدہ، دبیز، سفید اور کافی طویل کاغذ پر نہایت خوبصورت اور صاف حروف میں چھپا ہے۔ اشتہاروں تک کی روشنائی کسی جگہ سے اُڑی نہیں جس سے اشتہار والوں میں ''بہتوں کا بھلا ہوگا'' صرف اخبار پر ٹیلی فون نمبر نہیں لکھا تھا، جس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا یہ کہ اخبار کا دفتر ہی کسی نہایت تنگ گلی میں واقع ہوا یا پھر تار پہنچانے کے لیے محلہ والوں نے اپنی اپنی چھتوں پر بے پردگی کے خوف سے تار لگانے والوں کو چڑھنے نہ دیا ہوگا۔

اس تیسرے نمبر ہی میں آپ کا مقالۂ افتتاحی تھا۔ ''لارڈ ونٹرٹن کی زود پشیمانی'' اس مقالہ سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ کے اخبار کا معیار بازاری رنگ کے اخبارات سے نہایت بلند ہے ورنہ

آپ بھی شور بازار، بچہ سقہ، شنواری، غلزئی، آفریدی اور کابل پر علی جان کی چڑھائی پر روزانہ لکھنا شروع کرتے تو یہ اندازہ کیا جاتا کہ آپ پر بھی وقتی گھبراہٹ سوار ہے اور آپ کسی اہم حالت کے موقع پر اپنا دماغی توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس سے بھی زیادہ خوشگوار اندازہ یہ ہوا کہ آپ کا ذوق زندہ اقوام کے حالات سے بحث کرتا ہے اور فاضل ایڈیٹر وہی ہے جو زندہ اقوام کے حالات وافکار اور مشاغل و وظائف سے بحث کر کے اپنے مخاطبین کے ناواقف دماغوں کو ان حالات کی روشنی سے منور کرتا رہے۔ بھلا یہ بھی کوئی اخبار نویسی ہے کہ سرورق پر ایک غزل، اندر مسلم لیگ اور کانگریس اشتہارات میں ''مردہ زندہ ہو گیا'' اور خاتمہ پر دفتر فلاں سے چھپ کر شائع ہوا اور بس۔ ہاں اگر انگریزوں کے حالات سے بحث کرو گے تو ذرا پولیس والوں کو آپ پر تاؤ آئے گا، مگر ہمارے یہ جلسے کہیں چھاپ نہ دینا ورنہ اور تو کچھ نہیں یہ بے چارے پولیس والے کہیں گے کہ اب اپنے ملا رموزی صاحب بھی ''پیغام'' والوں سے مل گئے۔

اب آپ نے اگر روزانہ یورپ، امریکہ، افریقہ، جاپان، چین، روس اور عراق عرب کے حالات سے بحث کی اور ہندستان پر ایک حرف بھی نہ لکھا تو ہم آپ کے نتیجہ تدبیر اور بلند نظری کے قائل ہو جائیں گے اور ہندستان کو ان ممالک کے حالات دکھانا اور بتانا ہی اصل ضرورت ہے۔ بھلا ہندستان کے شاندار جلوس، بمبئی کی ہڑتال اور قتل سانڈرس وغیرہ پر مقالات لکھنا بھی کوئی مقالات لکھنا ہے؟ اماں یہ سب تحریکات تو ہیں کم علموں او بچوں کے دل بہلانے کی۔ اخبار نویس تو وہ ہوتا ہے جو حقیقت اور ناقابل نتیجہ حرکتوں سے خود بھی علاحدہ رہے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی علاحدہ رکھے اور ان کے سامنے ہمیشہ وہ اچھوتی چیز پیش کرے جس سے ان کے دماغوں کی محدود فضا وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور جو بھائی آپ سے بغیر غزل اور نظم کی اشاعت کے رہا ہی نہ جائے تو ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ نظم چھاپ دی۔ چھاپ دی سو وہ بھی ایسی کہ بس۔

ہاں ''مشاہیر عالم'' کے حالات و سوانح کا ایک صفحہ روزانہ دیا کرو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس صفحہ میں سب سے پہلے ہمارے ہی حالات چھاپنا بلکہ ہم تو ہیں آپ کے جب چاہو ہمارے حالات چھاپ دینا۔ فی الحال تو ترکی قوم کے مشاہیر سے سلسلہ شروع کرو اور جو ہندستانی حالت پر لکھے بغیر پھر نہ رہا جائے تو یہ کرنا کہ یہاں کے لیڈروں پر لکھنا اور اس طرح کہ بس ان کے ٹکڑے

اڑا دینا کیونکہ ہندستان کے لیڈر عملی سیاست سے قطعاً نا آشنا ہیں، اس لیے یہ ہمیشہ نہایت گھٹیا قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اور شرمندہ ہمیں اور آپ کو ہونا پڑتا ہے اور ہر عام اخبارات ان سے ڈرتے ہیں اور اکثر اخبارات تو خود ان لیڈروں ہی کی جائیداد ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کی غلط کاریوں سے اب ہر شخص کا کلیجہ پک گیا ہے، مگر مجبور ہیں کہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اب ہندستان میں دوسری چیز لکھنے کے قابل ہے تو وہ یہاں کے "طلبا"۔ ان بے چاروں کو یورپ کے فیشن نے مار ڈالا ہے۔ یہ اب تک پائنیر اخبار کے سوا دنیا میں کچھ جانتے ہی نہیں، مگر لاحول ولا اب خیال آیا کہ ہم تو اصل میں آپ کو ایک رقعہ لکھ رہے تھے مگر یہ تو خاصا وعظ ہوا جا رہا ہے۔ اچھا تو اب اور باتیں رہنے دیجیے آپ تو یہ کیجیے کہ منیجر صاحب "پیغام" کو ڈانٹ کر کہہ دیجیے کہ دیکھو بھائی آج سے اپنے ملا رموزی صاحب کے نام اخبار بند نہ ہونے پائے۔

اور ہاں خوب یاد آیا وہ یہ کہ آپ کے دفتر میں جو مولوی عباس حسین قاری ایڈیٹر اخبار 'قوم' سابق ہیں، ان سے ہمارا بہت بہت سلام کہہ دینا کیونکہ یہ بے چارے نہایت مخلص اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ دہلی جب جاتے ہیں یہ بے چارے ہمیں مہمان رکھنے پر تیار ہو جاتے ہیں مگر وہ تو کہو کہ یہ دہلی کی جمعیۃ العلما والے ہمیں نہیں چھوڑتے اور ان کے ہاں مہمان نہیں رہ سکتے، مگر انشاء اللہ اب کے ارادہ ہے کہ ان کے ہاں کچھ دن تو ضرور ہی ٹھہر جائیں گے۔

◆◆◆

رقعہ بنام ایڈیٹر صاحب اخبار 'پارس' لاہور

جناب مکرم لالہ کرم چند صاحب مدظلہٗ

بعد ادائے آداب کے معلوم ہو کہ یہاں پر خدا کے فضل سے ماں باپ کی اچھی اچھی دعاؤں سے بچوں اور چھوٹوں کی خدمت گزاری سے، حکومت اور پولیس کے عمدہ انتظام سے، موسم کے اعتدال سے اور ''ننھے میاں کی والدہ'' کے سلیقے سے سب طرح سے خیریت ہے اور خیریت و عافیت آپ کی، آپ کے متعلقین کی، آپ کے اخبار کی اور معاون اخبار کی شب و روز تو کیا البتہ خط آنے پر درگاہ خداوند کریم سے نیک چاہ لیتے ہیں۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ بعد مدت مدید اور انتظار شدید کے آپ کا خط ملا، جس کی ساری عبارت تو عمدہ اور درجہ اول کی اردو زبان میں تھی، صرف انگریزی گورمنٹی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے اس کی پیشانی پر آپ کا نام اخبار کا نام آپ کا عہدہ اخبار 'پارس'' کی ہفتہ وار صفت شہر لاہور اور خط لکھنے کی تاریخ انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تھی اسی طرح خط کے خاتمہ پر آپ نے بجائے نشانِ انگوٹھا بنانے کے انگریزی زبان میں یوں دستخط کیے تھے گویا آپ کہیں کے بہت بڑے افسر یا حاکمِ عدالت ہیں۔ آپ نے اس خط میں ہمیں بڑی شرافت سے لکھا ہے کہ:

> ''پارس کے عید نمبر کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور جناب کے خلوص سے توقع ہے کہ اپنے چند قیمتی لمحے پارس کے لیے صرف فرما کر کوئی طویل یا مختصر نظم یا نثر مضمون 6 ؍مارچ

1928ء سے قبل مرحمت فرمائیں گے"۔

آپ کے اسی خط میں برادر عزیز باصر ایڈیٹر "نمکدان" کا دھانی رنگ کا ایک خط رکھا ہوا تھا، یا لپٹا ہوا تھا، یا چپکا ہوا تھا، یا چمٹا ہوا تھا یا جوڑا ہوا تھا، یا لگا ہوا تھا، یا ملا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی کی بھی وہی حالت تھی۔ البتہ دستخط زبان اردو میں تھے اور تاریخ وہی انگریزی زبان میں تھی۔ اس خط میں باصر صاحب نے لکھا تھا کہ:

"محترم ہدیہ تسلیم!

دو دن سے بستر پر پڑا ہوا ہوں اور کوئی پوچھتا تک نہیں سوائے ہائے وائے کے کوئی پرسان حال نہیں۔ آج جی کچھ اچھا ہوا تو نصف ملاقات کر رہا ہوں۔ تفصیل سے مضمون آنے پر لکھوں گا"۔

آپ کے خط میں "معاوضہ" کا تذکرہ نہ پا کر یوں تو پہلے ہی سے تاؤ آ رہا تھا مگر جناب باصر صاحب کی علالت کے معاملہ کو معلوم کر کے آپ کی طرف سے دل ٹوٹ گیا۔ اماں بھلا غضب خدا کا کہ بے چارے باصر ایسے لائق فائق اور عالم فاضل ایڈیٹر پورے دو دن بستر پر پڑے رہیں اور آپ نے ان کے لیے اتنا بھی نہ کیا جتنا انگریزی حکومت ہندی سپاہیوں کے ساتھ یورپ کے میدانِ جنگ میں زخمی ہو جانے کے بعد کرتی ہے۔ دور کیوں جاتے ہو لاہور یا کانپور ہی میں دیکھ لیا ہوتا کہ ہزاروں ہندستانی سپاہی انگریزی حکومت کی حفاظت کے سلسلہ میں اندھے، لولے، لنگڑے، بہرے، گونگے اور کانے ہو کر کیسے عمدہ عمدہ بستروں پر سوتے ہیں اور روزانہ چار پانچ بجے شفاخانوں کی تفریح گاہوں میں لکڑیوں کے سہارے اس خوبصورتی سے اچکتے پھرتے ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے، مگر آپ نے باصر صاحب کو کسی لڑائی سے واپس آئی ہوئی رجمنٹ کا کوئی ادنیٰ لیفٹننٹ بھی نہ سمجھا اور نہ کسی شفاخانے میں انھیں داخل کیا۔ اماں وہ "کلکتہ والی" سے ذرا دور جو ڈاکٹر ایس کے برمن رہتے ہیں ان کی دو چار گولیاں ہی کھلا دی ہوتیں اور جو یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا تو پھر لاہور کے کسی "قرشی" یا "عرشی" قسم کے حکیم صاحب ہی کو دکھا دیا ہوتا جن کے زیر علاج ایک مرتبہ یہ مولانا سالک انقلاب بھی رہ چکے ہیں۔

کہیں گئے نہیں تھے، مگر سچ کہتے ہیں کہ زمانہ ہی بے قدری کا ہے۔ دیکھیے تا آخر ہم بھی جو

کبھی بیمار ہو جاتے تو بس ہمارے محلہ کے حکیم الحکماء رئیس الاطبا حضرت مولوی سلطان محمود صاحب مدظلہ العالی ہی از راہِ علم دوستی وادب نوازی علاج کو تشریف لے آتے ہیں اور اس مرتبہ تو ہمارے لیے بہترین مقوی ومفرح دوائیں بھی مفت عطا فرمائیں، مگر دوسروں سے یہ نہ ہوا کہ وہ بیماری کے زمانہ میں دو چار انگریزی نسل کی ''نرسیں'' ہماری خدمت کے لیے فراہم کرتے اور یہ ہوتا تو کس طرح کہ زمانہ ہی اس رنگ کی قدر دانی کا گیا گزرا۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ آپ نے عید نمبر کے لیے ہم سے مضمون طلب کیا ہے تو یہ کیا لکھ دیا کہ ''نظم یا نثر'' مضمون، اس کے صاف معنی یہ ہوئے ہم شاعر بھی ہیں۔ اس پر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ آخر آپ نے ہمارا وہ کون سا تازہ ''کلام'' ملاحظہ فرمایا تھا یا ہمیں کہاں کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں غزل گاتے سنا تھا جو آپ نے ایسا لکھ دیا؟ (تو حیدی صاحب آداب عرض ہے)

سنیے! شاعر نام ہے آج کل اس قوتِ خاص کا جو کوئی بہت بڑا شاعر اپنی استادی سے کسی کم عمر اور کم علم مگر خوش الحان شاعر کے اندر پیدا کردے۔ جب ایسا ہو لیتا ہے تو پھر غزل کہنا آجاتا ہے۔ پھر ایسا ''نوجوان شاعر'' غسل کر کے سرمہ لگا کر اور فیشن ایبل کپڑے پہن کر مشاعرہ میں جاتا ہے اور وہاں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں وہ غزل یا نظم گاتا ہے، ہاتھ ہلاتا ہے اور کولھے مٹکاتا ہے، پھر لوگ اس کی ان لونڈے پن کی حرکتوں پر اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو وہ بے وقوف ہو کر اسے داد سمجھتا ہے اور اچھل اچھل کر یا جھک جھک کر آداب بجالاتا ہے تو لوگ باگ اس حرکت پر اور بھی اس کا مذاق اُڑاتے ہیں تو وہ سمجھتا ہے کہ دوسری غزل کی فرمائش ہو رہی ہے اور کیا دیکھا نہیں کہ اسی قسم کی شاعری پر 2/ مارچ 1929 کے اخبار لاہور میں حضرت مولانا سالک انقلاب نے بہت کچھ لکھا ہے، اس لیے کہ آج کل ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی خیالات اور قیاسات نظم کرنے کے عوض ہر لحہ اپنی تجارتی، زراعتی، علمی، مذہبی، اخلاقی اور مالی حالت کو ترقی دینے میں مصروف رہے اور صنعت وحرفت کی تعلیم حاصل کرے۔ تو اس سے اس کی صحت، تہذیب اور ناموری کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ آخر یہ دنیا میں مصطفیٰ کمال پاشا، رضا شاہ پہلوی، لینن اور ریف کے غازی عبدالکریم، امان اللہ خاں اور جنرل نادر خاں کو طرح میں غزل پڑھنے سے تو شہرت حاصل نہیں ہوئی ہے اور نہ قیصر جرمنی تخت سے اس لیے اتارے گئے کہ وہ غزل کہتے تھے۔ بھئی شاعری سے تو

ہمیشہ بیکاری، کسل، فضول گوئی، مکاری، فریب اور جھوٹ بولنے اور جھوٹ مان لینے کی ذلیل قوتیں پیدا ہوتی ہیں اور کیا پڑھا نہیں تھا وہ جو کچھ کہ آقائے ظفر علی خاں زمیندار کے اخبار مورخہ 2/دسمبر 1928 میں شاعری کے خلاف برادرم سید محمد زبیر صاحب ایم۔اے نے لکھا تھا اور پھر اس پر حضرت حفیظ 'مخزن' کے رسالہ میں ہم نے بھی لکھا تھا اور خلاصہ ان تمام اقسام کے ''لکھوں'' کا بس یہی تھا کہ قوم اب شاعری کے شغل کو ترک کر کے علم و قلم کے اس حصہ کو اختیار کرے جو آج اور مستقبل کے لیے مفید ہو، مگر دیکھنا یہ کہ ہندستان میں اسکولوں اور کالجوں کے ساتھ جب تک بورڈنگ ہاؤسوں میں بال سنوارنے والے لڑکے رہیں گے اس پیشہ کا خاتمہ نہ ہوگا۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ رہا نثر مضمون نگاری کا معاملہ سو اس کے لیے عرض ہے کہ آج ہے تاریخ 22/رمضان مبارک جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہم روزہ دار ہیں اور بھائی روزہ رکھتے ہیں چونکہ ہندو بھائی بھی اس لیے آپ جان سکتے ہیں کہ بھوک پیاس کی حالت میں آدمی مضمون نگاری سے اس لیے گھبراتا ہے کہ اس حالت میں جمائیوں پر جمائیاں کام نہیں کرنے دیتیں۔ پھر خدا کے فضل و کرم سے ہم ہیں حافظ قرآن بھی، اس لیے شب کو تراویح میں قرآن محترم بھی سناتے ہیں اور دن کو اسے یاد بھی کرتے ہیں۔ وہ تو یہ لاہور کے مسلمان اخبار نویس کمال کرتے ہیں کہ دن بھر روزہ اور ایک طویل و عریض اخبار کا مرتب کرنا اور تو اور یہ لوگ اس روزہ کی حالت میں ''عید نمبروں کی ترتیب'' تک سے نہیں چوکتے۔ واللہ بہت مشکل کام ہے ورنہ آپ ہی ایک روزہ رکھ کر کوئی ''عید نمبر'' تیار کیجیے تو ہم جانیں۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ ''عید نمبر'' میں عید ہی سے متعلق مضامین لکھنے کا قاعدہ عام ہے اور ہم تاؤ کھائے ہوئے ہیں ہندستانی لیڈروں کی غلط کاریوں پر اور امیر خاندانوں کی بے حیائی اور بے غیرتی پر اور طلبا کی بداخلاقیوں پر اس لیے جب بھی مضمون لکھتے ہیں تو انھی لوگوں پر لکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور آپ خود ہی انصاف کیجیے کہ ان معاملوں پر سوائے ہمارے اور لکھ بھی کون سکتا ہے؟ اماں غضب خدا کا وہ بے چارے جنرل نادر خاں سپہ سالار اعظم افغانستان۔ افغانستان کی تازہ بغاوت کی روک تھام کے لیے ملک فرانس سے افغانستان جاتے ہوئے ہندستان سے کیا گزرے کہ ہندستانی لیڈروں نے آفت ڈھادی۔ ایک تو بے چارے اپنے ملک کی بربادی اور سفر کی تھکن،

دمہ کی بیماری سے پریشان (خدا اس بیماری سے اپنے سید جالب دہلوی کو بچائے) اِدھر جناب جسے دیکھو وہ جنرل صاحب کی ریل پر سوار۔ پھر مزید برآں یہ کہ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے کہ بتا دیجیے کہ آپ افغانستان میں جا کر کیا کریں گے اور جناب یہ آپ جلال آباد کیوں جا رہے ہیں؟ تو کیوں جنرل صاحب آخر آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ آپ کیا کریں گے۔ لاحول ولا آخر کار بھائی نتیجہ ان کج مج دماغ لیڈروں کی اس حرکت کا یہ نکلا کہ جنرل صاحب کو پشاور میں ایک مرتبہ تاؤ آ گیا تو انھوں نے بھی کہہ دیا کہ جایئے میں نہیں بتاتا۔ اب آپ سے جو کچھ بن آئے وہ کر لیجیے۔ بس رہ گئے پھر منہ سا لے کر یہ اپنے ہاں کے لیڈر لوگ اور سارے ہندستان کی آبرو خاک میں مل گئی۔ استغفراللہ اتنا نہ سوچا کہ جو جنرل کہ فوجی زندگی آزاد ممالک کی سیاسیات اور فوجی چالاکیوں میں اپنی کافی عمر گزار چکا ہو وہ بھلا کسی ایرے غیرے کو اپنی کوئی چال بتا دے گا؟

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ ہم آج کل عید نمبر کے لیے اس لیے بھی کچھ نہیں لکھ سکتے کہ اب ہم لکھیں گے انھی طلبا کے حالات کو جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری اور بزدل اخبار نویسوں کی بے توجہی سے یہ نئی نسل عرف طلبا بالکل تباہ ہوئے چلے جا رہے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پہلی خرابی تو ان طلبا میں یہ ہے کہ ان کے ذریعہ غیر قومی معاشرت ترقی کر رہی ہے اور جس قوم میں غیر ملکی معاشرت ترقی کر جائے سمجھ لو کہ اس میں افلاس کی وبا بھی پھیل کر رہے گی۔ چنانچہ علاوہ مصارف تعلیم کے ان طلبا کے بال سنوارنے کے ہزاروں قسم کے تیل، صابن، پاؤڈر، چست پاجاموں اور بوٹ اور پمپ جوتے اور سائیکلوں پر ان کے ماں باپ کا جس قدر روپیہ صرف اور تباہ ہو رہا ہے وہ تو رہا ایک طرف اسی رنگا رنگ لباس سے ان کے اندر نزاکت، ملاحت، صباحت، لوچ، لچک، لٹک، ادا، بانکپن اور چال ڈھال کی بے شمار قسمیں تو پیدا ہو رہی ہیں مگر نہیں پیدا ہوتی تو ان کے مزاجوں میں غیرت، حیا، شرم، جفاکشی، بہادری اور اولوالعزمی، حوصلہ مندی اور طلب علم۔ پھر آپ ہی ایمان سے کہنا کہ جس قوم کی نئی نسل یوں تربیت پا رہی ہو اس کا مستقبل شاندار، آزاد اور شہرت انگیز ہوگا؟ مگر سچ پوچھو تو ان طلبا کو بے حیا بنانے والے پہلے ان کے ماسٹر اور پروفیسر ہیں جو ان کے اندر ایسے ذلیل جذبات کو دیکھ کر انھیں باز نہیں رکھتے۔ پھر ان کی بے حیائی کو ترقی دینے والے ہیں ان کے ماں باپ جو اپنے لاڈلے بچوں کو ان

نسوانی نزاکتوں میں مبتلا پا کر ناراض نہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ خیر اب اس معاملہ پر تفصیل سے تو پھر لکھیں گے اب تو۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ آپ نے ''پارس'' کا عید نمبر نکال کر بہت دل خوش کیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ابھی ہندو بھائیوں میں آپ ایسے باوقار، بردبار، سنجیدہ، مآل اندیش لوگ موجود ہیں جو ''ہندو مسلم'' جذبات کا احترام کرتے ہیں اور خدا نے چاہا تو ایسے ہی لوگوں کی کوششوں سے ایک دن ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جائیں گے۔ اسی طرح آپ نے ہمارے متعلق بھی یہی رائے قائم کی ہوگی کہ ملا رموزی صاحب بھی نہایت اعلیٰ پایہ کے مدبر، مصلح اور باوقار رہنما ہیں جو ہندو اخباروں میں بھی مضامین اُسی مہربانی سے لکھتے رہتے ہیں جس طرح مسلمان اخباروں میں لکھتے ہیں اور بھائی ایمان کی بات تو یہی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ایک ہو جانے سے زندگی پُر لطف ہو سکتی ہے، مگر دیکھیے اس معاملہ میں بھی وہی لیڈر لوگ حائل ہیں اور ان کی ذاتی اغراض۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انھی لیڈروں کو سنبھال لیجیے، سارے دام وصول ہو جائیں گے اور بھائی ہمارے مذہب میں تو یہی آیا ہے کہ جو شخص کسی غلط کار انسان کو اس کی غلطی پر ایمانداری سے ٹوک دے اسے ایک اونٹ کے برابر ثواب ملتا ہے۔ خدا کرے آپ کے ہاں بھی ایسا ہی آیا ہو۔ ہاں تو پھر۔

''دیگر احوال'' یہ ہے کہ وہ برادرم باصر کو میری طرف سے بھی پوچھ لیجیے گا اور اگر بچ جانے کی کوئی امید ہو تو عید مبارک بھی کہہ دینا۔ اچھا اب رقعہ کو ختم کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتے رہیے۔

اور ہاں بھائی کسی حسین تر، جمیل تر، انشا پرداز اور گرلز اسکول یافتہ سے دعا کرنا کہ ہماری شادی بھی فقط۔

◆◆◆

موٹر میں دو راتیں

بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ہماری فطرت اُلٹی واقع ہوئی ہے یا یوں سمجھو کہ سارے ہندستانیوں کی فطرت اُلٹی ہے اس لیے عوام و خواص کے مقابل ہمارے ہر کام میں ''ترچھاپن'' نمایاں رہتا ہے اور ایک مصلح قائد، لیڈر، عالم، موجد اور مجدد کی علامت بھی یہی ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی لٹک، لچک، ہٹک، ڈھنگ، ادا، طرز، طور، طریق، وضع، قطع اور رنگ اس قدر مخصوص اور سب سے الگ ہو کہ دوسرے مر بھی جائیں مگر اس کا جواب پیش نہ کرسکیں۔ مثلاً ہماری اسی ادا کا کوئی باکمال سے باکمال علمی و ادبی آدمی جواب پیش نہیں کرسکتا کہ ہم شب کے نو بجے سے بارہ بجے تک ویران اور غیرآباد سڑکوں پر تفریحاً گھوما کرتے ہیں اور بارہ بجے رات سے دو تین بجے رات تک مضمون لکھتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے جذبات میں مضمون نگارانہ، یا ادیبانہ نفاست اور نزاکت کے مقابل حرب وضرب، خونخواری، خوں ریزی اور تھانیداری کے وہ ''کوتوالانہ'' اثرات موجود ہیں کہ اگر پولیس سے ہمارے ''شاعرانہ تعلقات'' نہ ہوتے یا گورنر جنرل با جلاس کونسل سے ''ساز باز'' کا سلسلہ نہ رہتا تو اب تک خدا جانے ہم کیا ہوتے؟ اور اسی لیے ابھی نہیں کہتے کہ ہماری وفات حسرت آیات ''گاما کوکین فروش'' کے عہدے سے ہوگی یا ''فیلڈ مارشل'' کے رینک سے اور جذبات کے اسی ''مصطفیٰ کمالانہ'' رنگ کا نتیجہ ہے کہ ہم تفریحات میں بجائے ہاکی، فٹ بال، مرغ بازی کے ''پتنگ لڑانا'' پسند کرتے ہیں۔

ایک ہفتہ ہوگیا تھا کہ بارش بند نہیں ہوتی تھی۔ گلی، کوچے، سڑکیں، تالاب، ندی، نالے سب پر پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور کیچڑ نے تو اچھے اچھوں کی انگریزی خراب کر رکھی تھی۔ ایک ہفتہ سے گھر میں بیٹھے بیٹھے اور ننھے میاں کی والدہ کی واہی تباہی باتیں اور طعنے سنتے سنتے جی اُکتا گیا تھا۔ جب دیکھیے دیواریں منہدم ہوجانے کا رونا رویا جارہا تھا۔ اِدھر ہم نے قسمت وہ پائی ہے کہ دنیا کو گھر بیٹھے ہی فتح کرکے رکھ دیا لیکن دولت یا روپیہ کا جب نام لیا تمام کھیل بگڑ گیا، اس لیے سوچ رہے تھے کہ پانی تھمے تو کہیں تفریح کو جائیں کہ یکا یک ''وہ'' برآمد ہوگئیں۔ دیکھا تو کوئی ستر لاکھ ٹن وزن کا ایک اور بادل چھا گیا واپس آکر طریق طعن ہم سے بولیں کہ... لو اور جاؤ تفریح کو!۔

آگ ہی لگ گئی اور فوراً یاعلی کہہ کر اٹھے اور دوستوں میں پہنچ گئے اور دوستوں کو اسی برساتی رات میں تفریح کے لیے یوں تقریر کرکے اُکسایا:

آیئے برادرانِ اسلام! ذرا یہاں برادرانِ اسلام کا موقع دیکھیے۔

آج کے دل بادل، آج کی ڈراؤنی رات، آج کی بھیانک فضا، آج کی خوفناک کڑک چمک، آج کا ہراس افزا سناٹا اور آج انسانی آبادی کا موت نما سکوت ایک امتحانی موقع ہے، ان شیر دل نوجوانوں کے لیے جو ناز ونعم کی ہلاکت بار آسودگیوں میں پل کر جوان ہوئے ہیں یا جو جوان ہوکر پلے ہیں، یا جو تیغوں کے سایہ میں پیدا ہوئے ہیں اور ''زیرِسایہ برطانیہ'' نوآبادی بنے جارہے ہیں۔ پس وہ اٹھیں اور انگڑائی نہ سہی تو جمائی لے کر اٹھیں اور اس بارش کا مقابلہ کریں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آج رات بھر تفریح کے لیے کوئی طویل سفر کیا جائے، مگر گھروں میں نہ بیٹھا جائے۔

اس آتش ریز وآتش بار تقریر سے پہلے ہی دوستوں میں ہمارے طے تھا کہ:

''آمادہ بہ قتلِ من آں شوخ ستمگارے''

فوراً ہی تو کہا اور سب نے کہا... واقعی یار ملا کہتے تو سچ ہو۔ ہاں جی بھلا یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے، لاحول ولا، آٹھ دن ہوگئے گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالا۔ اچھا تو لو چلو، تو لاؤں پھر موٹر؟ مگر دیکھو کہے دیتا ہوں اگر راستہ سے واپسی کا کہا تو پٹرول کے دام وصول کرلوں گا، تو کیا کھانا بھی رکھنا پڑے گا؟ عجیب بے وقوف ہو یہ آدھی رات کو تم کھاؤ گے؟ استغفر اللہ! اس پانی میں بستر ا

کیا؟ تو پھر مزا ہی کیا آئے گا جب سب سامان رکھ لیا، کون وہ ارے وہ بلا کا مضبوط ہے۔ اچھا تو جھگڑتے کیوں؟ ساتھ لے چلو۔ راستہ میں دیکھ لینا بھائی مجھے تو والدہ کا خیال ہے۔ نہیں بھئی وہ رات کو گھر سے باہر رہنے کو پسند نہیں فرماتیں۔ بس تو ایک آپ ہی کی والدہ تو ہیں اور رات ہی کو واپس نہ آجائیں گے تو کیا مرنے کے بعد؟ لو موٹر لے آیا، چلو چلو اب بحث وحث راستہ ہی میں کرنا، مگر بھیا موٹر میں پردے وردے نہیں ہیں۔ اماں بڑے بھائی جاگ رہے تھے، ان سے چوک تک کا کہہ کر لایا ہوں۔ ہاں ہاں ایک اسٹپنی بھی ہے تو کیا لندن جانا ہے لاحول ولا، تو اگر وہ نہیں چلتے نہ چلیں میں تو چل رہا ہوں۔ اچھا تو چلیں ہاں ہاں چلو اور کس طرح کہوں یہ لیجیے کلہم تین سگریٹ ہیں، چلو میرے پاس سے لے لینا۔ خدا کے لیے شور تو نہ کرو وہ خالو میاں اٹھ بیٹھے تو اور مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ تو چلیں، بسم اللہ اچھا تو سامان ایک نظر پھر دیکھ لو۔ کچھ بھولے تو نہیں؟ ہاں ایک سوٹ کیس، اندھے ہو گئے ہو یہ ایک سوٹ کیس ہے۔ اچھا دو یہی اور تین بندوقیں اور کارتوس؟ لاحول ولا پہلے بندوقیں تو گن لو، اچھا تین بندوقیں، پانچ پٹرول گھر، بھیا یہ پٹرول گھر کیا بلا ہے؟ اجی وہی ڈیزل کے پیپے یا پٹرول کی ٹنکیاں۔ میں انگریزی نام کیا جانوں؟ کہیں کا "ہالسٹر" ہوں؟ اور بستر؟ دھرا ہے بستر ہے بس کوٹ تو پہنے ہو، اچھا اچھن میاں چلاؤ، بسم اللہ۔

چل پہ چل کوئی دس بارہ میل چلے ہوں گے کہ جناب چلنے دیجیے۔ آندھی اور چلنے دیجیے، پانی اور چلنے دیجیے، سردی اور چلنے دیجیے، کیچڑ اور چلنے دیجیے، ندی اور چلنے دیجیے، نالے اور چلنے دیجیے، پانی میں ڈوبی ہوئی ہوائیں مگر جوشِ تفریح میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لیے زناٹے سے قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ کوئی صاحب:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کا "بچکانہ ترانہ" گا رہا تھا۔ کوئی جالندھری حفیظ صاحب کا "پریت کا گیت" الاپ رہا تھا۔ ہم نے بھی مسلمانانِ ہند کی موجودہ ذلت و خواری کے تصور سے کھانس کر یہ مصرع گنگنانا شروع کیا کہ:

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مستی اور جوشِ مسرت کے اسی عالم میں موٹر کے آگے والے حصہ میں آہستہ سے ایک پنچر

ہوا تو سب نے آہستہ سے اتر کر اسے فوراً ہی جوڑ لیا اور چل دیے، مگر تا کجے؟ سواری اور طویل سواری کا خلاصہ ہی اونگھ اور غنودگی ہوا کرتا ہے لہٰذا کوئی تیس میل گئے ہوں گے کہ ایک ندی آئی۔ اس وقت ڈرائیور صاحب کے سوا تقریباً تمام سواروں کی قوالی جوش اور مستعدی ختم ہو کر غنودگی کے اضمحلال سے بدل چکی تھی اور ایک دوسرے کا سر ایک دوسرے کے شانہ پر آ چکا تھا کہ یکا یک موٹر ندی کے پختہ پل پر داخل ہوئی، مگر اس پل پر سے پانی اس قدر کثرت سے بہہ رہا تھا کہ اس کے شور سے سب کے سب بیدار سے ہو گئے۔ بعض نے تو سوال کیا کیا کوئی پُل آ گیا اور بعض نے مارے غنودگی کے صرف آنکھیں کھول دیں مگر کسی سوال کی ہمت نہ ہوئی تو پھر بند کر لیں۔ پُل تھا ذرا لمبا چوڑا اس لیے وسط سے نکل کر جب سڑک کے قریب ہو رہے تھے کہ پانی کا عمق کمر کمر ہو گیا اور ڈرائیور صاحب گھبرائے کہ یکا یک موٹر کا انجن بالکل خاموش ہو گیا اور ڈرائیور صاحب نے بے ساختہ فرمایا ''ارے لاحول ولا''۔

اس ''ارے لاحول ولا'' سے پھر سب کے سب کو بیدار ہونا پڑا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ اس وسط ندی یا وسط پانی کے بہاؤ میں موٹر کا پنکھا ٹوٹ گیا، بس حضرت سلامت آ گئی قیامت۔

پہلے تو دو چار نے ہماری طرف بڑے غصے سے اس لیے گھورا کہ اس موسلا دھار بارش اور اس اندھیری رات کی تفریح کے بانی ہم تھے۔ پھر ایک بولے: لیجیے اور تفریح کو چلیے۔

دوسرے بولے: لعنت ہے ایسی تفریح وفریح پر۔

تیسرے بولے: مرے کیوں جاتے ہو، نیچے اترو، پانی زیادہ نہیں ہے کمر کمر ہے۔

چوتھے بولے: جو لایا ہے وہی اترے۔

پانچویں بولے: اچھے تو غارت ہوئے۔

چھٹے بولے: بس رات بھر مرتے رہو، کوئی گاؤں بھی تو قریب نہیں۔

ساتویں بولے: اور گاؤں میں کہاں کی راحت مل جائے گی۔

آٹھویں بولے: مگر اس مصیبت سے تو نجات مل جائے گی کہ اوپر پانی اور نیچے پانی۔

نویں بولے: قرآن کی قسم ایک کپڑا ابھی خشک نہیں۔

دسویں بولے: دیکھتے کیا ہو میری خود یہی حالت ہے۔

گیارہویں بولے: ڈرائیوری کرنے چلے تھے، راستہ بھی نہ سوجھا، اب تم نے موٹر بگاڑا ہے تو تم ہی اتر واور درست کرو۔

بارہویں بولے: اماں وہ سنتے کس کی ہیں، میں کہہ رہا تھا کہ دیکھو دیکھو سیدھے ہاتھ کی طرف چلو، آہستہ چلو پانی زیادہ ہے، مگر انھیں تو آج ہی ڈرائیوری دکھانا تھا۔

تیرہویں بولے: بھائی ان کی کیا خطا ہے۔ قسمت کا لکھا پورا ہوا۔

چودھویں بولے: مارے پانی کے آگے کچھ سوجھتا تو تھا نہیں، لو ذرا تم آ کر چلا لو۔ وہ بے چارا بچاتا کس طرح؟

پندرہویں بولے: تو میں چیخ رہا تھا مگر وہ قدرتی ضدی آدمی ہے۔

سولہویں بولے: تو بات ہی کیا ہے، ابھی نکالے لیتے ہیں۔

سترہویں بولے: تمھارے تو ان سے بھی نہ نکلے گی۔

اٹھارہویں بولے: تو کیا آپ کے بھروسہ پر آئے ہیں؟

انیسویں بولے: کہہ رہے تھے کہ خدا کے لیے اس بارش میں نہ چلو، مگر ملا صاحب کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ اچھا ہے خدا کرے صبح تک بھی موٹر نہ نکلے۔

بیسویں بولے: منجدھار میں ہو، خدا کی قسم کوئی زور کا ریلا آ گیا تو ہڈیاں بھی نہ ملیں گی۔

اکیسویں بولے: لیجیے یہ اندر پانی گھس رہا ہے خدا خیر ہی کرے۔

بائیسویں بولے: خدا جانے کس منحوس کا منہ دیکھ کر چلے تھے۔

تیئیسویں بولے: واللہ ان کے ساتھ جب آئے ہیں کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر رہے ہیں۔

چوبیسویں بولے: تو کیا اب رات بحث ہی میں گزار دو گے؟

پچیسویں بولے: تو ذرا آپ ہی اتر کر موٹر نکال لیجیے۔

چھبیسویں بولے: اچھا ہے میاں خوب جھگڑتے رہو، مگر موٹر نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ لاحول ولا کس قدر بےہودہ لوگ ہیں۔

ستائیسویں بولے: جھگڑالو ہے کہ وہ بھی تو چپ نہیں رہتے۔

اٹھائیسویں بولے: ذرا گھڑی دیکھنا کیا بجا ہے؟

انتیسویں بولے: تین بجنے میں ہوں گے کوئی پندرہ منٹ۔

تیسویں بولے: خدا کی قسم مجھے تو بخار شروع ہو گیا۔

اکتیسویں بولے: استغفراللہ! یہ ابراہیم کو دیکھا؟ اماں سو رہا ہے، اونہہ تم دیکھ لو کوئی جھوٹ کہہ رہا ہوں۔

بتیسویں بولے: خدا کی قسم تم لوگوں کے ساتھ اسی لیے آنے سے گھبراتا ہوں۔

تینتیسویں بولے: بھیا ذرا بندوقوں کو تو دیکھ لو کہیں اندر تو پانی نہیں بھر گیا؟

چونتیسویں بولے: تو ذرا ادھر تو ہٹو، میں تو بالکل ہی تر ہو گیا۔

پینتیسویں بولے: ذرا سگریٹ ہی پلا دو۔

چھتیسویں بولے: پیدل ہی چلو نا؟

سینتیسویں بولے: اور موٹر تم نکال لانا۔

اڑتیسویں بولے: ملا صاحب کی جو حرکت ہوتی ہے اُلٹی ہی ہوتی ہے۔

اُنتالیسویں بولے: اماں اس میں بے چارے ملا صاحب کا کیا قصور ہے؟

چالیسویں بولے: اور جو اس جمعہ کو آئے تھے اس دن ملا اپنے ساتھ کب تھے؟ مگر پھر بھی تو مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے۔

اکتالیسویں بولے: بھائی جان بے چارے ملا کو غریب دیکھ کر سب برا ہی کہتے سنے گئے، مگر اس کے کمالات پر کسی نے خزانہ نہیں لٹا دیا۔

بیالیسویں بولے: تو ملا صاحب تمھاری طرف سے ہم خود تو بول رہے ہیں، پھر تمھیں جواب دینے کی کیا ضرورت؟

تینتالیسویں بولے: ہاتھ جوڑتے ہیں، اس گاؤں تک چلے چلو وہاں سے کچھ گنواروں کو پکڑ لاتے ہیں ابھی موٹر نکل آئے گا۔

پینتالیسویں بولے: تو اس حساب سے کچھ دن میں یہی گنوار ہمارے خالو اور ماموں بھی بن جائیں گے کیونکہ مساوات تو پھر ہر چیز میں استعمال ہو گی۔

چھیالیسویں بولے: اب یہ سوال تو کرو ابوالکلام آزاد سے یا پنڈت مدن موہن مالویہ سے۔

سینتالیسویں بولے: لیجیے وہ پھر کانفرنس شروع ہوگئی۔

اڑتالیسویں بولے: بس ملا کو موٹر میں رہنے دو، ہم آپ چل کر گاؤں سے آدمی لیے آتے ہیں۔

انچاسویں بولے: تو ملا صاحب کہیں کے رئیس ہیں؟

پچاسویں بولے: میاں بال بچوں والا آدمی ہے، ابھی پانی میں بیمار ہو گیا تو گھر بیٹھے تم پنشن دے دو گے؟

اکاونویں بولے: ہاں ہاں ٹھیک ہے، چلو میں بھی چلتا ہوں۔ ناقدرے کہیں کے تم کیا جانو مُلا کو؟

آپ گھبرائیں گے کہ یہ ایک موٹر میں ایک اوپر پچاس آدمی کہاں سے سوار ہو گئے؟ اس لیے واضح ہو کہ آدمی تو پچاس نہ تھے مگر باتیں دو ہزار سے زیادہ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے صرف پچاس نمونے پیش کر دیے گئے۔

گاؤں سے گنوار تو کیا مگر دو چار گنوار مزاج انسانوں کو لے آئے اور یہ سب کے سب تو کھڑے ہو گئے کنارے پر اور ان سے کہا گیا کہ موٹر نکالو۔ مگر یہ آخر کو انسان ہی تھے۔ کوئی پچاس ہارس پاور' تو تھے نہیں کہ بیک جنبش موٹر کو باہر نکال لاتے، اس لیے اب طے پایا مگر بہت برا طے پایا کہ موٹر کے بقیہ سوار بھی نیچے اتر آئیں اور کنارے والے بھی پانی میں قدم رنجہ فرما کر موٹر نکالیں۔ اب جو یہ ''نیچے اتر شُل لا' جاری ہوا تو ہمیں موٹر میں اب کون رہنے دیتا تھا۔ ادھر ہم جو موٹر سے نیچے نہیں اترتے تھے سو بارش اور پانی کے خوف سے ورنہ جناب موٹر نکال لینا یا چلا لینا، یا اپنی جگہ سے ہٹا دینا یا ہلا دینا، یا اٹھا دینا، یا دھکا دینا یا بڑھا دینا، یا جنبش دے دینا یا حرکت دے دینا، یا کھینچ لینا، یا گھسیٹ لینا کوئی ہندستانیوں کا ''سوراج'' تو تھا نہیں جو ڈیڑھ سو برس سے لیا جا رہا ہے مگر لیا ہی نہیں ''جا چکتا'' (یہاں ''جا چکتا'' کی فصاحت قابل ملاحظہ ہے) مگر آپ اس علمی و ادبی نکتہ کو کیا

خاک سمجھے؟

غرض سب نیچے اترے اور کنارے والے بھی پانی میں داخل ہوئے مگر ہم ذرا موٹر ہی میں... تو آواز آئی مُلا صاحب آپ اگر رئیس ہیں تو اپنے گھر کے یہاں سب برابر ہیں۔ سیدھی طرح سے نیچے اتر آؤ ورنہ...'' پس حضرت دھری رہ گئی ہماری انشا پردازی اور جو نیچے اترے ہیں اور جو صاحب پانی میں بھیگے ہیں اور جو صاحب کیچڑ میں پھنسے ہیں اور جو صاحب جاڑے سے مرے ہیں اور جو صاحب موٹر کو کھینچا ہے تو پتہ چل گیا کہ ''جہاد کرنا'' کس قدر مشکل کام تھا۔ اب جو موٹر کو نکالنے کی کوشش شروع ہوئی تو پھر:

ایک بولے: یہ زور لگا رہے ہو، لعنت، شرم تو آتی نہیں۔

دسویں بولے: تو کیا مذاق کر رہا ہوں؟

بیسویں بولے: لاحول ولا میرا تو پورا پاؤں کیچڑ میں ہے، زور کیا خاک ہو۔

تیسویں بولے: عجیب احمق ہو، سارا بوجھ میرے ہی اوپر ڈال دیا۔

چالیسویں بولے: لو وہ اور دھنس گئی۔

پچاسویں بولے: شاباش شاباش!

ہم بولے: الحمدللہ نکل آئی نکل آئی چلو جلد سوار ہو جاؤ۔

اب سوال یہ تھا کہ یہاں خیر سے ہیں سب کے سب ''نیم ڈرائیور خطرۂ موٹر'' اب پنکھا کون درست کرے؟ ایک تھے ہمراہ جنھیں خدائے غالب و توانا نے جسمانی حسن وصحت، ہمت، اولوالعزمی، جفاکشی کے ساتھ ہی ''حسن غصہ'' بھی عطا فرمایا ہے۔ (یہاں غصہ کے ساتھ حسن کا اضافہ اس لیے ہے کہ موصوف کو غصہ تو کافی آتا ہے مگر ساتھ ہی وہ بجائے ''بندے ماترم'' کے خاموش اور بے حد خاموش رہتے ہیں۔ اس موقع پر بندے ماترے کے معنی ہیں شو کرنا) بس فوراً ہی تو موٹر کے نیچے گھس گئے اور پنکھے کو ''درستیانے'' لگے۔ خدا کا کرنا بھی یہ کہ پنکھا درست ہو گیا اور موصوف نے موٹر سے باہر آ کر فرمایا... چلو چلو بیٹھو۔

اس چلو چلو میں حضور عالی کے جس قدر فاتحانہ احسانات ہم لوگوں پر پنہاں تھے انھیں حضور نے ظاہر فرما دیا۔

موٹر چلا اور بڑے کروفر سے چلا، مگر اس مرتبہ سب کے سب خوش تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ پانی تھم گیا تھا، یا رُک گیا تھا، یا بند ہو گیا تھا، یا موقوف ہو گیا تھا۔ کوئی پانچ میل جا کر پھر پنچر کا فیر ہوا۔ اسے بھی درست کیا گیا، مگر دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح درست کیا گیا۔ پھر چلے اور صبح کی ان نورافشاں ساعتوں میں جب کہ ہر ذی حیات وذی ہوش کو ایک نئی جوانی اور امنگ ملتی ہے ہم سب کے سب اونگھتے ہوئے منزل مقصود پر جا پہنچے اور:

کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

کا معاملہ شروع ہوا تو خاصے سوئے۔ اب اٹھنا شروع ہوا تو یہ سب کے سب کوئی نصف گھنٹہ میں اٹھے۔ اب سوال یہ تھا آخر کپڑوں کی کی ''کیچڑ زدگی'' لوگوں کو ہمارے متعلق کن شکوک وشبہات کا موقع دے گی؟ مگر سینما دیکھنے کا شوق اس قدر غالب تھا کہ ان دو عدد مذکورہ بالا سوٹ کیسوں میں جس قدر سوٹ تھے پہن لیے گئے۔ باقی سب کے سب نے اسی کیچڑی سوٹ میں سینما جانا منظور فرمالیا۔ بے حد مسرت تھی، بے حد خوشی تھی کہ سینما دیکھ کر راستہ کے تمام تکالیف بھول جائیں گے۔ بعض مارے جوش کے کہہ رہے تھے کہ

''ایسا سینما ہندستان میں شاید ہی ہو''

یہاں تک کہ سینما آ گیا۔ دروازے پر پہنچے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا:

''ارے ہائے رے''

یہ ''ارے ہائے رے'' کا بندے ماترمی نعرہ اس لیے لگایا کہ آج تھا دن اتوار کا اس لیے سینما بند تھا۔

چلیے یہاں سے بھی فارغ ہوئے اور چونکہ اس تکلیف دہ سفر کی منزل مقصود یہی سینما تھا۔ اب جو یہ بھی نہ ملا تو اب یاد آنے دیجیے سفر کی تمام تکلیفیں۔ کوئی کہتا ''اف! بھوک تو اب قابو کی نہیں''۔ کوئی کہتا ''خدا کی قسم کوٹ تو اب تک خشک نہیں ہوا''، کوئی کہتا ''اب یہاں دھرا ہے شکار چلو پڑ کر سو رہیں تا کہ تھکن تو دور ہو، رات تو مارے مچھروں کے نیند نہیں آئی''۔

پھر پہنچے قیام گاہ پر۔ کیا بتائیں کیسی گزری، بس جو کچھ اللہ میاں نے دیا کھا پی لیا اور ''شکریہ بمقدار کھانا'' ادا کر کے لیٹ گئے۔ بہت کہا اماں تاش لائے ہیں، کچھ دیر تو کھیلو، مگر ہمت کسے۔

شام کو اٹھے تو سخت تقاضا کہ بس اب گھر چلو۔

چلے تو پھر وہی تاریک ترین رات ''موٹر گھر'' سے نکلتے ہی راستہ بھول گئے اور الحمد للہ کہ کوئی سات میل دور جا کر پتہ چلا کہ غلط راستہ پر آ رہے ہیں۔ اس لیے زمین کو گول تسلیم کر کے پھر اسی جگہ آئے اور پھر چلے۔ چلتے چلتے پنچر ہوا، جو کچھ تازگی لے کر آئے تھے وہ پنچر کی درستی میں صرف ہوگئی۔ پھر چلے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب ''برسٹ'' کی توپ چلی اور موٹر میں ایک دوسرے پر اس زور سے گرے کہ ٹوپیاں اپنے اپنے سر پر درست نہ رہ سکیں۔ اب کیا کر سکتے تھے موٹر کو'' جنگل حافظ'' کر دیں چھوڑا اور ریلوے اسٹیشن کی تلاش میں مجو قافلہ چلا ہے تو بس اونٹ تو نہیں تھے باقی سفر حجاز کی جملہ تکالیف کا مزہ آ گیا اور تہجد کے وقت بالآخر خدا نے دعا قبول کی اور ایک ریلوے اسٹیشن سے کچھ باٹکٹ ریل پر سوار ہو کر واپس آئے، جیسا خدا ہمیں لایا سب بھائیوں کو اسی طرح لائے۔ آمین۔

(دوسری رات کے حالات آئندہ اشاعت میں دیکھنے کے قابل ہوں گے انشاء اللہ تعالیٰ)

◆◆◆

لاٹھی اور بھینس

از

مُلّا رموزی

فہرست

- مقدمہ 163
- مُلا رموزی اور بھینس 165
- بھینس کی تعریف 169
- حرکات 181
- بھینس کی اقسام 195
- گھریلو بھینس 199
- کالی بھینس 203
- مُلا رموزی کی بھینس 217
- بھینس کا لڑکا 235

مقدمہ

اُس خدائے عرش وفرش کے نام سے شروع کرتا ہوں جو کائناتِ عالم کی ناپیدا کنار وسعتوں اور فردوس افروز رنگینیوں کا تنہا خالق ہے اور جو ازل سے خدا ہے اور ابد تک خدا ہی رہے گا۔

اُس خدا کے نام سے جس کے آخری مگر سب سے محترم نبی احمد مصطفیٰؐ روحی فداہ نے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کر کے بتایا کہ انسانی سعادت و سربلندی کی شان ہی یہ ہے کہ وہ صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کے آگے سرخم کرے اور بس۔

اسی خدا کے نام سے جس نے اُس رسولؐ عالیجاہ کے صحابہ کو علم و شمشیر اور انصاف و جہاں بانی کی وہ خرد افروز صلاحیتیں عطا فرمائیں جن کے باعث تاریخ انسانیت رہتی دنیا تک ان کے ناموں کی عظمت کو فخر کے ساتھ برقرار و زندہ رکھے گی۔

اُسی خدا کے نام سے جس نے اس نبیؐ کے ایک نواسے کو یہ مقدرت عطا فرمائی کہ اس نے دینوی شوکت وجلالتِ شاہانہ کی تمام نخوتوں کو میدانِ کربلا میں اپنے جلال استقلال اور شکوہِ خدا پرستی سے یوں ٹھکرا کر رکھ دیا کہ آج بھی بہادرانِ عالم کے کلیجے اس مقابلہ کی یاد سے لرزتے ہیں اور جس کا دبدبہ انگیز نام حسین ابن علی ہے۔ رضی اللہ عنہ۔

اُسی خدا کے نام سے جس نے اُس رسولؐ عالی مقام کے اہلِ بیت میں وہ سرتاج عالم خواتین پیدا کیں جن کا صبر واستقلال جن کا علم وکمالِ بصیرت اور جن کا حسن تدبر وحسن خداپرستی آج بھی صدا دے رہا ہے کہ آؤ اور کامیاب وکامران زندگی کے تمام سلیقے ہمارے طریقِ زندگی کی پیروی کر کے سیکھ لو۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اب رہا یہ سوال کہ میں نے دنیا کے بے شمار موضوعات کو چھوڑ کر بھینس ایسے مکروہ جانور پر کیوں "طبع آزمائی" کی سو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ مجھ ایسے باغ وبہار اور حسن ورنگ پر جان دینے والے اہلِ قلم کے سر پر بھینس ایسے مکروہ جانور کا باندھ دیا جانا دنیا میں آخر ظرافت اور ہلسی کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جو اس سے بھی ذرا شائستہ جواب مطلوب ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ مجھے غریب گھرانوں کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے جو تفصیلی اور تکمیلی حصے پیش کرنا ہیں اور جو میری معاشرتی واخلاقی کتاب "عورت ذات" جلد اول وجلد دوم سے بچ رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ اب اگر حقیقت بینی اور نکتہ دانی ہے تو اس میں غور سے دیکھیے گا کہ ایک بھینس نے غلط کار عورتوں کا کتنی جگہ اور کس کس طرح پارٹ کیا ہے۔

واضح ہو کہ اس کتاب کا نام "لاٹھی اور بھینس" ہے اور یہ اصطلاح خصوصیت سے جبر اور سیاسی مواقع کے اعتبار سے مستعمل ہے، لیکن اس کتاب کو سیاست سے تعلق نہ ہونے پر جو یہ نام دیا گیا ہے تو اس لیے کہ بھینس کے قصے والی کتاب کا نام "عبداللہ خاں" یا مسماۃ "رحیما" بھی نہیں رکھا جاسکتا تھا اور صرف "بھینس" یا "بھینس نامہ" نام رکھنے کو میرا ذوق پسند نہیں کرتا تھا اس لیے محض نام کو قدرتے شائستہ بنانے کے لیے یہ نام رکھا کہ سند ہو اور وقتِ ضرورت مجھ مُلّا رموزی کے کام آئے اور وضاحت کے لیے طویل مقدمے کے عوض یہ مختصر سی "مقدی" لکھ دی اب:

زین گلستان من ببر ورقے

مُلّا رموزی

مُلّا رموزی اور بھینس

مُلّا رموزی نام ہے ایک ایسے ''آدم ذات'' کا جسے دنیا میں نہ کبھی تانگہ چلاتا آیا نہ کسی عظیم الشان دنگل میں کسی بھوت کی صورت والے پہلوان سے کشتی لڑنا آیا نہ اس نے چانڈو، چرس، گانجے، بھنگ اور افیون کھانے کی مشق کی، نہ راتوں کو ایک مرتبہ بھی کسی افسر کے مکان میں نقب زنی کی کوشش میں گرفتار ہوا، نہ اس نے دفتری زندگی کو کبھی اس لیے سرمایۂ توقیر و افتخار سمجھا کہ افسر ہو کر شہر اور محلے والوں کو خوب ستائیں گے اور اکڑفوں دکھائیں اور تنخواہ ملے گی تو موٹر منگائیں گے۔ نہ اس نے کبھی بلدیہ اور مجلس وضع قوانین کی رکنیت کو وجہ اعزاز و افتخار سمجھا نہ وہ لنگوٹ بند قلندر بن کر ولی اللہ بنا نہ لمبی زلفوں کے ساتھ قوالی پسند پیر صاحب کے رتبہ کو پہنچا، نہ اس نے کسی حورش اور اسکول کی تعلیم یافتہ لڑکی کو اولاد بخش تعویذ دیا نہ اس نے کسی مزار پر عرس کے لیے چندہ وصول کیا۔ ہاں اگر ملا رموزی دنیا میں کچھ بنا تو بس مضمون نگار اور وہ بھی ''لطافت نگار'' اب ایک لطافت نگار انسان کی تعریف یہ ہے کہ اس کے دماغ میں جُلاہا پن نہ ہو بلکہ علم و معلومات اور فنون و معارف کی وہ حقائق افروز روشنی ہو جس کی عالم آرا تجلیوں سے وہ اپنے مخاطب کے دماغ کو علم و حقیقت سے جگمگا دے۔ اس کے دماغ میں کنجڑا پن نہ ہو بلکہ وہ فطرت و جمالِ فطرت کی تمام عقل افزا حکمتوں اور گیتی افروز رنگینیوں کو عوام و خواص تک اس انداز سے پہنچائے کہ جو دیکھے وہ مسحور اور جو

سنے وہ مسرور۔ اس کے دماغ میں اس قسم کا دھوبی پن نہ ہو کہ وہ دن بھر کسی دفتر میں سر جھکائے مراسلہ، آفس کاپی، آفس نوٹ، نقشہ ڈگری، فیصلہ اور سمن لکھتا رہے اور شام کو ٹینس اور کرکٹ کھیل کر آئے اور ''پائنیر'' پڑھ کر جو سوئے تو صبح اس وقت اٹھے جب اسے آفتاب جلانے سر پر ہی آجائے اور اس زندگی کو بڑی شاندار زندگی سمجھتا رہے بلکہ اس کے لیے مضمون نگار کے دماغ میں حقائق آگاہی، حکمت آموزی اور دقیقہ سنجی کی وہ قوتیں بیدار ہوں جو مظلوم کی آہ اور شعر سننے والوں کی آہ کے نازک سے فرق کو محسوس کر سکے جو تختۂ دار پر لٹکنے والے کی چین جبیں سے اس کی ہمت یا بزدلی کا اندازہ کر سکے جو صبح صادق کے آسمان تاب افق اور اس کی نو راندر نور طلعتوں سے گلزار و گلشن میں سبزہ کے متاثر ہونے کو سمجھ سکے، جو نسیم صبح گاہی کی حیات افروز حیات آرا موجوں کی نازک لپٹ سے شگوفوں کا کھلنا دیکھ اور سمجھ سکتا ہو، جو ان شگوفوں سے نکل کر چمن کو مشکبار بنا دینے والی خوشبو کے اثرات کو محسوس کر سکتا ہو، جو شام کے لالہ رنگ افق کی ان نقرئی دھاریوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہو، جو شام سیہ کو چند لمحوں کے لیے رنگا رنگ بنا دیتی ہیں، جو نقش و رنگ کے نظر نواز نمونے یعنی تتلی کو گلوں اور شگوفوں کی تازہ تازہ پنکھڑیوں پر کپکپاتا دیکھ کر خوش دل و خوش دماغ ہوتا ہو، جو غلامی و عبدیت پابندی و چاکری کی تمام دولت مندیوں اور سرفرازیوں کو ذلت سمجھ کر آزادی و بے فکری کے لیے دنیا کی ہر مصیبت کو راحت قرار دیتا ہو، جو ذہن و دماغ اور عمل و زندگی کی آزادی کی خاطر فقر و فاقہ کشی کو بھی کائنات عالم کی تاجداری و اورنگ آرائی تصور کرتا ہو، جو تاج و افسری کے ذریعہ خدا کے بے بس و بے کس بندوں پر جبر و قہر کی حکمرانی کو دانائیت و خباثت قیاس کرتا ہو، جو آسمان بوس محلات و قصور میں رہنے کے عوض پھوس کے جھونپڑے میں رہ کر آزادی کے وقار کو قائم رکھ سکتا ہو، جو عہدے اور افسری کی جلال انگیز وردی کو غلامی و بندگی کا لعنت خیز لباس قرار دیتا ہو، جو کوٹھیوں، بنگلوں اور اٹاریوں پر حریر و دیبا چڑھی ہوئی کرسیوں اور جواہر بار مسندوں پر بیٹھ کر ''پائنیر'' اخبار پڑھنے اور اکڑنے کو غلامی کی تقلیدی ادا کہتا ہو، جو شاہان عالم کی غلامی آموز فیاضیوں سے مرعوب ہونے کو انسانی مجد شرف اور وقار و الوالعزمی کی توہین قرار دیتا ہو، جو جبر و طاقت اور غرض و آرزو سے دب کر کتوں اور گدھوں کی طرح ہو جانے والے انسانوں سے متاثر ہونے کو انسانیت کی تذلیل کہتا ہو، جو دولت و اقتدار کے نشے سے پھولے ہوئے انسان کو گدھوں اور

خچروں سے زیادہ وقعت نہ دیتا ہو، جو بلغم اور خشکی سے اٹے ہوئے متین وسنجیدہ نام کے انسانوں اور ان کے علم اور عہدے کی غرور انگیز گری سے بھرے ہوئے دماغوں کا مذاق اڑاتا ہو، جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ برق و رعد سے بھرے ہوئے بادلوں کو اُڑانے والی ہواؤں کا مقابلہ کرنے والوں کے عزم واستقلال اور شجاعت ومردانگی کی عزت کرتا ہو، جو پہاڑوں سے اونچی موجوں والے سمندروں کا طوفانی سینہ چیر کر جہاز چلانے والوں کی ہمت وعالی حوصلگی پر آفریں کے پھول برساتا ہو، جو جنگ وقتال کے خونبار وخوں ریز میدانوں میں ہنسنے اور قہقہہ لگا کر تلوار چلانے والوں کی خاک پاک کو سرمۂ بینائی سمجھتا ہو، جو اعلائے حق وصداقت کے حرم میں دار پر مسکرا کر چڑھ جانے والوں کی قسم کھاتا ہو، جو اژدر دہن توپوں اور آتش بار مشین گنوں سے اپنی فوجوں کو ٹکرا دینے والے سردار کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہو، جو فقر وفاقہ کشی اور تنگ دستی وتنگ دامنی سے اپنی معصوم اولاد کو بلکتا ہوا پا کر بھی صبر وخودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دینے والے کے غرور پر مرتا ہو، جو اسکولوں اور کالجوں کو جانے والے لونڈوں اور نوجوانوں کی مانگ چوٹی اور زنانہ وضع کی آرائش پر شرم شرم کے آوازے کستا ہو، جو عہدِ حاضر کے زنانِ بازاری کو شرمانے والے نوجوانوں کے گھونگریالے بالوں، اُستروں، پاؤڈروں، چشموں اور لونڈر[1] سے مزین ومعطر چہروں اور بالوں کو انسانیت اور جلالِ مردانگی کی توہین قرار دیتا ہو، جو نوجوان اور شباب سے بے قابو لڑکیوں کے چوپاٹیوں، ہوٹلوں اور سیرگاہوں میں شوخیاں کرنے اور اٹھلا کر چلنے کو ایشیائی عظمت وعفت کا جنازہ سمجھتا ہو، جو سیاست وحریت طلبی کی دنیا میں عہدناموں، دستاویزوں، لیڈری اور اخبار نویسی کے ذریعہ غداری، بے ایمانی، اقتدار اندوزی اور خود غرضی کی تمام ترکیبوں اور گھاتوں کو تاڑ کر ان کے خلاف جد وجہد واحتجاج کو خلاصۂ آزادی قرار دیتا ہو، جو تصنیفوں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ انسانوں سے انسان کو ٹکرا دینے کو لعنت وشیطنت تصور کرتا ہو۔

یا جو پھر رنجیدہ، ستم دیدہ، غم کشیدہ اور مصیبت رسیدہ انسانوں پر لطف وپرکیف اور خوش دل وپُرخوش بنا دینے والی قوت کا مالک ہو، جو زبانِ اردو میں اپنی لطافت نگاری اور سحر مقالی کے ذریعہ فصاحت وخطابت کے وہ اچھوتے نمونے جمع کرتا ہو کہ اس کی سطر سطر مذاقِ سلیم اور زندگی کے

---

1. یہ ترکیب دانستہ لکھی گئی ہے۔

جواہر لٹاتی ہو، جس کے خدا ساز و خداداد جملوں اور لفظوں میں خروشِ زندگی اور مسرت بار کیفیات کے سمندر میں موجیں مار رہے ہوں، جس کے ذخیرۂ ادب و انشا میں اگر ایک طرف مذہب یثربی اور عقیدۂ مدنی کی تقدیس و تکریم اور خدا کی آخری عظمت و برتری کی تبلیغ و تشہیر نظر آتی ہو تو دوسری طرف غم والم سے پاک خوشی اور زندہ دلی کو زندہ رہنے کی ضمانت قرار دینے کی تعلیم و تشویق ہو، جو جماعت قوم یا سوسائٹی میں مسرت ہی مسرت اور بے فکری ہی بے فکری کو رواج دینے پر اپنی تمام قوتوں کو خرچ کر رہا ہو۔ اگر اس کے سامنے آکر اس کی عظمت جناب والدہ صاحبہ یہ فرمائیں کہ:

''بھیا آج ہم نے ایک بھینس خریدی ہے چلو تم بھی دیکھ لو''

تو ایمان سے کہیے کہ ایسی صفات والے انسان یا ملا رموزی کا اس وقت کیا حال ہوا ہوگا؟

پس یہ ہے سببِ تالیف بھینس۔

◆◆◆

بھینس کی تعریف

پس امابعد یہ کہ اس ذات کی تعریف تو صرف اتنی ہی مشہور ہے کہ بھینس وہ کالا کالا اور بھورا بھورا سا جانور جو ایسا دودھ دے جسے اگر یورپ والے چائے میں ڈال کر نوش فرمائیں تو مارے جوش کے ایشیا کے ہر ملک پر تلواریں سونت کر آ پڑیں اور اگر اسی دودھ کو ہندستانی چائے میں ڈال کر نوش فرمائیں تو مارے غنودگی اور بکواس کے دن بھر ہوٹل سے باہر نہ نکل سکیں، لیکن آج تک کسی ایک اہلِ قلم کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس عظیم الشان وجود پر کچھ لکھتا جسے ہاتھی کی چھوٹی بہن کہا جائے تو غلط نہیں اور لکھنے چلے بھی تو یوں کہ:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

ظاہر ہے کہ یہ شعر ایک مسلمان مولوی محمد اسماعیل مرحوم میرٹھی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس میں کسی ہندو بھائی نے ان کی بے خبری میں ضرور تصرف کیا ہے۔ کیونکہ اصل شعر یوں تھا کہ:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری بھینس بنائی

اب دکھا دیجیے اس شعر کو ملک کے ہر سلطان الشعرا کو اگر ایک حرف بھی غلط بتا دے تو اپنی بھینس ہارنے کو تیار ہیں، اس لیے آج کی تاریخ میں ملا رموزی ایک حقیری کوشش کرتا ہے بھینس کی منقبت نگاری کی۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

پس آپ تمام دنیا کے ڈاکٹروں، حکیموں، ویدوں، مصوروں اور ''چغتائیوں'' سے دریافت کیجیے کہ انسان یا حیوان کا ''جسمی حسن'' کیا ہے؟ سب متفقہ طور پر یہی کہیں گے کہ جسم کا حسن و جمال یہ ہے کہ اس کے اعضا میں نہایت درجہ موزونیت ہو جسے ''بڑے مولوی صاحب'' خدا بخشے ''تناسب اعضا'' کہتے کہتے مر گئے، مگر انگریزی پڑھے ہوئے مسلمان نہ سمجھ سکے اور ویسے بھی آج کل کے انگریزی پڑھے ہوئے مسلمان اپنی مذہبی زبان عربی کے الفاظ کب سمجھتے ہیں، ان سے تو انگریزوں کی ایک ایک حرکت کے معنی دریافت کر لو حفظ بتاتے چلے جائیں گے اور بھئی غلام قوموں کی پہچان بھی یہ ہے کہ وہ جس کے ہاتھ میں لاٹھی دیکھتی ہیں اسی کی بھینس بن کر رہ جاتی ہیں۔ غرض یہ طے شدہ معاملہ ہے کہ جسم کا جمال صرف اعضاء کا موزوں ہونا ہے لیکن اس ضابطہ سے اگر آپ بھینس پر ایک نظر ڈالیں یا بھینس آپ پر نظر ڈالے تو بس جسمی حسن و جمال اپنا ہی سر پکڑ کر بیٹھ جائے گا، مگر آپ کو یہ کمال اس کے اندر نظر نہ آئے گا۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی پچاس من گوشت آسمان سے زمین پر یہ کہہ کر پھینک دیا گیا ہے کہ جس طرح تیرا جی چاہے تو جسم بنا اور اسی قسم کے گوشت کے ڈھیر کا نام لوگوں نے تنگ آ کر بھینس رکھ لیا۔ یہی تو راز ہے کہ اسے جس طرف سے اور جتنا بھی غور سے دیکھو مکروہ اور بدقوا تو نظر آئے گی مگر نظر نہ آئے گی تو حسین و جمیل اور دودھ دیکھو تو کیسا پاک اور نورانی رنگ والا؟ اب اگر تفصیل میں پڑیے تو بھیلسے کی اس ''ناچیز کنیز'' کے حسن اور اعضاء کا یہ حال کہ اس کی تمام موزونیت اس کے شکم اور ہاکی کھیلنے کے میدان کے برابر کمر ہی پر خرچ ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس کی کمر اور اس کا پیٹ کیا ہے گویا اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں پر اچھا خاصا این۔ ڈبلیو۔ آر کا انجن رکھ دیا گیا ہو اور اس کے ایک کونے پر گھوڑے کے شکل کی لالٹین لگا کر اس کا نام بھینس کا منہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے سینگ انسان کے لیے تو خنجر اور آفریدیوں کے گورکھوں اور پنجاب کے انگریزی سپاہیوں کا کچومر نکال دینے والے چھرے ہوتے ہی ہیں لیکن حضور عالیہ بھینس صاحبہ جب اپنی کسی بے ہنگم سی سہیلی کے

ساتھ اٹکھیلیاں فرماتے ہوئے الجھ جاتی ہیں تو آپ بازار والوں اور راستہ چلنے والوں کے لٹھ کھائے بغیر سلامتی سے علاحدہ بھی نہیں ہوسکتی ہیں۔ پھر جب موصوفہ ان تلواروں کے بوسیدہ میان نما سینگوں کو کبھی کبھی آراستہ فرماتی ہیں تو اس طرح کہ گندگی اور عفونت خیز پانی اور کیچڑ سے بھرے ہوئے کسی کھڈ میں بیٹھ گئیں اور کچھ بڑی ہی مستی سے سینگوں پر پاؤ پاؤ بھر وزن کی کیچڑ لگائے ہوئے وہاں سے جھومتی ہوئی آپ کے صاف ستھرے مکان میں داخل ہوگئیں، آپ کے چہرے یا رُخِ انور سے اس ''سینگیاتی حسن'' کی دوبالاگی اس وقت تو ملاحظہ ہوتی ہے جب آپ کسی سہیلی کی جنگ میں اچانک ایک سینگ کی زد میں آجاتی ہیں اور جو کہیں آپ کے سینگ درازی اور پیچیدگی کے پیچھے پڑ جائیں تب اچھا سے اچھا بہادر انسان بھی ایسی بھینس کو دور سے دیکھ کر چلا تا ہے، بھئی وہ بھینس آرہی ہے۔ اب ان کے درازتر اور پیچیدہ قسم کے سینگوں سے ان کا لازمۂ سعادت مندی بھی جاتا رہتا ہے۔ اب ممدوحہ موصوفہ کو فطرتاً کتنی ہی حلیم و بردبار اور کتنی ہی نیک سیرت یا پھر کتنی ہی غبی اور کند ذہن کیوں نہ لیکن جہاں آپ نے ان بے ڈول سے سینگوں کے ساتھ اپنی گردن کو ڈھائی میل دور تک بھاپ اڑانے والے سانس کے ساتھ مٹکایا کہ مالک بھی کود کر دور اور راستے والے بھی مارے خوف کے ایک طرف۔ گھر والوں میں بے اعتمادی کا یہ حال کہ جہاں آپ گھر میں داخل ہوئیں کہ آوازیں شروع ہوگئیں۔

بھاگو بھاگو ننھے دہ دیکھو وہ کمبخت بھینس آگئی۔

بس تم اس کے پاس ہی نہ جانا خدا کے لیے دیکھتے نہیں ہو اس کمبخت کے سینگ ہیں کہ تلواریں؟

تو بس کہہ رہی ہوں تم سے کہ تم تو اس سے الگ ہی رہو، اچھی بلا گھر میں باندھی ہے انھوں نے؟

اور میں کہتی تھی کہ دیکھو خدا رکھے گھر ہے بچوں کا مگر وہ کب مانتے ہیں میری بات۔ انھیں تو اپنے بھینسوں والے ملا رموزی کا مشورہ پورا کرنا تھا۔

اب اگر گھر میں بھینس باندھنے کی جگہ قدرے نامعقول سی ہوئی اور بھینس صاحبہ کو کسی چھپّر کے ''زیرِ سایہ برطانیہ'' رکھا گیا تب تو سمجھ لیجیے کہ ایک دن یہ بھینس مع پورے گھر کے مصیبت میں

گرفتار ہو کر رہے گی۔ یعنی جس دن بھی موصوفہ نے ذرا لاڈ پیار میں آ کر سینگوں کو اس چھپر میں الجھا دیا سمجھ لیجیے کہ اب گھر بھر پریشان ہے یعنی اِدھر تو بھینس صاحبہ ہیں کہ سینگ الجھ جانے کے باعث کھڑی چھپر سے دنگل لڑ رہی ہیں اور اُدھر گھر میں عورتیں ہیں کہ کمروں میں بند ہو کر چیخ رہی ہیں ''ارے خدا کے لیے تمھارے ابّا کو بلالاؤ ننھے''۔

دیکھو تو وہ بھینس کو کیا ہو گیا ہے جو وہ کود رہی ہے؟

خدا خیر کرے اونہہ وہ دیکھو وہ اس نے چھپّر کو گرایا، تو آخر تم دیکھو تو آپا یہ کیا کر رہی ہے؟

بیوی آپا کی تو یہ طاقت نہیں جو اسے قابو میں کر سکے، تو تم ہی چلی جاؤ نا ذرا'' اگر میں ڈرتی ہوں تو''۔

''کون بادشاہ؟''

اے میاں ذرا دوڑ نا تمھارے بھائی کو بلالانا کہنا کہ وہ بھینس کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے جلد دوڑو ورنہ وہ ایک آدھ کو مار ڈالے گی۔

لاحول ولا آپا؟

آپ بھی اس قدر بدحواس ہو جاتی ہیں آخر وہ شیر تو نہیں ہے جو کھا جاتی کسی کو۔

غصہ کی بات ہی ہے۔

آخر وہ ملا رموزی صاحب کیا کہتے ہوں گے کہ صاحب کیا عورتیں ہیں ان کے گھر کی اور وہ ویسے بھی اپنے نام کے ملا رموزی ہیں۔ وہ لکھا ہی کرتے ہیں کہ مسلمان عورتوں سے وہ صحابہؓ کرام کی بیبیوں ایسی ہمت، بہادری، عزت و دلیری تو فنا ہو گئی۔ اب ان کی جگہ پمپ جوتے، ریشمی ساڑھیوں، پاؤڈروں اور قسم قسم کی بے حیائیوں نے لے لی ہے اور جو مسلمان عورتیں کبھی میدانِ جنگ میں تلوار چلانے کے لیے مشہور ہوئی تھیں آج وہ کلبوں، اسکولوں، پارٹیوں، ہوٹلوں اور ناچ گھروں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں اور پھر جب وہ وغیرہ وغیرہ لکھنے پر آتے ہیں تو خدا ہی بچائے اس وقت ان کے قلم کی مار سے۔

تو معلوم نہیں تھا آپ کو تو یہ تو سمجھ لیا ہوتا آپ نے کہ آخر باہر میں مردوں ہی کے پاس بیٹھا ہوؤں گا لہٰذا ایسی خبر نہ بھیجی جائے جس سے چار بھلے مانسوں میں رسوائی ہو۔

افوہ افوہ کیسی۔

سچ کہو تو آپ غصہ کرتی ہیں۔

قسم خدا کی ان کی بھی عادت ہے وہ آپ ملا رموزی صاحب کی کتاب ''عورت ذات'' تو ذرا پڑھوا کر سنیے تب معلوم ہوگا کہ انھوں نے کیسے کیسے بلند خاندانوں کی عورتوں کے بھانڈے پھوڑ کر رکھ دیے ہیں۔

ارے نہیں صاحب بھلا ہمارے گھر سے ان غریب کو کیا تعلق وہ تو انھوں نے آج کل کے میاں بیوی کے نئے نئے قاعدوں اور نئے حالات پر اس قدر عمدہ باتیں لکھی ہیں کہ پڑھ کر آپ حیران رہ جائیں گے اور یہ اسکول میں پڑھی ہوئی بعض بے حیا لونڈیوں کی تو وہ گت بنائی ہے کہ میں کیا کہوں آپ سے۔ اچھا اچھا تو آیئے۔

لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ۔

لیجیے دیکھ لیجیے کہ اس کمبخت کا یہ سینگ الجھ گیا ہے، بس اس کے نکالنے کی یہ کوشش کر رہی ہوگی اور آپ سمجھیں کہ وہ اب کود کر بھاگتی ہے یا گھر والوں کو مار ڈالے گی لاحول ولا اور ویسے بھی آپا انسان کو اتنا بزدل اور ڈرپوک نہ ہونا چاہیے۔ آپ کو کیا خبر ہے خدا کی قسم میں تو روزانہ ملا رموزی صاحب سے اخباروں کی باتیں سنا کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ہندستان کے باہر کی مسلمان عورتیں تو اب کفار سے جنگ کے میدان میں ایسی لڑتی ہیں کہ انھیں چھٹی کا کھایا یاد آجاتا ہے۔

ہاں ہاں خدا کی قسم عورتیں لڑتی ہیں۔

تو معلوم کس طرح ہو یہاں یا تو عورتوں کو اس طرح بند رکھتے ہیں کہ وہ جھینگر تک سے ڈر کر بھاگتی پھرتی ہیں یا پھر نوجوانی ہی میں ایسی ہڑدنگی بنا کر چھوڑتی ہیں کہ پھر وہ بھی مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گھومنے میں کسر اٹھا کر نہیں رکھتی۔

اب خدا خدا کر کے ایسے سینگوں کو آپ نے سلجھادیا تو خیر ورنہ بھینس صاحبہ نے انھیں سلجھانے کے لیے یا اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر لیے یا چھپر جگہ جگہ سے توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اگر یہ سینگ بجائے طویل ہونے کے نوکدار واقع ہو گئے تو پھر یہ شہر بھر کے حق میں ''آلۂ دھاردار'' بن

کراوروں کی ''دست اندازی'' کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ بھینس قتل، اقدام قتل اور قتلِ عام کے ارتکاب سے پہلے اور بعد میں آپ کے لیے تکلیف دہ بنی رہتی ہے۔ ان جرائم کے بغیر بھی وہ اور نہیں تو گھر میں کم از کم گھاس کھلانے والے کے حق میں اتنی تکلیف دہ تو ہر وقت بنی رہتی ہیں کہ گھاس ڈال کر انھوں نے مذاق سے بھی ذرا گردن مٹکا دی تو گھاس ڈالنے والا دس نمبر لگانے سے فرصت نہیں پاتا۔ سینگوں کے بعد سینگوں کے بالکل قریب حضور عالیہ بھینس صاحبہ دامت حشمتہا کے کان ہوتے ہیں۔ ان کی تعریف یوں سمجھیے گویا دو عدد دیسی جوتے ان کے سینگوں کے نیچے لٹکا دیے گئے ہیں۔ جب آپ انھیں پھڑ پھڑاتی ہیں تو ان سے وہ مکروہ آواز پیدا ہوتی ہے جو خواجہ حسن نظامی دہلوی کے ہاں کی لاکھوں قسم کی قوالیوں کی موسیقی کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کے کان ہلانے کی آواز پر آپ کو ہمیشہ شبہ ہوگا کہ پڑوس میں کوئی بیوی اپنے شوہر کو پلنگ کے نیچے بٹھا کر آہستہ آہستہ جوتے مار رہی ہے۔ ساخت اور بناوٹ کے حسن میں ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی شریر لڑکے نے نیا جوتا پہننے کے لیے اپنے پرانے دیسی جوتے کو چاقو سے جگہ جگہ سے کاٹ دیا ہو۔ جب یہ کان غصے اور خوف سے جنبش میں لائے جاتے ہیں، اس وقت ان کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے اپنے بڑے مولوی صاحب نے بارش میں بھیگے ہوئے جوتوں کو خشک کرنے کے لیے دیوار سے لٹکا کر کھڑا کر دیا ہو۔ رُخ زیبا پر ایک سرنگ نما ناک ہی کیا کم مصیبت تھی کہ اس پر اس کے نتھنوں میں آپ کا ہر وقت زبان ڈالنا اور نکالنا آپ کا وہ حسین شغل ہے کہ اگر کوئی ایم۔ اے پاس آدمی اپنی ناک میں اس طرح زبان ڈالتا ہوا مل جائے تو بغیر سوال کیے پولس والے اسے پاگل خانے پہنچا دیں۔ اسی طرح حضور عالیہ ممدوحہ کی آنکھوں میں ڈھائی ڈھائی تولہ کیچڑ کا ہر وقت جمع رہنا کھانسی زدہ بوڑھے آدمیوں اور افیونی کی آنکھوں کی یاد تازہ کر کے کھایا پیا خراب کرتا رہتا ہے مگر بعض چرواہے اور مالک ان تے آدر خوبیوں پر بھی اسے پیار کرتے پائے گئے ہیں۔ اب آپ کی دم کی طرف آیئے۔ یعنی دُم ویسے ہی کہاں کا حسین اور جمال افروز حصۂ جسم ہے جو اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس پر دُم بھی کس کی کہ بھینس کی۔ مثلاً اس کی اسی قباحت کو سوچیے کہ اگر دنیا کے مشہور و معروف وزیر اعظم کے کسی جگہ بھی یہ دم لگا دی جائے تو اس کے رعب و ظلم سے دبی ہوئی رعایا کا اپنے دُم دار وزیر اعظم کو دیکھ کر کیا حال ہوگا؟ اماں جوتے مار کر اسی دن نکال دیا جائے گا۔

لہٰذا انھیں دُم کی طرف سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا گویا کسی سرکس کے ہاتھی کا منہ کاٹ کر اس پر ایک دُم لٹکا دی گئی ہے۔ پھر اس دم کی رعنائی اور خوبصورتی کو سمجھنا ہو تو اسے دیکھ لو اور اپنے مولوی صاحب کے رات کے وقت استعمال کرنے والے لٹھ کو دیکھ لو سب سمجھ میں آجائے گا۔

ہمارے خیال میں تمام دنیا کی دُموں کے مقابل جتنی خرابیاں اور فساد بھینس کی دُم میں پوشیدہ ہیں شاید ہی کسی دُم دار کی دُم کو یہ مقدرت حاصل ہوئی ہو۔ مثلاً مضحکہ خیز دُموں میں شاید سب سے زیادہ مذاق کے قابل پولو کے گھوڑے کی وہ کٹی ہوئی دُم ہوتی ہے جسے نواڑ سے خاصا گٹھا جاتا ہے۔ پھر جب یہ دُم کٹا گھوڑا ہزاروں تماشائیوں کے سامنے اپنے ایم۔ اے پاس پولو سوار کو لے کر نکلتا ہے اور کٹی دُم کو مٹکاتا ہے تو اتنی ہنسی خود پولو سوار کو نہ آتی ہوگی جتنی تماشائیوں کو آتی ہے۔ پھر اس ''دُم کٹے پن'' پر یورپ والوں کو دعویٰ ہے کہ ہم ایشیا والوں کو تہذیب و شائستگی سکھانے آئے ہیں ورنہ ہمیں کھانے پینے کو یورپ ہی میں کیا کم تھا۔

اس دُم کے بعد ایک دُم وہ ہوتی ہے جو ''انگریزوں کے تقلیدی ڈھانچہ'' بنے ہوئے ہندستانیوں کے پیچھے بی۔ اے پاس ہونے کے بعد لگ جاتی ہے۔ اس قسم کا ''دُم دار بی۔ اے پاس ہندستانی'' اپنے ملک، اپنے مذہب، اپنی زبان، اپنے لباس اور اپنے جملہ قومی و ملکی آداب و اصول کو ترک کر کے غیروں کا ''دُم کٹا مقلد'' بن کر رہ جاتا ہے۔ اور ایسے ہی ''ارباب دُم'' ہوتے ہیں جو ملا رموزی کے مقابلہ میں خود کو بڑا ہی جلیل القدر انسان سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ایسے دُم داروں کو زبانِ اردو میں نرا یا اکیلا دُم دار نہیں کہتے بلکہ محاورے میں اسے یوں مخاطب کرتے ہیں کہ ہاں جناب فلاں صاحب کے ساتھ تو بی۔ اے کا دُم چھلا بھی لگا ہوا ہے، اس لیے ہماری دعا ہے کہ خدا اگر کسی ہندستانی کو عہدے، افسری، دولت مندی اور بی۔ اے یا منشی فاضل پاس ہونے کی دُم عطا فرمائے تو اسے ملا رموزی اور عام انسانوں کے سمجھنے کی توفیق بھی روزی فرمائے ورنہ ملا رموزی کی کتابوں میں قیامت تک دُم دار بنا کتب خانوں میں زندہ و سلامت بیٹھا رہے گا اور آنے والی نسلیں اس پر دل کھول کر ہنسیں گی اور کہیں گی کہ اُف وہ ملا رموزی ایسے نکتہ نگار اور رمز آگاہ اہلِ قلم کے مقابل ایسے دُم دار لوگ اکڑتے تھے؟

ان دُموں اور دُم داروں کے بعد ملا رموزی کے زمانے میں یعنی 1931ء میں شہر رنگون

واقع صوبہ برما سے شائع ہونے والے اردو کے ایک اخبار بنام ''شیر'' میں ایک صاحب فضل و بصیرت شاعر صاحب نے اپنا تخلص ہی ''دُمدار'' رکھا تھا جن کی ایک رباعی یہ ہے:

اپر برما چلے دُمدار صاحب
جلو میں ہے کوئی ہمدم نہ ہمراز
مدیر شیر ہیں ہمراہ اور بس
کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

الغرض اختصار کی خاطر اب اور تمام دُموں کو چھوڑ کر بھینس کی دُم پر آ جائیے۔ چنانچہ اس کی ساخت اور بناوٹ ہاتھی ایسے بے ڈول اور قابلِ دید جانور کی دُم سے بہت زیادہ مشابہ ہوتی ہے۔ یعنی ہاتھی کی دُم کی فربہی اور کرختگی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی مشہورِ عالم بہادر کمانڈر اِن چیف کے رُخِ زیبا پر جم کر پڑ جائے تو منٹ دو منٹ ہی کے اندر بہادر اور کمانڈر اِن چیف صاحب راہیِ ملکِ بقا ہو کر رہ جائیں اور بھینس کی دُم میں یہ صفت ہے کہ اسے کھائیے اور بھرے بازار میں ذلیل ہو کر رہ جائیے۔ اس طرح کہ شاید ہی کوئی مبارک گھڑی ایسی ہوگی جب اس کی دُم کا چنور نما حصہ گوبر، پیشاب یا کیچڑ سے آلودہ نہ ہو اور اسے گردش سے روکنے کے لیے آج تک کوئی ایسا قانون نہیں بنایا گیا جس میں لکھا ہوتا کہ بھینس کو اپنی گوبر آلودہ دم کو ہلانا چاہیے یا نہیں اور اگر ہلانا چاہیے تو کس وقت ہلائے، کس طرح ہلائے، کس طرف ہلائے، کس لیے ہلائے، کس شخص کے بالکل ہی منہ کے پاس ہلائے اور کس کی شیروانی سے قریب ہو کر ہلائے یا کس رفتار سے ہلائے، کتنی مرتبہ ہلائے اور اگر دن رات ہلایا جانا ہی ضروری ہو تو پھر یہ پریوں سے زیادہ حسین اور فیشن سے آراستہ نازنین ہندستانی لونڈوں اور مردوں کے عین منہ پر اور وسطِ بازار ہی میں کیوں ہلائی جائے؟

فطرتاً تو اس دُم کا منشا صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ بھینس اپنے جسم پر بیٹھنے والے یا جسم کو کاٹنے والے جانوروں کو بھگا دے اور بس، لیکن وہ جس طرح دنیا کے معاملات خصوصاً انسان کی امید کے خلاف اکثر کام ہوا کرتے ہیں اسی طرح اربابِ علم و فضیلت نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی کوا بھینس پر بیٹھ کر اس کے کان کے کیڑے کھاتا ہے یا اس کی کمر پر تفریحاً بیٹھ کر اسے لمبی لمبی

تانوں کے ساتھ قوالی سنایا کرتا ہے اس وقت یہ مارے لطف کے آنکھیں بند کیے جگالی فرماتی رہتی ہیں مگر اس کوے کو ایک دُم تو کیا نصف دُم بھی رسید نہیں فرماتی ہیں اور سوٹ پوش ہندستانیوں کو بازاروں تک میں ''توہین بالدم'' کرنے سے باز نہیں۔ اب کوئی اتنا بتائے کہ بازاروں سے گزرتے وقت اس پر ایسے کہاں کے لاکھ دولا کھ مچھر سوار ہوتے ہیں جو یہ گوبر پیشاب اور کیچڑ سے لتھڑی ہوئی دُم کو بڑے کروفر سے ہلاتی ہی چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کے اس ''سلسلہ دُمبانی'' سے اچھے اچھے فیشن آلودہ لوگ سڑک پر کھڑے ہاتھ کے رومال سے سوٹ صاف کرتے اور اسے گھور گھور کر کچھ گنگناتے نظر آتے ہیں مگر یہ کمبخت مغرور اور بے حس بھینس ان ''دُم زدہ لوگوں'' سے اتنا بھی نہیں کہتی کہ ''بھائیو معاف فرمایئے گا، میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کے لباس اور منہ پر پڑنے والی اپنی دُم کو واپس لیتی ہوں''۔ دراں حال یہ کہ اب الفاظ واپس لینے کا قاعدہ جوتے مار دینے تک کی خطا کو معاف کرا دیتا ہے۔ اب اس دم کی سب سے منطقی صفت یہ ہے کہ لوگوں کے دُم تو مارے بھینس اور گالیاں کھائے چرواہا۔

ابے اندھے کے بچے دیکھ یہ شیروانی کا کیا حال کر دیا تیری بھینس نے۔

ابے ہاں دُم ماری ہے اس نے۔

اور یہ دیکھ مردود یہ میرے گال پر۔

اور جو ذرا نیچے اتر کر پڑتی تو میری آنکھ گئی تھی مردود ابھی، آخر تجھے کس نے اس سڑک سے بھینس لے جانے کی اجازت دی ہے۔

ابے گالی نہ دوں تو کیا دعا دوں تجھ کو خبیث کہیں کے۔

کیا کہوں بھائی صاحب خدا کی قسم تمام نمازی کپڑے پلید کر دیے اس اندھے کی بھینس نے۔

ارے بھئی تو مار تھوڑا ہی رہا ہوں اس کو۔

مگر سنیے تو خاں صاحب میرا تو یہ کہنا ہے اس سے کہ تو اس سڑک سے کیوں نہیں لے جایا کرتا ہے آخر؟

اچھا اچھا چل جا۔

مگر دیکھو کل سے اسی سڑک سے لے جانا بچہ۔ اچھا۔

جی ہاں صاحب بھینس نے دُم ماردی ابھی۔

نہیں صاحب اب تو گھر جا کر کپڑے بدلنا ہی ہوں گے اور کیا خبر کہاں کہاں چھینٹیں پڑی ہوں؟

اور بعض لوگوں کو تو ملا رموزی نے یوں بھی دیکھا ہے کہ جہاں ان کے منہ پر یا کپڑوں پر بھینس کی دُم پڑی کہ انھوں نے چمک کر چرواہے کے اس زور سے دھپ رسید کیا کہ بے چارے کی پگڑی سڑک پر اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا حالانکہ لکھے پڑھے لوگوں کو بھینس کی دُم اور اس کے چرواہے کے متعلق سعدی صاحب صاف صاف الفاظ میں سمجھا گئے تھے کہ دیکھو بھائی:

دُم بھینسش نہ از پئے کیں است

مقتضائے طبیعتش ایں است

بہر حال خدا یورپ والوں ہی کو بھینس سے قریب رکھے کیونکہ ہم آپ ایسے لاغر، قحط زدہ تین پیسہ میں ایک کارڈ خریدنے والے ہندستانی تو بھینس کی پیار بھری دُم کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ اماں اس سے زیادہ خواری اور رسوائی کیا ہوگی کہ ایک تو پڑے بھینس کی دُم اوپر سے مذاق اڑائیں اور قہقہے لگائیں دکانوں پر بیٹھنے والے غنڈے اور گھر کے بچوں کے حق میں تو یہ دُم اچھی خاصی "ضرب شدید بہ دُم بذریعہ بھینس، بوقت چریدن کاہ بخانہ خود" والی دفعہ ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس قانونی ضرب شدید پر اگر آپ کسی ڈاکٹر کے پاس طبی سند لینے جائیں تو ڈاکٹر الٹا ہنسے گا مگر سند نہ دے گا گدھا کہیں کا۔

غرض یہ ہے حضور بھینس صاحبہ مدظلہا کے جسم گرامی کا وہ "حصۂ جنباں" جس سے اشراف شہر کی آدھی عزت ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے، مگر بھینس صاحبہ ہوتی ہیں کہ اسے مٹکائے بغیر نہیں رہ سکتی ہیں، بے عقل کہیں کی۔

اب دُم سے اُتر کر ان کی سیم تنی عرف جلد کی ملاحت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ یعنی کسی دن مارے پیار کے اگر آپ ان کے جسم نازنین پر ہاتھ رکھ دیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ یا تو اچانک ہاتھ شل ہو گیا یا تمام ہاتھ پر بے شمار چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں اور رینگ رہی ہیں۔ اچھا ان کے چڑے کی تمام خوبیوں

پر لعنت بھیج کر صرف یہی خوبی ملاحظہ فرمالیجیے کہ دنیا کے کتنے جانور ہیں جن کے چمڑے سے سوٹ کیس، سگار کیس، گھوڑوں کی زین اور تلواروں کے میان تیار ہوتے ہیں مگر ایک علیا حضرت بھینس صاحبہ کا چمڑا ہے جو صرف جوتے ہی کے کام آتا ہے اور بس۔ ممکن ہے کوئی ایم۔ اے پاس نمازی اس کے چمڑے کی جانماز بنالیتا ہو مگر ہم نے کسی شخص کے پاس بھینس کے چمڑے کی جانماز نہیں دیکھی اور ویسے بھی ایم۔ اے پاس مسلمانوں کے پاس جانمازوں کا خرچ ذرا کم ہوتا ہے۔

اب دنیا میں ''ہر ذی دُم'' کے لیے آنکھ تمام جسم کا حسن آخر قرار دی گئی ہے اور کیا شک ہے کہ ''چشم خمار آگیں سرگیں''، ''چشم نیم باز'' اور ''چشم غزالی'' ایسے حسین و جمیل ناموں سے شعرائے ہند و فارس نے آنکھ کی تعریف میں لاکھوں شعر کہے ہیں خصوصاً رئیس الادبار حضرت خواجہ بدرالدین چاچی رحمتہ اللہ علیہ نے جو وقت کے سب سے نامور تشبیہ نگار استاد گزرے ہیں، آنکھ کو ذیل کے جمال آرا الفاظ و استعارات سے نظم فرمایا ہے جن کی ادبیت، شعریت اور لطافت پر فارسی ادب جتنا فخر کرے کم ہے۔ مثلاً آنکھ کو بادام، ترک مست، صاد، کاسۂ لعل، کاسۂ نقرہ، طاس سیمگوں اور نرگس شوخ وغیرہ لکھا ہے لیکن ان ادب افروز تراکیب و تشبیہات کے ساتھ اگر بھینس صاحبہ کی آنکھوں کے وحشت خیز و وحشت ناک حسن کو بھی شامل کرلیا جائے تو ٹاٹ میں مخمل کے پیوند کی مثال صاف صورت میں سامنے آجائے گی۔ خصوصاً آپ کی آنکھوں کا حسن اس وقت دیکھنے کا قابل ہوتا ہے جب آپ اپنی طرف کسی اجنبی سی چیز کو آتا دیکھ کر کان سیدھے فرما کر غور سے ملاحظہ فرماتی ہیں۔ بس اس وقت ایسا ہی معلوم ہوگا گویا کوئی خوفناک بھوت آپ کو کھاجانے کے لیے کھڑا تاک رہا ہے، اسی لیے ان آنکھوں کو ''دیدے'' کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اب بھینس کے لب و دہن اور رخساروں کے حسن کا مقابلہ کرنے کے لیے خواجۂ چاچی کی تشبیہات کو پھر ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیجیے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے رخسار کے لیے ''سحر، سمن زار، صفحۂ گلنار، دائرۂ قمر''، دہن کے لیے ''نقطۂ تعلین، لعل درپاش، عناب، عقیق، افعی زمردین، دُرج گوہرین، چشم تدرو، پستۂ مرجان، پستۂ شور'' اور لب کے لیے ''خوں بستہ، ورق لالہ، شکر اور آتش گویا'' ایسے الفاظ وضع کیے ہیں، لیکن ان شکر بیز و شکر ریز اور جاں لطافت تشبیہات کے مقابل بھینس صاحبہ کے ہونٹ، رخسار اور جگالی کرنے والے دہن کا تصور فرمالیجیے اور صبر کر کے بیٹھ جائیے۔ ◆◆◆

حرکات

آپ کی حرکات بھی ایک طرح کا تھیٹر کا تماشہ ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے آپ کی جس حرکت سے اصحابِ ذوق کی بدنصیب آنکھیں دوچار ہوتی ہیں وہ آپ کی "جگالی" ہے۔ چنانچہ دور نہ جائیے صرف اتنا ہی سوچ لیجیے کہ اس حرکت کا جو نام تجویز کیا گیا ہے وہی کہاں کا شیریں اور فصاحت آرا نام ہے، جس کے اندر کسی حسن مزید کی تلاش کی جائے۔ چنانچہ اس حرکت سے بھینس صاحبہ کے چہرے اور دہنِ اقدس کا جو حلیہ بنتا رہتا ہے بس اسے دیکھیے اور ان کے نجی فطرت ہونے پر روتے رہیے۔ پھر اسی طرح سے "لعابِ دہن" کا مسلسل اخراج جس درجہ بھی امتلا آور معاملہ ہے بھینس والے ہی اسے سمجھا سکتے ہیں یا محکمہ حفظانِ صحت۔ اب اس دہن رنگیں سے آپ کے سانس کی آواز ایک طرف مصیبت ہے۔ خصوصاً جاڑے کے موسم میں اس سانس کا آپ کے دونوں نتھنوں سے اخراج اس شک میں ڈال دیتا ہے کہ یہ کوئی بھینس سانس لے رہی ہے یا کسی دیسی کپڑا تیار کرنے والے کارخانے کے پاس ہم کھڑے ہیں، جس کے انجن کے ہر حصہ سے بھاپ خارج ہو رہی ہے۔ پھر اگر یہی ہوتا تو شاید غنیمت تھا لیکن اسی سانس کو آپ رات کے اس حصہ میں سن لیجیے جب آپ گہری نیند میں کبھی خوفناک خواب سے ڈر کر بیدار ہو رہے ہوں اور اُدھر بھینس صاحبہ نے پوری قوت سے سانس کو خارج فرمایا ہو تو بس آپ کو اتنا اور چلانا پڑے گا کہ

''ارے دوڑ نا کھالیا'' ان حرکات میں آپ کی یہ صفت بھی شامل ہے کہ آپ انھیں دس برس تک کافی سے زیادہ لاڈ پیار سے پرورش فرمائیں لیکن ان کے مانوس ہونے کے مراتب بھی وہی ہیں جو انگریز بھائیوں کے ہندستانیوں سے مانوس ہونے کے۔ یا ہندو مسلمانوں کو انتظام حکومت میں حصہ دار بنانے کے لیے گاندھی جی نے اکتوبر 1931 میں گول میز کانفرنس میں پیش کیے تھے یعنی جس مطالبہ کو چاہا قبول فرمایا باقی کو لات ماری اور پھینک دیا۔ اسی طرح یہ بھینس ذات ہیں کہ آپ انھیں اپنے گھر میں باندھیے، ان کی تواضع کرتے رہیے، لیکن ان کا جس دن جی چاہے گا اسی دن یہ ایک منٹ میں آپ کے کسی معصوم اور کمسن جگر گوشے اور نور چشم کی ٹانگ توڑ کر رکھ دیں گی۔ پھر اس نقصان رسانی کے بعد آپ بچے کی بیمارداری میں دو مہینے تک شفاخانے میں پڑے رہیے اور ان کے عالی مرتبہ ہونے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی کہ یہ آپ کے بچے کی ٹانگ بھی توڑ دے گی اور پھر آپ ہی کے گھر میں عمر بھر دندنائے گی کیونکہ آج تک کسی ایک بھینس کے متعلق یہ نہیں سنا کہ اسے کسی کی ٹانگ توڑ دینے کے جرم میں دس سال قید بامشقت کی سزا ملی ہو۔ یہ حرکت تو تھی ان کے اس وقت کی جب یہ آپ کی کہی جانے لگی تھیں اور عرصہ سے آپ کی نمک خوار اور گھاس خوار ہو چکی تھی، لیکن اگر ان کی ابتدائی حرکات کو دیکھا جائے یا دیکھ لیا جائے تو خریدتے وقت ہی شریف لوگ تو چلا کر کہہ دیں گے کہ رہنے دیجیے بھائی صاحب ایسی بھینس کے خریدنے ہی پر لعنت جو بازار سے گھر تک جاتے جاتے ہی دس بھلے مانسوں کی آبرو خراب کردے۔ مثلاً کیا آپ نے ایک مرتبہ بھی بازار میں نہ سنا ہوگا کہ:

بھائی صاحب ہٹ جایئے گا ذرا بھینس آرہی ہے۔

اللّٰہ خدا نے بڑی خیر کی۔

خدا کی قسم بال بال بچ گیا۔

آخر یہ کس کی بھینس ہے؟

تو کیا انھیں یہی راستہ ملا تھا لانے کو؟

اچھا اچھا ملا رموزی صاحب نے خریدی ہے۔

ہاں تو یوں کہو کہ نئی ہے، ابھی خریدی ہے۔

مگر صاحب بلا کی غصہ ور بھینس ہے۔

خدا ہی حافظ ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ گھر تک جاتے جاتے دو چار کو زخمی نہ کر دے۔

ادنہہ دیکھنا وہ پھر کود رہی ہے۔

لاحول ولا ایسے جانور کا پالنا ہی کیا ضروری ہے؟

اب اگر اس حالت میں یہ بھینس کسی کانگریسی جلسے یا رضا کاروں کے ہجوم یا چاندنی چوک میں بدک جائے تو پھر خدا ہی حافظ ہوتا ہے اپنی رعایا کا، پولیس کے تو بس کا نہیں کہ وہ بھڑکی ہوئی بھینس سے رعایا کو بچالے۔ بس یہی دیکھا ہے کہ تمام بازار ہے کہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ لوگ ہیں کہ ایک کے اوپر ایک ہو کر چڑھے جا رہے ہیں۔ بازار کی جس دکان پر دیکھو دو چار ہندستانی بہادر بھینس کے ڈر سے منہ کھولے کھڑے ہیں۔ خود نئے خریدار صاحب ہیں کہ اپنا اصل حلیہ بگاڑے ہوئے کبھی اسے چمکارتے ہیں کبھی ڈانٹتے ہیں کبھی مارتے ہیں اور کبھی کبھی رسی چھوڑ کر خود کسی دکان پر چڑھ جاتے ہیں۔ کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ رسی ہاتھ سے چھُٹ جانے کے بعد آگے بھینس اور پیچھے نئے خریدار صاحب ہیں کے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اب بھینس اور خریدار کی اس ''گھوڑ دوڑ'' میں بھینس کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ منہ سے ایک مکروہ سی آواز نکالتی ہوئی بھاگی چلی جائے، لیکن تعاقب کرنے والے خریدار پر پولیس کا یہ قانون بھی سوار رہتا ہے کہ وہ بھینس کو قابو میں لانے کے لیے بھینس کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار سے بھاگے بھی اور اس ہوش رُبا رفتار میں وہ چلا چلا کر یہ بھی کہتا جائے اور بھاگتا جائے:

ارے بھئی ہٹنا بھینس آ رہی ہے۔

بچنا بھائی جان۔

ہوشیار ہوشیار، دیکھنا دیکھنا۔

لونڈے لونڈے ہٹ ہٹ۔

بچنا بھائی میرے۔

بس بس، کھڑی رہ۔

لے بیٹا لے۔

بس بھئی بس۔

اب پولیس والوں کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ جب کوئی ملا رموزی کسی بھڑکی ہوئی بھینس کی رفتار سے اپنی رفتار ملائے گا تو اس وقت اس غریب کا سانس اتنا قابو میں کہاں اور کس طرح رہے گا کہ وہ حفظ امن کی خاطر مذکورہ بالاقسم کے نعرے بھی لگاتا جائے اور بھاگتا بھی جائے؟

اس پر کہتے ہیں کہ پولیس والوں کی تنخواہوں میں اضافہ کردو؟

اب جونئی بھینس صاحبہ نئے خریدار صاحب کے قبضہ سے نکل کر فرار ہوں گی تو بغیر کسی پاسپورٹ اور پروانہ راہداری کے سیدھی اپنے گاؤں میں جا کر دم لیں گی۔ آپ ہیں کہ راستہ کے لوگوں سے ہانپ ہانپ کر کہہ رہے ہیں:

کیوں بھئی اس طرف ایک بھینس تو نہیں گئی؟

اجی ابھی ابھی بھاگی ہے وہ چاندنی چوک کے قریب سے۔

جی ہاں آج ہی خریدا تھا میں نے اس کو۔

نہیں کالی ہے بالکل۔

جی ہاں برے بڑے سینگ ہیں۔

جی ہاں گلے میں رسی بھی اُلجھی ہوئی ہے اس کے۔

جی ہاں جی ہاں پیشانی پر چاند بھی ہے اس کے۔

جی ہاں سیدھا کان ذرا کٹا ہوا ہے اس کا۔

تو پھر کتنی دیر ہوئی ہوگی اسے اس طرف سے گزرے؟

اچھا تو کیا بھاگتی ہوئی ہی جارہی تھی وہ؟

تو کیا یہی راستہ جاتا ہے سیدھا؟

تو کیا ہوگا یہاں سے کوئی چار میل وہ گاؤں؟

ارے بھئی کیا کہوں آپ سے وہ لونڈے کے کہے پر میں اس حماقت میں مبتلا ہوگیا، ورنہ میں کہاں اور بھینس کہاں، کمبخت۔

تو کیوں جناب اس طرف کوئی لاری بھی نہیں چلتی؟

لاحول ولاقوۃ۔

اب جو دیہات کی خاک اُڑاتے آپ اس کے ''وطن نما گاؤں'' میں پہنچے تو دیکھا کہ سینگوں میں یا گلے میں آپ کی رسّی بدستور سابق موجود ہے اور بھینس صاحبہ نہایت اطمینان سے سابق مالک کا گھاس کھانے میں مصروف ہیں۔ اب اگر اس عرصہ میں سابق مالک بھی اپنے گاؤں پہنچ گیا ہے تو اس سے بجائے معانقے اور مصافحے کے آپ کو کہنا پڑے گا:

بس لعنت ہے اس بھینس پر۔

اے بھائی وہ میری پریشانی تو ایک طرف میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی نے خیر کی ورنہ اس نے بازار میں آج ایک دو کو زخمی کر دیا ہوتا تو اس وقت میں کوتوالی میں بند ہوتا۔

غرض خدا خدا کر کے اب انھیں گاؤں سے پھر لے کر اب جو شہر کی طرف روانہ ہوئے تو انھوں نے پھر اسی اُچھل کود سے کام لینا شروع کیا اور آپ نے لٹھ بازی سے۔ اب اس طرح میل دو میل تشریف لے آنے کے بعد اگر آپ کے ہاتھ سے پھر رسّی چھوٹ گئی تو سمجھ لیجیے کہ پھر اتنی زمین آپ کے لیے گول ہو جائے گی۔ کبھی کبھی اس ''بھینسیانہ سول نافرمانی'' کی روک تھام کے لیے اسے کسی آنے والی بیل گاڑی سے بھی باندھ دیتے ہیں اور خود خریدار صاحب اس گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں تا کہ اس گاڑی کے ساتھ آپ مال گاڑی کا کالا ڈبہ بنی ہوئی چلی آئیں، لیکن یہ بھی دیکھا کہ گاڑی سے مضبوط باندھنے پر بھی یکا یک جو آپ نے گاڑی پر سر مارا تو آپ بھی کود کر نیچے اور بیل بھی مع گاڑی کے بدک کر سڑک کے کنارے۔ اب اگر وہ کسی نہ کسی طرح آپ کے ''غریب خانہ'' پر قدم رنجہ ہو ہی گئیں تو دعا فرمایئے کہ اب ایک مہینے تک خدا گھر والوں کو ان کی اچھل کود اور قلا بازیوں سے محفوظ رکھے اور اگر سب طرح سے یہ ''عافیت پسند'' اور ''صلح جو'' بن گئیں تو نہایت خاموشی اور مہربانی کے عالم میں آپ کے منہ پر یا پیٹ پر، یا پاؤں پر ان کا اچانک لات رسید کر کے پھر گھاس کھانے میں مصروف ہو جانا تو کہیں گیا ہی نہیں ہے۔ اب مصیبت یہ ہے کہ ایک مانوس بھینس کی اس ''لات بازی'' کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے کوئی ''خطرہ کی گھنٹی'' تو بجائی نہیں جاتی لہٰذا عمر بھر آپ بھی خطرہ میں اور ننھے میاں کی والدہ بھی خطرہ میں۔ اسی لیے تو یہ اسکول کی ہڑدنگیاں بھینس کا نام سن کر ''اوئی آپا'' کہہ کر کمرہ میں بھاگ جایا کرتی ہیں۔ اس لات کا

لطف اس وقت زیادہ قابلِ ملاحظہ ہوا کرتا ہے جب مالک کا برتن اس کے دودھ سے لبالب ہو چکا ہو کہ یہ لات رسید کرے، پھر دیکھیے کہ ایک طرف مالک صاحب پڑے کراہ رہے ہیں اور دوسری طرف ''جوئے شیر'' رواں ہے پھر لطف بالائے لطف یہ کہ اس ذلت انگیز لات اور دودھ کے ضائع جانے پر بھی آپ بھینس صاحبہ کو گولی نہیں مار سکتے اور نہ گالی دے کر اسے اذیت پہنچا سکتے ہیں کیونکہ کسی ایک زبان میں بھی آج تک کوئی ایسی سیدھی گالی وضع نہیں ہوئی جسے بھینس سمجھ کر رنجیدہ ہو سکے۔ لہٰذا جب بھینس گالی کے معنی اور اس کی تحقیر کو سمجھ ہی نہیں سکتی مگر آپ ہیں کہ لات کھا کر اسے برابر گالیاں دے رہے ہیں تو کہیے کہ لات کھا کر بھی آپ ہی بے وقوف رہے یا بھینس؟ اب ان ''اندرونی حرکات'' کے بعد ذرا ان کی ''بیرونی حرکات'' ملاحظہ فرمایئے۔ مثلاً دنیا میں ہر جانور کے لیے ایک چراگاہ خاص ہوا کرتی ہے مگر بھینس کی چراگاہوں کی وسعت ہی نرالی ہے۔ یعنی فرض کیجیے کہ آپ کی بھینس چراگاہ کو جس راستہ سے جاتی ہے اس کے بیچ میں کسی ڈپٹی کلکٹر، انسپکٹر یا کسی قسم کے بھی ''تر'' کی ایک کوٹھی بھی ہے اور پائیں باغ بھی اور جب سے ہندستانیوں پر انگریزوں کی غلامی مسلط ہوئی ہے اس وقت سے ان کے اندر ''عمارتی تقلید'' کا بحران بھی پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ ہر طرح پائیں باغ بنا کر رہتے ہیں، اس لیے اس فردوس آفریں باغ میں آپ کی یہ بھینس بغیر ''وزیٹنگ کارڈ'' بھیجے ایک دن یوں داخل ہو جائے گی گویا یہ باغ اس کے باپ کی جائیداد ہے اور دیکھ لیجیے گا کہ باغ کے اندر یہ حد سے زیادہ اطمینان سے کھڑی کلکٹر صاحب کا باغ چر رہی ہو گی اور پھر یہی نہیں کہ اس باغ میں بڑی احتیاط سے صرف گھاس ہی گھاس چر رہی ہے بلکہ کلکٹر صاحب کی خاص پسند کی ترکاریاں پہلے کھائے گی بعد میں گھاس۔ نتیجہ یہ کہ بھینس ہر حال میں ہندستان کی ہوتی ہے اور کلکٹر صاحب میں جو انگریزی پن ہونا ضروری قرار دے دیا گیا ہے تو اب وہ کاہے کو چوکتے ہیں۔ آپ کے نام سمن جاری کیے بغیر اور مقدمہ دائر کیے بغیر۔ لہٰذا باغ میں تشریف لے گئی تھیں بھینس صاحبہ اور سمن آ گیا آپ کے نام کہ:

''ہر گاہ عدالت میں مسمیٰ این۔ ڈبلیو۔ آر ولد جی۔ آئی۔ پی۔ آر ڈپٹی انسپکٹر قوم غلام ہندستانی صرف نخرہ اور وضع انگریزی تمھارے خلاف اس عنوان سے مقدمہ دائر کیا ہے کہ مدعی کی کوٹھی، جس کا نام اس نے ہندستانی ہونے پر بھی این۔ ڈبلیو۔ آر لاج

رکھا ہے، واقع جیکب روڈ جو ہندستانی سڑک ہونے پر بھی ایک انگریز کے نام سے منسوب ہے، کے اس نے باغ کے اندر جس کے وسط میں ایک ٹینس کھیلنے کا میدان محض اس لیے بنایا گیا ہے کہ انگریزوں کی غلامی اور تقلید کا ہر طرح اعلان ہوتا ہے اور جس پر کبھی کبھی کیا بلکہ ہر شام کو فیشن زندہ ہندستانی بڑ دنگیاں کودتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جسے تہذیب جدید کے بے حیا ماہرین نے ورزش نام دیا ہے۔ اس کے اندر تمھاری ایک راس بھینس رنگ سیاہ، دُم صراحی نما، سینگ لمبے اور آخر میں قدرے نوکدار، بایاں کان کٹا ہوا داخل ہو گئی جسے انسپکٹر کے ملازم نے دیکھا جو ٹینس کے کھیل کے وقت لڑکیوں کے پاس رہا کرتا ہے اور چنو نامی چپراسی نے بھی دیکھا جو سرکاری ملازم ہونے پر بھی انسپکٹر کے گھر کی چوکیداری کرتا ہے اور کوئی پرسش نہیں ہوتی۔ پس جب ان دونوں آدمیوں نے اسے بھگانا چاہا تو وہ ان پر اپنے نوکدار سینگوں سے حملہ آور ہوئی اور چونکہ ہندستانیوں کی قوت مقابلہ اور قوت تیغ آزمائی فیشن کی نزاکتوں میں صرف ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان دونوں مردوں نے خود کو بھاگ کر اس سے بچایا اور ٹینس کھیلنے والی لڑکیاں بھی اوئی کہہ کر بھاگ گئیں ورنہ قریب تھا کہ تمھاری بھینس سے ضرب شدید کا ارتکاب عمل میں آتا۔ لہٰذا ذریعہ سمن ہذا نمبری 974 دفعہ 5379 ضمیمہ حرف الف ضمن 114 قانون تعزیرات بھینس تمھیں پابند کیا جاتا ہے کہ تم مورخہ ایک دسمبر 1931 کو ٹھیک بوقت نواشت بارہ بجے کہ نصف جس کے چھ بجے سکہ شاہی ہوتے ہیں، عدالت ہٰذا میں اصالتاً اور چاہے روپیہ ہو یا نہ ہو مگر وکالتاً حاضر ہو کر جواب دو کہ کیوں نہیں تمھارے خلاف زیر دفعہ 177 ایکٹ نمبر 5790 مجریہ 1857 جب کہ انگریزوں کو ہندستانیوں پر فتح حاصل ہوئی تھی، بہ سلسلہ بد احتیاطی کارروائی کی جائے؟ تاکید جانو ورنہ تمھارے حق میں بغیر تمھاری غیر حاضی کی وجہ دریافت کیے وارنٹ نمبر 950 منظور شدہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل جاری کیا جائے گا۔ آج میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔

(مہر عدالت)　　　دستخط حاکم بخط انگریزی مگر قوم ہندستانی"

اب اگر یہی ہوتا کہ بھینس کو گرفتار کر کے اسے قید با مشقت کی سزا دے دی جاتی یا یہ تمام عدالتی کاغذات اسی کے نام اور ولدیت پر جاری ہوتے تو بھینس کا پالنا شاید اتنا گراں نہ گزرتا، لیکن یہ ہے چونکہ انصاف کہ ترکاریاں کھائے بھینس اور سزا پائے مالک اور چرواہا لہٰذا آپ کے نام تو آیا صرف سمن اور وہ چرواہے صاحب کو پہلے تو پکڑ کر خوب سا ٹھونکا انسپکٹر صاحب کے چوکیدار نے اس کے بعد انسپکٹر صاحب کے ایک خط کے ساتھ جو چرواہے کو پہنچایا گیا کوتوالی میں تو اب ہندستانی نسل کے کوتوال صاحب کا ہے کو قابو میں رہتے لہٰذا پہلے تو چرواہے صاحب سے ذیل کی گفتگو شروع فرمائی کہ:

اچھا تیری ماں کا...

اب بتاتا ہوں تجھے اور تیرے ملا رموزی صاحب کو۔

ارے کوئی ہے پہرے پر؟

ذرا لانا میرا بید؟

ٹھہر جا تیری بہن کا...

اچھا بھئی چوکیدار تو تو جا۔

اور دیکھ وہ انسپکٹر صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا آپ اطمینان رکھیں میں اس کو آج ہی پہنچائے دیتا ہوں بڑے گھر کیونکہ میں ہوں ہر حال میں ہندستانی خون کا کوتوال، لہٰذا میرے پاس کسی انسپکٹر صاحب کی سفارش کا خط آ جانے سے میرا جو حال ہوا ہے وہ قانون میں کسی ایک جگہ بھی نہیں لکھا صرف چرواہے کو جو شدید تکلیف پہنچاؤں گا اس سے ثابت ہوگا کہ ہندستانی لوگ اپنے ہم قوموں اور ہم وطنوں کے ساتھ کیا نفیس سلوک کرتے ہیں۔

ابے روتا کیا ہے حرام زادے؟

ابھی معلوم ہوا جاتا ہے بھینس چرانا تجھ کو۔

لاؤ جی منشی جی پہلے تو اس کا چالان درج کرو دفعہ 749 کے تحت اور پھر ذرا اسے اندر لے جا کر اس کا مزاج تو پوچھو اس سے۔

ہاں اب چلاتا ہے مردود!

اور اس وقت نہ سوچا جب ہمارے انسپکٹر صاحب کا باغ تیری بھینس برباد کر رہی تھی۔

واضح ہو کہ یہ تمام مصائب و مشکلات قانونی الفاظ میں صرف ''بداحتیاطی'' کے نام سے یاد کیے گئے ہیں اس لیے بے موقع نہ ہوگا اگر اس سلسلہ سے دو قطعہ وارنٹ یا نوٹس یا اطلاع نامے آپ کے نام اور جاری کر دیے جائیں، یعنی جب آپ کے گھر میں بھینس ہوگی تو لامحالہ اس کے ''بیت الخلا'' والے معاملات کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ لہٰذا چند دن بعد ہی آپ کے نام محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے ایک تحریر آئے گی کہ:

''از حفظانِ صحت۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے جس کی تصدیق تمھارے محلّہ کے چند آوارہ گرد اور لفنڈوں نے بھی کی ہے کہ تمھارے ہاں ایک راس بھینس ہے، اس کے بول و براز کی مقدار چونکہ عام انسانوں کے بول و براز سے زیادہ واقع ہوتی ہے اور تم اس کی صفائی خاطر خواہ نہیں کرتے ہو جس کی وجہ سے اس کی غلیظ ہوا کے ساتھ اس کے جراثیم تمام محلّہ میں اُڑ کر یا پھیل کر یا پراگندہ ہو کر یا پریشان ہو کر محلّہ کے مکانوں اور مکانوں کے برتنوں میں داخل ہوتے ہیں۔ نیز ایک راس نرگاؤ اور ایک راس گائے جسے ہندو لوگ عزت کی چیز سمجھتے ہیں جب اس بول و براز میں اپنے بول و براز کا اضافہ کرتے ہیں تو ان کے جراثیم سے محلّہ میں وبائے عام پھیلنے کا احتمال قوی ہوتا ہے۔ لہٰذا تم کو بذریعہ نوٹس ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ تم اندر میعاد ایک ہفتہ نرگاؤ اور گائے خود کو فروخت کر دو تا کہ ہندوؤں کی دل آزاری نہ ہو یا پھر اپنی بھینس کے گوبر کو ڈاکٹر انکار پرشاد صاحب کے معائنہ میں لاؤ جن کے معائنہ کی فیس مبلغ دس روپیہ بھی ساتھ ہی تم کو داخل کرنا ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کا اس قسم کا سرٹیفکیٹ بھی ہمارے ہاں داخل کرو جس میں وہ بتائیں کہ ہاں تمھاری بھینس کے گوبر سے کسی عام وبا کے پھیلنے کا احتمال نہیں ہے یا پھر تم اپنی بھینس کو اس طرح رکھو کہ وہ بول و براز نہ کر سکے اور جو کسی دفعہ کے تحت بول و براز سے باز ہی نہ آئے تو ایسی تدبیر عمل میں لاؤ جس سے محلّہ کے لفنڈوں کو تم سے شکایت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ اس قسم کی شکایتیں اشراف نہیں کرتے

صرف غنڈوں کا یہ پیشہ ہوتا ہے کہ وہ محلے کے اشراف کو تنگ کرتے رہنے کو اپنی خاندانی شرافت سمجھتے ہیں۔ بصورت عدم تعمیل تمھارے خلاف حسب دفعہ 347 ضابطہ بھینس منظور شدہ نومبر 1931 مجریہ ایک دسمبر 1932 کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

تاکید جانو۔ فقط

دستخط حاکم علی... حفظانِ صحت، بخطِ انگریزی

بہ ٹوپی انگریزی، بصورت خالص غلام ہندستانی"

اب اگر اس غصہ میں آپ نے بھینس کی قیام گاہ کی کافی صفائی کے خیال سے یا مکان کی تنگی سے تنگ آکر یا محض سردی کی شدت سے کسی دن بھینس کو مکان کے سامنے باندھ دیا تو دوسرا نوٹس اس مضمون کا آپ کے نام آئے گا کہ:

"ہرگاہ کہ ہمارے پاس تمھارے محلے کے چند اوباش فطرت اور کمینہ خصائل لوگوں نے اطلاع پہنچائی ہے کہ تم نے کل سے اپنی بھینس کو سرکاری رقبے میں بغیر حصول اجازت باندھنا شروع کیا ہے۔ چونکہ یہ قبضہ حسب منشا قانون آراضی منظور شدہ گورنر جنرل باجلاس کونسل دفعہ 994 قانون آراضیات مجریہ 1931 کے خلاف ہے، جس سے سرکاری نقصان متحمل ومتصور ہے نیز اس سے شارع عام کی رونق کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے تم کو مورخہ 17 نومبر 1931 کو علی الصباح کہ نصف جس کا صبح سویرے ہوتا ہے مع بھینس میونسپل کمیٹی ہال کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دو کہ کیوں نہیں تمھارے خلاف دفعہ 93 قانون آراضیات سرکار مداخلت بیجا بہ بھینس بہ زمین سرکار مقدمہ چلایا جائے؟ جب کہ زمین سرکار پر تمھارا بھینس کا باندھنا اور اس کے سامنے سرکاری زمین پر گھاس ڈالنا محلے کے چند شرارت پیشہ لوگوں کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے۔

اس نوٹس کی ایک نقل کوتوال صاحب شہر کے پاس جائے کہ وہ سرکاری زمین پر بندھی ہوئی بھینس کی سخت نگرانی کریں تاکہ اس سڑک سے گزرنے والی دوسری بھینسوں کے

مقابلہ سے محلے میں نقص امن کی حالت پیدا نہ ہو۔

دستخط حاکم بخط انگریزی بہ قلم انگریزی

نسل ہندستانی بہ تقلید فرنگستانی"

اب ان احکام کی تعمیل سے پہلے آپ کی بھینس تو گئی چرنے اور آپ چلے عدالت میونسپل وکیل صاحب کے گھر اور حاکم صاحب کے بنگلے۔ بھینس ہے کہ گردن اٹھا اٹھا کر چر رہی ہے جنگل میں اور آپ کا یہ حال کہ جس ملا رموزی نے آپ سے کہا کیوں بھئی خیر تو ہے آج آپ یہاں کہاں؟ کہ آپ نے فوراً کہنا شروع کیا۔

"کیا بتاؤں بھائی جان عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں وہ ایک بھینس خرید کر۔ ارے صاحب وہ کل کہیں جاڑے کی وجہ سے میں نے صبح کے وقت بھینس کو دھوپ میں باندھ دیا تھا بس یہ گناہ ہو گیا کیونکہ آپ تو جانتے ہی ہیں وہ ہمارے حضرت عطر سنگھ پہلوان کو کہ وہ محلے بھر کو آئے دن بات بات پر جیسا کچھ تنگ کرتا رہتا ہے۔ اُدھر وہ پرانا مقدمہ باز۔ بات بات پر لوگوں کے خلاف مقدمات دائر کرتا رہتا ہے اور ویسے بھی وہ حکام سے ملا رہتا ہے، انھیں رشوتیں دلاتا ہے۔ بس اُس مردود نے میرے خلاف بھی ایک رپورٹ کردی ہے، اس لیے پریشان پھر رہا ہوں"۔

جی ہاں تو جس کے پاس علم نہ ہو، خاندان کا ذلیل ہو، معاش اور عزت ہی ایسی ہو وہ تو ایسی ہی حرکتیں کرتا رہے گا۔

مگر ہاں سچ ہے آپ کا کہنا کہ زمانہ ہی ایسا ہے اور ایسوں کی چل بھی رہی ہے۔

وکیل صاحب ہیں کہ منت منت پر اسٹامپ، کورٹ فیس اور محنتانہ وصول کر کے دم لے رہے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے آج تک کمبخت عدالت اور کمیٹی کی صورت نہیں دیکھی۔

وہ وکیل صاحب کے کہے پر کل جو صاحب کے بنگلے پر گیا ہوں تو خدا کی پناہ، اماں وہ ہندستانی ہو کر مجھ سے اس فرعونی انداز میں پیش آیا کہ توبہ۔

جی ہاں جانتا ہوں جانتا کیوں نہیں۔

ہاں ہاں سلطان احمد کا بھتیجہ ہے مگر صاحب کس بلا کی انگریزیت سوار ہے اس پر کہ خدا ہی

رحم فرمائے۔

جی ہاں یہ نتیجہ ہے اس زمانہ کی تعلیم کا۔ حالانکہ تعلیم سے انسان کے اندر انسانیت، عقل و تمیز، تہذیب وشرافتِ نفس کا اضافہ ہوتا ہے مگر آج کل تعلیم کے بعد اپنے ہی بھائیوں سے فرعونیت کا برتاؤ لازمہ تسلیم سمجھا گیا ہے۔

مگر میر صاحب آپ کو بھی اپیل کا حق حاصل ہے۔

ارے بھئی لاحول ولاقوہ، اپیل کیسی۔ میں ایک پیشی میں اتنا پریشان ہو گیا کہ اگر کوئی دس روپیہ میں خرید ے تو واللہ میں اس بھینس کو دے کر رہوں گا۔ بھلا میں کہاں اور کہاں یہ مقدموں کی لعنت، وہ تو کہو کہ ملا رموزی صاحب کے مشورے سے بچوں کے دودھ کھانے کے خیال سے خرید لی تھی ورنہ لاحول ولا پڑھیے کون مردود ان جھگڑوں کو پسند کرتا ہے۔ اب ان تمام حالات کا نتیجہ اگر کہیں ''سرکاری حیثیت سے'' برآمد ہوا تو ایک دن آپ بھینس کی رسی تھامے میدان میں کھڑے ہوں گے اور ایک چپراسی چلا چلا کر یہ نعرے لگا رہا ہو گا کہ:

اس بھینس کے گیارہ روپیہ ایک، اور گیارہ روپیہ دو۔

اور جو یہ کچھ بھی نہ ہوا تو ہر ہفتے آپ کا ۸ر فیس کانجی ہاؤس ادا کرنا ضروری ہے اور کانجی ہاؤس کے ''منشی جی'' کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر اتنا ضرور کہنا ہو گا کہ منشی جی انشاء اللہ اب میں خاصی نگرانی کروں گا، اس مرتبہ تو یونہیں چھوڑ دیجیے بھینس کو کیا کہوں تنخواہ بھی ابھی تک نہیں ملی ہے اور ویسے بھی قرضدار ہوں تخفیف کمیٹی نے سارے بل نکال دیے ہیں اور افسر ویسے ہی لطف اٹھا رہے ہیں خدا آپ کا بھلا کرے گا۔ بس منشی خدا کی قسم اس بھینس کے دودھ پر گزارا ہے، ہم سب لوگوں کا وغیرہ وغیرہ۔

چلیے اب ان حالات کو بھلا کر بھینس کی حرکات کے سلسلے کی طرف پھر متوجہ ہو جایئے۔ چنانچہ ان کی سب سے نفیس اور حسین حرکت یہ ہے کہ آپ مزاج کی بہت سست اور کاہل واقع ہوئی ہیں گویا سستی اور کاہلی کے حساب سے بھینس بھی ایک طرح کی داغ دہلوی ہے جنھوں نے خود اپنی کاہلی کے لیے یہ مصرع کہا تھا:

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

لہٰذا گھر میں آپ جب تک دس بارہ ہاتھ لٹھ یا تچی کے رسید نہ فرمایئے گا یہ کسی ادنیٰ جنبش پر بھی خوشی سے تیار نہ ہوں گی۔ پھر مار کھانے پر جو بے غیرتی، بے حیائی اور بے حسی بھینس کے اندر پائی جاتی ہے شاید ہی کسی دوسرے جانور میں پائی جائے؟ لہٰذا اب آپ چاہے نازک سے نازک چھڑی استعمال فرمائیں یا موٹے سے موٹا لٹھ، ان کی حرکت میں تیزی کبھی پیدا ہوئی ہے نہ اب ہو۔ چنانچہ یہ اسی کا صبر، ضبط، تحمل اور حوصلہ ہے کہ مار کھاتے وقت بجز دُم ہلانے کے اس کے پورے جسم سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا لٹھ پڑ جانے پر کہہ رہی ہو کہ بس دیکھ لیا تمھارے لٹھ کو؟

اب جو خدا خدا کر کے گھر سے باہر نکل آئیں تو راستہ چلنا ہزاروں مشکلات، مصائب اور خطرات کا باعث بنا رہتا ہے جس کی تفصیلات کو موٹر والے، سائیکل والے، گھوڑا سوار، گاڑی والے، بگھی والے اور تانگے والے ہی کچھ خوب جانتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ آپ وائسرائے ہند کے کسی اہم سے اہم تار کو لے کر ڈاک خانہ جا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس وقت آپ کی موٹر کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ آئے کہ یکا یک سڑک کے کنارے سے بھینس نمودار ہوگی، اس طرح کہ سڑک پر سیدھی چلنے کے عوض ترچھی چل رہی ہوگی، اس وقت مارے تاؤ کے آپ کا جو حال ہوگا اسے آپ موٹر ڈرائیور بن کر ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ اب آپ اس کے پیچھے پہنچ کر جتنی زور سے چاہیں شور کریں موٹر کا ہارن چاہے سونے والوں کو بیدار کر دے مگر اس بھینس ذات پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا اور اس محویت کے ساتھ وہ چلتی رہے گی گویا کسی جلد ہونے والے سالانہ مشاعرے کی غزل کہنے میں مصروف ہے، یہاں تک کہ اس کی یہ ''ستیہ گرہی حرکت'' اب اس سے بھی زیادہ پُر لطف ہو جائے گی یعنی اب وہ اچانک آپ کے موٹر کے سامنے دُم اٹھا کر حوائج ضروری سے فارغ ہونے کو بھی اسی وقت ضروری قرار دے گی اور اب آپ وائسرائے کے تار کو لیے بیٹھے رہیں گے نہ موٹر چلا سکیں گے نہ موٹر سے کود کر بھاگ سکیں گے۔ پھر لطف یہ کہ وائسرائے کے تار کو لیٹ پہنچانے پر اس کے سکریٹری کی ڈانٹ پی کر اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکیں گے کہ ایک بھینس بالکل میرے موٹر کے سامنے کھڑی ہوئی یہ کر رہی تھی، اس وجہ سے دیر ہوگئی۔ اب اگر اس موقع پر گھبرایا ہوا چرواہا آپ کے شور اور گالیوں کے اثر سے اس بیچ سڑک پر استنجا کرنے والی بھینس کو لٹھ کے ذریعے جلد ہٹا دینے کی کوشش کرے گا تو یہ کچھ ایسی بے ترتیبی سے چلے گی کہ جدھر سے آپ موٹر

نکالنا چاہیں گے یہ خواہ مخواہ اسی رُخ پر آ جائے گی اور آپ کمبخت وغیرہ کہہ کر پھر موٹر روک لیں گے اور جو خدانخواستہ کسی سڑک پر بھینسوں کی تعداد چالیس پچاس کے قریب نظر آ جائے تو اس وقت تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ اچھے اچھے پولٹیکل ایجنٹ، رزیڈنٹ، کلکٹر، کمشنر اور لیفٹنٹ گورنر تک اپنے اپنے موٹر الٹے کر کے کسی دوسری سڑک سے تشریف لے جاتے ہیں مگر مارے تاؤ کے بھینسوں کے جلوس کو توڑ کر گزر جانے کی ہمت نہیں کرتے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ جتنے قدم بھینس چلتی ہے اتنے ہی قدم صاحب بہادر کا موٹر بھی چل سکتا ہے۔ ایسے موقع پر دیہات کے چرواہوں کی وحشت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ یعنی وہ انگریزوں کی دو سو برس کی رعایا ہونے پر بھی شہری حالات سے اس درجہ بےخبر رہتا ہے کہ جہاں اس نے اپنی بھینسوں کے پیچھے موٹر کی آواز سنی اور اس کے حواس خراب ہوئے۔ اب وہ پہلے تو بھینسوں کو اِدھر اُدھر بھگائے گا لیکن جہاں آپ کی موٹر اس کے قریب پہنچی وہ بھینسوں کو آپ کے موٹر کے بالکل سامنے چھوڑ خود سڑک کے کنارے پر جا کھڑا ہوگا۔ اس خوف سے کہ کہیں آپ کا موٹر اس پر نہ چڑھ جائے گویا وہ موٹر کو آج تک ایسی چیز سمجھتا ہے جو شہر والوں پر نہیں مگر چرواہوں پر چڑھے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ایک حرکت اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ اگر آپ کے مکان کے پاس والے مکان میں کوئی بھینس ہے تو اب مان لیجیے کہ آپ کا دماغی سکون اس بھینس کے رحم پر موقوف ہے کیونکہ جہاں آپ صبح کے وقت رات بھر کی ڈیوٹی یا کسی مصروفیت سے تھک کر گہری نیند سوئے کہ اس نے کوئی ایک فٹ طویل منہ کھول کر جو نہی نعرے لگانا شروع کیا تو اب آپ لاکھ کروٹیں بدلیے مگر اس کے نعروں کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوگا جب تک اسے چرواہا جنگل نہ لے جائے مگر پولیس والوں نے آج تک مداخلت بیجا بخواب بوقت صبح بہ آواز بھینس قرار نہیں دیا اس لیے آپ اپنی لاکھ روپیہ کی نیند برباد کر کے بھی بھینس کو گرفتار نہیں کرا سکتے کیونکہ بھینس کو اپنی چراگاہ یا اپنے بچے کی یاد میں اس قسم کے نعرے لگانے کا ہر وقت حق حاصل ہے۔

◆◆◆

بھینس کی اقسام

اب مذکورہ بالا حالات وحرکات سمجھ لینے کے بعد بھی اگر کسی صاحب یا ان کی صاحبہ سے بغیر بھینس پالے نہ رہا جائے تو انھیں اس جانور کی قسموں اور صفتوں کی بعض خاص خاص حالتوں سے خبردار ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ ہماری تحقیق میں اب تک بھینس کی جتنی قسمیں آئی ہیں یا جتنی قسم کی بھینسیں ہم دیکھ چکے ہیں ان میں سب سے بلند مرتبہ اور عجیب وغریب قسم کی بھینس کو سفید بھینس کہتے ہیں اور وہ جو اردو میں ایک ضرب المثل ہے کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' تو یہ ضرب المثل اصل میں اسی بھینس سے ایجاد ہوئی ہے۔ یہ بھینس دنیا میں تمام بھینسوں سے زیادہ مشہور، ممتاز، ذی عزت اور قیمتی بھینس مانی گئی ہے۔ یہ انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، آسٹریلیا، ہالینڈ، اسپین اور امریکہ میں پیدا ہوتی ہے اور گو اس کی نسل بلقان، آسٹریلیا اور ڈنمارک وغیرہ میں بھی موجود ہے مگر وہ اتنی زیادہ مشہور نہیں۔ اس کے مقابل سرخ اور پیلے رنگ کی بھینس بھی روس اور چین و جاپان میں ملتی ہے مگر یہ بھی سفید کے مقابل زیادہ قابلِ تذکرہ نہیں۔

پس یہ سفید بھینس یورپ کی اس آب و ہوا میں پیدا ہوتی ہے جو اپنے طبعی اثرات کے حساب سے نہایت درجہ خوش گوار اور معتدل ہے، اس لیے قدرتاً اس کے قویٰ نہایت قوی اور معتدل ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بھی نہایت خوبصورت، حسین اور رعب والی ہوتی ہے اور عقل و

ہمت میں تو اس کا جواب نہ ایشیا میں نہ افریقہ میں مگر بدقسمتی سے اس سرزمین کی تنگی کچھ اتنی بھی مشہور کردی گئی ہے کہ اس کے ماہوار گزارے کے لیے کوئی چراگاہ کافی نہیں، اس لیے اس کے مالکوں نے اس کی چراگاہ کے لیے افریقہ اور ایشیا کے وسیع اور شاداب علاقے تلاش کیے اور کچھ شک نہیں کہ ان علاقوں کی تلاش میں اس بھینس کے مالکوں نے ہوشر بامحنت، عقل سوز بہادری اور لاجواب عقل سے وہ کام لیا کہ بالآخر آج سارا ایشیا اور افریقہ اس کی چراگاہ بن گیا اور وہ اس لیے کہ بدقسمتی سے ایشیا اور افریقہ کے میدانوں میں زیادہ تعداد میں گدھے، خچر، اونٹ اور ہاتھی ہی چرا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان جانوروں میں عقل کم ہوتی ہے لہٰذا یہ آپس ہی میں لڑنے مرنے کے کچھ ایسے بھی عادی ہوگئے کہ اپنی چراگاہوں میں اس سفید بھینس کے آجانے کے بعد بھی آج تک اس باہمی سینگ بازی اور لات بازی سے باز نہیں اس لیے یورپ والوں نے اپنی بھینس کے لیے میدانوں پر قبضے کے جو طریقے ایجاد کیے اگر انھیں سلیقے سے کہا جائے تو ایمانداری کی بات ہوگی یعنی جب یہ لوگ ایشیا و افریقہ کے میدانوں پر قبضہ کرنے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میدانوں میں چرنے والے گدھے اور خچر بڑے لڑاکا ہیں اور آپس ہی میں گتھے رہتے ہیں اس لیے انھوں نے نہایت ہوشیاری سے انھیں مانوس کرنے کے لیے پہلے تو جھک کر سلام کرنا شروع کیا، پھر جب ان ایشیائی اونٹوں نے انھیں گردن اٹھا کر وحشت سے دیکھا تو انھوں نے بڑی ہوشیاری سے انھیں یورپ کا بنا ہوا انواع واقسام کا نہایت نظر فریب چارا دکھایا۔ اب جو ایشیا اور افریقہ کے ان وحشی اونٹوں نے اس چمکیلے چارہ کی طرف منہ بڑھایا تو انھوں نے ایک ہاتھ سے تو منہ میں چارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے ان کی گردنوں میں رسّی باندھ کر جو درختوں سے باندھا ہے تو آج تک بند ہے۔ جگالی کر رہے ہیں اور یورپ کی یہ سفید بھینس ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے ہر حصے میں نہایت شان سے چرتی پھرتی ہے اور دندناتی رہتی ہے۔ کہیں کہیں اونٹوں، ہاتھیوں اور خچروں نے ان یورپی چرواہوں پر جو حملہ کیا تو اس کی روم تھاک میں بھی ان لوگوں نے حد سے سوا بے جگری، بہادری اور عالی حوصلگی سے کام لیا اور بالآخر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا اور بزدل و بے عقل ایشیائی جانور اب کہتے ہیں کہ انھیں دھوکہ دیا گیا حالانکہ اسے دھوکہ کہنا بے ایمانی ہے انصاف نہیں۔

بہر کیف یہ بھینس نہایت قیمتی ہوتی ہے اسی لیے اسے بجز رئیسوں، بادشاہوں کے کوئی

دوسرا ایشیائی خرید نہیں سکتا۔ البتہ اب کچھ دن سے اس کی خرید کا یہ طریقہ بھی ایجاد ہوا ہے کہ آپ کے والد صاحب اگر اپنی تمام عمر کی کمائی صرف کر کے آپ کو ان علاقوں میں "تعلیم" کے نام سے بھیج دیں اور آپ وہاں پہنچ کر بجائے تعلیم کے تھیٹر، سنیما، ہوٹل اور تفریح گاہوں میں مارے پھریں اور اپنے خاندان، اپنے ملک اور اپنے مذہب کی تمام روایات اور آداب کو فروخت کر کے اگر رقم جمع کر لیں تو وہ واپسی پر ایک آدھ معمولی سی بھینس آپ کے ساتھ آسکتی ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کی آب وہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے وہ چند دن بعد آپ کو نیلام کے قابل بنا کر یورپ ہی واپس چلی جاتی ہے اور جو کبھی رہ بھی گئی تو آپ کا تمام خاندان اس لیے برباد ہو جاتا ہے کہ اس کے ناز ونعم کے لیے ہر چیز نرالی اور اچھوتی فراہم کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ اتفاق سے کسی زمانہ میں یہ بھینس ملک ترکی میں بھی گھس گئی تھی اور وہاں کے چند امراء ورؤسا نے اسے اپنے گھروں میں باندھ لیا تھا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں مارے سینگوں کے ان ترکی امراء ورؤسا کو لہولہان کر کے رکھ دیا تب مصطفیٰ کمال نام کے ایک ترک نے ان بھینسوں کا آنا جانا اپنے ہاں یک لخت بند کر دیا اور اب سنا ہے کہ ترک لوگ اپنی بھینسوں کو اپنی چراگاہوں میں آرام سے چرا رہے ہیں۔

◆◆◆

گھریلو بھینس

یہ بھینس ہندستان ہی میں پیدا ہوتی ہے، مگر زیادہ مقدار میں مہاجنوں اور دولت مندوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہ محض اپنے موٹاپے کے باعث عام بھینسوں سے چند خاص باتوں میں نمایاں ہوتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اس موٹاپے کے باعث ہی اسے بھینس کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں بلغم اور دولت کی کثرت سے پیدا ہوتی ہے اور مہاجنوں اور دولت مندوں میں بھی دو چیزیں زیادہ ہوتی ہیں۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ یہ پیدا ہوتے وقت بھینس نہیں ہوتی مگر جہاں یہ جوان ہوئی کہ اس میں بھینس پن کے آثار پیدا ہونے لگے یہاں تک کہ اگر وہ چودہ سے بیس سال تک کی عمر میں فروخت نہ کردی جائے تو اب اس کے بھینس بن جانے میں دیر نہیں ہوتی۔ بڑھاپے میں اس کے بھینس ہونے کی پہچان یہ ہے کہ باوجود بھینس ہونے کے اس کے چھوٹی سی داڑھی پیدا ہوتی ہے جو قریب سے نظر آتی ہے۔ اب عام فائدوں کے لحاظ سے تو یہ گھر والوں کے حق میں زیادہ مفید نہیں ہوگی مگر ہاں آج کل کی فیشن ایبل لڑکیوں کے حق میں یہ بے حد مفید ثابت ہوتی ہے، مگر وہ بھی غریب خاندانوں میں زیادہ مفید اور امیر خاندانوں میں کم مفید، مگر فی الجملہ مفید ہوتی ہے۔ یہ بھینس اگر کسی ''عورتانہ مجلس'' میں پہنچ جائے تو مجلس کی عورتیں تمام رسوم اور مشاغل کو چھوڑ کر صرف اسی کو

بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں اور یہ بھی نہایت غرور اور نخرہ سے بیٹھی جگالی کرتی رہتی ہے۔ بڑھاپے میں دانت نہ ہونے کے باعث اس کی جگالی کی حرکت کو دیکھ دیکھ کر محفل کی ہڑونگی قسم کی لڑکیاں قہقہے لگاتی رہتی ہیں، مگر اس کی پوپلی جگالی بند نہیں ہوتی۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس بڑھاپے پر بھی وہ گلے اور پاؤں میں گھنگرو باندھنے سے باز نہیں آتی۔ وہ عام بھینسوں کے مقابل گھاس، دانہ بھی زیادہ کھاتی ہے، اس لیے کہ موٹی ہوتی ہے۔ ایسی بھینس جب کسی سڑک پر جاتی ہوئی نظر آ جاتی ہے تو اچھے قسم کے لوگ اسے دور تک کھڑے دیکھا کرتے ہیں۔ گستاخی معاف پنجاب اور سندھ کی طرف اس قسم کی بھینسوں کی کثرت خود ملا رموزی نے دیکھی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ نہ یہ الزام ہے چونکہ مالک کی دولت مندی کے باعث اسے چارہ کی کوئی فکر اور تکلیف نہیں ہوتی اسی لیے یہ دن رات بیٹھی جگالی کرتی رہتی ہے اور بڑی ٹرٹر کرتی رہتی ہے اور اسی حرکت سے گھر کی فیشن ایبل لڑکیوں کے حق میں یہ مصیبت اور نحوست مانی گئی ہے۔ مثلاً جہاں کسی لڑکی نے پیانو یا ہارمونیم باجے سے ہاتھ لگایا اور یہ سینگ تان کر کھڑی ہوگئی۔ جہاں کسی لڑکی نے حد سے زیادہ چست اور شباب افروز پاجامہ پہنا اور یہ سینگ لے کر دوڑی جہاں کسی لڑکی نے دیسی جوتا چھوڑ کر کالا پمپ پہنا اور یہ سینگ لے کر دوڑی جہاں کسی لڑکی نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ کر کسی آوارہ مذاق سہیلی کا یہ مصرع گنگنایا کہ:

پیا گئے پردیس موئے نہیں آوت چین

یا

مر مٹیں گے غمِ ہجراں کی جو ایذا ہے یہی

کہ بس یہ سینگ لے کر کھڑی ہوئی، جہاں کسی لڑکی نے اپنے ملازم یا ملازمہ کے ذریعہ کسی ملا رموزی کو خفیہ خط روانہ کرنا چاہا اور اس نے ملازم کے ساتھ اس لڑکی کو مارے سینگوں کے لہولہان کر کے رکھ دیا۔ جہاں کسی لڑکی نے کلب جانے کا ارادہ کیا اور یہ سینگ لے کر دوڑی، جہاں کسی نے جوانی کی دہلیز میں کسی چلمن کی اوٹ بیٹھ کر آج کل کے ماسٹروں سے تعلیم کے نام سے کچھ پڑھنا شروع کیا کہ اس نے ان دونوں کو تاؤ سے گھورنا شروع کر دیا۔ جہاں کسی لڑکی نے حسن و عشق کے مضامین شائع کرنے والے ادبی نام کے رسالے میں مضامین کے ذریعہ معاملات طے کرنے

والے صفحات کو پڑھنا شروع کیا کہ اس نے اس رسالہ کو چھپا کر رکھ دیا۔ جہاں اس نے کسی لڑکی کو جھرو کے یا دریچہ سے باہر کی طرف کوئی خط یا پرچہ پھینکتا پایا اور اس نے مارے سینگوں کے اس لڑکی کا کچومر بنا ڈالا۔ جہاں اس نے کسی بہترین اور قیمتی برقعہ پوش ملانی اور استانی کو جوان لڑکی کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا اور یہ بھی پاس آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں اس نے لڑکی کو تنہا سوتا دیکھا اور یہ آ کر اس کے قریب سو گئی۔ جہاں اس نے کسی لڑکی کے کمرہ کو تصویروں، آئینوں اور مسہری سے آراستہ پایا اور اس نے سب کچھ توڑ پھینک دیا۔ جہاں اس نے کسی لڑکی کو روزانہ غسل اور لباس لونڈر اور پاؤڈر سے صاف رہتے ہوئے دیکھا اور یہ سینگ لے کر دوڑی۔ جہاں اس نے کسی بدمست سی لڑکی کو دھوپ میں اپنا سایہ دیکھ کر اور سینہ تان کر چلتا ہوا پایا اور اس نے کھانس کر اسے ہوشیار کیا کہ خبردار، اور خدا جانے یہ بھینس انگریزی عورتوں کی طرح سر کے آدھے بالوں والی لڑکیوں سے اتنی زیادہ کیوں بدکتی ہے کہ جہاں اسے کوئی پٹھے رکھے ہوئے نوجوان لڑکی نظر آئی کہ اس نے اس پر حملہ کیا۔ جہاں کسی لڑکی نے اپنی اسکولی سہیلیوں کے ہاں مہمان جانے کا خیال ظاہر کیا اور یہ سینگ لے کر دوڑی۔ جہاں اس نے کمسن بچوں کو نوجوان لڑکی کے پاس زیادہ آتے جاتے دیکھا اور اس نے مارے سینگوں کے ان لونڈوں کے گھر آنا جانا بند کیا اور لڑکیوں کے پاس خطوط نویسی کا سامان، لونڈر، پاؤڈر اور انگریزی کنگھوں اور کنگھیوں کا تو نظر آ جانا ہی اس کے لیے مصیبت ہے۔ جہاں اس نے کسی نوجوان لڑکی کو اپنے گھر کے نوجوان ملازم سے بات کرتا ہوا پایا جیسا کہ دولت مندوں کے خاندانوں میں رواج ہے کہ اس نے گویا دونوں کو پھاڑ کھایا۔ اسی لیے ایسی لڑکیوں نے بھی تنگ آ کر ملازموں سے بات چیت کا وہ وقت قرار دیا ہے جب دوپہر کا گھاس دانا کھا کر یہ بھینس اکثر سو جاتی ہے اور تھیٹر یا سینما جانے والی لڑکیوں کی فیشن ایبل والدہ کی تو یہ بھینس گویا جان کی دشمن ہے مگر اس کو کیا کہیے کہ امیر گھرانوں میں لڑکیوں کے لیے سینما اور تھیٹر جانا بھی ضروری قرار پا گیا ہے۔

غرض اس بھینس سے لڑکیاں چونکہ خصوصیت سے عذاب میں مبتلا رہتی ہیں اس لیے انھوں نے بھی دوستوں کو خطوط بھیجنے، سینما جانے، ملازم سے بات چیت کرنے، سہیلیوں سے ملاقات کرنے، باہر سے خاص خاص چیز منگانے وغیرہ کے لیے نصف شب کے بعد کا وقت مقرر کیا ہے

جب یہ بھینس بڑی ٹرٹر کرتی رہتی ہے۔ حالانکہ آج کل کے فیشن زدہ ماں باپ اپنی لڑکیوں کے حق میں اتنے سخت اس لیے نہیں ہوتے کہ وہ خود آج کل کے اسکول اور کالجوں کی دیسی اور نیم دیسی پیداوار ہیں۔ انھیں خود خبر نہیں کہ دنیا میں غلام قومیں فاتح قوموں کی نقل کر کے نہ ترقی یافتہ ہوئی ہیں نہ فاتح بلکہ اسی فاتح قوم میں جذب ہو کر فنا ہو گئی ہیں، مگر انھیں کیا خبر کہ تاریخ اقوام نے کس قسم کی قوموں کو زندہ اور عروج یافتہ قومیں کہا ہے؟ یہی راز ہے کہ آج عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سوال نے تعلیمی حیثیت سے جو ترقی کی وہ ظاہر ہے، مگر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ مشرقی عزت واخلاق کے لحاظ سے وہ کتنی عمیق تاریکی میں گر چکی ہیں اور اخلاقی و معاشرتی زندگی کس درجہ افسوسناک خطرہ میں پہنچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنا ہے تو بے پردہ عورتوں کے ان مقدمات کی اطلاعات پڑھیے جو اغوا، فرار، خودکشی اور دوسرے ذلیل حالات وحوادث کے متعلق روزانہ اخبارات میں سرکاری حیثیت سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ غرض یہ بھینس اس قسم کی لڑکیوں کے حق میں جہاں قوی حیا وتہذیب کے لحاظ سے مفید ہے وہاں ان لڑکیوں کے اسکولی جذبات کے لیے بے حد مضر اور غیر مفید ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر خاندانوں میں اس بھینس کے مقابلہ میں لڑکیوں نے اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے بھی سینکڑوں ترکیبیں ایجاد کر لیں ہیں اور ان ترکیبوں کی ایجاد میں انھیں اس وجہ سے زیادہ آسانی ہے کہ اس زمانے کے باپ اور بھائی بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں ورنہ بتائیے کہ یہ حسن وعشق والے ماہوار رسالے اور ریشم کے موزے اور قمیصیں ان لڑکیوں کو کون خرید کر دیتا ہے اور ہاں کہیں کہیں یہ بھینس خود بھی لڑکیوں کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جس کو زمانے کا عقل سلب کرنے والا اثر کہیے۔ الحمدللہ کہ غریب گھرانے اپنی تنگ دستی کے باعث اس بھینس کو نہیں خرید سکتے۔

◆◆◆

کالی بھینس

اس بھینس کے پالنے والے، چرانے والے اور خریدنے والے چونکہ خود نہایت درجہ جاہل، تاریک دماغ، پرانے زمانے والے بھونڈے، گندے، میلے اور دنیا کی ہر تبدیلی سے بے خبر ہوتے ہیں اس لیے اس بھینس کی ابتدائی پرورش بھی نہایت بھونڈی، میلی، غلط بلکہ کچھ ہوتی ہی نہیں اور یہ بے چاری صرف قدرتی گھاس کھا کر زندہ رہتی ہے یعنی اسے دانا نہیں ملتا، اسی لیے اس میں چرنے، دودھ دینے، جگالی کرنے، نئے مالکوں کے گھر والوں سے مانوس ہونے حتیٰ کہ اپنے جسم تک کو اپنی غلاظت سے محفوظ رکھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسے فروخت کرتے وقت خریدار کو نہیں دکھایا جاتا بلکہ بعض خریدار اپنے گھر کے بزرگ قسم کے بوڑھوں اور بوڑھیوں کے ذریعہ اس کی قیمت کا معاملہ طے کرتے ہیں، مگر خریدار کے بزرگ چونکہ خود تاریک خیال، کوڑھ مغز اور بے حس ہوتے ہیں اور بھینس کی قسم، اس کی جنس، اس کی سیرت اور صورت کو خریدار کی مرضی کے موافق جانچنے کا ان کے اندر کوئی سلیقہ نہیں ہوتا اس لیے اکثر اوقات یہ بھینس ایسے ہی ''جہنمی بزرگوں'' کے صدقے اور فیض سے خریدار کے سر سے باندھ دی جاتی ہے۔ اس کی خرید و فروخت کے معاملات میں نہایت ہی قدیم اور جاہلانہ قاعدے برتے جاتے ہیں اور بڑی بھاری قیمت کے ساتھ اس کا معاملہ طے پاتا ہے۔ اس کی خرید کے معاملات کو حسب قانون ''خرید بھینس'' کی جگہ

لکھانا پڑتا ہے تب جاکر یہ بھینس پریشان خریدار کے گھر میں آتی ہے۔اب جس دن سے کہ یہ بھینس خریدار کے گھر میں پہنچتی ہے اس دن سے لے کر وہ تمام کافروں کے جہنم میں جانے والے دن تک یہ اس خریدار کے گھر والوں کے حق میں مصیبت بنی رہتی ہے۔اس کے داخل ہونے سے نئے خاندان کی مسرت، خوشی، راحت، زندہ دلی اور دولت مندی ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی ہے کیونکہ یہ مزاج کی اس قدر غبی، کند ذہن، بے حس، بے عقل، بے وقوف، بے تمیز، بھونڈی، سست، کاہل، مجہول، نامعقول اور الو ہوتی ہے کہ اسے جو بھی دیکھتا ہے فوراً ہی رونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ سے سب سے پہلے خریدار کی ماں روتی ہے اور خریدار کی بھینس تو دن رات اس کی حماقتوں کے باعث اپنا سر پھوڑتی رہتی ہیں، کیونکہ یہ بھینس اس قدر بے کار اور بے وقوف ہونے پر غصے اور نخرہ میں تمام دنیا سے آگے رہنے کی عادی ہوتی ہے، اس لیے گھر میں جو بھی اس کے پاس گیا یہ اسی کو مارے سینگوں اور لاتوں کے زخمی کرنے کی کوشش کرتی ہے اور چونکہ خریدار دن بھر نوکری پر رہتا ہے، ادھر کوئی چرواہا اسے چرانے نہیں لے جاتا اس لیے یہ تمام دن اور تمام رات گھر والوں کے حق میں مصیبت بنی جگالی کرتی رہتی ہے۔اب اسے گھاس دانا دینے کا کام یا خریدار کی ماں کے سپرد ہوتا ہے یا خریدار کی بھینس کے۔لہٰذا ان دونوں کو یہ بھینس دن میں ایک آدھ سینگ ایسا ضرور رسید کر دیتی ہے کہ جہاں شام کو خریدار گھر میں آیا اور اس کی ماں بہنوں نے اسے اپنے اپنے زخم دکھا کر بھینس کی شکایتیں اور شرارتیں سنانا شروع کیا۔اسی لیے اس قسم کی بھینس رات کے وقت زیادہ مار کھاتی ہوئی ملتی ہے۔چنانچہ جہاں خریدار کی والدہ نے کہا کہ:

بیٹا! آج تیری بھینس نے مجھے، کہ بس نوکری کی مصیبت کا مارا ہوا خریدار تاؤ کھائے اٹھا اور بھینس کو گھونسوں، طمانچوں، لات، بید، ڈنڈے اور جوتے سے مار کر رکھ دیا۔اب ادھر تو خریدار اسے مار رہا ہے اور اُدھر پڑوس کے گھروں میں ہماری آپ کی عورتیں اس طرح مذاکرہ اور گفتگو فرما رہی ہیں۔

ذرا ٹھہرنا، اسے سنو تو کم بختو۔

ہاں ہاں وہ پھر مار کھا رہی ہے آج کمبخت۔

اچھا نصیب پھوٹا ہے اس بے چارے ملا رموزی کا۔

کیا آپا آج پھر مار رہے ہیں ملا رموزی صاحب اپنی بھینس کو؟

ارے ننھے ذرا چپ تو رہو خدا کے لیے۔

ہائے ہائے وہ تو لکڑی ہی سے مار رہے ہیں آپا۔

اونہہ وہ دیکھو۔

اوئی بیوی کس غضب کی بے غیرت ہے یہ بھینس۔

نہیں چچی بی آپ کو کیا خبر کہ وہ کتنی بدمعاش اور شریر ہے۔

آپ دیکھیے نا کہ وہ غریب ملا رموزی دن بھر تو مارا پھرے لوگوں کی خوشامد اور روزی کمانے میں اور بے چارہ اس وقت آئے تو بھی اس بدذات کی وجہ سے اسے خون پینا پڑے۔

جی کمائی میں مغز نہیں کھپاتا ہے تو اسے کسی نے جاگیر دے رکھی ہے۔

بس رہنے دیجیے چچی بی آپ کی قوم کو۔

وہ غریب کی ایک کتاب ''عورت ذات'' ساڑھے تین روپیہ میں خریدی نہ گئی اس قوم سے اور اُلٹی سینکڑوں جلدیں یاروں نے اس غریب سے مفت ہدیہ وصول کرلیں اور کیا کہوں بہن کیسے کیسے دولت والوں نے ملا رموزی کی کتاب ''عورت ذات'' اس غریب سے مفت ہتھیائی ہے کہ مجھے عورت ہوکر شرم آتی ہے، مگر انھیں مرد ہوکر شرم نہ آئی۔

مگر دیکھنا چچی وہ بھی اپنے نام کا ملا رموزی ہے۔ چنانچہ کل ہی ان کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ اب وہ ایسے تمام ہدیہ وصول کرنے والوں کا بھانڈا ''عورت ذات'' کی دوسری جلد میں پھوڑیں گے تب دنیا کو پتہ چلے گا کہ زبانِ اردو اور ملا رموزی کے کیسے کیسے قدرداں کہاں کہاں زندہ ہیں اور بخارتک میں مبتلا نہیں ہوتے۔

اے چچی وہ ایک فوجی افسر تو کمبخت پوری چھ جلدوں کے دام وصول کرکے کھا گیا مگر اسے غیرت کا پسینہ بھی نہ آیا اور کمینے کو افسر بنا پھرتا ہے فوج کا۔

اونہہ وہ پھر مارا جوتا۔

ارے ننھے ذرا چوری سے تو دیکھ آ کہ یہ آج ملا رموزی صاحب اپنی بھینس کو اتنا کیوں مار رہے ہیں؟

ارے آپا، گندی ہے گندی۔

کھاتی تو ہے دس من اور دودھ کے نام بوند نہیں۔

وہ تو غضب کے صبر کرنے والے ہیں ملا رموزی صاحب بھی آپا، جو اس کمبخت پھوہڑ اور بے سلیقہ بھینس کو اب تک باندھے ہوئے ہیں ورنہ یہ آج کل کے بی۔اے پاس قسم کے غیرت دار ہوتے تو اسے کبھی کا نکال باہر کر چکے ہوتے۔

اللہ اکبر غضب کی بے غیرت ہے بہن۔

بس ہے کیا دن بھر پڑی کھاتی ہے اور ملا صاحب کی والدہ غریب کا دن رات کا آرام اور سکون برباد کرتی رہتی ہے اپنی حماقتوں سے۔ چل تو تو چپ رہ پٹا خو کہیں کی۔ ہزار بار تجھ سے کہا کہ تو ہے ابھی لونڈیا تو ہم لوگوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کر، بس تو یہی تعلیم دی جاتی ہے تجھے اسکول میں اور اس پر وہ والد صاحب ہیں کہ بیٹی پر اس لیے قربان ہوئے جاتے ہیں کہ اسکول میں پڑھتی ہے بس خدا تو میری اولاد کو ان اسکولوں سے محفوظ رکھنا۔

الغرض اس بھینس کی ہر حرکت میں بے ہودگی، بے تمیزی، ہڑدنگا پن، سرکشی، بے ہنری اور بے دقوفی کوٹ کر بھری ہوتی ہے جو عمر بھر خریدار کی زندگی کو برباد کرتی رہتی ہے۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے بے مرضی خریداری کا۔

اب اس پر خدانخواستہ اس بھینس سے ایک آدھ بچہ بھی پیدا ہو جائے تب تو سمجھ لیجیے کہ اب نہ یہ دین کی رہی نہ دنیا کی۔ بس اب وہ ہے اور دن رات اس کا بچہ ہے۔ اس بچہ کے پیدا ہوتے ہی اول تو اس بھینس کے مزاج میں حد سے سوا نخرہ، غرور اور اکڑفوں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس بچے کے پیدا ہونے سے دنیا کی غلاظتیں اس بھینس کے پاس جمع رہتی ہیں کیونکہ پہلے خود اپنا ہی گوبر سنبھالنا اس کے لیے مصیبت کا کام بنا ہوا تھا۔ اب جو ایک ساتھ دو گوبر جمع ہو گئے تو بس اب یہ ہے اور گوبر۔ اب جو اس کے پاس سے بھی گزر جائے تو مارے میونسپلٹی کے دماغ خراب ہو جائے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ یہ بھینس چاہتی ہے کہ ساری دنیا اس کے غلیظ بچے سے محبت بھی کرے اور اس کی تعریف بھی، مگر لطف یہ کہ بچے کے ساتھ اس کا لاڈ پیار بس چند دن ہی کی بات سمجھو۔ جہاں بچہ سال سوا سال کا ہوا کہ اب اس کی محبت تو رفو چکر۔ اب پھر یہ ہے اور اس کی کاہلی اور بے خبری۔ اب بچہ ہے کہ دودھ کے لیے تڑپ رہا ہے اور یہ جس حال سے گھاس کھا رہی ہے،

اب اس میں اتنی مستعدی کہاں کہ یہ خود بھی گھاس کھاتی رہے اور بچے کو دودھ بھی پلاتی رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس بھینس کے ساتھ اس بچے کا سنبھالنا اور پالنا بھی خریدار کی ماں بہنوں کے ذمہ خود بخود عائد ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ نہایت بے حسی کے ساتھ پڑی جگالی کرتی رہتی ہے۔ اس قسم کے اکثر بچے اپنی بھینس، ماں کے بھونڈے پن کا نمونہ ہوا کرتے ہیں جیسا کہ یہ بھونڈی بھینس خود اپنی بھونڈی ماں کا نمونہ ہوتی ہے۔ خصوصاً رات کے وقت اس بچے کے حق میں یہ بھینس خاصی کوتوالی اور حوالات ہوتی ہے کہ جہاں حوالات میں کسی سوتے ہوئے قیدی کے پاؤں کی بیڑی کی آواز پیدا ہوئی کہ صبح سویرے ہی اس خطا پر ایک درجن بید سے قیدی کا دل خوش کر دیا گیا۔ اسی طرح یہ بھینس رات کو جب سو جاتی ہے تو بچہ ہے کہ دودھ کے لیے چلا چلا کر گھر بھر کی نیند حرام کر رہا ہے، مگر اسے ہوش نہیں کہ میری بغل میں یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ جب خریدار اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے بلغم اور بے حسی سے پھولے ہوئے منہ پر ایک آدھ جوتا یا طمانچہ رسید کر کے کہے گا کہ اندھی اٹھ اس بچے کو دودھ پلا تب یہ اپنی خوفناک سی آنکھیں کھول کر کچھ اول فول بکے گی اور بس بچہ کو دودھ اس طرح پلائے گی کہ اس کی طرف کروٹ لیتے لیتے ہی نیند میں ڈوب جائے گی۔ خریدار پھر آدھے بستر سے واپس آ کر ایک آدھ طمانچہ رسید کرے گا تو اول تو یہ خریدار ہی پر سینگ لے کر دوڑے گی یا جو بچے کو دودھ پلائے گی تو اس طرح کہ چند منٹ بعد ہی بچہ تو نیچے اور یہ بچے کے اوپر۔ اب پھر رات کے دو تین بجے اس گھر میں یوں شور پیدا ہوگا:

ارے ہائے رے آپا وہ مار ڈالا اس نے بچے کو۔

دوڑنا خدا کے لیے بس اس نے پاؤں رکھ دیا ہوگا اس معصوم پر ذرا آپ سنبھالنا اسے۔

دیکھیے اماں بی اس لیے اس بھینس کو خریدنے سے گھبراتا تھا اور آپ کو منع کرتا تھا۔ مگر بیٹا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ کمبخت اتنی بھی بے کار ثابت ہوگی۔

بے شک تم دوسری خرید دو ورنہ کیا اس بے ہودہ کے ساتھ اپنی تمام عمر برباد کرو گے۔ اب ان حالات سے بے بس اور تنگ ہو کر خریدار اسے روزانہ مارتا ہے، ٹھونکتا ہے، کوٹتا ہے تو اس مار سے بھینس کے سابق مالک خفا ہوتے ہیں اور اگر یہ خفا نہیں ہوتے تو ایک دن مار سے تنگ آ کر یہ بھینس خود اپنے سابق مالکوں کے گھر بھاگ جاتی ہے اور سابق مالک نئے خریدار کی اس زیادتی پر

عدالت میں مقدمہ دائر کر دیتے ہیں اور ایک دن نئے خریدار کی خدمت میں عدالت سے اس قسم کا سمن وصول ہوتا ہے کہ:

ہرگاہ کہ اس کالی بھینس کے خریدار ہونے کی حیثیت سے تمہارے خلاف مسٹی گنگا پرشاد ولد رام پرشاد قوم پروار اگروال ساکن محلہ فاضل گنج، قصبہ رتنا، تحصیل گنوار پور ضلع نواب پور بوکالت منشی بدری پرشاد صاحب بی۔اے، ایل۔ ایل بی ایک مقدمہ اس عنوان سے ہمارے اجلاس پر دائر کیا ہے کہ جس کالی بھینس کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کر کے تمھیں بعوض مبلغ 50 روپے فروخت کیا تھا تم نے بڑی بے رحمی سے اسے زدوکوب کیا جس کے اثرات اس کی پسلی نمبر دس پر موجود ہیں اور جس کی تصدیق سرٹیفکیٹ نوشتہ ڈاکٹر سر محمد اقبال شکوہ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح تم نے ہمیشہ اسے نہایت قلیل مقدار میں گھاس، دانہ دیا ہے۔ خصوصاً جب سے کہ وہ اپنے سابق مالک کے گھر آئی ہے تم نے اس کے گھاس دانا کی طرف سے بالکل بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ درآنحالیکہ اس کے ساتھ دو تین بچے بھی ہیں نیز عدالت کے سامنے اس قسم کے حالات بھی لائے گئے ہیں کہ تم نے اس کے سب سے بڑے بچے کو روک لیا ہے اور اس بچے کو اس کی ماں تک نہیں جانے دیتے جس سے وہ ہر وقت رنجیدہ رہتی ہے اور اس رنج و غم سے اس کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ لہٰذا حسب دفعہ 94 قانون ساز وایکٹ مجریہ 1931 منظور شدہ گورنر بہ اجلاس کونسل صفحہ نمبر 70 ضمن (ج) حرف (ب) جسے منسوخ کرانے کے لیے جمعیۃ العلماء نے بہت زور شور سے اعلان کیا تھا...... تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تم بوقت نواخت بارہ بجے کہ جس وقت دولت مند مسلمان کھانا کھا کر یوں قیلولہ فرماتے ہیں کہ ظہر کی نماز تک قضا ہو جاتی ہے مگر انھیں اس خدائی نافرمانی سے شرم نہیں آتی اور پھر بھی خود کو مسلمان کہتے پھرتے ہیں، حاضر عدالت ہو کر خواہ اصالتاً خواہ وکالتاً جواب دو کہ اس کے لیے تمہارے پاس صفائی میں کیا ثبوت ہے؟

دستخط حاکم عدالت بخط انگریزی

سمن کی ساری عبارت بخط اردو"

اب جو اس مقدمہ کی پیشی ہوئی تو اس طرح کہ عدالت کے احاطہ میں آپ کی کالی بھینس بھی کھڑی ہے اور اس کے بچے بھی۔ دو چار گواہ بھینس کی طرف سے بھی حاضر ہیں اور آپ کی جانب سے بھی اِدھر اسی احاطۂ عدالت میں جو شریف آدمی داخل ہوتا ہے وہ آپ کو اور آپ کی کالی بھینس کو یوں مقدمہ بنا ہوا دیکھ کر آپ سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ:

لاحول ولاقوۃ! اماں شرم نہیں آتی تم کو کہیں شریفوں کی بھینسوں کے جھگڑے بھی عدالتوں میں آیا کرتے ہیں۔

استغفر اللہ کیا خاندان کو عزت دلائی ہے آپ نے، اس حرکت سے تو بھئی پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا اس بات کو کہ یہ بھینس اور اس کے مالک کیسے ہیں۔

تو اب جو خرید چکے ہیں تو پھر اسے عمر بھر رکھنا آپ کا شریفانہ فرض ہے۔

اِدھر سے آپ کے جوابات یہ ہیں کہ:

جی نہیں وہ زمانہ گیا جب انسان رسم و رواج کی بندشوں میں جکڑ کر برباد ہوتے رہتے تھے اور یہ اسی تاریک زمانے کی تعلیم ہے کہ اگر خریدنے کے بعد بھینس مرضی کے موافق نہیں ہے تب بھی اسے باندھے رہیے اور اپنی کمائی اس پر برباد کرتے رہیے۔

میں ہوں جناب اس روشن زمانے کی پیدائش، لہٰذا جب ایک چیز میری مرضی ہی کی نہیں تو میں اس پر اپنا وقت اپنا دماغ اور اپنا مصیبت سے کمایا ہوا روپیہ کیوں برباد کروں۔

اب جو پیشی کا وقت آیا تو ہر ایک شخص ہے کہ آپ کے اور آپ کی بھینس کے جھگڑے کے حالات کو سننے اور لطف لینے کے لیے موجود ہے اور آپ ہیں کہ ان لوگوں کو دیکھ کر اور اپنی رسوائی کے خیال سے مارے تاؤ کے گھن چکر بنے کھڑے ہیں کہ یکا یک آواز آئی۔

مُلا رموزی مدعا علیہ حاضر ہے۔

اب جو آپ حاکم عدالت کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے تو مارے خوف اور دہشت کے برا حال کہ یکا یک آپ سے سوال ہوا کہ بتائیے کہ:

کیا آپ ہی اس کالی بھینس کے خریدار ہیں جو عدالت کے احاطے میں مع اپنے بچوں کے ڈولی میں بیٹھی ہے نہ تو بہ احاطے میں بندھی ہوئی ہے؟

عدالت میں مقدمہ دائر کر دیتے ہیں اور ایک دن نئے خریدار کی خدمت میں عدالت سے اس قسم کا سمن وصول ہوتا ہے کہ:

ہر گاہ کہ اس کالی بھینس کے خریدار ہونے کی حیثیت سے تمھارے خلاف مسٹی گنگا پرشاد ولد رام پرشاد قوم پروار اگروال ساکن محلہ فاضل گنج، قصبہ رتنا، تحصیل گنوار پور ضلع نواب پور بوکالت منشی بدری پرشاد صاحب بی۔اے، ایل۔ایل بی ایک مقدمہ اس عنوان سے ہمارے اجلاس پر دائر کیا ہے کہ جس کالی بھینس کو اس نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کر کے تمھیں بعوض مبلغ 50 روپے فروخت کیا تھا تم نے بڑی بے رحمی سے اسے زدوکوب کیا جس کے اثرات اس کی پسلی نمبر دس پر موجود ہیں اور جس کی تصدیق سرٹیفکیٹ نوشتہ ڈاکٹر سر محمد اقبال شکوہ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح تم نے ہمیشہ اسے نہایت قلیل مقدار میں گھاس، دانہ دیا ہے۔ خصوصاً جب سے کہ وہ اپنے سابق مالک کے گھر آئی ہے تم نے اس کے گھاس دانا کی طرف سے بالکل بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ درآنحالیکہ اس کے ساتھ دو تین بچے بھی ہیں نیز عدالت کے سامنے اس قسم کے حالات بھی لائے گئے ہیں کہ تم نے اس کے سب سے بڑے بچے کو روک لیا ہے اور اس بچے کو اس کی ماں تک نہیں جانے دیتے جس سے وہ ہر وقت رنجیدہ رہتی ہے اور اس رنج و غم سے اس کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ لہٰذا حسب دفعہ 94 قانون سازوا یکٹ مجریہ 1931 منظور شدہ گورنر بہ اجلاس کونسل صفحہ نمبر 70 ضمن (ج) حرف (ب) جسے منسوخ کرانے کے لیے جمعیۃ العلماء نے بہت زور شور سے اعلان کیا تھا.....تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تم بوقت نواخت بارہ بجے کہ جس وقت دولت مند مسلمان کھانا کھا کر یوں قیلولہ فرماتے ہیں کہ ظہر کی نماز تک قضا ہو جاتی ہے مگر انھیں اس خدائی نافرمانی سے شرم نہیں آتی اور پھر بھی خود کو مسلمان کہتے پھرتے ہیں، حاضر عدالت ہو کر خواہ اصالتاً خواہ وکالتاً جواب دو کہ اس کے لیے تمھارے پاس صفائی میں کیا ثبوت ہے؟

دستخط حاکم عدالت بخط انگریزی

سمن کی ساری عبارت بخط اردو''

اب جو اس مقدمہ کی پیشی ہوئی تو اس طرح کہ عدالت کے احاطہ میں آپ کی کالی بھینس بھی کھڑی ہے اور اس کے بچے بھی۔ دو چار گواہ بھینس کی طرف سے بھی حاضر ہیں اور آپ کی جانب سے بھی اِدھر اسی احاطۂ عدالت میں جو شریف آدمی داخل ہوتا ہے وہ آپ کو اور آپ کی کالی بھینس کو یوں مقدمہ بنا ہوا دیکھ کر آپ سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ:

لاحول ولا قوۃ! اماں شرم نہیں آتی تم کو کہیں شریفوں کی بھینسوں کے جھگڑے بھی عدالتوں میں آیا کرتے ہیں۔

استغفر اللہ کیا خاندان کو عزت دلائی ہے آپ نے، اس حرکت سے تو بھئی پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا اس بات کو کہ یہ بھینس اور اس کے مالک کیسے ہیں۔

تو اب جو خرید چکے ہیں تو پھر اسے عمر بھر رکھنا آپ کا شریفانہ فرض ہے۔

اِدھر سے آپ کے جوابات یہ ہیں کہ:

جی نہیں وہ زمانہ گیا جب انسان رسم ورواج کی بندشوں میں جکڑ کر برباد ہوتے رہتے تھے اور یہ اسی تاریک زمانے کی تعلیم ہے کہ اگر خریدنے کے بعد بھینس مرضی کے موافق نہیں ہے تب بھی اسے باندھے رہیے اور اپنی کمائی اس پر برباد کرتے رہیے۔

میں ہوں جناب اس روشن زمانے کی پیدائش، لہٰذا جب ایک چیز میری مرضی ہی کی نہیں تو میں اس پر اپنا وقت اپنا دماغ اور اپنا مصیبت سے کمایا ہوا روپیہ کیوں برباد کروں۔

اب جو پیشی کا وقت آیا تو ہر ایک شخص ہے کہ آپ کے اور آپ کی بھینس کے جھگڑے کے حالات کو سننے اور لطف لینے کے لیے موجود ہے اور آپ ہیں کہ ان لوگوں کو دیکھ کر اور اپنی رسوائی کے خیال سے مارے تاؤ کے گھن چکر بنے کھڑے ہیں کہ یکا یک آواز آئی۔

مُلّا رموزی مدعا علیہ حاضر ہے۔

اب جو آپ حاکم عدالت کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے تو مارے خوف اور وحشت کے برا حال کہ یکا یک آپ سے سوال ہوا کہ بتایئے کہ:

کیا آپ ہی اس کالی بھینس کے خریدار ہیں جو عدالت کے احاطے میں مع اپنے بچوں کے ڈولی میں بیٹھی ہے نہ تو یہ احاطے میں بندھی ہوئی ہے؟

اچھا تو بتائیے کہ اسے آپ نے کس وجہ سے اپنے گھر سے علاحدہ کیا۔

اچھا تو وہ اگر آپ کو اور آپ کے خاندان بھر کو سینگ مار کر ہر وقت پریشان کرتی رہتی تھی تو کیا آپ نے اس سے یا اس کے سابق مالک سے کوئی ایسا تحریری معاہدہ کیا تھا کہ آپ اسے واپس کرتے وقت اس کے بڑے بچے کو اپنے پاس رکھ لیں گے۔

کیا آپ پہلے سے نہیں جانتے تھے کہ اس بھینس کا سابق مالک ایک تاریک خیال، رسم پرست اور گندے خاندان کا رکن ہے۔ لہٰذا اس کی پرورش کی ہوئی ہر بھینس ایسی ہی تاریک اور گندہ ہوگی جیسا کہ وہ خود ہے۔

اچھا فرض کیجیے کہ اس مالک کے ہاں تاریک رسم پرستی کے باعث لڑکی کو نہ تو یہ بھینس کو قبل فروخت خریدار کو نہیں دکھایا جاتا تو پھر تم نے اپنی والدہ کو اس کے دیکھنے کے لیے کیوں مقرر کیا تھا جب کہ تمھاری کیا پرانے زمانہ کی تمام ''والدائیں'' خود کٹر رسم پرست دھری ہوئی ہیں اور انھی کے صدقہ میں آج 99 فیصدی خراب بھینس نہایت روشن خیال خریداروں کے سر باندھ دی جاتی ہیں۔

اچھا تو اب تمھیں اس کا نان نفقہ نہ تو یہ اس کے گھاس دانے کے مصارف ادا کرنے سے کیوں انکار ہے۔

ابھی یہ ہو ہی رہا تھا کہ حاکمِ عدالت کو زور سے چھینک آئی اور پیشی دو ماہ بعد کی مقرر کر دی گئی۔ اس کے بعد پھر پیشی شروع ہوئی کہ عدالت کی چائے کا وقت آ گیا اور پیشی پھر تین ماہ بعد تک ملتوی کر دی گئی، پھر پیشی شروع ہوئی کہ وکیل مدعی نے درخواست کی کہ مجھے مزید ثبوت فراہم کرنے کا موقع دیا جائے۔ لہٰذا پھر دو ماہ بعد ابھی پیشی شروع ہوئی تھی کہ خود آپ نے درخواست دی کہ مجھے بھی گواہانِ صفائی کو لانے کا موقع دیا جائے۔ غرض ایسے ہی حالات کے تحت پورے چار سال کے بعد فیصلہ ہوا کیونکہ دیوانی کے مقدمات اتنے ہی وقفے میں کبھی کبھی طے ہوا کرتے ہیں اور آج تک یہ نہیں سنا کہ کسی نے دوسری پیشی کا وقفہ مقرر کرنے اور تعین مدت کے لیے چند لازمی شرطیں مقرر کی ہوں جن کے بغیر ایک دن سے زیادہ کے لیے پیشی بڑھائی ہی نہیں جا سکتی، لہٰذا اب جو آپ چار سال کی مکمل بربادی، پریشانی، رسوائی اور مالی تباہی کے بعد پہنچے تو حاکمِ عدالت نے انگریز کی نقل کرتے ہوئے سر سے ٹوپی اتار کر فیصلہ سنایا کہ:

آج مثل مقدمہ مساۃ بھینس بنت گنگا پرشاد قوم اگروال بنام رام سروپ ولد سورج پرشاد، ساکن موضع آگرہ، علاقہ اودھ تحصیل دہلی قوم اگروال پیشہ تجارت بابت دلا پانے زرخرچہ گھاس دانا و دلا پانے زرخرچہ مبلغ 25 روپے ہمارے اجلاس پر پیش ہوا، جس میں مدعی کی جانب سے منشی بدری پرشاد بی۔اے، ایل۔ایل۔بی اور مدعا علیہ کی جانب سے ضیاء الملک ملا رموزی، فاضل الٰہیات مشہور ادیب وکیل تھے۔

واقعات مقدمہ یہ ہیں کہ تاریخ 4 رنومبر 1931 کو مسمّی گنگا پرشاد نے ایک راس بھینس رام سروپ مدعا علیہ کے ہاتھ فروخت کی اور اس بیع کے وقت فریقین کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں مالک اخبار ''زمیندار'' لاہور، گاندھی جی ایڈیٹر ''ینگ انڈیا'' احمد آباد گجرات اور پنڈت جواہر لال نہرو سابق صدر کانگریس جو گاندھی جی کے لندن جانے کے بعد سارے ہندستان میں ہوحق کرتے پھرے.......... بطور گواہ موجود تھے۔ جیسا کہ ان چاروں کے بیانات منسلکہ مثل سے ثابت ہے۔ مدعی کا بیان ہے کہ اس نے مدعا علیہ سے ایسی کوئی شرط طے نہ کی تھی کہ اگر یہ بھینس مدعا علیہ کے گھر پہنچ کر اس کی مرضی کے موافق ثابت نہ ہوگی تو وہ ان سے بے چوں چرا واپس لے لیگا۔ اس کے جواب اور ثبوت کے لیے جب مدعا علیہ کے نام سمن جاری کیا گیا تو اس وقت وہ ایک خفیہ اشارہ پر ہندستانیوں کو باہم لڑا دینے کے لیے بیرون شہر گیا ہوا تھا کیونکہ اکثر اوقات اقتدار کے خوف سے ایسے لوگوں کو مخبری کرنا پڑتا ہے جو دل سے مخبری کو ذلیل کام سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ بھی مخبر بنے ہوئے نظر آئیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ اقتدار کی طرف سے مجبور کیے گئے ہیں اور اسی کو ''لاٹھی اور بھینس'' کہتے ہیں، اس لیے سمن کی تعمیل نہ ہو سکی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ عدالت مدعا علیہ کے خلاف یکطرفہ کارروائی کرے کہ عدالت کے پاس ایک خفیہ خط آیا جس میں بطور راز لکھا ہوا تھا کہ خبردار مدعا علیہ ہمارا خاص آدمی ہے اس لیے اس کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کی جائے۔ لہٰذا سمن دوبارہ جاری کیا گیا۔ الغرض کوئی سوا تین ماہ کے بعد مدعا علیہ کی جانب سے ضیاء الملک ملا رموزی صاحب وکیل درجہ اول ہائی کورٹ نے جواب دعویٰ پیش کیا ہے جس کے بعد ہی گواہان صفائی طلب کیے گئے۔

لہٰذا یکم دسمبر 1931 کی پیشی پر گواہان صفائی میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری،

مولانا حفیظ جالندھری اور مولانا ظفر علی خاں صاحب مالک اخبار ''زمیندار'' پیش ہوئے۔ ہر سہ گواہوں نے بہ اقرار صالح بیان کیا کہ ہاں ہم اس بھینس کے خریدار سے اس وقت سے واقف ہیں جب اس نے جنگ بلقان میں ترکوں کی حمایت میں قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ اس پر وکیل مدعی نے مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری پر جرح کی اب مسلمانان ہند، ترکوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف یورپ والوں نے نہایت غلط اطلاعات شائع کی ہیں جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ مسلمانانِ ہند اول تو ویسے ہی 99 فیصدی جاہل ہیں اور جو تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں وہ اصل میں تعلیم یافتہ نہیں بلکہ صرف ''انگریزی یافتہ'' ہیں ورنہ ایک صحیح تعلیم یافتہ کبھی اپنے ملک اور قوم کے لباس، رسوم، زبان اور تمدن کو ترک نہیں کرتا بلکہ جتنا وہ بلند ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ اپنے ملک وقوم کی چیزوں سے محبت کرتا ہے جیسا کہ گاندھی، مالوی اور نہرو کے لباس سے ثابت ہے۔ جو بادشاہ انگلستان تک کے محل میں دھوتی باندھے گھس گئے مگر ان کی عزت میں فرق نہ آیا۔ لیکن جس مسلمان کو دیکھیے وہ انگریزوں کی ٹوپی، کوٹ، پتلون اور ان کی زبان کے استعمال کو اپنے خاندان بھر کی روشن خیالی سمجھتا ہے، اس لیے اگر غلط تربیت کے اثر سے یہ غلام مسلمان ترکوں سے نفرت کرتے ہیں تو اس میں بھینس کے خریدار کی کیا خطا ہے۔

پھر بہ سوال جرح کہا کہ بالشویک مظالم کی اطلاعات کو جو اردو کے اخبارات بے تامل شائع کرتے ہیں یا دہلی میں بخارا کے جو باشندے بالشویک مظالم رو رو کر بیان کرتے ہیں ان کی اشاعت میں انھیں حد سے سوا غور وفکر کی ضرورت ہے مگر ان اخباروں کے معمولی ایڈیٹروں کے بس کی بات نہیں کہ وہ سیاست کے ان اہم رموز کی تہہ تک پہنچ سکیں کہ ایسی اطلاعات کا مقصد کیا ہوا کرتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ اس بھینس کی خرید کے وقت میں موجود تھا اور میں اس کے خریدار کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ میرے ساتھ کشمیر گیا تھا اور وہاں سے وہ اس لیے واپس آیا تھا کہ وہ ہندو بھائیوں سے کہہ دے کہ آپ کی یہ دلیل دلیل نہیں بلکہ کھلا ہوا انتقام یا مسلمانوں کے کاموں کی نقالی ہے کہ اب وہ بھی کشمیر کی طرح اسلامی ریاستوں میں جتھے لے کر جائیں گے۔

مولانا حفیظ جالندھری نے بیان کیا کہ میں اس بھینس کی خرید کے وقت موجود تھا اور

میرے سامنے سابق مالک نے یہ ہرگز نہیں بتایا تھا کہ میری بھینس کے اندراتنی خرابیاں ہیں۔ یہ سوال جرح کہا کہ وہ شاعرقوم کے حق مصیبت ہیں جوغم والم اورفریادوزاری سے بھرے ہوئے شعر کہتے ہیں۔

مدعی کی جانب سے خواجہ حسن نظامی صاحب نے فرمایا کہ میں نہ فقط مدعی بلکہ اس بھینس سے اس وقت سے واقف ہوں جب یہ ایک سال کی تھی۔ بظاہر میں اس کے اندر کوئی خرابی نہیں پاتا صرف اس کی پرورش قدیم اور پرانے اصول پر ہوئی ہے اور یہ امر مسلّم ہے کہ پرانے اصول کی تربیت پائی ہوئی بھینس میں حیا، غیرت، خودداری، اپنے مالک سے صحیح صحیح وفاداری کی قوت جتنی بیدار ہوتی ہے، آج کل کی تربیت پائی ہوئی بھینسوں میں اگر یہ بات ہوتی تو ان کے ایسے بے شمار مقدمات ہی کیوں عدالتوں اور اخباروں میں جاتے؟

مدعی کے دوسرے گواہ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے فرمایا۔ میں مدعی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ میرے وعظوں میں نہایت پابندی سے آیا کرتا تھا۔ بے شبہ اس نے اپنی ہر بھینس کو ''پرانے بھینس پرور لوگوں'' کے اصول کے موافق تربیت دی ہے اور چونکہ پرانے اصول پر چلنے والوں میں اس موقع پر مولانا صاحب شدت سے کھانسی کے باعث بیان کو جاری نہ رکھ سکے ، اس لیے دوسری پیشی پر سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ پرانے اصول پر تربیت دینے والے اپنی بھینسوں کے دانے میں عشق و عاشقی کے مضامین شائع کرنے والے ماہوار رسالوں کو ملا کرنہیں کھلاتے تھے، اس لیے ان کی بھینسوں میں اپنے سابق مالک سے جو وفا ومحبت پائی جاتی ہے اسی کے اثر سے یہ بھینس اس نئے خریدار کے ہاں سے بھاگ کر سیدھی اپنے سابق مالک کے گھر میں آگئی ورنہ اس زمانہ کی بھینس ہوتی تو وہ ضرور اپنے دانے میں عشق انگیز ماہوار رسالوں کو کھا چکی ہوتی تو اس موقع پر وہ کسی بی۔ اے پاس شخص کے گھر میں گھس جاتی اور اخباروں میں یوں شائع ہوتا کہ فلاں کی 15 سال کی بھینس فلاں بی۔ اے پاس کے ساتھ فرار ہوگئی۔

کچھ شک نہیں کہ ضیاء الملک ملا رموزی صاحب وکیل مدعا علیہ نے شہادت کے سلسلہ میں جو جرح کی اس نے عدالت کی رہنمائی میں خاص امداد کی مگر عدالت کو افسوس ہے کہ ملا صاحب یہ ثابت نہ کر سکے کہ ان کے موکل نے اس بھینس کے خریدنے سے پہلے کوئی ایسا معاہدہ کیا تھا کہ اگر

یہ بھینس میری مرضی کے موافق نہ نکلی تو میں اس کو اتنا ماروں گا کہ یہ تنگ آ کر اپنے سابق مالک کے گھر چلی جائے نیز عدالت کو اس واقعہ پر افسوس ہے کہ گاندھی جی کے گول میز کانفرنس لندن میں شریک ہونے سے ان کے قائدانہ وقار اور شہرت کو اس لیے نقصان پہنچا کہ وہ اپنے تدبر سے وہاں ہندو مسلم سوال کو حل نہ کر سکے کیونکہ لیڈر کی تعریف یہ ہے کہ وہ اہم اور الجھے ہوئے مسائل کو چٹکی بجاتے ہوئے حل کر دے۔ اسی طرح مدعی نے تنقیح نمبر ایک ضلکہ مسل ہذا کا کوئی ایسا ثبوت نہ دیا جس کا یہ مطلب ہوتا کہ اس خریداری کے عرصہ میں باوصف اس کے کہ یہ بھینس شروع سے نئے خریدار کی مرضی کے بالکل خلاف تھی مگر وہ اسے برابر گھاس دانہ دیتا رہا اس لیے صرف ایک وقت کے مارنے سے یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کی خریداری کے ابتدائی مصارف اور اتنے عرصہ تک دودھ نہ دینے پر بھی اس کی جملہ خدمات کو بھلایا جائے بنا بریں حالات۔

حکم ہوا کہ

حسب دفعہ 584 تعزیرات بھینس ضابطہ دیوانی نمبری 91716 ضمن (ج) بابت 1931 مدعی بھینس کو واپس مدعا علیہ کو دے اور مدعا علیہ کو اس امر کا پابند کیا جائے کہ آئندہ اسے کوئی ایسی خفیف ضرب بھی نہ پہنچائے جسے ضرب شدید بنوانے اور لکھوانے میں اس کے سابق مالک کو ڈاکٹروں کو رشوت دینا پڑے جیسا کہ اکثر ڈاکٹر ایسے موقع پر رشوت لیا کرتے ہیں اور ضرورت مند دیا کرتے ہیں۔ خرچہ فریقین ذمہ فریقین، ضیاء الملک ملا رموزی صاحب کی اطلاع یابی لکھائی جائے اس لیے کہ ان کا مؤکل کسی کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا ہے جیسا کہ ہندو مسلم فسادات کے وقت لیڈر کہہ کر فساد والے شہر سے کسی پرامن شہر میں چلے جاتے ہیں اسی لیے بجز لالہ لاجپت رائے آنجہانی کے کسی ایک لیڈر کے آج تک کوئی ایک چوٹ نہ آئی اور نہ آئے۔

آج ہمارا یہ اردو میں لکھا ہوا فیصلہ ہمارے انگریزی دستخط اور مہر عدالت سے اس لیے نافذ ہوا کہ اردو پر انگریزی دستخط کو ہر ہندستانی اپنی لیاقت سمجھتا ہے مگر بدقسمتی سے ارباب علم و فضل کی نظر میں وہ بے علم ثابت ہوتا ہے۔ نقشہ ڈگری مرتب ہو اور گواہوں کو اپنے اپنے وطن جانے کا فرسٹ کلاس کرایہ مدعی سے دلایا جائے جیسا کہ ان کی شان سے ظاہر ہے۔

اس قسم کے مقدمے اور فیصلے کے بعد بھینس پھر خریدار کے گھر آ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ چند ماہ بعد پھر خریدار کی مار کھاتی ہے۔ خریدار اسے گھاس دانے کی تکلیف دیتا ہے یہاں تک کہ بعض گھرانوں میں ایسی بھینس ناخوش خریدار کی ایذا رسانی سے تھک کر کسی دن اپنے ہی گلے کی رسّی سے الجھ کر خود کو ہلاک کر لیتی ہے، جسے پولیس والے کہتے ہیں کہ ''پھانسی لگا کر مرگئی'' پھر خریدار صاحب ہوتے ہیں اور وہی سابقہ کوتوالی، وارنٹ، چالان، تحقیق، عدالت اور فیصلہ۔ اب یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ خریداری میں جانبین کی مرضی کا خیال نہیں کیا جاتا۔

پھر اگر بھینس اس طرح نہ مرے اور ہر حال میں موجود اور زندہ ہی رہے تو اس کا خریدار اس سے تنگ آ کر ایک ''خفیہ بھینس'' خرید لیتا ہے اور اپنی تمام کمائی اور توجہ اسی کے لیے خاص کر دیتا ہے، اس لیے پرانی بھینس کو اسی صدمہ سے ''تپ دق'' ہو جاتی ہے اور کھانستے کھانستے ایک دن ''انتقالِ پُر ملال'' بن کر رہ جاتی ہے، لہٰذا جماعت اور قوم میں کچھ عقل آ گئی ہو تو چاہیے کہ اب بے مرضی بھینس کی خریداری یک لخت بند کر دی جائے ورنہ حضور مالک ہیں۔

◆◆◆

مُلّا رموزی کی بھینس

صاحبِ شعر و سخنوری حکیم انوری نے اپنے کلام میں ایک ایسے گھوڑے کا تذکرہ کیا ہے جو اس نے اپنے کلام کے صلے میں بطور انعام پایا تھا۔ لہٰذا ایک فاضل روزگار اور شہرۂ آفاق شاعر اپنے کلام میں ایک گھوڑے کا تذکرہ چھوڑ جاتا ہے تو اگر ملا رموزی اپنی تصنیفات میں ایک بھینس کی تفصیلات چھوڑ جائے تو اسے کچھ کہنے کے عوض صرف انوری اور رموزی کے زمانے کے اس فرق کو دیکھ کر ذرا ذراشر ماجائے گا کہ انوری کا زمانہ علم و اشاعت علم کے لحاظ سے اتنا ترقی یافتہ زمانہ نہیں تھا جتنا کہ آپ کے ملا رموزی کا زمانہ ترقی یافتہ ہے یعنی انوری جو کچھ لکھتا تھا وہ صرف ایک شہر یا ایک ملک میں بھی بڑی دشواری سے تمام آبادی میں پہنچتا تھا مگر ملا رموزی جو کچھ لکھتا ہے وہ صرف چند ہفتوں میں ہندستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک بلکہ چند ماہ میں تو دنیا کے اُس سرے تک پہنچ جاتا ہے اور پہنچ سکتا ہے۔ پھر انوری جو کچھ کہتا تھا وہ علم و بلاغت یا ادب و فصاحت کے ایسے نکات و اسرار بیان کرتا تھا جنھیں صرف اربابِ علم و فضیلت ہی سمجھ سکتے تھے، مگر ملا رموزی جو کچھ لکھتا ہے اسے اصحابِ علم و حکمت سے لے کر ایک معمولی سی قابلیت کا آدمی بھی آسانی سے سمجھتا ہی نہیں بلکہ حزن و ملال اور رنج و غم سے دور ہو کر گھنٹوں خوشی کے قہقہے لگاتا ہے لیکن انوری اپنے محدود علم کے زمانے میں بھی درباریوں میں بار پاتا ہے، زر و جواہر اور گھوڑے کا مالک ہوتا

ہے لیکن آپ کے معارف گستر زمانے کا ملا رموزی اگر کسی دربار میں خود ہی گھس جائے تو سوچ لیجیے کہ یہ آپ کے پولیس والے کیسی گت بنا کر چھوڑیں۔ یہی حال درباروالوں کا ہے کہ آج تک وہ غریب جانتا ہی نہیں کہ دربار کسی صاحب حشم وشوکت تاجدار کی شاہانہ مجلس کا نام ہے یا اجمیر شریف کے عرس ہی کو دربار کہتے ہیں؟ امراء اور دولت مندوں نے یہ قدر پہچانی کہ جب ملا رموزی کی حاضری پر چائے پلا کر اپنی تصویر دے دی اور ایک صاحب نے انتساب کے بعد اس کتاب کی پانچ جلدیں خرید فرمالیں۔ واللہ برٹش گورنمنٹ بھی شرماتی ہوگی کہ میں نے بھی کس قسم کے لوگوں کی تعلیم کے لیے اربوں روپیہ برباد کردیا۔

ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ ملا رموزی کو اس کی علمی خدمات کے صلے میں بجز ان چند ادب شناس ہستیوں کے جن کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''زندگی'' میں بعنوان ''راز کی بات'' لکھا ہے اور بھی حضرات نے امداد کی ہے۔ مگر وہ ملا رموزی کی کسی ادبی اور خالص تحریری خوبی کے صلے میں نہیں بلکہ ملا رموزی کی تنگ دستی اور بدحالی کی اطلاع پا کر اور شائد اس سے زیادہ شرمناک کوئی حرکت نہ ہوگی کہ میرے ایک دوست نے عین اس وقت جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا اپنے خط مورخہ 23 اکتوبر 1931 کے ذریعہ اطلاع دی کہ تمھاری تمام تحریروں کو فلاں رئیس ابن رئیس اور امیر ابن امیر چوری سے خرید کرا کر خوب لطف لے کر پڑھا کرتے ہیں۔

یہ وہ اطلاع ہے جس پر ملا رموزی کچھ دیر تک اچھا خاصا پاگل بنا کہ افوہ یہ بے حسی کہ ایک حد سے سوا بلند مرتبہ اور ذی مقدرت آدمی ملا رموزی کی ہر تحریر پڑھتا ہے اور اس میں ملا رموزی کی تمام تکالیف کو دیکھتا ہے مگر امداد و قدر دانی کے نام یوں ساکت وخموش رہتا ہے گویا ملا رموزی کی تحریر بھی ایک طرح کا قیامت نامہ ہوا کرتی ہے جسے پڑھیے اور عذاب آخرت کے خوف سے یا رو دیجیے یا ساکت ہو کر بیٹھ جائیے۔

پس ان حالات کے تحت انوری کے انعامی گھوڑے کے مقابل ملا رموزی کی بھینس کے لیے خود سمجھ لیجیے کہ وہ اسے انعام میں ملی ہوگی یا اس نے خود خریدی ہوگی؟ پھر یہ بھی سوچ لیجیے کہ بھینس کی خرید دو صورتوں ہی میں ضروری ہوتی ہے ایک یہ کہ آپ خاصے دولت مند اور بڑے گھرانے والے ہوں، اس لیے خاندان اور چائے کی ضرورت کے لیے بھینس کا دودھ ضروری ہو

اور جو یہ نہیں تو پھر بھینس صرف اس لیے خریدی جاتی ہے کہ دودھ فروخت کریں گے اور اس کے داموں سے گزارہ کریں گے یا گزر بسر کریں گے۔ بہر حال آپ سمجھ گئے کہ ملا رموزی کے ہاں بھینس اس لیے آئی تھی کہ افسوس اور جواب بھی سمجھ میں نہ آیا ہو اور اسی کی زیادہ امید ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ ملا رموزی کی تمام تحریروں میں لطافت بیان ونفاست خیال روح وروانِ کلام ہوا کرتی ہے تو ملا رموزی پھر دنیا کے حسین سے حسین جانوروں کو چھوڑ کر بھینس ایسی کریہہ المنظر اور کریہہ الصورت ذات کو کیوں چھوڑے گا؟ اس لیے باور فرمالیجیے کہ اس جانور کے لیے ضرور کوئی خفیہ سازش عمل میں لائی گئی ہوگی جس کا پتہ چلانے سے آج تک کے تمام بوڑھے سی۔ آئی۔ ڈی لوگ عاجز رہے ہیں۔ یہ اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ ایک دن والدہ محترمہ مدظلہا سے اپنی "ان" کو کچھ بڑی ہی متانت اور سنجیدگی سے اس طرح گرم گفتگو پایا کہ:

"اور اماں جان اگر دودھ بچ بھی جائے گا تو "اُن" کی چائے کے کام آجایا کرے گا"۔

جی میں تو آیا تھا کہ چلا کر کہہ دیں کہ اواللہ کی بندی وہ بے چارے ملا رموزی کی چائے کا اس گھر میں ایسا کون سا انتظام واہتمام ہے جس کے لیے ایک بھینس کا بچا ہوا دودھ اُس غریب کے نام پر محسوب ومنسوب کیا جارہا ہے؟ دراں حال یہ کہ شہر بھر کے افیونی گواہ ہیں کہ وہ ایک درجۂ سوم کے ہوٹل میں روزانہ جا کر چائے پیتا ہے سو وہ بھی اس بے سروسامانی کے ساتھ گویا ملا رموزی نہیں بلکہ چائے ملا رموزی کو پیتی ہے۔ مگر وہ جو بڑے مولوی صاحب کہہ مرے ہیں کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے سو اس خوف سے اس وقت تو کچھ نہ کہا مگر بعد میں ہم نے اپنی "اُن" سے کہا:

کیوں جناب یہ موسم تو ہے "تخفیف کمیٹیوں" کا اور جناب مشورہ میں شریک ہیں بھینس خریدنے کے تو ایسی صورت میں یہ ہندستان سے لے کر لندن تک کے "تخفیف کمیٹی والوں" کو ہم بے وقوف سمجھیں یا صرف آپ کو؟

بجلی کی رفتار سے ملتی ہوئی تیزی سے بولیں کہ:

میں کیا کہہ رہی تھی بس خاموش بیٹھی ہوئی تھی وہ تو اماں جان نے جب خود ہی کہا کہ "دلہن تم بھی تو بولو تو میں نے اتنا کہہ دیا اور ویسے بھی دیکھ تو رہی ہوں خود سارے گھر کی پریشانی، اس سے

کچھ تو پیسہ ملتا رہے گا۔

ہم نے کہا اور دیکھیے کہ کس قدر عقل کے ساتھ کہا کہ:

اچھا اگر اماں جان ہی نے فرمایا تھا تو آپ کو بھینس کے معاملہ میں ملا رموزی کے نام پر بقیہ دودھ صرف کرنے کی ایسی وکالت کے اختیارات وائسرائے کے کس "خاص آرڈی ننس" کی رو سے حاصل تھے جو آپ نے مشورہ میں جان ڈال دی۔ جواب ملا کہ:

گھر میں رہتے ہیں تو سب باتوں میں شریک ہونا ہی پڑتا ہے۔ کاش آپ اس خشک جواب میں موصوفہ کے اس وقت کے لہجے اور رُخ کے تغیر کو محسوس فرما سکے ہوں؟

ہم نے کہا اور وزیرِ مال کی حیثیت سے کہا:

اچھا تو یہ بھی سوچا تھا کہ اس بھینس کے لیے روپیہ کہاں سے لائیں گے؟ جواب ملا کہ:

جس خدا نے آج تک دیا ہے وہی اس کام کے لیے بھی دے گا۔

چونکہ اس جواب میں "مذہبی جذبہ" غالب تھا اس لیے نکتہ چینی اور اعتراض نہ کر سکے حالانکہ آج کل کے بی۔ اے پاس مسلمان تو علمائے دین کے بتائے ہوئے مسلمات پر بھی اعتراض سے نہیں چوکتے اس لیے ہم نے اعتراض کا ادبی حصہ لیا اور کہا کہ:

اچھا تو یہی سوچا ہوتا کہ آپ کے نفاست مآب اور علمی و ادبی ذوق کے شوہر المعروف بہ ملا رموزی صاحب کو بھینس کی گندگی اور غلاظت سے کتنی تکلیف پہنچے گی؟ جواب ملا اور کس قدر "خانگی توہین" کرنے والا جواب ملا کہ" آپ کا گھر ایسا پہلے ہی کہاں کا محل تھا جواب خراب ہو جائے گا"۔

چونکہ قوم کی قدر ناشناسی کے باعث اس جواب میں بھی صداقت تھی اس لیے یہاں بھی اعتراض کا رُخ بدلنا پڑا اور وہ آخری خطرہ پیش کیا جس سے ہر شریف آدمی گھبراتا ہے۔ یعنی ہم نے کہا کہ: اور جس دن چرداہا "ستیہ گرہ" کر بیٹھا اس دن بتائیے کہ اس بھینس ذات کو آپ چرانے جائیں گی یا یہ آپ کی مشہور و معروف قسم کے ملا رموزی؟ اس کے جواب میں ذرا ہمارے حقیقی بھائیوں کی عزت افزائی ملاحظہ فرمائیے گا۔ ارشاد ہوا کہ "اور یہ منجھلے میاں اور چھوٹے میاں کس کام کے ہیں؟"۔

غرض ہر طرح اطمینان ہوگیا کہ اب بھینس آئے گی اور ملا رموزی ہی کے گھر میں آئے گی کیونکہ جس گھر میں ''بزرگ'' موجود ہوں اس گھر کے چھوٹے اگر افلاطون بھی ہو جائیں تو کون سنتا ہے اور ویسے بھی قابل لوگوں کو اس سفلہ پرور زمانے میں کون پوچھتا ہے، ہر جگہ بس رشوت دیجیے یا سفارش لائیے ورنہ خوشامد بغیر تو ''نائب کلرک'' ہونا بھی بس کی بات نہیں۔

ارے بھئی وہ ایک دن بجے ہوں گے کوئی دن کے ساڑھے دو یا کچھ کچھ تین جب کہ ہم معمولی قسم کا نان نمک کھا کر قیلولہ بنے چارپائی پر پڑے ہوئے تھے کہ نیند میں ایسا محسوس ہوا کہ جرمنی میدانِ جنگ سے کچھ گھوڑے بدک کر ہمارے گھر میں کیا بلکہ دالان ہی میں گھس آئے ہیں۔ بدحواس ہو کر آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ ''وہ'' ہمارے دونوں شانے دبا کر کہہ رہی ہیں کہ:

ذرا اٹھو تو وہ بھینس آ گئی ''بھینس'' ارے بھینس بازار سے آئی ہے بھینس خمار کی حالت میں بے ساختہ منہ سے نکلا کہ ''اچھا تو دروازے بند کر کے مجھے لحاف اُڑھا دو''

کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور فرمایا:

آپ ہوشیار تو ہوا رے وہ بھینس آئی ہے شیر نہیں آ گیا، سب دیکھ رہے ہیں آپ بھی چل کر دیکھ لیجیے۔ اب کچھ کچھ ہوشیار ہو کر ہم نے عرض کیا کہ: اچھا جو بھینس ہی بازار سے خرید کر لائی گئی ہے تو کیا وہ آج ہی کی پنجاب میل سے کہیں واپس جا رہی ہے جو ہمیں اس میٹھی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھایا جا رہا ہے۔

قریب تھا کہ اس سوال پر ''وہ'' جھنجھلا کر فرما جاتیں کہ اچھا تو پڑے رہو کہ ہم جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنی آٹھ آنے ماہوار کرایہ کی حیثیت والی کوٹھری سے باہر نکلے ہی تھے کہ آواز آئی: ذرا اُدھر ہی رہنا۔

گویا یہ آواز ہمارے ننھے میاں کی والدہ کو دی گئی تھی مگر ہم سمجھے کہ ہمیں کسی خطرہ سے روکا جا رہا ہے اس لیے ''اُن'' سے پہلے ہم پھر جو کوٹھری کی طرف تیزی سے واپس ہوئے تو پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور یہ جملہ کہا کہ ''آپ بھی عجیب ہیں'' اب تک تحقیق نہ ہو سکی کہ اس جملہ کے صحیح معنی کیا تھے۔ ''آپ بھی عجیب ہیں'' کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ آپ بھی اونچے درجہ کے بزدل، ڈرپوک اور بہت ہی معمولی قسم کے مرد ہیں۔ پھر یہ سوچتے تھے کہ بھلا ایک بیوی اپنے شوہر کو بزدل اور

ڈرپوک کس طرح کہہ سکتی ہے مگر جب اونچے خاندانوں کی آج کل کی بعض بیویوں پر نظر جاتی تھی تو ان معنی کے صحیح ہونے پر یقین آجاتا تھا کیونکہ اونچے خاندانوں کی بعض بیویوں کے متعلق خود اپنے ذاتی کانوں سے سنا ہے کہ شوہر صاحب کو مالدار اور تعلیم یافتہ بیوی صاحبہ طمانچے تک رسید فرماتی ہیں اور شوہر صاحب پھر بھی باہر اعلیٰ درجہ کے انسان بنے پھرتے ہیں اور تیز کلامی سے تو یہ 25 فیصدی بیویاں چوکتی ہی نہیں۔ مگر دیکھ لیجیے گا کہ ایسے ''طمانچہ خور'' اور ''گلابی خوار شوہر'' اس مضمون کو پڑھ کر بھی ایسی بیوی کے دو چار چانٹے رسید نہ کریں گے یہ کہہ کر کہ ''دیکھا او گستاخ یہ ملا رموزی صاحب نے تیرا میرا معاملہ کس خوبی سے لکھا ہے کہ میرے اور تیرے اوپر بالکل ہی فٹ اُتر رہا ہے کہ نہیں؟'' اس قسم کے ''بیوی زدہ شوہر'' دولت مندوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اس طبقے میں غریبوں کی طرح ''جوشیلی ذہنیت'' مفقود ہوتی ہے باقی سب طرح خیریت رہتی ہے۔ غرض اب جو باہر آئے تو دیکھا کہ نئی بھینس سے ہمارے خاندان بھر کا ''عظیم الشان دنگل'' ہو رہا ہے اس لیے ہم نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ بس خیریت اسی میں ہے کہ اس وقت ''چار آنے والوں ہی میں'' کھڑے رہو مگر افسوس کہ اس وقت اس دنگل کی حدود مقرر نہیں تھیں کیونکہ بھینس آئی تھی سیدھی بازار سے اس لیے جس حصہ کی طرف چاہتی تھی دوڑ پڑتی تھی۔ اس وقت کے کام کا خلاصہ تو صرف اتنا تھا کہ نئی بھینس ہونے کے باعث بدک رہی تھی اس لیے اسے باندھنا قدرے دشوار ہو رہا تھا مگر کام کرنے والوں کی تفصیلات کی رنگینیاں گھر کے ہر گوشہ میں یوں پھیل رہی تھیں کہ:

اور قیہ، کیا اندھی ہے تو جو یہاں کھڑی ہے تو۔

اری بھاگ یہاں سے دیکھتی نہیں کہ اس وقت شیر ہو رہی ہے وہ۔

لیجیے بھینس بھی غیر مسلم ہندستانیوں میں شیر ہو جایا کرتی ہے۔

اماں صادق! کیسے مرد ہو تم، ہاں بس مار داس کے منہ پر ابھی سیدھی ہوئی جاتی ہے بدذات کہیں کی۔

لاحول ولاقوۃ۔ ابے رسّی کیوں چھوڑ دی تو نے اس کی؟

آیا بڑا بھینس والا کہیں کا۔

اُفوہ اُفوہ۔

چلیے چلیے اِدھر سے بس دیکھ لیا آپ کو اور آپ کی بہادری کو۔

بس بس خالو میاں اب ہو جائے گی سیدھی۔ آخر وہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔

ہٹنا ہٹنا۔ بسم اللہ بسم اللہ دیکھوں کہاں چوٹ آئی؟

استغفر اللہ بھینس ہے یا مصیبت؟

ہاں ہاں اوپر سے رسّی ڈالو اوپر سے۔

اماں رہنے بھی دو شرم تو آتی نہیں تم کو عورتوں کی طرح کھڑے بک رہے ہو ذرا اِدھر آؤ نا۔

ہاں چل چل، بس بس۔

سچ کہتا ہوں، خدا کی قسم جواب کے نکل گئی نا گھر سے تو پھر سیدھی گاؤں نہ پہنچے تو کہیے گا مجھ سے۔

اور خالو میاں راستہ میں کتنوں کو زخمی کرے گی یہ نہ کہیے گا؟

آپ تو رہنے ہی دیجیے اپنا ملا رموزی پن، بس کھڑے ٹرٹر کرنے چلے ہیں اماں ہاں سچ تو کہتا ہوں کہ تم تو عورتوں سے بھی بدتر ہو۔ لیجیے ایک بھینس کے معاملہ میں برسوں کا مانا ہوا مرد ملا رموزی عورت بن گیا۔

اِنا للہ میں کہتا ہوں کہ اس رقیہ کی آج شامت ہی آرہی ہے تو کمبخت تجھ سے آخر اندر کیوں نہیں رہا جاتا۔

اُفوہ بھئی وہ تمھارے کپڑوں ہی سے تو بدک رہی ہے اور تم ہو کہ اس کے سامنے ہی کو در رہے ہو۔ بس اس طرف سے بڑھانا اب کی۔

دیکھ بے اب کے رسّی چھوڑی ہے تو سر توڑ ڈالوں گا تیرا۔

آپ آپ خدا کے لیے ہٹ جائیے۔

لیجیے آپ اُلٹا غصہ کرتی ہیں، خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ اگر ایک سینگ مار دے گی تو پیٹ کا تمام ڈاکخانہ باہر نکل آئے گا۔

ہاں شاباش شاباش صادق میاں تم ہی سے ہوگا یہ کام۔

جی ہاں ساجد صاحب آپ نے تو اتنا بڑھایا ہے اسے بھلا اب کی ذراہمت کر کے باندھ دو

بیٹا تو جانیں تم کو پہلوان۔

ہٹنا ہٹنا۔ بسم اللہ بسم اللہ، لاحول ولاقوۃ۔

اماں لکڑی تو لو ہاتھ میں پہلے۔

اچھا تو رستم خاں آپ ہی کو دیکھوں اب کی۔

لونڈے ہونا آخر کار، غصہ کرتے ہوبے کار۔

کیا کہا غصہ۔

لیجیے تو ذرا آپ ہی باندھ دیجیے آ کر اس کو۔

رہنے بھی دیجیے بس باتیں کرنا آتا ہے آپ کو۔

دس مرتبہ دیکھ چکا ہوں آپ کی بہادری۔

تو میں کیا کہہ رہا ہوں خالہ بی وہ خود تو آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔

اماں ہم کہہ رہے ہیں کہ وہ ذرا شریف میاں کو بلا لو وہ ابھی سیدھی کر دیں گے۔ تو کیا ہم زنانے ہیں جو شریف میاں صاحب کو بلایا جا رہا ہے؟

اے صاحب اگر یوں کھینچ لیتا ہوں اسے تو وہ سیدھی کھڑی نہیں رہ سکتی۔

مصیبت تو یہ ہے کہ مکان بھی تو کمبخت اس قدر تنگ ہے۔

جی ہاں اردو کے نامور ادیب ملا رموزی صاحب ہی کا تو گھر ہے، جن کے قدرداں ناظرین ان کے ساڑھے تین روپیہ کی کتاب ''عورت ذات'' بھی مفت ہی ملاحظہ فرمانے کے خواستگار ہیں۔

ہاں ہاں ساجد میاں بس یونہی کھینچے رہنا ذرا۔

لگے لگے ٹانگ پر۔

ہٹ ہٹ ذرا پیچھے۔

ارے بچو تم تو خدا کے لیے تھوڑی دیر اندر ہی رہو۔

قرآن کی قسم ہاتھ بے کار ہو گئے ہیں خالہ بی بازار سے یہاں تک جس طرح لایا ہوں

اسے۔

اس موقع پر خاکسار ملا رموزی نے دالان کے اندر ہی سے رائے پیش کی کہ وہ احمد حسن ماموں کو بلا لیا جائے وہ ابھی سیدھی کر دیں گے اسے وہ بھینس کے معاملات کو خوب جانتے ہیں تو ایک بزرگ کی طرف سے جواب عطا ہوا۔ ذرا اس جواب میں ملا رموزی صاحب کی حیثیت ملاحظہ فرمایئے:

بس بس رہنے دیجیے مولوی صاحب آپ کے احمد حسن صاحب کو۔

لاحول ولاقوۃ۔ بس بھائی کیا جان سے مار ڈالو گے اسے آخر وہ بھی خدا کی مخلوق ہے؟

اُفوہ!

صادق غصہ ہی کرلو یا بھینس باندھو؟

ہٹنا ہٹنا اُفوہ!

اماں یہ بھینس جان تو نہ لے گی آج کسی کی؟

اس موقع پر خاکسار ملا رموزی کی قمیض کا دامن کھینچ کر بولیں کہ آپ تو خدا کے لیے خاموش ہی کھڑے رہیے ورنہ پھر خواہ مخواہ خالو میاں بکنا شروع کریں گے تو گھر میں رہنا حرام کر دیں گے۔ ابھی یہ تنبیہ فرمائی جارہی تھی کہ بھینس نے پھر قلابازی سے جو کام لیا تو ہمیں دالان ہی میں چھوڑ کر 'دہ' کرہ میں۔ اب پھر 'دنگل' شروع ہو گیا۔

لاؤ لاؤ مجھے دو رسی۔ وہ شاید تمھارے کالے کوٹ سے بدکتی ہے؟

ہات تیری کمبخت کی بچی۔

تو اب بٹی ذرا بھاگو تو دیکھوں تم کو؟

ہاں ذرا کس کر، میں کہتا ہوں خدا کی قسم پھر نہ بھاگ کھڑی ہو تو میرا نام۔

شاباش شاباش ساجد۔

ہاں میاں تم ہو بھی گھر میں سب سے زیادہ ہمت والے۔

اس موقع پر خاکسار ملا رموزی سے دالان میں نہ رہا گیا اور اس نے کہا کہ اور ''میں؟'' تو جواب کی خوبصورتی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوا کہ بس رہنے بھی دو کھڑے میں میں کر رہے ہو، اماں شرم تو

آتی نہیں تم کو اس سے تو عورتوں کی چوڑیاں پہن کر بیٹھ گئے ہوتے، مرد کی صورت اور یہ بزدلی، لاحول ولاقوۃ۔

لیجیے ایک ادیب اگر بھینس کی اچھل کود میں شریک نہ ہوا اور نہایت وقار کے ساتھ دالان سے کھڑا ہوا مشورے پیش کرتا ہے تو پرانے خیال کے بزرگوں کی نظر میں آج کل بزدل قرار پاتا ہے۔

ہاں آپا بی اب آ جائیے آپ لوگ باہر۔

باندھ دیا کمبخت کو میں نے۔

ہاں ہاں صاحب خوب دیکھ لیا میں نے اب انشاء اللہ حرکت بھی نہیں کرسکتی۔ آپ سمجھے اس کا مطلب کہ "اب آپ لوگ باہر آ جائیے" مطلب یہ ہے کہ جب تک بھینس باندھنے کا دنگل بپا رہا ملا رموزی صاحب کے خاندان کی تمام خواتین عرف عورتیں کوٹھریوں اور کمروں میں بند رہیں حالانکہ کہنے کو ہم سب لوگ افغان ہیں مگر ہندستان میں آ کر بس جانے والے افغانوں کو آپ نے بھی دیکھا ہی ہوگا، سب سے اونچی بہادری ہم افغانوں کی یہ کیا کم ہے کہ نمک خوار بنے ہوئے ہیں۔

غرض خدا خدا کرکے جو بھینس کو باندھا گیا تو خالو میاں تھے کہ ہر ایک کو اس نظر سے دیکھ رہے تھے کہ "کیوں دیکھا کس بہادری کے ساتھ میں نے بھینس کو باندھ کر چھوڑا۔ اب اس ہنگامے سے فراغت نصیب ہوئی تو اب عورتوں اور بچوں نے "بھینس بینی" اور بھینس دکھائی کا سلسلہ شروع کردیا۔ چنانچہ ایک بولیں:

ماشاء اللہ خدا مبارک کرے، ہے تو ماشاء اللہ ہاتھ پاؤں کی اچھی اور ماشاء اللہ ہے بھی نئی عمر کی۔

دوسری بولیں: مگر ماشاء اللہ قیمت بھی تو دیکھو۔

تیسری بولیں: اور دیکھنا خالہ بی ماشاء اللہ اس کے سر پر چاند بھی ہے۔

چوتھی بولیں: مگر بیا اس کے سینگوں سے خدا ہی بچائے، مگر ماشاء اللہ چند دن میں اس کی مارنے کی عادت بھی جاتی رہے گی۔

اس موقع پر خالو میاں اندر ہی سے بولے: آج ہی میں نے ایسا سیدھا کر دیا ہے اسے کہ اب انشاءاللہ سر بھی نہیں ہلائے گی عمر بھر اور ویسے بھی جانور ہے کہہ نہیں سکتے۔

خاکسار ملا رموزی بولے: خالو میاں جب وہ سر بھی نہیں ہلا سکتی اور کہہ بھی نہیں سکتے تو پھر فرمایئے کہ آپ نے کون سا اطمینان بخش انتظام فرمایا۔

تو کھسیانے ہو کر کوٹھری سے باہر نکل کر بولے کہ: صاحبزادے مطلب یہ ہے کہ جانور رفتہ رفتہ ہی مانوس ہوتا ہے۔ اب ہم آج ہی کیسے کہہ دیں کہ وہ بالکل ہی نہ مارے گی اور پھر ماشاءاللہ یہ آپ کا لونڈوں سے بھرا گھر، بس یہ ہے کہ اب اس کے پاس ہجوم نہ کیجیے آپ لوگ اب ذرا اسے گھاس دانا کھانے دیجیے۔

مگر خالو میاں کی کون سنتا ہے تھوڑی ہی دیر میں وہ پڑوس کی کچھ آئیں اور بولیں کہ: اخا آپا بی یہ بھینس منگائی ہے آپ نے۔ ماشاءاللہ خدا مبارک کرے، چلو ہمیں بھی دودھ کا آرام ہو جائے گا ورنہ کوس بھر سے منگایا کرتے تھے اور انشاءاللہ دودھ بھی خوب دے گی۔ یہ سن کر پھر خالو میاں اندر سے بولے۔

جب دودھ دے گی تب پتہ چلے گا کہ کیسی بھینس لایا ہوں چھانٹ کر؟ مگر یہ ہے کہ اب اسے خوب گھاس اور دانا ملے کیونکہ جانور تو اسی سے رہتا ہے۔

ارے بھابی جان آپ بھی تو آ کر دیکھیے۔

ہماری طرف اشارہ کر کے بولیں۔

ہاں آتی ہوں بیا آپ دیکھیے۔

مطلب یہ تھا کہ ملا رموزی کو باہر چلا جانے دیجیے پھر میں ذرا آزاد ہو کر اور اکڑ اکڑ کر اس بھینس کے نقصانات بتاؤں گی کہ فوراً ہی خالو میاں بولے۔

کیوں بھئی دلہن کیا تم نہ دیکھو گی اس بھینس کو، بات کیا ہے آخر؟

اب تو جانا ہی پڑا مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ دور ہی سے کھڑی آہستہ آہستہ کچھ فرماتی تھیں اور ہماری طرف بھی دیکھتی جاتی تھیں کہ محلّہ کی ایک اور آ کر بولیں کہ:

واہ بیوی خوب یہ الگ ہی الگ بھینس منگائی اور خبر تک نہ کی کہ خالو میاں نے فوراً ہی تو کہا

کہ تو کیا بھئی تمھیں بھی ضرورت ہے۔ ہاں تو وہ یہ ہے کہ مجھے قیمت دے دو موقع اچھا ہے میں دیکھ آیا ہوں ابھی دو چار بھینسیں اور باقی ہیں اور بڑے دودھ کی ہیں، مگر بھئی پہلے تم اپنے گھر کے آدمیوں سے مشورہ کر لینا ورنہ کل کو کہو کہ خالو میاں نے لوٹ لیا وہ تو کہو کہ آپ ہیں ہماری عزیز اس لیے وہ منہ سے نکل ہی گیا کہ میں لا دوں گا۔ اس موقع پر ہماری ننھے میاں کی والدہ کو دیکھا تو وہ کچھ بھنا کر ان محلے والی بی بی سے فرما رہی تھیں۔ مطلب یہی ہوگا کہ خالو میاں تو ہیں دیوانے ہر ایک کی بات میں دخل دیا کرتے ہیں کہ ایک بولیں کہ ماشاءاللہ چار پانچ سیر دودھ کی معلوم ہوتی ہے کہ خالو میاں کوٹھری سے پھر آئے ہی تھی کہ جواب دیں، مگر معلوم ہوا کہ اس وقت بھینس کی طرف ''جانے کی سخت ممانعت ہے'' کیونکہ کچھ عورتیں بھی معائنہ فرمانے آئی ہوئی ہیں اس لیے کچھ گنگناتے ہوئے پھر اندر چلے گئے۔

مذکورہ بالا معائنہ میں دیکھا ہوگا کہ فی عورت کوئی دس دس بار لفظ انشاءاللہ اور ماشاءاللہ، اس لیے صرف ہوا کہ گھرانا ہی ہم لوگوں کا پرانے زمانے کا اور خالص اسلامی اور مشرقی آداب والا ہے، اس لیے جملہ روایات وطن زندہ ہیں ورنہ اسی بھینس کو اگر آج کل کی ''اسکول یافتہ عورتوں'' کے سامنے لایا جاتا تو ایک تحقیر آمیز تبسم کے ساتھ چند جملے کہہ کر پیانو بجانے میں مصروف ہو جاتیں اور بعض ''گڈ'' کہہ کر کلب تشریف لے جاتیں۔

اس معائنے اور مبارک سلامت کے طویل سلسلہ کے بعد اب بھینس کی آئندہ زندگی اور جملہ متعلقات کے مسائل نہایت اہم قرار دیے گئے، اس لیے آج ہی کی فرصت میں ان ''دشوار ترین مسائل'' کے حل کا سلسلہ اور مذاکرہ یوں جاری رہا کہ ملا رموزی کا رہنا محال سا نظر آنے لگا خاص کر خالو میاں کی عجیب عجیب احتیاط آفریں تجویزیں اس معرکۃ الآرا معاملے کی جان تھیں۔

اب بیٹھے کیا ہو صادق، فکر یہ کرو کہ صبح ہی سے بھینس چرنے چلی جائے، کیونکہ وہ یہ ہے کہ جنگل میں چرنے والا جانور ہے۔ صادق نے خالو میاں کے اس حکم کی تعمیل میں قدرے جھنجھلا کر کہا اونہہ ابھی سے آپ کو اتنی فکر کیوں ہے۔ کہہ دوں گا وہ خوشیا سے لے جایا کرے گا وہ اپنی بھینسوں کے ساتھ۔ پان کا کوئی نصف چھٹانک وزن کا پیک تھوک کر خالو میاں بولے۔

جی ہاں تمھاری طرح لونڈے تو ہیں نہیں ہم کہ جانور کو گھر پہ باندھ کر یوں آرام سے بیٹھ

جائیں اور جوتم کہتے ہو صادق کہ وہ خوشیا سے کہہ دوں گا چرانے کو تو بھئی پھر تمھاری بھینس کا خدا حافظ ہے۔ وہ دیکھا نہیں تم نے کہ اسی خوشیا مردود نے مولوی صاحب کی بھینس کو مار کر رکھ دیا ہے اور ویسے بھی خوشیا ہندو ہے اور وہ کلا چرواہا کیسا ہے وہ مسلمان بھی ہے کیونکہ بھئی وہ کانپور کشمیر وغیرہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچائے ہیں اس وقت سے میں تو ہندوؤں کو کچھ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس ہندو مسلم سوال پر ملا رموزی پھر بولے کہ خالو میاں بھینس کے معاملہ میں ہندو مسلمان کی کیا تمیز جب کہ خود بھینس کے لیے اب تک طے نہیں پایا کہ بھینس ہندو ہوتی ہے یا مسلمان؟

اسی طرح بلند خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی پورے ہندستان کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ آپ اسے اور بڑھانا چاہتے ہیں کیا؟ صادق بیچ ہی میں بولے کہ اور یہ جو آپ کے ہندو اسلامی ریاستوں میں ادھم مچانے آرہے ہیں تو؟ اس پر ہم نے کہا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ہندستانی حصولِ آزادی والی تحریک اور بیداری کو سو سال پیچھے ڈھکیل دینے کے مرتکب ہوں گے کیونکہ جس طرح شدھی کی تحریک سے ہندو بھائیوں نے مسلمانوں کو خود سے مشتعل کر کے گول میز کانفرنس لندن میں ناکامی کا منہ دیکھا اسی طرح اب وہ اسلامی ریاستوں میں دخل دے کر ہندستان کی متحدہ بیداری کو ہمیشہ کے لیے برباد کر دیں گے کیونکہ ان کی یہ تحریک محض کشمیر کے انتقام کے طور پر ہے کسی اہم اور انصاف کی ضرورت پر نہیں ہے۔ اب جو یہاں تک ہم بولے تو خالو میاں کے غیر سیاسی دماغ میں صرف اتنا خیال پیدا ہوا کہ کڑک کر بولے کہ:

بس تو پھر میں کیا برا کہہ رہا ہوں کہ خوشیا سے نہ کہو بھینس چرانے کو۔

ارے ذرا خاموش تو رہو۔

دیکھو تو بنے کیا وہ پھر رسی کو توڑتی ہے، کچھ کودنے کی سی آواز آئی تھی مجھے۔ نہیں اب وہ حرکت نہیں کر سکتی مگر ہاں گھاس کی فکر کرو، بھئی ساجد خالو میاں نے بے پرواہ لہجے میں کہا۔

کون شریف میاں؟

ارے بھئی آجاؤ تم سے ایسا کون سا پردہ ہے؟

لو بھئی تو اب تم بھی آگئے ہو میں کہتا ہوں کہ اس وقت اس بھینس کے چرانے کا معاملہ طے ہو جائے۔ صادق نے پھر تاؤ کھا کر کہا خالو میاں آپ بھینس سے زیادہ مصیبت میں ہیں۔ کہہ دیا

میں نے کہ صبح انتظام ہو جائے گا۔ مگر آپ ہیں کہ اسی جھگڑے میں الجھے ہوئے ہیں۔ قریب تھا کہ خالو میاں کے تاؤ کا پارہ پھر کھل جائے کہ شریف میاں نے فوراً ہی کہا کہ نہیں صادق میاں، خالو میاں سچ فرماتے ہیں کہ بھئی جب ایک کام کیا ہے تو پھر اسے پورا ہی کیا جائے۔ اب تو خالو میاں کے مدبرانہ اور حاکمانہ غرور کے نتھنے پھول گئے۔ فوراً بولے۔

جزاک اللہ بھئی شریف۔

آخر کیوں نہ ہو معاملے کے آدمی ہو، ان لونڈوں کا کیا۔

واضح ہو کہ خالو میاں کے بتائے ہوئے لونڈوں میں اس وقت یہ ایک بال بچے والا ملا رموزی بھی شامل تھا۔

کون احمد حسن؟ آجاؤ بھئی آجاؤ۔

لو بھئی اب ذرا آپ لوگ چل کر اس بھینس کو دیکھ لو۔ خالو میاں نے ان دونوں "مبصرین بھینس" سے فرمایا۔

آجاؤ، آجاؤ قریب قریب، وہ یوں نہیں مارتی، بس کھڑی رہ خاموش ہاں اِدھر سے دیکھو۔

یہ یہ، ماشاء اللہ کیا بات کہی تم نے بھئی احمد حسن۔

انشاء اللہ انشاء اللہ

ہوہوں، بس کھڑی رہ سیدھی۔

آجاؤ آجاؤ ذرا قریب سے دیکھو، ڈرو نہیں اس سے وہ تو ذرا یونہی بدکتی ہے۔

ہاں تو اب ذرا اپنی خالہ سے کہو کہ کیسی بھینس لایا ہوں۔

ارے بھئی بچوں کا گھر ہے، بچوں کا گھر ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کو اس سے دور رکھیے نا کیوں بھئی احمد حسن؟

اس موقع پر خاکسار ملا رموزی کو پھر اتنا بولنا پڑا کہ خالو میاں آخر گھر کے بچے ہیں، بھینس کے بچے تو نہیں ہیں جو انھیں بھینس کی طرح باندھ کر رکھا جائے۔ وہ تو غنیمت ہی ہوا کہ احمد حسن ماموں فوراً بول اٹھے کہ ارے بھئی وہ چند دن میں سیدھی ہو جائے گی، ایسی وہ کہاں کی شیرنی ہے۔ ورنہ خالو میاں کا جواب خدا جانے کیا رنگ لاتا؟

واضح ہو کہ اس بھینس کے ہاں اولاد پیدا ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے، مگر اس چرانے کے انتظام کی طرح خالو میاں نے ایک پیشگی معاملہ اور پیش فرمادیا۔ اچھا بھئی اس وقت آپ سب لوگ موجود ہیں تو یہ بھی طے ہو جائے کہ اس کے دودھ کا اب کیا انتظام ہوگا؟ کیونکہ آج کل تو گھر گھر بھینس موجود ہیں، کوئی دکاندار راضی نہیں ہوگا، مگر یہ کام ہے کرنے کا اور بھئی ہم سے سن لو کہ یہ کام احمد حسن تم کرو یا یہ میاں شریف ذمہ لیں ورنہ ان لونڈوں سے تو ہمیں کوئی امید نہیں اور ویسے بھئی تمھاری خالہ جو کہیں۔

دیکھا آپ نے یہاں بھی خالو میاں نے ملا رموزی کو اشارتاً لونڈوں میں شامل کر دیا۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اس لیے وہ خالہ بی بول اٹھیں کہ آخر یہ دودھ کا معاملہ ابھی سے کیوں طے ہو رہا ہے جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔

تو گویا پہلے سے ایک بات کو طے کر لینا فضول سی بات ہے آپ کے نزدیک خالو میاں نے منہ پھیر کر خالہ بی سے کہا، مگر خالہ بی نے جو ہماری طرف دیکھا تو ہم نے کہا جی ہاں ہو جائے گا سب انتظام۔ ہمارے دوستوں میں چائے کے لیے دودھ کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے کہ خالو میاں نے چمک کر کہا بس میاں ملا صاحب میں نے آپ کے دوستوں کو خوب دیکھ لیا۔ ہاں وہ آئے تھے نا آپ کے ایک دوست جو کہہ کر گئے ہیں کہ میں نظام حیدرآباد سے تمھارا وظیفہ کراؤں گا، پھر کہیے کہ آج تک انھوں نے جواب بھی دیا آپ کو؟ بس آپ کے دوست تو جتنے ہیں سب زبانی جمع خرچ کے ہیں۔ امید ہے کہ خالو میاں کے اس واقعی بیان سے ملا رموزی کے احباب خفا نہ ہوں گے۔ کیونکہ بھینس کے دودھ کے تبصرہ میں ان احباب کا تذکرہ چنداں مضائقہ کی بات نہیں۔ ادھر سب سے زیادہ مشکل معاملہ یہ تھا کہ اس موقع پر تردید کرنے سے خطرہ تھا کہ خالو میاں ملا رموزی کے ظاہری قدر دان اور بہ باطن مخالف، احباب کا اس سے زیادہ بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیتے لہٰذا خاموش جو رہے تو معاملہ ٹل گیا اور خالو میاں اُسی روانی کے ساتھ بولے۔

میرے خیال میں تو صادق ہی دودھ کی دکان قائم کر لیتے تو خاصا نفع تھا مگر صادق صاحب نے اسے اپنی توہین قرار دیتے ہوئے کہا:

کل کو کہہ دیجیے گا کہ بازار میں پان بیڑی بھی فروخت کرتے پھر و۔ اچھا بھئی نہیں کہتے کہ

آپ دودھ کی دکان قائم کرو۔ وہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے نوجوان لونڈے تو تجارت کے نام سے ہی بھاگتے ہیں۔ انھیں تو بس ناٹک کا تماشا دیکھنے کے لیے چھوڑ دیجیے تو خوش ہیں، بہت اچھا صاحب آپ دکان نہ قائم کیجیے تو اب گویا ہم بزرگ ہوکر دودھ فروخت کرتے پھریں گے بہت اچھا۔ یہاں پھر خالہ نے بات کاٹی تو خالو میاں نے کھانس کر فرمایا۔

اچھا بھئی احمد حسن اب ہم تو سوتے ہیں۔ اگر ہو سکے تو تم ان معاملات کو طے کر کے اٹھنا کیونکہ بس تم ہی ایک تجربہ کار آدمی ہو۔ لیجیے یہاں بھی خالو میاں نے ملا رموزی کو تجربہ کاروں میں شامل نہ فرمایا اور پانوں کی ڈبیا اٹھا کر خواب گاہ میں پہنچے، مگر چار پائی پر کوئی دس منٹ تک خاموش لیٹے رہنے کے بعد یکا یک کھانس کر بولے۔

اماں احمد حسن تم اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت کاٹ رہے ہو اور وہ جو میں کہہ کر آیا ہوں؟

ارے بھئی کیا کہا تھا وہی دودھ فروخت کرنے کا انتظام اور سنو بھئی میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ بھینس لانے کا میں ذمہ دار ہوں اور اس کے دودھ دینے اور نہ دینے کا میں ذمہ دار ہوں مگر کل کو آپ لوگ اگر کہیں کہ خالو میاں یہ آج کا دودھ تو فروخت ہی نہیں ہوا سو اس کا جناب میں ذمہ نہیں لیتا اور ہاں وہ خوب یاد آیا کہ وہ چرواہے کا انتظام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اس وقت اندازہ سے معلوم کیا گیا کہ خالو میاں اپنی چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور پورے زور سے گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا مگر لیجیے وہ چار پائی پر سے اٹھ کر خالو میاں صاحب پھر ہم لوگوں میں یہ کہتے ہوئے تشریف لے آئے کہ:

دیکھو بھئی میں تو اب تک کبھی کا سو گیا ہوتا مگر پھر اس بات کا کہنا ضروری سمجھا کہ اگر تم لوگ اس بھینس کے دودھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو میں نے جو کچھ کہا ہے اسے پورا کرنا ہوگا ورنہ سنو احمد حسن میں تم سے اور تمھاری خالہ سے بھی کہے دیتا ہوں کہ یا پھر پھر مجھے جواب دے دو تو میں کل ہی اسے اسی طرح واپس کر کے تمھاری قیمت تمھیں لائے دیتا ہوں کہ کل وہ مولوی صاحب مجھے بازار ہی میں پانچ روپیہ نفع دے کر اس بھینس کو مجھ سے مانگ رہے تھے۔ یہ کہہ کر خالو میاں نے ایک پان اور کھایا اور آہستہ سے فرمایا کہ اب نیند تو خراب ہو ہی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب خالو میاں ہم لوگوں کا ناطقہ بند کرنے کی خاطر دو گھنٹے کے لیے اور تیار ہو گئے، اس لیے خالو میاں کو ٹالنے

کے لیے خاکسار ملّا رموزی نے عرض کیا کہ خالو میاں اتنی باتیں تو آپ چارپائی پر ہی سے فرما سکتے تھے یہاں تک دوبارہ آنے کی کیوں زحمت گوارا فرمائی؟ جواب میں خالو میاں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں کسی قدر رتاؤ سے گھورا اور فرمایا کہ ہاں بھئی احمد حسن تو پھر کیا رہا فیصلہ؟

خالو میاں کا ہمیں صرف گھور کر رہ جانا یہ کہہ رہا تھا کہ تم بے وقوف ہو اس لیے تمھیں کون جواب دے۔

حاصل کلام پھر کوئی پندرہ منٹ تک خالو میاں کے اصول یا تباہ کن سوالات کا سلسلہ یوں جاری رہا کہ مجلس کا ہر فرد تنگ تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے کہ خالو میاں ہی خاندان میں سب سے زیادہ عمر کے ہیں، خاص کر خالو میاں کی یہ حرکت بے حد تکلیف دیتی تھی کہ ایک سوال کا پورا جواب پا کر آپ جانے کے لیے آدھے کے قریب کھڑے ہو کر پھر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کہہ کر کہ اچھا تو وہ اس کا کیا فیصلہ کیا تم نے؟

◆◆◆

بھینس کا لڑکا

بجے ہوں گے رات کے سوا تین کہ ہماری نیند سے دبے ہوئے شانے دبا کر چلا چلا کر بولیں۔اے ذرا اٹھیے تو وہ بھینس نے بچہ دیا ہے۔خدا کی قسم کیسا پیارا بچہ دیا ہے۔سب دیکھ رہے ہیں آپ بھی تو دیکھیے چل کر۔انھوں نے تو یہ فرمایا اور ہم نے یہ تکلیف محسوس کی کہ واقعی ہمارے گھر میں بھینس پالنے کا پیشہ آبائی اور تجارتی نہیں بلکہ محض دودھ فروخت کر کے آمدنی میں اضافے کی غرض سے یہ مصیبت سر لی گئی ہے، اسی لیے یہ رات کے تین بجے گھر کے ہر فرد پر بھینس کا بچہ دیکھنے کی وحشت سوار ہے ورنہ اگر بھینس پالنا ہم لوگوں کا آبائی پیشہ ہوتا یا تجارت کے طور پر ہمارے گھر میں ہمیشہ سے بھینسیں موجود رہتیں تو بھینس کا بچہ دیکھنے کا یہ اشتیاق آج ہم لوگوں میں نہ ہوتا مگر کرتے کیا "وہ" اُٹھا رہی تھیں پھر کیسے آرام فرماتے رہتے کیونکہ دنیا میں نیند سے اٹھانے کے دو مواقع ہی انسان کے لیے نہایت تکلیف دہ اور نا قابلِ انکار ہوا کرتے ہیں ایک کوئی ہندستانی جاہل بیوی اپنے شوہر کو اٹھائے دوسرے ہندستانی پولیس والے آپ کو گرفتاری کے لیے رات کے وقت اس خوف سے نیند سے بیدار کریں کہ اگر دن کے وقت آپ کو گرفتار کیا جائے گا تو عوام آپ کے "پولیس پن" کو مزا چکھا دیں گے۔ وہ جیسا کہ بمبئی میں جناب ایم۔ این۔ رائے کو اور لاہور میں مشہور جہاز گوما گاٹا مارد کے لیڈر جناب گروجی کو سوتے میں یہ کہہ کر گرفتار کیا گیا کہ اٹھیے بھائی صاحب اور

گرفتار ہو جایئے، اس لیے کہ ہم پولیس والے ہیں اور یہ لیجیے یہ آپ کا دن کے وقت کا دستخط کیا ہوا وارنٹ۔ اس لیے اٹھے اور جو بھینس کے پاس جا کر دیکھا ہے تو سارا خاندان جمع تھا، مگر گفتگو میں ماشاءاللہ اور سبحان اللہ کی صدائیں سب سے اونچی تھیں یا خالو میاں ہنگامہ آرا باتیں فرما رہے تھے کہ:

اب دیکھنا انشاءاللہ اس کا دودھ، گویا اب یہ بھینس دودھ کے سمندر ہی تو بہا دے گی۔

کیوں بھئی دیکھتے ہو احمد حسن کیا حسین بچہ دیا ہے؟

بدقسمتی سے ملا رموزی کے شہر میں بھینس کے لڑکے کی کوئی قدر اس لیے نہیں ہے کہ لکھنؤ اور کانپور کی طرح یہاں بھینسا کام میں نہیں آتا یعنی وہ گاڑی اور ٹھیلا نہیں کھینچتا اور چونکہ بھینس کی لڑکی بھینس ہو کر دودھ دیتی ہے اس لیے اس لڑکے کے پیدا ہونے سے ہم لوگوں میں جو ایک طرح کا افسوس محسوس ہو رہا تھا اسے خالو میاں مختلف طریقوں سے اس لیے مٹانے کی کوشش کر رہے تھے کہ بعض نے آہستہ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ واہ خالو میاں کیا بھینس لائے آپ کہ اس نے بجائے لڑکی کے لڑکا دیا، اس لیے خالو میاں ہر طرح سے زور لگا رہے تھے کہ ہم لوگ اس لڑکے ہی سے خوش ہو جائیں۔

اونہہ رقیہ دیکھا تو نے بیٹی یہ اس کے سر پر بھی چاند ہے۔

ہاں بھئی اب تو ہی کھلایا کرے گی اس بچہ کو نا؟

آ جا آ جا قریب وہ ابھی مار تھوڑا ہی سکتا ہے بیٹی۔

دیکھنا بھئی صادق ذرا ابھی بھینس کے قریب نہ چلے جانا تم کیونکہ ابھی وہ کچھ دن تک مارتی رہے گی سب کو، اس لیے وہ ہے ابھی بچے کی محبت میں۔ نہ بیٹی ابھی وہ گھاس نہیں کھا سکتا۔

ایک بولیں: خیر جی خدا مبارک بچہ ہے ماشاءاللہ بھورے رنگ کا اگر بالکل ہی کالا ہوتا تو ذرا برا معلوم ہوتا۔

دوسری بولیں: آپا اس کے گلے میں کوڑیوں کا ہار ڈالیں گے انشاءاللہ تو پھر بڑا خوبصورت معلوم ہوگا۔

تیسری بولیں: مگر خالہ بی یہ میاں ننھے کو بچانا کیونکہ ابھی بچہ ہے اور جانوروں کے اتنے بچے کودتے اچھلتے زیادہ ہیں۔

چوتھی بولیں مگر یہ کمبخت میرے درخت کھا جایا کرے گا۔

خالو میاں بولے: مگر اب یہی موقع بھینس کو طاقتور چیزیں کھلانے کا ہے ورنہ پھر مجھ سے دودھ کی کمی کی کوئی شکایت نہ ہو۔

اور بھئی احمد حسن بولو کہ کل سے جو یہ انشاء اللہ دودھ کا سلسلہ شروع ہوگا تو اس موقع پر پھر خاکسار ملا رموزی سے نہ رہا گیا تو اس نے عرض کیا کہ اب رات کے چار بجا چاہتے ہیں اس لیے اگر کل دن کے وقت یہ معاملات طے ہوں تو کیا خرابی۔

خالو میاں بھنا ہی تو گئے اور فرمایا: آپ کو کون مردود خواب سے اٹھا کر لایا ہے جو آپ اپنی منطق جھاڑ رہے ہیں۔ پاس ہی کھڑی تھیں ''وہ'' ہم نے فوراً ہی کہہ دیا کہ یہ۔ اب خالو میاں نے ''اُن'' کا تمام شوق تماشہ خاک میں ملانا شروع کر دیا کہ۔

دلہن ہو تو بڑی بے وقوف۔ بھئی معاف کرنا دلہن، وہ بے وقوف تم کو یوں کہا میں نے کہ تم کیوں ان میاں کو اٹھا کر لائیں نیند سے؟ جانتی تو ہو کہ ان میاں کو بجز اپنی مضمون نگاری کے نہ دین کی خبر ہے نہ دنیا کی وہ دیکھو نا کہ انھوں نے اپنی ملازمت تک کو برباد کر کے رکھ دیا اور کہتے کیا ہیں کہ میں قوم اور مذہب کی خدمت کے لیے پیدا ہوا ہوں، مگر میں کہتا ہوں کہ قوم اور مذہب سے پہلے تمھارے اوپر اپنی بیوی بچوں کا سنبھالنا فرض ہے مگر تم دیکھو دلہن کہ اس بے وقوف کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دن رات ہے کہ کاغذوں سے آنکھیں پھوڑ رہا ہے اور وہ قوم والے ہیں کہ اتنا نہیں پوچھتے آ کر کہو میاں ملا رموزی صاحب تم جو اپنے گھر بار اور ملازمت کی تمام ترقیوں کو خاک میں ملا کر ہمارے لیے دن رات قلم گھسا کرتے ہو تو یہ لو آج ہم بھی تمھارے لیے یہ تحفہ لائے ہیں یا ہم سب مل کر تمھیں نظام حیدر آباد سے جاگیر دلانے جاتے ہیں آج اور اُلٹا ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ جو تمھارے ملا صاحب نے تمھارا زیور گروی رکھ کر وہ اپنی بڑی موٹی کتاب کیا نام اس کا ہاں وہ ''عورت ذات'' چھپوائی ہے تو بولو دلہن غلط کہتا ہوں کہ رکھی ہوئی ہے نا وہ اب تک تمھارے ہی کمرہ میں؟ پھر آج کو ایسی ناقدردان قوم کی جگہ اگر تمھارے یہ شوہر صاحب اپنی ملازمت ہی میں اتنی محنت کرتے تو آج ہوتے کہیں کے افسر کیونکہ یہ ہم ضرور جانتے ہیں دلہن کہ خدا نے تمھارے آدمی کو ہم سب میں زیادہ علم دیا ہے مگر اب کون کہے ان سے۔ تو بھئی دلہن میں تو اب بھی یہ کہتا ہوں تم

سے کہ ہو سکے تو انھیں سمجھاؤ کہ میاں چھوڑو اس مضمون وضمون کو وہ دیکھو وہ بے چارے کیا نام ان کا وہ مولانا محمد علی شوکت علی مر ہی گئے اس قوم کے کام کرتے کرتے مگر سنا ہے کہ اس غریب کے گھر کے لوگوں پر دتی کے کسی اللہ کے بندے نے الٹا کرایہ کا دعویٰ کر دیا اور نہ شرمایا تو پھر تمھارے شوہر صاحب کو کون جاگیر دے دے گا۔ آہ وہ زمانہ تو کچھ مغل بادشاہوں کا تھا جن کے درباروں میں علم والوں پر جواہر نثار کیے جاتے تھے۔

اس موقع پر خاکسار ملا رموزی سے پھر نہ رہا گیا اور عرض کیا کہ: خالو میاں وہ جو آپ نے ایک ہی سانس میں مولانا محمد علی صاحب کے ساتھ مولانا شوکت علی صاحب کو بھی لگے ہاتھوں مرحوم قرار دے دیا تو سن لیجیے کہ الحمدللہ مولانا شوکت علی قبلہ ابھی زندہ ہیں، اس لیے آپ ان کی درازیٔ عمر کی دعا کیجیے اور صرف قبلہ مولانا محمد علی صاحب کے لیے مغفرت کی دعا فرمایئے۔ اس پر خالو میاں کی اخباری واقفیت کا جواب ملاحظہ ہو بے تکلفی سے فرمایا۔

ارے بھئی معاف کرنا وہ تو ہم یونہی سنا کرتے تھے اخبار والوں سے کہ وہ مولانا محمد علی شوکت علی نے ایسا کیا اور ویسا کیا تو ہم بھی سمجھتے تھے کہ یہ ایک صاحب ہی ہیں اور اس طرف کے لوگوں کے نام ہی کچھ عجیب قسم کے ہوا کرتے ہیں اس لیے ہم نے کبھی اس بات پر غور بھی نہ کیا کہ یہ دو صاحبوں کے نام ہیں یا ایک صاحب کا؟ اور آج کل کے مسلمان ویسے بھی اپنے نام انگریزوں کی طرح رکھتے ہیں جو ہم سے ادا ہی نہیں ہوتے وہ دیکھو نا وہ تمھارے کون دوست آئے تھے وہ دلی سے جن کا نام ایس۔ ایم۔ دین تھا جنھیں ہم کرسچن سمجھتے تھے کیونکہ ان کی مونچھیں بھی صاف تھیں اور کوئی علامت ہی ان میں مسلمان کی نہ تھی مگر وہ تم نے پھر ہمیں بتایا تھا کہ ان کا اصل نام سید محمد دین ہے۔ اب دیکھو تو بھئی کتنے عمدہ اسلامی نام کو انھوں نے ایس۔ ایم۔ دین بنا دیا تھا اور پھر کہتے ہیں کہ اس طرف کے مسلمان بڑے عمدہ ہوتے ہیں اور اسلام کی خدمت کرتے ہیں مگر صورت اور نام تک انگریزوں سے ملا کر رکھتے ہیں۔

اچھا تو بھئی کیا کہا تم نے کہ یہ مولانا محمد علی شوکت علی صاحب دو بھائی ہیں تو پھر وہ جن کا سنا ہے کہ ولایت میں انتقال ہوا وہ ان کا نام شوکت علی تھا یا یہ جواب زندہ ہیں، ان کا۔

ہم نے مولانا محمد علی قبلہ مغفور کا نام بتا کر بات کو اس لیے ٹال دیا کہ اگر جواب دیتے جاتے

تو خالومیاں بھینس اور اس کے بچے کو بھول کر صبح تک خالص سیاسی سوالات ہی فرماتے رہتے۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ جس خاندان کے سب سے بڑے بزرگ مولانا محمد علی شوکت علی کو ایک آدمی سمجھتے ہوں اس خاندان کے دوسرے افراد سیاست میں کتنی حسین ولطیف معلومات کے مالک ہوں گے؟ اور ایک بے چارے ملا رموزی کے خاندان پر کیا موقوف ہے، اماں چلے جاؤ اس طویل وعریض ملک اودھ میں اس طرف جتنی زیادہ عمر کا مسلمان ملے وہ واجد علی شاہ مرحوم کے حالات اور کلکٹر صاحب ضلع کے واقعات تو حفظ سنا دے گا، مگر نہ بتا سکے گا تو تازہ سیاسی انقلابات کو۔ پھر جس قوم میں سیاسی واقفیت کو آج بھی ایک مہمل اور غیر ضروری بات سمجھا جائے اور اس کے مستقبل کا اندازہ کیا مشکل ہے؟ اور مسلمانوں کی یہی تو سیاست ناشناسی ہے جو اردو کے دوسرے ظرافت نگاروں میں اور ملا رموزی میں یہی تو ایک فرق شروع سے آج تک چلا آیا ہے کہ ملا رموزی کی تحریر میں جو کچھ ہے کسی نہ کسی طرف سے سیاست ہے اور دوسروں کے ہاں ہر طرف سے نری ظرافت ہے... اور اسی غیر سیاست آگاہی کا نتیجہ تو ہے کہ ملا رموزی سے اچھے اچھے ایڈیٹر لوگ جب طلب کرتے ہیں تو زیادہ کام کا نہیں بلکہ زیادہ ہنسانے والا مضمون لاحول ولاقوۃ۔

غرض یاد ہے کہ بھینس کے بچے کی خوشی قریب قریب صبح تک منائی گئی اور دن ہونے پر تو خدا کی پناہ۔ تقریباً پورے محلے میں اخبارات سے شائع ہو گئے تھے کہ ملا رموزی صاحب کی بھینس نے بچہ دیا ہے۔ گھر تھا کہ دن بھر خاصا عجائب خانہ بنا رہا تو بھی آ اور میں بھی آ۔ یہ بھی آ تو وہ بھی آ اور بچوں کی تعداد کا صحیح اندازہ تو ہر جگہ ناممکن ہوا کرتا ہے خصوصاً جس محلے میں تعلیم و ہنرمندی سے بزرگ ہی کورے دھرے ہوں ان کے بچوں کو بھینس کے ایک بچے کے تماشہ میں پورا دن برباد کر دینا کون سا مشکل کام ہے اس لیے خالومیاں ہی دن بھر بچے اور زچہ بھینس کی حفاظت میں سرگرم نظر آتے تھے۔

ارے بھئی دور رہ ذرا دور کون سدوا؟

ابے کہہ رہا ہوں لونڈے کہ بھینس کے پاس نہ جا۔

ہٹ ہٹ او کلو، ابے سنتا ہے کہ نہیں ابھی مار دے گی ایک آدھ سینگ تو پھر بادا آئیں گے چڑھ کر۔ بس دور سے بیٹھ کر دیکھ بچے کو ہاں جب ذرا بڑا ہو جائے تو پھر کھلاتے رہنا اسے سڑک پر

بیٹھے۔

کون رشیدا، ابے تو یوں کہہ کہ تو سعد اللہ خاں کا بیٹا ہے۔ اچھا لے ذرا آ تو اس طرف اس بچے کو ذرا اٹھا تو اس طرف سے۔

ارے بھئی کچھ کھلاؤ گی اس بھینس کو اس وقت؟

تم جانو بھئی ہمارے خیال میں تو یہی وقت ہے اس کے کھلانے پلانے کا۔

ارے بھئی نہ کھلاؤ نہ کھلاؤ مگر یہ بھی نہ کہنا کہ دودھ کم دیا اس نے؟

خدا خدا کر کے تین دن کے بعد جو چرواہا آیا تو بھینس نے جنگل جانے کے خلاف گاندھی صاحب سے زیادہ اونچی ستیہ گرہ اور سول نافرمانی شروع کر دی۔ جس طرف دیکھیے گھر والے بھاگ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، کود رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں محض اتنی بات پر کہ بھینس صاحبہ اپنے اکلوتے صاحبزادے کو تنہا چھوڑ کر جنگل جانے پر راضی نہیں تھیں اور خالو میاں اس کوشش میں تھے کہ کہیں یہ بچے کی محبت میں جنگل جانا نہ بھول جائے اس لیے کوئی نصف گھنٹے جو دنگل ہوتا رہا تو دل جانتا ہے کہ کتنا لطیف تھا یعنی آج بھینس کی اُچھل کود اور گھر والوں کی وحشت کا وہی پہلا دن نظر آتا تھا جس وقت یہ بھینس بازار سے نئی گھر میں آئی تھی اور اس کا باندھنا عذاب آخرت بنا ہوا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دس مرتبہ خود خالو میاں بھاگ کھڑے ہوئے تھے دالان کی طرف یہ کہہ کر کہ ارے بھئی ہٹنا اندر کو، مگر سب سے زیادہ غصہ وہ ہوتا تھا خالو میاں کا جو غریب چرواہے کے اوپر کیا جاتا تھا یعنی خود بھینس کو باہر نکالنے سے ڈر کر چرواہے پر چلاتے تھے کہ:

ابے مارتا ہوں جوتا پھینک کر یہاں سے۔

تو پھر کھڑا کیا ہے نامراد ذرا کھینچ رسی پکڑ کر اس کی۔

ہاں بڑھا اور ذرا آگے اب کی۔ اس عرصہ میں بھینس گردن ہلا دیتی تھی تو خالو میاں دو گز دور بھاگ کر فرماتے تھے کہ: تو بس چھوڑ دی ناری تو نے۔

ادھر گھر والوں کو اپنے اوپر ہنستا پا کر یوں خفت مٹاتے جاتے تھے کہ ادنہہ کچھ نہیں وہ دو چار دن اور ذرا بدکتی رہے گی کیونکہ بھئی اولاد کی محبت تو جانور میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ انسان میں۔ اسی عرصہ میں کہیں ایک مرتبہ چرواہے نے آہستہ سے کہہ دیا کہ حضور تو دور ہی کھڑے رہتے

ہیں وہ مجھ اکیلے سے کیسے بڑھے گی آگے۔ اب تو خالومیاں کی بات کا سوال تھا اس لیے ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر کوئی پانچ قدم آگے تیزی سے بڑھے یہ کہتے ہوئے کہ:

ابے تو کیا ہم کو ڈرپوک سمجھتا ہے تو۔

لے اب ہم آگئے یہاں تک اب تو بھی ادھر سے رسی کھینچ اس کی۔ غرض وہ ساجد ہی سے نہ رہا گیا اور انھوں نے جا کر بھینس کے ٹھیک منہ پر جو دس بارہ بید رسید کیے تو بھینس گھر سے باہر اور خالومیاں یہ کہتے ہوئے اپنے کمرہ میں کہ:

لونڈے ہی تو ہیں جب کام پر آجاتے ہیں تو یوں دو منٹ میں بڑے بڑے کام کر گزرتے ہیں ورنہ آج کل کے نوجوانوں سے تو ہم بوڑھے ہی اچھے۔ آج کہو تو دس کوس پیدل چل کر بتا دیں۔ کشتی لڑنے میں ہم اچھے، گھوڑے کی سواری میں ہمیں دیکھ لے کوئی، وزن اٹھانے میں کرلے کوئی ہم سے مقابلہ اور جناب یہ آج کل کے نوجوان ہیں کہ انھیں کنگھی چوٹی اور بناؤ سنگھار ہی سے فرصت نہیں لاحول ولا قوۃ اور کہتے کیا ہیں کہ آج کل کا فیشن ہی یہ ہے کہ لعنت ہے ایسے فیشن پر جو مرد کے بچے کو رنڈی کی صورت بنا دے۔

کوئی دس بجے دن کو ملا رموزی صاحب کے بھانجے خلیق عصمت طول عمرہٗ، ملا رموزی کے پاس آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "ماموں جان وہ اپنی بھینس کا بچہ تو مر گیا"۔ لیجیے گویا غریب آدمی بنا ہی اس لیے ہے کہ ہر مصیبت اسی کے حق میں ختم ہو جائے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے یہ سوچ کر کہ بھینس کے بچے کی وفات کا تو غم نہیں غم تو یہ ہے کہ اب اسے بھینسوں کے قبرستان تک لے جانے والوں کو قانون کی رو سے مبلغ ایک روپیہ دینا ہوگا اور اس لڑکے کے غم سے بھینس نہ معلوم کتنا دودھ کم دے گی۔ فی الجملہ اس حادثہ جانکاہ میں شریک ہونا ہی تھا اس لیے جو بھینس والے گھر میں گئے تو خالومیاں ہم سے بالکل اس طرح مخاطب ہوئے گویا ہمارے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے۔ بے ساختہ فرمایا:

صبر کرو بھئی، وہ کچھ تھا ہی بیمار سا۔

اچھا بھئی وہ جو تم ڈاک خانے جاؤ اپنی ڈاک لینے تو ذرا وہ چماروں سے کہتے جانا کہ وہ آکر اسے پھینک آئیں۔ ملاحظہ فرمایئے آپ نے ایک لطافت نگار کی یہ ڈیوٹی۔ عورتوں کی افسردہ دلی اس لیے نظر آئی کہ وہ سب یہ کہہ رہی تھیں کہ جس کام کو نفع سوچ کر کرتے ہیں اسی پر پتھر پڑ

جاتے ہیں۔ غرض بھینس کے لڑکے کے کفن دفن کے بعد ایک رات آواز آئی۔

کون ساجد؟ کیوں بھئی سوتے کیوں نہیں ہو؟

کیا خاک نیند آئے، یہ بھینس جو ہمارے سر پر باندھی گئی ہے۔

ہوا کیا؟

دیکھیے ذرا یہاں آ کر، خدا کی قسم مچھروں نے کاٹ کاٹ کر ڈھول بنادیا ہے میرے جسم کو۔

تو بھئی میرے پاس چارپائی لے آؤ تمھاری اور کہوں کیا خود میرا بھی یہی حال ہے، مگر دیکھو تو ساجد آخر اب اسے کہاں باندھا جائے، تم ہی بتاؤ؟ یہی حال میرا ہے آپا، خدا کی قسم کل رات تو میں لونڈے کو لیے رات بھر بیٹھی رہی مگر مچھروں نے نہ سونے دیا تو نہ سونے دیا، اچھی بلا گھر میں لائی گئی ہے۔

ارے بھئی صادق، کیا تمھیں بھی مچھر ستا رہے ہیں جو سوتے نہیں ہو۔

عجب مصیبت ہے اب اگر دھواں کرتے ہیں اس کے پاس تو بھی نیند نہیں آتی اور پھر لطف یہ کہ اتنی مصیبتوں پر بھی دودھ ہے کہ فروخت نہیں ہوتا۔

خیر اس وقت تو تم میری چارپائی پر آ کر سو جاؤ، کل کوئی تدبیر کریں گے ایسی کہ یہ تکلیف نہ رہے مگر ہاں یہ بھی سچ کہتے ہو تم کہ جگہ کہاں سے لائیں گے بس وہ میاں ملا رموزی صاحب کے دالان سے ملا ہوا جو دالان ہے اسی میں باندھا جا سکتا ہے اسے، مگر پھر ملا رموزی صاحب شاید ہم لوگوں کو زندہ ہی نہ رہنے دیں گے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ بھئی چند دن ہمیں تکلیف کی وجہ سے اس طرف بھینس باندھ لینے دیجیے۔ حالانکہ اس سے ان کا کوئی نقصان بھی نہیں مگر وہ تو مزاج پایا ہے ملا صاحب نے بادشاہوں کا، اس لیے ان سے کہے کون؟

مگر آپ نے ان تمام حالات اور مباحثوں میں کسی ایک سے یہ نہ سنا ہوگا کہ سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ اس بھینس ہی کو فروخت کر دیا جائے، لیکن بھینس فروخت نہ کرنے کے اسباب اوپر واضح ہو چکے ہیں اس لیے جملہ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہماری اس بھینس کے دودھ کے لیے بہ کثرت خریدار بہم پہنچا کر ہمیں ممنون و مسرور فرمائیں۔ فقط والسلام۔

◆◆◆

شفاخانہ

از

مُلا رموزدکانی

فہرست

- مقدمہ 247
- گلابی اردو (فیروزی دیباچہ) 253
- بخار 255
- کھانسی 265
- زکام 273
- جبل پور تک 283
- گھر تک 287
- ناگپور تک 293
- برہان پور میں 299
- آپریشن 301
- مراق 319
- غنودگی 333
- دردِ دل 339

مقدمہ

(بقلم خود)

اُس حکیم وشافی مطلق کے نام جس کی فرماں برداری ہی سے ساری خدائی کی فرماں روائی ملتی ہے، جس کی غلامی اختیار کرنے ہی سے دنیا جہان کی آزادی نصیب ہوتی ہے۔

اُس خدا کے نام جس نے اپنے آخری رسول احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے بھیجا کہ وہ ساری دنیا کو بتادیں کہ عبادت وعبودیت صرف خدا کے لیے ہے اور انسان انسان کی غلامی، ماتحتی، محکومی اور نمک خواری کی لعنت سے فطرتاً آزاد ہے۔

اُس خدا کے نام سے جس نے اس آسمان جاہ نبی کے گرامی جناب خاندان کے ہر فرد کو یہ برتر از قیاس وگمان مقدرت عطا فرمائی کہ وہ تبلیغ حق اور ضمیر وخیال کی آزادی کی خاطر کوفے اور کربلا کی بلاخیز فوجوں سے جا ٹکرایا مگر بے دل وبے حوصلہ نہ ہوا۔

اُس خدا کے نام سے جس نے خلفائے راشدین کو اپنی اطاعت وفرماں پذیری کے صدقے اور تعلیماتِ اسلامی کی لفظ لفظ پیروی کے باعث تاجدارانِ عالم کے زمرۂ اول میں جگہ دی اور جن کی جہاں بانی وجہاں داری میں انسانیت نے آزادی کی دولت پائی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

کہنے کو یہ زمانہ تعلیم وترقی کا وہ آخری زمانہ ہے جس کے بعد شاید ہی اس سے زیادہ بلند زمانہ آئے۔یعنی جب علم وفن کوایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے دریائی جہاز، ہوائی جہاز، ریل، تاراور علمی تقریروں کوایک شہر سے دوسرے شہر تک منتقل کرنے کے ہوائی آلات موجود ہوں، جب اعلیٰ سے اعلیٰ کاغذ، تصاویراور مطابع موجود ہوں جو ذہنی اور فکری ترقیوں کو بلند سے بلند کرنے کو تیار ہوں تو پھر بتایئے کہ علمی وفنی ترقی کے لیے اس سے اونچا زمانہ کہاں سے آئے گا؟ مگر اس پر بھی زبانِ اردو کے علما واصحابِ قلم اپنی درماندگیوں کوآج بھی جو بیٹھے رورہے ہیں اس کے چند تلخ اسباب ملاحظہ ہوں:

1۔ سبب اول یہ کہ ہندستان میں موجودہ زمانے کی تعلیم وتربیت سے تعلیمی ذہنیت ضرور پیدا ہوتی ہے مگر علمی ذہنیت نہیں، اسی لیے حصولِ علم کا شور اپنی حد سے گزرا ہوا ہے مگر علما پیدا ہونے کے عوض دفتری محرراور افسر پیدا ہوتے ہیں، ورنہ بتایئے کہ پھر بی۔اے اور ایم۔اے پاس طبقہ تھیٹر، سینما، گھوڑ دوڑ، ہاکی، فٹ بال، کرکٹ اور یورپ کی تفریح پر جتنا حریص ہے اتنا علمی مضامین اور علمی مطالعہ پر حریص کیوں نہیں پھر ''غیرعلمی ذہنیت'' پیدا ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ہندستانی فضیلت کی سند حاصل کرکے بھی غیرقومی آداب واطوار اور غیرقومی اشیاء کا قدردان اور شائق ہوتا ہے اور اپنی آبائی تہذیب سے نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ جن ہندستانی امراء اور اصحابِ دولت کو وطنی مصنوعات اور وطنی افکار کا سب سے زیادہ قدردان اور سرپرست ہونا چاہیے تھا کیا سبب کہ وہی امراء اور اصحابِ دولت ''پانیئر'' پسند اور ''یورپ طلب'' بنے چلے جارہے ہیں؟ اوران کی زندگی کے کسی آخری گوشہ میں بھی وطنی زبانوں، وطنی فنون اور وطنی عادات واوضاع کی جھلک اور سرپرستی کا جذبہ موجود نہیں؟

2۔ سبب دوم یہ کہ زبانِ اردو کے باوصف خالص ہندستانی پیداوار ہونے کے اسے ہندو، سکھ، پارسی اور دیسی عیسائی اپنی مادری اور ملکی زبان تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔رہے مسلمان تو ان کے دماغوں پر صرف یہ عقیدہ غالب ہے کہ دماغ و دولت کی تمام مقدرتیں خرچ کرکے انگریزی زبان کو مادری زبان سے زیادہ بہتر طریق پر سیکھ لینے ہی میں نجات ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ آج 95 فیصدی انگریزی یافتہ مسلمانوں کی اردو ایسی ہی ہے جیسے کسی زمانے میں لالہ

لوگوں کی فارسی ہوا کرتی تھی۔

3۔ سبب سوم یہ کہ اردو کی تباہی میں خود اردو کے اخبارات اور رسالے خاصا حصہ لے رہے ہیں اور وہ اس طرح کہ آج کل اردو کے اخبارات اور رسالے اُنھی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو تعلیمِ جدید کے اثرات سے متاثر ہی نہیں بلکہ مخبوط سے ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اخبارات اردو اور رسائلِ اردو کے تیار کرنے والوں نے اپنی قومی غیرت کے فقدان اور اردو میں کافی مقدرت نہ ہونے کے باعث اس کے ذخیرۂ ادب میں غیر زبانوں کے بے ضرورت اور بے محل الفاظ اس کثرت سے ٹھونس دیے ہیں کہ اگر ان کی اردو کو میر انیس د کان اور مرزا داغ دکان کی مکمل اور شیریں اردو سے ملایا جائے تو ان دونوں میں مسلم اور نومسلم کا فرق نظر آئے گا۔

4۔ مطبوعاتِ اردو یا تصنیفاتِ اردو کو بہتر سے بہتر الفاظ میں شہرت دینے کے لیے اخباراتِ اردو اور رسائلِ اردو میں نہ صلاحیت نہ جذبہ۔ حد ہوگئی کہ ملا رموزی ایسے مقبول مضمون نگار کی کتابوں کو نمایاں کرنے کے لیے ان اخباروں نے اُس سے اتنے مضامین معاوضہ میں طلب کیے کہ بالآخر وہ تھک گیا اور اس نے اپنی کتابیں ان اخباروں اور رسالوں میں تنقید و تشہیر کے لیے بھیجنا ہی بند کر دیا، پھر نئے مصنفین کی کتابوں کا حشر سامنے ہے۔

5۔ ہر زبان کی ترقی کا ذریعہ یا حکومت یا دولت مند طبقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آج ہندو رؤسا اور ہندو دولت مند ہندی زبان کو ہندستان کی واحد اور سرکاری زبان بنانے کے لیے اپنی دولت کو جس فراخ حوصلگی سے صرف کر رہے ہیں، جتنے زیادہ مطابع اور اہلِ قلم ہندی زبان میں کام کر رہے ہیں اُس کا لازمہ یہ ہے کہ آج ہندی زبان میں سیاست و اخلاق اور مذہب و معاشرت سے لے کر زندگی کے ہر حصہ پر کافی ذخیرہ معلومات کا مل سکتا ہے، بخلاف اس کے مسلمان کی تمام تر دولت یا یورپ کی سیاحت پر صرف ہورہی ہے یا یورپین وضع کی تفریحات پر بلکہ مجھے تو اطمینان ہے کہ یورپ کی تفریحی تقلید میں مسلمانانِ ہند نے جتنی دولت مس زبیدہ جان ناٹک والی پر خرچ کردی ہے اُتنی دولت سرسید علیہ الرحمۃ کو بھی نہ دی ہوگی اور صرف مسلمان کی اردو سے اس یکسر بے خبری کا باعث ہے کہ آج زبانِ اردو علوم و

فنون اور حیات بخش ذخیرۂ ادب سے خالی ہے اور تاریخ وطن اور تاریخ اردو میں موجود زمانے کے مسلمانوں کے لیے اس بے حیا ذہنیت پر جو کچھ لکھا جائے گا اُن کی آئندہ نسلیں بھی اُن پر نفرین بھیجنے پر مجبور ہوں گی۔

میرا مقصد تحریر ہمیشہ یہ رہا کہ قوم میں زوال وغلامی، غیر قومی علوم اور غیر قومی تربیت سے جو افلاس انگیز اور موت آور ذہنیت پیدا ہوگئی ہے قومی افراد کے دماغوں میں متانت وسنجیدگی نام کی جو خشکی اور افسردگی پیدا کردی گئی ہے، ملازمت کی لعنت اثر زندگی اور اولاد کی کثرت سے جو مالی تباہی پھیل پڑی ہے اور اس سے جو مزاجی خشکی اور دماغی پریشانی چھائی ہوئی ہے اس کا یہ ''مولویانہ اثر'' ملاحظہ ہو کہ ہندستانی لوگ اپنی تفریحی مجالس اور تفریحی تقاریب میں بھی اتنے گاڑھے اور موٹے موٹے واللہ چنانچہ بنے رہتے ہیں گویا فی قہقہہ انھیں دس دس سال کی سزا دے دی جائے اگر اور وہ اپنی تفریحی محفل میں کہیں ہنس پڑے۔

بس مسلمانوں کی رونے والی فطرت کی حد ملاحظہ ہو کہ حضرت میر انیس نے اپنے مرثیہ میں شجاعت پناہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شجاعت وتیغ افگنی کے جتنے جوش انگیز واقعات لکھے انھیں تو طاق پر رکھ دیا اور مرثیہ کا وہ حصہ لے کر بیٹھ گئے جس میں رونے اور رُلانے کے حالات جمع ہیں۔ پس چاہتا ہوں کہ یہ رونے والی قوم میرے ذخیرۂ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی، ہنسی اور خوش طبعی کی امنگ اور مسرت اندوز زندگی کی بہاریں حاصل کرے اور نول کشوری مطبع کے مولویوں نے جتنی کتابیں قیامت اور دوزخ کے عذابوں سے ڈرانے اور رُلانے کے لیے لکھی ہیں ان کے مقابل جنت کی بہاروں کا کوئی تحریری نمونہ بھی موجود رہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب ظرافت میں سیاست یا سیاست میں ظرافت کا رنگ بھرنا اصحابِ قلم کے بس کی بات نہ تھی اور آج بھی یہی عالم ہے کہ ظرافت نگار تو بدقسمتی سے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان کا قلم جو کچھ لکھتا ہے اس کے چھچھورپن سے اپنے مضامین کو بلند رکھنے کا ایک یہی طریقہ ہوسکتا تھا کہ میں اپنے مضامین میں پھر کوئی امتیازی انداز پیدا کروں۔ پس اس مقصد

کے تحت میں نے چند ایسے مضامین لکھے جو خالص علمی موضوعات کی شان رکھتے تھے اور ان پر کوئی مولوی ہی قلم اٹھا سکتا تھا، مگر میں نے انھی خشک موضوعات کے ظریف کردار کو پیش نظر رکھ کر ان پر جو کچھ لکھا اس کا مقصد یہ تھا کہ متانت پیشہ یا خشک فطرت قوم میں اسی طرح علمی مذاق اور ظریف تحریروں کو مقبول بنایا جائے ورنہ آپ ہی بتایئے کہ ''زکام'' اور ''کھانسی'' پر گل بنفشہ، عناب، گاؤزبان، شربت بنفشہ، حب سُرفہ اور لعوق سبستان تو لکھا جا سکتا تھا مگر مضمون نہیں۔ اسی طرح میں نے ''رائے'' قانونی زندگی، شکایت وغیرہ خشک موضوعات پر علمی ظرافت کا رنگ چڑھا کر پیش کیا۔ غرض یہ اُن غیر ظریف موضوعات کے ظریف کردار کا ایک نمونہ ہے جو پسند آ جانے پر اور زیادہ مقدار میں پیش کیا جائے گا۔

اس کتاب کا نام ''شفاخانہ'' علاوہ مضامین کی صحیح نسبت کے اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر غم والم، فکر و پریشانی کے امراض میں مبتلا قوم کو صحت حاصل ہو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ''شفاخانہ'' اسی گھر کا نام نہیں جس میں آدمی اور اس کی بیوی بیمار ہو کر جاتی ہے بلکہ شفاخانہ اس گھر کا نام ہے جہاں سے انسان موت اور خطرات سے محفوظ اور خوش دل ہو کر نکلتا ہے۔ اس مقدمہ کے بعد ''گلابی اردو'' کے عنوان سے جو ''دیباچہ'' لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ طرز تحریر میرا سب سے پہلا طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ میں ملک میں روشناس ہوا ہوں اور میرے قدر دان بھائیوں اور بہنوں میں ایسے بے شمار بہن بھائی موجود ہیں جو میرے اسی طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ پس کچھ تو اس طرز تحریر کے بقا اور یادگار کے طور پر اور کچھ ان حضرات کے پاس خاطر کے طور پر ''گلابی اردو'' کا ایک دیباچہ عرض ہے:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ الکریم والسلام علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

مُلّا رموزی

22 رشعبان المعظم 1351 ہجری اسلامی

21 ردسمبر 1932 عیسوی

گلابی اُردو

فیروزی دیباچہ

امابعد اے محترم مفت کی کتابیں پڑھنے والو!

کیا نکر اُچک لے گیا شیطان راندا ہوا عقلوں درجہ سوم تمھاری کی کو یا نہ رہی غیرت بیچ دلوں سیاہ تمھارے کے کہ پڑھتے ہو کتابیں تم مانگ کر دوستوں بھی محلے والوں سے مگر نہیں شرماتے تم۔ پس قسم ہے اس بے شرمی تمھاری کہ گالیاں دیتا ہے تم کو پیچھے تمھارے وہ شخص کہ مانگ کر لاتے تم کتاب جس سے۔ پس اگر باقی ہے بیچ دل و دماغ تمھارے کے حرارت اے گرمی غیرت کی تو خود خرید کر پڑھا کرو تم کتابیں موافق پسند اپنی کے کیونکہ البتہ تحقیق ہے یہ کام بُرا۔ پس دور ہو تم اُس سے اور جو نہیں سکتے ہو یا نہیں سکتی ہو تم خریدنا مبلغ کتاب کا بہ سبب افلاس اپنے کے تو صبر ہی بہتر ہے واسطے تمھارے کیونکہ نہیں ہے اور البتہ تحقیق نہیں ہے ضروری یہ کہ فروخت کی جائے غیرت بدلے کسی کتاب کے جیسی کہ فروخت ہو رہی ہے غیرت اور حیا ہندستانیوں کی ذریعہ سے نئی تمدن اور نئی تہذیب کے۔ پس کیا نہ دیکھا تو نے اے شاگرد نیک بخت کہ چلتی ہیں اوپر سڑکوں ٹھنڈی کے ہندستان زادیاں اُٹھا کر سینہ اپنا ساتھ طریقوں یورپ کے مگر یہ کہ بے خبر ہیں وہ رسوائی اپنی سے مگر اے عجب ماں باپ ایسی مساتوں کے۔

پس تحقیق کہ نہیں ہے یہ دیباچہ ہٰذا انگر ملا ہوا او پر نکتوں چند اور او پر حکمتوں چند کے۔ اگر سکو تم کرنا غور کا اندر نکتوں اس کتاب اور اندر ناچ مس زبیدہ جان۔ پاؤڈر لگا کر ناچنے والی کے کہ تحقیق یہی اور لاجرم یہی ہے وہ کتاب بیچ زبانِ اردو کے کہ صحیح ہے عبارت اس کی از روئے قواعد زبان کے بھی بادصف ہونے اس قدر موٹی کے خالی ہیں سطریں اس کی بے ضرورت الفاظ اور جملوں انگریزی سے جس طرح خالی ہوا کرتے ہیں وعدے اور اقرار دولت مندوں کے یا جیسے خالی ہوتے ہیں طلبا اکثر اس ہٰذا مانے کے مردانہ شجاعت سے یا ڈاکٹر لوگ ہمدردی اور مروت سے یا جس طرح خالی ہوتے ہیں اکثر پیر اور صوفی اس زمانے کے کرامت اور نفع پہنچانے سے یا ایڈیٹر اخباروں اردو کے علوم سیاست اور اصولِ اخبار نویسی سے یا بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی لوگ صحیح اردو لکھنے سے بھی۔ موافق قولِ حکیم بزرجمہر کے یہی ہے وہ کتاب ہٰذا کہ پڑھنے اس کے سے پیدا ہوتی ہے جوانی امنگ ترنگ بھی خوشی اور ہلسی اندر آدمی بھی مساۃ کے۔ پس اگر ہو تم رکھنے والے عقل سلیم اور مذاقِ علمی کے تو خریدار پہنچاؤ ہم کو اس کتاب کے ساتھ کثرت زیادہ کے تا دن حشر کے نجات پاؤ تم تعزیرات ہند اور پریس ایکٹ سے بھی محل موتیوں کے ملیں تم کو بھی مساۃ تمھاری کو بیچ دہلی کے، کیونکہ قسم ہے بڑھاپے پنڈت مالوی اور موٹاپے مولانا شوکت علی صاحب کے کی جب لطف اٹھاتے ہو تم کتاب سے ملا رموزی کی تو لطف پہنچاؤ تم خریداروں زیادہ سے ملا رموزی اپنے کے کو۔

اب کیا کیا خوبیاں ملا رموزی بھی کتابوں اُس کی کے جھٹلاؤ گے؟

◆◆◆

بخار

دیوبندی قماش کے مضمون نگار ہر مضمون کو جب امابعد سے شروع کرتے ہیں تو پہلے ازروئے لغت و بلاغت اس کے معانی و مطالب سمجھاتے ہیں پھر کہیں اصل مضمون شروع کرتے ہیں لیکن علی گڑھ والے اسے لغویت کہتے ہیں اور ابتدا ہی سے اصل قصہ شروع کر دیتے ہیں۔ بعض مضمون نگار اپنا مضمون شروع کرتے وقت منطق و فلسفہ کے موٹے استعارے اور مصطلحات استعمال کرتے ہیں اور عوام اس کے فوائد سے ایسے ہی محروم رہ جاتے ہیں جیسے ہم اور آپ ہندستان کی خام پیداوار سے، مگر ہم ان سب کے خلاف ہیں اور آج کل مسلمانوں کا شعارِ زندگی ہی اختلاف ہے لہٰذا جان جایئے کہ ہم قدرے دیوبندی مضمون نگاروں کے مقلد ہیں اس لیے آج ہم پہلے اپنے مضمون کے قدرے معنی سمجھاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ بخار کے معنی ہیں یکا یک جامۂ انسانیت سے باہر ہو جانا۔ ایسی حرکتیں کرنا جو عوام و خواص کے نزدیک مضحکہ انگیز ہوں مثلاً دن رات چارپائی پر پڑے رہنا، اُچھلنا کودنا، چلاّنا، ایک دم چپ سادھ لینا، پھر چلاّنا، اونہہ کرنا، ہائے ہائے کرنا، اللہ میاں کو بکثرت پکارنا، توبہ کرنا، لحاف پر لحاف اوڑھے چلا جانا، کم کھانا، زیادہ پینا اور بیوی بچوں کو دیکھنا اور رونا۔ پس اس قسم کی علامتیں جس میں پائی جائیں سمجھ لو کہ یہ بخار میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اب ازروئے طب یونانی جس قسم کے بخاری آج کل پائے جاتے ہیں ان کے نمونے

ملاحظہ ہوں.......... یہ بخار والے کو یائے صفت کے ساتھ جو بخاری کہا ہے تو اس سے شہر بخارا کے وہ بخاری مراد نہیں ہیں جو علوم عربیہ پڑھنے کے لیے ہندستان سے مر کر ہی وطن واپس جاتے ہیں اور کبھی تکمیل نہیں ہونے پاتی۔ بہر حال بخاری سے مراد بخار میں مبتلا ہونے والا یا ہونے والی ہے۔ اگر اس میں کوئی علمی غلطی ہو تو اسے کاتب کی غلطی سمجھیے۔

بادشاہوں کا بخار:

بفضل ایزدی یورپ بہ استثنائے حکومت تندرست تر کی جس قدر بادشاہ لوگ ہیں انھیں ایک مرتبہ بخار ضرور آتا ہے مگر ان لوگوں کو بخار سے اس وقت تک صحت نہیں ہوتی جب تک کہ یہ لوگ تبدیل آب وہوا نہ کریں اور تبدیل آب وہوا صرف یورپ ہی میں ہوتی ہے۔ یورپ کی اس آب وہوا کی شفا بخشی پر دہلی کے ''بڑے حکیم جی'' بہت حیران ہیں کہ جو گیا صحت یاب ہو گیا یہ کبھی نہیں سنا کہ ایک دیسی بادشاہ صاحب یورپ ہی میں دھرے رہ گئے۔ الّا مہاراجہ گوالیار سو وہ بھی اپنی غلطی سے فرانس چلے گئے تھے۔ سنا ہے کہ دیسی رئیسوں کے لیے یورپ کے دفتر خارجہ میں اچھے اچھے نبض شناس موجود ہیں۔ ان لوگوں کے مصارف علاج، رعایا ٹیکس دینے والے اور کاشتکار ادا کرتے ہیں جو کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

امیروں کا بخار:

امیروں کو بخار آتے ہی ان کی کوٹھیوں میں سناٹا طاری ہو جاتا ہے جاں حضور نے کروٹ لی کہ یورو پین ڈاکٹر حاضر ہو گیا۔ ان کے بخار کی ابتدا ایک ہزار روپیہ یومیہ فیس والے ڈاکٹر سے ہوتی ہے اور انتہا دس ہزار روپیہ فی گھنٹہ فیس والے ڈاکٹر پر۔ یہ لوگ یونانی دواخانہ دہلی کی دواؤں کو انتہائی غیر شائستہ سمجھتے ہیں جتنا یورپ والے سوراج کے لیے آپ ہندستانیوں کو۔ غرض بخار کی ہر حرکت میں انگریزوں کی حرف بہ حرف نقل کرتے ہیں، لیکن جب ڈاکٹری تشخیص ''آپریشن'' پر مجبور کرتی ہے تو پھر آہستہ سے دہلی والے ''بڑے حکیم جی'' کا پُل ٹس استعمال کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ امیروں کے بخار آنے سے ان کی ''عورت ذات'' روتی چلاتی نہیں، البتہ فقیروں کے نام سے ان کے ملازمین خوب پلاؤ کھاتے ہیں ''صدقے کے بکرے'' ذبح ہوتے ہیں، پیروں کے نذرانے دیے جاتے ہیں اور مستحقین بھوکے مرتے رہتے ہیں۔ امیروں کا بخار اکثر تاش کھیلنے اور

گھوڑ دوڑ وغیرہ سے بھی جاتا رہتا ہے۔

لیڈروں کا بخار:

ہندستانی لیڈروں کو کافی چندہ جمع کر لینے کے بعد بخار ضرور آتا ہے۔ ان لوگوں میں بخار آنے کو کہتے ہیں ''کام کرتے کرتے صحت خراب ہوگئی ہے'' اور جوں ہی کہ صحت خراب ہوئی ان کو ڈاکٹروں نے تقریر بند کردینے کا مشورہ دے دیا اور منصوری یا شملہ تو وائسرائے ہند کے ڈر سے جاتے نہیں البتہ اگر چندہ کافی ہے تو یورپ ضرور جاتے ہیں ورنہ ''کشمیر'' اور اگر شدھی کا بھی زور رہا تو اکثر لیڈر کسولی بھی جایا کریں گے۔ لیڈروں کو بخار آتے ہی اردو اخبارات کے صفحات سیاہ ہوتے رہتے ہیں۔ روزانہ کی سابقہ خدمات کے تذکرے ہوتے ہیں ''رفتار صحت'' شائع ہوتی ہے۔ بیمار لیڈروں کو اخبارت ''صاحب فراش'' کہتے ہیں جسے ہندو اخبار پڑھنے والے ''فراش'' پڑھتے ہیں۔ ان لوگوں کا جسم بھی تولا جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ بولیں کہ کیا لیڈروں کے وزن کے ساتھ ان کی ایماندرانہ قومی خدمات بھی تولی جاتی ہیں؟ اس پر ہم نے جھنجھلا کر کہا دیکھو جی تم ہو ''صنفِ نازک'' تمھیں اس قسم کے سوالات کا کیا حق ہے۔ ان کی حالت اخبارات میں ہمیشہ ''روبہ صحت'' رہتی ہے یہ کبھی نہیں کہ آج تو ختم البتہ کبھی کبھی ''حالت نازک'' ہو جاتی ہے اور جو کبھی بیمار لیڈر صاحب ہوئے قوم کے مسلمان تو بس پھر حالت نازک ہوتے ہی تمام مساجد میں دعائے صحت کے لیے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور چلا چلا کر اللہ دے اور بندہ لے۔ اس موقع پر وہ پھر بولیں کہ ''یہ مسلمان مرد جلسوں میں ہماری طرح بات بات پر رویا کرتے ہیں؟'' ہم نے کہا کہ ''لیڈر خود رو رو کر تقریر کرتے ہیں اور اسی کو کامیاب تقریر سمجھتے ہیں''۔

افسروں کا بخار:

یوں تو خدا ہر ہندستانی کو غلام ہی رکھے کیونکہ اس کا افسر ہونا اس کے ہم قوم ماتحتوں کے لیے قیامت سے کم نہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ پچاس روپلی کا ہندستانی ملازم بھی خود کو افسر سمجھتا ہے لیکن خصوصیت سے خدا مسلمانوں کو مسلمانوں کا افسر تو کبھی نہ بنائے کیونکہ خیر سے ہندستانی مسلمان کا دماغ افلاطون کے دماغ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہندستانی افسر صاحب بیمار ہو گئے یا حرارت ہی ہوگئی تو بس آپ کی بیمارداری کے لیے تمام عملۂ ماتحت کو ہڑتال کرنا پڑتی

ہے۔ جس ماتحت کو دیکھیے آپ کے دولت کدہ پر خیریت دریافت کرنے حاضر ہے اور اگر کوئی رازق سمجھنے والا حضور کے دولت کدہ پر حاضر نہ ہوا تو سمجھ لو کہ افسر صاحب کے نظر میں اس کے برابر گستاخ، نمک حرام، کام چور اور نااہل کوئی دوسرا نہیں۔ ہمارے ایک دوست نے تجربہ کیا کہ افسر صاحب کی بیماری میں مستعدی سے ان کے پاؤں داب دیے۔ دوسرے ہی مہینے ان کا اضافہ کر دیا گیا۔ غرض ان کی بیماری کی تمام خانگی خدمات سرکاری اہل کار اور چپراسی انجام دیتے ہیں۔ یہ ایک ہی دن کے بخار میں اس قدر کمزور ہو جاتے ہیں کہ ماتحتوں سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے جبھی تو خدا ان ہندستانی گنجوں کو سوراج کے ناخن نہیں دیتا۔

بچوں کا بخار:

اللہ عمر دراز کرے ہمارے ننھے میاں کی عمر کے بچے بخار سے اتنے ہی بے پروا ہوتے ہیں جتنا یورپ والے مشرقی ممالک کی آزادی سے۔ لہٰذا جب بچوں کو بخار آتا ہے تو صرف ان کا منہ لال ہو جاتا ہے مگر کھیلتے ہی پھرتے ہیں البتہ ان کی والدہ کا برا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ادھر بخار آیا اور اُدھر اس کی ماں نے اس کے باپ پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیا، حکم ہوا کہ جاؤ حکیم کو لاؤ، ڈاکٹر کو لاؤ، بڑے مولوی صاحب کو لاؤ، پیر صاحب سے تعویذ لاؤ، بکرا ذبح کرو، نیاز دو، فاتحہ پڑھو۔ اُدھر اللہ میاں سے کہنا شروع کیا اگر میرا بچہ اچھا ہو گیا تو نفل پڑھوں گی، روزے رکھوں گی، مساکین کو کھانا کھلاؤں گی وغیرہ۔ اب اگر ان تمام باتوں میں سے کسی ایک کے متعلق شوہر صاحب نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو پھر قیامت ہے۔ رات بھر بچہ کو گود میں لیے بیٹھی ہیں، کبھی روتی ہیں تو کبھی دعا کرتی ہیں۔ اب اگر کہیں دن بھر کی ملازمتی تھکن سے شوہر صاحب ہو گئے تو اودھم مچا دی۔ گو صبح کی ٹھنڈی ہواؤں سے خود چراغ پا کر ہو کر رہ جاتی ہیں، مگر رات بھر تمام گھر مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا ایک بچہ کو بخار نہیں آتا تمام خاندان بخار میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

طلبا کا بخار:

طلبا کا بخار نہایت پُر لطف ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں دس برس سے بیس برس کی عمر تک روزانہ بخار آنے کی تمنا ہر طالب علم کے دل میں خود بخود پیدا ہوتی ہے خصوصاً مدرسہ کے اوقات میں نہایت پابندی سے بخار آتا ہے اور اگر بے رحم والدین نے اس حالت میں بھی مدرسہ

بھیج دیا تو پھر طالب علم درجہ میں بیٹھتے ہی نہایت اہتمام سے کراہتا ہے، ہاتھ کے رومال سے سر کو باندھ لیتا ہے۔ بخار کے ساتھ ہی سر میں درد، پیٹ میں درد اور ہاتھ پاؤں میں درد ضرور ہوتا ہے کیونکہ درد کسی ماسٹر کو نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جہاں چاہا درد بتلا دیا۔ خاص کر ریاضی اور دینیات کے گھنٹوں میں درد حد سے گزر جاتا ہے مگر ہاکی اور فٹ بال کے وقت طاعون کے طلبا بھی تندرست ہو جاتے ہیں۔ البتہ تعلیم کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی طالب علم منہ بسور لیتا ہے۔ اسے اُبکائی پر اُبکائی آتی ہے۔ آنکھیں مل مل کر سرخ کر لی جاتی ہیں۔ جمائی پر جمائی لی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ماسٹر تنگ آکر چھٹی دے دیتا ہے اور طالب علم صاحب اسکول کی عمارت کے سامنے تک نہایت ضعیف رفتار سے چلتے ہیں گویا آپ کو چکر آرہا ہے، لیکن جوں ہی کہ اسکول کی عمارت سے آگے بڑھے کہ قہقہہ لگایا اور بخار جاتا رہا گویا ماسٹر کو بے وقوف بنالیا۔ ایسے بخار میں لاڈ پیار کرنے والے ماں باپ سے یہ بخاری طالب علم سائیکل، موزے اور فیشن کی ہر چیز آسانی سے وصول کر لیتے ہیں۔

ہمارا بخار:

اسلامی عقیدہ ہے کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو بیمار کر کے ان کے گناہ اور بلائیں کم کر دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بیماری اصل میں انسان کے جسم کی زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا اس حساب سے ہر مسلمان کو جس کی ہمارے سوا کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور بیمار ہونا چاہیے۔ آپ کاہلی نہ سمجھیں تو ہم کہے دیتے ہیں کہ دنیا میں اگر ہم کسی کام کو بدترین کام سمجھتے ہیں تو وہ غسل کرنا ہے اور اسی لیے ہم بجز عیدین کے کبھی نہیں نہاتے کیونکہ اس میں علاوہ پانی کے اسراف کے وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ مگر برا ہو اس موسم گرما کا کہ 10 جون 1928 کی دوپہر کو بے دم کر دیا۔ اِدھر قوم کی ظالمانہ قدر دانی اور منافق دوستوں کی دراندازیوں سے خس خانہ بھی باقی نہیں ہے۔ لہٰذا چار و ناچار غسل جو کیا تو لو لگ گئی۔ صبح جو بستر سے اٹھنا چاہا تو اکڑے ہوئے تھے۔ تنگ آکر لیٹے ہی لیٹے کلمہ شریف پڑھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد حرارت شروع ہو گئی۔ حرارت میں یہ ہوتا ہے کہ اچھا خاصا انسان خواہ مخواہ اکڑنے لگتا ہے، جمائیاں بہ کثرت آتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاتھ پاؤں بھی جب اونچے نیچے ہونے لگے تو ہم نے اُن سے کہا کہ:

''دالان میں چارپائی بچھادو اور لحاف اُڑھادو کیونکہ ہمیں بخار آنے والا ہے''۔

وہ بولیں تمھیں تو وہم ہو گیا ہے جاؤ باہر چبوترے پر جا بیٹھو، ذرا دل بہلاؤ تو مگر دل ذرانہ بہلا اور ہاتھ پاؤں مٹکاتے ہوئے پھر گھر میں آ گئے اور کہا کہ چادر اڑھا دو، پھر کہا لحاف اُڑھا دو، پھر کہا دوسرا لحاف، پھر تیسرا لحاف، پھر چوتھا، پھر پانچواں، پھر چھٹا، پھر ساتواں، پھر آٹھواں، پھر نواں۔ یہ گویا تمام عزیزوں کے لحاف تھے جو ہمارے اوپر ڈال دیے گئے مگر سردی کم نہ ہوئی تو وہ بھی ہمارے اوپر لد پڑیں مگر کپکپی کا یہ حال کہ جاتی ہی نہ تھی یہاں تک کہ اب ہمیں خبر نہیں کہ ہم کہاں گئے۔ آنکھ کھلی تو کہا سیلا بچی لاؤ اور اب غوغو کرنا شروع کر دیا جسے عرف عام میں استفراغ کہتے ہیں۔ اس کے بعد کہا "ارے رے، اُف رے، اللہ رے یا اللہ، یا خدا، توبہ، توبہ ہے توبہ، ہائے رے کہ پھر اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ رو رہی تھیں، مگر ہم نے انھیں روتا دیکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب جو کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ لاہور کے ہندو مسلم فساد میں کسی سکھ نے ہمارے سر میں کرپان ماردی ہے اور سر ہے کہ مارے درد کے اُٹھایا نہیں جاتا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر اجرت بوجھ اٹھاتے اٹھاتے جسم چور ہو گیا ہے کہ پھر اب جو آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی میں قیام امن کے لیے پولیس خواہ مخواہ گولی چلا رہی تھی اور ہماری دونوں ٹانگوں میں گولی لگ گئی ہے لہٰذا مارے درد کے لگے چارپائی پر پاؤں مارنے کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ بیٹھی پاؤں داب رہی ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے ورنہ اس وقت اگر ہوتی کوئی گرلس اسکول کی تو جھولے پر اکڑی بیٹھی رہتی اور خادمہ کو حکم دیتی کہ پاؤں دابو کہ یکایک ننھے میاں نے چیخ ماری اور انھوں نے ہمارے پاؤں چھوڑ کر ننھے میاں کو گود میں لے لیا کیونکہ ننھے میاں کو آشوب چشم کا عارضہ تھا اور گو ہم نے پھر بھی ٹانگیں ماریں، خوب شور مچایا مگر انھوں نے ننھے میاں کے مقابل ہماری طرف دیکھا بھی نہیں کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دین دنیا کی راحت حضرت والدہ محترمہ سرہانے بیٹھی ہیں مگر بے حد ملول و آبدیدہ۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور عرض کیا کہ آپ آرام فرمائیے صرف دعا کا محتاج ہوں کہ پھر، اب جو آنکھ کھلی تو محترمہ ممدوحہ نے فرمایا کہ بیٹا گھبراؤ نہیں تمھیں بخار ہے کہ ہم پھر، اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عزیزہ ہمشیرہ اور قبلۂ دو جہاں والد صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کہ ہم پھر اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ یہ تمام سرپرست اور رفیق و مہربان دعائیں کر رہے ہیں کہ ہم پھر، مگر فوراً ہی سنبھل کر کہا کہ ہمیں تکیہ کے سہارے سے بٹھا دو۔ اس وقت بخار کی شدت لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی اور ہمارے حواس، بس بیٹھتے ہی ہم نے وہ دھواں دھار تقریر شروع کر دی جو شدید بخار کی حالت میں

ہر لیڈر، مدبر، فلاسفر اور ایڈیٹر کرتا ہے۔ عنوانِ تقریر تو صرف اتنا تھا کہ:

''ہم اچھے ہو جائیں گے آپ حضرات گھبرائیں نہیں مگر الفاظ کی شوکت، ترتیب، ترصیع اور بندش کی تعریف کچھ سننے والوں ہی کو معلوم ہے اور گو تقریر ہم نے کی تھی مگر خود ایک لفظ یاد نہیں رہا البتہ ہماری وہ تقریر جس کو انھوں نے کسی قدر قلم بند کیا تھا یہ ہے۔ مثلاً ہم نے یکا یک کہا:

پانی لاؤ، لاؤ، لاؤ، لاؤ، جب پانی دیا تو کہا کہ اس میں پیاز کا بگھار کیوں نہیں دیا؟''۔

ان جملوں کو عنوان کی تقریر سے ملاتے جایئے دیکھیے کس قدر ربط و مناسبت ہے پھر کہا جی ہاں، جی ہاں بہت اچھا حاضر ہوا حالانکہ اس وقت ہمیں کسی نے آواز نہیں دی تھی۔ پھر کہا ٹوپی لاؤ ٹوپی حج کا وقت جا رہا ہے۔ عمر گزر گئی، لندن اور پیرس جانے کے سوا مکہ معظمہ کا کبھی خیال بھی نہیں آیا اور نہ آج کل کے مسلمان امیروں کو آتا ہے مگر پھر کہا ارے بھائی تانگہ لاؤ ورنہ حج ہو جائے گا، پھر کہا نہیں نہیں مضمون غلط چھپا ہے غلط پھر کہا سو روپیہ فی صفحہ لیں گے سو روپیہ حالانکہ اردو کا ایک رسالہ بھی نہیں جو ایک روپیہ فی صفحہ معاوضہ دیتا ہو سب کے سب، براہِ کرم، ہی طلب فرماتے ہیں۔ پھر اس انگریز کو سامنے سے علاحدہ کر دو خدا معاف فرمائے یہ ہمارے بڑے سالے صاحب تھے اور اسی لیے وہ بعد صحت بہت خفا تھیں اور کہتی تھیں کہ تم بخار میں بہت بکتے ہو اور اب دیکھنا اس مضمون کو پڑھ کر وہ اور بھی آگ بگولہ ہو جائیں گی کہ ہم نے ظاہر بھی کر دیا پھر کہا وہ منی آرڈر والا آ گیا خدا سمجھے افلاس میں ایسی ہی سوجھتی ہے۔ غرض اس تقریر کا وہ زور رہا کہ الامان، مگر آخر میں کہا لا الٰہ اشہد ان اللہ استغفر اللہ مگر یہ الفاظ قبلہ والد مدظلہ کی ڈانٹ کا نتیجہ تھے۔ ہماری اسلام دوستی کا اثر نہیں کہ ہم پھر۔ اب بخار نے اپنی آخری شدت اختیار کر لی کہ یکا یک قارورہ کی حاجت ہوئی اور ہم لحاف پھینک کر اٹھے۔ اب جو قارورہ کے لیے چوکی پر جا کر بیٹھے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ شدید بخار کی حالت میں قارورہ کرنے میں جو لطف آتا ہے اسے بخار والے ہی کچھ خوب جانتے ہیں۔ خیر وہ اٹھا کر لائیں اور ہم چار پائی پر آتے ہی پھر، اب جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ قبلۂ محترم حکیم حاذق مولوی ضیاء الحسن صاحب ہمارا ہاتھ پکڑے بیٹھے ہیں۔ ہم نے ادب سے سلام کیا۔ قبلہ موصوف نے ہمارے علمی دماغ اور علمی مزاج کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت مختصر

نسخہ تحریر فرمایا لیکن جب عطار کے ہاں سے یہ نسخہ لایا گیا تو بے مبالغہ ایک سپاہی کا فوجی راشن تھا۔ تیار ہوا تو کوئی نصف سیر پانی تھا جسے اللہ شافی اللہ کافی کہہ کر انھوں نے پلایا تو کیا پیٹ میں بھر دیا۔ حکیم صاحب قبلہ نے از راہ مرحمت حکیمانہ چلتے وقت ہمارے لیے دنیا کی تمام غذائیں حرام کردیں صرف دلیا اور کھچڑی حلال فرما گئے۔ یہ بھی فرمایا کہ ذرا لحاف میں دب کر پسینہ لے لو جس کی تعمیل فوراً کرائی گئی اور چار لحاف شروع ماہ جون کے جہنمی موسم میں ہمارے اوپر ڈال دیے گئے۔ اب جو دم گھٹنے لگا تو ہم نے کوشش کی کہ قدرے چہرہ باہر نکال لیں کہ چمک کر بول ہی اٹھیں کہ "دیکھو دیکھو پسینہ میں لحاف الگ نہ کرنا خدانخواستہ اگر ہوا لگ گئی تو پھر کیا ہوگا"۔ خیر صاحب بقول کسی شاعر کے غصہ فقیر کا اوپر جان فقیر کی کے۔ چپ سادھے پڑے رہے اور جب پسینہ میں نہا گئے تو انھوں نے پسینہ خشک کیا اور اب طبیعت بحال ہوئی۔

اب بھوک کا یہ زور کا تمام دنیا کے کھانے اُڑانے کو تیار مگر وہاں حکیم صاحب کے دلیے کے سوا کوئی چیز جائز نہیں۔ دلیا کھایا ہی تھا کہ جاڑا شروع ہوا اور ہم پھر... کہ انھوں نے ہمیں ہوشیار کر کے کہا کہ دیکھو کوئی آواز دے رہا ہے۔ اب یہ محلہ والے عیادت کو آنا شروع ہوئے۔ پردہ کرایا اور کہا آجایئے۔ یہ محلے کے ایک بزرگ تھے۔ آتے ہی ہم ایسے بخار زدہ مریض سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیوں کیسی طبیعت ہے؟ کل تو تم اچھے تھے، کیا لو لگ گئی ہے ،خیر جاتی رہے گی کہ دوسری آواز آئی۔ انھیں بھی اندر بلالیا گیا تو آتے ہی بعد سلام مسنون کے انھوں نے ہماری نبض ملاحظہ فرمائی کہ تیسری آواز آئی یہ بھی گھر میں آئے اور عیادت والوں کی آمد اُدھر گھر کی تمام عورتیں کمرہ میں بند اور مارے گرمی کے آفت میں عیادت والوں کا سلسلہ ترقی پذیر تھا۔ ہمارا ضعف کے مارے براحال مگر ار باب عیادت ہم سے جو سوالات ہو رہے تھے وہ اس طرح کہ۔

کوئی نبض دیکھتا ہے، کوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ کرتا ہے۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ کیوں مولانا کیا حال ہے۔ پھر فرمایا اماں تم بھی اتنی ہی بخر یہ میں لیٹ گئے ہم تو تمھاری عمر میں ایسے بخار کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ اچھا تو یہ بتلاؤ بخار کب سے آیا ہے؟ جاڑے سے آتا ہے؟ متلی تو نہیں ہوتی، سر میں درد ہے؟ کھانسی تو نہیں ہے؟ پسینہ آتا ہے یا نہیں؟ کس وقت اتر جاتا ہے؟ منہ کا ذائقہ کیسا ہے، بھوک بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ... مگر انھوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا اور فرمایا مولانا، مولانا، او مولانا، بولو تو، ہوشیار تو ہو، دیکھو

یہ کون کون بیٹھا ہے۔ اچھا تو بتاؤ یہ کرسی پر کون بیٹھا ہے؟ کیا دل گھبراتا ہے۔ غرض سوالات کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم بنگال کی کسی بغاوت کے مقدمہ میں بحیثیت سلطانی گواہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور دس بارہ وکیل ہم سے جرح کر رہے ہیں۔ خیر یہاں تک بھی معاملہ غنیمت تھا مگر اب عیادت والوں نے ایک اور ستم ڈھایا۔ ایک صاحب بولے:

''ہاں بھائی علاج کس کا شروع کیا ہے؟'' ہم نے حکیم صاحب کا نام بتلایا تو انہوں نے کہہ کر حکیم صاحب پر اعتراضات شروع کر دیے اور ایک دوسرے حکیم صاحب کے علاج کی تعریف شروع کر دی۔ ایک صاحب بولے کہ میاں تم تو علاج ولاج چھوڑو بس آم کا شربت پی لو تمام شکایتیں جاتی رہیں گی۔ ایک صاحب نے تو ہماری حجامت ہی بنا ڈالی۔ فرمانے لگے مولانا گرمی بہت ہے آپ یہ سر کے بال اسی وقت منڈوا دیجیے''۔

غرض عیادت کیا تھی خاصا جلیانوالہ باغ کا انگریزی مارشل لا تھا جس میں سب کچھ گزر گئی اسی طرح کوئی ایک ہفتہ بخار میں مبتلا رہے نصف تنخواہ رخصت میں وضع ہو گئی۔ دس روپیہ عطار کے قرض ہو گئے۔ عیادت والوں کی خاطر میں کوئی پانچ روپیہ کی پان چھالیہ خرچ ہوئی، تین روپیہ حکیم صاحب کے تانگہ کے دیے، بیس روپیہ فیس میں گئے۔ والدین اور انھوں نے رو رو کر آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ معاوضہ کے مضامین نہ لکھ سکے۔ بارے فضل خدا اب صحت یاب ہو گئے مگر ہماری قوم کو اتنا ہی غم ہوا کہ:

''عرصہ سے ملا صاحب کا کوئی مضمون نہیں دیکھا اور بس؟''

اگر یورپ کا کوئی مضمون نگار ہوتا تو قوم اس کے تمام مصارف خود ادا کرتی۔ یوں بیمار ہوا کرتے ہیں ہندستان کے غربا۔ دعا ہے کہ خدا ہمیں ہمیشہ تندرست رکھے اور یہ جس قدر انگریز یورپ والے ہمیں تہذیب سکھانے کے لیے ہندستان میں پڑے ہیں خدا کرے انھیں ایک ایک سال ایسا ہی بخار آئے۔

◆◆◆

کھانسی

بیماری، مرض، علالت، ناسازیٔ مزاج وغیرہ الفاظ انسان کی اس حالت کے اظہار کے لیے خاص ہیں جب اس کی عام صحت میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اور وہ بجائے دفتر جانے کے شفا خانے جانے لگے۔ یا وہ ملا رموزی کی کتابوں کا پارسل منگانے کے عوض "دواخانہ یونانی دہلی" کے پارسل منگانے لگے۔ یا وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ اور عقلمند ہونے پر بھی یکا یک جامۂ انسانیت سے باہر ہو کر جانوروں کی سی حرکات کا مرتکب ہونے لگے یا وہ دوستوں کے گھر جانے کی جگہ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھ کر کہے کہ "افوہ حکیم صاحب اب تو مجھ سے مارے درد کے بیٹھا نہیں جاتا" تو سمجھو کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔

لیکن بیماری کے ساتھ ہی زبان اردو میں کسی ایسی عادت کو بھی بیماری کہتے ہیں جو اعتدال اور معقولیت سے ذرا ہٹ کر ایک مستقل اور مسلسل فعل کی صورت اختیار کرے مثلاً کسی افیونی آدمی کا ہمیشہ گردن نیچے کر کے بات کرنا، دوا کے قابل بیماری تو نہیں مگر اصطلاحی بیماری ضرور ہے یا کسی تانگے کے گھوڑے کا ہر وقت اپنے مکان کے سامنے چلتے چلتے رک جانا، بگڑنا، بدکنا اور سواریوں کا سہم کر کہنا کہ بسم اللہ، بسم اللہ! ارے بھئی کیا خراب گھوڑا ہے تیرا۔ تو یہ عادت گھوڑے کی بیماری کہلائے گی۔

کہتے ہیں کہ بیماریوں میں بیماریاں طاعون، ہیضہ، انفلوانزا اور نمونیہ یا پھر مرگی، مراق، مالیخولیا اور جنون سب سے نمایاں بیماریاں ہیں مگر ہمارے خیال میں ان سب کو بیماریاں کہنا صحیح نہیں۔ جب ان میں بیماری یا مرض کی وہ دلفریب ادائیں نہیں جو انسان کو یکا یک کچھ سے کچھ بنادیتی ہیں بلکہ یہ تمام حالتیں تو انسان کو ''خدانخواستہ'' بنانے والی ہوتی ہیں اور جس چیز سے انسان ختم ہو جائے اسے موت کہنا زیادہ موزوں ہے نہ کہ مرض یا بیماری۔ مثلاً آپ کسی کھانسی کے مریض کو لے لیجیے اور اس کے چہرے کو اس وقت دیکھیے جب وہ چند شریف اور ذی اثر لوگوں کے مجمع میں بیٹھا کھانس رہا ہو۔

کھانسی کے وقت انسان پہ جو حالت طاری ہوتی ہے اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

1۔ بعض حجاب اور غصے کی وجہ سے دل ہی دل میں کھانس لیتے ہیں اور کبھی کبھی بہت خفیف سی ''اونہہ اونہہ'' یا ''اخ اخ'' یا ''اُخو اُخو'' کی آواز سننے میں آجاتی ہے۔

2۔ بعض کے دونوں شانے اٹھ کر کانوں تک آجاتے ہیں جب کھانسی پوری ہوتی ہے۔

3۔ بعض کی کھانسی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی جب تک انھیں مرادآباد کا اُگالدان پیش نہ کیا جائے۔

4۔ بعض کے نزدیک وہ کھانسی کھانسی ہی نہیں، جس کے ترنم کا سلسلہ مغرب سے صبح کی اذان تک اس طرح جاری نہ رہے کہ ماں باپ تک دعا کریں کہ اے خدایا اسے ایمان سے اٹھالے یا اس کی کھانسی کو بند کردے۔

5۔ بعض لوگ کھانسی میں تال سُر اور نغمہ وموسیقی پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور مجال نہیں کہ کھانسی کی کوئی آواز وزن ردیف، قافیے اور بحر سے علاحدہ تو ہو جائے مثلاً اگر کھانسی کا پہلا رکن فعلن فعلن ہے تو کھانسی کی پوری غزل اور اس کا ایک ایک ''مصرع'' اسی وزن پر ڈھلتا چلا جائے گا بجز اس کے کہ اس غزل کا ''کف آور مقطع'' ذرا ہٹ جائے گا۔ اس قسم کی کھانسی اکثر باپ کی عمر والے لوگوں کو ہوتی ہے بیٹے کی عمر والوں کو نہیں اور اسی لیے اس کا سلسلہ اناللہ والے وقت تک قائم رہتا ہے۔

6۔ بعض کھانسی کو مارے تاؤ کے منہ سے باہر نہیں نکلنے دیتے اور گلا گھونٹ کر یوں کھانسنے بیٹھ

جاتے ہیں گویا وہ کھانسی سے کہہ رہے ہیں لے اب تو چل۔

اس زور شور کی کھانسی پر خدا ان حکیموں سے سمجھے کہ یہ وہی 308 قبل مسیح کے زمانے کا ''لعوق سپستاں'' عطا فرماتے ہیں۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ چاٹتے جایئے اور کھانستے جایئے۔ اس کی کھانسی کے شباب کا وقت اکثر نصف شب سے تہجد کی نماز کے وقت تک رہتا ہے اور یہی وقت گھر والوں اور محلے والوں کے آرام کا مقرر ہے۔

لطیف کھانسیوں میں کم عمر بچوں کی کھانسی بھی ایک خاص چیز ہوتی ہے مثلاً شب کے سکون بخش لمحات میں جب ان کی کھانسی کا نغمہ شروع ہوتا ہے تو آپ آرام سے سو بھی نہیں سکتے اور انھیں سزا یا بددعا بھی نہیں دے سکتے۔ پھر اس خواب شکن کھانسی پر ان بچوں کا 75 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رونا چلانا ایک ایسی لطیف اذیت ہوتی ہے جس میں سارے خاندان کو خواہ مخواہ شریک ہونا پڑتا ہے۔ ان کی کھانسی میں زیادہ لطف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کا علاج حکیموں اور ڈاکٹروں کو چھوڑ کر محلے کی بوڑھی عورتوں سے شروع کرایا جاتا ہے۔ بوڑھی کے اس علاج کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ جب وہ ایک جان سے بے زار بچے کی کھانسی کے لیے بتاتی ہیں کہ فلاں درخت کے سبز پتوں کو جلا کر ان کا دھواں اس کی ناک سے گزار دو انشاء اللہ ابھی کھانسی بند ہو جائے گی اور تجربے کا جو علمی ثبوت پیش کرتی ہیں وہ یہ کہ میرے بچے کی کھانسی بھی اسی سے بند ہوئی تھی۔ بعض کسی پیر کی قبر پر جلنے والے لوبان کی راکھ کھلانا بتاتی ہیں اور بعض کے خیال میں کھانسی کا کوئی علاج مفید نہیں بجز اس کے کہ بچے کو چالیس دن تک اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے کہ کھانسی کا زور چالیس دن کے بعد خود بخود گھٹ جاتا ہے۔ ایک کھانسی خاندان کے سب سے آخری بزرگ کی ہوتی ہے۔ اس کھانسی میں متعدد لطائف اور حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ مثلاً اس کے ہر وقت موجود رہنے کے فوائد یہ ہیں:

1۔ رات کو اس گھر میں چور داخل نہیں ہو سکتے، جس گھر میں کوئی بوڑھا رات کو کھانستا رہے۔

2۔ دوسرے یہ کہ اگر چور گھر میں داخل بھی ہو گئے اور یہ کھانس دے تو انھیں عین چوری کی حالت میں فرار اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بوڑھوں کی کھانسی گھر کی بے احتیاط بہو بیٹیوں کے لیے بھی بے حد مفید ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں بوڑھے نے کھانسا اور گھر کی الھڑ اور بے احتیاط بہو بیٹیاں فوراً ہوشیار ہو گئیں۔ یہی کھانسی اس بوڑھے کے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کا اعلان

بھی ہوتی ہے۔ جہاں انھوں نے دروازے پر ''اونہہ'' یا ''اُخ'' یا ''اخ'' کیا اور تمام عورتیں دوپٹے سنبھال کر بیٹھ گئیں یہ کہہ کر کہ ''لو وہ دادا میاں آ گئے''۔ ان دادا میاں کی کھانسی شریر بچوں کے لیے بھی استاد کا کام کرتی ہے۔ جہاں دادا میاں نے ''اُنھ'' فرمایا اور بچے سہم کر بیٹھ گئے یہ کہہ کر کہ ارے وہ دادا میاں ابھی جاگ رہے ہیں۔

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ شاعرانہ کھانسی نوجوان لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے۔ انھیں اگر کھانسی شروع ہو جائے اور گھر میں ایک آدھ مرد بھی بیٹھا ہو تو ان کا مارے حجاب کے برا حال ہو جاتا ہے۔ یہ کھانسی کو روکنے کے لیے بار بار اپنے منہ پر ہاتھ رکھتی ہیں یا مکان کے کسی بند کمرے میں جا کر چھپ جاتی ہیں، مگر جب اس پوشیدہ حصے میں بھی کھانسی بند نہیں ہوتی تو یہ کھانسی پر غصہ کرتے کرتے یکایک اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں یہ کہہ کر کہ '' آگ لگ جائے بند ہی نہیں ہوتی''۔

ایک معنی آفریں کھانسی مقرر، واعظ اور لیکچرار کی ہوتی ہے۔ اس کھانسی کے فوائد بھی بے شمار ہیں۔ مثلاً تقریر کرنے والا اپنی تمام کمزوریوں کو کھانسی کے پردے میں چھپا لیتا ہے۔

کھانسی کے وقفے میں وہ آنے والے مضامین کو سوچ لیتا ہے۔ کھانسی کے وقفے میں اسے پانی منگانے کا قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے اور اس عرصے میں وہ سامعین کے خوف کو دل سے کم کرتا جاتا ہے۔ جوں جوں اس کی کھانسی بڑھتی جاتی ہے اس کے ہاتھ پاؤں کا رعشہ کم ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی کھانسی میں مسلسل نغمے پیدا کر کے اپنے آپ کو تقریر کے اہم حصوں سے بچا بھی لیتا ہے، یہ کہہ کر کہ افسوس کھانسی سے مجبور ہوں کل سے بخار بھی ہے وہ تو آپ حضرات کے اصرار پر میں کھڑا ہو گیا تھا۔

گھریلو کھانسیوں میں سب سے زیادہ ذلیل اور شرمندہ کرنے والی کھانسی وہ ہوتی ہے جو کھانا تناول فرمانے کے بالکل بیچ میں بغیر کسی تمہید و تقریب کے عین اس وقت چل جائے جب ایک موٹا سا لقمہ آپ کے حلق میں جا رہا ہو اور ابھی جا نہ چکا ہو کبھی کبھی اس موقع پر یہ لقمہ حلق سے یوں باہر پھینک دیتی ہے کہ پاس بیٹھا ہوا آدمی اس بدتمیزی پر آپ سے لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے، مگر خون کا گھونٹ پی کر چپ رہتا ہے اور جو کھانسی سے یہ لقمہ باہر آنے کے عوض حلق ہی میں پھنس کر رہ

جائے تو پھر کھانسنے والے کا حال دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔اس قسم کی کھانسی کا لطف اس وقت پورا ہوتا ہے جب آپ کھانسی سے حلق میں پھنسے ہوئے لقمے کو نیچے اتارنے کے لیے پانی کا گلاس بڑے زور اور طمینان سے اٹھائیں اور اس میں ایک بوند بھی نہ ہو۔

اسی قسم کی کھانسی سے ملی جلی کھانسی وہ ہوتی ہے جب آپ کسی ذی اثر بزرگ یا حاکم سے ہمہ تن مصروف ہوکر نہایت ادب سے باتیں کرر ہے ہوں کہ یکا یک چھالیا کا ایک دانہ آپ کے حلق میں اتر کر کھانسی پیدا کرے،اس طرح کہ پوری قوت صرف کرنے سے یہ بند نہ ہو۔ پھر دیکھیے اس بزرگ یا افسر کے سامنے آپ کی ندامت کا حال۔بس جی چاہتا ہے کہ اگر اس وقت یہ کھانسی آدمی بن کر سامنے آجائے تو اسے قتل ہی کر کے رکھ دوں یا اس بزرگ ہی کو قتل کر کے اپنے سامنے سے ہٹا دوں۔

ایک کھانسی افیونیوں کی ہوتی ہے۔اس کھانسی میں اگر چہ کوئی خاص شاعری اور لطافت نہیں ہوتی پھر بھی اگر کسی ہوٹل میں آپ کے برابر بیٹھا ہوا کوئی افیونی چائے پی رہا ہو اور اسے کھانسی چل جائے تو پھر آپ ہی اپنی پیالی کو فی سبیل اللہ چھوڑ کر اٹھ آئیں گے مگر آپ سے اس کی کف اور آواز نہ سنی جائے گی،اس لیے کہ اس کی کھانسی ''اُہوں اُہوں'' کا خاتمہ نہایت درجہ تکلیف دہ وہ نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو شکاریوں کے ذوق کی دشمن ہوتی ہے۔اس کھانسی کا زور اسی وقت ہوتا ہے جب شکار کے سامنے آنے وقت ہو جائے۔آپ چاہیں کہ شکار کے آنے سے قبل دل کھول کر کھانس لیں مگر وہ تو اسی وقت شروع ہوگی جب آپ چاہیں گے کہ شروع نہ ہو۔اس وقت اس کی کھانسی کی روک تھام میں خود شکاری صاحب ایک لطیف سا تماشا بن کر رہ جاتے ہیں اور آیا ہوا شکار بھاگ جاتا ہے۔اس کھانسی کی بدولت کبھی کبھی شکاری کا حلیہ یوں ہوتا ہے کہ بندوق ہاتھ میں آنکھیں شکار پر اور منہ کے اندر رومال کی گیند۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو ریل کے سیکنڈ کلاس میں رات کے وقت چلتی ہے۔اس طرح کے برابر سونے والے مسافر گردن اٹھا اٹھا کر آپ کو دیکھتے جاتے ہیں اور آپ مارے شرم کے ان کی طرف منہ نہیں پھیر سکتے۔

ایک کھانسی وہ ہوتی ہے جو مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے شروع ہوتی ہے۔ یہ کھانسی شروع نہیں ہوتی بلکہ شروع کی جاتی ہے، اس لیے کہ شاعر کی خوشامد کی جائے اور سارا مجمع آپ کی غزل کے لیے سراپا اصرار بن جائے۔ اس قسم کی کھانسی لکھنؤ کی طرف زیادہ کھانسی جاتی ہے یا ''کھانسا جاتا ہے''۔

ایک کھانسی قوال کی ہوتی ہے جو قوالی شروع کرنے سے پہلے کھانسی جاتی ہے۔ اس کا مقصد گانے کے لیے گلا صاف کرنا ہوتا ہے۔

ایک کھانسی غنڈوں کی ہوتی ہے جو کسی راہ گیر کو مخاطب کرنے یا دشمن پر آوازہ کسنے یا اُسے دھمکانے کے لیے کھانسی جاتی ہے۔ یہ کھانسی دکانوں اور بازاروں کے چوراہوں پر کھڑے ہو کر اور ذرا سینہ تان کر کھانسی جاتی ہے۔ اس قسم کی کھانسی پر یہ آج کل کے اسکولوں کے عورت نما فیشن ایبل لڑکوں کو بہت زیادہ تاؤ آتا ہے کیونکہ غنڈوں کی ایک کھانسی اسکول کے لونڈوں کے لیے بھی خاص ہوتی ہے۔

ایک کھانسی پولیس کے ڈرپوک قسم کے سپاہی رات کو گشت کے وقت کھانستے ہیں۔

اس قسم کی تمام کھانسیاں اگر سٹ کر ایک ہو جائیں تو ان کا نام ''دمہ'' رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر ''دمہ'' کے لطائف بجز اس کے کچھ نہیں کہ آدمی نہ دین کا رہتا نہ دنیا کا۔

ان تمام کھانسیوں میں ایک لطافت خیز نکتہ ان کی مختلف اور رنگا رنگ آوازیں ہیں۔ مثلاً کھانسی کی کوئی آواز اس درجہ شاندار اور زوردار ہوتی ہے گویا کھانسنے والا تمام محلے کے رہنے والوں کو ڈانٹ رہا ہے۔

بعض کی کھانسی میں اس نوع کا تسلسل ہوتا ہے جس سے زیر و بم اور تال سُر کے تمام ضابطے مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

بعض کی کھانسی کے درمیان اس قسم کے جھٹکے آتے ہیں جن سے اس کے ''مرحوم'' ہو جانے کا خطرہ اٹل ہو جاتا ہے۔

بعض کی کھانسی کا آغاز نہایت پُرشور ہوتا ہے مگر خاتمہ اس درجہ خفیف ہوتا ہے کہ سامع خیال کرتا ہے کہ وہ اب کھانس چکا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ کھانسی کی آواز بعد میں اس کے گلے سے اتر

کر پیٹ میں جا کر کھانستی رہتی ہے۔ یہ خصوصیت بوڑھوں اور افیونیوں کی کھانسی میں پائی جاتی ہے۔

بعض کی کھانسی اس رنگ کی ہوتی ہے کہ اسے سن کر کہنا پڑتا ہے کہ یہ شخص کھانسی کو نہیں کھانس رہا بلکہ کھانسی اسے کھانس رہی ہے۔

اب اگر ان کھانسیوں کے سوا کسی صاحب کو کوئی اور کھانسی ہو تو وہ براہ کرم مُلّا رموزی کو مطلع فرمائیں یا براہ راست اس کے پاس آ کر سنا جائیں۔

(منقول از رسالہ "ادیب"، پشاور)

◆◆◆

زکام

وہ رسالہ ''عالمگیر'' کے ''تصویر بخش'' و ''تصویر کش'' حکیم قبلہ فقیر محمد صاحب ہی سے دریافت کیجیے تو پچاس برائیاں، خرابیاں، تباہیاں اور ہلاکیاں بیان فرمادیں گے مرض زکام کی۔ اور جو طبی کتابوں میں اس مرض کی ہلاکت آفرینیاں پڑھیے تو جی چاہے گا کہ گریبان چاک کر کے اب جنگل کی طرف ہی نکل جایئے۔ لیکن اگر حقیقی ماں باپ اور بیوی بچوں سے لے کر عوام و خواص تک سے اس مرض کا تذکرہ کیجیے، اس کی تکالیف بیان کیجیے تو آپ کو الٹا الّو، خبطی، بزدل اور انگریزی میں ''نان مرد'' کہہ کر آپ کا خوب مذاق اُڑائیں گے اور اب عوام و خواص کے اس جہل سے یہ حکیم اور ڈاکٹر تک یوں متاثر ہو چکے ہیں کہ اگر ان کے پاس زکام کی حالت میں روتے ہوئے بھی جایئے تو ہنس کر آپ کی طرف سے منہ پھیر کر کسی دوسرے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ دیں گے، جس کا یہ مطلب ہوگا آپ کو چونکہ زکام کی شکایت ہے لہٰذا یہ ایسی تکلیف و شکایت نہیں جس پر جلد متوجہ ہونا ضروری ہو، مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ طاعون اچھا کہ آج مرے اور کل دوسرا دن، مگر اس زکام کی نیم مردہ اور نیم زندہ کیفیات کو ہم کس منہ سے بیان کریں اور کس قلم سے لکھیں؟

ہمارے رسالہ ''عالمگیر'' کے ایڈیٹر صاحب نے سالنامہ کے لیے ہم سے مضمون طلب فرمانے کا خط عین اس وقت لکھا جب ہم زکام میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے اور جب یہ خط ہمیں ملا

اس وقت ہم پورے جتلا ہوئے سر پکڑے بیٹھے تھے کہ خط آنکھوں کے سامنے لگا کر بولیں کہ کیا اسے بھی نہ پڑھیے گا؟ مطلب یہ تھا کہ یہ معاملہ تو ہے ''زرنفقہ کا'' اب معلوم نہیں زکام زدہ شوہر کو اس وقت زرطلبی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے یا بیوی کو؟

بہر کیف یہ مضمون چونکہ زکام کی حالت میں لکھا جا رہا ہے اس لیے اگر آپ کو اس کی حالتیں اور صورتیں سمجھا دی جائیں تو آپ کو ہزاروں فائدے پہنچیں گے اور ہمارے لیے چند نیک طینت مرد اور چند اسکول کی پڑھی ہوئی لڑکیاں یہ کہہ کر چپ ہو جائیں گے اور ہو جائیں گی کہ بیچارے اپنے ملا رموزی صاحب کتنے نیک ہیں کہ زکام کی حالت میں بھی قوم کو فائدے کی بتاتے رہتے ہیں۔ اس لیے واضح ہو کہ ہم نہ تو قبلہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی کا مطب ہیں نہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا ہندستانی اور یونانی شفاخانہ اور نہ ہی ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن، کلکتہ میں جو زکام پر طبیا، حکیما اور ڈاکٹر اروشنی ڈالیں یا تاریکی ڈالیں۔ البتہ ہم نے تو جتنے جس قسم کے زکام اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں انھیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً مثلاً یہ کہ وہ علی گڑھ کالج کے سب سے زیادہ مشہور مشاعرہ باز پروفیسر حضرت قبلہ مولانا احسن مارہروی مصنف ''کتب کثیر'' نے اپنی ایک کتاب بنام ''تحفۂ احسن'' کے صفحہ نمبر 50 قیمتی 8ر پر زکام کی تعریف یوں فرمائی ہے کہ:

بن گیا ہے طبیب اک عطار
بیچ کر کچھ دوائیں ناقص وخام
دیکھیے اب کدھر گرے نزلہ
مینڈکی کو بھی ہوگیا ہے زکام

اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ملا رموزی کا دوسرا نام مینڈکی ہے؟ غرض ان اشعار کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ معمولی آدمی کو گھمنڈ ہو جائے تو کہیں گے کہ مینڈکی کو زکام ہو گیا ہے ورنہ عقل میں نہ آتا کہ مینڈکی کو اگر زکام ہوا ہے تو اسے طبیہ کالج کا بنایا ہوا ''جوشاندہ'' کس طرح پلایا جائے گا؟ لہٰذا معلوم کیجیے کہ انسانوں کو زکام کس طرح ہوا کرتا ہے۔ پس سب سے پرلطف قسم کا زکام ''سفری زکام'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کسی تھرڈ کلاس خاص کر کسی فرسٹ اور سیکنڈ کلاس ڈبے کے اُس تھرڈ کلاس حصہ میں بیٹھے سفر کر رہے ہوں جس پر انگریزی میں ''سروینٹ'' لکھا ہوتا ہے تو کسی اسٹیشن پر

آپ دیکھیں گے کہ پلیٹ فارم پر سے یکا یک ایک انگریزی قسم کا اور رئیسانہ بستر آپ کے اوپر پھینک دیا جائے گا۔ اب اس ''ضربِ بستری'' سے آپ بھنّا کر اٹھیں گے کہ اس ''بستر انداز مسافر'' کا مارے جوتوں کے سر توڑ ڈالوں مگر کھڑکی کے باہر آپ بجائے کسی معمولی مسافر کے ایک نہایت شاندار اور بیرسٹر قسم کے ہندستانی کو کسی اپنے ایسی عظیم الشان حیثیت والے ساتھی سے انگریزی گفتگو میں مصروف پاکر آپ مارے خوف کے پھر اپنی جگہ خاموش بیٹھ جائیں گے کہ گاڑی چلتے ہی یہی بستر انداز اور بیرسٹر صورت کے فیشن ایبل مسافر صاحب ہاتھ میں ''پائنیر اخبار'' لیے کچھ بڑی ہی شان سے آپ کے اس تھرڈ کلاس ڈبے میں گھس آئیں گے جس میں فرسٹ کلاس انگریزوں کے جوتے صاف کرنے والے نوکر سفر کرتے ہیں اب آپ اور پریشان ہوں گے کہ آپ کے ڈبے میں یہ کہاں کا رئیس آ گیا۔ شاید ریل روانہ ہوتے وقت یہ فرسٹ کلاس میں سوار نہ ہو سکے ہیں اس لیے بے چارے گھبراہٹ میں اس تھرڈ کلاس ہی میں بیٹھ گئے۔ خیر بیٹھ جانے دو آگے آنے والے اسٹیشن پر اتر جائیں گے، لیکن دوسرے اسٹیشن پر یہ صاحب بہادر پھر اتر کر کسی فرسٹ کلاس ڈبے والے سے گفتگو فرمائیں گے اور جہاں ریل چلی کہ یہ پھر آپ کے سرونٹ والے تھرڈ کلاس میں آ جائیں گے۔ اب آپ تو اپنے کند ذہن ہونے کے سبب سے انھیں نہ پہچانیں گے اور ان کی انگریزوں ایسی صورت اور لباس سے ڈر کر اپنا بستر سمیٹے ایک طرف بیٹھے رہیں گے اور یہ ہوں گے کہ ایک کبھی کھڑکی سے نکالے سیٹی بجاتے ہوئے ریل کا بیرونی منظر ملاحظہ فرماتے جائیں گے مگر آپ سے بات نہ کریں گے۔ بیرونی منظر سے اکتائیں گے تو اندر سر ڈال کر کبھی پتلون کی اس جیب میں ہاتھ ڈالیں گے کبھی کوٹ کی اُس جیب میں اور پھر بڑی ہی افلاطونی نظروں سے آپ کی طرف دیکھ کر ایک جیب سے ''ہاتھی چھاپ سگریٹ'' نکال کر الٹی طرف سے جلائیں گے تا کہ آپ مُنہ سے یہ نہ پہچان لیں کہ ''اے دیکھ لیا ہاتھی چھاپ پی رہا ہے'' اس کے بعد اب پھر یہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر سیٹی بجائیں گے مگر آپ سے بات نہ کریں گے جب اس سے بھی تھک جائیں گے تو ''پائنیر اخبار'' کو خواہ مخواہ پڑھیں گے مگر انگریزوں کی ایک بھی سیاسی حرکت کو نہ سمجھیں گے کیونکہ اگر اتنی ہی لیاقت ہوتی تو آزاد نہ ہو جاتے انگریزی غلامی سے گدھے کہیں کے۔ اب سمجھے آپ یعنی اسے کہتے ہیں ''سفری زکام'' کہ سفر تو کر رہے ہیں بیٹا تھرڈ

کلاس میں مگر دماغ میں بھرا ہوا ہے خاصا "میکڈ لفلڈ پن" اب اس زکام کی تفصیل یہ ہے کہ اس قسم کے مسافر کو آپ جب دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ آدمی یا کسی بڑے آدمی کا دوست ہے اور یہ اس کے ساتھ نوکر کے ٹکٹ سے سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ درمیانی اسٹیشنوں تک فرسٹ کلاس ہی میں اپنے دوست کے پاس بیٹھا رہے گا اور جہاں ٹکٹ کلکٹر کے دیکھ لینے کا اسے خطرہ ہوگا وہاں یہ فوراً فرسٹ کلاس سے بھاگ کر آپ کے سرونٹ کلاس میں آجائے گا مگر زکام کا یہ حال ہوگا کہ اس ذلت پر بھی آپ سے سیدھی طرح بات نہ کرے گا۔ کم ظرف کہیں کا۔ اور جو یہ نہیں تو خود ہوگا امیر زادہ اور دولتمند باپ کا بیٹا مگر بی۔ اے پاس ہونے کی تجارتی ذہنیت کے اثر سے لباس تو پہنے گا انگریزی والد کا مگر خرچ کم ہونے کی خاطر ٹکٹ لے گا تھرڈ کلاس ہی کا کمینہ کہیں کا۔

اس زکام کا پہلا جوشاندہ تو وہ ہے جو ملا رموزی اور اس کے بھائی صادق صحی نے لاہور سے واپس آتے ہوئے انٹر کلاس میں ایسے ہی زکامی فیشن ایبل مسافر کو سوار ہوتے وقت پلایا تھا یعنی جوں ہی کہ مسافر صاحب نے برادرم صادق صحی کے پاؤں کے برابر سیٹ پر کوئی چالیس من کا بستر رکھا کہ صحی صاحب نے دل میں یا علی کہہ کر جو ایک لات ماری تو بستر موصوف کی گود میں۔ اس پر جو بھنائے تو ہم دونوں نے کھڑے ہو کر ادب سے عرض کر دیا کہ اگر اُف بھی کیا تو حضور ریل ہی کے باہر نظر آئیں گے۔ کھینچئے زنجیر اور کیجیے رپورٹ ہماری۔ بس دہلی تک ہم جانتے ہیں کہ یہ "دام اقبالہ" کس طرح خوش بیٹھے رہے ہیں اور جو گئے ہیں تو دہلی کا ایک ایک یتیم خانہ تلاش فرمالیجیے اگر مل جائیں تو آمدورفت کا کرایہ ہمارے ذمہ۔

اور دوسرا جوشاندہ یہ ہے کہ جب آپ کے ڈبے میں ایسے تھرڈ کلاس افلاطون صاحب تشریف لے آئیں تو پہلے حسب ضابطہ ان سے تہذیب کا برتاؤ کیجیے لیکن وہ کبھی بھی آپ کی تہذیب کو خاطر میں نہ لائیں گے، اس لیے کہ ان پر تو زکام سوار ہوگا "فیشن ایبلیت" کا اس لیے پھر ان کی ہر ادا اور ہر حرکت کا خوب مذاق اُڑایئے اور ہو سکے تو انھیں ہر قسم کی تکلیف پہنچایئے کیونکہ ان کی تکلیف رسانی سے کسی قسم کا خطرہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس قسم کے مسافر اکثر بے ٹکٹ بھی ہوا کرتے ہیں اور وہ جو اپنے چہرے پر ذرا ڈپٹی کلکٹروں ایسا رعب پیدا کیے بیٹھے رہتے ہیں اس کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ غریب مزاج کا ٹکٹ کلکٹر اور مسافر ان سے ٹکٹ کا سوال نہ کر سکیں۔

اس لیے ان سے بحیثیت مسافر بھی آپ اس طرح ٹکٹ طلب کیجیے کہ جناب عالی کہاں تشریف لے جارہے ہیں۔ جب وہ بڑے غرور سے کہیں کہ لکھنؤ تو کہیے کہ اوہ تو ذرا اپنا ٹکٹ مجھے دکھایئے کیونکہ میرا ٹکٹ بھی لکھنؤ کا، مگر اس پر 3 آنے کم کیوں لکھے ہیں۔ اس پر ٹکٹ دکھا دینا کوئی معیوب بات نہ ہوگی پھر دیکھ لینا کہ وہ آئیں بائیں شائیں فرما کر ٹالیں گے۔ بس آپ کو چاہیے کہ فوراً کسی ٹکٹ کلکٹر سے جا کر کہہ دیں کہ:

''ہاں ہاں وہ جو بڑے نخرہ سے بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں''

ہاں ہاں بھی سامنے والے تھرڈ کلاس میں''

''وہ دیکھو وہ آپ کے خوف سے اب اپنے منہ کو اخبار سے چھپا رہا ہے بیہودہ کہیں کا''۔

بدقسمتی سے ہندستانی علم کو علم کی خاطر نہ خود حاصل کرتے اور نہ حکومت انھیں فاضل اجل تصور کرتی اس لیے 99 فیصدی ہندستانیوں کی معراج زندگی کہیے تو ملازمت ہے اور مقصود حیات کہیے تو ملازمت ہے اس لیے شدید سے شدید قسم کا زکام ہندستانی افسروں کا زکام ہوتا ہے جس کی ابتدا مبلغ سو روپیہ کی غلامی عرف ملازمت سے ہوتی ہے۔ اُدھر عوام وخواص کی ذہنیت میں چونکہ بلندی اور وسعت نہیں اس لیے جہاں کوئی کالے خاں اور نربدا پرشاد صاحب سو روپیہ سے زیادہ ملازم ہوئے کہ اب نہ دل ٹھکانے نہ دماغ درست۔ اس لیے اب باور فرمالیجیے کہ انھیں زکام ہوکر رہے گا اور اب یہ ٹینس کھیلے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ پس ان کا زکام سب سے پہلے رخساروں کی سرخی اور گولائی سے شروع ہوگا اور جب ان کا پیٹ توند کہے جانے کے قابل ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب موصوف کو زکام ہو چکا۔ چنانچہ ہندستانی افسروں کی زکام کی علامتیں حسب ذیل ہیں:

1۔ مزاج میں خواہ مخواہ کی خشکی، رعونت، اکڑفوں پیدا ہو جائے گی، یہاں تک کہ جس موقع پر انھیں کسی ضرورت سے تیز تیز چلنا ہوگا وہاں بھی عہدے اور افسری کے غرور سے آہستہ ہی چلیں گے۔

2۔ ہنسی، مذاق، دل لگی اور قہقہہ لگانے سے دانستہ طور پر پرہیز کریں گے تاکہ چہرہ پر ہر وقت اس قسم کی خشکی طاری رہے جو دیکھے وہ سمجھ لے کہ آپ ضرور کہیں کے افسر ہیں یا آپ کے والد ہی مرثیہ خواں تھے اس لیے اب چہرہ پر ہنسی اور خوشی کا کیا ذکر۔

3۔اب اگر افسری پر موٹر بھی ہاتھ آ جائے تو سمجھ لیجیے کہ اب حضور ممدوح کا زکام بہہ رہا ہے۔لہٰذا موٹر میں ان کے زکام کی پہچان نمبر چار یہ ہوگی کہ گزرنے والے لوگوں کا سلام اس انداز میں قبول فرمائیں گے کہ اگر سلام کرنے والا سمجھ لے تو جوتا ہی پھینک کر مارے۔

پہچان نمبر پانچ یہ ہوگی کہ افسری کے بعد ہی پہلے تو محلے کی مسجد اور مندر میں جانا ترک کر دیں گے پھر محلے والوں سے مراسم اور میل جول میں کمی فرمائیں گے یہاں تک کہ اب آپ انھیں نہ کسی غریب اور نہ محلے کے عقیقے میں پائیں گے نہ ختنہ میں۔

پہچان نمبر چھ یہ ہوگی کہ اپنے ماں باپ کا لباس چھوڑ کر انگریزوں کا لباس اختیار فرما کر اسے روشن خیالی اور ترقی بھی سمجھیں گے۔

پہچان نمبر سات یہ ہوگی کہ اپنی قومی تاریخ ،قومی روایات اور قومی آداب سے یکسر جاہل ہوں گے اور نپولین ،گلسڈ سٹون اور پاپائے اعظم روما کے حالات و روایات سے واقفیت کو شرف و فضیلت سمجھیں گے اور انھیں خیالات کا تو اثر ہے جو بے چارہ گاندھی آج تک مارا مارا پھر رہا ہے اور کوئی پوچھتا نہیں ،مگر ان گدھوں نے یہ نہ دیکھا کہ گاندھی اپنی ملکی اور قومی لنگوٹی کی عزت کیسے کیسے صاحبانِ مراتب سے منوا رہا ہے ،مگر یہاں تو یہ زکام سوار ہے کہ شہر بھی میں افسر صاحب مشہور ہیں۔ پس اُن کے زکام کا بہترین اور مجرب جوشاندہ یہ ہے کہ آپ انھیں کسی حال میں بھی خاطر میں نہ لائیے۔ کچھ شک نہیں کہ ان لوگوں کا زکام قوم کی عام صحت کے لیے نہایت درجہ وبائی نقصانات کا باعث بنا ہوا ہے اور ایسے ہی ہیں جنھوں نے قوم کی وحدت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی امیر و غریب ورنہ اگر انھیں زکام نہ ہوتا اور یہ غرباء سے بھی مراسم اور تعلقات رکھتے تو قوم کے یہ دو ٹکڑے کبھی نظر نہ آتے خصوصاً مسلمانوں میں تو یا سب کو غریب کہا جاتا یا سب کو امیر لہٰذا ان کے زکام سے محفوظ رہیے۔

بیوی کا زکام بیوی کی حیثیت سے متعلق ہوا کرتا ہے مثلاً اگر آپ کی بیوی پرانے یا غریب گھرانے کی ہے تو اس کا زکام اول تو تکلیف دہ نہ ہوگا اور ہوگا تو خود اس کے لیے ہوگا اور جو آپ کی بیوی امیر گھرانے کی ہے اور اس پر کسی اسکول کی تعلیم یافتہ بھی پھر تو اس کے زکام کا علاج نہ ملا رموزی کے بس کا نہ کسی حکیم اور ڈاکٹر کے اختیار کا۔اس کا زکام اس کے گھر میں دوسری عورتوں

کے آنے سے شروع ہوتا ہے اور جب کسی شادی بیاہ کی محفل میں پہنچ جائے تو سمجھو کہ اب اس کا زکام اس کے قابو ہی کا نہیں۔

جہاں کوئی عورت اس کے گھر میں داخل ہوئی کہ اس نے مارے زکام کے اس کے سامنے پھولنا شروع کیا اور ان سب معاملہ میں وہ شوہر کو اس طرح ضرور شریک رکھتی ہے کہ:

''کیا بتاؤں، بہن کیا کر رہی ہوں؟ انھی کا مفلر تیار کر رہی ہوں خدا جانے مشین کب سے بند پڑی تھی کیونکہ اسے میرے سوا کوئی دیکھنا بھی تو نہیں جانتا اور مفلر ہے یہ دیکھیے ریشم کا۔ اُن کا کیا وہ تو حکم دے کر چلے گئے ہیں۔ جی میں آتا ہے مشین توڑ کر پھینک دوں۔ اس سے پہلے بھی دو تین مشینیں ذرا میں توڑ کر پھینک چکی ہوں''۔

''مگر وہ پھر ولایت گئے تو اسے لے آئے''۔

خدا کا شکر ہے وہ میری ان عادتوں کو پہچانتے ہیں اور میں کتنا ہی بڑا نقصان کر دوں بس دیکھ کر ہنس دیتے ہیں۔''

ارے للا اندھی بیٹھی ہے اور دیکھ رہی ہے۔

ہاں وہ میز ہی پر تو رکھا ہے۔

باجہ باجہ کرتی ہے بے غیرت۔

دیکھ اللہ رکھی اب تیرے مار کھانے کے دن آ رہے ہیں، بہت سر اٹھایا ہے تو نے، لا اور وہ موئیوں کی ڈبیہ دے۔

اری اگالدان تو رکھ بہن کے لیے۔

واہ واہ، آپا یہ الٰہ آباد کی ایک بڑی طوائف کا ریکارڈ ہے۔

سبحان اللہ!

سمجھ میں آ رہا ہے آپ کے؟

اری وہ پروں کا پنکھا لا کر جھل آپا کے اوپر۔

کیا کہوں آپا آج خدا جانے یہ بجلی کو کیا ہو گیا ہے۔

صبح ہی سے پنکھا بند پڑا ہے۔

کچھ نہیں وہ دفتر سے آجائیں بس ایک حکیم بھیج دیں گے تو پنکھا اسی وقت درست کردیا جائے گا، اسی لیے تو میں نے فوراً یہ پروں کا پنکھا تیار کرلیا، کس قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے اب کی۔

دیکھیے ہم پرسوں تک منصوری یا شملہ چلے جائیں گے۔ کون رہے بہن اس جہنم میں۔

محفل میں جو نیم انگریز لیڈی بن کر پہنچیں تو دروازہ ہی سے ملازمہ کے ساتھ یوں مخاطب کہ:

کیوں ری بے ہودہ وہ تو میرا وہ سیاہ ہینڈ بکس نہ لائی حالانکہ میں نے تاکید کردی تھی تجھ کو۔

آداب عرض ہے۔

معاف فرمایئے گا وہ مجھے دیر اس لیے ہوئی حاضر ہونے میں کہ پرسوں ہم لوگ شملہ جا رہے ہیں بس اس کی تیاری میں ایسی مصروف ہوں کہ عرض نہیں کرسکتی مگر وہ تو آپ کے بچہ کی تقریب تھی۔

جی ہاں پرسوں روانگی ہے پنجاب میل سے۔

جی نہیں۔

ارادہ یہ ہے کہ شملہ سے منصوری چلی جاؤں گی کیونکہ وہاں بڑی بھاوج بھی ہیں ادھر چھوٹا بھائی وہاں کالج سے چھٹیوں میں آکر مل لے گا۔

وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ تم اس مرتبہ پشاور بھی ہو آؤ کیونکہ تمھاری صحت بھی خراب رہتی ہے مگر دیکھیے اب خدا کو جو منظور ہو کیونکہ تمھاری صحت بھی خراب رہتی ہے مگر دیکھیے اب خدا کو جو منظور ہو، وغیرہ۔

اپنی مرضی کے بغیر پوری متانت سے بیٹھے بیٹھے اچانک آپ اچھل پڑیں یا کانپ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ زکام شروع ہو گیا۔

باتوں کے بالکل بیچ میں آپ ایک دم منہ کھول کر رہ جائیں۔

''اچھا صو۔صو۔صو۔ بابا آچھیں، آچھیں صبح ملوں گا''

''انشا آ۔آ۔چھی۔چھیں، چھیں اللہ تعالیٰ ضرور حاضر ہوؤں گا''۔

''اور دیکھیے تو بس ذرا اٹھے آ۔آ، چھیں، چھیں ٹھہر جایئے''

جب اس قسم کی حرکات کے آپ مرتکب ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ زکام شروع ہو چکا۔ پس ہمارا جب یہ حال ہونے لگا تو بولیں:

تو وہ جوشاندہ کیوں نہیں پی لیا جاتا دن بھر ہو گیا ہے آچھیں آچھیں کرتے۔ بتایئے ان الفاظ میں زکام زدہ شوہر سے ہمدردی اور محبت ظاہر ہوتی ہے یا اُلٹا تاؤ اور طنز؟

کون صاحب؟

حا۔حا۔آچھیں۔حاضر ہوا۔

وا۔وا۔آ۔آ۔آچھیں۔آچھیں۔آچھیں، وعلیکم السلام

جی ہاں کیا بتاؤں رات ذرا بے موقع نہا لیا تھا۔

جی ہاں نز۔نز۔آچھیں آچھیں نزلہ بھی ہے۔

میں خود آپ کے ہاں دو مرتبہ گیا تھا۔ سبحان اللہ اماں تم خود غا، غا، غا۔آچھیں آچھیں غائب تھے۔

ارے بھئی کوئی سر تو دبا دو میرا۔

آہ۔آہ۔اللہ۔اللہ۔

ارے اب اب آچھیں آچھیں، عبداللہ!

اُفوہ، اونہہ، اچھیں۔آ۔آ۔آچھیں۔

یا اللہ تو گناہ معاف فرما۔

جی کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا۔ے۔ے، آ۔ لاحول ولا چھینک ہی رُک گئی۔ ہاں میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا بس وہ ایڈیٹر صاحب آ۔آچھیں آچھیں آچھیں "عالمگیر" کے ہاں ایک پا۔پا۔پا۔آچھیں کمبخت پراٹھا کھا لیا تھا۔صو۔صو۔آ۔آچھیں صبح کے وقت۔

غرض اس طرح دو تین دن ناک سے خاصا شور بہہ جانے کے بعد اب آپ کا زکام آپ کے چہرہ کو یوں حسین بنا دے گا گویا آپ کے منہ میں پمپ لگا کر ہوا بھر دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شدید بخار کھانسی اور کبھی کبھی آ۔آ۔آچھیں کے استخواں شکن جھٹکے آپ کو جانکنی کی تکلیف تک پہنچا دیں گے مگر اس عذابِ الیم میں مبتلا دیکھ کر آپ کے ماں باپ اور بیوی بچوں سے لے کر ایک

ایک شخص آپ سے یوں ہمدردی کرے گا کہ اماں لاحول ولا بس اتنے سے زکام میں یہ حال۔

ماشاء اللہ کیا مرد ہیں آپ؟

واہ کیا کہنا، سبحان اللہ اماں بچے بھی اتنے نہیں گھبراتے ہیں۔

ارے بھئی یہ زکام کھانسی بھی کوئی علاج والے مرض ہیں؟

استغفر اللہ اتنی سی زُکیا میں جب یہ حال ہے تمھارا تو پھر اور بیماریوں میں تو خدا جانے کیا حال ہوتا ہوگا تمھارا۔

ممکن ہے آئندہ سال کے ''سالنامہ'' میں اپنے زکام کی کچھ تفصیلات بتلائیں فی الحال اگر ہو سکے تو مذکورہ بالا زکاموں کا علاج کیجیے۔

پس مذکورہ بالا علامتیں جس شخص کے اوپر طاری پائی جائیں سمجھ لیجیے کہ اسے زکام ہو گیا ہے۔ فقط۔

(منقول از سالگرہ، عالمگیر، لاہور)

◆◆◆

جبل پور تک

روایت ہے اور نہات معتبر روایت ہے کہ سابق مولانا عبدالحق انجمن ترقی اردو حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن جب سفر فرماتے ہیں تو ریل گاڑی نمبر تین عرف پسنجر ٹرین سے، اس لیے کہ اس غریب نواز ریل گاڑی میں ممدوح کو تحریری کام کے لیے خاصا سکون حاصل ہوتا ہے یعنی اس میں مسافر زیادہ نہیں ہوتے۔ ادھر یہ سنتے رہتے تھے کہ بزرگوں کے "پاؤں پر پاؤں رکھ کر" چلنا عین سعادت ہے۔ لہٰذا صوبہ جات متوسط میں انجمن ہائے امداد باہمی کی طرح انجمن ہائے اردو کی طرح ڈالنے کے لیے اردو کے مذکورہ بالا بادا آدم علیہ السلام کے قدم بہ قدم چلنے کی خاطر تمام ریلوں کو چھوڑ کر پسنجر ٹرین ہی کو اختیار کیا تاکہ خیر و برکت کا باعث ہو۔

پہلا ہی پھل یہ ملا کہ ہم مذاق مسافروں کے عوض کم نہ زیادہ پورے چار نقشبند عرف گداگر لوگ "مولا مشکل کشا علی" کہہ کر برابر آ بیٹھے۔ اب ان چار یار برقرار کے بالکل بیچ میں ہم "پنجتن پاک" کی طرح جو نظر آئے تو ان لوگوں نے خالص ایم۔ اے پاس جاہل دہریہ اور علوم اسلامی سے یکسر کورا سمجھ کر جو گداگرانہ معجزات و کرامات کے اظہار کا سلسلہ شروع کیا تو اطمینان ہو گیا کہ مسلمان قوم زوال و ذلت کے دور میں جو داخل ہوئی ہے تو اس کا ہر فرد فضولی فضول گوئی اور بربادی کے ہنر میں طاق بھی ہے اور اور دروازہ بھی مثلث مثلاً ہم سے جب ان مولا مشکل کشا علی قسم کے

لٹھ بند فقیروں نے دریافت کیا کہ آپ جبل پور کیوں جا رہے ہیں تو ہم نے ادب سے عرض کیا کہ:

''مرشد دعا کیجیے میں جبل پور ہا کی کھیلنے جا رہا ہوں''

تو ان کا بہرۂ کرامات کھل گیا اور روحانیت کے جملہ مراتب طے کر کے ایک لمبی لاٹھی والے مرشد بولے کہ:

''بچہ مولا علی تیری مدد کریں گے تو جب کھیل کر جائے تو جبل پور کی درگاہ مداری پر حاضری دیتا جانا''۔

اس پر ہم نے عقیدت مندی کے لہجہ میں عرض کیا کہ آخر کار ہمیں بھی تو بتا دیجیے کہ اس درگاہ میں وہ کون سی اکسیر اعظم ہے جس کے طفیل ہم ہاکی کے کھیل میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تو واقفِ اسرار خفی و جلی مرشد نے اپنی گردن میں تسبیح کو گھما کر فرمایا کہ:

''بچہ وہاں ایک بادا صاحب ہیں اور اس سے زیادہ ہم کچھ بتانے پر قادر نہیں''۔

اب جب یہ بھی ہو لیا تو عرفان و معرفت اور اسلام و حقائق اسلام کے ان غیر سرکاری ٹھیکہ داروں میں سے ایک نے پورے آدھے فٹ کی ایک چلم نکالی اور ایک نے حکیم اجمل خاں قبلہ مغفور کی حبوب دافع تبخیر کے برابر گانجے کی گولی کو ہتھیلی پر مل کر جو ''یا حق'' کہا ہے تو ان میں پورا ڈبہ برطانیہ کی دُخانی کشتی نظر آنے لگا۔ اب اس دھواں دھار گانجا نوشی کے وقت ہمارے لیے دو ہی راستے تھے یا ان میں سے ہر ایک کا گلا دبا دیتے یا اپنی ناک کاٹ کر انھیں دے دیتے کہ لیجیے اور تعفن کو ہماری ناک سے سونگھ کر اندازہ کیجیے کہ آپ کیا پی رہے ہیں اور ایک عاشق مزاج اور رنگین دماغ ملا رموزی کو اس گانجے سے کس قسم کا لطف حاصل ہو رہا ہے؟ مگر سوچا کہ اگر گانجے سے اظہار بیزاری کرتے ہیں تو ان گداگروں کی گفتگو سے محروم رہ جائیں گے اس لیے پہلو بدل بدل کر دھواں بچاتے رہے تو ان کی رنگین داستانیں جاری رہیں کہ اچانک مرشد نے چلم سے خاک اٹھا کر ان الفاظ کے ساتھ ہمیں عطا کی کہ لے علی کے شیر اسے کھیلتے وقت پان میں کھا لینا پھر دیکھنا فقیروں کی بات کا کتنا اثر ہے۔

ہم نے فوراً اس خاک کو آنکھوں سے قریب کیا تو گداگروں کو یقین ہو گیا کہ ملا رموزی ان کا معتقد ہو چکا لہٰذا پھر چلنے دیجیے اس ''عمل سوختہ'' کا دور۔ اب خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس

تیں مریض ایسے بتائے گئے جنھوں نے ''ان مرشدین راہِ چلم وگانجا'' کی خاک سے شفا پائی۔
اب ہمیں حیرت تھی تو یہ کہ جب ان مرشدینِ کامل کی چلم میں خاک شفا بخش دن میں ہزار بار تیار ہوتی ہے تو پھر ہمدرد دواخانہ دہلی اور ''یونانی دواخانہ، دہلی'' کی کیا ضرورت ہے جو ان پر لاکھوں روپیہ برباد کیے جارہے ہیں؟

غرض اس قسم کی واہی تباہی باتوں کے بعد اصل فقیری اور خدارسیدگی کا اظہار اس وقت ہوا جب یہ چاروں رہروانِ منزل سلوک وعرفان ہوشنگ آباد اسٹیشن تک مطمئن ہو گئے کہ ملا رموزی بھی اسی قسم کا کوئی ایم۔اے پاس افسر ہے جو اپنی بہو بیٹیوں تک کو برکت حاصل کرنے پیروں اور ولیوں کی خدمت میں بھیجا کرتے ہیں لہٰذا جب یہ لوگ ریل گاڑی سے اترنے لگے تو ایک نے ہم سے آہستہ سے کہا کہ:

''لا بچہ کچھ فقیروں کا حصہ بھی دے دے تا کہ صبح کو یہاں سے آگے کا ٹکٹ خرید لیں''۔

تب ہم نے کہا کہ یہ حصہ تو وصول کیجیے آپ تحصیلداروں سے کہ انھی کے ہاں اس قسم کے حصے وصول ہو کر آتے رہتے ہیں البتہ یہ دیکھیے کہ اب ہم آپ کی گت بناتے ہیں؟ اب جو یہ کہا تو فقیر صاحب کے حواس خراب ہو گئے اور فوراً پلیٹ فارم کے اُس دروازہ کا رُخ کیا جدھر سے بے ٹکٹ مسافر بھاگا کرتے ہیں۔

◆◆◆

گھر تک

اب یہ یقین آ ہی گیا کہ دنیا کا لاجواب سے لاجواب شوہر اپنی دنیا کی بد سے بدتر بیوی سے ہمیشہ کے لیے جدا نہیں رہ سکتا تو اچانک بستر باندھ دینا پڑا۔ اتفاق کہ بھائیوں کی ہاکی والی جماعت بھی اسی وقت سفر کر رہی تھی۔ رات کے ایک اوپر گیارہ بجے جبل پور سے ریل روانہ ہوتی ہے۔ آج کئی دن کی شدید گرمی کے بعد شام کو ایک خوفناک اور دماغی سکون کو برہم کر دینے والی آندھی کے بعد قدرے بارش ہو جانے سے موسم میں وجد و کیف کی جو شرابیں بھر دی گئی تھیں، ان کے اثر سے آج کی رات رندوں کے حق میں پینے پلانے والی رات ہو گئی تھی۔ اس رات ہواؤں میں جو لطافت و نزہت اور فرحت و شادابی پیدا ہو گئی تھی اس نے دل و دماغ میں نشاط خیال و سرمستی کے جو ولولے پیدا کر دیے تھے ان کا لطف وہی لوگ کچھ خوب محسوس کر سکتے ہیں جو جہنم زار ہند میں چار مہینے کے لیے جھونک دیے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر غربا اگر بھوکے مر جائیں تو اخباروں میں تعداد بتا دو اور سرکاری دفاتر کو شملے کی برفانی بلندیوں پر منتقل کر دو۔

ابھی بارش ہو رہی تھی اور ملا رموزی سیٹھ احمد فرحت کے دولت کدہ پر بیٹھا تھا کہ یکا یک اس نے اپنی روانگی کا اعلان کیا۔ کچھ شک نہیں کہ اس اعلان سے سیٹھ صاحب موصوف مولانا امیر اللہ صاحب امیر اور مولانا غلام جیلانی صاحب کو بے حد افسوس ہوا۔ انھوں نے از راہ خلوص و کرم اشٹشن

تک ہمراہ رہنے پر اصرار کیا، مگر ہم نے اسے منظور نہ کیا۔ البتہ برادر گرامی ڈاکٹر اعظم کریوی ایڈیٹر رسالہ ''اکبرآباد'' نے کسی طرح نہ مانا اور برساتی سوٹ پہن کر یہ کہتے ہوئے ہمراہ ہو گئے کہ:

آن نہ من باشم کہ وقت ریل بینی پشت من

اب جو ڈاکٹر اعظم ایسا رنگین دماغ ہم پیشہ اور نکتہ سنج اہل قلم ساتھ ہو گیا تو جبل پور میں آج جو ہلکی بارش ہو گئی تھی اس کا حیات آرا لطف حاصل ہو گیا یعنی اس بارش نے آج کی رات کو خنکی اور طراوت تازگی اور شادابی کے جس حسن و شباب سے آراستہ کر دیا تھا اس کی لطافت افزا کیفیات کا مزا اسی طرح مل سکتا تھا کہ حسن و جمال کے تذکروں میں کوئی ہم خیال و ہم مذاق اس طرح شریک ہو کہ ہم کہیں کہ آج لوگ اس طرح کوٹھوں پر سو رہے ہیں ہوں گے کہ بجلی کے لیمپ سرہانے ہوں گے اور کچھ کتابیں اور رات کی اس خنکی سے جو گہری نیند آئی ہو گی تو اس کے اثر سے دوپٹہ مسہری سے نیچے لٹک رہا ہو گا۔ مگر سونے والے کو خبر بھی نہ ہو گی تو ساتھی کہے کہ غلط غلط بلکہ کوئی آج اس طرح سو رہا ہو گا کہ اس کے منہ پر ملا رموزی والا اخبار ''تازیانہ'' پڑا ہو گا اور وہ ملا کے مضمون کو پڑھتے پڑھتے ہی سو گیا ہو گا۔

کچھ شک نہیں کہ ہم اور ڈاکٹر اعظم اس بارش سے اتنے ہی پر کیف تھے کہ اسٹیشن تک حسن انسانی سے لے کر جمال فطرت کی وجد آفریں نگار آرائیوں پر لاکھوں تبصرے کر گزرتے۔ مگر برا ہو احساس و شعور پر تنگ دامنی اور حرماں نصیبی کا کہ اس وقت ہم دونوں کہنا تو چاہتے تھے یہ کہ آؤ ہم تم ان شاداب ہواؤں کے مستی پیدا کرنے والے جھونکوں میں بیٹھ کر خط لکھیں جس کا خلاصہ صرف یہ ہو کہ تمھیں خبر بھی ہے کہ ہواؤں کی ان شادابیوں نے اصحاب درد اور ارباب ہوش کے کتنے افسردہ ارمان پھر سے شاداب کر دیے ہیں۔ مگر دونوں کے منہ سے جب نکلتا تھا تو یہ کہ افوہ ملا صاحب نہ پوچھئے ان بے دردوں کی ہم ایسوں سے بے مہریاں؟ اور ہم کہتے تھے کہ جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب سچ ہے کہ گورے کو کالی اور کالے کو گوری بیوی دیے جانے کا قاعدہ اور آرڈی ننس جو جاری ہو چکا ہے وہ بدلا جا سکتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اسے بدلے کون؟

غرض بارش کی خنکی اور جبل پور کی ٹھنڈی اور کشادہ سڑکوں پر جب تک چلتے رہے اس وقت تک شعر و ادب اور حسن و جمالیات ہند پر وہ وہ تبصرے اور وہ تنقیدیں ہوئیں کہ اگر ہم دونوں کی

اس وقت باتوں کو کوئی لکھتا جاتا تو وہ ادب اور زبانِ اردو کا ایک ایسا سرمایہ ہوتا کہ جو دیکھتا وہ مست ہو جاتا اور جو سنتا وہ شیریں فرہاد کے قصوں کو بھول جاتا کہ:

ناگاہ ریلوے اسٹیشن جو نظر آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ سی۔ آئی۔ ڈی کا کوئی بڑا انگریز افسر ہمارے کان میں کہہ رہا ہے کہ اچھا بس ملا صاحب اب یہ اپنی تمام خوش دماغی اور سرمستی تو چھوڑ جایئے۔ ہمارے پاس اور ہاتھ ڈال کر جیب میں یہ دیکھیے کہ تھرڈ کلاس ٹکٹ کے دام بھی ہیں یا نہیں؟ اس لیے فوراً ہی ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ ٹکٹ لے آیئے۔ میں بستر لے کر پلیٹ فارم پر چلتا ہوں۔

ٹکٹ جو آ گیا تو اب ہونے دیجیے ہجر وفراق اور جدائی کے افسردہ کن تذکرے۔ مثلاً ڈاکٹر فرماتے کہ آہ ملا صاحب آپ کے آنے سے میرے اندر جو پھر سے جوانی آ گئی تھی تو اب آپ کے جانے سے میں پھر خضاب لاجواب کے قابل رہ جاؤں گا۔ اور ہم کہتے تھے کہ کچھ شک نہیں ڈاکٹر صاحب اب جو ہم وطن میں داخل ہوئے کہ ہونے دیجیے ہم سے یہ لطافت سوز سوالات کیسے کیا لائے۔

جی ہاں اب تو خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ کتابوں سے وغیرہ؟ پلیٹ فارم پر ابھی اس قسم کے خیالات دماغوں کو برباد کر ہی رہے تھے کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ سبز ریشم میں ایک سفیدی چیز کو چند انگریز اس مستی وخری اور فاتحانہ تبسم کے ساتھ اپنے حلقہ میں لیے ٹہل رہے ہیں کہ کالے آدمی کہیں دیکھیں اور دل تھام کر پلیٹ فارم پر بیٹھ جائیں۔ یہ سفیدی متحرک بجلی جس طرف جھک جاتی تھی بڑے بڑے انگریز ٹوپیاں اتار کر اسی طرف جھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے پاس سے سینٹ کی جو مہک اور خوشبو اڑتی تھی اس نے پلیٹ فارم پر چلنے والی ہندستانی ہواؤں کو پرستان، انگلستان کی عنبر فشانیاں اور عطر بیزیاں بخش دی تھیں اونچی ایڑی کے سیاہ جوتے کی کھٹ کھٹ پر نظر پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سرو گلستان ہے جس کے قدرِ رعنا میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے موجیں پیدا کر رہے ہیں اور قریب ہے کہ پلیٹ فارم تہہ و بالا ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی خواہ مخواہ کی ملائیت کو بستر کے پاس رکھ کر جب خواجہ حسن نظامی قبلہ کی حسن پرور نگاہ سے دیکھنا شروع کیا تو یہ محققانہ نکتہ سمجھ میں آ ہی گیا کہ گلستانِ فرنگ کی یہ نیلگوں چشم قمریاں اور ریشمی تتریاں کچھ تو اس

لیے حشر خرام اور حسن لبالب نظر آتی ہیں کہ وہ ایک سرد و معتدل خطے کی پیداوار ہیں، مگر یہ جو ہندستانیوں کی نظر میں مجموعۂ جمال و محبوبیت نظر آتی ہیں سو اس لیے کہ ان کے مالک خود انھیں اتنا زیادہ لچک دار بنا کر پھراتے ہیں کہ دیکھیے اور "دہائی ہے خواجہ دہلوی" کی کہہ کر کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر رہ جایئے اور انھیں گلستان در گلستان نمونوں کو دیکھ کر یہ اپنے قحط زدہ ہندستانی چاہتے ہیں کہ اپنے قومی کالجوں اور اسکولوں سے بھی ایسی ہی کمانی دار تتریاں اُڑائی جائیں جو اپنے گنگا جمنی انداز سے لندن زادیوں پر آوازہ کس سکیں کہ آؤ اور اپنے حسنِ بے قید و جمال بے محابا سے ہمارے لجائے ہوئے اور شرمیلے نمونوں سے مقابلہ کرو۔ پھر دیکھو کہ ایشیا تمھارے چاند سورج کو شرمانے والے چمڑے پر مرتا ہے یا ہماری گندی ملاحت پر جان دیتا ہے۔

فی الجملہ ہم نے طے کیا کہ پلیٹ فارم پر اس نارنجی اور سبز رنگ کی عزت بڑھانے والے کو اگر دیکھنا ہی ہے تو یوں دیکھو کہ ہندستان کی مانی ہوئی پرہیزگاری بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے اور نظربازی بھی یوں ہو کہ ہر نظر اس زرق برق انسان ہی میں جذب و پیوست ہوتی رہے۔ اس لیے کچھ بڑے ہی نمازیوں کے انداز سے ایک چائے کی دکان پر کھڑے چائے پیتے رہے۔ اعظم بے چارے نہ کسی کے جھانکنے میں ہیں اور نہ کسی کے تاکنے میں بس کھڑے چائے پی رہے ہیں اب اتنے میں اگر ادھر ادھر کبھی کبھی دیکھ بھی لیتے ہیں تو کہاں کا گناہ کرتے ہیں۔

وہ تو ہوش اس وقت آیا جب وطن اقدس لے جانے والی ریل گڑگڑاتی ہوئی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور ہندستانی مسافروں کے بستروں اور صندوقوں کا دنگل شروع ہو گیا۔ اب قریب قریب ہر مسافر اس فکر میں تھا اس کو اکیلے کو ساری ریل سونے کے لیے مل جائے، مگر ہم اس غم میں کھڑے تھے کہ آہ زبانِ اردو کے کسی نصف نظامِ دکن ہی نے آج اس قابل تو بنا دیا ہوتا کہ جس فرسٹ کلاس میں یہ بستانِ فرنگ سفر کرتے ہم بھی اسی فرسٹ کلاس میں ڈٹ جاتے مگر وہ جو جبلپور اپنے ہی کرایہ سے لے گئے تھے اور اپنے ہی کرایہ سے واپس ہو رہے تھے تو اس کا پھل یہ ملا کہ وہ قہقہہ لگا کر اور انگریزی ٹوپیوں کا سلام لے کر فرسٹ کلاس میں اور ہم نے قلی سے کہا کہ ڈھونڈھ بھائی کوئی بدبودار مہاجنوں اور کسانوں سے بھرا ہوا تھرڈ کلاس۔ اس وقت ڈاکٹر اعظم کریوی کو جو بذلہ سنجی سوجھی تو ہمارے تھرڈ کلاس میں بیٹھ جانے اور ان کے فرسٹ کلاس میں بیٹھنے پر انھوں نے

یہ آوازہ کسا کہ اور قہقہے اور شادمانیاں پیدا کیجیے اردو زبان کے بے حس پڑھنے والوں میں، اس سے تو عجب خاں سرحدی ہی کی زبان کے ادیب ہوتے تو آج مس بازی میں یوں ناکام دید تو نہ رہتے۔ غرض اس آوازے سے جہاں اردو کے شگفتہ نگاروں کی واماندگی پر افسوس ہوا وہاں ڈاکٹر اعظم ایسے صاحب ذوق و نکتہ سنج دوست کی جدائی کا غم لے کر روانہ ہو گئے۔

اب تو ہندستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ہندستانی ریلوں کے تھرڈ کلاسوں میں کیا ہوتا ہے اور کیا ہوتا رہتا ہے۔ بس یہی کہ تو آیا اور میرے پاؤں پر بستر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور میں آیا اور تیرے منہ پر پاؤں رکھ کر سو گیا۔ اِدھر ریل کے تھرڈ کلاس کا کرایہ تو جتنا ریلوے کمپنی چاہتی ہے ہر سال بڑھا دیتی ہے اور کونسل کے ارکان اسے ڈانٹ بھی نہیں سکتے، مگر کرایہ پر کرایہ بڑھا دینے کے بعد بھی تھرڈ کلاسوں میں نہ بجلی کے پنکھے بڑھائے گئے نہ اتنی تیز روشنی کی جاتی کہ کوئی لکھا پڑھا مسافر رات کو نیند نہ آنے سے کچھ بیٹھا پڑھتا ہی چلا جائے۔ لہٰذا دو چار اسٹیشن تک تو رات کو ٹھنڈی ہوا اور کچھ مطلب کے موافق اشعار گنگناتے چلے گئے اور اس کے بعد ڈیڑھ فٹ جگہ میں لیٹ کر سوتے وقت کی توبہ استغفار کو یوں پڑھتے رہے گویا سارا دن گناہوں اور سیہ کاریوں ہی میں گزرا ہے۔ حالانکہ جبل پور کی ایک ایک ٹھنڈی سڑک سے پوچھ لیجیے جو کسی ایک کو بھی دل بھر کے دیکھا ہو؟

القصہ کسی نہ کسی طرح اٹارسی جنکشن پر پہنچے۔ رات بھر اسی طرح سوئے تھے کہ نیند اور میٹھی نیند کے عوض ایک بے ہوشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ کیونکہ دس پندرہ منٹ کے بعد پاس والے مسافر کے سر سے سر ٹکرا جاتا تھا اور کبھی پاؤں نہ پھیلانے سے جو درد پیدا ہو جاتا تھا اس کی تکلیف سے آنکھ کھل جاتی تھی۔ یہی حال گاڑی ٹھہرنے والے اسٹیشنوں پر ہوتا تھا۔ کہ اِدھر تو ہم بیٹھے خواب میں دیکھنے لگے کہ ایک پری پیکر پری وش اور پری جمال سرہانے کھڑی کہہ رہی ہے کہ اف ملا رموزی ایسا شگفتہ نگار اور بہار افروز قلم کا مالک اور مجھ سے اتنا دور؟ کہ اچانک مسافروں کی یلغار ہوئی کہ کوئی ہے کہ سر کے پاس ہی اپنا بڑا سا صندوق یوں رکھ رہا ہے گویا اس کے جی میں ہے کہ سونے والے مسافر کا سر توڑ ڈالے۔ کوئی ہے کہ گٹھریوں پر گٹھریاں ہے کہ ڈبے میں بھرتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی ہے کہ مع بیوی کے اس طرح آ کر ڈٹ گئی ہے کہ بیوی کی بغل میں بھی ایک بچہ ہے تو گود میں بھی ایک بچہ پھر ان بچوں کو ریل میں نہ نیند ہے نہ موت۔ بس سونے والے مسافروں کے سر پر ہیں

کہ بے تحاشا رو رہے ہیں اور سلیقہ یہ کہ اس کی ماں اس چیخ پکار پر بھی اس گھمنڈ سے پڑی سو رہی گویا یا تو وہ حسن و رنگینی اور جمال و لطافت کی کوئی دوسری نور جہاں ہے۔ کہ انگریز بھی اگر سوتا دیکھ لیں تو کچھ نہ کہہ سکیں گے یا پھر دہقانی بدتمیزی کا آخری ثبوت ہے کہ اولاد چاہے تمام راستہ چیختی جائے، مگر جو سوئی ہیں تو سوتی ہی رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اٹاری جنکشن پر کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے اونگھتے رہے، مگر اس اونگھنے سے زیادہ تکلیف دہ تصور یہ تھا کہ اب اٹاری سے گھر تک جو پھر تھرڈ کلاس میں جائیں گے تو اس طرح کے مسافروں سے پھر سابقہ پڑے گا جو تمام راستے بیٹھے اونگھتے تو رہیں گے مگر ان کے اندر ہنسی مذاق، دل لگی، تفریح اور زندہ دلی کی کوئی علامت موجود نہ ملے گی کہ غلامی کے مارے ہوئے دماغ زندہ دلی اور مسرت کے ہر جذبے سے ہمیشہ خالی ہوا کرتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو فاتح انگریزوں کے سولجروں کی اسپیشل ریلیں دیکھا کرو جن میں سفر کرنے والے سولجر زندہ دلی، مستی، تفریح اور خوش مذاقی کا نمونہ ہوا کرتے ہیں، مگر ان کے مقابل تم جس مرتبے کے ہندستانی کے ساتھ چاہو سفر کر کے دیکھ لو۔ بس انشاء اللہ میلوں خشکی اور ماتم کا ٹام لوٹ بنا چلا جائے گا، مگر ایک مرتبہ بھی ہنسنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور دوسروں کو ہنسانے اور خوش دل بنانے کی مقدرت تو ہندستانیوں کو حاصل ہی نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان بدمذاقی اور ماتم زدگی کے دلدادہ ہندستانیوں میں کسی ظریف مضمون نگار کی کوئی قدر ہے نہ کسی پرجوش اہلِ قلم کی قیمت۔

◆◆◆

ناگپور تک

صوبہ جات متوسط میں زبانِ اردو کی خدمت سے جب امرائے صوبہ جات متوسط کو بے پروا پایا تو ان کے ذمہ کی اس ذمہ داری کو ملا رموزی جو پورا کرنے چلے اور اپنے ذاتی مصارف سے چلے تو ان کا دل گھر ہی سے خون ہونے لگا، مگر اس مالی اور ذہنی اذیت کو جب ملا رموزی نے برداشت کرلیا تو فطرت و جمال فطرت کے نزہت آرا مظاہر اس کی تشفی اور ذہنی نوازش کے لیے تیار ہو گئے اور اس طرح خدا کا وعدہ پورا ہونے لگا کہ وہ صابر اور جفاکش بندوں کو آخر کار افسردہ نہیں ہونے دیتا۔

لہٰذا خدا جانے کن تفکرات کو ساتھ لے کر ناگپور میں انجمن اردو کے لیے ریل کی تھرڈ کلاس میں گنواروں کی کثرت سے اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر چوروں کی طرح بیٹھ کر ابھی دو چار ہی اسٹیشن چلے تھے کہ چند مسافر ہمارے ڈبے میں آئے اور سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ریشمی گٹھری بھی ہے جو کونے میں رکھ دی گئی ہے، مگر تھوڑی ہی دیر میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ زرتار و زرنگار چیز ہمیں دیکھ رہی ہے اور اس انداز سے گویا وہ چاہتی ہے کہ اگر اس کے ساتھی نہ دیکھ سکیں تو ملا رموزی بھی اس کی طرف دیکھتا رہے بشرطیکہ وہ نزاکت ونفاست، حجاب وشباب، حسن ودلنوازی اور جمال وعشوہ گری کا کوئی عالم آشوب نمونہ دیکھنا چاہتا

ہے۔ اب بظاہر تو اس نمونۂ حیا و حجاب اور جمال و شباب کے دیکھنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی الا تھرڈ کلاس مسافروں کا خوف کہ کہیں وہ ملا رموزی ایسے شائستہ صورت مسافر کو نہ دیکھ لیں کہ وہ ایک جمال و شباب اور حسن و رنگ میں ڈوبے ہوئے اور زر تار و زرنگار لباس والے مسافر کو کیوں گھور رہا ہے، اس لیے ہم نے چاہا کہ اس طرف دیکھیں تو ضرور مگر اس انداز سے گویا ہم خود تو دیکھنا نہیں چاہتے ہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ نظر اٹھتی ہے تو اسی گہوارۂ حسن و شباب کی طرف۔ ریل کی حرکت سے یوں جنبان نظر آتا تھا گویا ساون کے جھولے میں کوئی ہے، جو مست و بے پروا ہو کر جھول رہا ہے۔ اب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم تھوڑی دیر تک گھور لینے کے بعد تھرڈ کلاس کے لٹھ بند مسافروں کے ہنگامے اور چلم بازی سے تنگ آ کر سو جاتے، مگر قابل بیان نہیں ہماری وہ بے بسی کہ جب اس طرف دیکھتے تھے تو دیکھتے تھے حنا کے رنگ سے رنگین انگلیاں برائے نام گھونگھٹ کو پکڑے ہیں اور شرم و شوخی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ہمیں دیکھ دیکھ کر اشارے کر رہی ہیں کہ خبردار جو سوئے ہو یا نظر ملانے میں کمی کی ہے۔

اب تو دل کی دھڑکن اور نظر کے اضطراب کا یہ عالم کہ جی چاہنے لگا کہ وہ "انجمن اردو ناگپور" بنے یا نہ بنے ہمیں چاہیے کہ بے ٹکٹ ہی اس مجموعۂ بہار و شباب کے ساتھ وہاں تک جائیں جہاں اسے جانا ہے۔ بس اگر ہو گا تو یہی کہ ہمارے خلاف اغوا کا مقدمہ چلے گا اور سارا ہندستان کہے گا کہ لیجیے وہ ملا رموزی صاحب بڑے پاکباز بنے پھرتے تھے! پس اگر یہ ہو گا تو ہم بھی رہا ہو کر یہ سوال چھپوا دیں گے کہ آپ کی قوم نے اپنے شگفتہ نگاروں کے لیے کہاں کی رنگینیاں اور آسودگیاں جمع فرما دی ہیں جو وہ مست و مسرور ہو کر آپ کی تفریح طبع اور زبان اردو میں حسن ادب کے جواہر فراہم کرتے رہیں؟

ابھی انھی خیالات میں غرق تھے کہ "پاسبان" سو گیا۔ اب تو اس طرف سے آزادی کی ایک تبسم ریز انگڑائی لی گئی جس کا یہ مطلب تھا کہ اب "نظر بازی" آسان ہے، مگر برا ہو اس مروجہ تہذیب و شائستہ خیالی کا کہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ جی بھر کر دیکھ تو لیں مگر اس طرف یہ بے باکی یہ بے حجابی گویا کوئی بیٹھا ملا رموزی کو اپنے اندر جذب کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی دس دس منٹ کی کوشش کے بعد ہم نظر کو ہزاروں تدبیروں سے اس طرف پھیر کر دیکھنا چاہتے تھے، مگر دیکھا نہیں جاتا تھا

۔اور آپ ہی بتایئے کہ حجاب و شباب کی ایک جنت کو کوئی چند منٹ میں کس طرح دیکھ لے مگر اس طرف نظر بازی اور نظر نوازی کا یہ عالم گویا حسن و رنگ اور شباب و مستی کی ایک دنیا لیے ہوئے جو ریل میں بیٹھے ہیں سو اسی لیے کہ ملا رموزی کے خیال و دماغ میں عشق و وارفتگی کی ایک آگ لگا دیں تو سہی۔ لہٰذا ہونے لگا کہ گھونگھٹ نے اختصار اختیار کیا اور حنا بستہ انگلیوں سے ریشم کی دھانی آستین اس طرح ہٹائی جانے لگی کہ ملا رموزی کو ایک غرق نور کلائی پر طلائی گھڑی اور اس کی نقرئی چین اتنی صاف نظر آنے لگی کہ وہ اپنی جگہ پر کلائی کی اس نزاکت و نفاست پر یوں متوجہ ہو جائے کہ پھر اسے ریلوے پولیس کے سپاہی بھی ڈبے سے اتاریں تو نہ اتر سکیں۔

اب جب کلائی اور گھڑی اس بے حجابی سے دکھائی جانے لگی تو بے چین نگاہوں نے یوں گستاخ ہونا شروع کر دیا کہ جب دیکھیے ملا رموزی صاحب اُدھر ہی جھکے ہوئے دیکھ رہے ہیں، مگر دیکھنے والے نے یہ بھی دیکھا کہ ملا رموزی دریائے نور میں ڈوبی ہوئی اس کلائی کو دیکھ کر جہاں مست و مدہوش ہو رہا ہے وہاں وہ بے چین اور بے قرار بھی ہے۔ تو حسن خموش نے وہ حکیمانہ طریق نوازش اختیار کیا جو جوانی اور مستی والوں کا خاص سلیقہ مانا گیا ہے۔ یعنی اب کلائی او رگھڑی کے حسن سے زیادہ حسین مظاہرے ہونے لگے اور اس درجہ کمال حکمت و حجاب سے گویا اس تمام کارروائی میں کسی اہتمام کا دخل ہی نہیں بلکہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اتفاقاً اور اضطراراً، مگر ملا رموزی کی بے تاب نگاہوں کی تاثیر تھی کہ ان کے حجاب کو بے حجابی سے بدلتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ اب یہ ہوا اور گویا اچانک ہوا کے جھونکے سے ہوا کہ سر کے معطر بالوں سے گھونگھٹ یکا یک گر گیا جسے فوراً سنبھال لیا گیا۔ مگر دل کہہ رہا تھا کہ اگر ملا رموزی کی نادیدہ نگاہیں پرستان زادگی کی اس گوہر افروز مثال کے رخ رنگین پر حوصلے کے ساتھ جمی رہیں۔ تو یہ گھونگھٹ ایک مرتبہ کیا ہزار مرتبہ اٹھایا جائے گا اور نام یہ ہوگا کہ کرتی کیا ریل میں تیزی سے آنے والی ہوا سے منہ کھل جایا کرتا تھا۔ چنانچہ مستی اور رعنائی سے دمکتا ہوا گلاب اس گھونگھٹ سے نظر آیا اور اس طرح کہ کبھی کبھی جو کوئی دوسرا مسافر ہمارے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے حسن و رنگ اور شباب و دوشیزگی کی آگ سے اس دہکتے ہوئے گلاب سے چہرہ پر ساری کا ریشمی حجاب طاری کر لیا جاتا تھا اور مسکرا دیا جاتا تھا۔ یعنی اس وقت کی مسکراہٹ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ

میں کیا کرتی تمھارے پاس والا مسافر بھی تو میری طرف دیکھ رہا تھا، اس لیے میں نے منہ چھپالیا،تم سے حجاب کروں تو جوانی کی قسم۔

اب یہاں سے دماغ نے فیصلہ کیا کہ یوں تھرڈ کلاس مسافروں کے لیے بڑے اسٹیشن کا آنا اس لیے نعمت ہوا کرتا ہے کہ اتر کر پانی، پوری، بیڑی، سگریٹ چنے دال موٹ اور لمبی لمبی جمائیاں اور انگڑائیاں لے لیا کرتے ہیں، مگر آج ہمارے حق میں ہر بڑا اسٹیشن اس لیے مصیبت بن جاتا تھا کہ گاڑی کے دیر تک ٹھہرنے اور تھرڈ کلاس مسافروں کی قحط زدہ تعداد سے کہیں بوڑھا ''پاسبان'' بیدار نہ ہوجائے۔ مگر خدا سمجھے ان انگریزوں سے کہ جس اسٹیشن پر جتنے منٹ کے لیے گاڑی ٹھہرانے کا ضابطہ مقرر کردیا ہے لاکھ ملا رموزی کہیں کہ جلد گاڑی روانہ کرو کہ انھیں کچھ کام ہے، مگر انگریز گاڑی نہ چلائیں گے۔ بے سمجھ کہیں کے۔

بارے ہم نے یہ کیا کہ جہاں بڑا اسٹیشن آیا اور ہم یوں لیٹ گئے۔ گویا بڑی گہری نیند میں ہیں۔ مگر دل و دماغ کی اس محبوبانہ تاربرتی پر قربان ہوجایئے کہ جہاں کسی اسٹیشن پر بہانے کے طور پر لیٹ جاتے، اس طرف بھی ایک سرخ شال اوڑھ کر کوئی یوں لیٹ جاتا کہ اگر کوئی دریافت بھی کرے تو کہہ دیا جاتا کہ میں خود سو رہی تھی مجھے کیا خبر کہ ریل اسٹیشن پر کتنی دیر کھڑی رہی؟ اب جو ریل روانہ ہوتی تو ہم تیزی سے اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ مگر اس طرف حجاب چلا کر کہتا تھا کہ اتنی ہی تیزی سے میں بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تو ملا رموزی سمجھ لے گا کہ میرے ہی دل کی خموش تاثیر سے یہ بھی اٹھی ہے۔ لہٰذا اس وقت دیکھتا کوئی اس طرف کی انگڑائیاں، مگر جذبات انگیز جوانی کا برا ہو کہ ملا رموزی کی خاطر لاکھ بہانوں کے بعد بھی اٹھنا ہی پڑتا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی وہ اٹھنے کی محبوبانہ خفت یوں مٹائی جاتی تھی کہ دیر تک ہماری طرف دیکھنے کے عوض کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جاتا تھا۔ گویا کوئی سوال کرتا تو کہہ دیا جاتا کہ میں اٹھی ہی اس لیے تھی کہ ریل سے باہر کا منظر دیکھوں مجھے کیا خبر کہ اس ڈبے میں بیٹھے ہوئے ملا رموزی کون ہیں؟

اب آپ کا خیال ہوگا کہ یہ رنگین و دلنواز سلسلہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ ایک دل پسند قربت کی طرف بڑھ رہا ہوگا، مگر اس حسین انتظار کو ایک آہ پر یوں ختم کیجیے کہ ہماری ریل بدلنے والا اسٹیشن آگیا اور ہم اس لیے یہاں اتر گئے کہ ریلوں میں ایسے دل شکن سلسلے صرف

اسی حد تک جھڑ جاتے ہیں کہ اپنے اپنے شہر کے اسٹیشن پر دونوں کلیجہ تھام کر اتر جاتے ہیں اور بس۔ لیکن اگر افسردہ دلی اور مایوسیوں سے تھکا ہوا ملا رموزی کسی سفر میں اپنی منزلِ مقصود چھوڑ کر کسی دوسرے اسٹیشن پر اتر جائے تو سمجھ لیجیے گا کہ کوئی جادو اثر اشارہ پایا ہوگا، اس لیے اتر گیا تو کیا گناہ کیا۔

اب جمال و محبوبیت کے کسی حور وش ہمراہی سے جدا کر کے جب کوئی مزدور آواز دے کہ اسٹیشن اٹارسی، ناگپور جانے والی گاڑی تیار ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس قلی کا گلا دبا کر کہہ دیا جائے کہ اسے مرگی کا عارضہ تھا خود گر کر مر گیا۔ لہٰذا اترے اور خدا جانے کس طرف اترے اور ناگپور جانے والی پسنجر ٹرین کے قریب پہنچتے ہی اندازہ گیا کہ بغیر وفات حسرت آیات کے اس ریل سے باہر نہ آئیں گے۔ یعنی یو۔ پی میں تعلیم و تربیت پایا ہوا ملا رموزی اصحابِ علم و فضیلت کی شائستگی آموز صحبتوں میں رہنے والا ملا رموزی فطرت و جمالِ فطرت پر تنقیدیں لکھنے والا ملا رموزی اور پری زادوں اور پری جمالوں کے خوں ریز اشاروں پر مرمٹنے والا ملا رموزی کو جب آپ مرہٹی زبان بولنے والے ننگ دھڑنگ گنواروں کی ریل میں بند کر کے فرمائیں کہ جائیے اور ناگپور میں "انجمن اردو" بنا آیئے تو ایمان سے کہیے کہ غریب ملا رموزی کو اپنی وفات کا یقین ہوگا یا کسی نئی جوانی کا تصور!

لہٰذا ناگپوری پسنجر میں جو بیٹھے ہیں تو دل جانتا ہے کہ ایک ایک لحہ اردو کی شاعری کا اس حشر کے برابر کا محسوس ہوتا تھا جس دن حسینانِ ہند اور بعض پولیس والوں کو ان کے مظالم کا مزہ چکھایا جائے گا۔ یعنی پانی جو برس رہا تھا تو مرہٹی زبان کے یہ گنوار اپنی پانی سے بھیگی ہوئی چٹائیوں اور کمبلوں سمیت ہمارے برابر اس خوبصورتی سے آ کر بیٹھ جاتے تھے گویا ہم بھی مہاراشٹر کے بڑے اونچے گنوار ہیں۔ پھر اگر یہی ہوتا غم نہ تھا کہ تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کے معنی ہی شائستگی اور بلند خیالی کا خون کرنا ہے، مگر ستم تو یہ تھا کہ یہ گنوار ابن گنوار ہم سے مرہٹی زبان میں اس تیزی سے باتیں کرتے تھے گویا خدانخواستہ ہماری مادری زبان بھی مرہٹی ہے۔ اب اگر زبانِ اردو کے مضمون نگار کو بھی دوسری زبان کے حسن و قبح پر کچھ کہنے کا حق حاصل ہے تو صاف کہتے ہیں کہ ناگپور کے ادب نواز بھائی اگر ہزاروں روپیہ نذرانہ دے کر بھی ملا رموزی کو ناگپور آنے کی دعوت دیں تو ممکن

ہے کہ ہم محض اس لیے جانے سے انکار کردیں کہ راستہ میں مرہٹی زبان بولنے والے پھرل جائیں گے تو پھر کون ہے جو اپنی کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی زبانِ اردو کی سماعت کو ان سے برباد کرے۔

پُرلطف اور ہمت آزمابات یہ تھی کہ ہم گھر ہی سے ملیریا میں مبتلا روانہ ہوئے تھے، اس لیے سر کا درد چاہتا تھا کہ ریل میں آرام ملے۔ مگر ناگپور کے گنواروں نے بھی قسم کھائی تھی کہ جتنی زیادہ تعداد میں ہو سکے گا آج ہی ہم بھی اس ریل میں سفر کریں گے۔ لہٰذا اٹارسی سے ناگپور تک جتنے چھوٹے اسٹیشن بنائے گئے ہیں، ان میں کا ایک ایک اسٹیشن آج جنکشن کا مزا دے رہا تھا اور ہر اسٹیشن سے گنواروں کے قافلے کے قافلے سوار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ شب کے کوئی تین بجے تک مسلسل بے آرام رہنے پر بالآخر بے ہوش سے ہو گئے جسے گنواروں نے سمجھا ہوگا کہ ملا رموزی صاحب سو گئے۔

الحمدللہ کہ صبح کے ٹھیک پانچ بجے کوئی بیس پچیس گنواروں کا اس زور سے حملہ ہوا کہ بیدار ہی نہیں بلکہ اٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔ وہ تو غنیمت ہی کہیے کہ ہمارا بستر ذرا خوبصورت تھا اور جھالردار تکیے، جن کے رئیسانہ رعب سے یہ گنوار آگے نہ بڑھے ورنہ ان میں کے ہر ایک نے تمام سوتے ہوئے مسافروں کو یہ کہہ کر اٹھا کر بٹھا دیا کہ اب صبح ہوگئی۔ اب زبانِ اردو کے خلوص سے نہیں بلکہ صبح کی نماز پڑھ لینے کی برکت سے ملیریا کا اثر کافور ہو چکا تھا۔ ایک اسٹیشن پر چائے جو پی لی تو معلوم ہوا کہ ایک عادی چرس نوش کو کسی نے چرس یا گانجے کی ایک پوری چلم پلا دی، اس لیے مزاج میں قدرے جولانی جو محسوس ہوئی تو "ریلیاتی مناظر" دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

◆◆◆

بُرہان پور میں

برادرم سید حفیظ الدین صاحب شوقی بی۔اے نے لکھ دیا تھا کہ برہانپور میں ملا رموزی ایک مشاعرہ کے صدر بھی بنائے جائیں لہٰذا ملا رموزی اپنے گھر میں تو کبھی اتنا خوش دماغ رہتا نہیں کہ وہ کوئی بہار افروز اور محبوب اندوز غزل کہہ سکے۔ادھر ملا رموزی کی شاعری ابھی بالکل ہی تازہ ہے۔اس لیے اب ریل ہی میں غزل کہہ سکتے تھے تو اول تو تمام رات مسافروں کی علمی تحقیق میں جاگے، صبح کو برادرم بشیر احمد جالندھری نے اپنی پرخلوص چائے اور انڈوں سے ثابت کر دیا کہ اگر جالندھر سے ملا رموزی کو شکایت ہے تو حسن صولت جالندھری اور بشیر احمد جالندھری اسے رفع کرنے کے لیے پیدا ہو چکے ہیں، لہٰذا چائے نوش فرماتے رہیے۔

اب اس حالت سے جو پارسل ایکسپریس سے از کھنڈوا برہانپور سفر شروع ہوا تو مارے دماغی تھکن کے ایک ایک آدمی کے دو دو آدمی نظر آ رہے تھے۔اور بارش نے جو فردوسی مناظر پیدا کر دیے تھے وہ بھی میونسپلٹیوں کی گندہ نالیاں نظر آ رہے تھے جن کا انتظام نااہل ہندستانیوں سے کسی جگہ بھی نہیں ہو سکتا۔اس لیے پنسل اور کاغذ ہاتھ میں تھا اور غزل آسمان پر۔

مگر حسن شاعری کہ کھنڈوا سے چل کر چالانی کے اسٹیشن پر نصف گھنٹے کے لیے ہماری ریل یہ کہہ کر روک دی گئی کہ کلکتہ میل گزر رہا ہے اس لیے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کو جو اترے ہیں تو

ہمارے ہی ڈبے کے برابر والے ڈبے میں قومِ ہنود اور ''عمر چودہ سال'' ادھر شباب و جوانی وہ گویا ہیرے کی نازک ترین بوتل میں گلابی رنگ کی شراب بھر دی گئی ہے اور وہ بھی اتنی تیز جو بوتل توڑ کر اڑ جانے کے لیے بے چین ہے۔ بس بھاڑ میں گئی وہ ہماری غزل وزل اس بری طرح ہم کھڑے کے کھڑے رہ گئے کہ اگر کوئی سمجھ جاتا تو فوراً بداحتیاطی کی دفعہ میں چالان کر دیتا۔

اب جو منٹ دو منٹ میں حواس درست کر کے مردود مسافروں سے نظر بچا کر اس طرف دیکھا تو شوخی و جوان سالگی، مستی اور دلفریبی کا معاملہ معاذ اللہ کی حد سے گزر چکا تھا۔ اماں وہ ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ تم مجھے بدنظر کہو مگر واقعہ یہ ہے کہ جب دیکھا تو اس طرح کہ بے ساختہ مسکرا کر نظریں جھکالیں۔ پھر اگر اتنا ہی ہوتا تو ہم بھی برسوں سے بے آب و گیاہ پھر رہے ہیں، استغفر اللہ کہہ کر رہ جاتے، مگر وہاں یہ حال کہ جوانی شرارتوں اور عشوہ سازیوں میں یوں مصروف تھی کہ اگر اس وقت ہم بوڑھے سے اسٹیشن ماسٹر بھی ہوتے تو محبوبیت اور دلنوازی کی ان چاردہ سالہ فسوں سازیوں میں یوں کھو جاتے کہ ہری جھنڈی ہلانا بھول جاتے اور آنے والا میل کہیں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ پھر جو لوگ ''آنکھ لڑانے'' کے اثرات کو سمجھتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ دونوں میں یہ جذبہ کتنا بیدار ہو جاتا ہے کہ ایک بے خود بنا دیکھتا رہے اور دوسرا جوانی، شباب، مستی، دلبری اور دلربائی کی تمام شوخیوں سے کام لیتا رہے۔ لہٰذا یہی ہوا کہ کبھی حنا بستہ انگلیوں سے ریل کی کھڑکی کے اوپر اس طرح کے نشانات بنائے جانے لگے گویا کچھ لکھا جا رہا ہے، جسے ملا رموزی کو پڑھ لینا چاہیے۔ کبھی نورانی نفاستوں اور دلنوازنزاکتوں میں ڈوبے ہوئے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی جاتی تھی گویا کہا جا رہا ہے کہ اگر اس اٹھتی ہوئی جوانی کی وجد انگیز و بہار افروز ادائیں پسند ہیں تو میرے ساتھ میرے وطن تک چلو پھر وہاں سن لیں گے جو تم کہو گے۔ مگر ملا رموزی اب بھی کسی قدر وقار الملک زاہد علی بنے کھڑے تھے۔ تو ان کے زہد و وقار کو اس طرح برباد کیا گیا کہ کسی بہانے سے ریل میں کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی گئی جس میں ملا رموزی کی نگاہوں کو اس سینے کے اندر جذب ہو جانے کی اجازت تھی، جس کے اسرار و اثرات کو سمجھ لینے کے بعد اصحابِ وجد و کیف بیان کے قابل نہیں رہتے۔ لہٰذا سن لیجیے کہ برہانپور کا اسٹیشن آ گیا۔

◆◆◆

آپریشن

ہندستان میں انگریزی قوم کے غالب اور حکمراں ہو جانے کے بعد جہاں اور بے شمار چیزیں ہندستان پہنچ گئیں آپریشن بھی اسی قوم کی لائی ہوئی ایک بلا ہے یا دولت۔

یعنی آپریشن وہ طریقۂ علاج ہے جس میں کوئی خاص سرخاب کا پر تو نہیں ہے بلکہ یہ طریقۂ علاج وہی ہے جو عرب اور ایران کے مسلمانوں کے صدقے صدیوں سے چلا آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عرب اور ایرانیوں کی شاعری میں آپریشن کے لیے جراح فصاد اور مرہم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور انگریزوں کے ہاں مفتوح قوموں سے جمع کی ہوئی بے شمار دولت کے باعث اس علاج کو بے حد حسین بنا دیا گیا ہے لیکن زخم کو چیرنے اور کاٹنے سے اتنی ہی سوزش اب بھی پڑتی ہے جتنی پرانے زمانے کے فصاد اور جراح کے کاٹنے سے پڑتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے کے فصاد مریض سے بالکل اور صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ اگر بہادر شجاع اور دلیر ہو، مجاہد اور غازی کی اولاد ہو تو بیٹھے رہو ہم تمھارے زخم کو چیرتے ہیں۔ اور اس زمانے کے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بس اس لمبی بنچ پر لیٹ جایئے آپ کو معلوم بھی نہ ہوگا ذرا یہ کلوروفام عرف بے ہوشی کی دوا سونگھ لیجیے لہٰذا آپ جب بے ہوش ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ آپ کے زخم کو جتنا اور جدھر سے چاہتے ہیں کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ آپ کی بیوی بچوں سے پہلے اسٹامپ پر لکھوا لیتے ہیں کہ اگر آپ کا

مریض ہمارے کاٹنے سے مرجائے گا تو تم لوگ رو رو کر تو مر جاتا مگر ڈاکٹر پر کوئی دعویٰ نہ کرتا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے پاس ان کے جیتے ہوئے ملکوں سے جو کافی سے زیادہ دولت ملی ہے تو یہ دواؤں اور کاٹنے پھاڑنے کے اوزار پر خوب روپیہ صرف کرتے ہیں اور ان عمدہ عمدہ چمکدار نشتروں سے زخم کاٹتے ہیں کہ اگر تکلیف نہ ہو تو ان اوزاروں کی خوبصورتی دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ ان حسین اوزار سے تمام جسم کٹوا کر پھینک دیں مگر منہ سے اُف تک نہ کہیں۔

پہلے زمانے میں فصاد اور جراح کی حالت یہ تھی کہ یہ لوگ ہمارے ہی ملک کے ہوتے تھے اس لیے ہم ان کی عادتوں سے واقف ہوتے تھے اور یہ لوگ ہم سے واقف ہوتے تھے اس لیے جہاں آپ نے کسی جراح سے جھوٹ بھی کہہ دیا کہ میرے زخم میں بڑی تکلیف ہے تو جراح خود ہی دوسرے دن آپ کے گھر پر حاضر ہو کر نہایت ادب سے آپ کو سلام کرتا تھا، مزاج دریافت کرتا تھا، گھر کے تمام بچوں کا نام لے لے کر ان کی خیریت دریافت کرتا تھا پھر دنیا بھر کی باتیں کرنے کے بعد بڑی نرمی سے آپ کے زخم کا تذکرہ شروع کرتا تھا اور لفظ لفظ میں یقین دلاتا جاتا تھا کہ انشاء اللہ معلوم بھی نہ ہوگا اور زخم اچھا ہو جائے گا۔ پھر زخم کو چیر کر جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جاتا تھا جراح روزانہ آپ کے گھر پر اس انداز سے حاضر ہوتا رہتا تھا گویا وہ آپ کے باوا کا نوکر ہے۔ پھر جب آپ کو شفا ہو جاتی تو آپ کو اختیار تھا کہ اس کے صلے میں جراح کو ڈھائی سیر گیہوں دے دیں یا ایک گھوڑا۔ وہ غریب ہر چھوٹے سے چھوٹے انعام پر اٹھارہ مرتبہ سے سوا سلام کر کے چلا جاتا تھا اور آپ کے دیے ہوئے انعام کی دس جگہ تعریف کرتا تھا۔

لیکن یورپ سے جو لوگ ڈاکٹر بن کر آئے تو اول وہ ہمارے ملک کے نہیں تھے نہ یہاں کی وہ زبان سے واقف نہ یہاں کے اخلاق و آداب سے واقف۔ ادھر وہ تھے فاتح قوموں کے ڈاکٹر ان کے پاس ہم لوگوں کے محصول اور مالِ غنیمت کے نام کی دولت بھی خاصی تھی اس لیے آئے بھی تو بادشاہوں کی شان سے لہٰذا پہلے تو ہم لوگ ان کے زرق برق لباس، ان کی موٹروں اور موٹر سائکلوں ہی سے ڈرے، پھر ان کی زبان نہ سمجھنے کے باعث ان سے سہم گئے پھر ان کی عادتوں سے ناواقف ہونے کے باعث ان کی ہر بات کو مارے ڈر کے سرکار کا حکم سمجھ کر کانپنے لگے۔ لہٰذا ان لوگوں نے جو دیکھا کہ ہندستانی تو صرف ڈرنے لرزنے کانپنے اور مارے وحشت کے دنیا جہاں

کے ہر حکم کو مان لینے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے تو انھوں نے بھی دل کھول کر اور جان بوجھ کر نئی نئی عادتیں اور بے ضرورت رعب ڈالنا شروع کیا۔ بس حد ہوگئی کہ ان کے اس طریقے کا یہ اثر ہے کہ آج تک ہندستانیوں کے شریف اور اونچے گھرانوں کی عورتیں تک ڈاکٹروں کے نام سے گھبراتی ہیں اور جہاں تک انھیں فائدہ ہوتا ہے وہ حکیموں کو چھوڑ کر ڈاکٹروں کا نام تک نہیں لیتی ہیں۔

یہ تو اس وقت کا قصہ ہے جب غدر 1857 سے پہلے انگریز لوگ پہلی مرتبہ ہندستان پر قابض ہو رہے تھے اور ان کے ملک انگلستان سے نئی نئی چیزیں ہندستان آتی جارہی تھیں۔

اب جب سارے ملک ہندستان پر ان کا قبضہ ہوگیا تو اب ہندستانیوں کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر ہم لوگ انگریزوں کی زبان اور ان کی باتیں نہ سیکھیں گے تو مارے بھوک پیاس کے کل کے عوض آج ہی مر جائیں گے تو اب ہندستانیوں میں سے بھی اکثر نے ڈاکٹری علم پڑھا اور ڈاکٹری شروع کردی مگر تھے فطرتاً ہندستانی۔ انھوں نے جو انگریزوں کی زبان اور ان کی باتیں سیکھیں تو یہ آدھا تیتر آدھی بٹیر بن گئے یعنی لباس اور باتیں تو خالص انگریزوں کی حاصل کرلیں مگر مزاج قدرتاً وہی ایشیائی رہا اس لیے ان کے ہر کام میں ادھورا پن اور الٹا پن پیدا ہوگیا۔ مثلاً جس موقع پر انگریزوں کے ڈاکٹر ہندستانی مریضوں کو ڈانٹتے تھے یہ بے چارے اپنے آدھے ہندستانی اور آدھے انگریزی پن کے باعث اس جگہ تو رہتے ہیں خموش اور جس موقع پر انگریز ڈاکٹر محبت اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں وہاں یہ ہندستانی ڈاکٹر مریض کو ڈانٹ ڈانٹ کر نیم مردہ کردیتے ہیں اس لیے جس طرح ہندستانی خالص انگریز ڈاکٹر کے نام سے بھاگتے ہیں اس سے بھی سوا یہ ہندستانی ڈاکٹروں کو گالیاں دیتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ضرورت کے باعث ان کے منہ پر کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے آنے سے تو گھر بھر کی رونق ہو جاتی ہے، مگر جہاں ہندستانی ڈاکٹر فیس لے کر گھر گیا کہ بچہ بچہ اسے خوب کوستا ہے۔ اور سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ آج تک 95 فیصدی ہندستانی تو ڈاکٹر کے حالات اور اس کے قاعدوں سے واقف ہی نہیں اور اسے اپنے حق میں بھوت ہی سمجھتے ہیں اور خدا کرے سمجھتے ہی رہیں۔

القصہ ان حالات میں ہماری جو شامت آئی تو ہم اس قسم کے بیمار ہوگئے کہ آپریشن کی زد میں آنا پڑا۔ یعنی بیمار یہ ہوئے کہ ہمارے چہرہ پر ایک مہاسہ ہوکر ایک دانے کی طرح خشک ہوگیا اور

بس۔ چونکہ انسان قدرتاً حسن پر حریص ہے اس لیے چہرے کی صفائی بگڑنے سے ہمیں رات دن غم ستانے لگا، دنیا بھر کی دوائیں استعمال کیں مگر افاقہ نہ ہوا۔ دانا خشک ہوکر اگرچہ غیراذیت رساں ہوگیا تھا، مگر جب کسی آئینے کو دیکھ لیتے تھے تو اپنے چہرہ کے بدنما ہونے پر اتنا ہی غم ہوتا تھا جتنا ایک رنڈی کو اپنے چہرہ کے بگڑ جانے کا صدمہ ہوا کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہم تو اس دانے کے علاج سے مایوس ہوگئے، مگر ایک ذی مرتبہ مہربان نے اس بدنمائی کو دور کرنے کا ایک یہ طریقہ بتایا کہ آپریشن سے چہرے کی یہ بدنمائی عمر بھر کے لیے دور ہوسکتی ہے۔ ادھر ہمیں یہ غم ہر وقت ستاتا ہی رہتا تھا کہ اگر ہمارے مضامین کی گلزار افروز لطافتوں اور فردوس آرا رعنائیوں نے بدمذاق مسلمانوں میں ہماری امداد و سرپرستی کا کوئی عملی جذبہ پیدا نہیں کیا تو ہماری صورت کا حسن ہی ہمیں کسی دن اس قابل کردے گا کہ کوئی اپنے شباب و جمال کی بھڑکتی ہوئی آگ سے دنیا کو جلا دینے والی ہمارے مردانہ حسن و جمال پر سو نہیں تو پچاس جان سے ہمارے اوپر فریفتہ ہوکر ہمارے ساتھ اس طرح فرار ہوجائے گی کہ اپنے مالدار باوا کا ہزاروں روپیہ بھی ساتھ لے گی اور کسی شہر میں جاکر ہمیں کوٹھیاں اور موٹریں خرید کر آزاد کردے گی تاکہ ہم مالی مشکلات سے فارغ ہوکر پھر وہ لکھتے رہیں جو دنیا کو نئے سرے سے جوان بنادے۔

اب بتایئے کہ جس شخص کو یہ یقین آجائے کہ اسے اس کے آپریشن کے بعد ہی وہ حسن ملے گا کہ اس پر کوئی مہ پارہ عاشق ہوکر اسے بمبئی اور کلکتے میں لاکھوں روپیہ کی کوٹھیاں خرید دے گی اور وہ مالی مصائب کے مسلسل عذاب سے نجات پاکر ایک مرتبہ پھر جوان ہوجائے گا وہ آپریشن کے لیے کتنی عجلت اور مستعدی سے کام لے گا، مگر اللہ شاہد ہے اس حقیقت پر کہ کوئی ایک سال گزر گیا مگر ہمت نہ ہوئی کہ آپریشن کے لیے تیار ہوجائیں۔

بس جب بھی ارادہ کرتے تھے تو ان خیالات میں ڈوب جاتے تھے کہ اگر آپریشن میں مرگئے تو یہ تو نہ ہوگا کہ ہمارے ضعیف والدین ڈاکٹر ہی کو پھانسی پر چڑھا کر چند لمحے قلبی سکون حاصل کرلیں گے۔ یہ بھی تو نہ ہوگا کہ ہمارے متعلقین کا کوئی سرکاری وظیفہ مقرر کردیا جائے گا جب کے بے شمار آپریشنی مردے قبر ہی میں پہنچ گئے مگر تین دن کے سوا ان کا تذکرہ بھی دنیا میں نہ رہا اور بھوکے مرتے پھر رہے ہیں ان کے متعلقین۔ یہ بھی تو نہ ہوگا کہ کوئی انجمن حمایت اسلام قسم کی انجمن

ہمارے متعلقین کا وظیفہ مقرر کردے گی جب کے پورے ہندستان میں ایک مجلس بھی اس مقصد کے لیے قائم نہیں ہے جو اردو کے بے زرو مال خدام کے متعلقین کو پنشن دینے کے لیے بنائی گئی ہو۔
اچھا یہ کچھ بھی نہ ہوا بلکہ ہمارے عوض خود ڈاکٹر ہی مرگیا اور ہم اچھے ہو گئے تب بھی یہ تو یقینی بات ہے کہ آپریشن ہونے پر خدا جانے ڈاکٹر کس قسم کا اور کن چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہے گا اور ہم سے نہ ہوسکا تو؟ کیونکہ انسان کی یہ مانی ہوئی عادت ہے کہ وہ لفظ پرہیز کے خلاف چلتا ہے اور ایک بیماری کے زمانے والے پرہیز ہی کا کیا جس جگہ اور جس بات سے پرہیز کو کہیے انسان اور اس کی بیوی وہی کرتا ہے اور وہی کرتی ہے جس سے ان دونوں کو منع کیا جائے۔ وہ دیکھیے نا کہ آج کل کی نوجوان لڑکیوں کو جو معلوم ہوگیا ہے کہ پہلے زمانے میں شادی ہو جانے سے پہلے اشراف اپنی لڑکیوں کو آرائش اور فیشن کی نزاکتوں سے دور رکھتے تھے۔ تو اب دیکھ لیجیے کہ لڑکیاں اسکول بھی جاتی ہیں تو ریشم اور سلک کے برقعے اوڑھ کر، چشمے، سینٹ اور پاؤڈر لگا کر، پپ اور فینسی چوڑیاں پہن کر۔ پھر ان لڑکیوں سے کہا گیا کہ شادی ہو جانے سے پہلے کنواری لڑکیاں گھر کے دروازے کے پاس بھی نہیں آتی تھیں تو انھوں نے یہ کیا کہ شہر لاہور سے قصبہ ماڈل ٹاؤن تک اور امرتسر سے لاہور تک مردوں کی لاری میں بیٹھ کر جانا شروع کردیا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ پہلے زمانے میں کنواری لڑکیاں دروازہ سے جھانکتی نہیں تھیں تو اب انھوں نے والد صاحب ہی کے موٹر میں بیٹھ کر جھانکنا شروع کردیا۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجیے گا کہ جس موٹر میں پردے باندھ کر اس زمانے کی لڑکیاں جارہی ہوں گی وہ موٹر کے پردے اٹھا اٹھا کر یا موٹر کے پیچھے والے شیشے میں سے جھانکتی جارہی ہوں گی اور بعض تو اشارے تک کرتی جاتی ہیں اور موٹر ڈرائیور سے مذاق کرنے سے تو چوکتی ہی نہیں ہیں۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ پہلے زمانے میں شادی ہو جانے سے پہلے لڑکیاں مہمان تک نہیں جاتی تھیں تو اب انھوں نے سنیما کا تماشہ تک دیکھنا شروع کردیا اور بعض تو مردانہ لباس میں سنیما کے اندر پکڑی گئی ہیں۔

اسی طرح آج کل کے مردوں کو معلوم ہوا کہ پہلے زمانے کے مرد عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھاتے تو اس زمانے کے مردوں نے یہ کیا کہ یورپ والوں کی نقل میں اپنی عورت کو موٹر میں سیدھی طرف بٹھانا شروع کردیا۔ اور تو اور آج کل کے پچاسوں مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت

مردانہ سوٹ پہنا کر سنیما میں لے جاتے ہوئے ہم ملا رموزی بقلم خود کے سامنے سے گزرے ہیں اور ہم نے ان کی حماقت پر قہقہہ لگایا ہے اور اپنے ساتھ کے غنڈوں سے کہا ہے کہ تم بھی قہقہہ لگاؤ۔

غرض قصہ کون کہے کہ اب یہ فکر پیدا ہونے لگی کہ اگر آپریشن ہونے پر ڈاکٹر نے کسی چیز سے پرہیز کو کہا تو یقیناً ہم ایسا نہ کریں گے اور گھر والوں کی نظر بچا کر کوئی نہ کوئی چیز ایسی کھالیں گے کہ آپریشن سے اچھے ہونے سے پہلے کسی دوسرے مرض میں مبتلا ہو کر اگر اسی دن مر بھی نہ گئے تو کم از کم "مردہ نما" ضرور ہو جائیں گے۔

اچھا تو یہ بھی سہی کہ ڈاکٹر نے کوئی پرہیز نہ بتایا اور انگریزوں تک کو کھا جانے کے لیے اجازت دے دی تب بھی یہ تو ضرور کہے گا کہ دیکھیے ملا صاحب اب چند دن تک لکھنا پڑھنا بند رکھیے گا، چلیے گا نہیں، بس لیٹے رہیے گا۔ کسی دوست آشنا سے ملاقات نہ کیجیے گا، کھانسی کے وقت منہ بند رکھیے گا، زیادہ زور سے قہقہہ نہ لگائیے گا، بستر پر تین تکیوں کے عوض ایک اوپر دس تکیے لگائیے گا، نہایت صاف اور قیمتی چادر بستر کے اوپر بچھائیے گا تاکہ آپریشن کا حال دریافت کرنے والے آئیں تو آپ کے مالدار ہونے پر یقین کرسکیں۔ بستر کے قریب ہی ایک میز پر تازہ نارنگیاں، سیب، انگور اس طرح رکھ لیجیے گا کہ جی چاہنے پر بھی نہ کھائیے گا اور نہ گھر کے بچوں کو کھانے دیجیے گا صرف اس لیے ان پھلوں کو رکھ لیجیے گا کہ مزاج دریافت کرنے والے لوگ دیکھیں کہ ہاں ڈاکٹر نے آپ کو اتنے قیمتی پھل کھانے کو بتائے ہیں۔ اسی پھلوں والی میز پر دو چار شیشیاں رکھ لیجیے گا تاکہ معلوم ہو کہ آپ کو یہ دوائیں پینے کو بتائی گئی ہیں۔ بس اس طرح کی ایک آراستہ میز کے پاس مسہری لگائے پڑے رہیے گا کہ آج کل کے یورپ زدوں اور فرنگی پرستوں کے بیمار ہونے اور علاج کرانے کا یہی فیشن ہے۔

مگر ہم سوچتے تھے کہ اگر ڈاکٹر نے ہمیں ان قاعدوں پر پابند ہونے کا مشورہ دیا تو بس اتنا کرلیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کے آنے پر انھیں سب کچھ بتا دیں گے لیکن ان کے جانے کے بعد ہی تمام گھر کے بچوں کو گود میں بھی بٹھائیں گے اور کاندھے پر بھی۔ بیوی پر چلا چلا کر غصہ بھی کریں گے اور مرغا مرغیوں پر بھی لکڑی لے کر دوڑیں گے اور یہ تو کبھی بھی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں دیکھ کر چلے جائیں اور ہم میز پر رکھے ہوئے سیب، انار، نارنگی اور کیلوں کو چھوڑ دیں اور ان پر

ہاتھ صاف نہ کریں۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم دوا پینے یا لگانے پر سو نخرے نہ کریں، منہ نہ بنائیں، ایک آدھ گھر والے پر پانی کا گلاس نہ پھینک ماریں۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ ڈاکٹری دوا نوش کریں اور بستر کی چادر کو خراب نہ ہونے دیں۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ پرہیز کا کھانا مسہری ہی پر کھاتے رہیں اور باورچی خانے سے کھانوں کی عمدہ عمدہ ہوائیں اور خوشبو آنے پر ایک مرتبہ بھی باورچی خانے میں جا کر ترکاریاں نہ دیکھیں۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ تمام گھر آدھی رات کو سو رہا ہو اور ہم آہستہ سے اٹھ کر باورچی خانے سے کچھ غیر پرہیزی چیزیں نہ اُڑا دیں۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ بیوی کو پاس بٹھا کر یہ نہ کہیں کہ دیکھو بیوی میرے مر جانے کے بعد تم چاہے بھوکی مر جاؤ مگر میرے لڑکے کو آکسفورڈ یا علی گڑھ بھیج کر انگریزی ضرور پڑھا دینا اور اگر لڑکا عربی فارسی علوم پڑھنے کی خواہش کرے تو مارے جوتوں کے اس کا سر توڑ دینا اور اس سے کہنا کہ تیرے والد ملا رموزی کہہ مرے ہیں کہ آج کل کے مسلمان تعلیم یافتہ اُسے کہتے ہیں جو انگریزی زبان اور انگریزی کے کلرک بنانے والے علوم جانتا ہو یعنی کسی تاریخ کا سر تو کسی جغرافیہ کا پاؤں۔ حساب کی ایک آدھ ٹانگ تو سائنس کا ایک آدھ کان۔ بس جب وہ اتنا پڑھ لے تو اسے لیڈری پر لگا دینا کیونکہ آج کل ہندستانی مسلمانوں میں یا تو لیڈر مزے کرتے ہیں یا افسروں، عہدہ داروں، ایم۔ اے پاس لوگوں اور رئیسوں کے پیر صاحب۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ ہم ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیوی سے یہ بھی نہیں کہیں کہ لاؤ جی آج تو خدا کا حوالہ مجھے انڈے اور کباب تو کھلا ہی دو مگر دیکھو اماں بی سے نہ کہنا۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ ہمارے مضامین پر ایک لاکھ جانوں سے نثار ہونے والی کے پیہم خطوط کے جوابات بھی نہ لکھیں خصوصاً جب کہ وہ ہر خط میں ہمیں یہ لکھتی رہے کہ:

"میرے پیارے ملا رموزی!

خدا کے لیے مجھے زیادہ نہ آزماؤ، مجھے زیادہ بے چین نہ کرو۔ مجھے ہر ڈاک سے اپنی خیریت کا خط بھیجتے رہو۔ بالکل مطمئن رہو... آہ میرے پیارے ملا رموزی میں دوسرے کے بس کی ہوں اگر آج میں اپنے اختیار کی ہوتی تو بتا دیتی کہ تمھاری صحت تک تمھاری مسہری سے الگ نہ ہوتی اور تمھاری جوانی پیدا کرنے والی اور غم سے دور رکھنے والی مضمون نگاری کی یہ قدر کرتی کہ بس تم سے جدا نہ ہوتی۔ خیر ذرا صبر کیجیے

مجھے مسوری جانے کا موقع ہاتھ آنے دیجیے ایسا بھی ہو جائے گا جیسا کہ مسوری کے زمانے میں ہوتا بھی رہتا ہے۔ تمھاری اور صرف تمھاری اپنی تصویر بھی بھیج رہی ہوں۔

''شوکت عارفہ''

اچھا سب کچھ مان لیں گے مگر ڈاکٹر کا یہ مشورہ کس طرح مانیں گے کہ روزانہ معاوضہ کے مضامین نہ لکھیں گے کیونکہ اگر ایسا نہ کریں گے تو بھوکے مریں گے کیونکہ گورنمنٹ کی زبان اردو تو ہے نہیں جو ہمیں نوبل پرائز بھی مل جائے اور سیر و سیاحت کو جائیں تو گورنروں کی کوٹھیوں میں مہمان رکھے جائیں اور جن ہندستانی رئیسوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں انگریزی پرستی اور ''پانیئر'' پڑھنے سے فرصت نہیں، اسی لیے وہ اردو زبان کے اتنے خوشبودار خواجہ حسن نظامی اور اتنے سفید بالوں والے مولانا راشد الخیری تک نئے نئے چندوں اور اپیلوں کے ذریعہ ریاستوں اور امیروں کے ہاں حاضر ہوتے ہوتے تھکے جا رہے ہیں اور نام یہ ہے کہ بڑے بااثر ہیں اور بڑے ادیب!!

اماں اور تو اور لوگ ہماری کتابیں صاف ہضم کر گئے مگر انھیں غیرت کا نصف پسینہ بھی نہ آیا۔ تو ایسی صورت میں مضمون نہ لکھیں تو کیا کوہ ہمالہ پر جا کر بیٹھ جائیں؟

بس جناب یہ خیال جب آتا تھا کہ تنخواہ نہیں، جاگیر نہیں اور تو اور کسی ایسے کی بیٹی نکاح میں نہیں جو آج لیٹے لیٹے آپریشن کے زمانے میں اس کا قیمتی جہیز ہی فروخت کر کے کھاتے رہتے تو پھر وہ آپریشن کا خیال دل سے نکل جاتا تھا۔

مگر جہاں فیشن ایبل دوستوں میں پہنچے کہ پھر ہمیں یہ کہہ کر ڈانٹا جاتا کہ کس قدر گندے آدمی ہو چہرہ بدنما ہو رہا ہے مگر تم سے اتنا سا آپریشن بھی نہیں ہو سکتا۔ اِدھر ہم بھی سوچتے تھے کہ آج کل زمانہ ہی زنانہ قسم کی آرائش کا ہے۔ چاہے مرد ہو کر آپ کتے اور گیدڑ تک سے بھاگ جائیں لیکن اگر آپ فیشن کا چمکدار لباس پہنے رہیں اور ذرا حسین آدمی نظر آئیں تو سب لوگ کرسیوں پر کھڑے ہو کر آپ کی تعظیم کریں گے۔ اس لیے کوئی سال بھر کے بعد ایک دن ارادہ مضبوط کر کے انگریزی شفاخانے چل دیے اور سب سے پہلے اس جگہ کو معلوم کیا جہاں یہ خوفناک کام ہوتا ہے۔

بس صاحب جو ملازم نے اس کمرے کو بتایا ہے جہاں یہ مردود اور راندۂ درگاہ آپریشن ہوتا ہے تو چاہو جس کی قسم لے لو کہ ہاتھ پاؤں قابو کے نہ رہے اور یاد نہیں کہ دل میں کس قسم کا بہانہ لے کر جو گھر آئے ہیں تو الحمدللہ مہینوں اس طرف کا رُخ بھی نہ کیا۔

اماں غضب خدا کوئی ڈھائی سو قسم کے نشتر تھے کہ صاف صاف الماریوں میں اس خوبصورتی سے جمے ہوئے تھے گویا شفا خانہ کیا ہے نشتروں کے حسن کی نمائش گاہ ہے۔ اسی طرح کوئی نوسو نوے قسم کی چھوٹی بڑی چھریاں اور خدا جانے کس کس قسم کے آلے تھے جو ان نشتروں کے پاس رکھے ہوئے تھے، مگر تھے سب کے سب کاٹنے چیرنے اور پھاڑنے والے۔ بس تاؤ تو اس بات پر آرہا تھا کہ تھے تو تمام اوزار حد سے سوا صاف اور حسین مگر تھے سب کے سب نوکدار اور دھار والے۔ بھلا بتایئے کہ انسان کے زخم کو کاٹنے اور پھاڑ ڈالنے والے اوزار اور آلات کو اتنی خوبصورتی سے جما کر رکھنے اور پھر وہ بھی شیشے کی الماری میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا اور جو یہ بھی تھا تو اتنا ہی کیا ہوتا کہ ہر آلے پر اتنا پرچہ لکھ کر لگا دیا ہوتا کہ ''ساختہ مراد آباد قیمتی نو روپیہ دس آنے'' تو یہ 95 فیصدی غیر انگریزی داں ہندستانی سمجھ لیتے کہ اس شفا خانے میں ممکن ہے مراد آباد کے برتنوں اور آلات کی دکان بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنے نفع کے لیے کھول لی ہے اور یہ تمام آلے اسی دکان کا مال ہوں گے۔ مگر جناب انگریزی شفا خانے کے اس قاعدہ کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ ان نشتروں کو اتنی خوبصورتی سے جما جما کر رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ اصل میں انگریزی علاج کچھ بھی نہیں ہے اس لیے اس کے اوزار کو حد سے سوا حسین بنا کر مریضوں کو اس کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ ادھر ہندستانی ویسے ہی بے وقوف ہوتے ہیں بس اس ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ وہ دیکھیے نہ کہ لندن جاتے تو ہیں تعلیم کے لیے مگر وہاں سے جو میم سے نکاح کر کے لاتے ہیں تو بس اس کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر ہی مرمٹتے ہیں یا کچھ اور؟۔

اچھا پھر ایک یہی نہیں کہ اس کمرہ میں صرف ہلاک کرنے والے اوزار ہی رکھے ہیں بلکہ اس میں عجیب عجیب قسم کی میزیں اور کرسیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً ایک کرسی اس قسم کی دیکھی کہ اگر خدانخواستہ ہم یا خدا کرے کہ آپ اس پر بیٹھ جائیں تو اس میں آپ کی گردن اس طرح پھنسا دی جاتی ہے کہ آپ جنبش بھی نہ کر سکیں اور آپ کی گردن تک کاٹ کر پھینک دی جائے۔ اسی طرح چند

میزیں ایسی دیکھیں کہ بس خدا یورپ والوں ہی کو دکھائے۔ یعنی ایک میز ایسی دیکھی کہ اس سے بالکل ہی ملی ہوئی ایک میز پر پھر وہی نشتر اور چاقو تھے کہ رکھے ہوئے تھے جو اپنے منہ سے خود بول رہے تھے کہ اس میز پر آپ کو لٹائیں گے اور اس میز کے نشتروں سے آپ کو ذبح کریں گے۔ پھر اور چلیے تو جناب ایک طرف روئی بھی رکھی ہوئی ہے تو دوسری طرف پٹی باندھنے کا کپڑا بھی نظر آرہا ہے۔ اب بتائیے کہ مریض اگر نہ بھی سمجھتا ہو کہ یہاں مجھے کاٹا جائے گا تو یہ تمام چیزیں خود سمجھا دیتی ہیں کہ ہاں ہاں تجھے یہاں کاٹا جائے گا۔ پھر سب سے بڑی خوبصورتی یہ کہ اس کمرہ میں صفائی اور خوبصورتی تو جنت سے اونچی ہوتی ہے مگر بدبو اس قسم کی آتی رہتی ہے کہ شفا خانے سے باہر ہی آپ سمجھ جائیں کہ ہاں انگریزی اسپتال آ گیا۔ پھر کہنے کو تو شفا خانہ ڈاکٹروں ایسے محققین اور ماہرین مزاج کا گھر ہوتا ہے مگر یہ اتنا بھی تو نہیں جانتے کہ جس قسم کی خوشبو ہوتی ہے انسان کے دل و دماغ پر ویسا ہی اثر پیدا کرتی ہے لہٰذا ہونا یہ چاہیے تھا کہ شفا خانوں میں عطر اور مشک کی لطیف تر خوشبو پھیلائی جاتی تا کہ مایوس اور گھبرائے ہوئے مریضوں کے دل پر دحشت کے عوض فرحت پیدا کرنے والا اثر ہوتا، مگر انھیں اتنی نازک اور نفیس عقل سے کیا کام۔

بس حد ہوگئی کہ تمام جسم کاٹ کر پھینک دینے والے اتنے بے شمار آلے اور اوزار ہر ڈاکٹر کے پاس رہتے ہیں مگر سب کے سب بغیر لائسنس کے اور کوئی ایک مجسٹریٹ نہیں پوچھتا کہ یہ جان سے مار ڈالنے والے ہتھیار جو آپ نے جمع کر رکھے ہیں تو لکھائیے ان کا حلیہ اور دیجیے سرکاری ٹیکس، لیکن اگر ہم اور آپ لاکھ شریفوں کی اولاد ہو کر لاکھ تعلیم یافتہ ہو کر لاکھ غیر بنگالی ہو کر بھی ایک دیسی بندوق اور ایک آدھ ریوالور بھی بے لائسنس کے رکھ لیں تو پھر دیکھیے ان آنریری مجسٹریٹوں تک کا زور، منٹ بھر میں آپ پر مقدمہ چلائیں اور وہ بھی پوری فوجداری کا۔ پھر ضمانت کے لیے محلے بھر کے ہاتھ ہی جوڑتے پھریے ورنہ پھر دھرے رہیے حوالات میں اور وہ بھی بے روشنی اور کھٹملوں والے حوالات میں۔

غرض یہ کمرہ جو دیکھا تو سیدھے گھر آ گئے۔ وہ تو نفع میں یوں رہے کہ ابھی آپریشن کا خود ہی ارادہ نہیں کیا تھا اس لیے گھر میں کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا، مگر کب تک پھر جناب کچھ دن بعد دوستوں نے تنگ کیا اور فیشن ایبل قسم کے دوست تو جان ہی کے دشمن نظر آنے لگے پھر وہ بھی اپنی

مثالیں دے دے کر کہ:

اماں جاؤ بھی کیا خاک تم مضمون نگار ہو کہ اب تک آپریشن ہی کو نہیں سمجھتے۔ کوئی کہتا:

اماں گنوار ہی دھرے ہوئے ہو اب تک کہ آپریشن سے ڈرتے ہو۔ خدا کی قسم ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر کاٹتا رہا مگر معلوم نہ ہوا اور الحمد للہ اس موذی پھوڑے سے نجات مل گئی پھر تمھارے تو کوئی زخم نہیں ہے۔ کوئی کہتا:

اماں شرماؤ ذرا! اب تو بچے آپریشن کرا لیتے ہیں مگر تم ہو کہ لرزے جاتے ہو آپریشن کے نام سے۔ کوئی کہتا:

اماں مرے کیوں جاتے ہو چلو میں لے چلوں تمھیں ڈاکٹر صاحب کے پاس۔ کوئی کہتا پھر ملا رموزی ہی کیوں بنے؟

گویا آپریشن نہ کرایئے تو ملا رموزی ہو ہی نہیں سکتے، مگر ایک بولے کہ اماں ملا رموزی سوچو تو کہ وہ جو کلب اور ٹھنڈی سڑکوں پر اٹھلا اٹھلا کر چلنے والیاں تمھارے مضامین پڑھ کر مست ہو جاتی ہیں وہ اپنی حسن و رنگ اور شباب میں ڈوبی ہوئی سہیلیوں کو کہتی ہیں کہ بہن آپ ہمارے ملا رموزی صاحب کے مضامین ضرور پڑھا کیجیے، اگر وہ سن لیں گی کہ ملا رموزی صاحب اتنے بزدل ہیں تو سوچو کیا کہیں گی۔

بس اس شخص کا یہ کہنا کہ ہم نے دل سے تیاری کر لی کہ اب چاہے جان جاتی رہے لیکن بغیر آپریشن کے اب نہ رہیں گے۔ لہٰذا اس تاؤ میں تو آئے جو بیوی سے کہہ دیا کہ کل آپریشن ہوگا۔ اماں یہ کہنا تھا کہ ہمارے سیدھے سادے اور غیر انگریزی داں گھر میں گویا باؤلا کتا گھس آیا یعنی پہلے تو بیوی ہی عدالت کی جرح کی طرح ہم سے چمٹ گئیں۔ مثلاً پہلا ہی سوال وہ کیا کہ دل جانتا ہے یعنی فرمایا اور بہت بے پرواسے لہجے میں فرمایا کہ:

یہ آپریشن کیا بلا ہوتی ہے۔

اب بتایئے جس شوہر کی بیوی آپریشن سے اتنی واقف ہو اس کا شوہر آپریشن کے معاملہ میں کتنا بہادر ہوگا۔ اب جو تفصیل بتائی تو مسماۃ موصوف کے حواس خراب نظر آنے لگے۔ اماں وہ خدا کی غیر آپریشن داں بندی اٹھی اور سیدھی پہنچی والدہ صاحبہ کے پاس اور ماجرا کہہ دیا۔ اب کیا تھا

گھر بھر تھا کہ آصف علی بیرسٹر بنا ہوا تھا۔

تو بھئی اس کی تمھیں کیا ضرورت ہے؟

کیا دنیا سے حکیم طبیب بالکل ہی اٹھ گئے ہیں جو یہ حرکت کرتے ہو؟ اور آخر تم نے ہم سے تو تذکرہ کیا ہوتا، ہم لا کر دیتے ایسی دوا کہ ایک مہاسہ کیا دس مہاسے اچھے ہو جاتے۔ وہ پوچھو جا کر رستم علی سے میں نے اس کے مہاسوں کے لیے کیسی لا جواب دوا لا کر دی تھی کہ پھر نشان تک نہ رہا۔

وہ بولیں کہ ایسی ضرورت ہی کیا پڑی ہے حسین بن جانے کی خدانخواستہ کچھ اور ہو گیا تو؟ لیجیے۔

خالو میاں! بولیے اس زمانے کے لونڈے بزرگوں کے صلاح مشورے کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں، ورنہ ہم سے کہتے تو بتا دیتے کہ یہ جو تمھارے گھر میں نیم کا درخت کھڑا ہے یہ تو سو دواؤں کی ایک دوا ہے۔ بس اس کے پتے پیس کر آج لگاؤ اور کل نفع دیکھو، مگر بھئی کہیں اس سے جو ہماری مانے!

اماں احمق ہوئے ہو ان بے ایمان ڈاکٹروں کا کیا بھروسہ اول تو ان کی دواؤں میں شراب ملی ہوتی ہے جو ویسے ہی مسلمان کے لیے حرام ہے، پھر یہ لوگ بے ہوشی کی دوا سنگھا کر آدمی کو مار ڈالیں تو ان سے کوئی نہ پوچھے۔

اچھا تو وہ امو خلیفہ کا بیٹا کیا برا ہے؟

علاج ہی کرانا ہے تو وہ ہمارے گھر کا پرانا جراح ہے ہزاروں مریض اچھے کر چکا ہے، مگر تمھیں تو ہوا لگ چکی ہے نیچری لوگوں کی۔ تم تو انہی قاعدوں پر چلتے ہو، سنتے تو ہو نہیں بزرگوں کی۔

اچھا تو پھر ذرا ٹھہر جاؤ آج شام ہی کو ہم لاتے ہیں دوا حکیم سلطان محمود صاحب کی۔ پھر ذرا اس کا اثر بھی دیکھو۔ بھئی خدا نے اس حکیم کے ہاتھ میں عجب شفا رکھی ہے مگر تم کسی کو مانو جب؟

وہ بولیں کہ خالو میاں اگر یہ آٹے کا پانی روز صبح لگایا کریں تو دس مہاسے اچھا ہو جائیں۔

اب خالو میاں کا تاؤ دوا کے اثر سے بھی زیادہ تیز ہو گیا۔ چمک کر بولے:

مگر دلہن کہیں کس سے، خدا نے تمھارے آدمی کو عقل دی ہو تب؟ اچھا بھئی ہم جو کہتے ہیں

سودہ کر کے دیکھو۔ ایک پیسے کا لاؤ لوبان، ایک دھیلے کی لو پھٹکری، تھوڑا املاؤ نوسادر اور ان تینوں کے پانی سے ایک دو دن منہ دھوڈالو پھر تم سے پوچھ لیں گے کہ وہ مہاسہ کدھر گیا جس کے علاج کو تم ڈاکٹروں کے پاس جارہے تھے؟ مگر تم ہماری بات سنو تب!

ایک بولیں۔ اچھا ہے ذرا مزا تو چکھ آنے دو میاں کو ڈاکٹری علاج کا تو۔

وہ گھبرا کر بولیں۔ نہیں نہیں خالہ بی وہ ڈاکٹر کے پاس یہ مہاسا کٹانے جارہے ہیں مزا کیا خاک چکھ آنے دو۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو، آنکھ کے قریب کا معاملہ ہے۔ آپ تو نہ سوچتی ہیں نہ سمجھتی ہیں۔

خالو میاں بولے۔ اچھا بھئی تو اگر شگاف ہی دینا ہے تو لاؤ ہمارے سامنے بیٹھ جاؤ ہم شگاف دے دیں ایسا کہ معلوم بھی نہ ہو تم کو، مگر تم ہماری بات مانو جب!

غرض اب جو ہم نے دیکھا کہ گھر میں تذکرہ کر کے گویا اپنے اوپر خود ایک سنگین سا مقدمہ چلاتا ہے اور جرح میں الجھتا اس لیے سوچ کر ہم نے کہہ دیا کہ اچھا اچھا بس سن لیا۔ اب نہ جائیں گے ہم شفا خانے وہ تو انشاءاللہ خود بخود اچھا ہو جائے گا۔ ہمارے آخری فقرہ پر تقریباً تمام گھر نے بہ یک زبان زور سے انشاءاللہ کہا، مگر ہم نے دل میں طے کر لیا تھا کہ بس ایک دن خموشی سے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر آپریشن کرا لیں گے۔

اب یہ نہ پوچھیے کہ اس ارادہ میں کتنے دن تک ہم ہچکچاتے رہے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک دن شفا خانے پہنچ ہی گئے۔

جناب گرامی ڈاکٹر اصفہانی صاحب!

ایک حاذق ڈاکٹر ہیں۔ ممدوح کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ زبانِ اردو میں قابلِ تعریف و حیرت قابلیت رکھتے ہیں اور بیدار قوم کے بیدار فرد ہونے کے باعث ممدوح ایک ادیب اور اخبار نویس کے مرتبے کو بھی پہچانتے ہیں اور اہلِ قلم کی وہ عزت فرماتے ہیں جسے دیکھ کر اردو سے بے بہرہ مسلمانوں پر سو مرتبہ لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر سب سے بلند اور لائق صد احترام کمال یہ کہ ایک بلند مرتبہ ڈاکٹر ہونے پر اخلاق، شرافت، تواضع اور خوش مزاجی وہ کہ آپ سے غریب اور بے ذریعہ مریض کافی سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور اب زمانہ بھی غریبوں کے

عروج کا آرہا ہےاور یہ کوٹھیوں والے تو اب جیسے رہیں گے تعلیم یافتہ لوگ خوب جانتے ہیں۔

اسی طرح حضرت ڈاکٹر اصفہانی صاحب ملا رموزی کے مضامین کے یوں قدر دان ہیں کہ خود صاحب فضل و کمال بزرگ ہیں لہٰذا موصوف نے ملا رموزی کے اس خشک مہاسے کے آپریشن کا جو اہتمام کیا حق یہ ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرنا مشکل ہے۔ ہمارے پہنچنے پر ممدوح نے پہلا اہتمام تو یہ کیا کہ ہمیں اس کمرہ میں نہ لے گئے جہاں چھریاں، چاقو اور نشتر بہ تعداد کثیر رکھے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اس خاص کمرے میں لے گئے جہاں رؤسا اور امراء کے آپریشن ہوتے ہیں۔

اب اِدھر ڈاکٹر صاحب ہمارا دل بڑھا بڑھا کر ہمارے آپریشن کا اہتمام فرمارہے تھے اور اِدھر ہمارے جسم پر مارے وحشت کے خدا جانے کتنی مرتبہ پسینہ آتا تھا اور خشک ہوجاتا تھا۔ کئی مرتبہ ہمت کی کہ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحب آج تکلیف نہ کیجیے گا انشاء اللہ آئندہ جمعہ کو ہم بہت سویرے حاضر ہوجائیں گے، مگر مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے تمام انتظامات مکمل کرلیے تھے لہٰذا بہت کم مقدار میں ہمیں غیرت کا اثر محسوس ہوا تو خاموش ہوگئے کہ لیجیے وہ آپریشن کے کمرہ میں ہمیں پہنچا کر ڈاکٹر صاحب نے اپنا کوٹ اتارا ہے تو بے ساختہ رونے کو جی چاہنے لگا محض یہ محسوس کرکے کہ او نادان ملا رموزی تو نے یہ کیا حماقت کی کہ گھر میں کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا اب اگر تو اس آپریشن میں کچھ سے کچھ ہوکر رہ گیا تو خیر عاقبت تو یوں خراب ہوگی کہ خدا جانے ڈاکٹری علاج میں مریض کو آخر وقت میں کلمہ بھی پڑھنے دیتے ہیں یا نہیں؟ اور دنیا یوں خراب ہوگی کہ مریں گے بھی تو لاہور اور دہلی ایسے علمی اور ادبی شہروں سے دور، مگر ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی اشارہ کیا کہ اس میز پر لیٹ جایئے۔ اب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حال ہوا؟ بس اتنا یاد ہے کہ لیٹ گئے، مگر ڈاکٹر اصفہانی صاحب کا کمالِ شفقت ملاحظہ ہو کہ آپ نے اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر رفعت صاحب کو بھی طلب فرما کر ہمارے سرہانے کھڑا کردیا جو کمالِ مہربانی سے ہمیں تشفی دینے لگے اور ہم اس تشفی سے یہ سمجھے کہ ہمارا معاملہ ضرور نازک ہے اسی لیے ہمیں یہ تشفی دی جارہی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہمیں تو میز پر لٹادیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب ہماری نظروں سے دور ہوکر آپریشن کا سامان درست فرمارہے تھے جس کی ہر آواز کو ہم سمجھتے تھے کہ بس یہ ہوا آپریشن مگر

بڑی تیزی سے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس آئے تو بے ساختہ ہماری آنکھیں بند ہوگئیں۔اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔

ملا رموزی آنکھیں تو کھلی رکھو۔

ڈاکٹر صاحب کی اس آواز سے ہمیں اتنا اطمینان ہوا کہ اس آپریشن میں آنکھیں بند کرنے کی نوبت نہ آئے گی، مگر اب جتنا وقت گزر رہا تھا ہمیں رہ رہ کر رشتہ والے اور عزیز یاد آرہے تھے۔ کبھی محترمہ والدہ صاحبہ یاد آتی تھی تو کبھی قبلہ والد صاحب۔ کبھی بہن تو کبھی کبھی اکلوتا بیٹا کہ اچانک ڈاکٹر صاحب نے ہم سے فرمایا۔

ملا رموزی اگر جاڑا معلوم ہوتا ہو تو کمبل اوڑھ لو۔

قسم کھاتے ہیں اس فقرہ پر۔ خدا جانے کتنا خون خشک ہوگیا اور جواب دینے سے پہلے سوچنے لگے کہ اچھا اگر ہمیں جاڑا محسوس ہو رہا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے اسے کس طرح پہچان لیا؟ پھر اس وقت ہمیں کمبل اُڑھانے کی کیا ضرورت، یعنی وہ جو آپریشن کے لیے ہم نے اپنے دماغ میں ہمت کی تھی اس فقرہ سے نصف سے زیادہ کم ہوگئی اور آخری مصیبت یہ کہ اب اس میز پر سے بھاگ جانے کا کوئی راستہ اور بہانہ ہی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ اب تو آپریشن کے آلات کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں جو جنگل میں شیروں کی آواز سے مشابہ معلوم ہوتی تھیں کہ لیجیے وہ ڈاکٹر صاحب ہمارے سرہانے آگئے اور ڈاکٹر رفعت صاحب نے ہنس کر فرمایا:

ملا صاحب ذرا منہ کو سیدھا رکھیے۔

ڈاکٹر رفعت صاحب کے اس فقرہ سے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ملا صاحب اب آپ کا انتقال ہو رہا ہے اس لیے کعبے شریف کی طرف منہ کر لیجیے، کہ لیجیے ڈاکٹر اصفہانی صاحب نے ہنس کر ایک سوئی ہمارے مہاسے میں پیوست کر دی تو ہم سمجھے کہ یہ بیہوشی کی دوا ہے، کیونکہ آپریشن گھر میں داخل ہوتے ہی ہمیں پہلا انتظار یہی تھا کہ کس طرح ہمیں بے ہوش کیا جائے گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہی اس سوئی کو باہر نکال لیا۔ اب تو نہ رہا گیا اور ہم نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا قاعدہ کی رو سے انگریز ڈاکٹر تو اس وقت ہمارے منہ پر طمانچہ مار دیتا اور یہ لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ:

یہ کُنین کا انجکشن تھا، اس سے اب مہاسے کو کاٹنے کی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ واللہ یہ بات بالکل سچ تھی مگر ہم نے اپنی وحشت کے باعث اسے بھی ڈاکٹری دھوکہ سمجھا کہ لیجیے وہ ڈاکٹر صاحب نے قینچی سنبھالی اور مہاسے کے پرخچے اڑانا شروع کر دیا، مگر ہم اب بھی سوچ ہی رہے ہیں کہ اصل آپریشن تو وہ ہوگا جس میں ہمیں بے حد تکلیف ہوگی، اسی لیے ہمیں چیخنے چلانے سے روکنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ایک اور ڈاکٹر کو اپنے پاس کھڑا کر لیا ہے مگر خدا ڈاکٹر اصفہانی کو سارے ہندستان کا ڈاکٹر بنا دے کہ ممدوح نے باتیں کرتے کرتے ہی آپریشن پورا کر کے کہا:

لیجیے ملا صاحب تشریف لے جایئے آپریشن ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تو اپنے فن کی حیران بنا دینے والی قابلیت سے ہمیں فارغ کر دیا مگر ہماری واقفیت کا جو اثر دماغ پر تھا اس نے چند لمحات تو یقین ہی نہیں ہونے دیا کہ آپریشن واقعی ختم ہوگیا۔ جب ڈاکٹر رفعت صاحب نے شانہ ہلا کر کہا کہ اُٹھیے تو ایسا محسوس ہونے لگا گویا جرمنی کے فرانس شکن توپ خانے کی تیز گولہ باری کے درمیان سے ہم صاف بچ کر نکل آئے، لیکن تھے آخر کار دیسی اور مغرب کی ہر چیز سے نفرت کرنے والے یا ناواقف لہٰذا اثر وہی رہا یعنی جی تو چاہتا تھا کہ اگر مسلمان قوم اردو کے مضمون نگاروں کی قدر دان ہوتی تو اس وقت اتنے بڑے باکمال ڈاکٹر پر جواہر نثار کر دیتی جس نے اس قوم کو زندگی بخشی۔ ذخیرۂ تحریر بہم پہنچانے والے ادیب کا اتنا کامیاب آپریشن کیا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی مگر ڈاکٹر صاحب کو سلام کر کے اپنی انگریزی نواز قوم کو کافی سے زیادہ گالیاں دیتے ہوئے میز سے علاحدہ ہوئے تو اس طرح کہ اب جو زمین پر قدم دھرتے تھے تو اس نزاکت سے گویا اگر ذرا بھی زور سے چلے تو آپریشن ٹوٹ جائے گا یا اُلٹ جائے گا یا خراب ہو جائے گا۔ غرض خدا خدا کر کے تانگے تک آئے اور تانگے والے کو سوار ہونے سے پہلے تاکید کی کہ دیکھو بھئی تانگہ بے حد آہستہ چلانا، یہ دیکھ یہ آپریشن ہوا ہے۔ تانگے والا بھی خدا کے فضل سے جاہل ہندستانی ہی تھا اس لیے اس نے بھی ہم سے زیادہ نازک مزاج ہو کر جو تانگہ چلایا تو پورے ایک گھنٹہ میں گھر میں کیا پہنچے کہ پھر مصیبت میں پھنس گئے اور پھر وہی عدالتی جرح۔

افوہ خدا خیر کرے۔

یہ کیا ہوا؟

ارے کیا دہی آپریشن تو نہیں ہوا؟

یااللہ!

لاحول ولا قوۃ!

کہہ رہے تھے کہ دیکھو بھئی ذرا ڈاکٹری علاج سے دور رہو۔

اچھا اچھا جلد بستر پر لیٹ جاؤ۔

ارے ان بچوں کو تو خدا کے لیے باہر بھگا دو، ان کے شور سے اور میرا دل اچھلتا ہے یااللہ تو شفا دینا خیر سے۔

اچھا تو یہ بتاؤ کہ اب یہ کب اچھا ہوگا۔

تو یہ اس پر کون سی دوا لگائی ہے۔

تو اسے کب بدلنا ہوگا؟

پہلے ہی کہا تھا کہ ہم لوگوں کو ان کمبخت ڈاکٹروں کا علاج معالجہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اب بتایئے کہ کیا کریں گے؟

اچھا تو اب پرہیز کیا بتایا ہے؟

تو کیا اب ڈاکٹر صاحب تمھیں روزانہ دیکھنے آئیں گے یا تم خود ڈاکٹر صاحب کے پاس جایا کرو گے؟

خالو میاں بولے۔ کیا نا آخر لونڈا پن؟

ہاں بھئی ہماری کون سنتا ہے زمانہ ہی نا خلف آگیا ہے، پہنچ ہی گئے آخر ڈاکٹر کے پاس۔

لیجیے اس بے رحم نے کاٹ کر رکھ دیا، یہ بھی تو نہ دیکھا کہ آنکھ کے قریب کا معاملہ ہے۔

خیر بھئی اب تو جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس نے اس پر لگایا کیا بس وہی پھٹکری کی پٹی لگائی ہوگی۔ ان کم بختوں کے ہاں اور دھرا ہی کیا ہے۔

اچھا بھئی یہ تو کہو کہ تمھیں کتنی دیر بے ہوش رکھا؟

بڑی تکلیف ہوئی ہوگی تمھیں تو؟

وہ یوں کہا میں نے کہ یہ لوگ بڑے جلاد ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے تو خاصے دشمن۔

اماں ہم سے کہتے تو ہم ساتھ چلتے اور اس طرح اپنے سامنے چیرا دلاتے کہ تمھیں تکلیف نہ ہونے دیتے۔

اچھا تو پھر پرہیز کیا بتایا ہے۔

ہم تو جانیں کہ اب تم اس پٹی کو پھینک کر نیم کے پتوں کی پٹی باندھ لو اور انشاء اللہ شام تک ہی اس کا اثر دیکھ لو۔

وہ بولیں۔ خالو میاں تو ہر جگہ نیم کی پٹی ہی لیے پھرتے ہیں چاہے موقع ہو یا نہ ہو۔ اس پر خالو میاں بولے ہاں ہاں دلہن سچ کہتی ہو۔ ہاں بھئی زمانہ ہی بزرگوں پر اعتراض کا آ گیا ہے۔ عجب ''ناخلف زمانہ'' ہے۔ خیر بھئی جو تمھیں نظر آئے وہ کرو ہم اب نہ بولیں گے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ ہوشیاری سے علاج کرانا معاملہ ہے ڈاکٹری کا آگے بھئی جو تمھیں نظر آئے۔

مگر بھئی یہ تو کہو کہ اب وہ ڈاکٹر کو کیا دینا ہوگا کیونکہ یہ لوگ تو نہ دیکھیں امیر نہ دیکھیں غریب انھیں تو اپنی فیس سے کام، مگر تم یوں کہنا کہ کوئی فائدہ نظر آئے گا تو فیس دیں گے اور ہم تو جانیں کہ اب ڈاکٹر کے پاس جاؤ کیوں؟ اور بھئی ہم تو دلہن کے کہے سے اب زیادہ بولنا بھی نہیں چاہتے کیونکہ ہماری بات کا تو اب مذاق اڑایا جاتا ہے، مگر ہاں دیکھتے ہیں تو رہا نہیں جاتا۔

القصہ یہ تو ایک ٹھیٹ پرانے خیال کے گھرانے کی بدحواسی کا خلاصہ تھا مگر جب تک ہمارا غسلِ صحت نہیں ہوا ہے دل ہی جانتا ہے کہ ہمارے روشن خیال دماغ میں کیسے کیسے خطرات پیدا ہوتے تھے۔ بالآخر اس آپریشن سے اچھے ہو کر ہم اس فطری اور قدرتی نتیجے پر پہنچے کہ مشرق مشرق رہے گا اور مغرب مغرب ہی یہ اور بات ہے کہ چند دن کے لیے ہندستانی انگریز بن جائیں اور انگریز ہندستانی مگر خواص اور پیدائشی خصوصیات کے حساب سے ہندستانیوں کے لیے ہر حال میں حکیم اجمل خاں مغفور کے گل بنفشہ اور تخمِ خطمی والے نسخے ہی کچھ زیادہ موزوں اور مفید ہیں باقی سب خیریت ہی خیریت ہے۔

◆◆◆

مراق

صاحب غیاث نے مالیخولیائے مراقی کی تعریف یہ کی ہے کہ معدہ سے جو غلیظ انجرہ پیدا
ہوتے ہیں ان سے دماغ میں ایک قسم کا اختلال پیدا ہوتا ہے، مگر ہمیں ان تمام امراض پر طبی دیا
سلائی سے روشنی ڈالنا مقصود ہی نہیں بلکہ ہمیں تو از روئے ظرافت وزندہ دلی ان کے ہنسا کر غم سے
دور کردینے والے حصوں سے بحث ہے، اس لیے ہمارے ہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ مرض
کیوں پیدا ہوتا ہے؟ البتہ علمی نقطۂ نظر سے اس کی تاریخ پیدائش یا اس مرض کے وطن کی تحقیق لازم
ہے۔ سو آنکھ بند کر کے مان لیجیے کہ جس طرح آتشک ایسا موذی مرض ہندستان میں یورپ کے
سپاہیوں کی لائی ہوئی لعنت ہے اسی طرح مرض مراق بھی ہندستان میں یورپ والے ہی لائے
ہیں، جس کا تاریخ سے بھی اونچا ثبوت ہے کہ اس مرض کے نہایت ہی قیمتی نسخے ارسطو اور افلاطون
کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں اور یہ جلیل القدر حکماء ملک یونان کے باشندے تھے جو ایک وقت
بھی ہندستان نہیں آئے تھے اور ظاہر ہے کہ ملک یونان یورپ ہی کا ایک حصہ ہے لہٰذا یہ مرض سب
سے پہلے یورپ اور یونان ہی میں پیدا ہوا جسے دیکھ کر یونان کے حکیموں نے نسخے تجویز کیے گویا اس
طرح یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ یورپ والے جہاں ایشیائی ممالک میں تہذیب وشائستگی پھیلانے
آتے ہیں وہاں مراق اور مالیخولیا بھی پھیلا جاتے ہیں اور یہ مراق نہیں تو کیا علم وعقل ہے کہ

ہندستانی انگریزی زبان سیکھتے ہی اپنے ملک اور اپنے آبائی مذہب تک میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ورنہ عقلاً تو زبان انگریزی صرف اس لیے ضروری ہے کہ اسے حاصل کرکے آدمی نوکری کرے اور زیادہ سے زیادہ کاروبار میں تبادلۂ خیال کرے، مگر یہ کس علم میں آیا ہے کہ انسان اپنی زبان، اپنا لباس اور اپنی رسوم کو ترک کرکے دوسری قومیت میں یوں جذب و شامل ہو جائے کہ نہ وہ اُس قوم کا ہے نہ اِس قوم کا مگر دیکھیے کہ بقول اخبارات آج اور تو اور ایک چھوٹے سے مرزا نے صرف ایل ایل بی تک پڑھ کر ہی یہ لکھ دیا کہ مسلمان عورتوں تک کو ناچ گانا سکھانا مذہباً جائز ہے مگر ان چیزوں کا نام تک لینے سے مرزا صاحب کی روح کانپ گئی جن کے ذریعہ یاروں نے ان کے باپ دادا کا ملک فتح کرکے رکھ دیا غرض اس مرض کے اثر سے ایسی ہی سوجھتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس مرض کا مریض اپنی حرکات کے لحاظ سے کچھ اس درجہ حسین ہو جاتا ہے کہ دیکھیے اور وجد کرتے رہیے۔ مثلاً آپ کو جہاں مراق شروع ہوا کہ آپ نے بجائے آبائی پاجامہ کے یورپ کے لوگوں کا وہ پاجامہ پہن لیا جس کے شکم اقدس پر بجائے کمربند کے موٹے چمڑے سے یوں کسا جاتا ہے کہ برسوں استعمال کے بعد بھی آپ مارے تکلیف کے اس چمڑے کو منٹ منٹ پر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت دیتے رہتے ہیں مگر شکم مبارک میں کھانا کھاتے ہی جو ہوائیں پیدا ہوتی ہیں ان کے زور سے یہ پتلون اور اس کا چمڑا آپ کو کرسی پر آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا اور آپ مہذب لوگوں سے مخاطبت کے وقت بھی شکم پر سے بار بار پتلون کی پیٹی ادھر سے اُدھر ہٹاتے ہوئے آپ جس بندری اور لنگوری صورت کے بن جاتے ہیں اس کا اصل نام مراق ہے۔ کیونکہ مراق اصل میں معدہ کے خراب بخارات کے بگڑنے سے پیدا ہوا ہے اور آپ پتلون سے اسی وقت گھبراتے ہیں جب آپ کے معدہ کے بخارات کو پتلون کی پیٹی روکتی ہے اور جب یہ پتلون آپ کو تکلیف دیتی ہے تو اسے درست کرنے سے آپ پر بندر اور لنگور کی سی حرکات نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا مراق یہ ہے کہ آپ پتلون کو بغیر تحقیقِ ضرورت استعمال کرتے ہیں یعنی بے میانی کا پاجامہ یورپ والے تو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے ہاں زمین بارہ مہینہ کی بارش اور برف باری کے اثرات سے کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہاں آدمی زمین پر بیٹھ سکے اس لیے وہاں کے لوگوں نے وہاں کی اس حالت سے تنگ آکر اس پاجامہ کو ایجاد کیا اور نشست کے لیے

کرسی ایجاد کی تا کہ وہاں کی مرطوب زمین کے اثرات سے محفوظ رہیں، مگر آپ بتائیے کہ آپ کے ملک میں زمین کے اندر ایسی کون سی بارش اور دریا بھرے ہیں جن کی سردی سے محفوظ رہنے کے لیے آپ نے یورپ والوں کی پتلون استعمال فرمائی، لہٰذا ثابت ہوا کہ مراقی وہ جو ہندستانی ہو کر یورپ والوں کی پتلون پہنے۔ اس کے بعد کے عام مراقی یہ ہیں۔

(۱) مثلاً مراقی نمبر ا یک وہ جو گھر سے بازار جانے کے ارادہ سے نکلا ہو مگر راستہ میں بغیر بازار جائے آپ کے ساتھ ہو جائے۔ اس طرح کہ آپ جہاں جا کر اس سے کہیں کہ اچھا اب میں معافی چاہتا ہوں اب مجھے یہاں سے دفتر جانا، آپ تشریف لے جائیے تو وہ آپ سے کہے کوئی پروانہیں چلیے میں دفتر تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں وہاں سے واپس آجاؤں گا۔ تو آپ گھبرا کر کہیں کہ نہیں نہیں، میں بھول گیا آج دفتر کی تو تعطیل ہے۔ مجھے اپنے سسر کے ہاں جانا ہے تو وہ کہے کہ کوئی حرج نہیں میں وہاں تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اب آپ سسر کے گھر پہنچ کر گھر میں گھس جائیے اور پورے تین گھنٹہ تک ان کی خبر بھی نہ لیجیے مگر یہ دروازہ کے باہر اس طرح ٹہلتے رہیں گے کہ جو شخص ان کے سامنے سے گزرے گا یہ اسے بڑے تپاک سے خود سلام کر کے روک لیں گے اور مارے باتوں کے اسے عاجز کر دیں گے۔ اب جو آپ باہر آ کر کہیں گے کہ افو بھائی صاحب آپ کو بہت زحمت ہوئی تو یہ فوراً ہنس کر کہیں گے کہ جی کوئی حرج نہیں میں بھی فلاں صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ اب آپ کو دل میں اطمینان ہوگا کہ یہ شخص اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔ لہٰذا آپ کہیں کہ اچھا بھائی صاحب اب میں معافی چاہتا ہوں کیونکہ وہ میرے گھر کے لوگوں نے کہا ہے میں ذرا ملا رموزی صاحب کی کتابیں بازار سے جا کر خرید لاؤں تو یہ فوراً کہیں گے کہ سبحان اللہ بہت ہی خوب چلیے چلیے میں بھی آپ کے ساتھ بازار تک چلتا ہوں کیونکہ وہ مجھے بھی تو آپ کی بھاوج نے بازار ہی بھیجا تھا مگر افسوس کہ میں آپ سے باتوں میں ایسا کھویا کہ بس آپ کے ساتھ اِدھر نکل آیا۔ اب آپ یہی سن کر خوش ہوں گے کہ چلیے بازار سے تو پیچھا چھوٹ جائے گا۔ لیکن جہاں آپ بازار میں پہنچے اور آپ نے کسی دکاندار سے گفتگو شروع کی کہ بغل سے لیک کر ان بزرگ نے اس دکاندار سے جرح شروع کی کہ دکاندار بھی تنگ اور آپ بھی تنگ پھر بار بار ہیں کہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت آپ فلاں دکان پر میرے ہمراہ چلیے دیکھیے میں یہی چیز آپ کو کتنی

ارزاں اور کم قیمت پر دلاتا ہوں۔غرض اس طرح دکان دکان آپ کو ذلیل کر کے پھر گھر تک کے لیے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔اب آپ دل میں یہ کہہ کر کہ اے خدا تو اس پاگل کو زمین کا پیوند بنادے۔ان سے کہیں گے کہ مسٹر وہ آپ کو بھی تو بازار سے کچھ خریدنا تھا۔لہٰذا آپ تشریف لے جایئے خدا جانے بھاوج صاحب کب سے اس چیز کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی تو یہ فوراً کہیں گے نہیں ،نہیں، کوئی حرج نہیں وہ چیز اس بازار میں نہیں ملتی ، مجھے اس کے لیے چوک بازار ہی جانا پڑے گا لہٰذا میں آپ کو گھر تک پہنچا کر پھر چلا جاؤں گا۔اس طرف سے مجھے چوک بھی قریب پڑے گا اور یہ کہنے کے بعد ہی بیوی کے منتظر رہنے کی تردید بھی شروع کر دیں گے جس کی تفصیل آپ کے گھر تک بھی پوری نہ ہوگی مثلاً یہ کہ کیا کہوں حضرت خدا نے مجھے جیسی نیک اور فرماں بردار بیوی دی ہے خدا میرے ہر بھائی مسلمان کو ویسی بیوی دے۔حق یہ ہے کہ میں اس غریب کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کرتا،مگر وہ ہے کہ پھر بھی میری خدمت و فرماں برداری کے لیے چوبیں گھنٹہ کمر بستہ کھڑی رہتی ہے۔اب ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصہ تک ان کے ہمراہ رہنے سے آپ کی شرافت اور آپ کی خوش خلقی زور پر آئے گی۔لہٰذا گھر پر اگر آپ نے جھوٹ کہہ دیا کہ مسٹر اب کھانا تیار ہے کھا ہی لیجیے کہ یہ فوراً کہیں گے کہ بھئی اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کیا میں اپنے اور آپ کے گھر میں کوئی فرق سمجھتا ہوں۔لایئے بسم اللہ۔اس موقع پر خاکم بدہن لفظ بسم اللہ پر جو تاؤ آتا ہے دل جانتا ہے خدا معاف کرے۔

اب جو دستر خوان پر یہ بیٹھ گئے تو آپ جب چاہیں جتنا چاہیں کھالیں مگر ان کے ہر لقمہ سے ایک طویل داستان لپٹی رہے گی جس کے سلجھانے سے ان کی زبان اتنی فارغ ہی نہ ہوگی کہ یہ لقمہ کو حلق کے اندر پہنچا سکیں۔جہاں ایک لقمہ اٹھایا کہ فوراً اس ترکاری پر تنقید، تبصرہ، نقد و نظر، بحث و تمحیص، انتقاد، ریویو، نظر سے خوش گزرے، نکتہ چینی اور جرح شروع فرمادی ایسی کہ ان کی زیر بحث ترکاری بجائے ان کے آپ کھا گئے مگر انھیں بحث ہی سے فرصت کہاں جو یہ ملاحظہ فرمائیں کہ ترکاری کون کھا رہا ہے۔پھر ان کی بحث کا تمام زور اپنی بیوی کے ''باورچی پن'' پر خرچ ہوگا اس طرح کہ، کیا عرض کروں بھائی صاحب کبھی آپ اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا پلاؤ کھائیں تو کہیں اور بھائی مرغ کے کباب بنانے میں تو ان کو قیامت کا ملکہ حاصل ہے میں تو عرض ہی نہیں کر سکتا بس کسی

وقت کھایئے تب ہی آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ میرے بڑے بھائی صاحب نے جو ایم۔اے پاس بھی ہیں اور آج کل بریلی کے محکمۂ قضاء کے افسر اعلیٰ ہیں ایک ڈپٹی کلکٹر کی دعوت کی جو انھیں دنوں ولایت سے آیا تھا بس کیا عرض کروں بھائی صاحب کہ جو میں نے آپ کی خادمہ کا پکایا ہوا پلاؤ اسے کھلایا ہے تو واللہ ولایت تک سے تین برس تک اس کے خطوط آتے رہے جن میں وہ آپ کی بھاوج کے پلاؤ کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ غرض ان کا سلسلۂ کلام برابر جاری رہے گا یہاں تک کہ آپ اس شرافت میں مقدار سے زیادہ کھانا خود ہی کھالیں گے کہ ایسا نہ ہو کہ میرے فارغ ہوجانے سے یہ غریب مارے حجاب کے بھوکا رہ جائے، مگر انھیں نہ اس کا ہوش۔ وہ تو کھا بھی رہے ہیں، بحث بھی فرما رہے ہیں اور لقمہ ہاتھ میں لے کر لحموں بیٹھے بھی ہوئے ہیں۔ اب جو خدا خدا کر کے کھانا ختم بھی ہوا اور کہیں آپ نے لکھنؤ کا حقہ پیش کر دیا تب تو سمجھ لیجیے کہ اب یہ آپ کی جان ہی لے کر واپس ہوں گے یعنی جتنا وقت انھوں نے کھانے پر برباد کیا اس سے سوا اب حقہ پر صرف ہوگا اور اب کھانے کی جگہ ''حقہ جاتی مسائل'' پر اظہار خیال ہوگا (یہاں حقہ جاتی بروزن صوبہ جاتی صحیح ہے)

القصہ اب یہاں اتنا وقت برباد کرنے کے بعد ان میں کے اکثر تو چار و ناچار رخصت ہوجاتے ہیں اور جن کا مراق کافی شباب پر ہوتا ہے وہ کھانے کے بعد یا تو خود ہی خود ''قیلولہ'' بن جاتے ہیں یا بے تکلفی سے آپ ہی سے دو گز زمین اور ایک چادر مانگ کر آپ کے باہر والے کمرے میں سو بھی جاتے ہیں۔ غرض مانی ہوئی بات ہے کہ مراق کا مارا ہوا اپنے گھر سے صبح سے جا کر شام ہی کو واپس گھر آتا ہے اور غریب بیوی ہم سے تم سے مدد لے کر زندہ رہتی ہے۔

ان کا یہی عالم گھر میں رہتا ہے یعنی بلا سے بیوی ابجد خواں بھی نہ ہو مگر یہ اس کا کوئی فیشن ایبل نام رکھ کر جیسا کہ آج کل کے انگریزی داں ہندستانی اپنی بیوی کے مساۃ نصیبن بی نام کو بدل کر شوکت جمال رکھ لیتے ہیں۔ تمام دنیا میں تو اس کا تذکرہ کرتے پھرتے ہیں پھر اوپر سے گھر میں رہ کر بھی اس غریب بے زبان کا مارے بحث و جرح کے ناطقہ بند کیے رہتے ہیں۔ وہ غریب اگر کہے گی کہ آج کل گھی بہت گراں ہے تو فقط ہاں یا ٹھیک ہے کہہ کر اس کا پیچھا نہ چھوڑیں گے بلکہ گھی کی لغوی تعریف کریں گے پھر اس کی پیدائش پر بحث فرمائیں گے یہاں تک کہ آخر میں وائسرے

کونسل میں گھی کے مسودۂ قانون پاس ہونے پر بحث کرتے ہوئے کونسل کے کسی ممبر کے ذاتی حالات بتاتے بتاتے شام کردیں گے۔ اگرچہ اس عرصہ میں بیوی ان کے سامنے سے دس مرتبہ اٹھ کر اِدھر اُدھر چلی بھی جائے گی مگر یہ جس پہلو سے بیٹھے اظہار خیال شروع کریں گے شام تک اُسی انداز سے ان کی زبان چلتی رہے گی پھر وہ بھی بالکل قینچی کی طرح۔

مراق کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ آپ گھر سے بائیسکل ہاتھ میں لے کر باہر نکلے اور تمام شہر میں گھوم گھوم کر آگئے۔ سائیکل ہاتھ میں رہی مگر ایک جگہ بھی اس پر سوار ہونے کا خیال نہ آیا۔

یا کبھی عمر میں موزے پہننے کا خیال آیا تو اس طرح کہ موزے اوپر اور پاجامہ نیچے۔

یا سڑک پر تنہا چلے جا رہے ہیں مگر اس طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا کسی شخص سے زور شور سے باتوں میں مصروف ہیں۔

یا گھر سے بغیر کوٹ اور شیروانی پہنے تمام بازار میں گھوم آئے اور گھر کے دروازہ پر واپس پہنچ کر کہا کہ ارے لاحول ولا شیروانی تو بھول گیا تھا۔

یا دو چار آدمیوں میں چپ بیٹھے تو اس طرح کہ اپنی مسلسل اور بے ربط باتوں سے خود بولتے رہے اور سب کو چپ رکھا۔

آخری مگر سب سے نازک مراق کی پہچان یہ ہے کہ ایسا آدمی اکثر کسی جگہ کا افسر یا عہدہ دار بھی ہو جاتا ہے تو پھر مصیبت ہی آجاتی ہے۔

ایک قسم مراق کی یہ ہے کہ اچانک آپ نے یہ سوچا کہ افوہ! مر گیا، ہائے اس کی یہ بالی عمر اور پھر قیامت کہ وہ اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتی ہے اور ابھی سے شعر کہنے کی یہ مشق!!!

اوفوہ! آنکھوں میں خمار تھا کہ حیا و حجاب اور شوخی و سرمستی کا رنگا رنگ میخانہ؟ اور توبہ جو اس کے سینے سے میں نے اس کا دوپٹہ ڈھلکا ہوا دیکھا اور وہ مجھے دیکھ کر شرمائی۔ اور توبہ جو اس نے مجھے پھر اشارہ کیا اور مسکرا کر چھپ گئی۔ اور خدا کی پناہ اس کے چہرے کا رنگ تھا کہ نور کے دریا کی موجوں میں شرابیں ملا دی گئی تھیں اور پھر بیٹی بھی کس کی کہ اتنے بڑے آدمی کی۔

بس یہ خیالات پیدا ہوئے ہی تھے کہ آپ فوراً ملا رموزی کے پاس آئے اور ہانپتے کانپتے ہوئے لہجے میں آپ نے کہا کہ خطا معاف ملا صاحب ہے تو گستاخی مگر جذبات سے مجبور ہوں۔

جی ہاں جی ہاں انھیں کی لڑکی۔

جی ہاں مجھلی ہے یا چھوٹی یہ ابھی معلوم نہ کرسکا مگر ہاں تھی انھیں کی کیونکہ موٹر تو میں نے صاف پہچان لیا تھا۔

تو بس ملا صاحب یہ آپ کا آخری احسان ہوگا اگر آپ پہلے ہی خط میں اسے میری طرف متوجہ کردیں گے اور میں عمر بھر آپ کا غلام رہوں گا۔

جی ہاں اس نے خود ہی کھانس کر مجھے متوجہ کیا تھا۔ بس میں نے جو موٹر کی طرف دیکھا تو مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے ہنس کر مجھے کچھ اشارہ بھی کیا تھا، مگر ہائے رے قسمت کہ اس وقت کمبخت سامنے سے بڑے مولوی صاحب آرہے تھے، اس لیے میں اچھی طرح دیکھ ہی نہ سکا اور خدا کی قسم ملا صاحب اس کے ہاتھوں کی مہندی اور کلائی پر کی گھڑی تو میں نے صاف صاف دیکھ لی۔

جی ہاں وہ تو اس کے باپ کی موٹر سے میں نے اسے پہچان لیا ورنہ میں تو مر گیا ہوتا جو یہ پہچان نہ ہوتی۔ اچھا تو پھر کل تک آپ یہ خط لکھ دیجیے گا مگر خدا کے لیے ملا صاحب ایسا لکھیے گا کہ وہ میرے لیے بے چین ہی ہو جائے۔

السلام علیکم ملا صاحب!

خدا آپ کو بادشاہ کردے بس کمال کردیا ملا صاحب سبحان اللہ، لیجیے یہ اس کا جواب آگیا۔ خدا کی قسم ملا صاحب خط لکھنے میں تو آپ کا ہندستان بھر میں جواب نہیں۔ واللہ آج ہی کی ڈاک سے جواب آیا ہے اور دیکھیے تو پہلے ہی خط میں لکھتی کیا ہے مجھے؟ دیکھا آپ نے؟

اب جو گھر گئے تو حال یہ کہ باتیں کر رہے ہیں بھائی سے اور دماغ اسی کوٹھی، اسی محل اور اسی بنگلے میں پڑا ہوا ہے جہاں وہ رہتی ہے کہ یکایک خیال آیا کہ وہ اخبار ''زمیندار'' لاہور میں جو اشتہار چھپتا رہتا ہے کہ ''معشوق عاشق کے قدموں پر'' تو کیوں نہیں اس اشتہار والے تعویذ کو منگا کر آزمایا جائے اور وہ جو خود ملا رموزی صاحب کے پاس تسخیر کا اتنا بڑا عمل ہے تو اسے ان کی خدمت کرکے کیوں نہ حاصل کیا جائے۔ بس ان خیالات کا آنا تھا کہ اب آپ کے کمرے میں تعویذوں، گنڈوں، عملیات کی کتابوں، زعفران وعنبر اور لوبان کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ گوشت،

ترکاری، پھل غرض سب کچھ کھانا حرام ہو چکا ہے۔ بارہ بجے رات کو کسی منہدم سی مسجد کے صحن میں کسی دریا کے کنارہ کسی سان اور مرگھٹ میں بیٹھے وظیفہ پڑھے جا رہے ہیں۔ دوستوں میں جب تذکرہ ہے تو اسی کا پھر وہ بھی اول سے آخر تک چاہے کوئی سنے یا نہ سنے۔ اس حد تک معاملہ پہنچنے پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا آپ گھر سے بھاگ جاتے ہیں یا وہ بھاگ جاتی ہے مگر اس عرصہ میں آپ قدم قدم پر مراقی پکارے جاتے ہیں۔

مراق کی ایک لطیف تر قسم یہ ہے کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ مقدار سے زیادہ موٹے ہوتے جا رہے ہیں، بس اس یقین کے پختہ ہوتے ہی آپ کے اندر بندر اور لنگور کے سے خواص پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو آپ کی عقل آپ کو جواب دے دے گی اس طرح کہ آپ طبعی فطری اور اصلی بھوک کے خلاف جہاد شروع کر دیتے ہیں اور بجائے روٹی کے اب پھلکا کھانا شروع کر دیتے ہیں اور وہ بھی نصف یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ۔ پھر آخری بدعقلی یا عقلی مراق کا پہلا ثبوت یوں ملتا ہے کہ آپ اپنے موٹاپے کے کم یا زیادہ ہونے کا خود ہی اندازہ لگا لیتے ہیں یعنی ایک دن اپنے مٹکے اور گھڑے کی قسم کے شکم کو خود ہی دیکھا۔ دو چار مرتبہ ہاتھ پھیرا، کوٹ کے بٹن لگا کر دیکھا اور خود ہی یقین فرما لیا کہ ہاں کم کھانے میں آج موٹاپا کم ہو گیا۔ اب جو اس سے بھی اطمینان نہیں ہوا اور مراق نے اور زور دکھایا تو اب لگے بندروں ایسی حرکات سے کام لینے جسے انگریز لوگ اکسر سائز اور وطنی علما ورزش کہتے ہیں، مگر ہندستانیوں پر چونکہ انگریزوں کا بھوت سوار ہے لہٰذا خمیر تو بنا ہے ہندستان کی مفتوح، غلام اور بے حیثیت مٹی سے مگر نقل ہر حال میں کرتے ہیں یورپ والوں کی۔ لہٰذا ورزش بھی کریں گے تو یورپ والوں کی اور چونکہ سرد ملک والوں کے خون میں قدرتاً جمود ہوتا ہے اس لیے سخت سے سخت محنت سے حرکت میں لانے کے لیے انھوں نے سخت سے سخت محنت والی ورزشیں ایجاد کی ہیں اور ہندستان گرم ملک ہونے کے باعث اپنے باشندوں کو سخت محنت سے روکتا ہے مگر نقالی کا برا ہو کہ ہندستانی جب یورپ والوں کی سخت محنت والی ورزش کو اختیار کرتے ہیں تو الحمدللہ کہ بجائے اسی اور نوے برس کی عمر پانے کے بعد ہندستان کے اچھے اچھے انگریزی ورزشوں والے پچاس ساٹھ برس سے زیادہ زندہ نہیں رہتے اور انگریزوں کا جولارڈ بھی مرتا ہے وہ نوے اور پچانوے برس سے پہلے نہیں مرتا۔ دور کیوں جائیے وہ اپنے مسٹر

لائڈ جارج اور مسٹر چرچل ہی کو دیکھ لیجیے کہ ہم نے آپ نے جب دنیا میں پہلی مرتبہ آنکھیں کھولی ہیں اس وقت بھی یہ دونوں زندہ تھے پھر جب ہم آپ تعلیم پانے گئے تب بھی یہ زندہ تھے پھر جب دنیا کی سب سے بڑی جنگ یورپ ہوئی اس وقت تو گویا یہ دونوں ہی اس تمام جنگ وخوں ریزی کو روک رہے تھے پھر جب ہماری آپ کی شادی ہوئی تب بھی یہ دونوں زندہ تھے اور آج جب کہ ہم آپ بال بچوں والے ہو کر وفات پانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں تب بھی یہ دونوں زندہ ہیں اور کم از کم ہندستان کا تو دل ہی خوب جانتا ہے کہ یہ دونوں کس طرح زندہ ہیں مگر آپ ہندستان کے کسی بڑے سے بڑے کھلاڑی کا نام بتا دیجیے جس نے محض یورپی وضع کی ورزش کے اثر سے ایک کم سو برس کی عمر پائی ہو؟ مگر غلامی سے جب دماغ ہی اوندھا پیدا ہو تو کسی بی۔اے یا ایم۔اے پاس ہندستانی کی کیا خطا۔

لہٰذا اب جو یقین ہوا کہ انگریزی ورزش سے موٹاپا کم ہو جائے گا تو لگے بندروں اور لنگوروں سے سوا کودنے اچھلنے اور ناچنے پھر یہی نہیں کہ ایک آدھ دن کو دلیے اور پھر بیٹھ گئے بلکہ دنوں ہیں کہ قلابازیاں کھاتے پھرتے ہیں اور بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے ہیں کہ موٹاپا کم ہوا یا نہیں؟

اب اگر کہیں یہ مراق یہاں سے ذرا ترچھا ہو گیا تو کسی حکیم کے مطب کو جالیا اور اب صبح و شام ہیں کہ حکیم صاحب کے مطب میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حال یہ کہ کوٹ کی جس جیب میں دیکھیے نسخوں کی کتابیں کی کتابیں اور دواؤں، پرہیز اور طریق استعمال کی یادداشتوں کی شلوں سے ہر جیب بھری پڑی ہے۔ پھر خاص پہچان یہ کہ حکیم صاحب جتنے تپاک اور پیار سے چاہیں کہ آپ مطلب کے اول وقت میں حال بیان کر کے نسخہ لکھالیں تو آپ اسے کبھی منظور نہیں کریں گے بلکہ نہایت اطمینان سے حکیم صاحب سے کہہ دیں گے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں آپ مطب کے تمام مریضوں سے فارغ ہو لیں تو میں عرض کروں گا اب تین چار گھنٹہ تک حکیم صاحب اور دوسرے مریض ہیں کہ مصروف ہیں اور آپ ہیں کہ یا تو اپنے ہی خیالی مرض کی ادھیڑ بن میں مصروف ہیں یا پھر ہر مریض کا حال سن کر پریشان ہو رہے ہیں یہاں تک کہ مراق کا دورہ اگر زور پر آ گیا تو کسی مریض کے حال کو سنتے ہی اتنے پریشان ہوئے کہ مارے وحشت کے حکیم صاحب سے بغیر حال

کہہ کوئی بہانہ کر کے گھر چلے آئے یا بیٹھے بھی تو اس طرح کہ اپنا حال اور اپنا مراق تو بھول گئے اور اس مریض کے مرض میں کھو گئے۔ اب جو حکیم نے آپ سے حال دریافت کیا تو تفصیل سے عرض کرنے کے عوض مختصر سا کچھ کہہ کر چل دیے اور دوسری صبح کو سب سے پہلے پھر مطب میں موجود۔

اب جس دن بھی آپ کے منشا کے موافق حکیم صاحب نے آپ سے مخاطبت کی اس دن آپ نے جو اپنے مرض کی تفصیل یعنی اس کی پیدائش، اس کی قومیت، اس کی عمر اور اس کے پچھلے علاج اور پچھلے حکیموں اور ڈاکٹروں کے نسخے کی تفصیلات کو شروع کیا تو حکیم صاحب نے سمجھ لیا کہ اب آپ سے پیچھا چھڑانا مشکل لہٰذا ثابت شد کہ آپ مراق نمبر اول کے مریض ہیں لہٰذا اس غریب نے تو ایک نسخہ مراق کا گھسیٹ دیا اور آپ سے کہہ دیا کہ کچھ نہیں آپ کو معمولی نفخ کی شکایت ہے مگر جوں ہی کہ اس نے آپ کے مرض کو معمولی کہا اور آپ اس کے گلے کا ہار ہو گئے اور پھر آپ نے اس مرض کی تمام تفصیل اور دوسرے حکیموں کی تشخیص، ان کی ادویہ، ان کے طریق علاج وغیرہ وغیرہ کی تفصیل سنا کر ان سے منوانے کی کوشش کی کہ یہ بھی کہہ دیں کہ ہاں واقعی آپ کا مرض بہت خطرناک ہے اور اب جانے والا نہیں مگر حکیم پھر حکیم ہوتا ہے لہٰذا اس نے صبر سے کام لے کر کہہ دیا کہ بہت ٹھیک تو آپ چار دن میرے اس نسخہ کو استعمال کر کے آیئے گا تو میں دوسرا نسخہ تجویز کر دوں گا۔ اب اسے اطمینان ہوا کہ کم از کم آپ چار دن کے لیے تو گئے مگر یہ حکیم دوسرے ہی صبح کو کیا دیکھتا ہے کہ آپ موجود ہیں اور تمام مطب ختم ہونے کے بعد آپ نے پوچھا بھی تو صرف اتنا کہ وہ جو کل آپ نے چار دن کا نسخہ تجویز فرمایا ہے اس میں یہ نہیں بتایا کہ کھانے میں کس کس غذا سے پرہیز کروں لہٰذا میں نے نسخہ تو پی لیا مگر شام کو کھانے کا ناغہ کر دیا یہ سوچ کر کہ کہیں بد پرہیزی نہ ہو جائے۔ حکیم صاحب کو غصہ تو بہت آیا مگر سوچ کر کہ عجب بے وقوف سے پالا پڑا ہے مگر حکیم چونکہ غیر یوپی ڈاکٹر ہوتے ہیں اس لیے انھوں نے غصہ ضبط کر کے فرمایا کہ افوہ جناب کو بڑی زحمت ہوئی۔ اتنی سی بات کے لیے اچھا تو بس آپ صرف تیل اور ترشی سے پرہیز رکھیے اور باقی سب چیزیں شوق سے استعمال کیجیے۔ اب حکیم صاحب کی اس اجازت کے صاف معنی یہ تھے کہ جو چاہیں وہ آپ کھائیں، مگر آپ نے مارے مراق کے اب خود حکیم کو ملزم نمبر 10 قرار دے کر ان سے یوں جرح شروع کر دی اور حکیم صاحب وہ آج کل الٰہ آباد کے امرود اگر کھاؤں تو خرابی تو نہیں، مگر حکیم

صاحب ترشی توان امرودوں میں بھی ہوتی ہے اور حکیم صاحب وہ والدہ نے فرمایا تھا کہ لوکی کھانے کی اجازت بھی لے لینا۔ اچھا تو میں نارنگی تو کھا ہی نہیں سکتا تو پھر وہ مٹھائی بھی نہ کھانا چاہیے کیونکہ یہاں تو سچ پوچھیے تو حکیم صاحب یوپی میں ایسی مٹھائی ملتی بھی نہیں اور یہ ہے کہ بڑا شہر ہے لاحول ولاقوۃ۔ مگر قبلہ وہ رات جو میں نے دوا پی تو کوئی نصف گھنٹہ کے بعد مجھے قدرے چکر سے محسوس ہوئے اور ...اب آئے تھے صرف پرہیز کی غذائیں دریافت کرنے مگر بیماری کی تفصیل پھر سے شروع کردی۔ غرض کوئی ایک گھنٹہ میں یہ دشواری تمام کا پیچھا چھوڑا تو عطار سے جا الجھے۔ ایک ایک دوا کی اس سے تفصیل پوچھی جارہی ہے۔ دواؤں کی خاصیت سمجھی جارہی ہے، ان کے نئے اور پرانے ہونے کی تحقیق ہورہی ہے اور دوسرے گاہک ہیں کہ عطار پر خفا ہورہے ہیں کہ کس مخبوط الحواس سے الجھے ہوئے ہو ہمیں تو دوائیں دے دو اب جو خدا خدا کرکے گھر پہنچے تو گھر بھر آپ کے مراق سے تنگ یعنی گھر میں اپنے مرض کی شدت، اس کی تکلیف، اس کی طوالت اور اس کی خطرناکی کو ایسے خوفناک الفاظ میں سناتے رہے کہ تمام گھر پریشان اور بیوی اگر تعلیم یافتہ نہ ہوئی تب تو اس غریب کا چوبیس گھنٹہ ناطقہ بند۔ دواؤں کو رکھنے اور ان کے بنانے میں لاکھوں احتیاطوں کی تاکید دوا پینے اور کھانے کے اوقات کی حد سے گزری ہوئی پابندی دواؤں کا اپنے سامنے تیار کرانا اور ہر دوا کی خاصیت اور اس کی اصلیت سے بیوی بچوں کو واقف کرتے رہنا یہ آپ کے چوبیس گھنٹہ کے خانگی مشاغل ہوں گے پھر ہر وقت یہ وحشت سوار کہ مرض بڑھ تو نہیں گیا اور اس وقت میری جو کیفیت ہے وہ نصف گھنٹہ پہلے کیوں نہیں تھی۔ بس جہاں کوئی ادنیٰ تغیر بھی محسوس ہوا کہ اب آپ بغیر حکیم کے نہ گھر میں ٹھہر سکتے نہ نوکری پر یعنی جس جگہ آپ کو اپنی طبیعت میں کوئی فرق محسوس ہوا کہ آپ اسی جگہ سے حکیم صاحب کی خدمت میں روانہ ہوگئے یہاں تک کہ اگر طبیعت پر بحالی محسوس ہوئی تو بھی حکیم صاحب کی خدمت میں کھڑے حال بیان کررہے ہیں اور وہ بھی عجیب عجیب قسم کی تفصیلات سے اور اگر آپ کسی کالج کے پڑھے ہوئے ہیں تب تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے مراقی علاج کے سبب سے گھر میں افلاس موجود رہے گا۔ یعنی آپ اپنی کالج زدگی کے باعث انگریزی علاج ہی شروع فرمائیں گے۔ لہٰذا دیے جائیے پھر فیس پر فیس اور کمپاؤنڈروں کو انعام پر انعام۔ اب آپ کی جیب میں نسخوں کے ساتھ ہی سینے، کلیجہ، جگر، پھیپھڑے اور آنتوں

کے دیکھنے کے انگریزی آلات بھی رہیں گے اور حرارت دیکھنے کا آلہ تو چوبیس گھنٹہ بغل سے جدا نہ ہوگا۔

جب دیکھیے کھڑے ڈاکٹری معائنہ کرا رہے ہیں۔ پیشاب اور خون کا معائنہ تو روزانہ کی بات ہے۔ اب جو مقامی ڈاکٹر سے تشفی نہ ہوئی تو کلکتے اور بمبئی کے ڈاکٹروں سے علاج شروع ہے اور اگر خدا نے چند غریبوں اور مزدوروں پر حکومت بھی دی ہے تب تو آپ کا مراق بجز پیرس اور لندن کے جا ہی نہیں سکتا۔ آئے دن ہیں کہ باہر سے قیمتی سے قیمتی دواؤں کے پارسل چلے آرہے ہیں، آپریشن پر آپریشن اور انجکشن پر انجکشن ہو رہے ہیں اور غریبوں مزدوروں اور کسانوں کے روپیہ سے آپ ہیں کہ مسوری، شملے اور لندن تک ہیں کہ آب وہوا تبدیل کرنے چلے جا رہے ہیں اور وہ بھی سال میں دو مرتبہ، مگر مراق ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے، محض اس لیے کہ جن غریبوں کی کمائی سے آپ مراق پر یوں بے دریغ دولت صرف فرما رہے ہیں، وہ ہیں کہ گلے پھاڑ پھاڑ کر بددعا کر رہے ہیں حتیٰ کہ ایک دن تار آہی گیا کہ آپ پیرس کے سرکاری شفاخانے میں اناللہ ہو چکے۔ خوشامدی اخباروں نے آپ کے نوحے چھاپ دیے اور غریبوں نے پوشیدہ طور پر آپ کی وفات پر خوشی منائی اور اس طرح انگریزی وضع کا مراق ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔

اس مریض کی پہچان میں زیادہ تحقیق اور محنت کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی صورت ہی مراق کا نمونہ ہوا کرتی ہے یعنی ان کے لباس میں کبھی ترتیب اور باقاعدہ تہذیب نظر نہیں آتی یہاں تک کہ گرم کوٹ کی آستین سے قمیص کی آستین ہمیشہ باہر نظر آتی ہیں۔ سر کے بال اول تو طبی مشورہ سے صاف ورنہ پھر یہ خشک بال ہمیشہ فوجی سپاہیوں کی طرح سیدھے کھڑے رہتے ہیں۔ آنکھوں کی وحشت اور گفتگو کا بے ربط ہونا بہت جلد بتا دیتا ہے کہ آپ مراق میں مبتلا ہیں۔

اس مرض کا آخری دور نہایت شاندار ہوتا ہے یعنی پھر بازاروں اور سڑکوں پر لوگ ہیں کہ آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ عجیب عجیب باتیں سنا رہے ہیں۔

اس مرض کی چند نہایت نازک، غیر محسوس اور ناقابلِ فہم اقسام اور بھی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں کہ:

اخلاق اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی غلط ہو مگر ایشیا اور افریقہ اور بس چلے تو بحرِ منجمد

شمالی کی تہہ کو بھی فتح کرو اور شراب پیتے رہو اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم ملک چین ہی کو فتح کرو اور زندگی کے مزے اڑاؤ۔

ایک مراق یہ ہے کہ بلا سے جائیداد پر جائیداد قرق ہوتی رہے مگر اخبار ہر حال میں جاری رہے۔ بلا سے ملازمت جاتی رہے مگر ملا رموزی بنے رہو اور مضمون نگاری نہ چھوڑو۔ بلا سے دنیائے انسانیت میں آپ کو قبرستان میں بھی جگہ نہ ملے مگر ''جی حضوری'' کا پیشہ اختیار کیے رہو اور خطابات حاصل کرتے رہو اور بلا سے بچے بھوکے رہیں مگر زیور پر زیور بنواتی رہو اور پہنتی رہو۔ پس خدا ہر مسلمان کو اس مرض سے محفوظ رکھے آمین۔

◆◆◆

غنودگی

غنودگی کو تمام گل بنفشہ قسم کے حکیموں نے ایک بیماری تسلیم کیا ہے جو مزاج کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کی عملی صورتیں وہ ہوتی ہیں جو اس مضمون میں آپ کو نظر آئیں گی اور ویسے انسان کے اندر غنودگی بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبر، جلیل القدر سپہ سالار، باوقار علماء، صاحب عظمت وزراء اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یعنی ''اونگھتے ہیں'' غلط ہے کہ اس کیفیت کا نمایاں اثر صرف افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ گانجہ، چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد بغیر پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو انسان دنیا و مافیہا سے یکلخت............

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا۔ غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے بہت کافی پایا۔ عمر، موسم اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پچاس برس کی عمر کے بعد سے لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکا یک............ اگر انھیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا اور پھر... موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔

غنودگی

غنودگی کو تمام گل بنفشہ قسم کے حکیموں نے ایک بیماری تسلیم کیا ہے جو مزاج کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کی عملی صورتیں وہ ہوتی ہیں جو اس مضمون میں آپ کو نظر آئیں گی اور ویسے انسان۔ کے اندر غنودگی بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبر، جلیل القدر سپہ سالار، باوقار علماء، صاحب عظمت وزراء اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یعنی ''اونگھتے ہیں'' غلط ہے کہ اس کیفیت کا نمایاں اثر صرف افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ گانجہ، چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد بغیر پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو انسان دنیا و مافیہا سے یکلخت............

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا۔ غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے بہت کافی پایا۔ عمر، موسم اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پچاس برس کی عمر کے بعد سے لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکا یک............ اگر انھیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا اور پھر... موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔

اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جانا محال ہوگیا ہے اور بعض بزرگ تو دسترخوان پر ہی..........مگر قوائے جسمانی کے لحاظ سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے ہیں جب کہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان اور تندرست آدمی کو سوار کر دیجیے اور چاہے جس موسم میں سوار کر دیجیے وہ ایک اسٹیشن تک تو کھڑکی سے مناظرِ قدرت کی سیر میں مصروف رہے گا، مگر دوسرے اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلے میں کم از کم ایک سو ایک مرتبہ..........اگر اسٹیشن پر گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی تو ٹھہرنے کی آواز سے وہ بیدار بھی ہو جائے تو گاڑی روانہ ہوتے ہی پھر..........

غنودگی کا غلبہ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے لیکن یہ بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے جہاں غنودگی کے پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد اور اس لیے اللہ بخشے ہمارے بڑے مولوی صاحب ریل میں اپنا صندوق اپنے کمر بند سے باندھ کر بیٹھتے تھے۔ دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے جہاں آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا کہ..........خصوصاً ایسے طلبا پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جو انٹرنس کے امتحان کے لیے تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگرچہ نوجوان طلبا بھی اس کے انسداد کی تدابیر اختیار کرتے ہیں مگر سب بے سود۔ مثلاً ہمارے ایک مستعد شاگرد نے غنودگی سے تنگ آ کر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا، لیکن اس حد تک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گئے، لیکن اس کے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی..........غصہ میں آ کر انھوں نے دوسری تدبیر اختیار کی یعنی اس مرتبہ انھوں نے انگریزی کرسیاں بھی پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جس کے معنی یہ تھے کہ غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ بے شبہ وہ دیر تک پڑھتے رہے، لیکن اس کے بعد انھوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جمادیں پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دیے اور مطمئن تھے کہ غنودگی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ..........ہم نے جا کر دیکھا تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا اور خود..........بیدار کیا تو جھنجھلا کر رہ گئے اور منہ ہاتھ دھو کر آئے اور اس مرتبہ بہت زور سے چلا چلا کر پڑھنا شروع کیا مگر ابھی آواز میں کوئی دل پسند سُر بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ..........یہ تو تھے غنودگی کے نقصاں رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو نماز باجماعت اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھیے

گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں امام صاحب طویل تر سورت پڑھتے ہیں، لہٰذا اگر آپ
مسجد کی صف میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لیے کھڑے ہوگئے تو سمجھ لیجیے کہ توہین ہو کر
رہے گی۔ مثلاً جہاں امام صاحب الحمد شریف سے آگے بڑھے تو آپ کو تمام جسم میں ایک سنسنی
محسوس ہوگی تو آپ ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے اور دوسرے پاؤں کو آرام دیں گے، لیکن
سنسنی بڑھتی جائے گی اور آپ کی گردن خود بخود گریبان کی طرف جھک جائے گی۔ پھر کچھ دیر بعد
آپ نیت باندھے باندھے پاس والے نمازی پر دھڑ ادھڑا............اب اگر اس حالت میں امام
نے رکوع کیا تو آپ کو رکوع کرنا محال سا معلوم ہوگا۔ مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دیں گے مگر
رکوع کے لیے خمیدہ ہونا معدوم۔ اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب امام صاحب ہاتھوں کو
دوسرے سجدہ میں جانے کے لیے جنبش تو دیں گے مگر درمیان ہی میں............پھر سر اٹھا کر کچھ
پڑھنا چاہیں گے............ یہاں تک کہ امام صاحب سجدہ سے سر اٹھائیں گے تو آپ گھبرا کر یا تو
سجدہ میں بغیر امام کے چلے جائیں گے یا نادم ہو کر ایک ہی سجدہ پر قناعت کر لیں گے اور ہمیں تو
نماز باجماعت میں غنودگی کا یہاں تک تجربہ ہے کہ امام صاحب نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا
السلام علیکم ورحمۃ اللہ مگر یہاں قاعدہ آخر ہی میں بیٹھے رہے۔ جب پاس والے نمازی نے کہنی مار
کر بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہوگئی مگر فوراً سبحان اللہ اور الحمد للہ کہہ کر غنودگی کی خفت کو کم کیا جو
ناکام رہی اور اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب چلا کر کہتے تھے کہ جب ایسی ہی نیند آتی ہے تو
جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو؟ اور امراء نے شاید اسی لیے نماز باجماعت ترک کر دی
ہے۔ وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہو اور لوگوں میں گھر کر بیٹھ جایئے اور وعظ کہنے
والے قسمت سے بریلی، بدایوں، مراد آباد یا دیو بند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے
بعد سے غنودگی کا سلسلہ یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے اور لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور کبھی
بند کرنا اختیار کرتے ہیں اور اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں محفل کی روشنی چہرے تک نہیں آتی تو
پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو گریبان کی طرف جھکا دیتی ہے۔ پھر دونوں گھٹنے
کھڑے کر لیے جاتے ہیں اور ان پر دونوں ہاتھ رکھے جاتے ہیں اور اب جیسے ہی گردن جھکائی
کہ............آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر............اس موقع پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے

ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سن رہے ہیں، اونگھتے نہیں ہیں حالانکہ لحہ بہ لحہ............تا آنکہ وعظ ختم ہوگیا لیکن یہاں ہیں کہ............اور اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لیے کوئی دیوار ہاتھ آگئی تو پھر تمام محفل والے اپنے اپنے گھر جا پہنچے، لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیے............آخر کار صاحبِ مکان آتا ہے اور کہتا ہے اٹھیے حضرت تبرک لیجیے، تب کہیں ایک بڑی سی جمائی لے کر لاحول ولا کہتے ہیں اور بادلِ ناخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے۔

ہم کوئی حیدرآباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہلِ قلم تو نہیں ہیں کہ فکرِ معاش سے بالکل آزاد رہ کر دن کی بہترین روشنی میں انشاپردازی فرماتے رہیں بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں دفتر کے ''منشی جی'' اِدھر شب کے ابتدائی حصہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ جب وہ سوجاتے ہیں اور وہ بھی سوجاتی ہیں تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں اور کوئی ایک او پر تیس اخباروں اور سوالوں کے لیے اس وقت مضامین تیار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ شب بیداری سے خدا معاف کرے صبح کی نماز............مگر اس کو کیا کیجیے کہ دین و دنیا کی وجہ نجات محترمہ والدہ صاحبہ اذانوں کے وقت سے اٹھانا شروع کردیتی ہیں۔ اِدھر ممدوحہ کا اثر اور رعب اس قدر ہے کہ چوں نہیں کرسکتے۔ جہاں ممدوحہ نے آواز دی ''بھیا!'' اور ہم فوراً جی بہت اچھا کہہ کر چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں مل کر دیکھا کہ اماں بی کدھر ہیں۔ اگر وہ اپنے کمرے میں نماز کے لیے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے ہمیں آلیا اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رُخ کیا اور درمیان ہی میں............

مگر اماں بی بھی خوب جانتی ہیں کہ ہم آدھ گھنٹہ تک اونگھتے رہتے ہیں، اس لیے وہ بھی آوازوں کا تار باندھ دیتی ہیں۔ جہاں ہمیں دیکھا کہ ہم............کہ انھوں فوراً کہا ہوں اور ہم فوراً تیزی سے ہوشیار تو ہوگئے مگر پھر............اب چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکائے، مگر آنکھیں بند اور............کہ پھر انھوں نے پکارا بھیا سورج نکلنے والا ہے۔ اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھ کر جھومنا شروع کیا کہ پھر بھیا! اور ہم فوراً سنبھل گئے۔ ایک مرتبہ منہ پر ہاتھ پھیرا۔ کبھی داڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر............ یہاں تک کہ اب ننھے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا بھی لاکر رکھ دیا تو ہم نے انھیں بہت غصہ سے دیکھا مگر انھوں نے اماں بی کو سنانے کے لیے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا اُٹھتے کیوں نہیں ہو، بیٹھے اونگھ رہے ہو۔ وہ تو یہ کہہ کر کمرے میں بھاگ گئیں اور ہم جھنجھلا کر لوٹا ہاتھ میں

لیے گھر کے ''میونسپل بورڈ'' کی طرف چلے۔اب حسب دستور عام صبح چونکہ یہ گھر کے ''میونسپل بورڈ'' میں حاجت مندوں کی کثرت ہوا کرتی ہے لہٰذا اگر اندر سے کسی کے کھانسی کی آواز آ گئی تو ہم وہیں لوٹا ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے اور لگے............ یہاں تک کہ خاصی صبح ہو گئی اور ہم............ غرض دعا ہے کہ خدا صبح کی غنودگی سے ہر شریف آدمی کو بچائے۔اگر دہلی کے بڑے حکیم جی اس کا کوئی نسخہ تجویز فرمائیں تو ایک بوتل کے خریدار ہم بھی............

◆◆◆

دردِ دل

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

فارسی زبان میں یہ مرض اس طرح ہوتا ہے کہ اگر کسی حکیم سے علاج کے خیال سے اس کا تذکرہ بھی کردیا جائے تو مریض کی زبان جل جاتی ہے اور اگر اس کا تذکرہ نہ کیا جائے اور اس کی تکلیف کو برداشت کرنے کا ارادہ کیجیے تو اس سے ہڈیوں کے اندر والے گودے تک کے جل جانے کا ڈر پیدا ہوتا ہے۔

مگر زبانِ اردو میں یہ مرض اکثر اوقات نہایت مزا دیتا ہے۔ البتہ اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں کافی سے زیادہ الٹا پن پایا جاتا ہے یعنی حکیموں کے خیال میں تو یہ مرض بھی عام صحت کی کمزوری اور مزاج کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتا ہے اور خصوصیت سے اس 1933 عیسوی کے زمانے کے نوجوانوں کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس کی پیدائش کی جگہ انگریزی زبان کے مدرسے کالج اور بورڈنگ ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے علاج میں، حکیم عامل کریم الدین لاہوری، پیر جی عامل لکھنوی اور دوسرے پیروں، ولیوں، صوفیوں، قطبوں اور تعویذوں کو بڑا دخل ہے، مگر اصل یہ ہے کہ یہ مرض عقل کی بلندی، احساس کی تیزی اور علم و فضل کی صحیح روشنی سے زیادہ پیدا ہوتا

ہے۔ مسلمانوں میں جب سے علوم اسلام کی تعلیم کو ترک کر کے انگریزوں سے بات چیت کرنے کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اس وقت سے خصوصیت سے یہ مرض مسلمان دولت مندوں میں زیادہ پھیل گیا یہاں تک کہ ان ہندستانی دولت مندوں کے علاج کے لیے یورپ کے ہر شہر میں اس کے شفاخانے بنانے پڑے خاص کر ان کا علاج لندن اور پیرس میں بڑی خوبصورتی سے ہوتا ہے۔

مسلمان سیٹھوں اور مہاجنوں میں علوم کی کمی کے باعث عقل سلیم ہمیشہ کم ہوتی ہے مگر دوسروں کی کمائی کا روپیہ ان کے قبضہ میں کافی ہوتا ہے، جسے یہ طبقہ اپنے باپ دادا کی جائیداد سمجھ کر خرچ کرتا ہے۔ پس دولت کی اس کثرت سے انھیں یہ مرض لاحق ہوتا ہے بلکہ اکثر انھیں لاحق نہیں ہوتا تو ''لاحق کرایا جاتا ہے''۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ ان مہاجنوں کے پاس ایسے کم نصیب لوگ ملازم رہتے ہیں جنھیں بغیر ملازمت کے روٹی نہیں مل سکتی پس یہ اپنی روٹی، کوٹھی اور موٹر کی خاطر اپنے آقا کے دل کے بالکل بیچ میں یہ درد پیدا کرادیتے ہیں اس طرح کہ انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے حسن کے برابر شاید ہی کسی دوسرے کو حسن ملا ہو وہ دیکھیے نا کہ لندن کے اخبار اور فوٹو گرافر حضور کے فوٹو کے لیے اس دن کس بےخودی کے ساتھ آپ کا موٹر گھیرے ہوئے تھے اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ اس نے آپ کو سوائے ہوٹل پیرس میں دعوت بھی تو دی تھی اور واللہ تاجر صاحب وہ بھی اپنے وقت کی ''ملکۂ جمال ہے'' بس اتنے تذکرہ سے حضور کے دل میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں تو اس سے خط و کتابت، تار بازی اور پیغام بروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس پر غریبوں کی آمدنی کے ہزاروں روپیہ بے دریغ خرچ کر دیے جاتے ہیں، لیکن مرض میں افاقہ کے عوض زیادتی ہوتی ہے تو پھر ملازمین میں سے بعض لوگ ان کے ''خفیہ کارکن'' بن جاتے ہیں جن میں اچھے اچھے بی۔اے اور ایم۔اے پاس ہوتے ہیں مگر محض دولت کمانے کی خاطر یہ لوگ ان مہاجنوں کے اس مرض کے علاج کے لیے ذلیل سے ذلیل حرکات پر اتر آتے ہیں۔

اِدھر تو یہ ہوتا ہے کہ مریض دردِ دل کی اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں اعلیٰ درجہ کی مسہری پر اعلیٰ درجہ کے بجلی کے پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں بیٹھے اس درد کی یاد میں ہارمونیم اور فونوگراف باجے

بجاتے رہتے ہیں اور اُدھر جب اس درد دل کو یقین آ جاتا ہے کہ فلاں دولت مند میرے خیال میں مبتلا ہو چکا ہے تو پھر وہ بھی لندن پیرس اور بنارس کی تمام نقاشیوں کو صرف کر کے ان کے درد میں اضافہ کرنے پر تُل جاتی ہے۔ اس درد کا پہلا دورہ یوں پڑتا ہے کہ دولت مند صاحب غریبوں کی کمائی کے کئی ہزار روپیہ نقد لے کر اپنے ضمیر اور عزت فردش خدام کے ساتھ وطن سے بغرض تبدیل آب وہوا اسی شہر میں جا کر مقیم ہو جاتے ہیں جہاں ان کی درد دل رہتی ہیں۔ پھر قیام بھی وائسرائے کی شان کے ہوٹل میں ہوتا ہے۔ اور اب ہوٹل والوں سے لے کر اس شہر کے بھنگیوں، دھوبیوں، نائیوں اور قلیوں تک پر خوب خوب روپیہ برسایا جاتا ہے تا کہ ان کی ''درد دل'' کو معلوم ہو جائے کہ ان کا مریض بڑی شان والا ہے، پس ان کی اس حرکت سے اس شہر کے لُچے، شہدے، مگر فیشن ایبل بدمعاش ان کی بیمار داری کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور دولت مند مریض صاحب ان کے ہر جھانسے میں بخوشی پھنس جاتے ہیں محض اس لیے کہ غریبوں کی کمائی کی خاص رقم ان کے بکس میں موجود رہتی ہے، پس یہاں سے مریض اور درد دل کے درمیان، شاندار پیغام بازی شروع ہو جاتی ہے، جس میں قسم اول کے موٹر کاریں دوڑتے ہیں کہ جس میں آپ کو صحیح وسلامت گزرنا محال ہو جاتا ہے۔ اس پیغام بازی میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ انگریزی لباس میں رہتے ہیں اور ان کے پاس بے شمار نوٹ اور ریوالور بھی رہتے ہیں۔ جب یہ ہوتا ہے تو درد دل بھی نہایت آراستہ پیراستہ ہو کر کوٹھے پر نظر آنے لگتی ہیں کیونکہ اکثر ہندستانی دولت مندوں کی درد دل دہلی کے چاوڑی بازار، آگرہ کے کناری بازار، لاہور کے ہٹی بازار اور بمبئی کی سفید گلی ہی میں رہنے والی ہوتی ہیں اور بعض کی لندن یا پیرس میں اور حال ہی میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ملک اٹلی کی پیداوار میں بھی یہ تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔

غرض آپ تو رات کے وقت بھی چاوڑی بازار سے گزرنا ایشیائی اور اسلامی حیا و تہذیب کے خلاف سمجھیں گے مگر ان مریضوں کے موٹر کار اس بازار میں دن کے وقت بھی کھڑے ہوئے پائے گئے ہیں۔ اب جب لاکھوں روپیہ کے قریب درد دل خرچ فرمالیتی ہیں تو پھر مریض کی درد دل صاحب سے ہلکی سی رسم و رواہ شروع ہوتی ہے مگر اتنے عرصہ میں پیغامبر لوگ، تار کے ذریعہ مریض کے وطن سے پھر لاکھ سوا لاکھ روپیہ منگا لیتے ہیں اور پھر علاج شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاج

ہے۔ مسلمانوں میں جب سے علوم اسلام کی تعلیم کو ترک کر کے انگریزوں سے بات چیت کرنے کے لیے انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اس وقت سے خصوصیت سے یہ مرض مسلمان دولت مندوں میں زیادہ پھیل گیا یہاں تک کہ ان ہندستانی دولت مندوں کے علاج کے لیے یورپ کے ہر شہر میں اس کے شفاخانے بنانے پڑے خاص کر ان کا علاج لندن اور پیرس میں بڑی خوبصورتی سے ہوتا ہے۔

مسلمان سیٹھوں اور مہاجنوں میں علوم کی کمی کے باعث عقل سلیم ہمیشہ کم ہوتی ہے مگر دوسروں کی کمائی کا روپیہ ان کے قبضہ میں کافی ہوتا ہے، جسے یہ طبقہ اپنے باپ دادا کی جائیداد سمجھ کر خرچ کرتا ہے۔ پس دولت کی اس کثرت سے انھیں یہ مرض لاحق ہوتا ہے بلکہ اکثر انھیں لاحق نہیں ہوتا تو ''لاحق کرایا جاتا ہے''۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ ان مہاجنوں کے پاس ایسے کم نصیب لوگ ملازم رہتے ہیں جنھیں بغیر ملازمت کے روٹی نہیں مل سکتی پس یہ اپنی روٹی، کوٹھی اور موٹر کی خاطر اپنے آقا کے دل کے بالکل بیچ میں یہ درد پیدا کرا دیتے ہیں اس طرح کہ انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے حسن کے برابر شاید ہی کسی دوسرے کو حسن ملا ہو وہ دیکھیے تا کہ لندن کے اخبار اور فوٹو گرافر حضور کے فوٹو کے لیے اس دن کس بے خودی کے ساتھ آپ کا موٹر گھیرے ہوئے تھے اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ اس نے آپ کو سوائے ہوٹل پیرس میں دعوت بھی تو دی تھی اور واللہ تاجر صاحب وہ بھی اپنے وقت کی ''ملکۂ جمال ہے'' بس اتنے تذکرہ سے حضور کے دل میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں تو اس سے خط و کتابت، تار بازی اور پیغام بروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس پر غریبوں کی آمدنی کے ہزاروں روپیہ بے دریغ خرچ کر دیے جاتے ہیں، لیکن مرض میں افاقہ کے عوض زیادتی ہوتی ہے تو پھر ملازمین میں سے بعض لوگ ان کے ''خفیہ کارکن'' بن جاتے ہیں جن میں اچھے اچھے بی۔اے اور ایم۔اے پاس ہوتے ہیں مگر محض دولت کمانے کی خاطر یہ لوگ ان مہاجنوں کے اس مرض کے علاج کے لیے ذلیل سے ذلیل حرکات پر اتر آتے ہیں۔

اِدھر تو یہ ہوتا ہے کہ مریض درد دل کی اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں اعلیٰ درجہ کی مسہری پر اعلیٰ درجہ کے بجلی کے پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں بیٹھے اس درد کی یاد میں ہارمونیم اور فونوگراف باجے

بجاتے رہتے ہیں اور اُدھر جب اس درِ دل کو یقین آجاتا ہے کہ فلاں دولت مند میرے خیال میں مبتلا ہو چکا ہے تو پھر وہ بھی لندن پیرس اور بنارس کی تمام نقاشیوں کو صرف کر کے ان کے درد میں اضافہ کرنے پر تُل جاتی ہے۔ اس درد کا پہلا دورہ یوں پڑتا ہے کہ دولت مند صاحب غریبوں کی کمائی کے کئی ہزار روپیہ نقد لے کر اپنے ضمیر اور عزت فروش خدام کے ساتھ وطن سے بغرض تبدیل آب وہوا اسی شہر میں جا کر مقیم ہو جاتے ہیں جہاں ان کی درِ دل رہتی ہیں۔ پھر قیام بھی وائسرائے کی شان کے ہوٹل میں ہوتا ہے۔ اور اب ہوٹل والوں سے لے کر اس شہر کے بھنگیوں، دھوبیوں، نائیوں اور قلیوں تک پر خوب خوب روپیہ برسایا جاتا ہے تاکہ ان کی ''درِ دل'' کو معلوم ہو جائے کہ ان کا مریض بڑی شان والا ہے، پس ان کی اس حرکت سے اس شہر کے لُچّے، شہدے، مگر فیشن ایبل بدمعاش ان کی بیمار داری کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور دولت مند مریض صاحب ان کے ہر جھانسے میں بخوشی پھنس جاتے ہیں محض اس لیے کہ غریبوں کی کمائی کی خاص رقم ان کے بکس میں موجود رہتی ہے، پس یہاں سے مریض اور درِ دل کے درمیان، شاندار پیغام بازی شروع ہو جاتی ہے جس میں قسم اول کے موٹر کاریوں دوڑتے ہیں کہ جس میں آپ کو صحیح وسلامت گزرنا محال ہو جاتا ہے۔ اس پیغام بازی میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ انگریزی لباس میں رہتے ہیں اور ان کے پاس بے شمار نوٹ اور ریوالور بھی رہتے ہیں۔ جب یہ ہوتا ہے تو درِ دل بھی نہایت آراستہ پیراستہ ہو کر کوٹھے پر نظر آنے لگتی ہیں کیونکہ اکثر ہندستانی دولت مندوں کی درِ دل دہلی کے چاوڑی بازار، آگرہ کے کناری بازار، لاہور کے ہٹی بازار اور بمبئی کی سفید گلی ہی میں رہنے والی ہوتی ہیں اور بعض کی لندن یا پیرس میں اور حال ہی میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ملک اٹلی کی پیداوار میں بھی یہ تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔

غرض آپ تو رات کے وقت بھی چاوڑی بازار سے گزرنا ایشیائی اور اسلامی حیا وتہذیب کے خلاف سمجھیں گے مگر ان مریضوں کے موٹر کار اس بازار میں دن کے وقت بھی کھڑے ہوئے پائے گئے ہیں۔ اب جب لاکھوں روپیہ کے قریب درِ دل خرچ فرما لیتی ہیں تو پھر مریض کی درِ دل صاحب سے ہلکی سی رسم وراہ شروع ہوتی ہے مگر اتنے عرصہ میں پیغامبر لوگ، تار کے ذریعہ مریض کے وطن سے پھر لاکھ سوا لاکھ روپیہ منگا لیتے ہیں اور پھر علاج شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاج

میں عورتوں کی برہنہ تصادیر، گراموفون، باجہ، داغ دکانو میر دکان کی عاشقانہ غزلیں، رنڈیوں کا ناچ گانا، اردو کے رسالوں کے عریاں افسانے اکسیر اعظم کا کام دیتے ہیں اور مریض کو خاصا افاقہ ہوتا رہتا ہے، مگر درد دل بالکل ہی نہیں جاتا بلکہ مریض کی حالت اندر ہی اندر خراب ہوتی جاتی ہے۔ اِدھر تو یہ علاج دہلی، لاہور، آگرہ اور بمبئی میں ہوتا رہتا ہے اور اُدھر مریض کی بیوی کو اس مرض کا علم ہوتے ہی دق کا مرض پکڑ لیتا ہے جس سے نجات کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو یہ بیوی خدا گنج کا راستہ اختیار کرتی ہے یا پھر وہ بھی کسی ڈرائیور یا گھر کے ملازم کو اپنا درد دل بنا کر بیمار ہو جاتی ہے اور اچھی بھی ہو جاتی ہے۔

اس مرض پر جب درد دل کے دورے پڑتے ہیں تو وہ بجائے یا خدا یا اللہ کہنے کے عاشقانہ اشعار پڑھتا ہے، ناولیں اور افسانے دیکھتا ہے یا سنتا ہے یا پھر غریبوں کی کمائی کے روپیہ سے ایک ایک دن میں دس دس مرتبہ اعلیٰ درجہ کے کپڑے بدل کر ایک اعلیٰ درجہ کے موٹر میں بیٹھ کر اپنے درد دل کی کوٹھی یا کوٹھے کے آس پاس چکر لگاتا رہتا ہے، تب اسے سکون ہوتا ہے یا پھر اپنے درد دل کے لیے ہزاروں روپیہ کے ولایتی زیور، کپڑے، پھل اور وغیرہ وغیرہ بھیجنے میں مصروف رہتا ہے تب اسے قدرے سکون ہوتا ہے اور اس عرصہ میں پھر تار کے ذریعہ وطن سے ہزاروں روپیہ منگا لیتا ہے۔

اول تو اس مریض کا جسم بھی نہایت ہٹا کٹا اور تندرست رہتا ہے لیکن پھر بھی رات اسے نیند نہیں آتی تو یہ مریض اس شعر کو زیادہ پڑھتا رہتا ہے:

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد سا پیدا ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

اس مریض کو پرہیز میں یہ چیزیں بتائی جاتی ہیں کہ اس مرض کی اطلاع گھر بھر میں کسی کو نہ ہو، وطن والوں کو معلوم نہ ہونے پائے خصوصاً ماں باپ کو، بیوی سے ہمیشہ علاحدہ رہا جائے اور اگر وہ خود بے غیرت بن کر پاس آ جائے تو اس سے اس درجہ غصے یا افسردگی سے بات کی جائے کہ پھر اسے دوبارہ پاس آنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اپنے ذمہ کا کوئی ایک کام خود نہ کیا جائے بلکہ سارا کاروبار نوکروں پر چھوڑ دیا جائے اور خود درد دل کی یاد میں مسہری پر پڑا رہنا چاہیے۔

جب اس درد کے متعدد دورے پڑ جاتے ہیں تو پھر مریض کے کارکن بی۔اے پاس اسے حکیموں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کے ہاں ایسے مریضوں سے ملنے، ان کے قیام کرنے، ان سے راز میں مرض کی تفصیل سننے کے لیے نہایت شاندار کوٹھیاں اور کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس قسم کے مریضوں کے لیے ان حکیموں کے ہاں دوائیں بھی اتنی قیمتی تیار ہونے لگی ہیں کہ ایک تولہ کی قیمت سے آدمی دہلی خریدی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ان مریضوں کے حکیم ریل کے فرسٹ کلاسوں میں بلائے جاتے ہیں ورنہ ہمارے آپ کے زمانے میں بڑے بڑے حکیم لوگ بے چارے کھانستے ہوئے یا پیدل یا فینس میں آیا جایا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی دوا ٹکے ڈیڑھ ٹکے کی بتا جاتے تھے، مگر جب سے اس قسم کے مریضوں کی کثرت ہوئی ہے اس وقت سے ان بوڑھے سے بوڑھے حکیموں کے گالوں پر گوشت اور سرخی اتنی زیادہ ہوگئی کہ دیکھیے اور حکیم صاحب کی آمدنی کی مقدار کو سمجھ جائیے اور مشہور یہ ہو رہا ہے کہ "دیسی طب" ترقی کر رہی ہے۔

القصہ اس قسم کے مریض کی حالت اس وقت نہایت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ جب اس کی دردِ دل لاکھوں روپیہ کا صفایا بول کر فرار یا ناراض ہو کر کسی فلم کمپنی کی مالک بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس وقت شہر بمبئی یا شہر میرٹھ میں ریوالوروں کے ذریعے دو چار صدقے کے بکرے چڑھائے جاتے ہیں اور بیوقوف لوگ اُڑا دیتے ہیں کہ "قتل ہو گیا"۔

ان مریضوں کے بعد دوسرے قسم کے مریض آج کل کے انگریزی طلبا ہوتے ہیں جنھیں چھٹی ساتویں جماعت ہی سے یہ درد پکڑ لیتا ہے جس کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ مریض ہر سال امتحان میں ناکام رہنے لگتا ہے۔ دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی ہر کاپی پر عشقیہ غزلیں اور اشعار نقل کیے ہوئے ملتے ہیں۔ اس مریض کی دوا اکثر گرلز اسکولوں کے قریب ملتی ہے یا پھر اسی کی جماعت میں ہوتی ہے۔ بس اس مرض کے پیدا ہوتے ہی لڑکے کی حالت کم عمری کے باعث اتنی زیادہ خراب ہو جاتی ہے کہ محلے والے تک سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بے چارا دردِ دل میں مبتلا ہو گیا ہے۔ پس یہ مریض اس درد سے شفا پانے کے لیے پرانے رنگ کے مولویوں اور جاہلوں کے بتائے ہوئے عمل زیادہ استعمال کرتا ہے۔ جب دیکھو کمرے میں بیٹھا کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھ رہا ہے اور نام

یہ کہ امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کے درد دل کو اس کے ساتھ کے طلبا بہت جلد تاڑ جاتے ہیں اور دن بھر اس کا نام لے کر اسے چڑاتے پھرتے ہیں۔ یہ مریض اکثر اشتہاری تعویذ اور عمل زیادہ خریدتا ہے۔ اس کے پاس حکیموں اور یونانی شفاخانوں کی فہرستیں بھی زیادہ ملتی ہیں۔ ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر بن جاتا ہے اور رسالے والے اس کی عشقیہ غزلوں سے تنگ آجاتے ہیں اور اگر اس میں کا کوئی مضمون بن جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے ٹیگور کے رنگ کے مضامین لکھتا ہے اور رسالہ ''نگار لکھنؤ'' کے مضامین کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کا درد دل جہاں رہتا ہے یا رہتی ہے یہ اس کے مکان کے پاس زیادہ گھومتا ہے، مگر اسے مارے درد کے کسی طرح چین نہیں آتا۔ بے ذریعہ ہونے کے باعث اس کے درد دل کو اکثر خبر بھی نہیں ہوتی کہ فلاں طالب علم درد میں مبتلا ہے۔ اسی طرح یہ کم عمری کے باعث اس درد کے اظہار میں ذرا شرماتا بھی ہے مگر جب اس پر زور و شور کا دورہ پڑتا ہے تو اس کی بدحواسی اور پریشانی سے اس کے ساتھی لڑکے اور اس کے ماں باپ تاڑ جاتے ہیں مگر ہمدردی یوں کرتے ہیں کہ سب طرف سے اسے گدھا، بے وقوف، احمق، الو، خبطی، آوارہ، بدچلن اور بدکردار کہا جاتا ہے، مگر یہ نمازیں اور وظیفے پڑھ پڑھ کر چیختا ہی رہتا ہے۔

اس درد کی شدت کی ایک خاص علامت یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی درد دل کی تصویر کو ہر لحہ اپنی جیب، اپنی گھڑی یا اپنی کتاب میں رکھتا ہے اور درد دل کے نام کے مخفف حروف کو اپنے ہاتھ پر نیلی روشنائی سے لکھ لیتا ہے۔ بعض طلبا اس نام کو ہاتھ کے چہرے میں پیوست کرنے کے لیے آگ سے جلا دیتے ہیں۔ اس قسم کے مریض درد کی شدت سے آوارہ اور واہی تباہی بھی ہوجایا کرتے ہیں۔ خصوصیت سے تعلیم کا سلسلہ برباد ہوجاتا ہے۔ اخلاقاً تو یہ نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے، مگر درد کا نتیجہ بھی بہت جلد برآمد ہوجاتا ہے، جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ درد دل چند برس بعد خود ہی کافور ہوجاتا ہے، ایسا کہ پھر قسم کھانے کے قابل بھی باقی نہیں رہتا یا پھر افلاس، کم علمی اور حماقت کی کثرت سے ریل کے سامنے لیٹ کر، کنویں میں گر کر، افیون کھا کر یا کوئی انگریزی زہر کھا کر ختم ہوجاتے ہیں اور پولیس والے حسد اور رشوت نہ ملنے کے باعث مشہور کردیتے ہیں کہ فلاں لڑکے نے خودکشی کرلی اور جیب سے ایک خط بھی برآمد ہوا۔

ان اقسام کے بعد اس درد کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جس کے مریض کو مریض کہنے کے عوض مریضہ کہتے ہیں اور اسی میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ اس مریضہ کو یہ درد 13 برس کی عمر سے لاحق ہوتا ہے اور اس مرض کا حملہ یا آغاز خود مریضہ کے حسن و جمال سے ہوتا ہے۔ پھر آج کل کے فینسی لباس، کلب، ٹھنڈی سڑک، سینما، اردو کے رسالوں کی تصاویر اور عشقیہ مضامین سے، اور ہاں اشعار سے بھی اور ہاں اسکولوں سے بھی، اور کالجوں سے بھی، غرض جب اس کی ابتدا ہوتی ہے تو مریضہ پہلے تو اسے ضبط کرتی ہے، مگر موجودہ زمانے میں مشرقی علوم و آداب کی تباہی کے باعث اسے زیادہ حیا اور شرم سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ اس درد کے پیدا ہونے کے اکثر اسباب اور مواقع آج کل کے فیشن ایبل ماں باپ اور بھائی ہی جمع کر دیتے ہیں۔ پس مریضہ فوراً ہی اپنے دردِ دل کو خط لکھتی ہے جس کی ابتدا بڑی نیک خیالی سے ہوتی ہے مگر انتہا اکثر شفایابی پر ہوتی ہے۔ ''رفتہ رفتہ بہم شود درماں'' کے قاعدے سے یہ اپنے دردِ دل کو خود ہی پا لیتی ہے۔ جب اُسے اس درد کا دورہ پڑتا ہے تو ہارمونیم اور فوٹوگراف سے دل بہلاتی ہے، پھر تصویر سے پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے سر کے بالوں اور چہرہ کی آرائش سے پھر رسالوں کے عشقیہ مضامین سے۔ دوسرے دورہ پر یہ خود شاعر ہو جاتی ہے یا مضمون نگار.......... یورپ میں تو ایسی مریضہ کو حق دیا گیا ہے کہ اسے جس وقت بھی یہ درد شروع ہو وہ آزادی سے چلائے چیخے اور تڑپے اور آہ کرے مگر ہندستان میں بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس اسی رفتار سے پیدا ہوتے رہے تو کم از کم دس برس اس مریضہ کو ضبط کی تکلیف ہوگی اور دس برس بعد یہاں بھی ایسی مریضہ آزادی سے چلا سکے گی کہ ''ہائے رے مری''۔ پہلے زمانے میں اس مرض کی مریضہ روز بروز گھلتی جاتی تھی اور تپ دق میں مبتلا ہو جاتی تھی مگر اس زمانے کی مریضہ اس درد کے دورہ سے زیادہ خوش ہوتی ہے۔ ہر وقت مست اور مخمور سی نظر آتی ہے۔ شوخیاں اور اٹکھیلیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ساری سہیلیوں میں سب سے زیادہ تیز باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر کھلکھلاتی ہے اور جب درد کی شدت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو گھر بار چھوڑ چھاڑ کہیں چلی جاتی ہے اور شہر کے مخالف مشہور کر دیتے ہیں کہ ''فرار ہو گئی'' یا ''اغوا''۔ کہیں کہیں افیون کھا کر یا کپڑوں میں آگ لگا کر اس کا علاج کر لیتی ہے، مگر بہت کم۔

اب وہ جو اوپر کہا تھا کہ یہ مرض اصل میں عقل کی بلندی، احساس کی تیزی اور علم وفضل کی لاجواب صلاحیت سے بھی پیدا ہوتا ہے تو اس کی بہترین مثالیں تو یہ لوگ ہیں۔
رئیس اعظم غازی مصطفیٰ کمال پاشا، ہز مجسٹی رضا پہلوی شاہ ایران، سلطان المعظم غازی عبدالعزیز ابن سعود شاہ نجد وحجاز، رئیس اعلیٰ غازی احمد اسکندر زغو پاشا شاہ البانیہ۔ یعنی ان لوگوں کا درد دل بس یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی قوم اور سلطنت کو جب غیر قومی لوگوں کے اثر میں پاتے تھے تو مارے درد کے بے چین ہو جاتے تھے اور اب جو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو گویا ان کا درد دل جاتا رہا اور انھیں غسل صحت نصیب ہو گیا۔
دوسرے درجہ میں یہ درد ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے نام مولانا محمد علی علیہ الرحمہ، مولانا ظفر علی خاں، مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، مفتی محمد کفایت اللہ مفتی اعظم ہند ہیں۔ اور تیسرے درجہ میں یہ درد ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کے نام خواجہ حسن نظامی، مولوی راشد الخیری دہلوی اور ملا رموزی ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا درد تو فریدوں فر آصف جاہ نظام دکن کی اردو نواز فیاضیوں سے کافی حد تک کم ہو جاتا ہے اور دوسرے کا درد رسالہ ''عصمت'' کے ذریعہ کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی معتدل۔ اب رہے ملا رموزی تو ان کے اس درد دل کا یہ عالم ہے کہ یہ حضرت ایسی منحوس گھڑی سے اس درد میں مبتلا ہوئے کہ پندرہ برس سے یہ کسی طرح کم ہی نہیں ہوتا۔ ان کے درد کا دوسرا نام مضمون نگاری ہے۔ پس ان حضرت کی خطا یہ ہے کہ انھوں نے مضمون نگاری کا ایک ایسا حصہ اپنے ذمہ لے لیا جس کے ذریعہ رونے والوں کو ہنسایا جاتا ہے اور غم والم میں مبتلا مریضوں کو شفا کامل دی جاتی ہے۔
مگر خود ان کا علاج یوں ہوا کہ جب تک ملا رموزی لطافت افروز مضمون نگاری کرتے رہے تو کمانے کی پابندیوں میں اس طرح جکڑے رہے کہ کامل دس برس انھیں دن کی روشنی لکھنے کو نصیب نہ ہوئی۔ اس سے ان پر درد دل کے شدید دورے پڑے اور وہ خاصے چیخے چلائے مگر ان کی غیرت مند قوم نے ان کی ایک نہ سنی۔ اس کے بعد ملا رموزی کا یہ درد دل جب اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تو انھوں نے تالیف وتصنیف کا وہ دماغ سوز مشغلہ شروع کیا جس میں معاش ومعاد

کی فکروں سے کامل نجات حاصل ہونا شرطِ اول ہوتی ہے، مگر جیسے ہی کہ انھوں نے اپنی سب سے بلند اور سب سے پہلی کتاب ''عورت ذات'' شائع کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی آمدنی خطروں میں گھر گئی۔ پھر جب انھوں نے اپنی دوسری کتاب ''لاٹھی اور بھینس'' تیار کی تو ان کے مضامین کے معاوضوں نے بھی انھیں جواب دے دیا کیونکہ اب تالیف وتصنیف کرتے یا مختلف مضامین لکھتے۔ پس اس درد سے وہ پھر چلائے تو ان کی بیدار، روشن خیال، ایم۔اے پاس مگر زبانِ اردو کی دشمن قوم کے ہزاروں افراد میں سے جتنے آدمیوں نے ان کی دوا کے لیے جتنے دام دیےاسے وہ اپنی کتاب ''لاٹھی اور بھینس'' میں چھاپ چکے، مگر اب بھی جو یہ درد کم نہ ہوا تو انھوں نے پھر یہ مجموعہ تیار کیا.........فالحمدللّٰه علیٰ کلِ حالٍ.

لیکن مجھے اگر یہ درد ملا تھا کہ میں اپنی مصیبتوں کی ماری ہوئی قوم کو اپنی لطیف وظریف تحریروں سے ہنسا کر جوان بناؤں، میں اپنی تحریروں سے زبانِ اردو میں ادبِ لطیف اور تحریر کو ایک شگفتہ اور جوان ذخیرہ جمع کردوں تو اس کا لازمہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں کسی کی ملازمت نہ کروں کہ ایسا کرنے سے مجھے مضامین لکھنے کا وقت نہ ملے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ میں نے دانستہ طور پر ترکِ ملازمت کرکے اپنے بے گناہ دس متعلقین کو بھوک پیاس کے عذاب میں مبتلا کردیا اور فخر کرتا ہوں کہ اپنے ان جواں ہمت متعلقین کے صبر وحوصلہ پر کہ ان سب نے میری اس دیوانگی پر بھی مجھے کچھ نہ کہا مگر کیا میری ان قربانیوں کا یہ صلہ قوم کے ذمہ عائد نہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنا سب کچھ میرے لیے وقف کردیتی مگر کتاب ''عورت ذات'' ایسی کتاب صرف عورتوں کے فائدے اور ان کے حق میں لکھی اور سنتا تھا کہ مرد کے مقابل عورت زیادہ نرم دل اور قدردان ہوتی ہے مگر اس کتاب میں اپنی تمام مصیبتوں کو بیان کرکے جو درخواست کی تو صلہ یہ پایا کہ............اس کے بعد کتاب ''لاٹھی اور بھینس'' بھی عورتوں ہی کے لیے لکھی اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ اپنی مصیبتوں کو بیان کیا تو پہلا ہی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کتاب کلہم (144) کی تعداد میں خریدی گئی مالی امداد کا تو ذکر کیا۔ اور اب جو یہ کتاب لکھ رہا ہوں تو دل جانتا ہے کہ مالی مشکلات کے کس ایمان آزما دور سے گزر رہا ہوں یعنی حد ہے کہ مہینہ بھر اپنی کتابیں فروخت کرتا ہوں اور ان کی

آمدنی جمع ہونے کے عوض ماہوار گزارہ اور ذریعہ معاش بن جاتی ہے اور ایک ذی مرتبہ شاہی خاندان کی ہمدردی نہ ہوتی تو اس کتاب کا حوصلہ بھی فنا ہو چکا تھا۔

پس ان حالات میں اب ایک ہی چیز رہی ہے یعنی میں اس سلسلہ کو یک لخت ترک کر دوں............اور بس۔ سن لیجیے کہ جب تک یہ بات مانی جا رہی ہے کہ عرش و فرش کا غداہر پستی کو بلندی اور ہر کمزوری کو قوت بنا سکتا ہے اور یاس کو کامیاب امید اس وقت تک میں حوصلہ نہ ہاروں گا اور محض اسی کی نوازش کے سہارے کیونکہ آپ نے تو جو کچھ کیا اسے میں نے اوپر کی سطروں میں دکھا دیا............

بھلا حد ہے اس اوندھی ذہنیت کی کہ آج ذاتی عقل و ایجاد تو ہندستانیوں میں قسم کھانے کو بھی نہیں۔ اب یورپ سے جو کچھ سیکھتے بھی ہیں تو وہ بھی اوندھا۔ مثلاً یورپ سے ہندستانیوں نے ''مشاہیر پرستی'' سیکھی تو صرف اس طرح کہ ''دیوانِ غالب'' کو ہزار رنگ سے چھپوا کر اس کی آمدنی خود کھا بیٹھے لیکن غالب کی قبر میں اس آمدنی سے نہ ایک سنگ مرمر لگایا نہ ایک اینٹ۔

پھر غالب مرحوم کے کلام پر جتنے بڑے بڑے دماغوں نے مضامین لکھے اگر ان سے نصف بھی کسی زندہ شاعر اور ادیب کے لیے لکھے جاتے تو وہ زندہ ہونے کے باعث ان مضامین سے اور زیادہ پُر جوش ہو کر کام کرتا، مگر وہ یہ سمجھتے ہی نہیں کہ زندہ لوگوں کا دل بڑھانا زیادہ مفید ہے یا مردہ بھائیوں کے موجودہ ضروریات سے دور کارناموں پر طویل مضامین لکھنا۔ بس انھیں تو اتنا یاد ہے کہ ''مشاہیر پرستی'' ہر حال میں مستحسن ہے۔ یہی تو ہے کہ ''اغلاط غالب'' اور ''متروکات غالب'' حتیٰ کہ غالب کا نشان انگوٹھا بھی مل جائے تو بڑے بڑے رسالے اسے رنگین صفحات میں جگہ دیں گے اور...... ڈاکٹر اقبال دن میں دس دیوان لکھ کر رکھ دیں تو بس وہ ایک شیخ مبارک علی چھاپ کر فروخت کر دیں گے اور وہ بھی چار پانچ سال میں صرف ایک ایڈیشن۔

سب سے بڑی دماغی خوبصورتی تو یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ تو یورپ زدہ ہو کر لندن اور پیرس میں جذب ہو گیا، اسے ملکی زبان اور ملکی ادب کے نام سے وحشت ہوتی ہے، تجارت پیشہ طبقہ تھا جو اپنی دولت مندی سے ملکی ادبیات کو ترقی دے سکتا تھا مگر تجارت پیشہ طبقے میں علمی و ادبی خدام کے لیے اتنی بھی جگہ نہیں کہ آج ملا رموزی مثال ہی کے طور پر رنگون، بمبئی، کلکتے، دہلی اور مدراس

کے کسی سیٹھ صاحب کا تذکرہ کرتا۔

پس جب یہ حال ہو تو اب یہی رہ گیا ہے کہ ملا رموزی مساجد کے اماموں اور جمخانے کے ناظموں سے درخواست کرے کہ خدارا آپ ملا رموزی کی اتنی امداد فرمایئے کہ وہ مشکلات سے آزاد ہو کر زبانِ اردو میں چند نادر نمونے جمع کر دے۔

لیکن اگر یہ ہے کہ امراء و روٴسا، تجار، خواتین، بیگمات اور سرکاری افسروں میں اردو میں شگفتہ بنا دینے والے ذخیرۂ ادب سے ترقی کے نام پر کوئی فیاض جذبہ بیدار ہے تو وہ ملا رموزی کی امداد کریں اور وہ بھی کوئی یونیورسٹی اور کوئی عجائب خانہ تعمیر کرنے کے قابل نہیں بلکہ اس کے ''دائرۂ ادب'' کے لیے تاکہ وہ اس ''مالی درد دل'' سے سکون پائے۔ فقط۔

مُلّا رموزی، بھوپال

◆◆◆

مضامینِ رموزی

مصنفہ

مُلّا رموزی

فہرست

- مقدمہ 355
- طوفان 365
- شیر کا شکار 377
- وفد بارش 405
- ایک سفریہ 415
- شکایت 429
- میں نے پھر تقریر کی 441

مقدمہ

(ایک نجومی کے قلم سے)

ضیاء الملک مُلا رموزی، فاضل الٰہیات، جرنلسٹ، ہندستان کے اُن شہرۂ آفاق ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کے دماغ وقلم کی اچھوتی قابلیتوں اور نادر اختراعات نے ملک وقوم کے نفع کے ساتھ ساتھ زبانِ اردو کو بھی بے مثال ذخائرِ ادب بہم پہنچائے، اس لیے سارے ہندستان میں ایک ممتاز شہرت وعزت رکھنے والے ادیب کے کلام پر لکھنے والے کو بھی کچھ ہونا چاہیے۔

اس لیے میں نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود ملا صاحب سے بعض سوالات کیے، مثلاً:

''بتایئے کہ آپ شعر ومضمون میں اپنے طے کردہ عنوان کے تمام عقلی وفطری اور واقعاتی اجزا اوران کی باریک سے باریک تفصیل کو دماغ میں کس طرح جمع کر لیتے ہیں؟'' وغیرہ۔

چونکہ ملا صاحب کو علم تھا کہ میں علم نجوم سے شغف رکھتا ہوں اس لیے ملا صاحب نے بجائے جوابات کے اپنا پیدائشی زائچہ بھیج دیا جو یہ ہے:
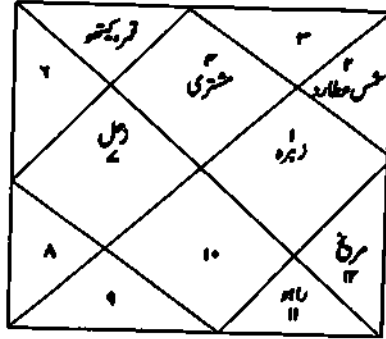
حکمائے نجوم کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی کے نشیب و فراز میں سیاروں کو خدائے جہان آفرین ہی نے تاثیرات عطا فرمائی ہیں اس لیے ان کا حساب صحیح ہے۔

لہٰذا جوتش کی اصطلاح میں ملا صاحب کا یہ بلندیاں اور رنگینیاں لیے ہوئے زائچہ "راج یوگی" زائچہ مانا جاتا ہے۔ مشتری ساسورا کبر ستارہ ان کا طالع ہے جو عقل عالی، جودت، ندرت، نکتہ آفرینی، وسعتِ علم و نظر و فطرت آگاہی، سیادت و سیاست اور نظم مملکت داری کے ارفع و اعلیٰ سلیقے پیش کرتا ہے اور متناسب الاعضاء دُبلا پتلا مگر بلا کا چست و چاق جسم اور حسن نظر، اسی لیے ملا رموزی کا رجحانِ قلم ہمیشہ سیاست رہا ہے، جو گویا ان کا پیدائشی موضوعِ قلم ہے۔

زحل ان کے چوتھے خانہ میں قوی تر ہو کر بیٹھا ہے، اس لیے زمین، مکانات، باغات، خدام، شاہانہ رنگینیاں، حسنِ تقریر اور شدتِ بیان و خطاب نذر کرنے کا ذمہ دار ہے، اسی لیے ملا رموزی کی شاعری، تحریر و تقریر اور گفتگو میں جلال و شدت اور مزاج و نظر میں نخوت و تمکنت موجود ملتی ہے۔

ان کے خانۂ حکومت میں زہرہ ایسا رنگین ستارہ ہے جو شعر و شراب سی خسروانہ لطافتوں سے ربط و رشتہ اور حسنِ کمال کی سرفرازیاں تحفہ لاتا ہے، اسی لیے برسوں نثر کا کام کرتے کرتے اچانک ملا رموزی نے شاعری شروع کی اور غزل کے قدیم اصول و ضوابط کو منسوخ کر کے جن شاہانہ جوانیوں والی غزل کے دو دیوان مرتب کر دیے وہ زبانِ اردو کا لائقِ فخر سرمایہ مانے جائیں گے۔

ان کا مریخ اور آفتاب بھی جوان ہے جو عالمگیر شہرت اور طاقت پہنچانے کے ذمہ دار ہیں، اسی لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ملا رموزی کی دماغی بلندیوں کا مستقبل ابھی اور کتنا بلند و معزز ہوگا؟

ایجاد و ندرت:

فطرتِ انسانی جدت پسند ہے، اردو میں وہی لوگ رتبۂ عالی پا سکے جنھوں نے کسی خاص تحقیق یا اچھوتی صلاحیت کو پیش کیا۔ ملا رموزی بھی ان ہی فاضلِ روزگار ہستیوں میں ہیں جنھوں نے بیان و کلام کے نادر طریقے ایجاد کیے۔ گلابی اردو کا طرزِ تحریر اب ان ہی کی ایجاد کے نام سے منسوب ہو چکا ہے اور وہ اس کے موجد تسلیم کر لیے گئے۔ اس طرزِ خاص کے بعد انھوں نے روزمرہ اور مروجۂ اردو میں لکھنا شروع کیا اور کمالِ قابلیت سے اس طرز کو بھی طرزِ خاص منوا کر چھوڑا، اس کے بعد انھوں نے شعر کی ابتداء کی اور اس شعبۂ ادب میں بھی وہ طرزِ خاص کے امام ہو کر رہے۔

پس ان تمام اسالیب کی روحِ اصل میں ان کے دماغ و نظر کی وہ برقی رو ہے جو ہر مسئلہ کی آخری گہرائی تک اس کمالِ جودت سے پہنچ جاتی ہے کہ ہر صاحبِ بصیرت انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر تحقیق و احساس کی اس ہمہ گیر قوت سے وہ جس چیز کو منظرِ عام پر لاتے ہیں اس کے بیان کا سلیقہ اس درجہ فطری اور لطیف ہوتا ہے کہ پڑھنے والا محوِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتا اور یہ دولت ان کے ہاں اس درجہ بہتات اور کثرت سے ہے گویا کسی اہم سے اہم مسئلہ کو اپنی صحیح اور فطری حیثیت سے بیان کر دینا ان کے لیے دشوار ہی نہیں۔

ندرتِ بیان کا یہ عالم ہے کہ جن باتوں کے بیان کرنے پر قانون و اخلاق کی شدید بندشیں اور سزائیں مقرر ہیں وہ ان ہی چیزوں پر اس اچھوتے انداز سے سب کچھ کہہ گزرتے ہیں کہ قانون اور دشمن بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سیاست ایسے خوفناک موضوع پر تیز تر تبصروں اور طوفانی تنقیدوں میں ملا رموزی ہی کا دماغ خاص ہے۔

ظرافت و سیاست:

ملا رموزی کے ان تبصرہ نگاروں نے بڑی زبردست ٹھوکر کھائی ہے جنھوں نے ملا رموزی کو موجودہ عہد کے دوسرے ظرافت نگاروں کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ مُلا رموزی اپنے طرزِ تحریر اور مضامین کے اعتبار سے ساری اردو دنیا میں سب سے الگ ہیں یعنی اردو میں وہ ایک ''سیاسی مزاح نگار'' ہیں اور اس اعتبار سے ان کا ایک بھی ہمعصر نہیں۔ ملا رموزی نے آنکھ کھولی تو سیاسی ظرافت میں، اور جوان ہوئے تو سیاسی میدان میں ان کے مضامین اور نظمیں غرض جو بھی ہے

سب کچھ سیاسی ہے اور دوسروں کی ظرافت میں صرف تمدنی اور اخلاقی اصلاحی ظرافت۔ اب سیاسی میدان کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ لکھنے والا خود نہایت زیرک، دانشمند، مدبّر اور وسیع العلم ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ قید و بند اور سزا و عقوبت کے برداشت کر لینے کی جرأت رکھتا ہو، لہٰذا اس لحاظ سے ملا رموزی اپنے وقت کے سارے مزاح نگاروں کو اپنے پیچھے چھوڑ چکے ہیں اور وقت کے وہی سب سے کامیاب سیاسی مزاح نگار ہیں۔

اب رہی ظرافت تو اس کے لیے میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ ملا رموزی کے مضامین میں ظرافت نہیں بلکہ کہیں کہیں لطافت ہے جس کو بالغ نظر اور سیاست آگاہ حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ لطافت ان کے ہاں فطری ہے اس لیے اس کی بہتات اور کثرت ضرور ہے، لیکن اس کمال کے ساتھ کہ وہ عریاں سے عریاں مقامات میں بھی اشارات کی جان بن جاتی ہے، مگر رواجی اور بازاری ظرافت نہیں ہوتی اور یہی چیز ان کے ادبی کمال کو بلند و خاص کرتی ہے۔

وسعتِ نظر:

ایک حاکم اور اخبار نویس میں اپنے زیرِ اثر اور مخاطب طبقات کا مکمل علم و اندازہ بے حد ضروری چیز ہے۔ ملا رموزی میں یہ ملکہ غایت درجہ کی تکمیل لیے ہوئے ہے۔ وہ جس جماعت کے کردار کو بیان کرتے ہیں اس کے تمام اجزاء بلکہ اجزاء کے اجزاء بھی اس روانی سے بیان کرتے ہیں گویا یہ تمام واقعات ان ہی کی ذات سے وابستہ اور متعلق ہیں۔ چنانچہ جب موصوف نے عورتوں کی گھریلو زندگی کی اصلاح کے موضوع کو اختیار کیا تو اس وقت وہ خود غیر شادی شدہ تھے، لیکن انھوں نے ''ننھے میاں'' کی والدہ کے فرضی کردار اور نام سے عورتوں کی گھریلو زندگی کے جو مکمل خاکے پیش کر دیے وہ ان کی وسعتِ نظر کے تحسین آفرین نمونے ہیں۔

انھوں نے ریل کے سفر میں تیسرے درجہ کے مسافروں کی تکالیف کے جو نقشے پیش کیے وہ اس درجہ صحیح اور کامل قسم کے نقشے ہیں کہ پڑھتے ہی تیسرے درجہ کے مسافر سامنے آجاتے ہیں۔

انھوں نے اسی کتاب میں فصلی بخار، بارش کے نقصانات وغیرہ میں غریب طبقات کے جو وسیع تر حالات بیان کیے ہیں ان سے یقین ہوتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی کے ہر جز سے اس درجہ باخبر ہیں گویا ان کا تمام وقت ایسے ہی حالات کے مطالعہ میں گزرتا ہے۔

انھوں نے طبقۂ اعلیٰ کے مغرب زدہ نوجوان لڑکوں لڑکیوں اور ذی اقتدار لوگوں کے جو کردار اور حلیے پیش کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عوام کے مقابل خواص کے حالات اور واقعات سے بہت زیادہ باخبر ہیں، پھر اس دریا در یا وسعت علم ونظر کے ساتھ ساتھ ہر کردار میں وہ جو سلیقۂ بیان اور اس میں جن اہم اور نازک واردات کو بیان کر جاتے ہیں، اس کی ندرت ورنگینی ہی نے ان کو سارے ہندستان میں ایک معزز وممتاز شہرت کا مالک بنادیا۔

معنیٰ آفرینی:

ملا رموزی کے اس کمال کا اقرار سارے ہندستان کو ہے کہ وہ حقیر اور پیش پا افتادہ واردات وواقعات سے بھی ایسے اہم نتائج اور اثرات پیدا کر دیتے ہیں جن کو خواص تک محسوس نہیں کرتے، مگر وہ اس کمال جامعیت سے ہر حادثے، واقعے اور معاملہ کو بھانپ لیتے ہیں اور ایسے معنیٰ پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی اس معنیٰ آفرینی سے انکار نہیں کرسکتا اور ان کا یہ کمال اصل میں ان کی وسعتِ نظر، وسعتِ علم اور فلسفیانہ قوت واستعداد کا اثر ہے۔ چنانچہ ان کے ایسے بے شمار تبصرے اور مقالے ہیں جن میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے بڑے معنیٰ اور اہم نتائج سے بحث کی گئی ہے۔

نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ اسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جو نفسیات انسانی اور عام وخاص حالات سے کماحقہ واقف ہو اور یہ شرف خدا نے ملا رموزی کو بدرجہ اعلیٰ عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں انھوں نے ''نفسیاتِ عشق'' کے نام سے عورت مرد کی محبت اور جنسی تعلقات پر جو معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے اور اس میں عورت مرد کے عشق واتحاد پر جس بے نظیر تحقیق کو پیش کیا ہے وہ مزید ثبوت ہے ان کے نکتہ دان اور نکتہ آفرین صاحبِ قلم ہونے کا۔ پس ان کی اس صلاحیت کا ایک اثر یہ ہے کہ زبانِ اردو ان کے قلم سے ایک لاجواب اضافہ اور وسعت پا رہی ہے کیونکہ ان کی معنیٰ آفریں انشاء میں الفاظ کا اُتار چڑھاؤ اور جدت زبان کی وسعت کی ضامن ہے۔

طرزِ ادا:

ایک خطیب اور ایک ممتاز ادیب اسی وقت مقبول ومحترم ہوسکتا ہے جب اس کے بیان و کلام کا طرز عوام سے ہٹ کر بے حد خاص اور ساتھ ہی مقبول وپسندیدہ ہو۔ ظاہر ہے کہ طرز ادا

کے معاملہ میں ملا رموزی نے قابلِ رشک شہرت وتخصیص حاصل کر لی ہے، یعنی وہ جس مقصد کو بیان کرتے ہیں اس کو گفتگو کی عام عادت اور فطرت کے موافق کبھی بیان نہیں کرتے بلکہ ایک ایسا نادر اندازِ بیان اختیار اور ایجاد کرتے ہیں جس سے قاری اور سامع صرف طرزِ ادا ہی میں کھو جاتا ہے، مثلاً وہ ایک موضوع کو شروع کر کے دانستہ طور پر اس طرح بہک جاتے ہیں گویا اب وہ اصل موضوع ہی کو بھول گئے، لیکن وہ اس درمیان میں بے شمار ضروری اور قیمتی باتیں جلد جلد کہہ کر پھر اصل موضوع پر اس طرح کہنے لگتے ہیں کہ دماغ بے ساختہ آفریں کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بلاغت واشارہ:

ان کے بیان وکلام کی ایک بے تاب کر دینے والی قابلیت ان کی بلاغت واشارہ نگاری ہے، اگرچہ بلاغت واشارہ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو کلام وبیان کو مہمل اور بعید الفہم بنا کر پڑھنے والے کے دماغ کو تھکاتی ہے اور پڑھنے والا ایسی ادق اور گنجلک لیے ہوئے عبارت کے مطلب کو سمجھنے میں کافی غور وفکر میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن ملا رموزی کے مضامین ایک ایسی بلاغت اور ایسے اشارات کے حامل ہیں جن کو پڑھیے اور وجد کیجیے خصوصاً بین الاقوامی سیاسیات میں ان کے ایسے بے اندازہ اشارے ہیں جو دلوں کو تڑپاتے ہیں اور قاری کو ایک ایسا اہم مفہوم سمجھا جاتے ہیں جو ادق اندازِ بیان سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

اہم سے اہم مطالب وواقعات کی طرف سے ذہن کو منتقل کر دینے کے لیے ان کا معمولی سا اشارہ بہت کافی ہوا کرتا ہے اور یہ قدرت ان کی جودتِ طبع کا کمال ہے جو پڑھنے والوں کے حق میں جادو کا اثر کرتا ہے۔

''شیر کے شکار'' یا ''مشاعرہ'' کے عنوان سے جو مضامین اس کتاب میں ہیں ان میں ایسے سینکڑوں اشارات ہیں جو بڑے واقعات، اہم تفصیلات اور نادر حالات کے آئینہ دار ہیں، لیکن ملا رموزی ان کو اس طرح بیان کرتے گئے ہیں گویا ان کے سامنے یہ واقعات پہلے ہی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ موصوف کا یہ وہ کمالِ قلم ہے جس پر انھوں نے تمام اونچے علمی طبقات سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

خاکہ کشی:

اپنے گھر میں بیٹھ کر افراد و اشخاص اور حالات و واقعات کی کامل و اکمل تصویر کھینچ دینا اور اس درجہ مکمل تصویر کہ اصل و نقل میں فرق نہ رہے کوئی مذاق نہیں، شک نہیں کہ اردو میں کردار نگاری بعض اہلِ قلم نے کی ہے، لیکن اس اہم حصۂ انشاء کی جو تکمیل ملا رموزی کے قلم نے کی ہے اس کی لاجوابی کے اعتراف و اقرار میں دوست تو دوست ان کے دشمن تک شریک ہیں۔ ملا رموزی نے کردار نگاری اور خاکہ کشی میں وہ عامیانہ اور غیر طبعی یا مصنوعی انداز اختیار نہیں کیا جو اردو کے عام ڈراموں، افسانوں اور بعض مکالموں میں ملتا ہے، بلکہ انھوں نے خاکہ کشی کے لیے چند فرضی نام اور القاب وضع کیے، مثلاً گلابی اردو میں وہ لائڈ جارج مشہور برطانوی وزیر اعظم کو اپنا شاگرد رشید ظاہر کر کے اس کے منہ سے بین الاقوامی سیاسیات پر جو گرانمایہ تبصرے لکھ چکے ہیں ان کو صرف سیاسی اصحابِ فکر و عمل ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان سیاسی رموز و افکار کے اشارات تک کو سمجھ سکیں۔

گھریلو زندگی اور اصلاح اخلاق و معاشرت کے لیے انھوں نے دوسرا کردار ''بیوی نمبر ایک تا چار'' کے نام سے شروع کیا اور ان ناموں سے انھوں نے جو ذخیرۂ اصلاح و ہدایت پیش کیا اس کی اہمیت اور ندرتِ انشاء کو صرف متبحر اور وسیع العلم طبقات ہی سمجھ سکتے ہیں۔

غریب طبقات کی مکمل زندگی کے جزئیات لکھنے میں ان کو جو بلند و مخصوص مقدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں ان کی مقبول ترین ''عورت ذات'' موجود ہے، جو سیرت نگاری اور کردار نویسی کی عظیم الشان اور حیرت انگیز کتاب ہے، اس کردار کے لیے انھوں نے خود کو اس طرح پیش کیا گویا واقعی وہی غریب ہیں اور بے حد مصیبت زدہ، لیکن یہ امر حقیقت ہے کہ انھوں نے مزدوروں اور غریبوں کے جو کردار لکھ دیے ہیں اور جن طبقات کے جو خاکے پیش کر دیے ہیں وہ خطِ قسمت ہی بن کر رہ گئے ہیں اور کسی میں ہمت نہیں جو ملا رموزی کے لکھے ہوئے خاکوں کو مصنوعی یا غیر طبعی کہہ سکے۔ اسی کتاب میں بارش کے فرضی وفد کو انھوں نے غرباء کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا ہے اور سپاسنامہ کی مروجہ اصطلاحات میں انھوں نے مزدور اور غریب طبقات کی جو کامل زندگی دکھائی ہے اس کی جامعیت، اصلیت، واقعیت اور طرز ادا کی داد حقیقت یہ ہے کہ صرف

یورپ ہی کی ذی علم قومیں دے سکتی ہیں۔ وہ کیا خاک سمجھیں گے جو خود علم ومصائب کی زندگی سے کوسوں دور ہیں۔

اسی طرح ''شیر شکار'' میں ایک ذی علم شخص کے کردار کو جس فطری بیساختگی سے وہ دکھائے گئے ہیں نفسیات کا ماہر ہی اس کی قیمت کو پہچان سکتا ہے۔ یہی حال ''طوفان، بغاوت اور شکایت'' نام کے مضامین کا ہے۔

وطن دوستی:

عہد حاضر میں ''وطن دوستی'' یا ''حب وطن'' سے مراد سیاسی تحریکات، حقوق طلبی یا سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کے معنی ہیں۔ یا ایسی تجاویز اور ہمدردیوں کا اظہار جس سے ملک غیر کے اثرات سے پاک ہو، لیکن ملا رموزی وطنیت کے محدود دائرے سے بہت آگے رہے ہیں اور حیرت ہے کہ خود ایک تاریک تر اور محدود دائرے میں زندگی گزارنے والا اتنا وسیع القلب اور وسیع الفکر اہل قلم کیوں کر بن گیا۔ مگر یہ اثر بھی ان کے ستارۂ مشتری کا ہے جو وسعتِ علم ونظر کا ضامن ہے۔ اسی لیے ملا رموزی کا نظریہ اصلاح وخدمت وطنیت کے محدود دائرہ سے بڑھ کر دنیا کے تمام انسانوں کی خدمت وہمدردی ہے۔ چنانچہ انھوں نے 1923 میں ترکوں کی مظلومیت پر جس طرح طویل ترین مقالات شائع کیے اسی طرح 1924 میں مظلومین ریف کے لیے انھوں نے پُر جوش سلسلۂ مضامین جاری رکھا۔

1934 سے 1939 تک انھوں نے ملک چین کے باشندوں کی حمایت میں کافی سے زیادہ لکھا اور 1940 میں انھوں نے فن لینڈ، ہالینڈ، پولینڈ، ناروے، بلجیم اور فرانس وانگلستان کی بیچارگی پر جس کمال شدت سے نظمیں اور مضامین لکھے وہ اخبارات ورسائل میں ابدالآباد تک محفوظ رہ کر بتائیں گے کہ ملا رموزی کس درجہ وسیع العلم اور فیاض فطرت انسان ہیں۔ اندرون ہندستان ہندو مسلم اتحاد پر تو ان کے مضامین کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جب وہ 1931 میں شمالی ہندستان گئے اور 1932 میں ولایات متوسط تو ان کے معزز وممتاز میزبانوں میں ذی عزت ہندو مسلمان رؤساء امراء اور عوام یکساں اور برابر کے شریک تھے اور آج بھی وہ اپنی وسعتِ قلب کے اثر سے ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں مقبول ومعزز ہیں۔

اب رہ گیا ہندستان کی سیاسی تحریک میں ان کی قلمی خدمات اور ان کی سیاسی فراست و بصیرت کا اندازہ سو اس کے لیے علامہ کفایت اللہ مفتی اعظم ایسی باا ثر شخصیت اور ایک سیاسی اسیر قید و بند کے ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''ملا رموزی کے مضامین سے حب وطن اور شوق آزادی کی خوشبو آتی ہے۔ جب تحریکات وطنیہ کامیاب ہوں گی اس وقت کا مؤرخ سرکردہ زعماء کے کارناموں کو لکھتے وقت ملا رموزی کے آثار قلم کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا''۔

یہ وہ آراء ہیں جو ملا رموزی کے ظریف معاصرین حاصل نہ کر سکے محض اس لیے کہ دوسرے ظریفوں کو سیاسیات ایسے سزا و عقوبت والے میدان میں قدم دھرنے کا حوصلہ نہ ہوا اور اگر حوصلہ بھی تھا تو ملا رموزی ایسی نڈر، بے باک اور ہر شدت کو مسکرا کر برداشت کر لینے کی جرأت کہاں۔ اسی لیے ملا رموزی کے اکثر ساتھی صرف تفریحی مضامین اور ماہوار رسالوں تک رہے، مگر ملا روزی چوٹی سے چوٹی کے انتہا پسند اخباروں کے روح رواں یعنی وہ سیاسی مزاح نگار ہیں نہ کہ صرف مزاح نگار۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ ملا رموزی کو خدائے فیاض نے جو زائچہ عطا فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا رموزی کے دماغ و مرتبہ کا مستقبل بے حد بلند و برتر اور زندۂ جاوید ہوگا انشاءاللہ۔

نجومی

7/جولائی 1940 — فلیمنگ روڈ، لاہور

طوفان

اس مضمون کا حق تصنیف میرے دونوں لڑکوں شوکت طوفانی اور خالد طوفانی کے لیے خاص ہے:

گر کسے نقل کند باطل گردد!

''طوفان'' اصل میں اس کتاب کا نام ہے جو میں 'وصایائے رموزی' کے طور پر اپنے بال بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں کہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ اس میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جو کتاب کی ''مولویت'' کو دور کر کے اس کو قدرے شگفتہ بناتے ہیں۔

طوفان کی بے شمار اقسام میں سے ''طوفان بدتمیزی'' بہت عام قسم کا طوفان ہے جو پبلک جلسوں میں اس طرح پایا جاتا ہے کہ:

''روشنی کے سامنے آیئے روشنی کے''

''ذرا زور سے بولئے زور سے''

''صورت نظر نہیں آتی صورت''

''بٹھادو، بٹھادو، الگ کرو الگ، بھگادو ہم ان کی تقریر نہیں سنتے''

''لعنت، لعنت''

طوفان

اس مضمون کا حق تصنیف میرے دونوں لڑکوں شوکت طوفانی اور خالد طوفانی کے لیے خاص ہے:

گر کسے نقل کند باطل گردد!

''طوفان'' اصل میں اس کتاب کا نام ہے جو میں ''وصایائے رموزی'' کے طور پر اپنے بال بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں کہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ اس میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جو کتاب کی ''مولویت'' کو دور کر کے اس کو قدرے شگفتہ بناتے ہیں۔

طوفان کی بے شمار اقسام میں سے ''طوفانِ بدتمیزی'' بہت عام قسم کا طوفان ہے جو پبلک جلسوں میں اس طرح پایا جاتا ہے کہ:

''روشنی کے سامنے آیئے روشنی کے''

''ذرا زور سے بولئے زور سے''

''صورت نظر نہیں آتی صورت''

''بٹھا دو، بٹھا دو، الگ کرو الگ، بھگا دو ہم ان کی تقریر نہیں سنتے''

''لعنت، لعنت''

طوفان

اس مضمون کا حق تصنیف میرے دونوں لڑکوں شوکت طوفانی اور خالد طوفانی کے لیے خاص ہے:

گر کسے نقل کند باطل گردد!

''طوفان'' اصل میں اس کتاب کا نام ہے جو میں ''وصایائے رموزی'' کے طور پر اپنے بال بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں کہ سند ہو اور وقت ضرورت کام آئے۔ اس میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جو کتاب کی ''مولویت'' کو دور کر کے اس کو قدرے شگفتہ بناتے ہیں۔

طوفان کی بے شمار اقسام میں سے ''طوفانِ بدتمیزی'' بہت عام قسم کا طوفان ہے جو پبلک جلسوں میں اس طرح پایا جاتا ہے کہ:

''روشنی کے سامنے آیئے روشنی کے''

''ذرا زور سے بولئے زور سے''

''صورت نظر نہیں آتی صورت''

''بٹھادو، بٹھادو، الگ کر دالگ، بھگادو ہم ان کی تقریر نہیں سنتے''

''لعنت، لعنت''

''ابے چپ او کھوسٹ''

''مولانا ابوالکلام کو کھڑا کیجیے، ان کی نہیں سنتے''

''منظور، منظور''

''اماں چپ تو رہو سننے بھی دو گے کہ چلے جائیں''

''بس دو منٹ اور''

''شانتی شانتی بھائیو کھموس کھموس''

اختلاف، ناراضی، آوازے، دھول دھپا، ہڑبونگ، تاریکی، رضا کاروں کی خوشامد، پولیس لاٹھی چارج، گرفتاریاں، اینٹ پتھر، سوڈے کی بوتلیں، تیزاب، مقدمات، سزائیں، معافیاں۔

یہ وہ طوفان ہے جو پبلک جلسوں میں اٹھایا جاتا ہے یا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

دوسرا طوفان بدتمیزی اس اختلاف کو کہہ سکتے ہیں جو قوم کے اہم اور سنجیدہ تر مسائل کو چھوڑ کر مغربی مسائل پر اخباروں میں مضامین پر مضامین بن کر شائع ہوتا ہے۔ مثلاً شیعہ سنی، اہل حدیث، وہابی، قادیانی، مسجد شہید گنج، کانگریس اور ہندو مہاسبھا، شدھی، تبلیغ، مسلمان لڑکی کا ہندو کے ساتھ فرار اور ان کے لیے ہندو مسلمانوں کا گتھ جانا۔

تیسرا طوفان بدتمیزی تھیٹروں اور سینما کے تماشوں میں خوبصورت گانے والیوں اور کامیاب مسخروں کو دوبارہ تشریف لانے کے لیے سیٹیوں، تالیوں اور ذلیل آوازوں سے اٹھایا جاتا ہے۔

چوتھا طوفان بدتمیزی اگر تھوڑی سی شراب نصیب ہو جائے تو دیہاتی مسائل یا اچھوت قسم کی چھوٹی جماعتوں کی ان پنچایتوں میں بھی نظر آجاتا ہے جو روشنی اور فرش بغیر کسی پیپل کے درخت کے نیچے یا کھلے میدان یا سڑک کے کنارے اجلاس فرماتی ہیں، ایسی پنچایتوں میں ضروری نہیں کہ فساد اور اختلاف کا طوفان صدر جلسہ ہی کی طرف سے اٹھایا جائے، بلکہ اس میں شراب کے نشہ کی مقدار زیادہ کام دیتی ہے، مثلاً جس کے سر پر جتنا نشہ سوار ہو طوفان کی ابتدا اسی سے ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی ضرورت نہیں کہ سخت وسست کہنے والے کا روئے خطاب اصل مخاطب ہی تک رہے بلکہ ان کی آن میں وہ ہر چہار سمت گالیاں ارسال کرنے لگتا ہے۔ خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ایسی

پنچایت کا صدر پولیس طلب کرنے کے عوض خود بھی فحش بن جاتا ہے اور پنچایت اس مصرع پر برخاست نظر آتی ہے کہ:

نشستند و گفتند و برخاستند!

یا پھر تمام پنچوں کے ساتھ کسی کوتوالی میں۔

پانچواں طوفانِ بدتمیزی دنگل، ہاکی، فٹ بال، گھوڑ دوڑ اور مرغ اور تیتر کے مقابلوں میں بغیر کسی خاص اعلان کے اٹھا دیا جاتا ہے اور ایسے مقابلوں کی تو تو میں میں کا حشر بھی بعض اوقات فساد، زخمی، موت، پولیس اور عدالتوں تک پہنچتا ہے۔

چھٹا طوفانِ بدتمیزی ریل گاڑی آنے پر تیسرے درجہ کے مسافروں میں یوں نظر آتا ہے کہ تیری لاٹھی کی نوک میری آنکھ میں اور میری گٹھری تیری ناک کی نوک پر، میری شیروانی کا دامن تیرے بستر میں لپٹ کر درجہ میں سوار اور تیرے برقعہ کا دامن میں الجھا کر ڈبہ کے اندر، تیرا صندوق میرے پاؤں پر اور میرے ناشتہ دان کا شوربہ تیرے پاجامہ پر۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ یہ طوفان ریل کے روانہ ہونے پر بھی اُمنڈتا ہی رہتا ہے اس طرح کہ:

''بھائی صاحب یہ تو میری نشست ہے، میں بمبئی سے اسی جگہ بیٹھا چلا آرہا ہوں اور آپ نے میرے چائے پینے کے لیے جاتے ہی اس پر قبضہ جمالیا''۔

''اچھا تو پھر میں آپ کو اس جگہ سے ہٹا کر بتادوں؟''

''تو خود ہوگا''

''ابے ہاں میرے باوا کی ریل ہے خبیث کہیں کے۔ دیکھ رہے ہیں آپ سب صاحبان میں کس کس طرح سمجھا رہا ہوں کہ بھائی صاحب اٹھ جایئے یہ میری جگہ ہے، مگر یہ اپنی افلاطونی سے باز ہی نہیں آتے''۔

''کیا کہا ذرا پھر کہنا، بس خبردار اب کے نہ سنوں''۔

''ابے تو اور تیرا باوا۔ دھپ، دھڑام، تڑاق''

''زنجیر کھینچ لیجیے زنجیر وغیرہ''۔

اس طوفان کا سلسلہ بھی بعض اوقات ریلوے پولیس کے تھانوں تک جا پہنچتا ہے۔

ساتواں طوفانِ بدتمیزی چھوٹے درجہ کے دو برابر کے مکانوں کی عورتوں سے شروع ہوتا ہے جو محلّہ میں لڑنے والے چھوٹے بچوں کی ہمدردی اور حمایت میں ہوتا ہے اور اس میں بعض عورتیں چھوٹے بچوں کو گود میں لیے ہوئے دروازوں سے آدھی باہر لٹک کر یا دیواروں پر چڑھ کر کام کرتی ہیں۔ اس وقت ان کی زبان قینچی اور ہاتھ پنکھے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے زبانی طوفان میں ان کے چھوٹے بچے آندھی کے جھونکوں کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً:

''میری آپا کو گالی دے گی تو منہ توڑ ڈالوں گا تیرا''۔

''ہاں چچی بی اس نے گھر میں بلا کر میرے طمانچے مارے تھے''۔

''اب مار تو پھر بتاؤں تجھ کو''۔

بعض اوقات یہ طوفان بھی پولیس تک جاتا ہے اور محلّہ کے بزرگوں کے روکنے پر مشکل سے رُکتا ہے۔

آٹھواں طوفانِ بدتمیزی صرف ان مکانوں میں نظر آتا ہے جن میں انسانوں سے زیادہ مرغا مرغی اور بکرا بکری ہوتے ہیں۔ جب یہ گھر میں آتے ہیں یا گھر میں کھولے جاتے ہیں اس وقت کا منظر طوفانِ بدتمیزی کی جو حسین صورت سامنے لاتا ہے اس کو غریب گھرانوں کی زندگی کا مطالعہ کیے ہوئے حضرات محسوس کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر ان جانوروں سے گھر کی چیزوں کے بچانے کے لیے جو طوفان پیدا ہوتا ہے اس میں ''لڑکیاں'' کڑک چمک اور بجلی گرانے کا کام کرتی ہیں۔

''ارے توبہ رشید! بھگا، بھگا''۔

''ارے مرگئی، وہ میرا دوپٹہ کھا گئی، مار مار''

''روک روک، وہ چلی کمبخت''

'کھِل کھِل کھِل، قہقہہ۔

''ارے توبہ میں تو تھک گئی آپا جان وہ ہاتھ تو آتی نہیں'' وغیرہ۔

طوفانِ بدتمیزی میں ایک خاص قسم کی بیوی کو نمایاں درجہ حاصل ہے۔ اس کی زد میں اس کا شوہر زیادہ آ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بھی کافی نہیں تو بیوی ہی کے برابر بیوقوف ہو۔

ایسی ''طوفان بیوی'' کے لیے دو شرطیں بے حد ضروری ہیں۔ یا وہ دو درجن بچوں کی ماں ہو چکی ہو یا کم سے کم دق کی قسم کی بڑی بیماری میں سے اب صحت یاب ہو رہی ہو، مگر مصیبت یہ ہے کہ ہزار میں ایک بیوی کے لیے بھی کوئی علمی اور فلسفیانہ علامت ہی قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ اسی قسم کی بے پہچان ہوتی ہے جس طرح ''زن مرید'' کے لیے نہیں طے کیا جا سکتا کہ یہ اپنی عورت کے مقابل اتنا بدھو کیوں واقع ہوا ہے۔

ایسی عورت اس طوفان کا نمونہ ہوتی ہے جو بغیر کڑک چمک کے پانی کی صورت میں اچانک دیہات کو برباد کر دیتا ہے۔ یہ گھر کے کاموں میں مصروف اور منہمک رہ کر اپنے شوہر کی صورت دیکھتے ہی کسی معمولی واقعہ پر برس پڑتی ہے اور ہنگامہ آرائی اور اس کی طوفانی چیخوں کا انسداد اسی طرح ممکن ہے کہ اس کا شوہر ایک بچہ کو گود میں لے کر یہ کہتا ہوا گھر سے باہر چلا جائے کہ:

''اچھا نیک بخت جو تیرا جی چاہے کر''۔

عام طوفانی عورتوں کا زیادہ زور بوڑھی ساس اور محلّہ کی بعض کمزور عورتوں کے خلاف صرف ہوتا ہے۔

''ہاں میں اپنے رشید کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تیری بیٹی نے پہلے اس کا قمیص پھاڑا تھا''۔

''تو اپنے بیٹے کو تو پہلے منع کر میرے بچوں میں گھسنے سے''۔

''منع کرے میری جوتی۔ بے عزت کہیں کی''۔

''ہاں ہاں آنے دے تیرے یار کو میں بھی تو دیکھوں''۔

''اری اسی کے ہاتھ تجھے ذلیل نہ کراؤں تو کہنا چھنال کہیں کی''۔

بعض اوقات ایسی عورت کا دماغی طوفان محلّہ کے دو چار گھروں کے مردوں کو بھی لے ڈوبتا ہے:

''اماں جانے بھی دو عورتوں کی باتوں پر کیا یقین کرتے ہو''۔

''بس جانے بھی دو منشی جی صاحب، مجھ کو تو منع کرتے ہو مگر اُس سے کچھ نہیں کہتے''۔

''خدا پاک کی قسم میں گھر سے باہر ہوا نہیں کہ میرے کسی نہ کسی بچہ کو پٹوا دیتی ہے گھر میں بیٹھی''۔

''ہاں ہاں تو اب گھر سے نکلیں تو تمیں مار خاں۔تو میں بتاؤں کہ ایسا ہوتا ہے دوسرے کی بیوی کو گالی دینا''۔

''ارے دیکھ چکا ہوں دس مرتبہ منشی جی صاحب اس کو۔قرآن کی قسم ابھی جائے گا بس تھانے رپٹ لکھانے''۔

''مرد ہے تو مقابلہ میں آئے''۔

ممکن ہے کہ ایسی عورت کو جاہل قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے ،لیکن میری تحقیق سے ثابت ہے کہ اگر اس مزاج کی بیوی کو بی۔اے پاس کرا دیا جائے تو اس کے طوفان میں اتنا ہی فرق آئے گا کہ محلّہ میں اس کی آواز نہ سنی جائے گی ،لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس کا شوہر اس کے خاموش اور اُمڈے ہوئے طوفان سے محفوظ رہ سکے۔

اس کے طوفانی ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے لباس کی تبدیلی اور صفائی میں کمی کر دیتی ہے، جس کو نفیس مزاج کا شوہر برداشت نہیں کر سکتا۔کسی بیماری کے بہانے ساتھ کھانا چھوڑ دیتی ہے۔تفریحی مشاغل میں حصہ نہیں لیتی۔ریڈیو، گراموفون اور سینما سے نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ بچوں پر کافی جھنجھلاتی ہے، بے ضرورت بات نہیں کرتی اور ویسے دیکھنے میں اچھی خاصی بی۔اے پاس نظر آتی ہے۔

اب اگر ایسی طوفانی بیوی کو الٹ دیجیے تو یہی نقشہ طوفانی شوہر کا تیار ہو جاتا ہے۔البتہ طوفان کی شدت میں بیوی صرف خود کو نوچتی ہے، کھاتی ہے اور صبر کرتی ہے اور طوفانی شوہر صاحب ایم۔اے پاس ہو کر بھی بعض اوقات بیوی کو قدرے قلیل ضرب بھی پہنچا کر پُر سکون نہیں ہوتے۔

اس قسم کے طوفان کو بہر حال طوفانِ بدتمیزی ہی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا طوفان بدتمیزی فطری ہے، مگر ہے بدتمیز۔یعنی بارش سے پہلے ''مانسون'' کے نام سے اور ہر وسط بارش میں ''سیلاب'' کے نام سے جو طوفان آئے اس کی کل اتنی سیدھی نہیں ہوتی کہ اس کو اونٹ نہ کہہ سکیں۔بھلا غور کیجیے کہ یہ بھی کوئی ''مانسون پن'' ہے کہ تمام دنیا کا گرد و غبار اور مچھر یا میری آنکھیں میں یا آپ کے صاف ستھرے کمرہ کی آرائشی چیزوں پر۔رات کو مارے مانسون کی

طوفانی دست برد کے نیند حرام اور اوپر سے جس مسہری پر آرام کیجیے اس کی چادر کہیں اور ڈلائی کہیں۔ رات بھر محسوس ہوتا ہے کہ مکان کی چھت اُڑانے کے لیے تمام مزدور زورلگا رہے ہیں اور ہائے ہائے کررہے ہیں۔

مانسون کا زور ہوتو سائیکل کو شریفانہ حیثیت سے چلا کر دکھا دیجیے تو انعام دوں۔ بھلا یہ بھی کوئی مانسون پن ہے کہ ایک راستہ میں یا تو دس مرتبہ سائیکل کی لالٹین روشنی کیجیے ورنہ سپاہی کو نام بتایئے اور چالان میں ٹھیک ایک بجے عدالت میں حاضر ملیے ورنہ بصورت عدم تعمیل سمن کچھ اور انتظام فرمالیجیے۔

ایک مانسونی طوفان سے ان عورتوں کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے جو غریب کسی وقت بھی دوپٹہ کو سر سے نیچے نہیں اترنے دیتی ہیں، مگر مانسون کا زور اتارتا ہے۔ بے گندھی ہوئی چوٹی والی لڑکیاں ہوتی ہیں کہ غریب تھک جاتی ہیں، مارے مانسون کے پیشانی پر سے بال ہٹاتے ہٹاتے۔

اس کے بعد کڑک چمک کا طوفان ہوتا ہے، جس کے بدتمیز ہونے میں اس لیے کوئی شبہ نہیں کہ اس سے بے شمار کمزور دل اور نازک جس کے مرد وعورت اور بچے لرزتے ہیں۔

اس کے بعد بارش کا وہ طوفان ہے جس کے بعد اخباروں میں آتا ہے:

''بازاروں میں کشتیاں چل رہی ہیں، پُل ٹوٹ جانے سے کلکتہ میل بھوپال ہوکر جارہا ہے، تہہ آب دیہات کی آبادی کو ہوائی جہاز کے ذریعہ خوراک بہم پہنچائی جارہی ہے۔ راجندر بابو اور جواہر لال نہرو بھی موقع پر پہنچ گئے ہیں''۔

''خان عبدالغفار خاں کے سرخ پوش طوفانی آبادی کو بچانے میں مصروف ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے امداد کی اپیل شائع کی ہے''۔

''سیوا سمیتی مع طبی سامان کے سب سے پہلے پہنچ گئی تھی، جس نے بہت سے ڈوبتوں کو نجات دلائی'' وغیرہ

طوفانِ بدتمیزی کے بعد طوفان تمیزی کا درجہ ہے، لیکن غلط ہوگا اگر اس کا درمیانی درجہ بھی نہ بتادیا جائے، جو میں نے تحقیق کیا ہے، اس لیے اس درمیانی طوفان کا نام اگر ''طوفانِ نیم تمیزی''

رکھا جائے تو علامات کے حساب سے صحیح ہوگا، یعنی شعور اور بے شعوری کے بیچ کی عمر میں یہ طوفان انسان کو گھیر لیتا ہے، جس سے کم شعور لڑکے اور لڑکیاں ضائع ہوتے رہتے ہیں اور ضائع ہوتے رہیں گے۔

لیڈر، حکماء اور مدبرین میں 99 فیصدی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ تعلیم کے زمانہ میں سیاست میں حصہ لینا تعلیم کے لیے سخت نقصان دہ ہے، لیکن شاید غیر محسوس طریقہ پر سہواً خود ماہرینِ تعلیم نے درسگاہوں میں ایسا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ آدمی خواہ مخواہ سیاسی انسان ہو کر رہتا ہے یا سیاسی ہونے کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا سیاسی ہونے کی استعداد کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

مثلاً درسگاہوں میں مجالس مذاکرہ کا انعقاد۔ ایک لڑکے کا تقریر کے لیے اونچی جگہ کھڑا ہونا اور سب کا اس سے نیچے بیٹھے رہنا، تمام لڑکوں کا نیچے بیٹھے رہنا اور ایک لڑکے کا اونچی کرسی پر بیٹھنا اور سب کا اس کو ''جنابِ صدر'' کہنا اس کے بعد تمام طلباء کا اخبارات پڑھنا اور ''حب وطن'' کے عنوان پر تقریروں اور تحریروں سے ''مشقی جنگ'' میں حصہ لیتے رہنا۔ یہ تمام مشق بجائے خود سیاسی تعلیم ہے اور کہتے یہ ہیں کہ طلبا کو سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیے۔

درسگاہوں کی اس مشق کے بعد یا اس کے درمیان ہی سے مذکورہ بالا طوفان کے آثار و اثرات شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات درسگاہوں کے عوض آج کل کے ''دارالمطالعوں'' کے مطالعہ اور تفریحی باغات میں مل کر بیٹھنے اور اخباری گفتگو سے یہ طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، اس طوفان کو ''نیم تمیزی'' اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اچھے بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت طبی نقطۂ نظر سے مکمل نہیں ہوتی، اس لیے طوفان زدہ انسان 19 برس کی عمر ہی میں تعلیم چھوڑ کر یا ''قومی رضا کار'' بن جاتا ہے یا ''افسانہ نگار'' حالانکہ یہ عمر محض تحصیل کمالات کی ہے، مگر طوفان ہی تو ہے۔ پس اگر دماغ میں اس طوفان کے پیدا ہوتے ہی بزرگوں اور وارثوں نے ''نگرانی'' اور ''اصلاح'' سے کام نہ لیا تو یقین فرمالیجیے کہ لڑکا یا لڑکی اس طوفان کی زد میں آ گئے اور مارے گئے۔ اس لیے کہ اب ایسا طوفان زدہ انسان اپنے صحیح مستقبل، نصب العین اور مقصدِ زندگی کو تو سمجھ سکتا ہے مگر اس کے نتائج کو محسوس بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس طوفان کے مارے ہوئے چند سال کے بعد عجیب و غریب حالات و شدائد میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

اس طوفان کے عملی اور نمایاں آثار یہ ہیں کہ اس نوع کا لڑکا یا لڑکی اپنے گھر سے زیادہ کلب، دارالمطالعہ، انجمن، جلسہ اور جلوس میں نظر آتا ہے یا آتی ہے۔ اس کی شعوری قوت ابھی طبعاً کامل نہیں ہوتی، اس لیے یہ دوسرے لیڈروں کی نقل کرتا ہے اور بس اور طوفان نیم تمیزی کی یہ ہی وہ منزل ہے جہاں سے افسانہ نگاری، قومی شاعری اور مضمون نگاری کی بلا بھی لپٹ جاتی ہے اور اس وقت کی یہ تینوں قوتیں پختگی، استقلال اور تدبیر آموزی کے عوض صرف بحرانی اور طوفانی ہوا کرتی ہیں۔

مثلاً افسانے، اشعار اور مضامین میں لفظوں کا ہجوم اور ہنگامہ ہوتا ہے۔ مغز و معنی اور مقصد و تدبیر آموزی کوسوں پتہ نہیں ہوتا۔ اب اگر اس طوفان کے عالم میں ایسے شخص کو تقریر کا موقع بھی مل جائے تو اس کا نمونہ اس قسم کا ہوگا:

''جناب صدر و حاضرین جلسہ!

میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ اگر قوم کی بیوہ ماں بہنوں کا عقد ثانی ہونے کے مسئلہ میں برطانی حکومت نے کوئی مداخلت کی تو میں سب سے پہلا انسان ہوں جو جیل جانے کو تیار ملوں گا، مگر اس مداخلت فی الدین کو برداشت نہ کروں گا۔

آہ قوم کے بے شمار یتیم بچے تو نانِ شبینہ کو حاصل نہ کرسکیں اور ہمارے سرمایہ دار سنیما کے تماشہ کا ناغہ نہ کریں، لہٰذا سنیما کے خلاف پیکٹنگ کی سخت سے سخت ضرورت ہے جس کے لیے میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

برادرانِ ملت!

ضرورت ہے کہ ہم اپنی آواز کو کامیاب بنانے کے لیے ایک اخبار جاری کریں تا کہ ہماری برادری کی ضروریات کی ترجمانی ہو سکے اور میں اس قومی آرگن کے لیے اپنے بکرا بکری تک فروخت کرنے کو تیار ہوں۔ ہم قوم سے بھیک مانگیں مگر اس کام کو کر کے دکھادیں گے۔

آہ ہم ان اسلاف کے اخلاف ہیں جنھوں نے ساری دنیا سے اپنا لوہا منوایا، مگر آج

ہم ہیں کہ دوسروں کے غلام ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم جلد ان بیڑیوں کو کاٹ کر پھینک دیں گے (نعرۂ تکبیر) گاندھی جی کی جے۔ خان عبدالغفار خاں زندہ باد، ملا رموزی مردہ باد!

آہ سارا مالابار سیلاب کی نظر ہو چکا اور ہماری سیوا سمتی کے بہادروں نے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے اپنی جانیں تک دے دیں، مگر ہماری اسمبلی کے غدار ارکان ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ایسے ارکان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ فوراً اسمبلی کی رُکنیت سے استعفیٰ دے دیں۔

''(گو بیک ملا رموزی'') ورنہ ہم سیاہ جھنڈیوں سے ایسے ارکان کا استقبال کریں گے۔ خموش خموش۔ لعنت لعنت۔ بٹھادو بٹھادو۔ ہم نہیں سنتے۔ مولانا ابوالکلام کو کھڑا کیجیے۔ روشنی سامنے لائیے۔ آواز نہیں آتی آواز۔ شانتی شانتی۔ سنیے سنیے، جی نہیں سنتے۔ ہم آپ کو خوب جانتے ہیں۔ پہلے یتیم خانہ کا حساب دیجیے وغیرہ''۔

اس نوع کے طوفان کا اُتار مسلسل افلاس، عوام کی بے رخی اور کہیں کہیں پولیس کی حسبِ ضابطہ نگرانی سے عمل میں آتا ہے۔ اس قسم کا طوفان زدہ اپنے گھر کے غیر روشن خیال اور غیر سیاسی مردوں اور عورتوں کے حق میں بھی سخت مصیبت ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ گھر کے ہر فرد کو دوپہر کے وقت بھی ''حبِ وطن'' پر لیکچر پلاتا ہے اور صبح کو بھی۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ ہوتا ہے کہ تمام خاندان کو قوم کے نام پر مرمٹنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یہ قومی تباہی کا ذمہ دار علمائے کرام کو قرار دیتا ہے۔ مذہبی علوم سے یکسر بے گانہ ہونے پر بھی خود کو مفتی اعظم فلسطین کا بڑا بھائی تصور کرتا ہے۔ گھر کی عورتوں تک کو کھدر اور کھادی میں دیکھنا چاہتا ہے اور اگر اس کا بس ہو تو یہ عورتوں تک سے دوپٹے چھین کر ان کو گاندھی ٹوپی اوڑھنے پر مجبور کر دے۔

اس کو ڈاکٹر اقبال مرحوم کا کلام ضرور یاد ہوتا ہے، جس کے حوالے جگہ جگہ دیتا ہے۔ یا پھر قبلہ گاندھی جی کے منصوبے۔ اس طوفانی اور بحرانی دباؤ سے اس کی آنکھیں عینک سے باہر نکلی پڑتی ہیں اور بے عینک ہو تو تیزی سے گھومتی رہتی ہیں۔

یہ طوفان شعوری قوت کے بیدار ہونے اور مسلسل ناکامیوں سے جب کافور ہوتا ہے تو طوفان زدہ لڑکا یا لڑکی پھر اس میدان سے اتنا دور نظر آتا ہے گویا وہ اس قوم کا فرد ہی نہیں جس کے غم میں وہ کل تک جرمنی تک سے لڑنے کو تیار تھا۔ یعنی اس بحرانی حالت سے شفا پالے پر بعض کو نیاز مند ملا رموزی نے دیہات میں سفید موصلی کی تجارت میں مبتلا پایا ہے اور بعض کو ہوائی جہاز پہ ملازم!

◆◆◆

شیر کا شکار

ہندستان کو فطرت کی طرف سے جو آب و ہوا عطا ہوئی ہے، اس کے اثر سے یہاں کی ہر پیداوار کمزور، ناتواں، لاغر اور پست ہی نظر آتی ہے۔ مثلاً یورپ میں جیسے قوی اور دیوہیکل انسان پیدا ہوتے ہیں ہندستان میں ویسے ہی قحط زدہ، فاقہ کش اور مریض صورت کے انسان پیدا ہوتے ہیں لہٰذا جتنا بڑا دماغ اتنی بڑی عقل اور ہندستان میں فطرت کے اسی بخل کا اثر ہے جو یہاں کے باشندوں کی تاریخ غلامی خاصی طویل ہے۔

پس شکار بھی ایک ایسے عمل کا نام ہے جو اگر سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے اور اس کا کوئی مفید و موزوں مقصد قرار دیا جائے تو اس سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن فطرت کا دیا اور تو سب کچھ ہے مگر ہندستانیوں میں جو یہی دولت نہیں ہے تو دیکھ لیجیے کہ آج ہندو مسلم فسادات تو بنے ہوئے ہیں مگر نہ ہو سکے تو سوراج، اس لیے ہندستان کے شکارستانوں میں آج جو قبیلے نظر آتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔ مثلاً:

1۔ وہ شکاری قبیلہ ہے جو صحت اور دماغی سکون کے لیے شکار کی تفریح اختیار کرتا ہے اور یہی قبیلہ صحیح اور برحق ہے۔

2۔ یہ وہ طائفہ ہے جو صرف گوشت خوری کے لیے اللہ میاں کے جانور بندوں اور بندیوں کو

ہلاک کرتا ہے، میری رائے میں یہ جماعت قرنطینہ کی مستحق ہے۔

3۔ تیسری جماعت وہ ہے جو جنگلی جانوروں کی نقصان رسانی اور ایذا رسانی کے انسداد کے لیے شکار کا کام کرتی ہے اس لیے یہ مستحق انعام ہے۔

4۔ چوتھی ٹولی وہ ہے جو صرف اس لیے شکار کو جاتی ہے کہ کسی امیر وزیر آدمی نے اس کے کسی فرد کو بطریق انعام و عنایت بندوق دے دی ہے۔ لہٰذا محض بندوق کے ہاتھ آ جانے سے اب شکار فرمانا بھی فرض قرار دے لیا گیا۔ چاہے نشانہ صحیح ہو یا نہ ہو، میری رائے میں ایسے تمام افراد کی بندوقیں ضبط کر کے مجھے عطا فرما دی جائیں تا کہ ان کو فروخت کر کے میں اپنا مکان بنوالوں۔

5۔ پانچواں گروہ وہ ہے جو خود شکار کے خوفناک جنگلوں سے ڈرتا ہے۔ بندوق بھی خود نہیں چلا سکتا، مگر ہر شکاری کے ساتھ جانے اور شکار کا تماشہ دیکھنے پر مرتا ہے اور کبھی کبھی اپنی ناواقفیت سے اصل شکاری کو بھی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا میری رائے میں ایسے شوقین حضرات کو اپنے اپنے شہروں ہی میں سنگسار کر دینا چاہیے۔

6۔ چھٹا طبقہ وہ ہے جس کو اگر شکار کا شوق دلا دیجیے تو فوراً تیار ورنہ برسوں شکار کا نام تک نہ لے، میری رائے میں اگر ایسوں کے ہاتھ سے جانور کے عوض انسان مارے جائیں تو معاف!

7۔ ساتویں برادری وہ ہے جو شکار کے صحیح مقاصد و فوائد سے کاملاً خبردار ہے، شکار کے اصول و ضوابط وضع کرتی ہے، شکار کے نقصانات سے دوسروں کو خبردار کرتی ہے، شکار کے بہترین قاعدے ایجاد کرتی ہے، شکار کے گوشت پوست کو کارآمد بناتی ہے، شکار سے قوت، شجاعت، جفاکشی، بہادری، اولوالعزمی اور محنت شاقہ کی استعداد پیدا کرتی ہے اور شکار کے نام سے غریبوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

اس طبقہ میں رؤسا، امراء، حکام اور ذی مقدرت لوگ شامل ہیں۔ لہٰذا میری رائے میں ان حضرات کو افریقہ، امریکہ اور یورپ تک میں شکار کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

8۔ آٹھواں حلقہ وہ ہے جو شکار کے گوشت پوست سے اپنی بیوی بچوں کی روزی پیدا کرتا ہے، میری رائے میں اس حلقہ کے افراد کو اگر جانور نہ ملنے پر ملا رموزی تک کو مار کر فروخت

کردیں تو خون اور سزا دونوں معاف۔

9۔ نواں عملۂ شکار وہ ہے جو اگر پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تو شکاری ورنہ پکے ڈاکو، میری رائے میں ان لوگوں سے دور ہی رہنا مناسب ہے ورنہ یہ لوگ بعض اوقات شریف شکاریوں کو بھی پولیس سمجھ کر فیر فرما دیتے ہیں۔

10۔ دسویں انجمن وہ ہے جس کے ارکان اپنے شہروں میں سکون سے ملازمت کرتے ہیں۔ بال بچوں میں رہتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ جنگل کے نام سے توبہ کرتے ہیں، مگر ہر شکاری کے سر پر مسلط رہتے ہیں کہ شکار کا گوشت کھلایئے۔ پھر گھر بیٹھے گوشت بھیج دینے کے بعد بھی یہ شکایت کہ اب کی مرتبہ بہت تھوڑا گوشت بھیجا۔ میری رائے میں ایسے لوگوں کو اگر شکاری لوگ دھوکہ سے مار ڈالیں تو مار کر حج کرنے اور گناہ معاف کرانے کی ضرورت نہیں۔

11۔ گیارہویں جمعیت وہ ہے جس کے افراد نمک مرچ ساتھ لے کر جاتے ہیں اور ہر معمولی سے معمولی شکار کے گوشت کو جنگل ہی میں بڑی مسرت سے تناول فرما کر آتے ہیں۔ میری رائے میں اگر ان لوگوں کو شیر مار ڈالے تو ان کے بال بچوں کو کوئی تاوان نہ دیا جائے بلکہ دفن کے وقت ان کے ساتھ ان کے شوق کا گوشت بھی رکھ دیا جائے۔

12۔ بارہویں خاصانِ خدا وہ ہیں جو شکار کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اور سب کچھ کر سکتے ہیں، مگر صرف اولاد کی کثرت، آمدنی کی قلت اور کارتوسی بندوقیں نہ ہونے کے باعث شکار کو نہیں جا سکتے، مگر شکاری ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی کسی شکاری کے ہمراہ رہ کر شکار کا نظری لطف اٹھا کر گھر آ جاتے ہیں۔ میری رائے میں ایسے لوگوں کو عاقبت کے خوف ہی سے شکار کے لیے سب کچھ دے دینا چاہیے اور شاید یہی وہ اللہ والے ہیں جن کے صدر جناب ملا رموزی صاحب ہیں۔

1933 میں اردو کی انجمنیں بنانے جب میں ولایاتِ متوسط ہند اور برار میں گیا تو علاوہ عوام کے حضرت گرامی نواب محمد علی خاں صاحب نے امراوتی میں اور حضرت محترم نواب عبدالوحید صاحب والی گوردھا اسٹیٹ نے ناگپور میں میری کافی سے سے زیادہ امداد فرمائی تھی۔ اسی عرصہ میں امراء ولایاتِ متوسط ہند سے جو تعارف حاصل ہوا تھا اس کے بعض سلسلے آج تک

جاری ہیں، اس لیے ذیل کا خط ملا:

''حضرت محترم ملا رموزی صاحب السلام علیکم!

نامۂ کرم ملا، نادرہ کہتی ہے کہ امتحان کی مبارکباد خود آ کر دیجیے۔ آپ نے بھاول کے
اسٹیشن پر جو وعدہ فرمایا تھا وہ اب پورا کیجیے۔ شیر حاضر ہے اطلاع دیجیے تو انتظامات
مکمل کر لیے جائیں۔ بیگم اور نادرہ کا آداب قبول کیجیے''۔

مذکورہ بالا نامۂ کرم اسی محترم اور معزز ٹولی کے ایک بے حد لائق احترام رکن کا تھا، جو ناگپور اور برار میں میری رفیق کار رہی تھی اور اس میں سے بعض نے اپنے خلق و کرم سے مجھ سے اچھی خاصی رشتہ داری پیدا کر لی ہے اور خصوصیت سے خط لکھنے والے محترم سے تو بے حد گاڑھی رشتہ داری ہے، اس لیے کہ محترم و معظم کی محترم و معظم بیگم صاحبہ اور ممدوحہ کی صاحبزادی عزیزہ نادرہ نے مجھے ان مواقع پر بھی گھی کے بہترین کھانے کھلائے جہاں پلاؤ، مزعفر اور بریان تک تیل میں پکائے اور کھلائے جاتے ہیں۔ یہ پورا خاندان بے حد روشن خیال، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بحمد اللہ کہ ذی ثروت و ذی مقدرت خاندان ہے۔ اس سے بھی زیادہ خاص بات یہ ہے کہ عزیزہ نادرہ نے میری بیوی نمبر ایک کو بہن بنایا ہے، اس لیے خوب خوب تحفے بھیجتی ہیں اور ملا رموزی بھی صرف ان ہی کا ہے جو انعام دیں یا تحفہ۔ ''یہ خالی خولی ملا صاحب تشریف لائے'' کہنے والے تو نہ میرے کرم فرمانہ میں ان کا دوست اور نہ وہ لوگ میرے دوست جو صرف یہ کہیں کہ ''کیا خوب مضمون تھا'' اور بس۔ اس لیے میں نے خط آتے ہی اپنی چاروں بیویوں کو جمع کر کے اس جلسہ کا صدر اپنی چھوٹی بیوی کو بنایا کہ یہ غریب ہی غضب کی منصف مزاج اور شریف تر جذبہ کی بیوی ہے۔ صدر جلسہ بنا کر میں نے یہ خط پیش کیا اور ادب سے عرض کیا کہ:

''اگر آپ سب کی رائے ہو تو ایک دن کے لیے چلا جاؤں۔ ویسے بھی وہ لوگ
میرے قدر دان ہیں اور گھرانہ بھی رئیس ہے۔ مجھے آرام بھی کافی ملے گا''۔

اب اگر آپ کو عورت کے تاؤ کھا جانے کے رموز و نکات سے واقفیت ہو تو یقین کیجیے کہ اس خط سے نہیں بلکہ میری ''شوہرانہ معروضات'' سے اُن میں ایک ہلکا سا 'بیویانہ تاؤ'' پیدا ہو گیا اور وہ زکام کھانسی کی ماری ہوئی بیوی نمبر دو بولیں کہ:

''اچھا ہے جب قدر دان گھرانہ ہے اور اوپر سے رئیس بھی تو ضرور تشریف لے جایئے۔آپ کو تبدیلِ آب وہوا کی ویسے بھی ضرورت ہے۔ہم میں آپ کا کون اتنا بڑا قدر دان ہے جو اس شدید گرمی میں آپ کو شملہ یا مصوری بھیج سکے''۔

یہ سراپا طنز و طعن گفتگو حضور بیوی نمبر دو صاحبہ کی ہے جس میں شوہر کی جدائی کا وہ عاشقانہ صدمہ مضمر ہے جس کو 99 فیصدی شوہر نہیں سمجھتے اور بیوی کو گستاخ سمجھ کر طلاق تک معاملہ پہنچا دیتے ہیں،اس لیے میں نے کہا کہ:

''نہیں نہیں یہ خیال غلط ہے کہ تم سے زیادہ قدر دان کوئی اور ہے بلکہ میں نے جس گھرانہ کو قدر دان کہا ہے وہ صرف علمی وادبی حیثیت سے۔اچھا اگر آپ کو ناپسند ہے تو یہ تو شکار ہے میں تو بغیر تمھاری منظوری کے تبدیلِ آب وہوا کے لیے سوئزر لینڈ بھی نہ جاؤں گا اور دیانا تو اب یوں نہیں کہتا کہ آج کل وہاں ہٹلر اور ان کے ساتھی دندنا رہے ہیں۔وہ مجھ ایسے ہندستانی یہودی کو کاہے کو گھسنے دیں گے''۔

بڑی بیوی کو اللہ اولاد پالنے کے لیے سلامت رکھے،ان کو اپنے صاحبزادے کی پرورش ہی سے فرصت کہاں جو وہ اپنے شوہر کے گشت اور سفر کو سمجھیں بھی کہ ملا صاحب کہاں جاتے ہیں اور کیوں جاتے ہیں؟البتہ وہ غریب چھوٹی بیوی ہی بولی اور بڑے بھولے سے تاؤ کے ساتھ بولی کہ:

''اچھا آیئے گا کب؟''

اس مختصر سے جملہ میں میرے جانے کا جو طویل صدمہ شامل تھا اس کی شاعری کو اگر تمام شوہر سمجھ لیں تو ہر گھر میں میاں بیوی جنت ہو کر رہ جائیں۔اور یہ میاں بیویانہ دھینگا مشتی اور طلاق کے محکمات کا نام بھی نہ رہے۔اس لیے میں نے کہا کہ:

''بس تیسرے دن''

اس پر بھی فرمایا کہ ''انشاءاللہ'' تو کہہ دیجیے''۔

دیکھا آپ نے اس عربی فقرے میں چھوٹی بیوی کی فکر مندی کو؟

اب سب سے اہم مرحلہ تھا محترمہ والدہ صاحبہ اور بہنوں کی اجازت کا کہ ان غریبوں کو میرے ہر سفر پر یہی یقین ہے کہ گئے نہیں کہ مرے،اس لیے ان سے اجازت لینا گویا مرتے وقت

کہا سنا معاف کراتا ہے، مگر میں ٹھہرا آدمی غیر کالجی۔ اگر کالج کا لکھا پڑھا ہوتا تو والدین کے امام ضامن باندھے بغیر چلا جاتا۔ اس لیے ان سے اجازت کی مشکلات کو حل کراتے ہوئے دعائیں حاصل کیں اور ان دعاؤں سے یقین کرلیا کہ اب شیر کے ساتھ اگر جرمنی کی فوجیں بھی ہوں گی تو مار ڈالوں گا۔

ایک نازک، لطیف، شاعر اور بال کی کھال نکالنے والے صاحب علم انسان کے لیے ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرادینے کے یہ معنی ہیں گویا اس کو پاگل بنانے کی مشق کرائی جارہی ہے اور وہ بھی ''رعایتی ٹکٹ'' کے زمانہ میں۔ میں تو روزانہ دیکھتا تھا کہ ہر گاڑی میں افلاس اور نادیدہ پن کے مارے ہندستانی پانچ روپیہ کے ٹکٹ سے حج بھی کرنے جارہے ہیں اور تفریح کو بھی۔ وہ تو آج کل ان کا بس نہیں ورنہ وہ اس پانچ روپیہ والے ٹکٹ کے ذریعہ اپنے مکانوں اور اپنے شہروں تک کو ریل میں بھر کر دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ لیے پھریں۔ اللہ اکبر ہندستانی کو موقع دیجیے پھر اگر یہ سنیما، تھیٹر، گھوڑ دوڑ، کارنیوال، دنگل، ٹورنامنٹ، میلوں ٹھیلوں کے تماشوں اور نمائشوں کے ٹکٹ لینے سے باز تو آجائے۔ وہ ان کھیلوں اور تماشوں کو سمجھے یا نہ سمجھے ان کے فوائد و نقصانات سے واقف ہو یا نہ ہو، مگر اس کو تو ''رعایتی ٹکٹ'' کی اطلاع دے دو پھر دیکھو اس کی بوکھلاہٹ۔ اس لیے آج کل کی ریل گاڑیاں مسافروں سے یوں لبریز ہوتی ہیں گویا آگرہ کے تمام بندر سرکار کے حکم سے مال گاڑی میں بند کر کے کسی دوسرے جنگل کو بھیجے جارہے ہیں اور وہ مارے وحشت اور گرمی کے ایک دوسرے پر چڑھے چلا رہے ہیں، مگر ریل میں جارہے ہیں اس لیے میں نے ریلوں کی اس دھینگا مشتی سے محفوظ رہنے کے لیے تیسرے درجہ کی لنگڑی ریل گاڑی سے سفر شروع کیا، مگر اس اللہ کی بندی نے بھی ہر اسٹیشن پر ٹھہر ٹھہر کر مجھے مزا ہی چکھا دیا۔ ادھ موا سا ہو کر اٹارسی کے اسٹیشن پر اترا، اٹارسی میں ''سیرت کمیٹی'' کی طرف سے تقریر کر کے اپنے خاصے کرم فرما پیدا کر چکا ہوں، اس لیے یہاں سے میرے لیے کھانا اور خربوز تربوز کافی مقدار میں آئے تھے۔ میں نے بھی ''یا علی'' کہہ کر تمام پھل عزیزہ نادرہ کے لیے یوں رکھ لیے گویا میں اپنے ہی روپیہ سے خرید کر تحفتاً دے رہا ہوں۔

اٹارسی ناگپور ریلوے صوبہ جات متوسط کے بعض ایسے پہاڑی سلسلوں سے گذری ہے جن کے قدرتی پیچ وخم سے پُر شباب غزل کی سینکڑوں رنگین طرحیں از خود پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ گرمی کے موسم نے ان پہاڑوں کو بے رونق بنادیا ہے مگر میں ان کو دیکھ کر اپنے جنگی ذوق کی خیالی تکمیل سے لطف لے رہا تھا اور ہر پہاڑ کو دیکھ کر دل میں کہتا تھا کہ اس پہاڑ کی اوٹ میں اپنا جنگی مرکز بناؤں گا۔ اس میدان میں ہوائی جنگی جہازوں کا اڈہ بناؤں گا۔ اس ندی سے پانی لوں گا۔ اس میدان میں رسد جمع کروں گا اور اس میدان میں کانگریس اور مسلم لیگ کے ارکان کو جبری بھرتی کے ذریعہ ابتدائی قواعد پریڈ سکھاؤں گا۔

ان خیالات میں مستغرق ہو جانے سے تیسرے درجہ کے مسافروں کی تو تو، میں میں، کپڑوں کی گٹھریوں، بستروں، صندوقوں اور بال بچوں کی چیخوں سے بے خبر رہا کہ بیتول کا اسٹیشن نظر آیا۔ اسٹیشن کے باہر ایک ہلکے آسمانی رنگ کا موٹر کار کھڑا تھا، جس سے ٹیکی لگائے ایک نوجوان انگریز خاموش کھڑا تھا۔ اسٹیشن سے باہر ہوتے ہی یہ انگریز میری طرف بڑھا اور اچانک عزیزہ نادرہ بن گیا۔ میں نے ان کے سلام کے جواب میں کہا کہ ''اخا نادرہ تم مسلمان ہوگئیں'' انھوں نے گھبرا کر کہا کہ ''ملا صاحب! شکار کے کپڑے ہیں کیا کروں؟''۔

قلی نے بستر کے ساتھ جب خربوز تربوز بھی موٹر کے پاس رکھے تو میں نے خدا کا نام لے کر نادرہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ اٹارسی سے میرے مولوی صاحب ہونے کے اعزاز میں مفت ملے ہیں، مگر تم ہو انگریزی دان! لہٰذا محترمہ بیگم صاحبہ سے انگریزی ہی میں کہہ دینا کہ ''دیکھیے ملا صاحب میرے امتحان کی کامیابی کی خوشی میں اپنی گاڑھی تنخواہ سے اتنے خربوز تربوز لائے ہیں''۔

نادرہ بے حد خوش ہوئیں اور فرمایا کہ ''آپ کی ایسی ہی باتیں تو سب کو یاد آتی تھیں''۔

اس حسین و نفیس اور نازک موٹر کار میں جب یہ خربوز تربوز بھرے گئے تو مجھے خود ایسا محسوس ہونے لگا گویا مجھے ہیضہ کا مریض سمجھ کر میرے گرہستی کے سامان کے ساتھ مجھے قرنطینہ بھیجا جا رہا ہے۔ نادرہ بے ساختہ موٹر کی دوسری نشست پر بیٹھ گئیں اور میرے لیے وہ نشست چھوڑ دی جس پر ڈرائیور بیٹھتا ہے۔ جب میں سوار ہوا تو کہا ''اِدھر آیئے اور میرا موٹر چلایئے'' میں نے کہا کہ

''آپ اپنے موٹر کار کو سائیکل بنا دیجیے تو میں چلا کر دکھادوں کیونکہ مجھے میری قدر دان قوم نے سائیکل ہی دلائی ہے''۔

نادرہ گوابھی طالبہ ہیں مگر بلا کی ذہین وزیرک۔ ادھر ذی علم گھرانے اور اعلیٰ ترتیب دینے والے والدین کی بیٹی، اس لیے میرے اس جملہ کا جو اثر نادرہ نے لیا، اس کی تاثیر کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ نادرہ نے بے ساختہ کہا:

''اچھا تو یہ موٹر آپ لے لیجیے''۔

میں ساکت سا رہ گیا اور نادرہ موٹر چلانے لگیں۔ مگر وہ بھی بے حد خاموش سی تھیں۔ تھوڑی دور چل کر پھر کہا کہ ''کیا واقعی آپ کو موٹر چلانا نہیں آتا''؟ میں نے پھر یقین دلایا کہ ''مجھے اتنا متمدن اور ترقی یافتہ انسان بنایا ہی نہیں گیا، موٹر کیسے چلاؤں''۔ اس پر نادرہ خاموش تھیں اور گاؤں آنے تک وہ جس درجہ متاثر رہیں ان کے اس جذبہ سے میں بے حد متاثر رہا۔

نادرہ اپنے جلیل القدر باپ کی بڑی لاڈلی بیٹی ہیں۔ گاؤں میں والد صاحب قبلہ ان کا اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ نادرہ نے گاڑی روکتے ہی گاڑی کے اندر ہی سے کہا ''باوا میاں! میں نے یہ گاڑی ملا صاحب کو دے دی ہے، آپ اس کو بھوپال بھیجنے کے لیے جبلپور سے ریلوے بوگی منگا دیجیے، اس کو آپ بیچ کھیے''۔

میں معظمہ محترمہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نادرہ کے جذبۂ قدر و ہمدردی کی تعریف کی اور نادرہ سے ہنس کر کہا کہ ''دیکھو جس جنگل میں ہم لوگ شکار کے لیے جا رہے ہیں وہاں کے پہاڑوں میں بیٹھ کر ایک وظیفہ پڑھوں گا اور مجھے موٹر مل جائے گا''۔

اب میں جس طرف دیکھتا ہوں دیہاتی ہی دیہاتی نظر آتے ہیں۔ جو شیر کے شکار کے بندوبست کے لیے جمع تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہی طے کیا گیا کہ چونکہ آپ صرف ڈیڑھ دن کے لیے آئے ہیں اس لیے ابھی سے جنگل چلیے، شیر سے پہلے دوسرے جانوروں کو شکار کیجیے۔ یہاں سے تین موٹر کار روانہ ہوئے۔ نادرہ نے اس مرتبہ اپنے موٹر میں یہ کہہ کر مجھے سوار کیا کہ ''ملا صاحب کیا میں آپ کا موٹر چلا سکتی ہوں؟''۔

جی میں تو آیا کہ اس کمالِ شرافت پر اپنی دو تین بیویاں نثار کر دوں، مگر میں نے کہا ''جی

نہیں اب جنگل جانا ہے اس لیے آپ باوا میاں کے ساتھ جایئے میں بیگم صاحبہ کی گاڑی میں آؤں گا"۔ مگر نادرہ کی محترم پھوپھی صاحبہ نے بے ساختہ فرمایا "جی نہیں ہم اپنی گاڑی میں ملا لوگوں کو نہیں بٹھائیں گے"۔ اس لیے پھر نادرہ تھیں اور ملا رموزی۔

اب ذرا میری شکاری لیاقتیں ملاحظہ فرمایئے۔ چنانچہ شکاری کے لیے اگر شرط اول ہمت، شجاعت، حوصلہ، بہادری، دلیری، جرأت، بے خوفی، صبر وضبط، محنت و جفاکشی اور لگا تار کوشش اور استقلال ہے تو میں پیدائشی شکاری ہوں، اس لیے کہ میری ساری زندگی ہمت، صبر وضبط اور لگا تار کوشش ہی کا صدقہ ہے اور حوادث وخطرات سے ہمیشہ بے خوف رہنا۔ اور یہ مضمون نگاری بھی شیروں کے میدان میں کام کرنا ہے۔ حد ہے کہ خود میری چھوٹی بیوی سمجھ رہی ہے کہ میں اس کے لیے کتنی تکالیف اٹھا چکا ہوں، اٹھا رہا ہوں، مگر اس کی طرف سے منہ نہیں موڑتا اور جو شکاری کے لیے شرط اول عمدہ بندوق چلانا ہے تو میں غیر شکاری اور میرا خاندان کا خاندان غیر شکاری۔

بھئی بات یہ ہے کہ جب تک شیر کو دیسی بندوق سے مارتے تھے میں خود لڑکا تھا اور مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ جمعہ کے جمعہ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں کے ساتھ باغوں میں جاتا تھا، وہاں لڑکوں سے تو تو میں میں ہونے پر کبھی ان کو مارتا تھا، اور کبھی خود مار کھاتا تھا۔ مگر گھر آکر سے کسی شکایت نہیں کرتا تھا لیکن جب سے میں بندوق چلانے کے قابل ہوا، اس وقت سے شیر کو کارتوسی بندوق سے مارنے کا چلن ہو گیا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ شیر کو مارنے والی کارتوسی بندوق اتنی بھاری قیمت پر ملتی ہے کہ اس رقم سے میں دو بیویاں کر سکتا ہوں اور اس طرح میں بیک وقت چھ بیویوں کے شوہر ہونے کا اعزاز وانعام حاصل کر سکتا ہوں۔

اس لیے میرا شکاری شوق یوں رہا کہ جس اللہ کے بندے یا بندی نے مجھے شیر کے شکار کا تماشہ دکھانے کے لیے بلایا میں اس کے ساتھ چلا گیا اور بہانہ یہ کر دیا کہ میری چھوٹی بیوی میری بے حد قدر دان ہے، اس نے میری جان کی حفاظت کے لیے مجھ سے حلف لے لیا ہے کہ میں شیر کے شکار سے ہمیشہ دور رہوں گا۔ اس لیے میں جس کے ساتھ اس شکار میں جاتا ہوں وہ بندوق چلاتا ہے، میں خوش ہوتا ہوں، وہ شیر مارتا ہے اور میں تعریف لکھتا ہوں۔ وہ جنگل میں زخمی شیر کو تلاش کرتا ہے اور میں مارے ڈر کے قل ہو اللہ پڑھتا رہتا ہوں۔ البتہ شیر کے شکار میں مجھے یہ کمال

حاصل ہے کہ عموماً لوگ اس کے شکار میں اس کے چند مخصوص اصول وضوابط اور خواص سے واقف ہوتے ہیں اور میں اس شکار کے ایک ایک جزو کو تحقیق، تنقید اور طبعی و علمی نقطۂ نظر سے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس لیے شیر سے واقفیت کا جہاں تک تعلق ہے مجھے اس کے متعلق بعض طبعی، فطری اور عقلی معلومات کا ذخیرہ مجھے، اسی لیے شکاری میری معلومات پر حیران رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس راستہ میں نادرہ نے مجھ سے شیر کے متعلق سوالات کیے اور میں نے جب سنجیدگی سے ان کے جوابات دیے تو وہ میری واقفیت پر حیران تھیں اور ایک مرتبہ تو یہاں تک داد دے دی کہ ''کیا باوا میاں آپ سے یہ قاعدے معلوم کر لیتے ہیں؟'' ان کو پہلی حیرت اسی وقت سے ہوئی جب میں نے انھیں بتایا کہ ''دیکھو اس جنگل میں نیل گائے بکثرت ہوں گی''۔ کیونکہ نادرہ کو معلوم تھا کہ یہاں نیل گائے کافی ملتی ہیں، اس لیے وہ حیران رہ گئیں کہ میں نے صرف جنگل دیکھ کر کس طرح بتا دیا کہ یہاں نیل گائے ملتی ہیں؟

شیر کے شکار میں جا کر جو لوگ شیر سے ڈرتے ہیں ان کی مثالیں یہ ہیں۔ مثلاً:

(1) بعض اس طرح ڈرتے ہیں کہ جب تک وہ شکار کے علاقہ میں رہتے ہیں ان کی گفتگو ان کے قابو میں نہیں رہتی اور بظاہر وہ کسی ڈر کا اظہار نہیں کرتے۔

(2) بعض وہ ہوتے ہیں جو شیر کے نظر آنے سے پہلے تک بڑے بہادر بنے رہتے ہیں، لیکن شیر کے نظر آنے پر وہ مختلف صورتوں سے ڈر جاتے ہیں:

پہلی صورت میں وہ سکتہ کی مکروہ صورت بن کر رہ جاتے ہیں، ان کی زبان اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کا ساتھ نہیں دیتے۔

دوسری صورت میں ان کے چہرے کا نور اُڑ جاتا ہے، جسم کا لرزہ پنکھے کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔

تیسری صورت میں وہ شیر کے نظر آتے ہی جو کچھ کر گزریں کم ہے یعنی ان میں کے بعض بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض شیر کو چلا چلا کر بھگانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے اصل شکاری بھی خطرہ میں گھر جاتا ہے کیونکہ شیر حرکت کرنے والے انسان پر اس لیے حملہ آور ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص مجھے مارتا ہے۔

چوتھی صورت میں ڈرنے والے شکاری کے حق میں آخری مصیبت بن جاتے ہیں مثلاً ابتدا میں وہ بڑے پُر جوش بن کر جنگل میں داخل ہوتے ہیں، لیکن شیر کا گھنا جنگل دیکھتے ہی وہ واپس جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس موقع پر شکاری کے غصہ کا انجن پوری طاقت سے ان کے خلاف کام کرنے لگتا ہے۔

پانچویں صورت عجیب وغریب ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ڈرنے والا خود ڈرتا ہے مگر اس طرح گویا وہ نہیں ڈرتا بلکہ شکاری ڈرتا ہے اور وہ شکاری کو ہمت دلا رہا ہے۔ ایسے شخص سے شکاری بے حد تنگ رہتا ہے۔

چھٹی صورت نہایت خوفناک ہے۔ اس میں ڈرنے والے کے لیے شروع سے بہت اچھی رائے قائم ہو جاتی ہے یعنی اس کی نقل وحرکت اور اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑا بہادر اور حوصلہ مند ہے، لیکن شیر کے نظر آنے پر یہ اچانک گھبراتا ہے اور اس گھبراہٹ میں اس کی ڈرپوک حرکات کا جغرافیہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اب یہ کس طرف بھاگے گا، یا یہ کپڑے پھاڑے گا، یا یہ درخت کی شاخ شاخ پر دوڑتا پھرے گا، یا یہ شکاری پر چڑھ جائے گا یا یہ شیر ہی کے سامنے جا کر لیٹ جائے گا یا یہ مچان سے کود پڑے گا یا یہ درخت پر چڑھ کر درخت کو ہلاتا رہے گا یا جنگل سے گھر تک بھاگتا ہی چلا جائے گا۔

ساتویں صورت خود شکاری صاحب کا ڈر ہوتا ہے۔ یعنی ضروری نہیں ہے کہ جو شخص شکاری ہو وہ شیر سے نہ ڈرتا ہو البتہ ان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً خوبصورت ڈرپوک وہ ہوتا ہے جو بظاہر نہیں ڈرتا لیکن اس کے ڈر کا اثر اس کی بندوق کے نشانہ پر پڑتا ہے۔ یعنی قلب کی غیر محسوس حرکت کی وجہ سے اس کا نشانہ غلط جاتا ہے۔ ایسے شکاری کے ساتھ شیر کے شکار میں رہنا گویا عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ تفریح کرنا ہے۔

ایک ڈرپوک شکاری وہ ہوتا ہے جو شیر کی شکارگاہ تک تو بڑے شوق سے جاتا ہے، لیکن شیر کے نہ ملنے کے ادنیٰ بہانے پر وہ گھر واپس آ جاتا ہے۔

ایک شکاری وہ ہوتا ہے جو شیر کے زخمی ہونے پر اس کی تلاش کے نام تک سے گھبراتا ہے اور اگر کسی دباؤ سے ایسا شکاری زخمی شیر کو تلاش کرنے چلا بھی جائے تو شیر کے حملہ آور ہونے کے

وقت اس کے ساتھیوں کو اللہ بچائے یا گورنمنٹ، کیونکہ زخمی شیر کو دیکھتے ہی وہ خود قوالی کے حال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

درجہ اول کا شکاری وہ ہوتا ہے جو شیر کے جنگل میں شیر ہی کی طرح جاتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں پر بہادرانہ کمانڈ کرتا رہتا ہے۔ اول تو ایسے شکاری سے شیر کبھی بچتا ہی نہیں اور اگر کبھی زخمی ہو کر جنگل میں بھاگ جائے تو ایسا شکاری بغیر کسی مدد کے اس کو ڈھونڈ کر مار ڈالتا ہے۔ ایسا شکاری ہی شیر کے حملہ آور ہونے تک بدحواس نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے خود شیر ہی بدحواس اور پریشان رہتا ہے۔

ملا رموزی صاحب کے ڈرنے کے قاعدے، اصول اور عقائد یہ ہیں:

مثلاً وہ شیر کے جنگل میں داخل ہوتے ہی سوچتے ہیں کہ اگر شیر نے مجھے مار ڈالا تو میرے بال بچوں کو پنشن کون دے گا، لہٰذا ڈرو۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر شیر نے مجھے مار ڈالا تو میرے بال بچوں کی امداد کون کرے گا، جب کہ میری ہی زندگی میں کسی نے میری امداد نہ کی بلکہ الٹا مجھے چور، ڈاکو اور عزرائیل علیہ السلام ہی سمجھا، لہٰذا ڈرو۔ مثلاً وہ سوچتے ہیں کہ اگر شیر نے مجھے زخمی کر دیا تو اول تو شفا خانہ میں میرا انتقال ہوگا اور شفا خانوں کے انتقال سے خدا محفوظ رکھے کیونکہ شفا خانوں میں حسب قاعدہ شفا خانہ مرنا پڑتا ہے، کوئی بے ضابطگی کی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب خفا ہوئے۔ پھر شیر کا زخمی ویسے ہی موت سے بچتا نہیں اور اگر بچتا بھی ہے تو بڑی قیمتی دواؤں سے اور یہاں ملا رموزی کے دماغ ہی کو باغ بہار رکھنے کے لیے کسی نے مقویات و مفرحات کا عطیہ دیا ہو تو بتا دے بلکہ اس غریب کو جو کچھ ملتا ہے اس کو بھی بہت زیادہ کہا جاتا ہے۔ گویا ملا رموی دیہاتی تمدن اور دیہاتی زندگی کا آدمی ہے جو مع متعلقین دس بارہ روپیہ میں گزر کر سکتا ہے لہٰذا ڈرو۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ اگر شیر نے مجھے زخمی کر دیا تو اس سے فوراً مر جاتا تو خیر غنیمت، لیکن اگر چھ سات مہینہ زخمی پڑا رہنا پڑا تو؟

مثلاً وہ سوچتا ہے کہ اگر شیر کے زخمی ہونے سے اس غریب کو شفا خانہ میں رہنا پڑا تو اس عرصہ میں چھوٹی بیوی کو واپس لانے کی کوشش کون کرے گا، جو چند ماہ سے تو نظر ہی نہیں آتی اور ظاہر ہے کہ مارے ڈر کے سسرال میں اس کو اصل معاملہ والا خط لکھا نہیں جاتا اور اشاروں سے وہ

سمجھتی نہیں، لہٰذا ڈرو۔

مثلاً وہ سوچتا ہے کہ اگر شیر نے مجھے زخمی کر دیا تو میرے متعلقین کا مارے مایوسی کے کیا حال ہوگا؟ اچھا اگر کچھ بھی نہ ہوا تو زخمی ہو کر خواب میں اول فول بولنے اور بکنے کی خدمت کس کے بس کی؟ پھر اگر شیر کے نظر آتے ہی میں خود بس میں نہ رہا اور بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا تو دنیا مجھے کیا کہے گی اور میری چاروں بیویاں میرا مذاق اڑائیں گی، لہٰذا ڈرو۔

یہ وہ خیالات وعقائد ہیں جو ہر شیر کے شکار میں ملا رموزی کے دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ البتہ وہ اوپر سے بڑا بہادر نظر آتا ہے۔

الحاصل ان ہی افکار و خیالات میں ڈوبا ہوا میں عزیزہ نادرہ کے موٹر میں بیٹھا ہوا تھا اور نادرہ قدم قدم پر مجھ سے جرح کرتی جاتی تھیں۔ مثلاً کیوں ملا صاحب آپ تو شاعر اور ادیب ہیں یہ شیر کے شکار کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ آپ نے کتنے شیر خود مارے اور کتنے مرتے دیکھے؟ اچھا کبھی زخمی شیر سے بھی سابقہ پڑا؟ اچھا تو اب میں ایک ہفتہ تک آپ کو گھر نہیں جانے دوں گی۔ وعدہ کیجیے ورنہ گاڑی روکتی ہوں؟

مگر میں تھا کہ شیر کے ڈر سے اپنے دماغ میں بھاگنے، چلانے، درخت پر فوراً چڑھ جانے، نادرہ کو شیر کی طرف دھکیل دینے اور خود درخت پر چڑھ جانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور اس غریب کے ایک سوال کے جواب نہیں دیتا تھا، وہ تو مجھ سے شدت سے محبت کرنے والی نادرہ تھی۔ اس لیے غریب ہنس ہنس کر میری بدحواسی کو ٹال رہی تھی اور جو کہیں نادرہ کے عوض ان کی پھوپھی صاحبہ میرا یہ اول فول پن دیکھ پاتیں تو مجھے خفیف کرنے میں دقیقہ نہ اٹھا رکھتیں کہ ان سے مجھ سے شروع ہی سے یہی کھاتا ہے۔ ندی کے ایک شاداب کنارے پر موٹریں کھڑی ہوگئیں اور اعلان ہوا کہ یہاں ہر شخص اپنے اپنے حصہ کا کھانا خود پکا کر کھائے گا۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ ''میں قضاء کے روزے رکھ رہا ہوں''۔ مگر کمبخت پان خوری نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اب کیا تھا نادرہ کی پھوپھی صاحبہ کو خدا مل گیا، فوراً ہی موصوفہ نے فرمایا:

''جائیے جنگل، لائیے لکڑیاں، روشن کیجیے چولہا اور تیار کیجیے اس گری میں اپنا کھانا کیونکہ اب تک چاروں بیویوں کے صدقے خوب عیش فرمایا آپ نے؟''

میں نے عرض کیا کہ "اگر صرف چار بیویوں کے ہاتھوں کا کھانا ہی اس سزا کا سبب ہے تو میں ان میں سے منجھلی بیوی کو آج طلاق دینے کو تیار ہوں"۔

فرمایا "یہ آخر صرف منجھلی ہی کیوں اور چھوٹی کیوں نہیں؟"

میں نے عرض کیا کہ "اول تو گنتی میں یہ عدد غیر شاعرانہ سا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اللہ کی منجھلی بندی ہمیشہ کھانسی، زکام اور ملیریا کا شکار رہتی ہے جس کی وجہ سے میں ہمیشہ نصف شفا خانہ بنا رہتا ہوں۔ دوسرے جب فرصت پاتی ہے تو اخبار "السٹرڈ ویکلی" بمبئی کے معمے حل کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مزاج کی مغرور اور خاموش پھر اوپر سے میرے اشاروں کو نہیں سمجھتی اور ایک چھوٹی بیوی ہے جو اول تو ہر فن میں طاق اور اوپر سے بے حد خوش اخلاق"۔

القصہ ایک طویل بحث کے بعد جس میں میں شکست کھا کر روٹی پکانے پر تیار نہیں ہونا چاہتا تھا، آخر کار نادرہ ہی کی عمر کام آئی۔ یعنی لڑکی پن کی عمر میں لڑکی میں اپنے عزیز مردوں کے لیے جو خلوص و ایثار ہوتا ہے وہ صاحبِ اولاد ہو کر شوہر تک کے ساتھ نہیں رہتا، اس لیے بھولی اور کافی سے زیادہ محبت کرنے والی نادرہ ہی بولی کہ "پھوپھی جان ملا صاحب تو اپنے مہمان ہیں، اس لیے ان کے ذمہ کا کھانا ہم پکا دیں گے"۔ اب جو میں نے نادرہ کی کی مستعدی دیکھی تو میری مردانہ غیرت پر لرزہ سا محسوس ہوا اور میں بڑا مرد بن کر جنگل کی طرف تنہا روانہ ہو گیا، یہ کہہ کر کہ "اچھا نادرہ میں تم کو لکڑیاں تو لا دوں"۔

کہنے کو نادرہ کے والد اور میرے محترم میزبان یہ سارا مباحثہ سن رہے تھے مگر میرے جنگل کی طرف تنہا جانے کو دیکھ کر بھی موصوف نے جھوٹ کو نہ کہا کہ "اچھا اچھا ملا صاحب آپ رہنے دیجیے، میں ملازمین سے لکڑیاں منگا دیتا ہوں"۔ آخر کار مرد ہوتے ہی ہیں بے مروت۔ اب ندی کا کنارہ اور وہ بھی بے حد شاداب، اس لیے چلا تو قدم قدم پر مجھے شیر اور شیر نہیں تو تیندوے نظر آنے لگے اور میں پھر وہی سوچنے لگا جو اس سے پہلے اپنی موت کے متعلق سوچتا تھا، لیکن اب تو محال تھا کہ میں لکڑیاں بھی جمع نہ کروں اس لیے لکڑیاں تو جمع کرنے لگا مگر دل میں جنگل میں دوبارہ نہ آنے کی قسمیں سی کھانا شروع کیں اور خدا سمجھے اس عقل و فراست کو کہ اس نے قوم سے موٹر کاریں اور کوٹھیاں تو آج تک نہ دلائیں، بس دلایا تو ہر نفع کی چیز کے حاصل کرنے میں قانون

سے ڈرنا، کوتوالوں سے ڈرنا، رسوائی کے نام سے ڈرنا، تہذیب کی لفظی پابندیوں سے ڈرنا اور اس جنگل میں شیر اور تیندوے سے ڈرنا۔ نتیجہ اس عقل کا یہ نکلا کہ میں قیام گاہ سے لکڑیاں لانے تو چلا بڑے بہادرانہ انداز سے مگر درختوں کی اوٹ میں پہنچتے ہی ایک درخت کے نیچے یوں کھڑا ہو گیا گویا شیر آنے والا ہے اور میں حیران و پریشان کھڑا ہوں کہ ناگاہ میں نے دبی ہوئی سی ہنسی کی آواز سنی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بامروّت نادرہ میری پشت کی طرف سے آہستہ آہستہ آ رہی ہیں، مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میں نے کہا "ہائیں"؟ کہا "شور نہ کیجیے، میں یہ کہہ کر نہیں آئی ہوں کہ ملّا صاحب کی مدد کو جاتی ہوں بلکہ یہ کہہ کر آئی ہوں کہ اپنے حصہ کی لکڑیاں لانے جاتی ہوں۔ بتایئے آپ یہاں خاموش کھڑے کیا سوچ رہے ہیں"۔ میں نے کہا "اچھا کھاؤ قرآن کی قسم کہ کسی سے کہوگی تو نہیں"۔ کہا "میری عادت قسم کی نہیں"۔ میں نے "اچھا میری خاطر قسم کھاؤ"، کہا "اچھا قرآن شریف کی قسم کسی سے نہ کہیں گے"۔ میں نے کہا "شیر کے ڈر سے یہاں کھڑا تھا"۔

میری اس صاف گوئی سے یہ بے حد متاثر ہوئیں اور ایک یہاں کیا غریب نادرہ تو گویا میرے لیے متاثر ہونے ہی کو پیدا ہوئی ہیں، اسی لیے میرا بھی ارادہ ہے کہ اگر عمر میں کبھی میں نے ہجرت کی تو ان ہی کے علاقہ میں باقی عمر پوری کروں گا اور نادرہ میرا مزار آگرہ کے پتھر کا بنوادیں گی جس کے تذکرہ سے وہ بے حد ملول ہوتی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد میں اور نادرہ قیام گاہ پر لکڑیاں لے کر اس بے ایمانی سے پہنچے گویا جنگل میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں اور غریب مزدوروں کی طرح اپنے اپنے حصہ کی لکڑیاں لے کر حاضر ہیں۔

نادرہ نے چولھا سنبھالا اور میں حیران تھا کہ یہ خالص رئیسانہ زندگی اور ناز و نعم کی پلی ہوئی لڑکی کس غضب کی مستعدی سے چولھے کے کام میں مصروف ہے۔ وہ آج کل کی وضع کی خاکی برجیس اور خاکی ریشمی بنیان پہنے تھیں، ان کے لمبے لمبے بالوں میں جنگل کی خاک اٹی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ کے رومال سے کبھی کبھی چہرہ صاف کر لیتی تھیں، مگر ان ہی کی طرح جب میں نے محترم و معظم بیگم صاحبہ کو بھی کام میں مصروف دیکھا تو نادرہ کی اس اچھی تربیت پر ان کے محترم والد صاحب اور

محترم ماموں جان صاحب کو مبارکباد دی۔

اس عرصہ میں خانہ بدوش بلوچیوں کے خیمہ کی نقل میں میں نے ایک طرف کپڑے کا گھر بنایا، جس میں ماموں جان میری مطلوبہ امداد فرماتے رہے اور میں نے، نادرہ نے، پھوپھی جان اور ماموں جان نے اسی کپڑے کے گھر میں کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد میری غزلوں اور نظموں کا طوفان شروع ہوا۔ بھلا ایسا جلیل القدر ذی علم اور ادب دوست خاندان اور پھر مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش۔ اب کاہے کو میں سانس لیتا۔ کوئی پچاس غزلیں تو سنا ڈالی ہوں گی۔ سب کو اس بات پر حیرت تھی کہ میں نے اچانک غزل گوئی میں اتنی کامیابی کس طرح حاصل کی۔

اس کے بعد اس خانہ بدوش زندگی کی تصویریں لی گئیں اور نادرہ نے یہاں بھی اپنی تصویر کش قابلیت کا ثبوت بہم پہنچایا اور بڑی تیزی سے مجھے متعدد تصاویر تیار کر کے عنایت فرمائیں۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میری کوئی تصویر بگڑنے نہ پائی، جس کا پھوپھی صاحبہ کو بڑا ارمان تھا۔

وقت آ گیا کہ شیر کا شکار ہو، میں نے سمجھا گویا میرا شکار ہوگا۔ قافلہ والے مسرور تھے، شیر کے مختلف حالات پر گفتگو تھی، محترم پھوپھی صاحبہ کا اصرار تھا کہ آئندہ آپ اپنی چاروں بیویوں کو بھی لائیے اور میں کہتا تھا کہ یہ چار بیویوں کا واحد شوہر جان ہی سلامت لے کر چلا جائے تو غنیمت!

الحاصل شیر کا علاقہ آ گیا۔ موٹر روک دیے گئے۔ پہلا ہی اناڑی پن ملاحظہ ہو کہ اس ٹولی کے تمام مرد و عورت شکار کے خاکی لباس میں تھے، مگر ملا رموزی صاحب وہی نفیس شاعرانہ لباس پہنے ہوئے تھے، جس کی جھلک بھی نظر آ جائے تو شیر شکار کر کے رکھ دے۔ روانگی اس طرح عمل میں آئی کہ گفتگو کے عوض دلوں میں باتیں کرنے لگے۔ یعنی بے حد دھیمی آواز سے بلکہ اشاروں سے باتیں ہونے لگیں۔ میں نے محترم میزبان کا سہارا لیا، کیونکہ جانتا تھا کہ موصوف ہی کی بندوق کا نشانہ قابلِ اطمینان ہے، لیکن میرے دل کے اس چور کو کون سمجھتا کہ میں شیر سے جان بچانے کے لیے اچھے نشانے والے کے ساتھ ہو گیا ہوں، لیکن میری اس حرکت کو نادرہ بری طرح محسوس

کررہی تھیں۔ وہ میرے اس طرزِ عمل کو اپنے ساتھ خالص نمک حرامی تصور کرتی تھیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر عورت کے احساسات بے حد مشتعل، زود رنج اور متاثر ہوتے ہیں۔ ان کا یہ دماغی کھولاؤ اب ان کے چہرہ تک سے نمایاں تھا، مگر میں اس الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ اگر وفاداری، خیر خواہی، خیر سگالی، خیر اندیشی، خیر طلبی اور خوشنودیٔ مزاج کے لیے میں یہاں بھی نادرہ کے ساتھ ہی رہا تو نادرہ تو ہیں ہر حال میں رئیس کی بیٹی، اس لیے یہ ہیں خوش اقبال۔ شیر ان کو تو کسی نہ کسی طرح چھوڑ ہی دے گا مگر میں دعائیں مانگنے پر بھی شیر کے طمانچے سے نہ بچ سکوں گا، اس لیے میں ان سے کٹنے لگا اور ان کے والد محترم کے ''زیرِ سایہ'' چلتا رہا۔

لیجیے وہ میری تمام کاریگری دھری رہ گئی اور اچانک ایک مچان کے نیچے کھڑے ہوکر ان ہی والد صاحب قبلہ نے مجھے اس مچان پر نادرہ کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ فرمایا، جن کو میں اپنا سرپرست اور قلعہ سمجھے ہوئے تھا۔ اب مارے شرم کے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ حضور قرآن کی قسم میں شیر سے بے حد ڈرتا ہوں، اس لیے مجھے اس لڑکی کے ساتھ نہ چھوڑیے ورنہ شیر مجھے مار ڈالے گا یہ غریب مجھے بچا بھی نہ سکے گی۔ چاروناچار ہم لوگ مچان پر جا بیٹھے۔

اب لینے دیجیے نادرہ کو مجھ سے بدلے۔ کیسے کیسے طنز سے یہ مجھ سے گفتگو فرمانے لگیں کہ میرا ہی دل جانتا تھا، مگر اب ان سے تاؤ کھا کر جاتا کہاں۔ میں نے مچان پر بیٹھتے ہی ان کے طنز سے بچنے کے لیے ان پر اپنی شعر دانی کا اثر ڈالنا چاہا، مثلاً میں نے کہا:

''سنو جی نادرہ! جب شیر آئے تو اس کو دیکھتے ہی حرکت نہ کرنا، نہ پہلو بدلنا، نہ بندوق آڑی ترچھی کرنا، بس جو کچھ کرنا ہے اس کے آنے سے پہلے کرلو ورنہ وہ گولی کھانے سے پہلے تم کو کھا جائے گا کیونکہ اس کی سماعت کی قوت اس کی نظر کی قوت کے تابع ہوتی ہے۔ جس جگہ سے اس کو حرکت کی آواز آتی ہے یہ بغیر کسی مشکل کے معاً اس جگہ کو پہچان لیتا ہے اور حملہ کر گزرتا ہے''۔

ظاہر ہے کہ لفظ ''سنو جی!'' ہی میں میرا رعب اور دبدبہ نمایاں تھا، مگر نادرہ کا ہے کو میرا رعب قبول فرماتیں، ہنس کر کہنے لگیں کہ:

''آپ بڑے بے مروّت ہیں''۔

میں نے کہا ''اگر بے مروّت نہ ہوتا تو قوم کی اصلاح اور خدمت کیسے کرتا''۔

کہا "اس کا مطلب؟"

میں نے کہا "اصلاح و رہنمائی کا کام بے مروّت دل ہی کر سکتا ہے، جس میں مروّت ہوگی وہ نہ کمزوریوں اور غلط کاریوں کو ظاہر کرے گا نہ سزا دے گا اور غلط کاروں کو جب تک بے مروّت ہو کر ڈانٹ نہ دیا جائے گا وہ غلط کاری سے کس طرح باز آئیں گے لہٰذا شک نہیں کہ مجھ میں ناز برداری کے ساتھ ساتھ ڈانٹ دینے اور کبھی کبھی پھاڑ کھانے کی قوت بھی زندہ ہے اور اسی لیے تحریر میں سرداری اور سالاری کے فرائض انجام دے رہا ہوں"۔

قدر دان اور ذی ہوش نادرہ میرے اس جواب سے بے حد متاثر ہوئیں اور اب بتایا کہ:

"ملا صاحب! قصہ اصل میں یوں ہے کہ شیر کا شکار میرے لیے ہے اور باوا میاں نے میرے امتحان کی کامیابی کی خوشی میں میرے لیے یہ شیر تیار کیا ہے، اس لیے ہم لوگوں میں آپ کے لیے پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ ملا صاحب کو نادرہ کے مچان میں بٹھا کر ملا صاحب کو شیر کا شکار دکھائیں گے تاکہ وہ مضمون صحیح اور چشم دید لکھ سکیں"۔

میں نادرہ کی اس "بھانڈا پھوڑ" اطلاع پر ظاہر میں تو خوش ہوا، لیکن دل میں اور ڈر گیا کہ لیجیے شیر اور وہ بھی نادرہ ایسی نوعمر بچی سے شکار کرایا جائے گا، تو اب اگر نہ بھی مرتا تو اس لڑکی کے اول فول نشانہ سے اب مر کر ہی رہوں گا۔

اب جو یہ سمجھا تو آنے دیجیے پھر موت اور موت کے بعد میرے گھر بار کی تباہی اور قوم کی یکسر ناقدر دانی اور زندگی میں قدر نہ کرنے کے دل شکن خیالات اور وساوس، مگر خوش دل نادرہ کو میرے ان خیالات کا کیا علم، وہ تھیں اور ان کا مذاق۔ پھر بھی میں نے مچان ہی پر سے درخت کی ایک ایک شاخ کو تک لیا تھا کہ اگرچہ شیر درخت پر تو نہ آئے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درخت پر چڑھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اگر چڑھا تو نادرہ تو اپنی بندوق اور خوش نصیبی سے لامحالہ بچ کر ہی رہیں گی ورنہ وہ امیر آدمی کے گھر پیدا ہی کیوں ہوتیں۔ خرابی تو ہے غریب آدمی کے گھر پیدا ہونے والوں کی جو ترقی کی لاکھ کوششوں سے بھی پروان نہیں چڑھتے اور دنیا کا ہر حادثہ ان کے لیے منہ کھولے کھڑا رہتا ہے، اس لیے شیر کے چڑھتے ہی میں اس شاخ پر چڑھ جاؤں گا اور خواجہ حسن نظامی مدظلہ کی کوئی نہ کوئی دعا پڑھتا رہوں گا کیونکہ بے عمل مسلمان دعاؤں اور گنڈے تعویذوں کے

زیادہ قائل ہیں اور مصطفیٰ کمال پاشا مسلسل کوشش اور علم وعقل کے۔

العظمت للہ، خود شیروں کے گھر میں رہتا ہوں اور خدا جانے کتنے رئیسوں اور رئیس زادیوں کے ساتھ شیر کا شکار دیکھا ہے۔ خطرناک سے خطرناک شیروں کو زخمی اور غضبناک دیکھا ہے، مگر اللہ شاہد ہے کہ اس اللہ کے بندہ کا خوف ہمیشہ ابتدا کی طرح پڑتا ہے یعنی لاکھ تجربہ کار ہوجایئے اور لاکھ نڈر مگر جہاں اس کے سامنے آنے کا یقین ہوا نہیں کہ دل ودماغ اور بندوق تک جواب دینے لگتی ہے۔ لہٰذا شیر کو نادرہ کے سامنے لانے والا شور شروع ہوا۔ اس موقع پر بہادر نادرہ کے چہرہ پر جو مسکراہٹ تھی میں اس کی علمی اور نفسیاتی کیفیات کو کیا بیان کروں، یعنی میں نے اس مسکراہٹ میں محسوس کیا کہ ہمت ضرور مردانہ ہے، مگر دل آخرکار عورت کا ہے جو سختی کے مقابلوں کے لیے بنایا ہی نہیں گیا، اس لیے تیور بتا رہے تھے کہ ''مار تو ڈالوں گی مگر...''

ان کی اس ''نیم مردانہ اور نیم عورتانہ اولوالعزمی'' پر میں نے بعد میں جو داد دی اس میں میں نے ان کو کلکتہ، دہلی، لاہور، مدراس اور پشاور تک دے دیا، صرف شہر بمبئی کو اپنے عیش کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔

الحاصل اس شور میں ظاہر ہے کہ کوئی ڈھائی سو مرد شریک تھے، لہٰذا شیر کا کیا ڈر، مگر واقعہ یہ ہے کہ دن کے وقت شیر کے گھر پر سے انسانوں کو یہ آوازیں بھی غضبناک شیروں کی آوازیں محسوس ہوتی تھیں اور میری تمام ''منشی گری'' مارے خوف کے لرزے میں تھی، لیکن محض ایک بچی کے پاس ہونے کی شرم سے میں ہمت سے اشارے کر رہا تھا۔

نادرہ بڑے حوصلہ سے بندوق تانے بیٹھی تھیں کہ اچانک ایک غلط سمت سے شیر کے آنے کا کھڑکا ہوا۔ میں نے آہستہ سے نادرہ کو اس طرف گھما دیا۔ نادرہ نے گھومتے ہی گولی ماردی اس عجلت میں نادرہ کی صرف ناتجربہ کاری تھی اس لیے گولی پیٹ میں گھس گئی۔ میں نے ابھی کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ ہوشمند نادرہ نے دوسری گولی ماری جو صحیح نشانہ پر لگی۔ یعنی آگے کے دونوں ہاتھ توڑ گئی۔ میں نے دونوں گولیوں سے شیر کے بال اُڑتے دیکھ لیے تھے اس لیے شیر زمین پر گر گیا اور نادرہ تیسری گولی مارنا چاہتی تھیں کہ میں نے ان کو روک دیا۔ انھوں نے گھبرا کر کہا ''کیوں؟'' میں نے آہستہ سے کہا کہ شیر ختم ہو چکا اب گولی مارو گی تو اس کی کھال خراب ہوگی۔ اس وقت نادرہ کی

مسرت کی بے خودی کا عالم نرالا تھا۔ بے ساختہ مجھ سے پوچھا کہ:

''میں باوامیاں سے چلا کر کہہ دوں کہ میں نے شیر مار لیا''۔

میں نے کہا ''دو منٹ اور ٹھہر جاؤ شاید یہ جوڑا ہو اور اس کا دوسرا ساتھی بھی آنے کو ہو''۔

مگر وہاں دوسرا ساتھی نہیں تھا صرف شیر تھا، اس لیے چار منٹ کے انتظار کے بعد میں نے ان کو اجازت دی کہ باوامیاں کو آواز دو۔ میں نے تو صرف آواز کی اجازت دی تھی مگر نادرہ کی وہ مثل کہ:

اب دل کہاں ٹھکانے نام آ گیا وفا کا

وہ تو اللہ کی یہ شیر ماربندی قریب تھا کہ مچان سے شیر پر ہی جست فرماتی، مگر میں پھر ''کام آیا'' اور میں نے عرض کیا کہ ''حضور ہم بھی جانتے ہیں کہ صرف آپ نے شیر مارا ہے اور کسی نے شیر نہیں مارا مگر یہ جلدی اچھی نہیں اور لوگوں کو شیر کے پاس آنے دیجیے''۔

وہ تو نادرہ قدرداں ماں باپ کی قدرداں بیٹی ہیں اس لیے میرے اس وقت کے روکنے پر ہنس کر رہ گئیں، ورنہ کوئی دوسرا اناڑی ہوتا تو شیر کے منہ پر پہنچ جاتا اور نتیجہ کے طور پر ملا رموزی اور اس کے ساتھی کسی عدالت میں کھڑے ان سوالوں کے جواب دے رہے ہوتے کہ:

''اچھا بتایئے کہ جب لڑکی کے والدین نے آپ پر اعتماد کر کے آپ کو لڑکی کے پاس مچان پر بٹھایا تھا اور آپ کو شیر کے شکار کا تجربہ بھی تھا تو آپ نے لڑکی کو اطمینان کر لینے سے پہلے شیر کے قریب کیوں جانے دیا؟''

''اچھا جب لڑکی شیر کے قریب پہنچی تو اس وقت شیر کا منہ کس طرف تھا اور اچھا اس وقت غروب آفتاب میں کتنی دیر تھی؟''

''اچھا لڑکی کس رنگ کے کپڑے پہنے تھی؟''

''جب شیر نے اس پر حملہ کیا تو آپ اس سے کتنے فاصلے پر تھے؟''

غرض اس قسم کے سوالات کے بعد لامحالہ فیصلہ میں یہی لکھا جاتا کہ:

''حسب دفعہ 1 ضمن 2 قانون ضابطہ شکار مجریہ 308 قبل مسیح۔ چونکہ ملا رموزی اور اس کے ساتھیوں کی غفلت اور اپنے فرض منصبی سے بے پروا مزاجی ثابت ہے اس لیے علی الترتیب تین

سال بامشقت اور چونکہ اس کے پاس مچان میں ایک بے لائسنس بندوق کا ہونا بھی ثابت ہے۔ اگرچہ اس نے اس کو استعمال نہ کیا لیکن بہ نظر تنبیہ بہ سلسلہ خلاف ورزی قانون اسلحہ چھ ماہ "محض" کی سزا دی جاتی ہے۔ البتہ ملزم کی خدمات عامہ اور اس کی شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے عدالت اس کے لیے جیل خانہ میں درجہ اول کی سفارش کرتی ہے اور اس عرصہ میں اس کی چار بیویاں اتوار کے اتوار اس کو خط لکھ سکتی ہیں اور وہ افسر جیل خانہ کے روبرو جواب لکھ سکتا ہے"۔

جب یہ ہو جاتا تو بتایئے کہ شیر کے شکار کی پُر لطف یاد میرے دل میں کتنے دن باقی رہتی، اس لیے میں نے نادرہ کے دل اور جذبۂ مسرت کی پروا کیے بغیر ہر ایسی خطرناک منزل پر سختی سے روک دیا کیونکہ آپ نے فیصلہ میں پڑھ لیا کہ عدالت نے ایک جگہ یہ نہ پوچھا کہ:

"اچھا بتایئے ملا رموزی صاحب جب شیر پر آپ کی نظر پڑی تھی تو خود آپ کے بہادر دل کی دھڑکن کی رفتار کیا تھی؟"

"اچھا جواب دو کہ جب شیر حملہ آور ہوا تھا اس وقت تم کس نمبر کی بیوی اور کس نمبر کے بچے کی محبت کی وجہ سے شیر کے سامنے نہ آئے؟"

"اچھا سچ بتاؤ کہ جب شیر حملہ آور ہوا تھا تو تمھارے قلب کی حرکت بند ہونے میں کتنی دیر تھی؟"

الحاصل ان حالات کے سمجھ میں آنے سے انسان شیر کے شکار میں احتیاط سے کام لیتا ہے، لہٰذا میں نے احتیاط سے نادرہ کو روکا۔ تھوڑی دیر میں ان کے محترم والدین کے حوالہ کر کے سب کو مبارکباد دی۔ نادرہ کو ہوش نہیں تھا کہ وہ شیر کی خوشی میں میری وفاداری اور شیر سے بچانے کا شکریہ ادا کرتیں، اس لیے جب وہ شیر کی پیائش کر کے اس کی تصویر کھینچ رہی تھیں تو میں نے ان کے حواس اور بندوق کے نشانہ کی تعریف کی اور ان کو قسم دی کہ آپ اس تصویر کو چاہیں جہاں بھیج دیں لیکن اخبار "ٹائمس آف انڈیا" کو نہ بھیجیں، کیونکہ "ٹائمس" میں تصویر دینا کھلے ہوئے دکھاوے کی علامت ہے جو بڑے لوگوں کا شیوہ نہیں۔

غروب آفتاب سے پہلے واپسی عمل میں آئی۔ اس وقت جنگل پر وہ سہانا پن تھا جس کے

روزانہ دیکھنے کا میں آرزومند تو ہوں مگر سائیکل پر شام کے وقت اگر جنگل کی تفریح کو جاؤں تو جنازہ بن کر تو واپس ہو سکتا ہوں زندہ نہیں۔ اس وقت میرے موٹر میں محترمہ بیگم صاحبہ، نادرہ اور پھوپھی جان صاحبہ تشریف فرما تھیں اس لیے مجھے یقین تھا کہ نصیب اعدا مجھے کسی خطرہ سے یوں دوچار ہونا پڑے گا کہ نام خدا پھوپھی صاحبہ رونق افروز ہیں۔ اِدھر میرا تجربہ ہے کہ بدنصیبی کے زمانہ میں ہر برا خیال اور خطرناک اندیشہ پورا ہو کر رہتا ہے اور اچھا خیال اور اچھی خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جیسے ہی کہ راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت ہوا فوراً ہی پھوپھی صاحبہ بولیں کہ:

''بس نادرہ گاڑی روک دو۔ ملا رموزی صاحب نماز پڑھیں گے اور لو یہ صراحی کا پانی دے دو تو وہ وضو کر لیں''۔

اس وقت محترمہ پھوپھی صاحبہ کا میرے لیے نماز کا بندوبست فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ کسی جاہل کے پاس دلیل نہیں ہوتی تو وہ ہر فقرہ پر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ڈراتا ہے اور کفر کے الفاظ نکلوانے کے لیے کہتا ہے کہ کیا اللہ میاں کا حکم بھی نہ مانو گے۔ اسی لیے اب میرے پاس نماز نہ پڑھنے کا کوئی شرعی عذر بھی نہیں تھا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تو صرف نام کا ملا رموزی صاحب ہوں یا ہوں تو ملا صاحب مگر شیر کے جنگل میں مغرب کی نماز پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔ لہٰذا دل میں تو بددعا کرتا ہوا اور ظاہر میں اجمیر شریف کے برابر مقدس صورت بنا کر موٹر سے صراحی لے کر نیچے آیا۔ وضو کر کے نماز شروع ہی کی تھی کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر موٹر فلتر و۔ اب نماز کی نیت توڑ کر اگر موٹر کے پیچھے بھاگتا اور شیر سے ٹکرا جاتا یا موٹر کسی اور سمت گیا تھا اور میں کسی اور سمت بھاگتا یا میں موٹر کے پیچھے بھاگتا اور راہ گیر لوگوں کے عوض مجھ سے چوروں اور ڈاکوؤں سے ملاقات ہو جاتی تو یا میں موٹر کے پیچھے بھاگ کر بھی موٹر کو نہ پاتا اور مارے ڈر کے کسی درخت پر بیٹھ کر نیند کے غلبہ سے میں یہ خواب دیکھنے لگتا کہ میری چھوٹی بیوی مجھے اپنے موٹر میں شام کی تفریح کو لے جا رہی ہے، کہ درخت سے میرے ہاتھ چھوٹ جاتے اور میں جب درخت سے نیچے گرتا تو وہاں شیر کھڑا ہوتا، اس لیے میں نے نماز کی نیت تو نہ توڑی مگر فوراً خیال آیا کہ شیروں کے جنگل میں شیروں کے لیے دفعہ 144 نافذ نہیں ہے جو وہ رات کے وقت گھر ہی سے باہر نہ آئیں گے اور میں اطمینان سے نماز پڑھتا رہوں۔ بس یہ خیال آتا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے پیچھے ہی

بیٹھا ہوا ایک شیر بھی مغرب کی نماز کا وضو کر رہا ہے اور اب میرے برابر ہی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونے والا ہے، اس لیے اب نماز کیسی۔ میں دل میں کہنے لگا کہ اللہ لوگوں کے ایسے مذاق سے ہمیشہ بچانا جو وہ اپنے نقطۂ نظر سے کرتے ہوں۔ کیونکہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو انعام بھی اسی وقت دیتے ہیں جب ان کا جی چاہے اور جب ہم کو ضرورت ہو تو ٹال۔

القصہ اب میں نے جوں توں کر کے بے ایمانی سے ایک رکعت تو پڑھ لی لیکن موٹر کی واپسی کی آواز نہ آنی تھی نہ آئی، اس لیے اب تو ایسا محسوس ہونے لگا گویا کوئی پاس ہی کھڑا ہوا مجھ سے کہہ رہا ہے کہ او بیوقوف! جلد نیت توڑ کر سامنے والے درخت پر چڑھ جا۔ اِدھر میں خود بھی نیت توڑ دینے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا، مگر بس میری مردانہ غیرت تھی جو مجھ کو نیت توڑ دینے سے ذرا شرما رہی تھی اور میں کہتا تھا کہ یہ عورتیں ہو کر تو شیر ماریں اور تو مرد ہو کر نماز تک سے بھاگ جائے۔ یہ سوچ کر نماز تو پڑھنے لگا مگر شیر کا ڈر جو میری رگ رگ میں بھرا ہوا تھا تو وہ کیسے نماز پڑھنے دیتا۔

خدا خدا کر کے نماز ختم ہوئی، بگر کلہم فرض نماز پڑھی، لیکن اب نوافل اور سنن کے پڑھنے کا نہ حوصلہ نہ ایمان۔ اب تو جی چاہ رہا ہے کہ بس کسی درخت پر چڑھو ورنہ یہ شیر آیا کہ وہ موٹر کی آواز آئی اور واقعی آئی۔ جب کامل اطمینان ہو گیا کہ موٹر آ رہا ہے یا آ رہی ہے تو اب میں نے سنتوں کی نیت اس ٹھاٹھ سے باندھی گویا میرے اوپر نہ جنگل کا خوف نہ تاریکی کا اثر اور شیر تو گویا میرے گھر کا خانساماں ہے۔ یہ انداز اس لیے اختیار کیا تا کہ موٹر والوں پر میرا شکاری رعب قائم رہے۔ سو الحمد للہ کہ رعب پڑا اور میں نے موٹر آ جانے سے کافی دیر بعد جب یہ دکھاوے کی نماز ختم کی تو ان لوگوں نے مجھ سے بار بار دریافت کیا کہ ''کیوں ملا صاحب ڈرے تو نہیں؟'' اس پر میں اس طرح مسکرایا جس طرح بڑے لوگ موٹر میں سے کبھی کبھار غریبوں کا سلام لیتے وقت مسکرا دیتے ہیں اور بے عقل غریب لوگ مسکرانے والے کے لیے طے کر لیتے ہیں کہ بڑا مہربان ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اصل مسکرانے والا وہ ہوتا ہے جو آپ کے گھر موٹر بھیج کر خود بلائے اور اپنے گھر پر مسکرا کر آپ کا استقبال کرے، اس لیے میرے مسکرانے کے ان لوگوں نے بھی یہ معنی لیے گویا ملا صاحب غضب کے بہادر آدمی ہیں، جو اس شیر کے جنگل میں تنہا نماز پڑھتے رہے اور نہ ڈرے۔

خدا خدا کر کے گاؤں میں پہنچے، لذیذ تر، نفیس تر، قیمتی تر، بھاری تر، مرغن تر، کھانے

کھائے۔ ایک دوسرے کی تعریفوں سے لبریز تقریریں سی ہوئیں۔ جامِ صحت سے تجویز ہوئے۔ ظاہر ہے کہ قدردان دنیا ملا رموزی کو تقریر کا اہل بھی سمجھتی ہے۔ لہٰذا جامِ صحت کی تجویز کے ساتھ مجھ سے فرمائش ہوئی میں شیر کے تجربات پر تقریر کروں۔ چنانچہ ذیل کی سی تقریر شروع کی:

''محترمین و محترمات!

بعد سلام مسنون آں کہ گزارش فدوی کی یہ ہے کہ فدوی کہنے کو تو افغان نسل ہے اور ثبوت میں نصف کے قریب پشتو اور نصف کے قریب فارسی جانتا ہے، لیکن فدوی کی اعلیٰ تعلیم و تربیت چونکہ کانپور اور لکھنؤ میں ہوئی ہے اور مضمون نگاری کا آغاز ولایات متحدہ الٰہ آباد کے اخبار ''مساوات'' مرحوم سے ہوا ہے، لہٰذا اس یکسر غیر جنگی ماحول کے اثر سے میرا دماغ خالص ریشمی و اطلسی دماغ ہو کر رہ گیا۔ اوپر سے بیویاں ملیں تو وہ میرے مضمون تک سے خواہ مخواہ ڈرنے والی۔ اسی لیے چھوٹی بیوی سے اب دور ہی سے سلام دعا ہے اور بس، اس لیے رہی سہی بہادری بھی جاتی رہی۔ تیسرے فدوی تو مفلس تھا ہی اوپر سے قوم بھی ملی تو مفلس، اس لیے آئے دن کے تفکرات نے دماغ کی حوصلہ مندی کو تباہ کر دیا۔ بس اب گویا بجز خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے تعویذوں کے میں کوئی کام ہی نہیں کرتا (تالیاں) پھر بھی آپ ایسے قدردان رئیسوں، امیروں کے ساتھ جو شیروں کے شکار میں رہا تو ذیل کے تجربات حاضر ہیں:

''مثلاً سب سے کامیاب اور معقول تجربہ یہ ہے کہ شیر کے شکار ہی کو نہ جایئے، انشاءاللہ شیر کے ہر خطرہ سے محفوظ رہیے گا (قہقہہ)

دوسرا تجربہ یہ ہے کہ شیر کے شکار میں تین دن بھوکا رہ کر جایئے تاکہ مچان میں کھانسی، چھینک اور پہلو بہ پہلو بدلنے کی طاقت ہی نہ رہے (قہقہہ اور تالیاں)

تیسرا تجربہ یہ ہے کہ مچان میں کسی ایسی خاتون کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھیے جن کو پھوپھی جان کہا جاتا ہو۔ (مسلسل تالیاں اور پھوپھی صاحبہ کا تاؤ ملا ہوا قہقہہ)

چوتھا تجربہ یہ ہے کہ شیر کے شکار میں چھوٹی بیوی کو زیادہ یاد کیجیے، ڈر دور ہو جاتا ہے۔

پانچواں تجربہ یہ ہے کہ جب شیر سے اچانک ٹکر ہو جائے اور وہ آپ کو تاؤ دلانے کے لیے لاکھ برا بھلا کہے مگر آپ ساکت کھڑے رہیے، حرکت نہ کیجیے، منہ سے ہو سکے تو ڈانٹتے رہیے لیکن

حرکت کی نہیں کہ آپ بحق گورنمنٹ ضبط۔

چھٹا تجربہ یہ ہے کہ کھلی گاڑی میں سے شیر پر بندوق نہ چلایئے۔ جھپٹ کر آنے والے شیر کو ڈانٹ کر پہلے روک دیجیے پھر بندوق رسید کیجیے۔ زخمی شیر کی تلاش پر اگر جاگیر بھی ملتی ہو تو نہ جایئے۔ اپنے مچان میں کسی کو ساتھ نہ بٹھایئے۔ ہو سکے تو مچان میں دس دن کا کھانا پانی لے کر بیٹھیے (تالیاں) مچان پر بیٹھتے ہی پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھتے رہنے کا عہد کر لیجیے۔ شیر کے شکار میں بندوق کا لائسنس گھر بھول جایئے تا کہ شیر سے زیادہ دماغ پر پولیس کا خوف غالب رہے۔ شیر کے سامنے درخت پر چڑھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ آپ کے ساتھ اگر کسی سے شیر سے لپٹ جائے تو شیر کے فوراً بندوق مار دیجیے۔ یہ انتظار نہ کیجیے کہ شیر علاحدہ ہو تو بندوق ماریں ورنہ اسی انتظار میں شیر ملا رموزی کا تصفیہ کر دے گا۔ اگر شیر آپ کے درخت پر چڑھنے کی کوشش کرے تو آپ خود سے نیچے گرنے کی کوشش نہ کیجیے (تالیاں) بکرا کھا جانے سے پہلے شیر کو مار ڈالیے تا کہ بکرے کی قیمت کی بچت سے وزیر مالیات خوش ہوں اور آپ کی تنخواہ میں اضافہ فرمائیں۔

نادرہ نام کی ہر رئیس زادی کے ساتھ شیر کے شکار میں شرکت کیجیے تا کہ ہر طرح کا آرام پائیں اور شیر سے بال بال بچ جائیں (قہقہہ)''۔

یہاں تک تقریر پہنچی تھی کہ پھر موٹر آیا۔ میں نے کہا، کیوں؟ فرمایا ''چاندنی کی تفریح اور ''ڈرائیو'' کو چلیے''۔

شب کی خنک ہوائیں، میدانی جنگل، نشیب و فراز، چاندنی سے جگمگائے ہوئے جنگلی پھولوں اور چٹکی ہوئی کلیوں کی خوشبو۔ اِدھر بیویوں کے غم سے دماغ فارغ۔ آدمی تھا میں سائیکل سوار۔ اب جو اس فردوسِ نظر صحرا میں ایک قدر دان جماعت نے یہ صحرائی سیر کرائی تو میرے دماغ کا ہلکا پن ملاحظہ ہو کہ جی چاہنے لگا کہ اسی میدان کے ہو کر رہ جایئے، مگر جیسے ہی خیال آیا کہ کل سے پھر وہی ناقدر دان بیوی بچے ہوں گے اور وہی نیم مردہ سائیکل تو ہوش آ گیا۔

گہری نیند سو رہا تھا کہ انگریزی قاعدے سے ٹھیک سترہ بجے اٹھا دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت محترمہ بیگم صاحبہ کے شیر مارنے کی باری تھی۔ مچان پر پھر لرزتے، کانپتے، ہانپتے اور دعائیں پڑھتے ہوئے جا بیٹھے، مگر دل میں قرآن پاک کی قسم سے قریب کی قسم کھائی تھی کہ وہ قدر دانی نہیں سلطنت

بھی ملے تو شیر کے شکار کا ارمان بھی نہ کروں گا، مگر اب کیا کرتا کہ خود فرمائش کر کے تو یہاں آ کر مرا تھا۔ مچان پر بیٹھے ابھی سفیدۂ صبح بھی کافی نمودار نہ ہوا تھا، شیر بھی نظر سے غائب تھا، مگر قانون یہ شروع ہو گیا کہ گلا گھونٹ کر مر جاؤں مگر نہ کھانسی سے کام لوں نہ چھینک سے۔ نہ انگڑائی سے نہ جمائی سے۔ نہ پہلو بدلوں نہ حرکت کروں، چاہے مچان کی لکڑیاں میری ہڈیاں توڑ ڈالیں۔

لہٰذا میں نے ہر چیز کو ضبط کرنا شروع کیا اور اِدھر فطرت نے اپنا اٹل مذاق شروع کر دیا یعنی اب کھانسی بھی تیار اور چھینک بھی بے تاب۔ انگڑائی بھی موجود اور حرکت کرنے کو دماغ بھی مشتعل۔ میں نے رعب ڈالنے کو بیگم صاحبہ سے کہا کہ:

''میں بڑے بڑے انگریزوں کے ساتھ مچان پر بیٹھا ہوں مگر انھوں نے تو کبھی انگڑائی سے منع نہیں کیا''۔

بے ساختہ فرمایا ''جی ہاں، مگر میرے ساتھ گول ہی بیٹھے رہیے''۔

شیر صاحب پورا بکرا ہضم فرما کر خدا جانے کس سرکاری کام کو تشریف لے گئے تھے کہ اِدھر کا رُخ بھی نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے میں نے دل میں یہ نمک حلالی شروع کر دی کہ دعا کرنے لگا کہ یا اللہ اگر شیر ہو بھی تو اس کو آج تو یہاں سے بھگا دے اور جب میں خیریت سے اپنی چھوٹی بیوی کو دیکھ لوں تب اس کو یہاں بھیج دینا، لیکن اگر میری دعائیں ایسی ہی قبول ہو جایا کرتیں تو چھوٹی بیوی مجھ سے دور کیوں رہتی۔ لہٰذا شیر آیا۔ اماں آیا وایا کہاں بس کچھ کھڑکا ہوا نہیں کہ بیگم صاحبہ بندوق تاک کر اور میں اللہ خیر کہنے کو یوں ٹل کر بیٹھ گئے کہ کوئی دس منٹ تک جیسے ہم دنیا ہی میں نہ تھے۔ جب شیر کا شبہ تک مٹ گیا تو بڑے گہرے گہرے اور تھکے ہوئے سے سانس لے کر ذرا سیدھے بیٹھے ہی تھے کہ یہ اللہ کا بندہ سامنے ہی سے لمبی انگڑائی لے کر آ ہی تو گیا۔ اب بیگمات کے بندوقی نشانے صحیح نہ ہوں گے تو کیا گاندھی جی اور جواہر لال ایسے ستیہ گرہ والوں کے صحیح ہوں گے، لہٰذا اِدھر انگلی کا اشارہ اور اُدھر شیر صاحب کی وفات۔ میں نے بے ساختہ یہ مصرع پڑھا:

حق مغفرت کرے عجب آزاد شیر تھا!

مبارک سلامت کے بعد ہی شیر کے سامنے شیر کی تصویر لی گئی۔ جب یہ تصویر بازی میں مصروف تھے تو میں نے ایک طرف ہٹ کر زور زور سے کھانسنا اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیا یعنی

کھانسی اور انگڑائی کا جو ذخیرہ مچان کی احتیاط میں ضبط کیا تھا اس کو پورا کیا۔

اب محترمہ بیگم صاحبہ کا اصرار تھا کہ اس پورے موسم میں آپ یہیں قیام فرمار ہیں اور میں کہتا تھا کہ "اب آؤں تو رام دہائی"۔ اب آپ جانتے ہیں کہ راحت، آرام، سکون، دولت اور چھوٹی بیوی مل جانے کا ارمان پورا نہیں ہوتا مگر رات دن جلنے، گھٹنے، بیویوں کے جھگڑوں کے تصفیوں اور چھوٹی بیوی کے نہ بولنے کے صدمے سہنے کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے، لہٰذا موٹر ملا، ریل ملی اور گھر آ گیا۔

خدا ان تمام علم دوست، علم نواز، علم پرور لوگوں کو تا دیر سلامت رکھے جنھوں نے میرے یوں ناز اٹھائے۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام۔ پھوپھی صاحبہ کو کچھ بھی نہیں۔ نادرہ کو دعا۔ آئندہ شیر کے شکار میں جاؤں تو خدا مصطفیٰ کمال پاشا کا سا میرا حشر کرے۔ آمین!

◆◆◆

وفد بارش

محترم ساون صاحب صدر وفد بارش!

سرکاری استقبال کے بعد میں کروڑوں غریبوں، گداؤں، بے نواؤں، محتاجوں، مسکینوں اور مزدوروں کی طرف سے آپ کی گرامی مرتبت خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں اور نہایت ادب سے اپنی معروضات کے لیے التماس ہے کہ جس وقت آنحضور بارش کا وفد لے کر ہمارے ملک ہندستان میں تشریف لانے کی تیاری فرما رہے تھے عین اسی وقت ہندستان کے کئی کروڑ باشندوں کی انجمن نے جناب کے استقبال کے لیے مجھ ناچیز کو اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، اس لیے میری ذمہ داری کی کامیابی کا ذریعہ یہ ہے کہ میں بندگانِ ہمایوں قدر کے سامنے ہندستان کے بے شمار تنگ دست باشندوں کے اُن تاثرات اور حالات و حوادث کو پیش کردوں جو آنحضور کی تشریف آوری سے رونما ہوں گے۔

عالی جاہ!

تمام دنیا کے جغرافیہ دان اور علم طبقات الارض نیز ماہرین فلکیات واقف ہیں کہ ہمارے ملک ہندستان کا محلِ وقوت خط استواء کی اس مہین لکیر کے شاید عین وسط میں ہے جو فرضی طور پر ہر جغرافیہ پڑھنے والے کو بھی فرضی طور پر سمجھائی جاتی ہے اور جس کو پڑھنے کے بعد ہر شخص بھول جاتا

ہے، اس لیے ہندستان میں سورج کی شعاعیں کچھ اس بے اعتدالی سے آتی ہیں جن سے یہاں کے باشندوں کی صحت یورپ کی صحت سے بدر جہا پست، کمزور اور ناقص تر رہتی ہے اور خصوصیت سے 1928 سے سورج میں جو داغ پڑ گئے ہیں ان کے اب تک خالی رہنے سے اس بے اعتدالی میں جو اضافہ ہو گیا ہے، اس کا سلیس مطلب یہ ہے کہ ہم ہندستانی پہلے سے بھی زیادہ بے وقوف ہوتے جا رہے ہیں، جس کا اخلاقی ثبوت ہمارے ہاں کے ہندو مسلم فسادات ہیں اور سیاسی ثبوت وہ فیڈرل نظام حکومت ہے جس پر آج تک اختلاف و بحث کا سلسلہ ہی ختم نہیں ہوتا اور یہ اس لیے کہ ہم لوگوں کو اونچی اور اچھوتی سوجھتی ہی نہیں البتہ آپس میں لڑنے مرنے کی روز سوجھتی ہے۔ پس اس ''جغرافیائی وجہ'' سے چونکہ ہم لوگ ناقص العقل ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگ عورتیں ہیں، اس لیے آج تک یہ ہوتا رہا کہ جہاں ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو محسوس و معلوم ہوا کہ آپ تشریف لا رہے ہیں۔ انھوں نے فوراً ہی آپ کی مدح و ثنا اور تعریف و توصیف میں اشعار اور مضامین کے پُل باندھنے شروع کر دیے اور آج ادبیات اردو کا وہی حصہ زیادہ شاداب، رنگین، وجد آفریں، عشق انگیز اور حسن افروز ہے جو برسات اور ساون کی گھنگھور گھٹاؤں سے متعلق ہے۔

لیکن ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا یہ طریق تعریف اُس وقت کا ہے جب کہ بلحاظ علم و عقل اور تحقیق و تفکر وہ گنوار کا لٹھ ہی دھرے ہوئے تھے اور وہ بے سمجھے بوجھے صرف لکیر کے فقیر بنے تھے، لیکن اب کہ بحمد اللہ گلی گلی اور کوچہ کوچہ مدارس عالیہ کھل گئے ہیں اور قدم قدم پر بی۔اے پاس ہندستانی مل رہے ہیں تو اب ناممکن تھا کہ ہم لوگ آنکھ بند کر کے ساون کی گھنگھور گھٹاؤں اور برسات کی شادابیوں پر تعریفی نظمیں اور افسانے ہی لکھتے رہتے اس لیے ہندستان کے غریب طبقات نے ایک ناچیز محقق کی حیثیت سے مجھے اپنا نمائندہ منتخب کر کے پابند کیا ہے کہ میں نہایت ایمانداری، دیانت اور جرأت سے حضور کی خدمت میں اُن نقصانات کی فہرست بھی پیش کر دوں جو حضور کے قیام ہند کے زمانہ میں ہم کو اور ہماری عزیز و محترم حکومت کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

حضور والا!

آپ کی تشریف آوری ہم لوگوں کے لیے صرف اس وجہ سے پُر لطف محسوس ہوتی ہے کہ آپ مئی اور جون کی جہنمی گرمی کے بعد تشریف لاتے ہیں، لہٰذا دو ماہ شدید گرمی برداشت کرنے پر

آپ قدرتاً اور عادتاً اچھے معلوم ہوتے ہیں، اس لیے آپ کی تعریف میں جو نظمیں اور قصیدے کہے جاتے ہیں وہ محققانہ کے عوض خوشامدانہ بلکہ بے سمجھے بوجھے محض نقل وتقلید عام میں ہوتے ہیں۔ لیکن اب تو زمانہ ہے سمجھ بوجھ کا، اس لیے مجھے اس جرأت کی اجازت دیجیے کہ میں حضور والا کے منہ پر حضور والا کے پہنچائے ہوئے نقصانات کو بیان کردوں۔

معلّیٰ مرتبت!

مجھے حضور والا کے ''برساتی وفد'' کے دوسرے ارکان عالیجناب اساڑھ صاحب، عالیجناب بھادوں صاحب اور عالیجناب کنوار صاحب کی خدمت گرامی میں بھی شکریہ وخیر مقدم کا ہدیہ پیش پہنچانے کی عزت وسعادت حاصل کرنے دیجیے اور اجازت دیجیے کہ میں حضور والا کے ساتھ ہی ان تینوں جلیل المرتبت ارکان کی خدمت وبرکت پر بھی اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں۔

چنانچہ جنتری کے قاعدہ سے ماہ اساڑھ کے اثرات یا ممدوح کے برساتی فیوض وبرکات انگریزوں کے ماہ جون سے شروع ہوجاتے ہیں۔ شک نہیں کہ جون کی خالص جہنمی گرمی، موت آور لو اور ''حبس بیجا بخانہ'' کے عذاب میں آپ کے مہینہ کی قدرے قلیل پانی کے چھینٹے لانے والی ہواؤں سے چند لمحوں کے لیے ہمارے کھولے اور جلے ہوئے جسم کو راحت محسوس ہوتی ہے، لیکن صرف اتنے فائدہ کے مقابل ماہ اساڑھ کی بے ضابطہ ہواؤں کے باغیانہ سے جھونکے غبار اور کوڑے کرکٹ کے جو انبار ہمارے دفاتر، محلات، مکانات، برتنوں، کپڑوں، تصاویر اور پانی کے کھلے ذخائر کو تباہ کرتے ہیں، ان کی صفائی پر علاوہ روپیہ خرچ ہونے کے بعض گھرانوں میں پھوہڑ بیویوں اور صفائی پسند شوہروں میں جوتو تو میں میں ہوجاتی ہے، اگر اس کی تفصیلات کی سماعت کے لیے جھگڑنے والے میاں بیوی کے مکان کے قریب حضور والا بھی مکان لے کر قیام فرمائیں تو امید ہے کہ ماہ اساڑھ صاحب کو ہندستان میں تشریف لانے سے منع فرمادیں۔

حضور گرامی!

آپ کے محترم ساتھی جناب اساڑھ کو ہم لوگ بارش کا دیباچہ، مقدمہ اور مقدمۃ الجیش باور کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا دیباچہ یا مقدمہ آنے والی چیز کی خوبی یا اس کی برائی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن افسوس ماہ اساڑھ اپنی تشریف آوری سے آنے والی بارش کے صحیح حالات و

حوادث، لطائف ومکروہات، منافع اور نقصانات کو واضح نہیں کرتا۔ حد ہے کہ یہ تک نہیں بتا سکتے کہ اس سال کی بارش ہوگی بھی یا ہندستانیوں کی اذانیں، نمازیں، صدقے کے بکرے اور دیوتاؤں سے درخواستیں کرنا ہوں گی، تب بھی ہوئی تو ہوئی ورنہ کال۔

تو ایسی صورت میں ہم نیم سے بھی زیادہ جاہل ہندستانی آپ کے وفد کے ان محترم رکن سے بکمال احترام دریافت کرتے ہیں کہ پھر جناب کا بارشی پیش خیمہ بن کر تشریف لانا ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپ کی جمعیۃ الاقوام کے بعض تحقیقاتی وفد۔

پھر مزید جہالت کو موصوف نہ فقط بارش کے آنے والے حالات سے ہم لوگوں کو بے خبر رکھتے بلکہ اپنے بے ضابطہ اور بے ترتیب سے ہوائی جھونکوں کے گرد وغبار میں بجلی کی کڑک چمک بھی لاتے ہیں، جس سے ہمارے بزدل بال بچوں، بدحواس نوجوانوں اور ضعیف القویٰ بوڑھوں کا مارے ڈر کے جو حال ہوتا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بعض نوجوان گریجویٹ مارے بیروزگاری کے بازاروں میں لوگوں کے جوتوں پر پالش کر کے روزی کمانے پر فخر فرمانے لگے مگر نہ ملازمت کی تو بجلی گھروں کی اور نہ سیکھا کام تو بجلی کا۔

پھر اگر ماہ اساڑھ کے اتنے ہی نقصانات ہوتے تو ہم ایسے جنگ و پیکار اور جنگی حالات و مشاغل سے دور رہنے والے فقشی جی قسم کے باشندگان ہند کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتے، لیکن آپ کے اس مہینے کے یہ اثرات تو کسی طرح برداشت نہیں کیے جاسکتے کہ جہنم سے گرم ہونے والے جون کے مہینے کی آتشیں راتوں میں پانی کے چند چھینٹے گرا دیے اور بس۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ مارے گرمی کے صحن اور کھلی جگہ ہونے سے اچانک محروم کر دیے جاتے ہیں اور رات کے اس منظر کو کس طرح بیان کیا جائے کہ پانی کے چند چھینٹوں سے آڑے، ترچھے، اونچے، نیچے، چھوٹے، بڑے، ہلکے وزنی بستر مکانوں کی چھتوں کے نیچے لے کر بھاگتے ہیں، اس امید سے کہ اب پانی مسلسل برسے گا، لیکن بستر برداری کے اس ''نیند شکن مشغلہ'' سے فارغ ہو کر جہاں پہلی جمائی لی نہیں کہ پانی غائب اور حبس حاضر۔ گھٹن اور اُمس کا یہ حال کہ اگر چھت کے نیچے سے بستر لے کر صحن میں نہیں بھاگتے ہیں تو فقط دم ہی نہیں گھٹتا بلکہ مچھروں کے پیار سے ملیریا کا عذاب مسلط ہوتا ہے۔ اب چونکہ ہمارے طبقات میں ملازم، خادم، اردلی، چوکیدار، خانساماں، ملازمہ، خادمہ

اور ماما ئیں وغیرہ نہیں ہوتیں اس لیے تمام شب پانی کے آنے اور نہ آنے، گرمی کے ہونے اور نہ ہونے سے ہم لوگ بقلم خود اپنے اپنے بستر جس طرح اندر باہر لادے پھرتے ہیں، اس میں غنودگی سے لڑکھڑائے ہوئے بال بچوں کے بیچ میں گھر کے گھبرائے ہوئے مرغا مرغیوں اور بکرا بکریوں کا آجانا اور شور کرنا ایک ایسا رحم طلب منظر ہوتا ہے جو آنحضور نے ملک چین کے اُن آفت زدوں میں بھی نہ دیکھا ہوگا جن پر بحالتِ خواب جاپان نے بمباری کی اور جمعیت اقوام نے صرف احتجاج کیا۔

معلی مقام!

آپ کے محترم ساتھی جناب اساڑھ کی ہواؤں سے بعض لوگوں کو آشوبِ چشم کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ گو اس سلسلہ سے بعض شرابی آنکھوں کا منظر حد سے سوا عشق انگیز ہو جاتا ہے، لیکن یہ حادثہ تو یوں برداشت کر لیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں کا حسن، عشق کی قدر کرنے کے عوض دولت کی قدر زیادہ کرتا ہے اور اسی لیے بی۔ اے پاس عاشقوں کو ترجیح دی جارہی ہے۔ حالانکہ حسن کی حیثیت سے زیادہ حیثیت کے عشق کے مکان پر حسن کو خود جانا پڑتا ہے اور دولت مند عشق حسن کی پروا بھی نہیں کرتا۔ مگر اس پر بھی حسن کو ہوش نہیں کہ وہ کس کی غلامی میں روزانہ خود حاضری دیتا ہے، لیکن عام آشوب چشم سے ان گھروں کا آرام تباہ ہو جاتا ہے جن میں دو چار بچوں کی آنکھیں متاثر ہو جاتی ہیں اور شاید یہی وہ مہینہ ہوتا ہے جب مقام شملہ اور منصوری میں نہ فقط بچھڑے ہوئے ملتے ہیں اور قرضدار ہو جاتے ہیں، بلکہ ہماری محترم حکومت کے مصارفِ سفر میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ گویا آپ کے وفد کے رکنِ اوّل کے زیادہ اثرات نقصان رساں ہیں اور ہاں وہ اسی مہینہ میں ہیضہ اور اس کا قرنطینہ نفع میں۔

لطافتِ نگاہِ صدر!

بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کی دشوار گزار اور طوفانی راہوں سے حضور عالی کا ہندستان میں تشریف لانا از بسکہ دوزخ میں فردوس کا اُتر آنا ہے اور شک نہیں کہ حضور کے نزولِ اجلال سے ہمارے شکر و سپاس کی گردنیں جس طرح یورپ والوں اور امریکہ والوں کے آگے خم ہیں، اسی

جذبۂ فدویت کے ساتھ حضور کے سامنے بھی خم ہیں:

اگر قبول گر پڑے عجب عزت و بزرگی!

نزہت نگاہ!

شکر و سپاس کے فدویانہ فریضہ کے بعد میری نمائندگی کا فریضۂ اولین یہ ہے کہ میں حضور معلّی کی آمد کی تشریف و نوازش کے لطائف و اثرات کو یکساں طور پر بیان کروں۔ سو شک نہیں کہ حضور گرامی جاہ کی تشریف آوری پیداوار اور نباتات کے حق میں ایک ایسی رحمت ہے جس کے فیض و عطیہ سے روح حسن بیدار و بالیدہ ہے اور ہم غربائے ہند کی جوار، مکئی، باجرہ اور چاول کی غذاؤں کے رنگین سبب آپ ہی میں ہیں۔ اب رہے گیہوں اور کپاس۔ سو وہ جتنی تعداد میں آپ ہندستان میں پیدا کرتے ہیں آپ ہی جانتے ہیں کہ وہ اتنی ہی تعداد میں ہم غربائے ہند کو ملتے ہیں یا ہندستان سے باہر چلے جاتے ہیں۔ البتہ شاداب و حسین فضاؤں کو پیدا کر کے حضور گرامی ہم ہندستانیوں کے دماغوں میں وجد و کیف، نغمہ و موسیقی، شراب و عشق، مستی و سر جوشی، رنگینی و شادابی، جوانی و خوش فکری، امنگ، ترنگ اور آرزو کی جو بیتابی پیدا کرتے ہیں اس سے صحیح معنی میں کامیاب و بہرہ مند ہونے کے لیے جب ہم تیار ہوتے ہیں تو موٹر کاریں اور روپیہ ندارد۔ اب مزید بدنصیبی کہ ہمارے ہندستان کے حسن کا بھی یہ حال ہے کہ اول تو وہ یورپ ایسی جنت ہی جنت دوشیزگی اور شادابی سے محروم۔ پھر اوپر سے جہل و ناقدردانی کا مارا ہوا، اس لیے آپ کی شاداب فضاؤں اور آبشاروں کی کوثر بہ کوثر لطافتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس کو نہ سلیقہ نہ شعور۔

اب رہے ہمارے طبقہ کے خوش ذوق و خوش فکر نقاد و مبصر۔ سو وہ آپ کے چمن پرور الطاف سے فائدہ اٹھانے جائیں تو کس طرح جب کہ ان کے پاس نہ موٹر نہ گرم سوٹ۔ اگر کرایہ کی سائیکل پر جنگل اور میدانوں کی تفریح کو جاتے ہیں تو دیر ہونے پر سائیکل والے سے وہ طوفانی تو تڑاق ہوتی ہے کہ کوتوالی جائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اب اگر غریبوں کا ذوق تماشہ اور شوق نظارہ کسی فاضل سے فاضل انسان کو تفریح کے لیے پیدل ہی لے جائے تو موٹر والوں کی نظر میں وہ قلی، مزدور، آوارہ، پاگل یا سی آئی ڈی معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے موٹر والے موٹر روک کر نہ اس سے مصافحہ کرتے نہ معانقہ بلکہ الٹا یہ دیکھا ہے کہ اگر کوئی ''بے موٹرا تفریح پسند'' انسان کسی آبشار یا سبزہ

زار کے قریب کھڑا سیر کر رہا ہو اور وہاں کسی مسلمان گھرانے کی پردہ دار عورتیں بھی موٹر میں آ جائیں تو اُلٹا اسی غریب کو ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا جاتا ہے۔ البتہ حضور محترم کی اس فیاضی کے ہم سب معترف ہیں کہ حضور کے زمانہ میں جتنی مچھلیاں ہم غریب لوگ پکڑ لیتے ہیں اتنی امیر لوگ کھا بھی نہیں سکتے اور غریبوں میں حضور کے اس ''مچھلی بخش کرم'' ہی کا صدقہ ہے جو اکثر مچھلی خوروں کا معاملہ ہیضہ تک پہنچ کر رہتا ہے، مگر آنحضور کی چھوٹی بڑی مچھلیوں میں کمی نہیں ہوتی۔ پھر کرم بالائے کرم یہ کہ ہم غریبوں کے بعض ''مچھلی دان'' اور ''مچھلی شناس'' حضرات جو آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور دیہات کی بڑی بڑی ندیوں پر جا کر تمام رات بغیر بندوق کے جال وغیرہ سے مچھلیاں پکڑتے رہتے ہیں ان کو شیر، تیندوے اور سانپ بچھو سے آپ ہی کے بے وردی فرشتے بچاتے ہیں، ورنہ یہ لوگ تو مچھلی کے شوق میں شہادت پانے اور وفات ہو جانے تک سے نہیں چوکتے اور مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے حلقہ کی پولیس!

سمندر پناہ!!

شک نہیں کہ آپ کے پانی میں رنگ و جوانی، شباب و شراب آفرینی اور نزہت و لطافت کی جو مقدرت ہے وہ ہم ایسے افسردہ، مایوس، مغموم اور تھکے ہوئے باشندگانِ ہند کے حق میں سراپا حیات و جوانی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ گو بجلی کی کڑک چمک کے بغیر برستے ہیں مگر جس تسلسل و تواتر کے ساتھ برستے ہیں اس کا ایک نقصان اور تاؤ تو پوچھیے میری عزیز و محترم چھوٹی بیوی سے اور دوسرا نقصان پوچھیے ان فیشن پسند مردوں سے جو اپنے انگریزی جوتوں کو روزانہ پالش سے حد سے سوا چمکیلا دیکھنے کے عاشق ہیں، مگر آپ کی مسلسل بوندوں اور پھوہار سے ان غریبوں کے جوتوں کی یہ چمک جیسی ضائع ہوتی ہے وہ کچھ ان ہی کے دلوں میں جا کر دریافت کیجیے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ حضور معلّٰی پانی بن کر ان کے جوتوں کا پالش خراب کرتے ہیں ورنہ آدمی کی صورت میں شدید خطرہ تھا۔ پھر حضور محتشم کی پھوہاروں کا یہ پھُس پھُسا سا سلسلہ ان کے حق میں نہ موت ہے نہ رزق، جو مزاج کے بڑے نفیس و نازک مگر خرچ سے تنگ۔ ایسے لوگوں کے لباسوں اور خام مکانوں میں ہر لحظہ جونمی اور سیل بڑھتی ہی جاتی ہے اس کے تاؤ کے کھولاؤ سے یہ آپ سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں سے جس طرح الجھ پڑتے ہیں اس کا صحیح اندازہ حضور والا ساون بن کر نہیں بلکہ غریب بیوی بن کر

ہی فرما سکتے ہیں، مگر وہ تو شکر ہے کہ غربت کی وجہ سے معاملہ طلاق تک نہیں پہنچتا ورنہ دولتمند شوہر کے ہاں تو بیوی بھاڑ میں جائے یا جہنم میں اس کا تو روپیہ سلامت رہے اور تفریحات۔ یہ تو بیوی کی قدر و خوشامد کچھ وہی شوہر خوب کرتے ہیں جو بیوی سے دولت میں کم ہوتے ہیں۔

دریا جناب!

حضور مکرم کی تشریف آوری پیداوار کے لیے کتنی ہی نافع سہی، مگر زراعت کے نیک اور مخلوق پرور جذبہ سے ہمارے جو کسان دیہات میں آباد ہیں ان پر شہروں تک آنے کے راستے حضور والا جس احسان فرما انداز میں بند فرماتے ہیں اس کی اذیت کو اس کسان سے دریافت کیجیے جس کی بیوی عین ساون کی جھڑیوں میں گھر سے غائب ہوگئی ہو اور تھانہ تک جا کر رپٹ لکھانے کے لیے نہ گھوڑا کام دیتا ہو نہ گاڑی، یا پھر حکومت کی اُس پولیس سے پوچھیے جس کو ساون کی جھڑیوں میں دیہاتی قاتلوں اور ڈاکوؤں کی تلاش، گرفتاری اور سراغ رسانی کا فوری حکم دیا جاتا ہے، یا پردے پھٹے ہوئے لاریوں کے ان مسافروں سے پوچھیے جو آنحضور کی جھڑیوں میں دیہات کا سفر کرتے ہیں، یا مجھ ملا رموزی سے پوچھیے جو آں محترم کی جھڑیوں کی نمی سے تنگ آ کر مضمون کے کاغذ کو لالٹین سے سینک سینک کر مضامین لکھتا ہے، یا اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے کاتبوں سے پوچھیے جو کاپی کے کاغذوں کو آگ سے سینک بھی نہیں سکتے اور لکھ بھی نہیں سکتے۔ یا غریب گھرانے کے ان فوج فوج بچوں کے والدین سے پوچھیے جن کے شور و غوغا لڑائی جھگڑے حضور کی جھڑیوں کے سلسلہ سے گھر سے باہر بھی نہیں کیے جا سکتے اور ان کے شور سے نازک دماغ ماں باپ گھر میں چین سے بھی نہیں بیٹھ سکتے، یا ان غریب دھوبیوں سے پوچھیے جن کے پاس بجلی اور آگ کا صحیح انتظام نہیں ہوتا اور مجبوراً کسی امیر کے کپڑے دھونے کا کام لے لیتے ہیں، یا ان بھنگیوں سے پوچھیے جو حضور کی جھڑیوں سے سرد ہو کر کسی غنڈے کے مکان میں تاخیر سے پہنچتے ہیں، یا ان پری پیکر بھنگنوں سے پوچھیے جو دلہن کی عمر میں غلاظت صاف کرنے پر مجبور ہوتی ہیں اور آپ کی مسلسل جھڑیوں سں لجا لجا کر گھروں میں جاتی ہیں اور اوپر سے ساس کی ڈانٹ بھی سنتی ہیں یا اپنی جھڑیوں کا اثر پوچھیے ان گائے بیل اور بھینس بکریوں والے مکانوں سے جن میں دن بھر یہ جانور چراگاہ کی یاد میں چیختے ہیں اور گھر والوں کا دماغی سکون و توازن باقی نہیں رہتا، یا پوچھیے ملا رموزی کے اُن دو بھائیوں اور ایک بھانجے سے جو

اپنے ہاکی، فٹبال کے میدانوں کو آپ کی جھڑیوں کے پانی سے تالاب بنا ہوا پا کر دن بھر گھر میں بیٹھے انگڑائیاں اور جمائیاں لیا کرتے ہیں اور جو وقت گزارنے کے لیے کیرم، شطرنج کھیلتے ہیں تو اپنے نیم مولوی بھائی ملا رموزی کی ڈانٹ سنتے ہیں اور جب ان سے ہاکی اور فٹبال کی ورزش چھوٹ جاتی ہے تو کم کھاتے ہیں اور زیادہ موٹے ہوتے ہیں جس کو انگریزی قاعدہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے، یا پھر ان مزدوروں سے پوچھیے جو حضور کی جھڑیوں کی بے چھت اور بے سایہ کثرت میں بھی کام کرتے ہیں اور مع اپنی بیگمات اور کالے کالے بچوں کے پھر دن بھر کی ایسی سمندری زندگی کے بعد رات کی بھی نمی اور سیل سے لبریز کھنڈروں، امیروں کے مکانوں کے سائبانوں کی کھلی ہوئی زمینوں، بند دکانوں کی بے روک گنجائشوں اور تاریک تر کوٹھریوں میں نم خوردہ گودڑوں میں سوتے ہیں اور صبح کو حکیموں اور ڈاکٹروں کے منہ پر جا کر مارے نمونیہ کے کھانستے ہیں اور روتے ہیں۔

یا پھر ان بازاری بینڈ باجے والوں سے پوچھیے جن کی روزی ان کا باجا ہے، مگر وہ مارے نمی کے بجتا کیا ہے خود باجے والوں کو بجاتا ہے اور بارشی باراتی ہنستے ہیں، یا ان غریبوں سے پوچھیے جن کے ہاں عقیقے، ولیمے اور بارات کی تقریبات ہوتی ہیں اور حضور کی جھڑیوں سے ایسی تقریبات میں چھتریوں، خستہ حال برساتیوں اور پھٹے ہوئے کمبلوں کے سہارے شریک ہونے جاتے ہیں اور گھر یوں واپس آتے ہیں جیسے طوفانِ نوح کے بچے ہوئے مسافر ہندستان میں گھس آئے ہیں، یا پھر ان تانگے والوں یا تانگوں کے ٹٹوؤں سے پوچھیے جو حضور کی جھڑیوں میں دن بھر شور بہ بنے پھرتے ہیں اور اوپر سے پولیس اور مسافروں کی بھی سنتے ہیں، یا پھر اُس ملا رموزی سے پوچھیے جس کو اپنے خام مکان کی دیواروں کے گرنے کی آوازیں نیند میں بھی آتی رہتی ہیں، یا جن کے مکانوں کی دیواریں گر جاتی ہیں اور وہ مارے چوروں کے ڈر کے رات بھر دمہ کے بیماروں کی طرح کھانستے رہتے ہیں۔

یا پھر ریل کے ان چلانے والوں سے پوچھیے جو 55 میل فی گھنٹہ کی رفتار میں راستہ دیکھنے کے ذمہ دار ہیں، مگر مارے جھڑیوں کے راستہ سوجھتا نہیں اور ناگاہ کسی بھینس پر ریل گاڑی چڑھا دیتے ہیں اور سزا پاتے ہیں۔

ندے نالے پناہ!

اب طبی قاعدہ سے جن حوادث کو سمع ہمایوں تک پہنچانا چاہتا ہوں وہ انسانیت اور انصاف

کے نقطۂ عقلی کی رو سے جس درجہ نا قابلِ برداشت ہیں امید کہ بندگانِ ذی جاہ کی انصاف گستر توجہ اس کا کافی اثر قبول کرے گی۔

مثلاً یہ ساونی جھڑیاں ہی ہوتی ہیں جو انسانوں کے پینے کے پانی کے ذخائر کو بے شمار بلاؤں سے لبریز کر دیتی ہیں۔ یہی وقت ہوتا ہے جب کنوئیں اور نل کا پانی ہم اثر ہو جاتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب معدوں کے ہضم کا نظام برہم ہو جاتا ہے۔ یہ میری منجھلی بیوی سے پوچھیے کہ اس غریب کو اس موسم میں پرہیز اور غذا کی احتیاط میں اپنے دل و دماغ کا کتنا خون جلانا پڑتا ہے۔ انسان اگر عادتاً دو سیر کھاتا ہے تو ساونی سوءِ ہضم سے بچنے کے لیے حکیم اور ڈاکٹر نصف سیر بتاتے ہیں اور اگر ان کی نہ مانیں اور نہ سنیں تو یہ ہیضہ سے ڈراتے ہیں۔ حد ہے کہ دودھ، دہی، مٹھے، پھل، میوے اور گوشت تک سے ڈرایا جاتا ہے اور انگریزی کھانا بجز میری بیویوں کے مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ میں کانٹے کو بائیں ہاتھ میں لے کر بھی دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتا ہوں بلکہ اس لیے کہ میں کانگریسی آدمی ہوں، اس لیے سارے یورپ میں تو یورپ والوں کے لباس اور ان کے اصول پر ڈنر کھاتا ہوں اور جب ہندستان میں آ جاتا ہوں تو یورپ کی ہر چیز کی مخالفت کرتا ہوں۔ اسی طرح سنا ہے کہ اسی موسم میں شراب خوار لوگ زیادہ پیتے ہیں اور تباہ ہوتے ہیں۔ وغیرہ۔

میرے ناچیز خیال میں گو حضور عالی نشان کے نقصانات میں ان سے بھی دو چند دکھا سکتا ہوں لیکن سمع مبارک کے تادیر متوجہ رہنے کی گرانی کے پیشِ نظر میں اپنے بیان کو مختصر کرتے ہوئے اتنی گزارش کی اور جرأت کرتا ہوں کہ ان حالات میں بھی میں نے یا میرے ہم پیشہ عرف ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں نے حضور انور کی شان میں جو قصیدے کہہ دیے ہیں ان کو ہم لوگوں کی حماقت تصور فرماتے ہوئے یا ہمارے ملک ہندستان کے تمام غرباء کو پہلے امریکہ کی طرح دولت مند بنا دیجیے پھر تشریف لائیے ورنہ گستاخی معاف:

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

اور ہاں مکھیوں کی کثرت بھی حضور ہی کی تشریف آوری کا صدقہ ہے۔

◆◆◆

ایک سفریہ

جب بڑے سفر کا موقع نہیں ملتا تو میں ایک چھوٹی سی سفریہ کے لیے تیار ہو جاتا ہوں تاکہ چار بیویوں کے مصارف اور پانچویں بیوی کی فکر و تلاش کی تھکن سے دماغ کو سکون حاصل ہو، اس لیے میرا نظام عمل یہ تھا کہ میں سیرت اعظم کے جلسوں کے سلسلہ سے ہوشنگ آباد، اٹارسی، ناگپور، کامٹی اور جبل پور میں تقریریں کروں گا اور دعوت نامے بھی ان ہی مقامات سے آچکے تھے کہ ناگاہ حضرت علامہ عبدالحلیم صدیقی بھوپالی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند کا مکتوب گرامی ملا کہ ''میں مقام بھیلسہ علاقہ گوالیار میں بغرض تقریر آرہا ہوں، چاہیے کہ تم ملو''۔

علامہ عبدالحلیم صدیقی نہ فقط ایک جادو بیان مقرر اور ایک تبحر عالم ہیں بلکہ وہ ملا رموزی کے وہی استاد ہیں جن کے فیض علم و فضل نے آج ملا رموزی کو حضرت ملا رموزی صاحب بنا دیا ہے ورنہ موصوف کی محنت و توجہ سے پہلے یہی آج کل کے ملا رموزی صاحب تھے، جو پہلوانوں کے دنگل دیکھتے پھرتے تھے اور ''کریما، مامقیماں'' بھی مشکل سے پڑھ سکتے تھے، پس اگر ان ہی علامہ عبدالحلیم صدیقی کے زیر سایہ نہ آجاتے تو آج کسی نہ کسی شہر میں ''غنڈا ایکٹ'' کے تحت دھرے ہوتے اور ضمانت دینے والے بھی نہ ملتے اس لیے اپنے طویل سفر کے تمام تقریری نظام کو برہم کر کے کلہم چار اسٹیشن فاصلہ کے سفر کے لیے یوں تیار ہو گئے گویا یورپ جا رہے ہیں اور وہ بھی

جناب سر آغا خاں کے ٹھاٹھ سے کہ اب واپس آئے تو آئے ورنہ سوئیٹزرلینڈ ہی میں رہیں گے اور وہ بھی بین الاقوامی مہمان کی حیثیت سے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہر شخص کے دوستوں میں چار دوست ایسے ضرور ہوتے ہیں جنھیں نہ موت ملتی نہ رزق اس لیے اگر ایسے بے رزقے دوستوں سے آپ جھوٹ کو بھی کہہ دیں کہ چلتے ہیں آپ میرے ساتھ فلاں سفر میں تو یہی وہ ہوتے ہیں جو قیامت کے خوف سے بھی انکار نہیں کرتے اور آپ سے پہلے ریل کے اسٹیشن پر ٹہلتے نظر آتے ہیں۔

اِدھر چھوٹی بیوی کی جدائی اور بات نہ کرنے کے صدمہ نے میرے گھر کو سینٹرل جیل جو بنا رکھا ہے تو تقریر کی دعوت تو بڑی بات ہے۔ آپ مشاعرہ میں بلا کر دیکھ لیجیے اگر مغرب کی نماز پڑھتے ہی نہ حاضر ہو جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میرے مخالفوں کی سزا، اس لیے میں نے عادت کے موافق پہلے تو اپنے اُن دوستوں سے سفر کے لیے کہا جو میری تقریر پر جان دیتے ہیں۔ مگر شور بختی کہ ان میں زیادہ تعداد ایسوں کی ہے جو بال والے بھی ہیں اور بچے والے بھی اور آپ جانتے ہیں کہ اولاد کے بعد نہ جسم کا حسن باقی رہتا نہ روپیہ، اس لیے میرے صاحب اولاد دوست تو میرے ساتھ رعایتی ٹکٹ ہی سے سفر کر سکتے ہیں یا پھر یکسر بے ٹکٹ، مگر اب جب سے کہ ریل والوں نے بے ٹکٹ مسافروں کو جنگل کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر اتار دینا شروع کر دیا ہے تو میرے ایسے شریف دوستوں نے بھی بے ٹکٹ جانے کی قسم کھالی ہے۔ لہٰذا اب تو میرے ساتھ وہی جاتے ہیں جن کا سسرال مالدار ہوتا ہے اور بیوی نافرماں بردار۔

مولوی حیات مہری منشی فاضل کو فطرت کی غلط بخشی سے وہ ملازمت ملی ہے کہ ان کو اگر حبشہ کا تاج و تخت بھی دیجیے تو وہ مارے ملازمت کے اس کا چارج لینے بھی نہیں جا سکتے۔ اب رہے دوسرے اور تیسرے دوست تو ان میں سے اگرچہ ایک دو بے رزقے تو نہیں مگر ہاں ''بے سسرالے'' جو ہیں تو ظاہر ہے پھر ان کی 24 گھنٹہ کی فراغت۔ وہ تو خدا جانے مجھ اکیلے ہی سے وہ کون سے بے شمار گناہ ہوئے تھے جن کے ثواب میں میرے دُبلے پتلے اور جاپانی کپڑے کے بنے ہوئے دامن سے یہ مظلوم چار جانیں باندھ دی گئیں جنھیں لوگ باگ میری چار بیویوں کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ پس چار بیویوں کے شوہر ہو جانے سے اب مجھے نہ رخصت علالت کا حق نہ

رخصت اتفاقیہ کا اور جوان کی بے اجازت جاتا ہوں تو عورتوں میں بے مروت اور ظالم مشہور ہوتا ہوں۔ اِدھر کم لکھی پڑھی عورتوں میں میرے لیے یہ بے ثبوت خوف پہلے ہی سے بھرا ہوا ہے کہ میں ہر عورت کے لیے بے وجہ بھی کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیتا ہوں تو ایسی حالت میں میرے لیے یہ چار قدم کا سفر بھی محال سا ہو رہا تھا کہ بطریق ناگاہ مولانا حسن مدحت دور سے تشریف لاتے نظر آئے، یہ ملا رموزی کے بروزی بھائی ہیں یعنی اگر ملازمت پر آجائیں تو بال بچے بھی تہہ و بالا ہو جائیں مگر دفتر کا ناغہ نہ کریں اور اگر ترکِ ملازمت پر تُل جائیں تو وزارت ملے تو منہ نہ لگائیں۔ پس مارے خوشی کے جس طرح میں نے ''السلام علیکم'' سے پہلے ہی کہا کہ چلتے ہو۔ ویسے ہی انھوں نے بھی ''وعلیکم السلام'' سے پہلے ہی کہہ دیا کہ چلو۔

یہ واقعہ ہے تقریر اور سفر سے پورے پانچ دن پہلے کا، مگر:

اب دل کہاں ٹھکانے نام آ گیا سفر کا

اس لیے ہم دونوں کی روزانہ ملاقاتیں مارے خوشی کے جنت کا نمونہ بنی رہتی تھیں۔ ہر دس بارہ باتوں کے بعد اس سفر کا کوئی دلچسپ پہلو سامنے لاتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ میں نے تو مارے چھچھورے پن کے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تقریر کروں گا، مگر انھوں نے ایسی بردباری اختیار کر لی تھی جس سے خوف پیدا ہوتا تھا کہ گویا یہ مسلح بغاوت کا انتظام کر کے رہیں گے۔

اب چونکہ یہ طے کر لیا تا کہ اس سفر کو یورپ کا سفر سمجھتے رہیں گے اس لیے میں تو ہر شخص سے اس طرح ملنے لگا گویا بس یہ آخری ملاقات ہے۔ اب اگر خدا ہی حفاظت سے واپس لے آیا اور جنگ جرمنی یا بحری طوفانوں سے بچ گئے تو واپس آئیں گے ورنہ بھائی کہا سنا معاف کرنا۔

وہی لوگ اچھے ہیں جو سفر کے معاملات میں اپنی بیوی کے محتاج نہیں ہوتے، مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ایک سے اجازت لیجیے تو دوسری اور دوسری سے تو تیسری اور تیسری سے تو چوتھی اور اب انگریزی قاعدہ سے پانچویں کا بھی حوصلہ کر رہا ہوں، اس لیے سمجھ لیجیے کہ بیویوں کے اس غدر 57ء کے منہ میں رہ کر قوم اور ملک کی خدمت کس طرح کر رہا ہوں؟ پس سفر تو بڑی چیز ہے وہ جو چھوٹی کے گھر کی طرف ہی جاتا ہوں تو ولایت کے سفر کا مزا آ جاتا ہے، اس لیے میں

نے یہ سوچ کر کسی سے کچھ نہ کہا کہ رات کے رات تو واپس آ ہی جاؤں گا، اس لیے دل میں ''یا حق'' کہا اور ریلوے اسٹیشن کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خدا نے عورت کو تاڑ جانے کی جو آنکھ دی ہے وہ ولایتی عینک والے مردوں کو بھی نہیں ملی اور ہندستانی لیڈروں کو اگر عورت کی یہ راز داں نظر مل جاتی تو آج یہ ہندو مسلم تعصب ہی کیوں نظر آتا۔ اس لیے ابھی شیروانی کے بٹن ہی لگا رہا تھا کہ آواز آئی:

''کہیے کیا پھر کہیں کا ارادہ ہے؟''

میں نے جھنجلا کر کہا ''پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟'' کہ دوسری آواز آئی:

''جانے دیجیے جانے دیجیے۔ معلوم ہو ہی جائے گا کہ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں''۔

اس آواز میں جو سی آئی ڈی پن تھا اس سے میں ذرا گھبرایا تو مگر فوراً ہی یوں سنبھل بھی گیا کہ اب مجھے بھی عورتوں کا ڈاکٹر ہی سمجھیے، جس کو کہیے ایک نظر ڈال کر بتا دیتا ہوں کہ یہ۔

اب میں نے مناسب سمجھا کہ جس طرح بے روشنی کے سائیکل اور موٹر والے پولیس والے کے سامنے سے تیزی سے گزر جاتے ہیں اسی طرح میں ان بیویوں میں سے گزر کر باہر ہو گیا۔

مصیبت یہ ہے کہ عجلت کے وقت اول تو تانگہ ہی نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو ایسا گویا اس کا گھوڑا گھوڑا نہیں ہے بلکہ ملک چین کا کوئی باشندہ ہے۔ لہٰذا ایسے تانگہ میں سوار ہو کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا گھوڑے کے عوض اس تانگہ کو ہم خود کھینچ رہے ہیں، ادھر اکثر تانگے والے حد سے گزرے ہوئے غریب، محتاج، تنگدست، بال بچوں والے یا پھر ان میں کے بعض حد سے گزرے ہوئے غنڈے، آوارہ، جاہل اور تو تڑاق والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا گھوڑے کی اُلٹی، دھیمی یا جان سے مار ڈالنے والی چال کے لیے ان سے کچھ کہنا گویا اپنے ہی ازالۂ حیثیت عرفی کا بندوبست کرنا ہے۔ حد ہے کہ آپ کے ساتھ کیسے ہی مہذب مہمان ہوں مگر جہاں ان کے دل میں طے کیے ہوئے داموں سے کم دام ان کو دیے نہیں کہ یہ آپ سے اور تانگہ سے باہر ہو کر یہ تقریر شروع کر دیتے ہیں۔

''میں نے تو آپ کو اشراف آدمی سمجھا تھا اس لیے سواری کے وخت کچھ نہ کہا''۔

''اس میں کیا ہو گا، میں تو پورے دس آنہ لوں گا''۔

''اچھا صاحب،ہم تو بیہودہ ہیں مگر آپ تو دام رکھ دیجیے ہمارے''۔

''کیا قرآن کی قسم ایک پیسہ کم نہ لوں گا''۔

اب ظاہر ہے کہ تانگہ کا جھگڑا سڑک پر ہی ہوسکتا ہے اور سڑکوں پر دفعہ 144 نافذ نہیں، جو کوئی نہ گزرے لہٰذا جہاں تانگہ والے کے جھگڑے کی تقریر سنی نہیں کہ سینما کا تماشہ شروع ہوگیا:

''ابے شور کیوں کرتا ہے، جانتا بھی ہے کون صاحب ہیں''۔

''جی جانتا ہوں مگر پیٹ کو کہاں لے جاؤں''۔

''چوک سے آئے ہیں بیٹھ کر اور رستہ میں دو جگہ گھنٹہ گھنٹہ بھر کھڑے رہے حضور کے انتظار میں''۔

''خدا پاک کی قسم صبح سے گھوڑا الگ بھوکا ہے، اس پہ یہ دس پیسے دے رہے ہیں''۔

''اچھا صاحب تو اب آپ تانگہ کا نمبر بھی لے لو اور مجھ کو بھی پھانسی پر چڑھا دینا، مگر میں تو دس آنہ سے کم لوں تو اس کی بھی... کیا کہنا ہے بڑے اشراف آدمی آپ ہی تو ہیں''۔

''اچھا تو جب جیب میں دام نہیں تھے تو تانگہ میں کیوں قدم رکھا آپ نے''۔

''اچھا آپ تو تھانہ میں چلیے ذرا داروغہ جی خود فیصلہ کردیں گے''۔

''میں سامان تو نہیں اتارنے دوں گا، اب چاہے آپ میرا تانگہ ہی بند کرا دینا اور کیا تو''۔

''اب بھوکے تو مر ہی رہے ہیں آپ اور سزا دلوا دینا اور نہیں تو''۔

''اچھا تو آپ بیچ میں بول رہے ہو تو آپ ہی رکھ دیجیے دس آنے میرے، اور کیا تو''۔

''بس منہ چلانا آتا ہے آپ کو جیب میں دام بھی ہیں اتنے''۔

''ملا صاحب آپ ہی دو آنے اور دے دیجیے وہ تو ہے گدھا بدتمیز''۔

''جی ہاں دام کے دام کھا جایئے اور ہم ہی گدھے بدتمیز ہیں، آپ تو بڑے کہیں کے... تمیز دار آدمی ہیں''۔

''جی ہاں گورنمنٹ بھی آپ ہی کی ہے، بس تو پھر ہمارے بال بچوں کو سولی پر چڑھا دیجیے، ارے ہاں تو''۔

سر راہ تانگہ والا اگر یہاں تک تقریر کرگزرے تو قانون داں آدمی ڈر جائے گا کہ کہیں مجھ

پر ''اشتعال انگیزی کا مقدمہ'' نہ چل جائے، اس لیے تانگہ میں امن سے بیٹھنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو جو تانگہ والا مانگے وہ دے دیجیے یا پھر اپنا سامان خود لاد کر صبح سے اسٹیشن روانہ ہو جایئے۔ راستہ میں جب تانگے والا خود خوشامد کر کے سوار کرے تو بھی نخرے کے ساتھ تانگے میں رونق افروز ہو جیے۔

(2)

یورپ کے مشہور عالم مدبرین اور قائدین میں زیادہ ایسے ہیں جو اپنی ابتدائی زندگی میں اخبار نویس، نامہ نگار اور مضمون نگار رہے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے نامور صدر اعظم لائڈ جارج، روس کا قائد اعظم لینن اور اٹلی کا موجودہ وزیر اعظم مسولینی شروع میں اخبار نویس رہ چکے ہیں۔ ترکی میں طلعت پاشا شہید صدر اعظم ترکی اور مارشل عصمت پاشا صدر اعظم ترکی شروع میں مدارس حربیہ کے مدرس تھے۔ ملا رموزی بھی آٹھ بس تک ایک مدرسہ میں ''ماشٹر صاحب'' اور آج کل ایک اخبار نویس ہے، اس لیے میرے مدرسی اور استادی کے زمانہ والے اب بھی مجھے ''ماشٹر صاحب'' کہتے ہیں۔

اس لیے میں جس تانگہ پر سوار ہوا اس کے چلانے والے مجھے ''ماشٹر صاحب'' کہنے والے تھے۔ لہٰذا تانگہ کی اجرت طے کیے بغیر مجھے ریل تک جو لے کر چلے تو دس بارہ جریب آگے جاتے ہی گھوڑا اچانک اُلٹا چلنے لگا۔ میں نے مارے ڈر کے قل ہو اللہ پڑھنا شروع کیا اور تانگے والے نے گھوڑے کو مارنا شروع کیا۔ وہ جتنا مارتے تھے وہ اُتنا ہی الٹا چلتا تھا۔ اور یہ جتنا اُلٹا چلتا تھا میں اُتنا ہی زور سے وظیفہ پڑھتا تھا، مگر تانگے والے تھے کہ اُدھر بے تحاشہ گھوڑے کو مارتے تھے اور اِدھر مجھ سے کہتے جاتے تھے کہ ''ماشٹر صاحب ڈرومت ابھی سیدھا ہوا جاتا ہے''۔

مگر میں سوچتا تھا کہ خاصی مار کھا کر گھوڑا جب بھی سیدھا ہو گا تو پوری قوت سے بھاگے گا اور اس بے تحاشا بھاگ میں معلوم نہیں گھوڑا درخت سے ٹکرائے گا یا میں؟ مگر تانگے والے تھے کہ مجھ ایسے مہین نظر والے اور دور کی سوچنے والے کو برابر تشفی دے رہے تھے کہ ''کوئی ڈر نہیں ہے بیٹھے رہیے'' کہ لیجیے وہ ترچھا چلنے لگا۔ میں دل مضبوط کر کے بار بار کہتا کہ ''ارے بھئی، نیچے اتر کر اس کو سنبھالو'' مگر انھیں اپنے ضابطہ پر اتنا بھروسہ تھا کہ ہر لحظہ مجھی کو بزدل سمجھ کر ڈانٹ دیتے تھے اور

گھوڑے کو مارے جار ہے تھے، لہٰذا گھوڑا بھی آخر کار جاندار تھا۔ وہ ہر بار کے ساتھ بھاگنے، بدکنے، اچھلنے، کودنے اور رُک جانے کے وہ وہ بے قاعدہ پہلو بدلتا تھا کہ میرا کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو تانگہ کے دونوں پہیے ایک نالی میں یوں اتر گئے کہ میرے سامنے مکان کی ایک دیوار تھی اور دوسری طرف گھوڑے کے لیے بھاگنے سے موت کی تصویر، مگر تانگے والے تھے کہ اب بھی اوپر ہی سے گھوڑے کو مار رہے تھے اور اس عرصہ میں انھوں نے میری تہذیب کی پرواہ کیے بغیر گھوڑے جو جو فحش گالیاں دیں ان کو سن کر میں نے طے کیا کہ آئندہ ہر مجلس قانون ساز میں یہ سوال بھیجوں گا کہ:

''براہِ کرم حکومتیں بتائیں کہ جب وہ فحش مضامین، فحش اشعار اور فحش اشتہاروں کو بحق حکومت ضبط فرماتی ہیں تو کیا وجہ ہے جو وہ فحش گو تانگہ والوں کو ضبط نہیں فرماتیں، جن کی فحش گوئی سے تعلیم یافتہ افراد کے اخلاق پر مضر اثر پڑتا ہے، اس لیے ہونا چاہیے کہ آئندہ تانگے والوں کے لیے بھی کم سے کم مڈل پاس ہونا لازمی قرار دیا جائے''۔

مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اب جب کہ شوہر کے لیے بی۔ اے پاس ہونا اور ملازمت کے لیے سند یافتہ ہونا ضروری قرار دے دیا گیا ہے تو بے روزگاری کے صدقے تانگہ والوں کے لیے کم از کم لکھا پڑھا ہونا بھی لازمی قرار پا ہی جائے گا ورنہ اردو ہندی جاننے والوں کو تانگہ چلانے کے لیے ترجیح دی جائے گی۔

آج مارے گھبراہٹ کے ایک گھنٹہ پہلے ریل کے اسٹیشن پر جا پہنچا تھا، اس لیے تانگے والے نے اجرت لینے میں کافی بحث فرمائی۔ ان سے فارغ ہو کر ایک چائے کی دکان پر جا بیٹھا۔

یورپ میں چائے کی دکانوں عرف ہوٹلوں میں عشق و محبت کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ مخبری، جاسوسی، زہر خورانی، اغوا، نکاح، شادی اور ولیمہ کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ حکومتوں کی حکمت عملی اور بین الاقوامی مسائل پر زور و شور کے مباحثے، مکالمے، تنقیدیں اور تبصرے ہوتے ہیں۔ اخبارات پڑھے جاتے ہیں مگر ہندستانی ہوٹلوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ:

''اللہ پاک کی قسم بال بال بچ گیا تجو رات کو ورنہ میں نے منہ توڑ ڈالا تھا ایک ہی چانٹ میں''۔

''کیا ملا رموزی کا بھائی، ارے قرآن کی قسم اِشاق میاں کیا کہتے ہو وہ ایک نہیں دس ملا رموزی کے بھائی کو لے آئے، مگر میں تو یہ کہتا ہوں اِشاق پیارے کہ وہ منہ در منہ تو آئے''۔

''غفورا ذرا تو چپ رہ میرے یار بات تو کر لینے دے ٹھیک سے مجھ کو پھر تو بھی کہہ لینا اپنی''۔

''قرآن شریف کی قسم میں اب بھی اس کو بہت ہوں، اِشاق میاں پر کیا کروں کہ رات میرے پاس چھری نہیں تھی، بس دو سال کی تو جیل ہوتی نا۔ قسم خدا پاک کی ظہورا تو ہوتا تو ذرا دیکھتا اُس دھیڑنی والے کو''۔

''اماں ہم سے کیا کہتے ہو۔ بیں وخت تو بھاگا ہے ہمارے سامنے ڈسکی رستی تو کوئی ہم سے پوچھے''۔

''ابے برف تو اور ڈال کر لا۔ دو آنہ کا گلاس اور برف کے نام... لے لو پیارے ایک ایک گلاس کے چار چار آنے، تمھارا بھی یہی وخت ہے ورنہ قرآن کی قسم پھر کوئی نہیں پوچھے گا تم کو''۔

''منہ توڑ ڈالوں گا... نقد دام دیتے ہیں تو مال بھی عمدہ لیں گے کوئی حرام کے دام ہیں''۔

''ارے وہ خود ٹیں ٹیں کر رہا ہے اس کو چپ کر پہلے...''

''السلام علیکم''۔

''ابے یہ رات کو سنیما میں کیا جھگڑا کر رہا تھا تو؟''

''کچھ بھی نہیں حمید بھائی وہی قصہ تو کہہ رہا ہوں''۔

''ارے توبہ ملا صاحب معاف کرنا صاحب میں نے دیکھا ہی نہیں آپ کو ابے ہمارے مولانا کے لیے بھی ایک گلاس لا جلدی''۔

''کہو صاحب لڑائی کی کوئی خیر خبر؟''

''مگر صاحب غضب کے اشتہار پڑھتے ہو آپ جب دیکھو بس اشتہار ہے اور آپ۔ کیوں صاحب تو یہ اب جرمنی کیا بالکل ہی سو گیا؟''

''مگر صاحب اس کو بھی ایسا ویسا مت سمجھو، کسی فکر ہی میں ہوگا وہ بھی''۔

''ماشاء اللہ مولانا صاحب کیا کچی بات کہی ہے آپ نے۔ ابے ذرا شور تو مت کرو۔ اِشاق

میاں قرآن پاک کی قسم اپنے ملا صاحب نے بھی وہ نام پیدا کیا ہے کہ سبحان اللہ اچھے اچھے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ خدا کی قسم اپنی تو جان حاضر ہے ملا صاحب آپ کے لیے۔ قرآن کی قسم آدھی رات کو حکم دو تو حاضر ہیں''۔

''ارے صاحب اور تو پیو''۔

کہ ناگاہ حسن مدحت نظر آئے اور ہم دونوں چودہ چودہ آنہ کا ٹکٹ لے کر ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں نے اس مختصر سفر کے لیے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میں دل میں یہی سمجھوں گا کہ یورپ جا رہا ہوں، اس لیے ریل چلی۔ خیال تو یہ تھا کہ ریل میں حسن مدحت صاحب سے پُر لطف صحبت رہے گی، مگر وہ یوں چپ ہو گئے گویا ان کے ہاں آج مذاق دل لگی کی تعطیل ہے، اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ وہ جو ہم دونوں خوش فکری، خوش ذوقی اور لطافتِ خیال ونظر کی رنگین دولتوں کے مالک ہو کر آئے تھے، تو کنجوس فطرت نے ہم دونوں کو یہ سزا دی ہے کہ حسن مدحت بال بچوں اور میں عشق کے غم سے خالی نہیں اور احسان یہ کہ دونوں ناکام۔ اسی طرح خوش ذوقی زندہ رہتی ہے دولت سے اور وہ ملتی ہے ایسوں کو جن کو نہ شعور عیش، نہ سلیقۂ فیض وبخشش۔ معنی یہ ہوئے کہ دونوں سفر اور لطفِ سفر سے اس درجہ ''تنگ دست'' تھے گویا ریل میں بیٹھتے ہی افسردگی کی موت طاری ہو گئی اور موت طاری نہ ہوتی تو ریل کے درجہ سوم میں ہم ایسے بلند نظر اصحابِ علم وصلاحیت پر مسرت کہاں سے طاری ہوتی۔

یہ تو جب ہوتا کہ کوئی قدردان ریلوے کمپنی اپنے عالی نظر شاعروں، مقرروں اور اصحابِ لطافت کے لیے کوئی جنت کو شرمانے والی مخصوص ریل گاڑی بناتی اور ہمارے سفر کے لیے مخصوص کر دیتی تو ہم بتاتے سفر میں خوش گفتاری کے نمونے، مگر یہاں تو عالم یہ ہے کہ ریلوے کے مالکوں کو خطِ عشق لکھوں تو سمجھتے ہیں کہ ہے کوئی فدوی دعا گو روپیہ چاہتا ہوگا، اس لیے تعریف کا خط لکھ رہا ہے۔ لہٰذا ایسی بے سمجھ ریلوں میں مذاق اور تفریح کے عوض ہم ایسے ''خوش ذوقے'' اگر اونگھنے لگے تو کیا خطا کی۔

اِدھر پھر سفر بھی تو ملاحظہ ہو کہ کلیم چار اسٹیشن کا۔ گویا سفر کی صبح ہوئی نہیں کہ پھر بے سمجھ

بیویاں اور نوکری کا بھاڑ اور ایک غصہ میں تو ہم دونوں ہمیشہ ہی مبتلا رہتے ہیں وہ یہ کہ اچھا آج تو کہنے کو ہم نے ریل میں مذاق اور ظرافت سے کام نہ لیا، لیکن اس سے قبل کی تو ساری عمر مذاق ہی میں گنوادی۔ پھر صلہ کیا ملا۔ صرف یہ کہ ان کو بیوی بچے گویا اُلٹی کمائی اور ملازمت کی مصیبت اور مجھے یہ کہ ''ملا رموزی بڑے مذاقیہ آدمی ہیں، روتوں کو ہنساتے ہیں''۔ یا پھر یہ کہ ''ملا رموزی کے قریب ہی نہ جانا ورنہ مضمون لکھ دیں گے''۔

اب فرمایئے جب ہماری لطافت، ظرافت اور زندہ دلی کو جہالت کے زور سے یہ سمجھا گیا ہو اور وہ جاہلانہ صلے ملے ہوں تو پھر ہم دونوں ریل کی اس ذلیل سی سفریہ میں باغ و بہار بنتے تو کس طرح۔ حالانکہ یہ امر حقیقت ہے کہ حسن مدحت میں لطافت فکر و بیان کی ایک ایسی صلاحیت ضرور موجود ہے جس کی اگر نوازش کی جائے تو ان کے افکار و مقالات سے ادب اردو کا بہرۂ لطافت شاداب ہو جائے، مگر صرف ہندستانی ہونے کی وجہ سے یہ تک نہ ہوا کہ کسی قدر دان نے ان کو ڈنر پر اور مجھ کو ولیمہ ہی میں شرکت کی عزت عطا فرمادی ہوتی تو آج ہم دونوں لطافت ہی لطافت نوجوان ریل گاڑی میں یوں مرثیہ میر انیس بن کر تو بیٹھتے کہ جو دیکھتا وہ ہم سے پہلے ہمارے اوپر رونے پر مجبور ہوتا۔ ہاں اس اکثر یاس و افسردگی اور بے تجھی بوجھی موت سے بچنے کے لیے کبھی حسن مدحت اپنی ہی تنخواہ سے خریدا ہوا سگریٹ روشن فرمالیتے اور میں اپنی ناقدردان برادری پر مرثیہ کہنے کے لیے ریل کی کھڑکی سے منہ نکال کر کچھ گنگنانے کی کوشش کرتا تھا کہ ناگاہ میرے منہ کے سامنے اسی معزز ہندو بھائی نے پنڈت موتی لال آنجہانی کے مشرقی آداب زندگی پر گفتگو شروع فرمادی۔ میں اس گفتگو کو غور سے سنتا رہا۔ اس میں سے میں نے ایک ہی خوبی گرفت کی۔ وہ یہ کہ ہندو قوم کے ہر فرد میں تہذیب و اخلاق کی اتنی بلندی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ باوجود اختلاف خیال کے بھی جب اپنے قومی کارکنوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو بے حد احترام اور بے اندازہ تعظیم کے ساتھ، لیکن مسلمانوں میں اخلاق اور تہذیب کی پستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اگر ان کو کسی سے اختلاف ہو جائے تو اول تو منہ پر ہی لاکھوں سنادیں اور ملاقات کریں بھی تو خالص منافقانہ یعنی دل میں کچھ اور منہ پر کچھ۔ اخباروں میں ایسی ایسی لکھیں کہ پڑھا نہ جائے۔ ایسے ایسے اشتہارات چھاپ دیں کہ تہذیب سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ غرض جس مسلمان کو دیکھیے مسلمان ہی

کا ستایا ہوا ملے گا۔

(3)

اب جب ریل کے سفر میں اپنے ساتھیوں کے لانے سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ بھی ویسے ہی خاموش رہے جیسے میرے خطوط کے جواب میں میری چھوٹی بیوی تو میں نے ریل کی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر غزل کہنے کی کوشش کی، لیکن دماغ ہی تو ہے۔ سو جب یہ ناز اور نخرہ پر آ جاتا ہے تو مسکراتا ہوا پھانسی کے تختہ پر تو چڑھ جاتا ہے، مگر کسی کے اثر سے نہیں ڈرتا۔ اس لیے اس نے بھی غزل کہنے سے انکار کر دیا۔ اب صاف بات یہ ہے کہ میں جو ریل میں اپنے دماغ کو مصروف کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس میں راز صرف اتنا ہی تھا کہ میں تقریر کرنے کے خوف سے گھبرا رہا تھا۔ اِدھر یہ سن کر اور پریشان تھا کہ اس مرتبہ مجھ سے پہلے اور بڑے بڑے بولنے والے بھی بولیں گے۔ اِدھر یہ بھی شرط تھی کہ تقریر ''باغیانہ نہ ہو'' اور مجھے میری وہی تقریر پسند آتی ہے جس سے بغاوت نہیں تو کم سے کم ہندو مسلم فساد ہی کھڑا ہو جائے اور جو یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہی پیدا ہو جائے تا کہ آج کل کی طرح بعض لیڈروں میں میں بھی شمار ہونے لگوں۔ تو قوم کے حقوق کی حفاظت کے نام سے کچھ نہیں تو چندہ ہی ہاتھ آئے اور روزانہ ریل کے درجۂ دوم ہی میں گھومتے پھریں اس سے صحت ہی اچھی رہے گی۔ اِدھر یہ منجھلی اور بڑی بیوی کے خالی خولی نخروں اور ان کے فرضی غرور سے محفوظ رہیں گے، مگر افسوس کہ دماغ سے تقریر کا خوف اسی طرح کم نہ ہوتا تھا جس طرح حکومت اسپین میں باغیوں کا اور چین میں جاپان کی فتوحات کا زور کم نہیں ہوتا۔ اور کہنے کو ان کے خلاف لاکھوں بددعائیں ہو رہی ہیں، مگر طاقت کے سامنے نہ تعویذ گنڈے کام آتے نہ بددعا۔ اس لیے میں نے اپنی فطرت سے کام لیا۔ یعنی میری فطرت ہے کہ جس چیز کو خطرہ سمجھتا ہوں ''یا حق'' کہہ کر اسی کے منہ پر کود پڑتا ہوں لہٰذا میں جو تقریر سے ڈر رہا تھا تو میں نے اب تقریر ہی سوچنا جو شروع کر دی تو دماغ کو بھی بے حیا بن کر کام کرنا پڑا، لہٰذا میں نے سوچا:

1۔ مثلاً اس مرتبہ کی تقریر سے پہلے میں وہاں کے لوگوں سے بہت زیادہ اور مصنوعی طور پر پھول کر بات کروں گا، جیسا کہ بعض ہندستانی اپنے غنڈے ملازموں سے تو ہنس کر راز تک کی

باتیں کرتے ہیں اور جب مجھ ایسے ذی علم اور حاجت مندوں سے ملتے ہیں تو بڑے رعب داب والے بن کر۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہاں کے باشندے تقریر سے پہلے ہی آدھے کے قریب مجھ سے دب جائیں گے۔

2۔ مثلاً میں نے سوچا کہ اس مرتبہ جاتے ہی وہاں کے لوگوں سے میں اتنے موٹے موٹے اور گاڑھے عربی الفاظ بولوں گا جس سے وہ سہم جائیں گے کہ بلا کے ذی علم مولوی صاحب آئے ہیں۔

3۔ مثلاً میں نے سوچا کہ میں جاتے ہی کہوں گا کہ میں آج کل پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔ جب لوگ کہیں گے کہ فرمایئے فرمایئے وہ بھی تیار ہوسکتا ہے تو ایک آدھ عمدہ قسم کی غذا تیار کرالوں گا۔

4۔ میں نے سوچا کہ تقریر سے قبل خالص مذہبی مسائل پر گفتگو کرتا رہوں گا جس سے میری مذہبی معلومات کا رعب طاری ہو جائے گا۔

5۔ ہر نماز جماعت سے پڑھوں گا اور طویل وظیفہ بھی۔

6۔ بہت کم مسکراؤں گا اور ہنسی کو بالکل ہی چپتا رہوں گا۔

7۔ افسر اور حکام سے قدرے مسکرا کر بات کروں گا اور عوام سے بڑے دبدبے سے۔

8۔ بے وقت تازہ پھل کھانے کا عادی ظاہر کروں گا۔

9۔ تحفے اور ہدیے دینے کا ثواب بتاتا رہوں گا۔

10۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دوں گا کہ میرے پاس ایک سینہ بہ سینہ عمل ایسا بھی ہے جس کی برکت سے عورتوں پر آئے ہوئے جنات بھاگ جاتے ہیں۔

11۔ تقریر سے پہلے کھانسی سے کام لوں گا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھوں گا۔ پھر مسلسل سفر اور مسلسل تقریروں سے تھکن ظاہر کروں گا۔ پھر پینے کو پانی طلب کروں گا۔ پھر مجمع سے درود شریف پڑھواؤں گا۔ پھر کہیں تقریر شروع کروں گا۔ پھر تقریر یوں کروں گا کہ اصل معاملہ پر چند جملے بول کر خلافِ عقل و یقین حکایات، قصے، لطیفے اور بے بنیاد روایات سے لوگوں کو رُلانے کی کوشش کروں گا اور اگر وہ نہ روئیں گے تو خود رونے لگوں گا اور درود شریف پڑھواتے ہوئے اپنے لیے چائے طلب کروں گا۔

12۔ جب مجمع رونے لگے گا تو یہ بھی کہہ دوں گا کہ اگر کوئی اور صاحب میرے وعظ کا بندوبست کراسکیں تو دو دن اور قیام کروں گا۔

13۔ تقریر میں جگہ جگہ اشعار اور مثنوی سے بھی کام لوں گا۔
14۔ یو پی قسم کی ظرافت بھی خرچ کروں گا۔ اگر اس پر مجمع نہ ہنسے گا تو خود ہنس کر تقریر جاری رکھوں گا۔
15۔ درمیان میں حکام کی اطاعت کی تلقین کروں گا اور پانی طلب کروں گا۔
16۔ بیوہ عورتوں کی خدمت اور یتیموں کے مال کی حفاظت پر کچھ کہوں گا اور عورتوں کو شوہروں کی فرماں برداری پر آمادہ کروں گا۔
17۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کا مذاق اڑاؤں گا چاہے وہ نہ بن سکے۔

اس قسم کے عنوانات وافکار کے غوطے میں تھا کہ وہ بھیلسہ کا اسٹیشن آ گیا۔ میں سمجھا کہ ایک تیز رفتار جنگی جہاز کے ذریعہ فرانس سے آبنائے ڈوور پار کر کے میں لندن کے وکٹوریہ اسٹیشن پر اتر کر "گارڈ آف آنر" کا معائنہ کروں گا کہ آواز آئی "اسٹیشن بھیلسہ گاڑی پانچ منٹ ٹھہرے گی"۔ میں نے صبر سے کام لے کر قدم بڑھایا اور اسٹیشن سے باہر جانے والے دروازہ پر "قرنطینہ" بنا کر اس لیے روک دیا گیا کہ چھوٹے اسٹیشنوں پر اسٹیشن ماسٹر صاحب ہی ٹکٹ کلکٹری کا فخر بھی حاصل فرماتے ہیں اور ریل کو بخیریت گزار دینے کے بعد، اس لیے تمام مسافران کے انتظار میں دروازہ پر بیٹھے جمائیاں اور انگڑائیاں لیا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی اس ذلت کو دور کرنے کے لیے حسن مدحت کی طرف دیکھا مگر وہ مجھ سے زیادہ رنجیدہ نظر آئے۔ تو میں نے "استقبالیہ جماعت" اور رضاکاروں وغیرہ کو جھانکنا شروع کیا۔ نیم تاریک سے دروازہ پر سے آواز آئی کہ "ٹکٹ لاؤ" گویا اسٹیشن سے کالا منہ کرو۔

باہر نکل کر جب کافی مایوسی نے گھیر لیا تو ناگاہ حضرت حکیم صاحب قبلہ اور ناظم مجلس "ادبیہ" نمائندگان مجلس استقبالیہ نے استقبال کے فرائض انجام دیے۔ اب مجھ پر ایک عظیم الشان جلسے اور شاندار تقریر کا خوف غالب ہونا شروع ہوا۔

ایک مکان پر فوراً ہی کھانا کھلایا گیا اور جلسہ میں آ گئے۔ میں بار بار سوچتا تھا کہ آخر ہم لوگوں میں ظرافت، زندہ دلی اور جوش مسرت کا وجود کیوں نہیں ہے تو اس کا سبب نہ حسن مدحت بتا سکے نہ میں۔ گویا دونوں کے نصیب میں رات بھر جاگنے اور بیویوں کو خفا رکھنے کی سزا لکھی تھی،

جس کو وہ سگریٹ پی پی کر اور میں تقریر سوچ سوچ کر کاٹ رہے تھے۔ البتہ دو بجے شب کو جب ریل میں واپسی ہوئی اس وقت وندھیاچل کے پہاڑی سلسلہ کا وہ حصہ مجھے قدرے قلیل لطف دے گیا جہاں کسی زمانہ میں میری رنگین شاعری کے دوچار بُت نصب کیے جائیں گے۔ خدا ان بُت نصب کرنے والوں کو تادیر سلامت رکھے۔ اس کے بعد میں نے تقریر کی۔ زیادہ روٹی اور روپیہ نہیں نہیں توبہ۔ زیادہ حداوب!

◆◆◆

شکایت!

لفاظی اور ہزل نگاری عرف شاعری میں اس کا وجود اتنا ہی ہے جتنا ریل کے درجۂ اوّل اور درجۂ دوم کے مقابل درجۂ سوم میں کسانوں کا ہجوم زیادہ ہوا کرتا ہے۔ ہمارے شعرا نے اس لفظ کی کمی، ظلم، ستانے، مطالبہ پورا نہ کرنے، صورت نہ دکھانے، عاشق کے خط کا بیرنگ جواب تک نہ دینے غرض کسی کمزوری اور کمی کے اظہار کے معنی میں لکھا ہے۔ بعض کھانسی کی حد تک پہنچی ہوئی عمر والے شعرا نے اسے عداوت اور دشمنی کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

آزادہ رَو ہوں اور میرا مسلک ہے صلح کُل
ہرگز کسی سے کوئی شکایت نہیں مجھے

فی الجملہ اس کے دو معنی زیادہ مستعمل ہیں۔ ایک کسی شخص سے اس کی خطا کی کمی، کمزوری اور غلط کاری کا اظہار کرنا۔ دوسرے عداوت اور مخالفت کا اظہار کرنا۔ اب ''شکایت'' کے اظہار کے جو طریقے عام طور پر دیکھے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ پُرلطف طریقہ پولیس والوں کا ہے۔ مثلاً کسی پولیس والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ شب کو بھیس بدل کر اپنی اصل بیوی کو تنہا سوتا چھوڑ کر کسی دوسری بیوی کے گھر اس طرح جاتے ہیں کہ آپ کے پاس لالٹین، لیمپ، فانوس، قمقمہ اور سرچ لائٹ نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی بلکہ اوپر سے آپ کی جیب میں یا کوٹ کے نیچے چھرا، تلوار،

طمنچہ، پستول، ریوالور یا کم سے کم سوا چار آنے والا چاقو اس لیے ہوا کرتا ہے کہ اس خفیہ بیوی کی گلی میں اگر کسی ملا رموزی نے آپ کو روکا تو آپ ان تمام دھار دار آلات میں سے ایک نہ ایک قسم کے آلہ سے اس کو زخم پہنچائیں گے، مگر اس خفیہ بیوی کے گھر میں ضرور گھس جائیں گے کیونکہ عام طور پر ایسے گھروں کے والد اس وقت سنیما یا تھیٹر میں ہوتے ہیں اور مکان کی حفاظت صرف ایک دو غنڈے قسم کے ملازموں کے ذمہ رہتی ہے اور اکثر اوقات اسی قسم کے غنڈے ملازم مکان میں گھس جانے کے لیے سب سے چوری ایک آدھ دروازہ اس طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں گویا اسے بند کرنا وہ بھول گئے تھے۔ اب معافی چاہتے ہیں آئندہ نہ کریں گے تو ایسی صورت میں پولیس والے آپ کا تعاقب کریں گے، روکیں گے، نام ولدیت، قومیت، سکونت اور جائیداد منقولہ وغیر منقولہ تک دریافت کریں گے۔ البتہ اگر آپ کسی ''بڑے آدمی'' کے لڑکے ثابت ہوئے تو ان تمام ہتھیاروں کے باوجود بھی آپ کو اس طرح چھوڑ دیں، گویا ان کے علم ہی میں نہیں کہ آپ روزانہ رات کے وقت فلاں مکان میں داخل ہوا کرتے ہیں اور صبح سویرے ہی وہاں سے رخصت ہو جایا کرتے ہیں اور جو کہیں بدقسمتی سے یہ ثابت ہو گیا کہ آپ ملا رموزی ایسے غریب آدمی کے بیٹے ہیں تو پھر پولیس والوں کی شکایت یوں ہو گی کہ:

''ابے چل آ گے ہو''۔

''ہاں ہاں میں جانتا ہوں تجھے لفنگے کہیں کے''۔

''ہاں ہاں بتائیں گے تیرے باوا ملا رموزی تک کو''۔

''اچھا تو بول اب تو سیدھی طرح چلتا ہے تھانے یا پھر تجھے اچھی طرح تھانے لے جا کر بتائیں''۔

''بس بیٹھ یہاں اور بتا کہ تو اتنے دن سے یہ آدھی رات کے وقت اس مکان کے آس پاس چکر کیوں لگایا کرتا ہے؟''

''اچھا مانتے ہیں کہ وہ خود بلاتی ہے تجھ کو''۔

''اچھا یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ اسکول کی پڑھی ہوئی ہے اور اس کی ملازمہ پر اس کے باپ کو پورا بھروسہ ہے، اسی لیے وہ اس ملازمہ کے ذریعہ ہی تجھے خط بھیجا کرتی ہے''۔

''اچھا اچھا یہ بھی سہی کہ اس کا باپ رات میں ایک مرتبہ بھی اپنی بیٹی کے کمرہ کی طرف نہیں آتا اور اپنے ہی کمرہ میں بیٹھا ''پانیئر اخبار'' پڑھا کرتا ہے یا سینما چلا جاتا ہے''۔

''اچھا اچھا یہ بھی سہی کہ تو نے اس کے باپ کے غنڈے ملازم کو روپیہ اور کپڑے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور وہ تیرے لیے دروازہ کھلا رکھتا ہے''۔

''اچھا چل بے یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ اسکول جاتے آتے تیرے گھر بھی دو چار وقت آئی اور اس کی والدہ نے اس کی پروا بھی نہ کی''۔

''اچھا اس کے شعر اشتہاروں میں بھی چھپتے ہیں تو پھر؟''

''اچھا ہماری طرف سے اتنا اور سہی کہ تو نے اسے پیانو باجا بجاتے بھی دیکھا اور اسے ٹھنڈی سڑک پر تفریح کرتے بھی دیکھا، اس نے تجھے سینما کے دروازہ پر ہجوم میں اپنے ہاتھ کا رومال بھی دیا اور اسی میں اس نے خط بھی رکھ دیا تھا، بلکہ اس کا فیشن ایبل بھائی بھی ان حالات میں اپنے فیشن کے لیے تجھ سے روپیہ لیتا رہتا ہے اور ان حالات میں تیری مدد کرتا ہے۔ اور ہاں ہم خود دیکھتے ہیں کہ ماں باپ کی بے پروا مزاجی اور تعلیم دین کے نہ ہونے کے باعث لڑکیوں میں ایسے اطوار پیدا ہو رہے ہیں اور ماں باپ الٹا فخر کرتے ہیں کہ ہماری لڑکی تعلیم پا رہی ہے''۔

''مگر تو یہ بتا کہ تو یہ چھری اور تلوار لے کر بغیر روشنی کے اتنی رات کو کیوں وہاں جاتا ہے؟ ابے معافی کیسی کل تجھے عدالت سے معافی ملے گی۔ تب معلوم ہوگا بیٹا یہ تلوار باندھنا''۔

ایک طریقہ شکایت کا یہ بھی ہے کہ آپ کے ننھے میاں کی والدہ ملا رموزی کے ننھے میاں کی والدہ سے اپنے گھر کی دیوار پر کھڑی ہو کر یا اپنے گھر کی کھڑکی سے منہ نکال کر فرمائیں کہ:

''دیکھا بیوی یہ تمھارے ننھے نے میرے بچے کے گال پر کیسا طمانچہ مارا ہے کہ اب تک اس کا نشان نہیں مٹا ہے''۔

''خیر تو اگر اس نے پہلے چانٹا مار دیا تھا تو تمھارا ننھا تو ہوشیار تھا۔ اسی کو ضبط کر لینا چاہیے تھا یا وہ مجھ سے آ کر شکایت کرتا تو خود اسی کے سامنے اپنے بچے کا مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیتی''۔ اس پر ملا رموزی کے ننھے میاں کی والدہ جواب دیں کہ ''ماشاء اللہ! شرم تو آتی نہیں آپ کو، چلیں اُلٹی شکایت کرنے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ خود آپ کا بچہ ہے کتنا شریر؟''۔

''خود تو آتا ہے اور طرح طرح کی چالوں سے میرے بچے کو بلا کر ساتھ لے جاتا ہے اور پھر کبھی جو وہ مار دیتا ہے تو بیوی دیوار پر آ کر مجھے ہزاروں سنا جاتی ہیں''۔

''بس رہنے دیجیے میں نے بہت ضبط کیں آپ کے بچے کی شرارتیں۔ اب کی اگر وہ میرے بچے کو بلانے آیا کبھی تو میں خود اسے وہ سزا دوں گی کہ یاد کرے گا''۔

''ہاں ہاں ہم اپنے گھر کے لاٹ صاحب ہی ہیں۔ تمھارے گھر کچھ مانگنے آئیں تو نہ دینا تم ہم کو''۔

اتنے میں آ جائیں کہیں باہر سے ملا رموزی صاحب اور فرمائیں کہ ''کیا ہوا، کس سے لڑ رہی ہو تم؟'' تو ان کے ننھے میاں کی والدہ غضبناک ہو کر اپنے ملا رموزی صاحب سے کہیں کہ:

''بس بس میں اب نہ رہوں گی اس گھر میں کل سے''۔

''اس لیے کہ دیکھا آپ نے یہ تھیں پیش کار صاحب کی بیوی۔ ہوا کیا تھا۔ وہ آج کہیں ننھے نے ان کے لونڈے کے ایک آدھ طمانچہ مار دیا ہوگا اور بچوں میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ بس اس پر دو گھنٹہ سے مجھے سنا رہی ہیں اور میرے بچے کو وہ بددعائیں دے رہی ہیں کہ اگر آپ ان میں سے ایک بھی سن لیتے تو مارے غصہ کے قابو سے باہر ہو جاتے''۔

''اچھا تو ابھی یہ جمیلہ بھی تو بیٹھی سن رہی ہے، اسی سے پوچھ لیجیے کہ میں نے ایک حرف بھی منہ سے نکالا ہو؟''

''خدا کی قسم چپ کھڑی سن رہی تھی اور اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ سنا رہی تھی اور اسے تو گھمنڈ ہے وہ پیش کار کا۔ ایسی تو وہ ہزار بار سنا چکی ہے مجھے مگر میں نے آج تک آپ سے ایک حرف بھی اس کے خلاف نہ کہا، محض اس وجہ سے کہ آپ کو بہت جلد غصہ آ جاتا ہے''۔

بس اتنا سنتے ہی ملا رموزی صاحب کو تاؤ آ جائے اور فوراً شیروانی سے باہر ہو جائیں اور جاتے ہی اس گھر والی کے ملا رموزی صاحب کو آواز دیں۔ جب وہ باہر آئیں تو اس طرف کے ملا رموزی صاحب اُس طرف کے پیش کار ملا رموزی سے کہیں کہ:

''دیکھیے پیش کار صاحب! عرصہ ہو گیا ہے کہ آپ کے گھر کے لوگوں کی زیادتیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں اور میں ہوں کہ بیٹھا ہوا استنار ہتا ہوں، مگر آج تک کبھی آپ سے ایک حرف بھی نہ کہا۔ مگر

آپ بتایئے کہ آخر میری بیوی بھی انسان ہے۔ وہ کب تک آپ کی بیوی کی ان زیادتیوں کو برداشت کرتی رہے؟''

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میری بیوی تو اپنے کان بند کر کے بیٹھی رہا کرے اور آپ کی بیوی صاحبہ کے جو دل میں آئے وہ کہہ لیا کریں''۔

''کہہ تو رہا ہوں کہ ہاں میری بیوی بے قصور تھی۔ تو آپ خود کھایئے نا اپنے بیٹے کی قسم''۔

''استغفر اللہ مجھے کیا خبر تھی کہ آپ اپنی بیوی کے اس قدر طرفدار ہیں کہ اس کے لیے کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے آپ کا۔ اچھا اچھا بہتر ہے بس تو ہم سے اب جو کچھ بن آئے گا کر دکھائیں گے''۔

''کیا کہا۔ اجی لاحول پڑھیے بھائی جان بس بہت ضبط کیا۔ وہ تو کہیے کہ اس مرتبہ بھی آپ کے ماموں جان بیچ میں آ گئے تھے ورنہ اسی وقت فیصلہ ہو جاتا''۔

''اجی خاموش رہیں وہ جو آپ سے کچھ کم ہوں''۔

''ہاں ہاں چلا کر تو کہہ رہا ہوں کہ آپ سے جو کچھ ہو سکے کر دکھایئے۔ اماں کھڑا تو ہوں تمھارے سامنے''۔

''اماں دیکھی تمھاری بہادری۔ بس جاؤ گے ابھی بھاگے ہوئے داروغہ کے پاس''۔

اس کے بعد چند منٹ دونوں کچھ سے کچھ ہو کر یہ کہتے ہوئے سنے جائیں گے کہ:

''بس نکل گئی ساری بہادری''۔

''ابے جا گدھے کے بچے''۔

''بس منہ ہی چل رہا ہے، اب''۔

''اچھا تو آ جا پھر''۔

''ارے بھئی کیوں پکڑتے ہو مولانا کو''۔

''آپ کو کیا خبر کہ یہ کیسا خبیث انسان ہے؟''

''اماں داڑھی تو سائن بورڈ کی طرح بڑھائی ہے اس مردود نے، مگر کوئی اس کی بدمعاشیوں کو دیکھے تب اسے پتہ چلے کہ مولویت کے جامہ میں کتنا بڑا شیطان ہے''۔

''بے شک دن بھر مسجد میں صدقہ کا بکرا بنا بیٹھا رہتا ہے، مگر آپ کو کیا خبر ہے کہ سارے محلہ کے غریبوں کو اپنا غلام بنائے رہنے کے لیے کیسی کیسی پاجیانہ حرکت کا مرتکب ہوتا ہے''۔

''صورت دیکھیے تو معلوم ہو کہ بس محلّہ میں اس کے برابر ایک بھی نیک انسان نہیں، مگر اس کی بدمعاشیاں کوئی مجھ سے پوچھے''۔

''کیا فرمایا آپ نے؟ اے صاحب یہ اس کا کمینہ پن، شیطانی اور بدمعاشی کیا کچھ کم ہے کہ اس کو جس نے جھک کر سلام نہ کیا، بس سمجھ لو کہ اسی کا دشمن ہے۔ اسی طرح جب تک ایک دو مسلمانوں کو آپس میں مقدمہ بازی پر آمادہ نہ کردے اسے روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ یتیموں کا مال اسے روا۔ بیوہ عورتوں کی جائیداد اسے حلال۔ غرض کیا کہوں اور کیا آپ اس کی حرکات سے واقف نہیں ہیں۔ اماں پولیس تک کو اس کی حرکات کا علم ہے، مگر وہ تو کہو کہ سب اس کو پاگل، اُلّو اور خبطی سمجھ کر چھوڑے ہوئے ہیں، مگر وہ جو کہا ہے کہ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مانگے گی، ایک نہ ایک دن ایسی تیز چھری کے نیچے آئیں گے کہ آواز تک بھی نہ نکلے گی اور کام تمام ہو جائے گا۔ اللہ اکبر ایسا بدمعاش ہے کہ خدا کے گھر میں رہ کر اور ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا اور بیوی صاحبہ آپ سے بھی دس گز آگے ہیں''۔

''جی ہاں یہ سب کچھ بیوی صاحبہ ہی کا ظہور ہے۔ صاحب عورت کیا ہے بس یوں سمجھیے کہ دس مردوں کی ایک مرد ہے۔ اُفوہ میں نے بھی بڑی بڑی حرافہ عورتیں دیکھی ہیں، مگر جناب خدا اس مکار کی بیوی سے بچائے۔ زبان تو اس کی ہے ہاتھ بھر کی۔ پھر وہ نہ جانے پردہ اور نہ سمجھے کسی کو چھوٹا بڑا۔ بس دن بھر ہے اور مکان کی دیوار پر کھڑی ہوئی آپ کی ہماری ہے کہ برائی کر رہی ہے۔ اگر آپ کا بچہ اس کے بچہ کے ساتھ کہیں خدانخواستہ کھیلتا ہوا نظر آ جائے تو بس سمجھ لیجیے کہ اس کو پہلے خود مارے گی اور پھر اس بچے کے ماں باپ سے لاکھوں شکایتیں کر کے اسے پٹوائے گی تب دم لے گی۔ اللہ اکبر غرض میں کیا کیا کہوں آپ سے؟''۔

''جی ہاں وہ سالے صاحب تو آپ سے بھی آٹھ حصے بلند ہیں۔ اوہ میاں خود کو ہمیشہ سے کچھ اتنا بھی اونچا لقمان اور سقراط بقراط سمجھتے ہیں کہ جواب ہی نہیں اُن کا۔ مگر حالت یہ ہے کہ چند جاہلوں اور غنڈوں کے سوا آج تک آپ کو کسی شریف انسان نے پوچھا بھی نہیں، مگر خود میاں کا یہ

خیال ہے کہ جو کچھ ہوں بس میں ہوں، اسی لیے تو آج تک محلے سے آگے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں''۔

''اماں سچ کہتے ہو۔ بے غیرت ہے بے غیرت۔ مار کھاتا ہے مگر شرماتا نہیں''۔

ایک طریقہ شکایت کا یہ ہے کہ جہاں والد صاحب دفتر سے آئے اور خادم خاص نے دوڑ کر حضور کا جوتا کھولا، کوٹ سنبھالا ''پائنیر اخبار'' ہاتھ سے لیا، پسینہ صاف کیا اور پاؤں دبانے بیٹھا تو فرضی طور سے آنکھوں میں آنسو بھر لایا کہ فوراً ہی اعتماد کرنے والے آقا صاحب نے دریافت کیا کہ:

''ابے کیا ہوا غفورا؟''

''کیوں رو رہا ہے تو؟''

''ابے کہہ تو سہی مردود؟''

اب غفورا نے کہا ''کیا عرض کروں حضور! میں ہی نمک حرام ہوں، چور ہوں اور بدمعاش۔ مگر حضور کا نمک کھایا ہے اب کدھر جاؤں؟ وہ بات تو کچھ نہیں بس یہ ہے کہ اب بڑی بیا صاحبہ مجھ سے بے حد ناراض ہیں، اس لیے حضور اب مجھے تو اجازت دیجیے کہ میں اس گھر ہی سے کالا منہ کر جاؤں۔ بات کچھ بھی نہیں تھی خدا کی قسم مگر بس آج کہیں میں نے اتنا کہہ دیا کہ بڑی بیا پان تو ختم ہو چکے ہیں صرف میاں کے خاصے کے دو چار پان باقی ہیں جو وہ دفتر سے آتے ہی مجھ سے مانگیں گے آپ ٹھہر جائیے میں بازار سے لائے دیتا ہوں آپ کو۔ بس اتنا کہنا تھا کہ بڑی بیا صاحبہ نے مجھے لاکھوں گالیاں دیں اور جوتا لے کر مارنے کے لیے دوڑیں۔ اب وہ مجھ سے اسی وقت سے ناراض ہیں۔ اور حضور ہزار کچھ ہو مگر بڑی بیا پھر حضور کی اولاد ہیں، وہ جو کچھ حضور سے کہہ دیں گی حضور اسی کو سچ سمجھیں گے''۔

بس اس بدمعاش ملازم کا رو کر اتنا کہنا تھا کہ بے خبر والد صاحب اپنی بیٹی سے بگڑ گئے اور فوراً نوکر ہی سے فرمایا:

''بس بس جا اور بڑی بیا سے کہہ دے کہ وہ آج سے ہمارے سامنے بھی نہ آئیں۔ جب انھوں نے ہمارے خاصے کے پانوں کا بھی خیال نہ کیا اور پانوں کی اتنی شوقین ہو چکی ہیں تو ہمیں

ان سے کوئی علاقہ نہیں؟ اور دیکھ خبردار جو آج سے تو نے کبھی بڑی بیا کا کوئی کام کیا ہے۔ بس میرے کمرے کے سوا ان کے کمرے کی طرف جانا بھی نہیں، سنتا ہے کہ نہیں۔ بس تو اُٹھ اور میرے غسل کا پانی تیار کر میں ابھی کلب جاؤں گا"۔

اب معصوم اور بے گناہ بڑی بیا کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ اُن کے والد کے نہایت معتمد ملازم نے ان کے خلاف والد سے کیا حکم حاصل کرلیا ہے۔ وہ آرام سے گھر میں بیٹھی ہوئی پیانو بجارہی تھیں کہ ملازم آیا اور بڑی بیا کو بلایا۔ بڑی بیا کا پردہ پہلے ہی سے اس نوکر سے نہیں تھا، اس لیے کہ گھر کا پروردہ تھا اور والد صاحب اس پر بے حد اعتماد فرماتے تھے۔ اب جو بڑی بیا اٹھلاتی ہوئی آئیں اور فرمایا:

"کیوں غفورا اس وقت تو نے مجھے باجے سے کیوں اٹھایا؟" تو غفورا نے غصہ کے لہجہ میں والد صاحب کا حکم سنایا۔

اب تو بڑی بیا کے حواس جاتے رہے اور گھبرا کر پوچھا کہ:

"غفورا کہہ تو سہی آخر میری ایسی کیا خطا دیکھی ابا جان نے جو مجھ سے اس بری طرح سے خفا ہو گئے؟"

غفورا: "بیا مجھے کیا خبر"۔

بیا: "ارے خبر کیوں نہیں، دن رات تو ہی تو رہتا ہے ان کے پاس"

غفورا: "تو بیا رہتا ہوں تو کیا، میں ان کے دل کے حالات سے بھی خبردار رہتا ہوں؟ مگر ہاں اتنا معلوم ہے کہ دو چار دن سے وہ کچھ آپ کی طرف سے خفا ضرور ہیں اور آج آتے ہی مجھ سے یہ کہا۔ اب یہ تو آپ ہی سوچیے کہ آپ نے کیا بات کہی؟"

بیا: "غفورا خدا کی قسم مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں اور نہ میں نے کچھ کہا نہ کچھ کیا"۔

غفورا: "خیر بیا اور تو کچھ نہیں، میں معافی تو دلا دوں گا آپ کو آج ہی، مگر آپ تو کہیے کہ وہ جو میں نے پرسوں آپ سے کہا تھا کہ آج اور چلیے میرے ساتھ سنیما کا تماشہ دیکھنے تو آپ نے یاد ہے کہ کس بری طرح سے جواب دیا تھا مجھ کو؟"

بڑی بیا:..................

غفورا: ''اچھا اچھا، بس بس! تو اب لیجیے آنے دیجیے حضور کو کلب سے اگر ایک منٹ میں آپ کو معافی نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ اچھا اگر میں معافی نہ دلا دوں تو خدا کی قسم آپ بھی میرے ساتھ سنیما نہ جانا''۔

''چلیں گے کدھر سے''؟

''لاحول ولا آپ بھی نئی بات کہہ رہی ہیں، اے بیا اسی باہر والے کمرہ سے نکل کر۔ خدا کی قسم حضور تو اخبار پڑھتے پڑھتے ایسے سو جاتے ہیں کہ پھر صبح ہی کروٹ لیتے ہیں۔ ہاں تانگے والا میرا بڑا پکا دوست ہے۔ آپ تو ہر طرح اطمینان رکھو۔ اے بیا وہی پہلا تانگے والا ہے جو آپ کو اُس رات کو لے گیا تھا میرے ساتھ پھر بتایئے کہ آج تک بھی خبر ہوئی کسی کو''۔

ان شکایات کے بعد دعا کرتے رہیے کہ خدا آپ کو آپ کی ذاتی ننھے میاں کی والدہ کی شکایتوں سے محفوظ رکھے۔ خصوصاً ننھے میاں کی تازہ والدہ سے کیونکہ جس وقت تک یہ ''نئی نویلی'' ہوتی ہیں بس 99 فیصدی شوہروں کے حق میں یہ مالیخولیا، مراق، خبط اور جنون بنی رہتی ہیں۔ جو ارشاد فرما دیتی ہیں شادی کی تازہ حماقت میں ڈوبے ہوئے شوہر صاحب اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ پس اس کی شکایت کے جملہ طریقوں سے واقفیت حاصل کرنا تو وہ سقراط بقراط تک کو نہ آیا، لیکن چند طریقے ایسے ضرور ہیں جو محققین کے خیال میں آج تک دریافت ہو چکے ہیں۔ مثلاً اس کی شکایت کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک طریقہ یہ ہے کہ وہ شکایت اس طرح کرتی ہے کہ ہزار آلے اور دوربین لگا کر بھی دیکھیے تو شکایت بھی شکایت ہی معلوم نہ ہو۔

مثلاً اس کی یہی ''طبی اور ڈاکٹری ترکیب'' ملاحظہ کیجیے کہ شکایت کرنے والے کا چہرہ، اس کی حرکات، اس کا لہجہ۔ غرض یہ طریقہ شکایت کے وقت بدل جاتا ہے، مگر یہ اللہ میاں کی بندی جب شوہر سے کسی کی شکایت کرنے چلے گی تو کئی گھنٹے پہلے سے وہ اپنے چہرہ کو نہایت خوش اور فکر و غضب سے پاک بنائے گی۔ وہ نہایت مسرور انداز میں مسکراتی رہے گی اور بعض اوقات تو وہ اس درجہ حکمت سے شکایت کر گزرے گی کہ اگر آپ ذرا غور سے کام لیں تو وہ ساری شکایت کر گزرے گی، مگر قانوناً آپ اس کا ایک حرف بھی شکایت کے سلسلہ سے گرفت نہ کر سکیں گے۔ پھر الفاظ اور جملوں کے الٹ پھیر اور برمحل چسپاں کرنے کی جیسی یہ ''غیاث اللغات'' واقع ہوئی ہے دنیا کے کسی

ایک نولکشور پریس نے ایسی غیاث اللغات آج تک نہ چھاپی اور نہ چھاپ سکتا ہے۔ مثلاً اسے اگر اپنے شوہر سے یہ شکایت کرنا ہے کہ "تم نے ننھے کو جھولا جھلانے کے لیے کوئی عورت ملازم نہیں رکھی" تو اس شکایت کو وہ ان الفاظ میں شوہر کو سنائے گی کہ ننھے سے مخاطب ہو کر کہے گی کہ:

"چپ رہو بیٹے وہ تو میں ہی فارغ ہولوں تو تمھیں جھولے میں لے کر بیٹھوں ورنہ کیا تمھیں قاف سے پریاں آکر جھولا جھلائیں گی؟"

یا اسے شکایت کرنا ہوگی کہ تم مجھے کلب میں نہیں جانے دیتے تو اپنی ملازمہ کو مخاطب کر کے شوہر کو سنائے گی کہ:

"چل چپ رہ میں کیا کروں اگر ملا رموزی صاحب کی بیوی کلب گھر گئی تھیں، میری قسمت میں تو یہ گھر قبر ہے سو ہے۔ بھلا قبر سے بھی کوئی نکل سکا ہے"۔

یا اسے اپنے شوہر سے اگر یہ شکایت ہے کہ وہ اسے کالے رنگ کا پمپ جوتا نہیں لا دیتا تو یہ اپنے ماما سے مخاطب ہو کر شوہر کو سنائیں گی کہ:

"آہ خدا بخشے ہمارے ابا میاں کو جب وہ تھے تو ہم سے پسند کرائے بغیر کبھی ہمارے لیے جوتا نہیں لاتے تھے اور ان دیسی جوتوں کو تو ہم نے اِسی گھر میں آکر دیکھا بھی اور پہنا بھی۔ ہمارے ہاں تو کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔ ہاں ہم پمپ جوتے کی ہر قسم اور قیمت کو بے دیکھے بتا سکتے ہیں، مگر اب بتائیں تو کسے"

الغرض اس کی بے شمار شکایتوں میں سے سب سے خطرناک شکایت وہ ہوتی ہے جو یہ شوہر کے خاندان والوں کی شوہر سے کرتی ہے۔ ایسی شکایت کے لیے یہ ہمیشہ اس وقت کا انتظار کرتی ہے جب اس کا شوہر اس سے بہت زیادہ خوش ہوسکتا ہو۔ لہٰذا عین اس خوشی کے وقت کبھی کبھی اور کہیں کہیں نہایت ہوشیاری سے خود کو قدرے سرگراں بنا کر کہیں گی کہ:

"آپ جانتے ہیں کہ میری عادت ہی کسی کی شکایت کی نہیں۔ حالانکہ خدا آپ کا سایہ میرے سر پر رکھے ہزار بار کہہ چکے ہیں کہ تمھیں جب کسی سے کوئی شکایت ہوا کرے تو فوراً مجھ سے کہہ دیا کرو، مگر آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے کبھی کسی کے لیے آپ سے ایک حرف بھی نہیں کہا، مگر ہاں آپ اگر اجازت دیں اور سن لیں تو صرف اتنا کہتی ہوں کہ اب مجھ سے للتاں بی کی (یعنی

ساس کی) باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ خیر وہ تو مجھے جو چاہیں کہہ لیں، مگر ہاں خدا آپ کو دشمنوں سے بچائے۔ جب وہ آپ کے حق میں بری طرح سے بددعا کرتی ہیں تو مجھ سے رہا نہیں جاتا اور میں کہتی بھی ہوں کہ اماں خدا کے لیے آپ مجھے دس جوتیاں روز مار لیا کیجیے، مگر خدا کے لیے ان کے حق میں تو بددعا نہ کیا کیجیے، آخر وہ تو آپ کے بیٹے ہیں اور ان کا تو اس بات میں قصور بھی نہیں۔ یا جو آپ کو کچھ نہیں کہتی ہیں تو پھر اس معصوم بچے کے حق میں بددعا کرتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ان معصوم بچوں نے ان کا کیا لیا ہے، مگر ہاں وہ تو بات حق یہ ہے کہ انھیں کسی نے بڑے زور سے یقین دلا دیا ہے کہ آپ رات کو کسی نائک والی کے ہاں جایا کرتے ہیں اور میں آپ کے اس راز کو چھپائے رہتی ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسا کب ہے اور آپ رات کو کس کے گھر جاتے ہیں۔ میں تو خدا کے سامنے بھی کہنے کو تیار ہوں کہ خدا نے جیسا آپ کو ان باتوں سے آج تک دور رکھا ہے خدا ہر مسلمان کو ایسا ہی محفوظ رکھے" وغیرہ۔

بس جہاں بیوی جان نے آپ سے آپ کی والدہ کے لیے یہ کہا اور آپ بغیر تحقیق کے مارے تاؤ کے ریل کے انجن کا انگارہ بن گئے اور صبح اٹھتے ہی کسی دوسرے محلّہ میں ایک مکان جا لیا اور دوسرے دن والدہ سے تفصیل کہے بغیر بیوی جان کو مع بستر اس مکان میں لے گئے۔ اب والدہ ہیں کہ ایک ایک کے سامنے روتی پھرتی ہیں کہ کوئی بتائے کہ اُن سے اُن کا بیٹا کیوں جدا ہو گیا، مگر آپ ہر وقت یہ جواب دے دیتے ہیں کہ بھئی وہ ماں ہیں، اُن سے کہنے کی باتیں ہی نہیں۔ بس اس میں کیا خرابی ہے کہ میں ان سے دور رہ کر بھی ان کے حقوق تو ادا کر رہا ہوں، مگر خدا کے لیے یہ نہ پوچھیے کہ تم اپنی ماں سے کیوں جدا ہو رہے ہو۔ آہ دل جانتا ہے وہ کیسی ماں ہیں ہماری؟

چند دن میں سنا کہ والدہ کا اسی غم میں انتقال ہو گیا۔ تو آپ بھی رسماً شریک ہو گئے، مگر اس وقت تک دل میں انہی غلط باتوں کا تاؤ باقی رہا، جو بیوی نے مکاری سے آپ کے ذہن میں جما دی تھیں۔

◆◆◆

میں نے پھر تقریر کی

اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی تقریر کی تھی۔ جی ہاں کی تھی اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کہوں کہ:

"ساتویں پشت ہے تقریر کی مشاقی میں"

لیکن قسم لے لیجیے جو ایک تقریر بھی ایسی ہو جس میں میں نے ڈرنے، جھجکنے، گھبرانے، پریشان ہونے، لرزنے، کھانسنے اور پانی پر پانی پینے سے کام نہ لیا ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح حسین، نازک، رنگین، لائق اور باغ و بہار دماغ کے مردوں کو کالی، جاہل اور پھوہڑ بیویاں ملتی ہیں اسی طرح آتش بیان، جادو گفتار اور رواں دواں بولنے والوں کے عوض اٹک اٹک کر، گھبرا گھبرا کر اور کھانس کھانس کر بولنے والوں کو لوگ بہت بلاتے ہیں اور تقریریں بھی سنتے ہیں اور وعظ بھی!

یہ مہینہ عید میلاد النبی کا مہینہ ہے۔ اس میں پنجاب کی "سیرت کمیٹی" کی تحریک سے ہندستان کے ہر شہر میں جو یہ تقریب منائے جانے لگی ہے تو تقریر کرنے والوں کی بھی چک گئی ہے، لیکن وہ جو ہندستان میں ہر اچھی چیز کا کال ہے تو اچھی تقریر کرنے والے بھی ناپید ہیں، اس لیے صوبہ جات متوسط کے متعدد شہروں سے ملا رموزی کے نام ڈاک پر ڈاک چلی آرہی تھی کہ "تشریف لا کر تقریر کیجیے، کرایہ بھی دیا جائے گا"۔ ظاہر ہے کہ ہندستان کا ہر صاحب کمال اگر آج

شہرت حاصل نہیں کرسکتا تو صرف اسی لیے کہ اس کے پاس اظہار کمال کا کرایہ نہیں ہوتا، لیکن سفر کے متعلق میرے ہاں جو دشواریاں ہیں وہ یہ کہ:

اول تو بیوی نمبر دو کے فراق کا صدمہ سفر سے باز رکھتا ہے۔ دوسرے مزاج اور دماغ کی فرعونیت بجائے تقریر کے مسلمانوں سے دنگل کا انتظام کرادیتی ہے۔ تیسرے تھرڈ کلاس کا ملیریا اور انفلوانزا سے ملتا جلتا سفر اب بس کا نہیں رہا۔

اس لیے ہر جگہ کا بلاوا رد کیا، لیکن 23 مئی 1937 کو جب شب کے پونے بارہ بجے میں دنیا جہان کی ناکامیوں سے تاؤ کھائے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی آوارہ گردی کررہا تھا کہ ناگاہ مولانا طرزی فنشی فاضل تشریف لائے۔ یہ جتنے ہلکے پھلکے، نازک، نفیس، سنجیدہ ہیں ان کے ہمراہ اتنے ہی آزاد، بے باک، بے دھڑک اور ایک صاحب بغیر چھتری کے مجھ سے ملے اور فرمایا کہ ''مسلمانانِ اٹارسی نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ کل تشریف لا کر سیرت النبی پر تقریر کیجیے۔ کرایہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا''۔

ادھر بیوی نمبر دو آج کل مجھ سے دور ہیں، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ ''سیرت ایسے مذہبی اجتماع'' میں مجھ ایسے نصف مونچھوں والے ملا رموزی کی تقریر ایسی ہی ہوگی جیسے آپ کہیں کہ اجمیر شریف کی قوالی میں بھائی پرمانند بھی حقانی گائیں، مگر انھوں نے کہا کہ آپ ہر حال میں تقریر کریں گے کیونکہ اٹارسی کے مسلمان طے کرچکے ہیں کہ آپ کی تقریر ہو اور آپ کی تقریر کے شوق میں جبل پور، گاڈر دواڑہ، سہاگپور، ہوشنگ آباد وغیرہ مقامات سے بھی لوگ آئے ہوئے ہیں۔

میں نے سوچا کہ جب مجھے اپنی قیام گاہ پر نہ موت ہے نہ رزق، تو بہتر ہے کہ تقریروں ہی سے عاقبت بخیر کرلوں، اس لیے بیوی نمبر ایک سے عرض کیا کہ بیوی حلوہ پکاؤ، نیاز و فاتحہ کا انتظام کرو کہ آج خدا نے تمھارے شوہر کو اس قابل کیا کہ اس کو مسلمان تقریر کے لیے بھی بلاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بال بچوں والی بیوی کا نکاح اولاد کے بعد آدھا رہ جاتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ بیوی سے عشق و محبت جبر و طاقت کی محبت ہے۔ اصل محبت تو اس قید سے آزاد رہ کر ہے جس میں بغیر قانونی اثر کے دونوں رات دن ایک دوسرے کے لیے بے تاب اور پروانہ بنے رہتے ہیں

لیکن جہاں شادی ہوئی نہیں کہ پھر محبت تو گئی دتی کے بھاڑ میں بس بیٹھے بچے پالتے رہو اور خضاب لاجواب لگاتے رہو۔ اس لیے بیوی نمبر ایک نے بغیر آنسو بہاؤ مجھے یوں اجازت دے دی گویا میں ان کے حق میں پہلے ہی سے مصیبت بنا ہوا تھا۔

سامانِ سفر تو ہو ان کے پاس جن کے پاس غریبوں، مزدوروں اور باوا کی اندوختہ جائیداد ہو یہاں تو سائیکل ہے جو ذرا سی غلط سمت چلنے پر مجسٹریٹی میں ذریعہ چالان جاسکتی ہے اور مال خانہ میں بند ہوسکتی ہے، اس لیے اللہ کا نام لیا اور ٹھیک دو بجے گھر سے یوں نکلے گویا اب اس گھر میں شریف ہیں تو نہ آئیں گے۔ حضرت طرزی مشرقی کا خاندانی تانگہ تھا یعنی ذاتی، اس میں بیٹھ کر چلے تو دو بجے کی جہنم کے کارخانہ کی بنی ہوئی لو اس طرح تانگہ میں تھی گویا ڈاکٹر نے ہماری صحت کے لیے گرم تر بھاپ کے طمانچے تجویز کیے ہیں، اس لیے خوش خوش تو کیا ہاں چکر کھاتے اور بدحواس اسٹیشن پر پہنچے۔

بغیر چھت کے پلیٹ فارم پر پسنجر ٹرین نصف گھنٹہ کے لیے یوں کھڑی ہوگئی گویا یہ ریل گورنمنٹ کے عوض کسی یتیم خانہ کی ریل ہے، جس کا نہ کوئی والی نہ وارث۔ تھرڈ کلاس کی لکڑی کی میزیں اس وقت اس طرح گرم تھیں گویا ''پُل صراط'' کے نیچے جہنم شعلہ زن ہے اور ہم گناہ گار اس پر سے گزارے جا رہے ہیں۔

ہمارے ڈبّے کے ہمراہی وہی دیسی کسان تھے جن کے مظالم کش جسم پر نہ بارش اثر کرسکتی ہے نہ گرمی۔ ہر کھڑکی سے جہنم کی آگ داخل ہو رہی تھی، مگر قومی خدمت گزاری کے مالیخولیا میں مبتلا طرزی اور رموزی اس ایثار وخلوص سے بیٹھے ہوئے تھے گویا اس خدمت کے بعد بے حساب جنت ہی میں جاکر دم لیں گے۔ یہاں سے ایک اور مقرر حضرت مہری رونق افروز ہوئے اور خدا خدا کرکے دو بجے والی پسنجر یوں روانہ ہوئی گویا بھڑکتا ہوا جہنم حرکت میں آیا اور وہ بھی پسنجر بن کر۔ دماغی نزاکت ولطائف اور وسعتِ خیال ونظر کے اثر سے میں فرسٹ کلاس کے عوض تھرڈ کلاس میں اب سفر نہیں کرسکتا کہ تھرڈ کلاس کی ہر تکلیف محسوس ہوتی ہے، مگر یقین ہے کہ جب تک میں مسلمانوں کا خدمت گزار رہوں گا ان تکالیف سے محفوظ نہ رہوں گا اس لیے میں نے چاہا کہ حضرت مہری سے گپ کے ذریعہ تھرڈ کلاس کی تکالیف کو بھول جاؤں، مگر موصوف کو دیکھا کہ بڑی

متانت سے اپنی تقریر کی یادداشتیں ملاحظہ فرمارہے ہیں۔اب کس کو حوصلہ کہ حضور کے علمی شغل میں مداخلت کرے۔اِدھر ایسے ذلیل اور بے ٹکٹ سے سفر میں مجھ سے نہ اخبار پڑھا جاتا نہ کتاب،اس لیے بیوہ عورت کی طرح خاموش بیٹھ گیا۔

ریل تھی پسنجر اس لیے ہر ڈھائی آنہ والے اسٹیشن پر یوں کھڑی ہوجاتی تھی کہ لاکھ خوشامدیں بھی کیجیے تو قدم نہ اٹھائے۔سفر کا راستہ خالص پہاڑی تھا اس لیے سط دوپہر میں ہر پانچ میل پر ریل کے کھڑے ہونے کے یہ معنی تھے گویا ہم دونوں جلا وطن بھائیوں کو کالے پانی پہنچنے سے پہلے آفتابی غسل سے بھی سرفراز کیا جارہا ہے۔

ریل کے جس ڈبہ میں ہم فاضل الٰہیات،ادیب وشاعر اور منشی فاضل قسم کے نازک مزاج بیٹھے تھے اس کی اندرونی شادابی یوں تھی کہ ہر طرف نصف سے زائد برہنہ کسان، بیڑی کا دھواں فاتحہ کے لوبان سے زیادہ پھیلا ہوا، مونگ پھلی کھانے کی طعفن پھیلی، گنوار قسم کی جمائیوں کی آوازوں میں محرم کے مرثیوں کے تال سُر شامل۔دیہاتی پسینہ سے بسے ہوئے لباس کی لپٹ سے محمد علی اصغر علی خمیرے والے لکھنؤ میں بے چین نظر آتے تھے۔اب ان حالات میں میرے لیے ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ فقط تنگ آکر مہری کو چھیڑا کہ اسی طرح راستہ کی تکالیف کم ہوں گی، مگر وہ یادداشتوں کے مطالعہ میں مصروف تھے اس لیے انھوں نے وہ عالمانہ آنکھیں دکھائیں کہ ڈرنا ہی پڑا،لیکن کب تک۔میں نے پھر چھیڑا اور وہ پھر غصہ ہونے لگے اور اس مرتبہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور امام صاحب جامع مسجد دہلی کی نصیحت کا انداز اختیار کرکے مجھے خاموش رہنے کی تلقین فرمائی۔اب ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کی جرأت کہاں جو مذہبی رنگ کی ڈانٹ پر بھی گستاخی سے کام لے۔اس لیے میں نے گناہ سے بچنے کے لیے کوئی نصف اسٹیشن گفتگو نہ کی اور اب یہ سوچ کر کہ مہری صاحب ہیں آخر نوجوان اور اوپر سے ناکتخدا بھی،اس لیے میں نے یقین کرلیا کہ ذیل کی گفتگو سے یقیناً یہ مست ہوکر مجھ سے مخاطب ہوجائیں گے۔چنانچہ میں نے کہا:

''آہ! ہندستان میں مسلمان بیوہ عورت کس درجہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے حالانکہ اسلام نے اس کو دوسرے نکاح کی آزادی دی ہے''۔

مہری نے دیکھا کہ یہ بیوی عورت کے دوسرے نکاح کے مسئلہ پر گفتگو ہے، جو ثقافت و

سنجیدگی کے خلاف نہیں ہے، اس لیے زیر مطالعہ کاغذات کے اوپر سے مجھے دیکھا مگر اس طرح خاموش رہے گویا وہ اس چیز کو غور سے سن رہے ہیں۔ میں نے پھر کہا "مگر بعض بیوی عورتیں اپنے سابق شوہر کی محبت میں خود بھی دوسرے نکاح پر تیار نہیں ہوتیں" کہ مہری نے آہستہ کہا "ہاں"۔ میں نے اتنی توجہ پا کر کہا "مگر اب تو نا کتخدا لڑکیوں کے لیے بھی شوہروں کا ملنا محال ہو گیا ہے اور آہ کیسی کیسی خوش خصال لڑکیاں گھر کی چہار دیواری میں سڑ رہی ہیں"۔

چونکہ گفتگو کا آغاز بیوہ عورت سے ہوا تھا اس لیے مہری صاحب نے اب نوجوان لڑکیوں کی گفتگو میں حصہ لینے کو بھی متانت کے خلاف سمجھتے ہوئے فرمایا "ملا صاحب یہ بھی صحیح ہے مگر اس کا سبب؟"

یہ کہہ کر یادداشتوں کے کاغذات کو آنکھوں سے ہٹا کر گود میں رکھ لیا۔ میں تو اتنا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرح مہری مخاطب تو ہو جائیں، اس لیے میں نے کہا کہ "بات کچھ بھی نہیں جب سے لڑکے نے پتلون اور لڑکی نے ریشمی ساڑی اختیار کر لی ہے اس وقت سے دونوں کا دولت مند ہونا ضرور قرار پا گیا ہے۔ لیکن دولت ملتی ہے ہنر مندی سے سو نہ لڑکا ہنر مند نہ لڑکی صاحب کمال، اس لیے جوڑ ملے تو کیسے"؟

اب بھی معاملہ سنجیدہ تھا، اس لیے مہری گفتگو کرتے رہے کہ میں نے اچانک کہا کہ "مگر مہری یہ تو بتاؤ کہ "عشق و محبت کر کے شادی کی جائے تو کیسا؟"

اس سے قبل کہ گفتگو چونکہ بے حد علمی، متین اور سنجیدہ تھی اس لیے اسی روانی میں مہری بے ساختہ کہہ گئے کہ "بہت اچھی" کہ بد قسمتی سے برکھیڑے کا اسٹیشن آ گیا اور یہاں سے ہم دونوں کے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے ایک دوست سوار ہوئے جو ہماری شامتِ اعمال سے عرصۂ دراز سے محکمہ سائیر میں ملازم ہیں۔ ان کے آنے سے حسن و عشق کی گفتگو اب دفتری گفتگو سے بدل گئی۔ گویا میرا تو جنازہ ہی نکل گیا اور مہری صاحب کو پھر سنجیدہ بن جانے کا موقع مل گیا اور اسی کا مجھے زیادہ صدمہ ہوا۔

اب ان کی "سائیرانہ گفتگو" کا یہ حال کہ ہم سے کوئی سوال بھی نہیں کرتا ہے مگر ان کی عالمانہ گفتگو ہے کہ اس طرح پھیلتی چلی جا رہی ہے:

''ارے بھائی وہ ہمارے نئے افسر سے بھی تمھارے مراسم ہیں؟ بھئی تم لوگ آج کل بڑے بااثر ہو اس لیے ذرا میرے تبادلہ کے لیے تم میں سے اگر کوئی کہہ دے تو میرا کام ہو جائے گا۔ آمدنی تو یہاں بھی اچھی ہے مگر ریلوے اسٹیشن ہونے کی وجہ سے افسروں کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہے''۔

میں نے بہتیرا چاہا کہ ان کو محسوس ہو جائے کہ ہم لوگ علمی ذوق کے آدمی ہو چکے ہیں اس لیے اب ہم کو دفتری معاملات و مسائل سے سخت نفرت ہے، مگر یہ شخص تھا بچپن کا دوست اور اللہ ترقی دے کر انسان کو بے تکلف دوست ہی سے محفوظ رکھے۔ وہ کاہے کو سمجھتا تھا کہ ہم آجکل لیڈر ہیں یا ایڈیٹر وہ تو آج بھی یہی سمجھے ہوئے تھا گویا ہم دونوں آج بھی آٹھ دس برس کے ننگ دھڑنگ بچے ہیں، لہٰذا جو چاہیں بولیں اور جو چاہیں ایک دوسرے سے کہیں۔ اِدھر میں نے اس کی گفتگو کی بے باکی سے اندازہ کر لیا کہ اگر میں نے موصوف کی گفتگو کے جوابات میں کسی قسم کی ٹال سے کام لیا تو یہ ابے تبے کی گفتگو تک سے کام لے گا اور بچپن کے حقوق اور قانون سے یہ اس کا حق بھی ہے۔ لہٰذا میں تو بے حد فرمانبردار بنا رہا مگر مہری تو بے انتہا باغیانہ مزاج کے انسان ہیں اس لیے انھوں نے ڈانٹ دیا کہ میرے علمی کام میں ہڑ بونگ سے کام نہ لے۔

وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ اس نے ڈانٹ کے بعد اپنی دفتری گفتگو میں وہ زور پیدا کر دیا کہ اب تو میرا جی بھی چاہنے لگا کہ خودکشی کر لوں۔ میں نے ہر چند بے رخی سے کام لیا، مگر وہ بے رخی کو خاطر میں کب لاتا تھا۔ کبھی شانہ پکڑ کر ہلا دیتا اور کبھی زانو پر اس زور سے ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتا کہ مجھے رونا آ جاتا تھا، مگر بے تکلفی کے حق کا تقاضا تھا کہ پھر بھی ہنستا رہوں، چنانچہ ہنستا رہا۔

بُدنی کے اسٹیشن سے یہ بے تکلف محکمہ سائر تشریف لے گئے، مگر خود سے کہیں سوا مصیبت دے گئے یعنی اس اسٹیشن سے ایک شاعری سوار ہوئی۔ شاعری بھی دیہات کی دوشیزگی اور جنگلوں کی جوانی لیے ہوئے۔ اب اس کی وجہ سے یا تو مہری کا برا حال یا میرا برا حال۔ بہرحال اس کے سوار ہونے پر مہری نے مجھ کو اور میں نے مہری کو اس طرح دیکھا گویا حسن و عاشقی کی ایک طویل داستان ہم دونوں ایک ہی اشارہ میں بیان کر گئے۔ البتہ میں خوش تھا کہ میری بیوی نمبر دو کو اطلاع نہیں ہو سکی۔ کیونکہ وہ اللہ کی بندی بڑی شکی مزاج ہے۔ اب میں نے خود مہری سے یوں علاحدہ

کرلیا گویا میں چلتی ریل سے قدرتی مناظر کا تماشہ دیکھنے میں مصروف ہوں، اس پر مہری نے سوال بھی کیا کہ ''کیا تماشہ دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا تماشہ انگریز کی بہادری، ہمت، جرأت اور حوصلہ کا۔ کیا نہیں دیکھتے ہو کہ دھوپ کی اس جہنم گسل شدت میں انگیز کس کمال جرأت سے ریل چلانے میں مصروف ہے۔ حالانکہ ہندستانیوں سے زیادہ نازک مزاج، عیش پسند اور دولت مند ہے اور ایک ہماری بیوی نمبر دو ہیں جو ہمت، جرأت اور حوصلے کے عوض مارے خواہ مخواہی اندیشوں اور احتیاطوں کے خشک ہو رہی ہیں مگر بہادری کے قریب بھی تشریف نہیں لاسکتی ہیں۔

(2)

اس عنوان کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ لوگ باگ منع کرتے تھے مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا لوگوں نے ایک تقریر سن کر کہہ دیا تھا کہ تم بے چارے تقریر کیا کرو گے مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا میری پہلی تقریر میں مجھے ہر جملہ بعد کے کھانس کھانس کر خفت مٹانا پڑتی تھی، مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا میری بیوی نمبر دو منع فرما گئی تھیں مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا لوگوں نے طے کرلیا تھا کہ ہم عین تقریر میں ہڑبونگ، لپاڈگی، شور وغل اور فتنہ وفساد سے کام لیں گے مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا لوگ باگ میری تقریر کے بیچ اونگھ رہے تھے مگر میں نے پھر تقریر کی۔ یا ''محترم خواتین'' میری تقریر سے تاؤ کھا رہی تھیں کہ کیوں میں ان کی فیشن زدگی کے خلاف لکھتا ہوں، مگر میں نے تقریر کی۔ یا ''کم اوقات'' کے لوگ ریڈیو کے خلاف میری تقریر سے جل رہے تھے، مگر میں نے تقریر کی۔ یا وہ عورتیں اور لڑکیاں میری تقریر سے غصہ تھیں جو ریشمی شلوار، زرّیں ساڑی، پاؤں کا زیور، خوبصورت جوتے اور مہندی رچے ہوئے پاؤں دکھانے کے شوق سے پردہ دار تانگوں کے پردہ سے باہر پاؤں نکال کر بیٹھی ہیں اور اپنے اس چھچھورپن سے شرماتی نہیں، مگر نے پھر تقریر کی۔ یا عین تقریر کے عالم میں مجھے صدر جلسہ نے پرچہ لکھا کہ آپ کا وقت ختم ہوگیا، مگر میں نے پھر تقریر کی۔ غرض کوئی ایک لاکھ معنی ہیں اس عنوان کے جس کے نیچے میں اپنی تقریر کے حالات لکھنے چلا ہوں۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ بیوی نمبر دو کی مصروفیت کی وجہ سے یا مسلمانوں کی ناقدردانی کے ہاتھوں میں نے آج سے ایک سال پہلے ایک تقریر کی تھی، اس کی یاد مجھ ایسے تقریری مفلس کے

دل میں ایسی تھی گویا میری یہ تقریر اس سے متصل ہی ہوئی ہے، اس لیے یہ عنوان قائم کیا تا کہ سند ہو اور مجسٹریٹوں اور کوتوالوں کے کام آئے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشن بدرنی سے وندھیا چل پہاڑ کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے نشیب و فراز میں غیر ہندستانیوں اور ہندستانیوں کی شجاعت و بزدلی کی سینکڑوں تاریخیں دفن ہیں۔ ان فلک بوس اور ناقابل عبور پہاڑوں سے ریل گاڑی کیا گزر سکتی، مگر ذی حوصلہ، بہادر، اوالوالعزم، عالی ہمت، جری، دلیر، دلاور، شجاع، نڈر، بے جگر، حوصلہ مند، جفاکش اور محنت سے عشق کرنے والے انگریزوں نے اپنی علمی سربلندی سے ان پہاڑوں کے سینے چاک کر کے دو بجے والی پسنجر کا راستہ بنایا ہے۔ اب اس پر سے فی گھنٹہ 55 کی رفتار سے پنجاب میل بھی گزر جاتا ہے اور پشاور ایکسپریس بھی، اس لیے میں تو جنگلوں کے خشک افسردہ مناظر کو چھوڑ کر انگریزوں کے پہاڑ شکن حوصلوں کی ان ترکیبوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

میں دیکھ رہا تھا اور میری جنگ و جدال اور قتل و خونریزی سے مست و مسرور ہونے والی فطرت جوان ہو رہی تھی۔ جب بہادر انگریز ڈرائیور ان خوفناک پہاڑی ڈھلوانوں، گھاٹیوں، دروں اور اتار چڑھاؤ سے 55 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے انجن چلا رہا تھا، اس وقت خیال آیا کہ اگر آج کو اس ریل کی ڈرائیور کوئی ہندستانی عورت ہوتی تو غریب مارے احتیاط، رسوم، عقائد، نزاکت، نفاست، ناتجربہ کاری اور بزرگوں کی سختیوں کے ریل چلانے کی ہمت کرنے کے عوض چارپائی پر پڑ کر دق اور سل ہی میں مرجاتی، مگر نہ ریل چلاتی نہ اپنے بزرگوں کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی اور میرا تو تجربہ یہ ہے کہ ایک ہندستانی عورت کیا سارے ہندستان کے مرد بھی ایسا ہی کرتے۔ مگر نہ کرتے تو ان پہاڑوں سے ریل چلانے کی ہمت کہ فطرت نے ان پر اگر کوئی حسین احسان کیا ہے تو وہ یہی کہ ان سے کام کا حوصلہ چھین لیا ہے، اسی لیے ہر جگہ درخواست لیے کھڑے رہتے ہیں اور وہ بھی مع اہل و عیال!!

دیگر احوال یہ ہے کہ اب ریل گاڑی ایک درہ نما ڈھلواں سے گزر کر اچانک ایک ہوش ربا پُل سے گزری، اس پُل کی ہولناکی، ہیبت اور ڈراؤنے عمق میں کافی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ ناگاہ مہری صاحب نے بھی جھانکنے کی زحمت گوارا فرمائی اور فوراً ہی اُف کہہ کر کھڑکی کے اندر ہو گئے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ ''کیا خوف کی وجہ سے؟'' فرمایا ''ہاں''۔

میں نے کہا ''مگر انجن کا انگریز ڈرائیور تو آپ کی طرح اُف نہیں کہتا، آخر اس کا سبب؟''

ہندستانی جواب عطا ہوا کہ ''ان کا تو کام ہی یہ ہے''۔

میں نے کہا تو گویا ان کا کام ہی ہے، اس میں ان کی عالی حوصلگی، ہمت مردانگی اور حوصلے کو دخل نہیں؟

فرمایا ''جی ہاں حوصلہ تو ہے مگر یہ کوئی بڑا حوصلہ نہیں کہ ایک پُل پر سے ریل گزار دی پُل خود مضبوط ہے''۔

اس وقت میرے تاؤ کا پارہ پورے کھولاؤ پر تھا، مگر میں نے طے کر لیا کہ ان سے بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل مسلم لیگی مسلمان سے کہا جائے کہ آپ بغیر سمجھوتہ کے کانگریس میں شریک ہو جایئے ۔یا جمعیۃ علما کے کارکنوں سے کہا جائے کہ آپ کانگریس کا سیاسی پیچھا چھوڑ یے۔ یا مسلمان طلبا سے کہا جائے کہ آپ ریشمی لباس ترک کر کے کھدر کا لباس اختیار کیجیے اور کافی محنت کی زندگی بسر کیجیے۔ یا جاہل عورتوں سے کہا جائے کہ آپ غلط اور نقصان رساں رسوم کو ترک کر دیجیے اور پیروں فقیروں سے تعویذ نہ لیا کیجیے۔ یا پرانے خیال کے شوہروں سے کہا جائے کہ آپ اپنی انٹرنس پاس بیویوں کا پردہ توڑ دیجیے۔ یا بوڑھی عورتوں سے کہا جائے کہ آپ اپنی انا للہ ہونے والی عمر میں مہندی لگانا ترک کر دیجیے۔ یا آٹھویں نویں جماعت کی طالبات سے کہا جائے کہ آپ سنیما کے تماشہ نہ جایا کیجیے۔ یا حضرت جگر مرادآبادی سے کہا جائے کہ خدا کے لیے آپ غزل کہنا ترک کر دیجیے۔ یا ہندو مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ رام لیلا اور مسجد کے سامنے باجے کی جنگ چھوڑ دیجیے۔ یا جمعیۃ الاقوام سے کہا جائے کہ حضور آپ کچھ کر کے دکھایئے اور اپنے اجلاسوں کو ترک فرمادیجیے۔ یا مسولینی اور ہٹلر سے کہا جائے کہ مارے انتظار کے مرے جاتے ہیں، عالم گیر جنگ شروع کر کے دکھایئے۔ یا دنیا کے عظیم الشان انسان مصطفیٰ کمال پاشا سے کہیے کہ اماں یہ بلقانیوں کے اتحاد پر بھروسہ کا کیا موقع ہے، یونان ہی پر چڑھ دوڑیے۔ یا بڑے مولوی صاحب سے کہا جائے کہ آپ چھری کانٹے سے ڈنر کھانے اور قدرے ڈانس کی مشق فرما لیجیے کیونکہ اب سو روپیہ کی ملازمت پر ہندستانی آدمی ڈنر کھاتا ہے اور مولی کھانا بھول گیا ہے۔ یا مسلمانوں کے پانچ سے دس

دل میں ایسی تھی گویا میری یہ تقریر اس سے متصل ہی ہوئی ہے، اس لیے یہ عنوان قائم کیا تا کہ سند ہو اور مجسٹریٹوں اور کوتوالوں کے کام آئے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشن ہرنی سے وندھیا چل پہاڑ کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے نشیب و فراز میں غیر ہندستانیوں اور ہندستانیوں کی شجاعت و بزدلی کی سینکڑوں تاریخیں دفن ہیں۔ ان فلک بوس اور نا قابل عبور پہاڑوں سے ریل گاڑی کیا گزر سکتی، مگر ذی حوصلہ، بہادر، اوالوالعزم، عالی ہمت، جری، دلیر، دلاور، شجاع، نڈر، بے جگر، حوصلہ مند، جفا کش اور محنت سے عشق کرنے والے انگریزوں نے اپنی علمی سربلندی سے ان پہاڑوں کے سینے چاک کر کے دو بجے والی پسنجر کا راستہ بنایا ہے۔ اب اس پر سے فی گھنٹہ 55 کی رفتار سے پنجاب میل بھی گزر جاتا ہے اور پشاور ایکسپریس بھی، اس لیے میں تو جنگلوں کے خشک افسردہ مناظر کو چھوڑ کر انگریزوں کے پہاڑ شکن حوصلوں کی ان ترکیبوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

میں دیکھ رہا تھا اور میری جنگ و جدال اور قتل و خونریزی سے مست و مسرور ہونے والی فطرت جوان ہو رہی تھی۔ جب بہادر انگریز ڈرائیور ان خوفناک پہاڑی ڈھلوانوں، گھاٹیوں، درّوں اور اتار چڑھاؤ سے 55 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے انجن چلا رہا تھا، اس وقت خیال آیا کہ اگر آج کو اس ریل کی ڈرائیور کوئی ہندستانی عورت ہوتی تو غریب مارے احتیاط، رسوم، عقائد، نزاکت، نفاست، نا تجربہ کاری اور بزرگوں کی سختیوں کے ریل چلانے کی ہمت کرنے کے عوض چارپائی پر پڑ کر دق اور سل ہی میں مر جاتی، مگر نہ ریل چلاتی نہ اپنے بزرگوں کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی اور میرا تو تجربہ یہ ہے کہ ایک ہندستانی عورت کیا سارے ہندستان کے مرد بھی ایسا ہی کرتے۔ مگر نہ کرتے تو ان پہاڑوں سے ریل چلانے کی ہمت کہ فطرت نے ان پر اگر کوئی حسین احسان کیا ہے تو وہ یہی کہ ان سے کام کا حوصلہ چھین لیا ہے، اسی لیے ہر جگہ درخواست لیے کھڑے رہتے ہیں اور وہ بھی مع اہل و عیال!!

دیگر احوال یہ ہے کہ اب ریل گاڑی ایک درّہ نما ڈھلواں سے گزر کر اچانک ایک ہوش ربا پُل سے گزری، اس پُل کی ہولناکی، ہیبت اور ڈراؤنے عمق میں کافی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ ناگاہ مہری صاحب نے بھی جھانکنے کی زحمت گوارا فرمائی اور فوراً ہی اُف کہہ کر کھڑکی کے اندر ہو گئے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ "کیا خوف کی وجہ سے؟" فرمایا "ہاں"۔

میں نے کہا "مگر انجن کا انگریز ڈرائیور تو آپ کی طرح اُف نہیں کہتا، آخر اس کا سبب؟"

ہندستانی جواب عطا ہوا کہ "ان کا تو کام ہی یہ ہے"۔

میں نے کہا تو گویا ان کا کام ہی ہے، اس میں ان کی عالی حوصلگی، ہمت مردانگی اور حوصلے کو دخل نہیں؟

فرمایا "جی ہاں حوصلہ تو ہے مگر یہ کوئی بڑا حوصلہ نہیں کہ ایک پُل پر سے ریل گزار دی پُل خود مضبوط ہے"۔

اس وقت میرے تاؤ کا پارہ پورے کھولاؤ پر تھا، مگر میں نے طے کر لیا کہ ان سے بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل مسلم لیگی مسلمان سے کہا جائے کہ آپ بغیر سمجھوتہ کے کانگریس میں شریک ہو جایئے۔ یا جمعیۃ علما کے کارکنوں سے کہا جائے کہ آپ کانگریس کا سیاسی پیچھا چھوڑ دیجیے۔ یا مسلمان طلبا سے کہا جائے کہ آپ ریشمی لباس ترک کر کے کھدر کا لباس اختیار کیجیے اور کافی محنت کی زندگی بسر کیجیے۔ یا جاہل عورتوں سے کہا جائے کہ آپ غلط اور نقصان رساں رسوم کو ترک کر دیجیے اور پیروں فقیروں سے تعویذ نہ لیا کیجیے۔ یا پرانے خیال کے شوہروں سے کہا جائے کہ آپ اپنی انٹرنس پاس بیویوں کا پردہ توڑ دیجیے۔ یا بوڑھی عورتوں سے کہا جائے کہ آپ اپنی اِنّا للہ ہونے والی عمر میں مہندی لگانا ترک کر دیجیے۔ یا آٹھویں نویں جماعت کی طالبات سے کہا جائے کہ آپ سنیما کے تماشہ نہ جایا کیجیے۔ یا حضرت جگر مرادآبادی سے کہا جائے کہ خدا کے لیے آپ غزل کہنا ترک کر دیجیے۔ یا ہندو مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ رام لیلا اور مسجد کے سامنے باجے کی جنگ چھوڑ دیجیے۔ یا جمعیۃ الاقوام سے کہا جائے کہ حضور آپ کچھ کر کے دکھایئے اور اپنے اجلاسوں کو ترک فرما دیجیے۔ یا مسولینی اور ہٹلر سے کہا جائے کہ مارے انتظار کے مرے جاتے ہیں، عالم گیر جنگ شروع کر کے دکھایئے۔ یا دنیا کے عظیم الشان انسان مصطفیٰ کمال پاشا سے کہیے کہ اماں یہ بلقانیوں کے اتحاد پر بھروسہ کا کیا موقع ہے، یونان ہی پر چڑھ دوڑیے۔ یا بڑے سولوی صاحب سے کہا جائے کہ آپ چھری کانٹے سے ڈنر کھانے اور قدرے ڈانس کی مشق فرمالیجیے کیونکہ اب سو روپیہ کی ملازمت پر ہندستانی آدمی ڈنر کھاتا ہے اور سولی کھانا بھول گیا ہے۔ یا مسلمانوں کے پانچ سے دس

سال تک کی عمر کے لڑکوں سے کہا جائے کہ تم ہوٹلوں کی نوکری چھوڑ کر صنعت وحرفت یا حصول علم کی کوشش کروں۔ یا تانگے اور موٹر کار کے جاہل ڈرائیوروں سے کہا جائے کہ آپ آبادی میں تیز رفتار گاڑی چلانا چھوڑ دو ورنہ ایک دن مار کھاؤ گے اور نکالے جاؤ گے اور حوالات میں تہجد کی نماز پڑھنا ہوگا وہ الگ۔

یا تانگے والوں سے کہا جائے کہ اچھا تم چاہو جتنا تیز تانگہ چلاؤ مگر خدا کے لیے جگر مرادآبادی کی غزلیں چلا چلا کر نہ پڑھا کرو۔ یا حکام اور دولت مند مسلمانوں سے کہا جائے کہ یہ کوٹھی اور بنگلہ کے عوض مسجد میں نماز باجماعت کو تشریف لایئے اور یہ بات بات پر اور منٹ منٹ پر یورپ کا علاج اور یورپ کی سیاحت ترک کر دیجیے۔

یا ''ٹائمس'' اور ''پائنیر'' کے خریداروں سے کہا جائے کہ آپ اپنی مادری زبان کے اخباروں کے خریدار بن جایئے۔ یا بڑے مولوی صاحب سے کہا جائے کہ آپ مس زبیدہ کا ناچ دیکھ لیجیے۔ یا شاعروں سے کہا جائے کہ آپ کو قسم ہے جو ایک غزل سے زائد سنانے کی آپ کوشش کریں۔ یا عورتوں سے کہا جائے کہ آپ وعظ ومیلاد کے جلسوں میں نہ جایا کیجیے۔ یا پرانے اور جاہل اماموں سے کہا جائے کہ آپ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سبح اسمہ اور ھل اتٰک نہ پڑھا کیجیے بلکہ ہر جمعہ کوئی سورۃ یا نیا رکوع پڑھا کیجیے۔

یا کاہل حکام سے کہا جائے کہ آپ روز کا کام روز ختم کر دیا کیجیے اور دفتر میں ٹھیک وقت پر آ جایا کیجیے۔ یا پیشکاروں سے کہا جائے آپ رشوت نہ لیا کیجیے اور حاکم کے گھر نہ جایا کیجیے۔ یا جدید نسل والوں سے کہا جائے کہ آپ لڑکیوں کی شادی سولہ برس کی عمر ہی میں کر دیا کیجیے۔ یا مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ آپس میں اتفاق اور پیار سے رہا کیجیے۔ یا گرمی کے موسم سے کہا جائے کہ تو کم ہو جا یا پھر برقی انجینئریوں سے کہا جائے کہ آپ علمی قدردانی کے طور پر اپنے حصہ کا برقی پنکھا ملا رموزی صاحب کے گھر میں فٹ کر دیجیے۔

اس لیے حضرت مہری کی طرف سے مایوس ہو گیا کہ دریائے نربدا کا وہ ہیبت ناک پل آیا جس پر سے ریل گزرتے وقت ہندو بھائی تو اس میں پیسہ اور روپیہ پھینکتے ہیں اور مسلمان سہم کر کہتے جاتے ہیں کہ اگر اس میں ہماری ریل گر گئی تو؟ حیران تھا کہ اس خوفناک دریا پر سے ریل گاڑی

پوری 55 میل فی گھنٹہ رفتار سے جارہی تھی اور یہ اس لیے کہ اس پُل کو حال ہی میں ریلوے انجینئروں نے تعمیر کر کے کہہ دیا ہے کہ 50 برس تک کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن اگر اسی پُل کو اپنے ہندوستانی ٹھیکیدار تیار کرتے تو اول تو بارہ برس سے پہلے یہ پُل تیار ہی نہ ہوتا اور ہوتا تو ریل گاڑی کے گزرتے وقت پہلے پیروں، فقیروں کے نام کا فاتحہ پڑھا جاتا، پھر 'یا امام رموزی' کے نعرے لگاتے ہوئے مسافر ریل گاڑی کو اس پُل پر سے گزارتے اور ہر ماہ ڈرائیور امام رموزی کے نام کا صدقہ بکرا ذبح فرماتے۔

حاصل کلام ہوشنگ آباد آیا، میں نے بڑے کرّ وفر سے ایک آنہ کی چائے پی اور میرے ساتھی بھی اس گھمنڈ کے ساتھ ٹہلتے رہے کہ وہ اٹارسی میں تقریر کرنے جارہے ہیں سمجھا کیا ہے؟

یہاں سے اٹارسی بہت قریب ہے، اس لیے میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھیوں پر استقبال کرنے والے، جلوس نکالنے والے، جلسہ کا پنڈال، بارعب صدرِ جلسہ، ہجوم اور تقریر سوار ہوچکی ہے۔ چنانچہ اسی رعب سے گھبرا کر میرے ایک ساتھی نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ پلائی کہ دیکھو ملا تم وہاں مجھ سے مذاق نہ کرنا۔ مطلب یہ تھا کہ میں اثر ڈالنے کے لیے وہاں کے لوگوں کے سامنے ذرا پھولا ہوا سا رہوں گا اور بے حد ''واللہ چنانچہ پن'' سے کام لوں گا اور تمھارے مذاق کا توڑ نہ کرسکوں گا تو میرا سارا مقررانہ وقار خاک میں مل جائے گا۔ میں ان کے اس بچپن اور گھبراہٹ پر مسکرا دیا اور مہری کو دیکھا تو وہ اپنی شیروانی کے بٹن لگانے میں مصروف تھے۔ میں تاڑ گیا کہ یہ بھی رعب ڈالنے کا انتظام فرما رہے ہیں، جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اٹارسی کے مجمع کا رعب خود ان پر بخار بن کر چڑھ رہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو بدحواس دیکھ کر ان کو زیادہ چھیڑنا شروع کردیا کہ وہ اٹارسی کا اسٹیشن آگیا اور استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے وہی بزرگ نظر آئے جو ہمیں دعوت دینے رات کے بارہ بجے تشریف لائے تھے۔ ان کے بعد نائب صدر انجمن نورالاسلام تھے کہ وہ ریل کھڑی ہوگئی۔

(3)

پلیٹ فارم سے پُل تک استقبالی بھائیوں کے السلام علیکم اور معانقہ کی قسم کے مصافحوں کا سلسلہ تھا کہ مسافروں کو حیران بنائے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے ہمراہی بے حد متین، سنجیدہ،

باوقار اور رعب داب کے چہرے بنائے ہوئے تھے۔ میں بھی بے حد مہذب اور شریف آدمی معلوم ہورہا تھا۔ پُل سے اتر کر راستہ قدرے صاف ہوگا، مگر استقبالی بھائی راستہ میں بھی جگہ جگہ بہت خاصا جھکا ہوا السلام علیکم بنتے چلے آتے تھے۔

ہمارے جلوس کے لیے پولیس میں کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مذہبی جلوس ہوگا، اس لیے پولیس کو اطمینان تھا، مگر میں دل سے چاہتا تھا کہ راستہ میں کوئی فساد ہو جائے تا کہ اخباروں میں لکھا جائے کہ:

''تین مقتول، 40 مجروح، 12 شفاخانہ میں جا کر جاں بحق تسلیم ہوئے—باقی کے پسپا ہوئے البتہ اِکا دُکا پر اب بھی حملے ہو رہے ہیں۔ جواہر لعل نہرو بھی فیصلہ کرانے آرہے ہیں، مگر ملا رموزی صاحب مسلمانوں کو برابر بھڑکا رہے ہیں۔ دفعہ 144 کا نفاذ ہو چکا ہے۔ فوج گشت کر رہی ہے''۔

مگر افسوس کہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے تمام ساتھی انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ اب میں اکیلا بے وفا اور نمک حرام کیا کرتا۔ پھر بھی میں نے ازلی فتنہ سامانی سے یوں کام لیا کہ جلوس والوں ہی پر شدید نکتہ چینی اور اعتراضات کا لام باندھ دیا۔ جو سامنے آیا نہیں کہ میں نے اعتراض کیا۔ غرض کافی اعتراضات کے بعد ہمارے جلوس کا مولویانہ تعزیہ ایک معزز اور بھاری بھرکم ملک التجار کے دولت خانہ پر رکھ دیا گیا۔

میں نے یہاں بھی حاکمانہ رعب داب قائم رکھتے ہوئے فرمائشوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ کبھی سوڈا واٹر منگاتا، کبھی برف اور کچھ نہیں تو اچھی خاصی جمی جمائی کرسیوں ہی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھواتا—یہ کہہ کر کہ اس طرف گرمی ہے اور اُس طرف سے لو آرہی ہے، مگر میرے ساتھی تہذیب کی قید سے معذور سے بنے بیٹھے تھے یہاں تک کہ یہ لوگ اپنی ضرورت بھی مجھ ہی سے کہتے تھے۔ محض اس لیے کہ یہ لوگوں پر کمانڈ کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے، اس لیے اپنی ہر خواہش کو خود ہی خلاف تہذیب سمجھ کر پی جاتے تھے، مگر میں تھا کہ چھایا ہوا تھا اور الحمدللہ کہ آج تک کسی نے مجھ سے شکایت بھی نہ کی۔

آپ جانتے ہیں کہ جب تقریر کے لیے کوئی شخص بلایا جاتا ہے تو وہاں کے میزبان مسلمان

کس درجہ ناز برداری کرتے ہیں۔ ادھر میں وہ ہوں کہ حکومت سے بھی چاہتا ہوں کہ میرے ادبی کمالات کی ناز برداری کرے اور بیوی نمبر دو سے بھی چاہتا ہوں کہ اگر ناز برداری کرتی ہو تو عشق ورنہ خدا حافظ، اس لیے یہاں کے مسلمان تھے کہ میری ناز برداری میں مصروف تھے۔

اب میں ٹھہرا پیدائشی آزاد، باغی، سرکش اور جھگڑالو، اس لیے میرے بس کا نہیں کہ میں کسی مہذب مجمع میں اندھا حافظ جی بن کر بیٹھا رہوں۔ لہٰذا میں نے حضرت مہری کو ورغلایا کہ چلیے ذرا تفریح کر آئیں۔ مہری نے میری زورداری اور سرکشی کا اندازہ ریل ہی میں کرلیا تھا، اس لیے غریب بے چوں و چرا ساتھ ہوگیا۔ باٹا کمپنی کے منصرم، میونسپل کمشنر اور انجمن اسلام کے نائب صدر میرے ہمراہ ہوگئے۔ بازاروں میں سے گزرا تو ہندو بھائی مجھے یوں گھورنے لگے کہ میں سفید گاندھی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا اس لیے ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ مسٹر محمد علی جناح کے مخالف اور کانگریس کے حامی ہیں۔

باٹا کمپنی میں بٹھادیا گیا اور یہاں ہم لوگوں کو درجہ اول کی چائے پلائی گئی اور اسی جگہ سے میرے اور باٹا کمپنی کے منصرم صاحب کے درمیان نصف سے زائد انگریزی گفتگو شروع ہوئی۔ میں دل میں خوش تھا کہ باقی کے تمام مولویوں میں میری انگریزی دانی ہی کا سکہ جم گیا۔ حضرت منصرم نے باٹا کمپنی کی ایک انگریزی کتاب مجھے دی جس میں حضرت باٹا کی تصویر بھی تھی۔ یہ موٹا تازہ اور مشٹنڈے قسم کا جرمن تاجر غضب کا تاجر ہے کہ آج ہندستان کا کوئی قصبہ نہ ہوگا جہاں جناب باٹا کے جوتے نہ ملتے ہوں۔

میں نے یہ کتاب دیکھ کر کہا کہ ہندستان کے نوجوان میں بھی تجارت کا یہ عالمگیر حوصلہ نہیں جو اس بوڑھے جرمن میں ہے۔ ہاں ہندستانی نوجوان ملازمت میں بڑا مستعد ہے، سو وہ بھی کام کرنے میں نہیں بلکہ صرف ملازمت کرنے میں یا سینما کا تماشہ دیکھنے میں۔

چائے پی کر اٹارسی کے مناظر دیکھتے رہے۔ شعری لطافتوں کا وجود بھی نہیں البتہ ہوشنگ آباد کے خربوز تربوز اچھے تھے۔ عصر کی آدھی نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد گئے تو یہاں بھوپال کے شیوہ بیان ادیب و عالم حضرت مولوی ابراہیم خلیل مولوی عالم نگراں رسالہ ''گوہر تعلیم'' سے نیاز حاصل ہوا اور ان ہی کی امامت میں سفر کی آدھی نماز پڑھی۔ حضرت مولوی ابراہیم خلیل ایک

کامیاب مقرر و واعظ ہی نہیں بلکہ ان کی علمی و ادبی معلومات اور شعری ذوق کی بلندیاں لاجواب ہیں اور تقریر و بیان کی روانی کا یہ عالم ہے گویا وہ محض خدا کے خوف سے چپ ہو جاتے ہیں ورنہ وہ بولے ہی چلے جائیں۔ اسی طرح ان کی تقریر میں قرآن و حدیث کے استدلال کا حسن ان کا عدیم النظیر کمال ہے۔

میں نے آہستہ سے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ فرمایا "تقریر کرنے"۔

بس ان کا یہ فرمانا تھا گویا میرے تقریری حواس جاتے رہے اور میں نے محسوس کیا کہ میں ان ایسے واقفِ اسرار خفی و جلی کے سامنے قیامت تک بھی تقریر نہ کر سکوں گا، لیکن اپنی شہرت کی غیرت سے ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مولوی صاحب آپ آج میری تقریر تک اٹارسی شہر سے باہر ہی رہنا، لیکن ایک گھبراہٹ تھی جو ان کی موجودگی سے میرے دماغ پر طاری ہو گئی تھی۔ اب میں اپنے دل میں لاکھ کہتا تھا کہ مولوی صاحب میری اول فول سی تقریر پر جلسہ ہی میں اعتراض تھوڑا ہی کریں گے مگر گھبراہٹ کہتی تھی کہ اگر اعتراض کر دیا تو؟

اس لیے بار بار جی میں آتا تھا کہ مولوی صاحب کو علاحدہ لے جا کر ان کے قدموں پر گاندھی جی کی ٹوپی ڈال کر عرض کروں کہ اے مولوی صاحب خدا کے لیے آپ کسی بہانے سے آج اٹارسی سے باہر چلے جایئے اور بعد میں چاہیں تو آپ عمر بھر کے لیے اٹارسی ہی میں آباد ہو جائیں تاکہ میں بغیر گھبراہٹ کے تقریر کر لوں۔ کبھی کبھی دل میں کہتا کہ اگر آج تقریر میں خدا نے شرم کھالی تو انشاء اللہ شریف ہوں تو آئندہ کبھی تقریر کے لیے گھر سے باہر نہ آؤں گا کہ ناگاہ ایک اور مقرر صاحب ہم لوگوں سے ملے اور حضرت طرزی سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ:

"میں چاہتا ہوں کہ ہم تمام مقرر آپس میں تقریر کا ایک ہی راستہ مقرر کر لیں تاکہ ہماری تقریروں میں اختلاف نہ ہو"۔

میں بات کاٹ کر بولا کہ "آپ کا مطلب؟"

فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کہ یہاں جو شخص بھی تقریر کرے وہ صرف سیرت پر تقریر کرے، سیاست پر کچھ نہ کہے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے مسائل پر کچھ بولے"۔

میں تاڑ گیا کہ یہ بے چارے وارنٹ، گرفتاری، حوالات، چالان، عدالت کی ایک ہزار کے قریب پیشیوں، جرح اور قید با مشقت سے ڈرتے ہیں سیاست سے نہیں جب کہ رسول گرامی علیہ السلام کی ساری زندگی ہی سیاست ہے،اس لیے میں نے چمک کر عرض کیا کہ:

''مگر میں تو ایسی ہی تقریر کے لیے آیا ہوں جس کے اثر سے گورنمنٹ کا کچھ نہ ہو تو کم سے کم ہندو مسلم فساد ضرور ہو جائے ،تو اس سے جناب کو کیا خوف۔ پھر یہ بتایئے کہ جو مرد عمر میں ایک مرتبہ بھی کسی بھاری نقصان، کسی بھاری تکلیف اور کسی عظیم الشان خطرہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو مرد کہا جائے یا مرزا پھویا لکھنوی؟''

میرے ان الفاظ کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ البتہ میری شرارت کی رگ ضرور بھڑک اٹھی اور میں نے بار بار ایسے فقرے کہنا شروع کر دیے جس سے مولوی صاحب کو یقین آ جائے کہ آج اگر اتارسی میں ٹھہر گیا تو بغاوت ہو کر رہے گی اور میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ خاص مصیبت یہ تھی کہ ہماری قیام گاہ کے منہ کے سامنے ہی یار لوگوں نے جلسہ کا پنڈال بنا دیا تھا جس کی وسعت اور رنگینی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہزاروں سے کم کسی طرح بھی شریک نہ ہوں گے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس پنڈال میں عورتوں کے لیے ایک ''زنانہ'' بھی تھا۔ ان حالات سے میری گھبراہٹ میں خاصا اضافہ ہو رہا تھا اور میں اپنے دماغ کو تقریر کی گھبراہٹ سے جتنا پاک کرنا چاہتا تھا ان حالات سے وہ اتنا ہی ڈرتا تھا۔ حد ہے یا ستم کہ محترم میزبانوں نے شام کے کھانے کا بندوبست بھی اسی پنڈال کے قریب کیا۔ قسم لے لیجیے جو مارے وحشت کے یاد بھی کر رہا ہو کہ کیا کھایا؟ ادھر میری گھبراہٹ کا تو یہ عالم اور اُدھر محترم میزبانوں کا یہ حال کہ وہ غریب اپنے خلوص سے چاہتے تھے کہ اگر اس وقت ہم تقریر کرنے والوں میں سے کوئی کہے کہ میں اونٹ کے کباب کھاؤں گا تو شاید یہ شریف میزبان طرابلس کا اونٹ لانے کے لیے تار تو دے ہی دیتے۔ وقت پر آتا یا نہ آتا یہ ہماری قسمت تھی۔ لہٰذا اب مجھ پر ان کی اس خاطر کا اثر بھی یہ ہوا کہ اب جتنے اچھے کھانے کھا رہے ہو اتنی ہی اچھی تقریر بھی کرنا اے ملا رموزی!

کھانے کے بعد ایک خوشگوار سی جگہ نہایت آراستہ پیراستہ انداز سے آرام کرسیاں ہمارے قیلولے کے لیے لگا دی گئی تھیں۔ میں ہی تھا جو سب سے پہلے ایک آرام کرسی پر اس شان سے دراز

ہو گیا گویا میں ہی سب سے بہتر تقریر کر کے دکھاؤں گا، حالاں دل میں خدا یاد آ رہا تھا۔

اب خدا جانے آٹھویں یا نویں مصیبت یہ نازل ہوئی کہ مختلف مقامات کے لوگ باگ ہم لوگوں کی ملاقات کو آنا شروع ہوئے۔ ایک صاحب نے ہمارے تعارف کا ٹھیکہ لے لیا تھا جو سب سے پہلے میرا ہی تعارف کرا دیتے، مگر میں رسمی خلوص اور مروجہ الفاظ کہنے کے عوض ہر ملنے والے کو گھورتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں یہ صاحب مجھ سے زائد قابل تو نہیں ہیں اور میری تقریر کی کمزوریوں کو بھانپ تو نہ جائیں گے مگر وہ جو مثل مشہور ہے کہ "اناڑی میں جو ہے سو 52 گز کا"۔ سو اللہ کے فضل سے جو صاحب ملتے تھے اچھے خاصے ہی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جو میری نظر اٹھ گئی تو مہری کو دیکھا کہ وہ قدرے قلیل پریشان نہیں تو "پریشان نما" ضرور ہو رہے ہیں، اس لیے میں نے ان کو اپنی کرسی کے قریب بٹھا کر ذیل کی گفتگو شروع جو کی جو مہری کے رہے سہے حواس خراب ہونے لگے۔ مثلاً میں نے کہا کہ:

"بتاؤ شادی سے قبل عورت کے قول فعل پر بھروسہ کیا جائے یا نہیں؟"

پہلے تو آہستہ سے فرمایا کہ پاگل ہو گئے ہو یہ بھی کوئی موقع ہے اس قسم کی بیہودہ گفتگو کا، مگر بعد میں کچھ پُر لطف ہو کر بولے کہ:

""جی ہاں شادی سے قبل تو بالکل ہی بھروسہ نہ کیجیے اور خدانخواستہ شادی ہو ہی جائے تب بھی بھروسہ نہ کیجیے"۔

اس پر میں نے کہا کہ "آپ عورت کے کردار سے اتنے مشکوک کیوں ہیں"۔ فرمایا "میرا تجربہ ہے جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں"۔ اب چونکہ تجربہ کا سوال تھا اس لیے مجھے مجبوراً قائل ہونا پڑا، مگر میں نے ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کہا کہ:

"اچھا بتائیے کہ یہ لڑکیوں کے مدرسوں کی استانیاں مارے ریشمی لباس کے مدرسہ میں پری جمال صاحب بن کر کیوں جاتی ہیں؟"۔ فرمایا "چھچھورے پن کی وجہ سے"۔

میں نے کہا "اچھا بتائیے فطرتاً لڑکا نیک ہوتا ہے کہ لڑکی؟"

فرمایا "نیک تو دونوں نہیں ہوتے، البتہ بدی کا موقع جس کو مل جائے"۔

میں نے کہا کہ "عشق و محبت کا معاملہ خوبصورتی کی کس حد سے شروع ہوتا ہے؟"

فرمایا ''خوبصورتی کو عشق میں دخل نہیں بلکہ عشق پیدا ہوتا ہے قریب ہونے اور قریب رہنے سے''۔

اس پر میں نے بات کاٹ کر کہا کہ ''پھر یہ عشق تو نہ ہوا'' فرمایا ''ہرگز نہیں بلکہ بے بسی کا نام عشق ہے اور بے بسی کا نام ہی سرکاری ملازمت ہے''۔

واضح رائے عالی ہو کہ اس عرصہ میں ملنے والے برابر آرہے ہیں، مگر میں مہری سے خواہ مخواہ ہی گفتگو کے ذریعہ اپنے خوف کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ کہیں کہیں وعلیکم السلام کہہ کر اور کبھی کبھی ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ تک جواب کو لمبا کر کے۔ پھر مہری سے مخاطب ہو جاتا تھا، مگر گیارہویں یا دسویں مصیبت تھی میری عالم گیر شہرت، اس لیے جو آتا تھا میرے ہی مصافحہ سے لپٹ کر رہ جاتا تھا اور میں تھا کہ پوری بے مروّتی اور بے توجہی سے ان ملنے والوں کی باتیں کاٹ کر مہری سے مخاطب ہو جاتا تھا، اس لیے میں نے پھر مہری سے سوال کیا کہ ''اچھا بتاؤ محبت کے معاملہ میں مرد باوفا ہے یا عورت؟'' فرمایا ''حالات ہی باوفا بناتے ہیں اور حالات ہی بے وفا، یعنی اگر عورت کے حالات اجازت اور موقع دیتے ہیں تو اس سے زائد باوفا مرد نہیں لیکن اگر اس کو اپنی چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہے تو اس کے برابر بے وفا کوئی اور نہیں''۔

اس پر میں نے کہا کہ مولانا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو گزشتہ زمانہ میں لڑکی پیدا ہونے پر اس کو جلا دیتے تھے اور لڑکے کی پرورش کرتے تھے۔

اتفاق سے یہ واقعہ نکلا یعنی حضرت مہری اپنے گھر کے لوگوں سے کسی قدر ناراض تھے، اس لیے قدرے بھنا کر بولے کہ ''جی ہاں یہی سہی مگر میرے تمام جوابات صحیح ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ کو کوئی باوفا مل گئی ہو تو آپ اپنی شاعری سے اس کی تعریف کے پُل باندھ رہے ہیں کہ اس موقع پر گفتگو کے انداز کو تاڑ کر حضرت مولانا ابراہیم خلیل نے مجھ سے غزل سنانے کی فرمائش کی۔ میں خدا سے چاہتا تھا کہ میری ہونے والی تقریر کی گھبراہٹ کا کوئی رُخ بدل دے، اس لیے میں نے بغیر لکھنوی تکلف کے غزل سنائی۔ اس پر اناری کے ملاقاتی حیران ہوئے کہ میں غزل کہنا بھی جانتا ہوں۔ جی میں تو آیا کہ کہہ دوں کہ بس تو اب مجھ سے تقریر کا کام نہ لیجیے۔ مگر میں کرایہ خرچ کر چکا تھا تقریر ہی کے وعدہ پر اس لیے مقدمہ چل جانے کے خوف سے خاموش رہا لیکن بڑی

حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ تقریر کے خیال سے میرا دل تو ڈوبا جا رہا تھا لیکن میرے ساتھیوں کے چہرے کی رونق بڑھ رہی تھی، اس لیے مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے آہستہ سے مہری سے کہا کہ "بھئی مہری تم جانتے ہو کہ مجھے مارے بیوی نمبر دو کے کبھی تقریر کا موقع نہیں ملتا، اس لیے بتاؤ کہ میں تقریر میں اگر اول فول ہو جاؤں تو کیا کروں؟"

بے ساختہ بولے "لوگوں سے درود شریف پڑھنے کا کہہ کر خود کو سنبھال لینا"۔ میں نے کہا "جو اس کے بعد بھی کچھ نہ بن آئے" تو کہا "کھانسی سے کام لینا"۔ میں نے کہا اگر اس کے بعد بھی کچھ نہ بن آئے؟" تو فرمایا "لگاتار پانی پیتے رہنا"۔ میں نے کہا "اس کے بعد؟" فرمایا "فرضی علالت کا بہانہ کر کے بیٹھ جانا"۔ میں نے کہا "اگر اس کے بعد بھی لوگوں کا اصرار بڑھے تو؟" فرمایا "مثنوی مولانا روم گانا شروع کر دینا"۔ میں نے کہا "یہ مجھے یاد نہیں؟" تو بھنا کر بولے کہ "پھر گھر سے تقریر کے لیے نکلے ہی کیوں تھے؟"۔

(4)

غیر مقرر اور جن کو تقریر کا شوق تو ہو مگر کبھی تقریر کرنا نصیب نہ ہوا ہو یا وہ خود کو بہترین مقرر تصور کرتے ہوں اور بیوی پر بھی اپنی تقریر کا رعب ڈال چکے ہوں مگر کبھی تقریر کرنا نصیب نہ ہوا ہو یا کبھی تقریر کی ہو تو فقط خوشامد، چاپلوسی اور دعا گوئی کی قسم کی۔ ان کے دماغ میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا کہ بعض مقرر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تقریر شروع کرنے سے دس منٹ پہلے تک بجائے تقریری نکات سوچنے کے یہ سوچا کرتے ہیں کہ:

"اور اگر اس مرتبہ کی بارش میں میرا نیم خام سا مکان بالکل ہی گر گیا تو کیا ایڈیٹر صاحب "ندیم" بنوا دیں گے؟"

"اچھا تو اس کی تعمیر کے لیے لالا ساون رائے صاحب سے قرض لوں تو یہ تو ممکن ہے مگر وہ بغیر زیور کے اگر نہ دے گا تو پھر؟"

"اور وہ جو شکورا قصائی کے اس مرتبہ بھی تین روپیہ باقی رہ گئے ہیں تو؟"

"خیر سائیکل تو اب نہیں کل درست ہو جائے گی مگر یہ جو بارش سر پر ہے اور چھتری ندارد تو؟"

''اور ہاں وہ ابھی یاد آئی کہ لڑکے نمبر دو کو مدرسہ میں داخل کرنا ہے تو؟''

''لاحول ولاقوۃ اور وہ جو پرسوں میں نے بیوی کو دس روپیہ دینے کو کہا تھا وہ؟''

غرض ان سے بھی سوا خیالات کا ہجوم اس وقت تک رہتا ہے جب تقریر کے لیے جناب صدر چلا کر فرماتے ہیں کہ ''جناب ملا رموزی صاحب تشریف لائیں''۔

شاید اسی قسم کے مقرر کو درجہ اول کا مقرر تسلیم کیا گیا ہے جو تقریر سے کچھ پہلے بھی نہیں سوچتا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب تقریر شروع کروں گا تو دریا بہاؤں گا اور بعض وہ ہوتے ہیں جو تقریر سے پہلے لاکھوں تقریری نکتے سوچتے سوچے اور یادداشتیں لکھتے لکھتے مرجاتے ہیں اور اتنا سوچنے پر بھی جب بولتے ہیں تو ایسا کہ لڑکے بھی قہقہہ لگائیں اور لڑکیاں بھی۔

مجھے بٹھایا بھی تھا تو کہاں کہ جلسہ گاہ کے بالکل منہ پر اس لیے میں دیکھ رہا تھا کہ جلسہ گاہ بھرتی جارہی ہے اور وہ بھی کھچا کھچ۔ مردوں کی فوجیں جس جوش وخروش سے جمع ہو رہی تھیں عورتوں نے بھی قسم کھائی تھی کہ ملا رموزی کی تقریر سنتے ہوئے اگر ماری بھی گئیں تو شہید ورنہ غازی۔

اس لیے اب حاضرین سے جلسہ گاہ اور عورتوں سے جب ''زنانہ'' لبریز ہوگیا تو میری وحشت کی حد نہ رہی کہ نظام عمل کے موافق جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی اور اٹارسی کے ایک جلیل القدر رئیس التجار جلسہ کے صدر بنائے گئے اور اعلان ہوا کہ حضرت مولانا قبلہ ابراہیم خلیل مولوی فاضل تقریر فرمائیں گے۔ ممدوح کے بعد حضرت مولانا طرزی مشرقی اور سب سے آخر میں حضرت ملا رموزی صاحب کی تقریر ہوگی۔

جلسہ گاہ کافی سے زائد دلربا، رنگین، دل کشا، دل کش، دلنواز، دلفریب، نظر فریب، نظر آرا، نظر پرور، نظر نواز، جاذب نظر اور نظر افروز تھی اور اوپر سے بجلی کی روشنی سے جھلمل بھی اور جگمگ بھی، اس لیے معزز مسلمان بھی صاف نظر آرہے تھے اور محترم ہندو بھی۔ عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ اب جو اتنے رعب اور شان کے جلسہ میں تقریر کرنے کا مجھے خیال آیا تو بے ساختہ جی چاہا کہ کاش میں بیوی سے کہہ کر آتا کہ جیسے ہی کہ میری تقریر کا وقت شروع ہو تمھارا ایک جھوٹا تار مجھے اس مضمون کا عین جلسہ میں پہنچ جائے کہ:

''حالت خراب ہے، صورت دیکھنا ہو تو پہلی گاڑی سے آؤ''۔

پس اگر بیوی کا کوئی ایسا تار مجھے مل جاتا تو تقریر سے بھی بچ جاتا اور لوگ باگ اُلٹی ہمدردی کرتے ہوئے مجھے اسٹیشن تک رخصت کرنے آتے، مگر حافظہ کی کمزوری کہ میں بیوی سے ایسا کہنا بھول گیا تھا تو اب تقریر سے انکار ناممکن تھا۔

حضرت مولانا ابراہیم خلیل اور حضرت طرزی تو جلسہ گاہ میں جا چکے ہیں مگر میں ایک پلنگ پر دراز ہوں۔ میرے پاس بمبئی کے ایک ایسے تاجر آرام کرسی پر دراز ہیں جنھیں تقریریں سننے سے زیادہ گیارہ بجے کی ریل سے ناگپور جانا عزیز ہے اس لیے وہ دل ہی دل میں مجھ سے نفرت کر رہے تھے اور میں ان سے کہ حضرت مہری تشریف لائے اور جھنجلا کر فرمایا کہ:

''اماں کیا تقریر نہ کرو گے؟''

حضرت مولوی حافظ محمد حیات مہری رات کی تاریکیوں میں میرے رفیق طریق اور دن کو میری جان کے دشمن کی طرح دوست ہیں، آپ کیا سمجھے؟ یعنی جناب مہری میرے ہم مکتب ہیں، وسعتِ علم ونظر، نقد ونکتہ دانی اور شعر وانشاء میں یہ میرے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ یعنی اگر بحث میں وہ مجھ سے دب گئے تو میں ان کا استاد ورنہ میں شاگرد اور وہ استاد۔ نیک اطوار، پاک کردار، داڑھی سیاہ، مونچھیں دراز، نمازی، پرہیزگار اور میری حرکات سے ہمیشہ بیزار۔ پھر بھی میرے جاں نثار۔ میں حکومتوں اور گورنمنٹوں کے حق میں جتنا سخت، باغی، فتنہ پرواز، انارکسٹ اور بمباز یہ اتنے ہی نمک حلال اور دعا گو۔ آج تک اگر کوئی گناہ کبیرہ کیا ہے تو یہ کہ ایک صابر وشاکر مولوی صاحب کے دوست رہے ہیں اس لیے ترقی پسند ہونے پر بھی جس درجہ میں بٹھا دیجیے خوش اور شکرگزار لیکن ذوق کی لطافت نے مجھے جو غلام بنالیا ہے تو اب مولوی صاحب سے کنارہ کش ہونے پر تیار ہیں۔ ان کا تخلص میرا ہی وضع کردہ ہے اس لیے بس تبرکاً لیے پھرتے ہیں مگر شعر نہ کہا ہے نہ کہیں گے۔ البتہ میرے ہر مصرع پر اصلاح دینے سے چوکتے نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات پر ان سے زائد کون ہوسکتا تھا جس کو مخاطب کر کے میں تقریر کی طرف سے اپنا خیال ہٹا لیتا۔ لہٰذا میں نے ان سے کہا کہ:

''جی ہاں تقریر تو کرنا ہی ہے مگر یہ تو بتایئے کہ انسان خوش پوشاک اور خوش لباس کب سے ہوتا ہے، بچپن یا جوانی میں؟''

فرمایا ''بڑھاپا شروع ہونے پر، اسی لیے دیکھا ہوگا کہ خضاب لاجواب کے استعمال اور نوک پلک سنبھال کر سرمہ لگانے میں جتنے مستعد بوڑھے ہوتے ہیں نوجوان نہیں''۔

میں نے کہا ''کیوں؟''

فرمایا ''بڑھاپے کے لیے طے کیا گیا ہے کہ وہ موت کی نشانی ہے اور انسان فطرتاً موت سے ڈرتا ہے، اس لیے بڑھاپے کی علامات چھپانے اور خود کو جوان تصور کرنے کے شوق میں بوڑھے ہمیشہ رنگیلے نظر آئیں گے اور نوجوان مست''۔

میں نے کہا ''نوجوان کیوں آراستہ نہیں ہوتے؟''

فرمایا کہ ''ان کی جوانی کی آرائش ان کے خیال و عمل کا جوش ہوتا ہے نہ کہ لباس کی نفاست۔ البتہ کالج زادے اس ضابطہ سے یوں بری ہیں کہ وہ صحیح معنی میں جوان ہی نہیں ہوتے، اس لیے ان پر مستی، جوش، دیوانگی اور جنون کے عوض فیشن کی نفاستیں غالب رہتی ہیں''۔

میں نے کہا اچھا بتایئے کہ....

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بات کاٹ کر بولے ''اماں یہ سوالوں کا وقت ہے یا تقریر کا؟''

اب تو مجھ سے بھی نہ رہا گیا اور میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ:

''مہری میری عزت تمھاری عزت ہے اور تمھاری عزت میری عزت۔ بات یہ ہے کہ میں تقریر کرنے سے جیسا اس مرتبہ گھبرایا ہوں شاید ہی کبھی گھبرایا ہوں''

''تو اس کا سبب؟'' جھنجلا کر فرمایا۔

میں نے کہا ''بات یہ ہے کہ گھر پر نومسلموں کی سی زندگی بسر کرتا ہوں۔ کبھی مجھے تقریر کا موقع ملتا ہو تو تم ہی بتا دو'' کہ وہ صدر صاحب نے اعلان فرمایا کہ ''حضرت مولانا طرزی'' دم سا نکل گیا کہ اب آئی میری باری کہ وہ چند صاحبان تشریف لائے اور فرمایا کہ ''حضرت صدر جناب کو یاد فرماتے ہیں''۔

اب میں اس طرح جلسہ گاہ کی طرف چلا گیا گویا پھانسی کے وقت بیوی سے آخری گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔ صدر نے مجھے شانہ سے شانہ ملا کر بٹھایا۔ میں اس وقت گاندھی ٹوپی پہنے تھا یا اوڑھے تھا اس لیے جلسہ کے تمام محترم ہندو حاضرین ناظرین نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔

اب میں نے بھی طے کرلیا کہ تقریر کر کے بدنام ہونا تو یقینی ہے لہٰذا اب پریشان ہونے سے حاصل؟ لہٰذا میں نے بھی بیٹھے بیٹھے جلسہ پر رعب ڈالنا شروع کر دیا۔ مثلاً:

کبھی اپنے سامنے بولنے والے مقرر کی طرف اس عالمانہ پندار سے دیکھتا گویا یہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں سب غلط۔

کبھی لوگوں کی طرف اس انداز سے دیکھتا گویا کہہ رہا ہوں کہ جب میں تقریر کروں گا تو بھول جاؤ گے مولانا ابوالکلام آزاد کو۔

کبھی بے وجہ بھی پانی منگا کر پی لیتا کہ شاید تقریر میں اٹک کر پانی پینا پڑے اس لیے دکھادوں کہ میں تقریر سے پہلے بھی تو پانی پی رہا تھا۔

کبھی تقریر کرنے والے کی طرف دیکھ کر اس طرح گردن ہلاتا گویا وہ جو کچھ فرمار ہے ہیں میں اس سے زائد جانتا ہوں۔

کبھی خواہ مخواہ یوں کھانستا کہ لوگ میری آواز کے کرارے پن سے تاڑ جائیں کہ جب تقریروں گا تو زمین ہل جائے گی۔

کبھی تقریر کرنے والے کی طرف اس طرح بھی دیکھتا گویا وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میرا ہی سکھایا ہوا کہہ رہے ہیں۔

یہ لیجیے وہ حاضرین کی طرف سے صدر کے نام پرچہ آیا کہ:

''لوگ دور دور سے حضرت ملا رموزی کی تقریر کے لیے آئے ہیں انھیں کھڑا کیجیے''۔

صدر نے یہ پرچہ مجھے دیا۔ جان نکل گئی۔ پسینہ آگیا۔ حواس نے جواب دے دیا۔ ایک آدمی کے عوض چار چار نظر آنے لگے۔ پرچہ کا جواب کیا دیتا کہ وہ مقرر صاحب نے خود ہی "برحمتك یا ارحم الرّاحمین" کہہ دیا اور صدر جلسہ نے میرا تعارف شروع فرمایا۔ اس وقت جی چاہنے لگا کہ جلسہ کو مخاطب کر کے کہہ دوں کہ:

''بھائیو اور بہنو! وہ جو آپ نے آج تک ملا رموزی کی تعریف سنی تھی یہ سب سی آئی ڈی والوں کی شرارت تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ وہ غریب کچھ بھی نہیں جانتا، اسی لیے وہ غریب خود حاضر نہ ہوسکا، میں ملا رموزی کا خالہ زاد بھائی ہوں، مجھے بھیجا ہے، مجھ سے جو کچھ بن آئے گا وہ عرض

کروں گا کہ معاً خیال آیا کہ ادملا رموزی گورنمنٹ سے نہیں تو رعایا سے تو ڈر کہ تیری دس پانچ تصویریں بھی تو شائع ہو چکی ہیں، اس لیے مفت میں کیوں جھوٹا بنتا ہے، لہٰذا خاموش رہا اور صدر کے تعارف کے بعد تقریر کے لیے کھڑا ہوا۔

پہلے تو دیکھ رہا تھا کہ لوگ جلسہ سے تنگ آ کر باہر جا رہے ہیں مگر اب کیا دیکھتا ہوں کہ غول کے غول جلسہ گاہ میں باہر سے آ رہے ہیں کہ میں چلا کر کہا:

''جنابِ صدر و حاضرین جلسہ!''

کہ مجھے مارے گھبراہٹ کے ایسا محسوس ہوا گویا میں کہہ گیا کہ:

''او بھائی صدر یہ کیا کرتا ہے جو مجھ سے تقریر کو کہتا ہے، میرا تو ویسے ہی دم نکل رہا ہے'' اب جو ایسا محسوس ہوا تو جی چاہنے لگا کہ معافی مانگ لوں کہ منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ:

''سفر کی تھکن سے میں زیادہ عرض نہ کر سکوں گا''۔

کہ پھر خیال آیا کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے جب سفر کُل ڈیڑھ گھنٹہ کا ہے۔ اس الجھن سے قریب تھا کہ میرے لہجہ پر کپکپی طاری ہوتی کہ میں نے کہا:

''اچھا درود شریف تو پڑھیے''۔

جلسہ گاہ ہلنے لگی درود شریف کے شور سے اور میں سمجھا کہ میری تقریر کا رنگ جم گیا۔ اس لیے میں نے پھر کچھ کہا مگر اٹک گیا تو میں نے اس طرح پانی منگایا گویا جب تک پانی نہ پی لوں اگر بولا تو مر جاؤں گا۔ اس عرصہ میں میں نے تقریر کو دل ہی دل میں تیار کیا۔ لوگ مستعد بھی تھے کہ منہ سے نکلا نہیں 'پانی' کہ بغل ہی سے ایک صاحب نے گلاس بڑھا کر فرمایا یہ لیجیے۔ اب فرمائیے کہ میں اتنی تیزی سے کتنی تقریر تیار کرتا، اس لیے پانی کا گلاس منہ سے لگا کر تقریر سوچی مگر کب تک کہ میں نے پھر تقریر کی اور ایک مرتبہ جلسہ گاہ پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہونے لگا گویا تمام جلسہ میری تقریر کے غلط ہونے پر ہنس رہا ہے۔ میں نے پھر نظر ہٹا کر تقریر کی اور پھر جلسہ والوں کو دیکھا تو محسوس ہونے لگا کہ تقریر کی بیہودگی اور پھیکے پن سے لوگ تنگ آ کر جلسہ سے جا رہے ہیں کہ میں پھر پانی مانگا اور اس مرتبہ جو غور سے جلسہ والوں کو دیکھا تو اچھے خاصے جمے جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے میرا دل اور ٹوٹ گیا اس لیے میری تقریر یوں شروع ہوئی کہ جو کچھ پہلے سے سوچا تھا

وہ سب تو گیا بھاڑ میں۔ خدا جانے کیا کیا کہنے لگا۔ دماغ پر جب زیادہ دیتا کہ وہ فلاں سوچی ہوئی بات یاد آ جائے تو یاد آتی بھی تھی تو اس طرح گویا پھر بھول گیا لہٰذا پڑھیے درود شریف!

تنگ آ کر میں نے طے کیا کہ تقریر کو رواں دواں اور دھواں دھار بنا دوں۔ شاید اس طرح روانی آ جائے تو اس خیال کا حشر یہ ہوا گویا اس طرح تقریر کرنے لگا کہ:

محترم حاضرین!

وہ جو سیرت پاک کے جلسہ میں...اخ...اخ...اُخو...،اخ تھو، مجھے تقریر کی عزت دی ہے، اُنہہ اُنہہ، اخو، اخ...اخ، پانی لائیے تو میں اس کے شکریہ کے لیے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا۔

بھائی مسلمانو!

میں کہتا ہوں کہ اب ہندو مسلم فساد چھوڑ دو ورنہ حشر کے دن وہ دیکھیے ایک امام کا مقولہ ہے اخ، اخ، اخو، اُنہہ، اُنہہ درود شریف پڑھیے ذرا چلا کر تو گویا آپ نے سمجھا بس تو یوں مجھے اور مجھے کیا وہ حدیث شریف میں آیا ہے اُنہہ اُنہہ لاحولا ولاقوۃ دیکھیے میں اس وقت اس حدیثِ پاک کو بھول گیا خیر مطلب یہ ہے کہ ذرا شور نہ کیجیے، میری طبیعت ویسے ہی خراب ہے، صرف آپ بھائیوں کے اصرار پر بول رہا ہوں، اگر ناگوار ہو تو تقریر ہی ختم کر دوں کہ آوازیں آئیں ''نہیں نہیں بولے جائیے''۔

لیجیے اب پھر تقریر کرنا پڑا اور میں نے ہمت کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جہنم کی آگ، بس اتنا ہی کہا ہوگا کہ جلسہ پر اُلٹا سناٹا چھا گیا اور میں ڈر گیا کہ اگر جلسہ والے بالکل ہی خاموش ہو گئے تو میری تقریر کا ہر عیب صاف صاف سمجھ میں آ جائے گا۔ اس لیے میں نے جہنم کو کاٹ کر جنت کا تذکرہ شروع کیا تو سبحان اللہ کے نعروں سے میں خود گونج اٹھا اور ''زنانہ'' سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ اب مجھے ہوش آیا کہ او کمبخت خود کیوں نہیں رونے کی آواز بنا لیتا تاکہ سارا جلسہ رونے میں مصروف ہو جائے اور تیری تقریر کا عیب چھپ جائے، اس لیے میں نے تقریر کا رُخ رونے والے حالات کی طرف پھیر کر اور رونے کی آواز بنا کر کہا:

''آہ! کبھی ہم بھی بادشاہ تھے، مگر آج ہماری ماں بہنوں کے پاس زیور تک نہیں کہ جلسہ میں نیم کہرام کی سی حالت پیدا ہو گئی کہ میں نے کہا کہ اور بھائیو! اب ہم کو بھیک بھی نہیں ملتی، کہ اب کیا

تھا جس طرف دیکھیے تقریر کا اثر ہی اثر تھا۔ کہ میں پھر اس طرح کھانسا گویا میں مسلمانوں کی ہمدردی میں مرا جارہا ہوں اور میرے حلق میں کھانسی اٹک گئی ہے کہ جناب صدر نے میری طرف پانی کا گلاس بڑھایا میں تو خدا ہی سے چاہ رہا تھا کہ میری گھبراہٹ چھپانے کا کوئی سبب پیدا ہوجائے''۔

یہاں تک کی میری تقریر ویسی ہی تھی جیسی کہ مسلمانوں کے واعظ کرتے ہیں اور مسلمان ایسی ہی رُلانے والی تقریروں سے خوش ہوتے ہیں، لیکن اب میرے قدم ذرا جم سے گئے تھے اس لیے میں نے ایک مرتبہ کھانس کر عورتوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ:

''ماں، بہنو! خدا کے لیے مولوی، فقیر، گنڈے تعویذ کی غلامی سے بچو اور علم حاصل کروتو خود مولوی ہوجاؤ گی اور ہاں نئی بہو کو چاہیے کہ وہ ٹرانٹ ساس کے خلاف ہر وقت بغاوت کرتی رہے اس لیے کہ پرانے زمانہ کی ساس اور سسر نئے زمانے کی بہو بیٹیوں کے حق میں جہنم بنی ہوئی ہیں لہٰذا جو بہو کہ ساس کو سسر سمجھتی ہے اور اس کی ہر اوندھی سیدھی سنتی ہے اور تنہائی میں روتی ہے، مرتے وقت اس کے چہرہ پر نہ نور ہوگا نہ ایمان کی علامت''۔

میں نے ہندو مسلم فساد پر کہا کہ:

''مسجد کے سامنے باجا اور گائے کی لڑائی اگر تم خدا کے واسطے لڑتے ہو تو لڑتے وقت اپنے اپنے مذہبی اماموں سے یہ بھی دریافت کرلیا کرو کہ کس حد تک لڑیں اور باجے اور گائے پر لڑنے کے لیے خود خدا نے کن ہتھیاروں کی اجازت دی ہے۔

ورنہ یاد رکھو کہ مسجد اور گائے پر تمھارے ذاتی جوش سے جو بھی مارا جائے گا وہ خدا کے لیے نہ ہوگا بلکہ صرف تمھارے جوش کا نتیجہ ہوگا اور تمھارے حشر کا فیصلہ بجائے خدا کے پہلے حوالاتوں میں موٹے موٹے کوتوال اور پھر ہائی کورٹ والے کریں گے۔ اب دعا کرو بھائیو کہ خدا ایمان دے اور عاقبت بخیر کرے''۔

ان جملوں پر جس زناٹے سے آمین کا شور ہوا ہے دل جانتا ہے اور بس۔ التجا ہے کہ اب کسی جگہ مجھے تقریر کے لیے نہ بلایا جائے گا۔

◆◆◆

شرح کلام اکبرالہ آبادی

ملا رموزی کی غیر مطبوعہ تحریریں

نوشتہ

ملا رموزی

شعر

نئے طریقوں سے مقصد شرع کار فرما نہ ہوسکے گا
اُدھر جو پردہ نہ ہوسکے گا ادھر بھی تقویٰ نہ ہوسکے گا

مطلب یہ ہے کہ نئے طریقوں سے پرانے مولوی صاحب اسلام کو خود ہی نہ سمجھ سکے تو دوسروں کو کیا خاک سمجھا سکیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب روح اسلام سے عوام بے خبر رہیں گے اور اوپر سے یہ اس زمانے کی چٹاخ پٹاخ قسم کی فینسی لڑکیاں تانگوں، ڈولیوں اور پردہ دار موٹروں سے پردہ ہٹا ہٹا کر مردوں کو جھانکتی اور تاکتی جائیں گی یا زیور اور مہندی رچے ریشمی چپل والے پاؤں کو پردہ سے باہر نکالے رہیں گی تو شیخ جی بھی لاٹھی پھینک کر یا حق کہہ گزریں گے بلا سے پھر جیل جائیں یا پھانسی پائیں۔

دوا ترقی کی میں نے دیکھی، بصد ادب سے یہی گزارش
مرض ترقی کرے گا اس سے مریض اچھا نہ ہوسکے گا

''دوائے ترقی'' کے معنی ہیں رشوت، مگر سی آئی ڈی والوں کا قول ہے کہ ترقی کی دوا سے یہاں مراد ہے ملازمت کے ساتھ ساتھ حکام کے بنگلوں اور کوٹھیوں کی حاضری، ان کی خوشامد، ان کے مکانوں پر ڈالی اور ان کے بال بچوں کی خدمت، لیکن ملا رموزیوں کا اتفاق اس امر پر ہے کہ

ترقی کی دوا سے مراد ہے وہ ''رنگین سفارش'' جس کے بہم پہنچانے میں بعض کندۂ ناتراشوں کو خاص ملکہ حاصل ہوتا ہے اس لیے شاعر کہتا ہے کہ تم ایسی پردہ پردہ لاکھ دوائیں بہم پہنچاؤ لیکن ایسی ترقی سے تمھارے مرض جہالت میں اضافہ ہی ہوگا اور عوام کی نظر میں تم ایسی ترقی پاکر بھی گدھے اور بے حیا ہی سمجھے جاؤ گے۔

ترقی کی دوا کے دوسرے معنی ہیں وہ ''ٹانک وانک'' جن کو یورپی دوافرشوں کے ہندستانی ایجنٹ عرف ہندستانی ڈاکٹر مالدار مریضوں کو معمولی سی کمزوری کے بہانے پلاتے ہیں اور ڈاکٹری علاج کے اندھے غلام ان ٹانکوں پر خاصا روپیہ برباد کرتے ہیں اور آخر میں انتقال فرماتے ہیں دیسی حکیموں ہی کے مطب میں، اس لیے اکبر کا کہنا ہے کہ بھائیو اگر مرض سے شفا پانا ہے تو اپنے ملک ہی کا گل بنفشہ، عناب تخم خطمی اور ماء اللحم انگوری استعمال کرو ورنہ ہر وہ مرض بڑھ کر رہے گا جس کا علاج ڈاکٹری کراؤ گے۔

کرلیا بیوی نے ان کی انٹرنس پاس
والدہ تو ان کی ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

مطلب: اس شعر میں نہایت پیچیدہ سسرالی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس شوہر کی بیوی نے انٹرنس پاس کیا اس شوہر کی ماں اور بیوی کی ماں دونوں کا ہم عمر ہونا ممکن ہے لیکن پھر یہ کیا کہ بیوی کے ''انٹرنس پن'' سے ایک ماں تو خوش اور دوسری خموش؟ لہٰذا شرح یہ ہے کہ جس ماں کی یہ بیٹی ہے اس ماں کو بیاہ ہوجانے کی وجہ سے اب اس ذاتی بیٹی سے کوئی امید نہیں ہے البتہ جس ماں کی یہ بہو ہے وہ اس لیے خوش ہے کہ بیٹے کی زندگی میں بھی بہو ''ماسٹرنی'' ہو کر تنخواہ لائے گی اور بیٹے کے ''خدانخواستہ'' ہونے کے بعد بھی بہو بیٹے کی تنخواہ کے نقصان کا کچھ تو بدلہ کر ہی دے گی۔

ساس کے خوش ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پرانے زمانے کی ساس کو نئی بہو کی ہر بلند اور انوکھی اور برادری میں مشہور و معزز بناتی ہے اور ادھر ہر ساس ملا رموزی کی ساس کی طرح قدامت پسند نہیں ہوتی لہٰذا جب ساس کو اس کی بہو انٹرنس پاس کر کے ''ٹائمس آف انڈیا'' پڑھ کر سنائے گی اور گھر کے سودے سلف کا حساب لکھا کر دکھائے گی تو ساس قدرتاً خوش ہوگی یا پھر بہو بھی اس کے بیٹے کے شانہ بشانہ جب پتلون اور ریشمی بنیائن پہن کر باہر جائے گی تو ساس کو اپنی بہو لارڈ

کرزن محسوس ہوگی لہٰذا ایک ہندستانی ساس کے لیے یہ کیا کم مسرت ہے کہ اس کی بہو لارڈ کرزن کا نمونہ ہو۔ لیکن بہو کی ماں کا انٹرنس پر خوش رہنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ بیٹی کے اس نگریزی پن پر اپنی سمدھن کو خوش طعنہ کر کے کہہ رہی ہے اچھا ہوا میری لونڈیا کو تمھارے یورپ زدہ بیٹے نے انٹرنس پاس تو کرا دیا ہے لیکن بیٹی تو آخر میری ہی ہے اس لیے اس انٹرنس کے بل پر اب تم کو اور اپنے شوہر کو جیسا چاپا بنا کر چھوڑے گی اس وقت پوچھ لوں گی کہ کہیے سمدھن صاحبہ اب مزاج کیسا؟ فی الحال تو میں چپ ہوں۔

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہو مگر ''استاد جی'' نہ ہو

پنجاب میں لفظ ''جی'' اعزاز و احترام کے موقع پر مستعمل ہے مثلاً ''ماسٹر جی'' اور ''مولوی جی'' انتہا یہ ہے کہ میں نے ایک دیہاتی عورت کو اپنے بھائی سے ''بھائی میاں جی'' کہتے بقلم سنا، مگر صوبہ جات متحدہ میں جہاں کا شاعر ہے لفظ ''جی'' اعزاز کے عوض تحقیق بلکہ گالی تک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ''استاد جی'' عموماً رنڈی کے استاد کو کہتے ہیں یا پھر یوں بولتے ہیں کہ ''اچھا چچا جی سمجھوں گا تم کو'' یا اچھا بیٹا جی بچ کے کہاں جاؤ گے، لیکن حضرت اکبر نے ''استاد جی'' میں معنی اور تشبیہ کا وہ دُہرا تہرا پن رکھا ہے کہ جواب نہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ نوجوان لڑکی کی تعلیم و تربیت کے لیے اگر آپ کو استاد رکھنا ہی ضروری ہے تو اس میں یہ دیکھو کہ وہ کردار و سیرت کے لحاظ سے ذی علم اور متقی بھی ہے یا نہیں اور ذی علم بی۔ اے پاس کو نہیں کہتے کیونکہ بی۔ اے کے نصاب میں علوم عالی کی صرف ابجد اور انگریزی بولنے اور لکھنے تک کا سلیقہ ہے، جس سے زبان ضرور آجاتی ہے مگر علوم تک رسائی نہیں ہوتی لہٰذا جب کسی استاد کا دماغ علوم سے کورا ہے تو اس سے جہالت اور بربریت کا ہر خطرہ و عمل منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ادھر زمانہ حاضرہ میں نوجوان لڑکوں اور نوجوان لڑکیوں کا رجحان سنیما اور فلم کمپنیوں کی طرف ویسے بھی زیادہ ہے لہٰذا اکبر ڈراتے ہیں کہ کہیں نوجوان لڑکی کی تعلیم و تربیت کے لیے کوئی نوجوان چھوکرا نہ پکڑ لانا ورنہ وہ لونڈیا کو علوم پڑھانے کے عوض فلم میں ڈانس عرف ناچ کی تعلیم پر نہ لگا دے اور جب وہ ایسی تعلیم دے گا تو وہ پھر استاد نہ ہوگا بلکہ ''استاد جی'' کہا جا سکے گا جو رنڈی کا استاد ہوتا ہے:

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے ان کو بہت
کیمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی
اپنی دھن میں آبرو کی کچھ نہیں پروا انہیں
نذر معجون ترقی ہو یہ موتی تو سہی

واردات شاعرانہ کی ایک فطرت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی کوئی واقعہ بصورت واقعہ دماغ میں کامل ہوتے ہی شعر بن کر بغیر ارادے کے زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور شاعر چونک کر اس کی شعریت میں کچھ لمحے کھو جاتا ہے۔ اب اس آپ ہی آپ پیدا ہونے والے چشمۂ شعر سے جو ردیف و قافیہ از خود زبان تک آتا ہے شاعر اس کی حلاوت سے اتنا لطف اندوز ہوتا ہے کہ اس کے لیے مزید شعر کہتا ہے مگر اس بے ساختہ شعر یا اس کے کسی دلکش قافیہ کو جانے نہیں دیتا اور ایسے از خود پیدا شدہ شعر و قافیہ کو محفوظ کر لینے کے لیے شاعر اپنی کوشش سے جو دوسرے اشعار و قوانی کہتا ہے ان کو عموماً ''بھرتی کا شعر'' یا ''بھرتی کا قافیہ'' کہتے ہیں۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ بس شعر تو فلاں تھا اور تو بھرتی کے ہیں یا قافیہ تو بس فلاں تھا دوسرے قافیے تو بھرتے کے ہیں۔ مگر مذکورہ اشعار میں ''پوتی'' اور ''موتی'' کے قوانی کچھ اس طرح کے ''لنگوٹیا دوست'' محسوس ہوتے ہیں کہ دونوں کے لیے یہ کہنا محال ہے کہ ''پوتی'' کے لیے موتی کا قافیہ بھرتی کا ہے یا ''موتی'' پہلا قافیہ ہے اور ''پوتی بھرتی'' کا ہے۔ البتہ ایک عقلی قرینہ یہ ہے کہ اکبر کے ذہن میں پہلے ''موتی'' کا قافیہ بمعنی حیا و عصمت آیا ہے اور ''پوتی'' کا قافیہ محض موتی کے قافیہ کو محفوظ کر لینے کے لیے کہا گیا۔ ثبوت یہ ہے کہ لفظ موتی ویسے بھی عصمت و آبرو کے لیے اس طرح بولا جاتا ہے کہ ''عزت کیا ہے موتی سی آب ہے جو اتر جائے تو پھر چڑھتی نہیں''۔ اس لیے ''موتی'' کے قافیہ کا مفہوم پہلے پیدا ہوا۔ یعنی شاعر پہلی مرتبہ کنواری لڑکیوں کے ناچ سے متاثر ہوا تھا نہ کہ کسی کی پوتی سے کیونکہ رشتہ کے سلسلہ سے جب سب سے آگے دادی اور ماں موجود ہے تو پوتی کے تذکرہ کی ضرورت اس لیے ثابت ہے کہ اکبر قومی بچیوں کی حیا و عصمت کے تحفظ کے جذبے سے بے تاب ہوئے اور زبان پر جیسے ہی کہ آبرو کا موتی آیا نہیں کہ ممدوح نے کھینچ تان کر ساس سسر اور بہو کے بعد فوراً پوتی کہہ کر موتی بھی باندھ گئے جو مقصود خاص تھا۔

فن انشا میں بلاغت ایک ایسی منطقی قسم کی ترکیب ہے جو گھسیٹا خاں قسم کے اصحاب قلم اور شیخ بدھو قسم کے شعرا کے بس کی نہیں۔ یہی حال طنز و طعن کا ہے کہ یہ فن شریف بھی گو برگنیش اور خوشیا حجام کے ہاتھ نہ آیا، لیکن اکبران اصناف کے کچھ ایسے بھی سقراط بقراط واقع ہوئے ہیں کہ ان کو نہ داد دے سکتے نہ پھوڑا پھنسی چنانچہ ذیل کے شعروں میں ایسی جرمنی کی بنی ہوئی بلاغت اور سوکن یا ساس نند کا سا طنز فرمایا ہے کہ سوچیے اور مستان شاہ میاں ہو کر رہ جایئے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ:

اب کہاں تک بت کدے میں صرف ایماں کیجیے
تا کجا عشق بتاں ست پیاں کیجیے
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجیے مجھ کو مسلماں کیجیے

مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کی تحریک تعلیم کے آغاز میں اس تحریک کے آدم علیہ السلام حضرت سید علیہ الرحمۃ اور آپ کے ساتھی چندہ وصول کرنے میں بسا اوقات مسلمانوں کو یقین دلاتے تھے کہ اس تعلیم سے مسلمان اسلام اور ملک کی خدمت کے قابل ہو سکیں گے اور تحریک والوں کا نعرۂ خصوصی یہ تھا کہ اس تعلیم سے مسلمان کے سر پر تاج ہوگا اور ہاتھ میں قرآن۔ الحاصل اس تعلیم کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بعد مذہب ضروری اور واجب سمجھایا جارہا تھا لیکن اکبر سمجھتے تھے کہ اس نصاب کے پڑھنے والوں سے مساجد کی جماعتیں ویران رہیں گی، اپنی مادری زبان اردو کو ترک کر کے یہ انگریزی زبان کو اپنی روزمرہ کی زندگی تک میں رواج دیں گے، اپنے ملکی اور اسلامی لباس کو چھوڑ کر یہ یورپی لباس اور وضع قطع اختیار کریں گے جیسا کہ اب ہو بھی رہا ہے اس لیے ممدوح نے ایک مخصوص بلاغت اور مخصوص طنز میں اس تحریک کو غلط ثابت کرنے کے لیے کہا ہے کہ اچھا اگر تعلیم علی گڑھ ہی سے ایک مسلمان مسلمان ہو سکتا ہے تو نیاز مند کا بھی چندہ حاضر ہے، ذرا بنا تو دیجیے فدوی کو پکا مسلمان!

ایک شاعر اور ایک بادشاہ یا حکام کے بڑے فرائض میں سب سے پہلا اور اہم فرض یہ ہے کہ وہ جن لوگوں اور جن بستیوں پر حکمراں اور ناظر ہوں چاہیے کہ ان کے ہر نوع کے انسان کے

جذبات حالات، واقعات اور نفسیات سے کما حقہ واقف ہوں، یہ کمال اکبر کو بدرجۂ کمال حاصل تھا چنانچہ محض نفسیات انسانی اور واقعات انسانی سے واقفیت کے اسی ہمہ گیر زور میں اکبر جس طرح طبقات اعلیٰ کے انسانوں کے حالات تک پہنچ جاتے تھے اسی طرح وہ متوسط اور پست طبقات کے واقعات و واردات سے بھی جزاً جزاً واقف تھے۔ چنانچہ بدعقل ہندستان میں یورپی اور ہندستانی ڈاکٹروں کے تجارتی اخلاق اور تاجرانہ علاج پر فرماتے ہیں کہ:

ان کو کیا کام ہے مروّت سے
اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان چاہے مریض چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

کیسے معاملات انسانی کا کتنا صحیح اور کامل مطالعہ ہے اور ڈاکٹر صاحبان کی تجارتی ودتی اور سوداگرانہ اخلاق کا کتنا اکمل نقشہ ہے؟

اب پست، مقہور، ضعیف اور بدعقل ہندستانیوں کے عمل کی ایک نازک ترین حماقت کو جن الفاظ کے گورکھ دھندے میں بیان کیا ہے اور جس استادانہ اڑنگے پر ان حمقا کو پچھاڑا ہے دنیا کے ہر حصہ کے گاماں پہلوان مرحوم کی قبر نہ چوم لیں تو داغ نام نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

مطلب یہ ہے کہ ''اس کھاڑے سے'' سے مراد ہے عہد انگریزی، قانون سے مراد ہے انگریزوں کے ہاں مقبول ہونے اور ان میں کامیاب رہنے کے اصول اور ان کی مشکلات، مراد یہ ہے کہ انگریزی عہد میں کامیاب اور بامراد ہونے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صرف انگریزی زبان اور مروجہ قوانین اور فنون میں لیاقت دکھایئے اور ڈپٹی کلکٹری سے لے کر گورنری تک پہنچ جایئے اور بس لیکن ہندستانوں میں گدھے قسم کے دماغوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر انگریزوں کی نظر میں مقبول حسن اور محبوب خان ہونا ہے تو نہ صرف یہ کہ انگریزی سیکھو بلکہ اپنے ملکی لباس کو بھی لات

مار کے پتلون اور ہیٹ ہی میں صاحب سے ملوتا کہ صاحب خوش ہوں اور یہ ایسے ہی ہندستانی حمقا ہیں جنھوں نے محض اسی کم فہمی کے ہاتھوں اپنی عورتوں تک کو بے ضرورت میم صاحب بنا رکھا ہے اور یہ کالی کلوٹیاں جب میم صاحب کا اونچی ایڑی کا جوتا اور نصف ٹانگیں برہنہ فرما کر کالے شوہر صاحب کے ہمراہ چھوٹی چھتری لگا کر ٹھنڈی سڑکوں پر نظر آتی ہیں تو ہندستانی منہ سے اب بھی آخ تھو ہی نکلتا ہے۔

انگریزی تعلیم کے فوائد بتانے اور سمجھانے والے پر انگریزی تعلیم کے مصارف کا جو چانٹا ذیل کے شعر میں رسید کیا ہے اس کے اختصار کی خوبی کا نہ جواب ہے نہ سوال۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

راہ تو مجھ کو بتادی شیخ نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے؟

حمقائے ہند اور جہلائے ہند نے جس جھپانے سے یورپیت کو قبول فرمایا ہے وہ دماغ کی اس بوکھلاہٹ سے ثابت ہے جو یورپ زدوں میں کسی یورپی عورت کے میل جول کے وقت نظر آتی ہے۔ یعنی ایک ہندستانی گدھا عام اس سے کہ وہ بذاتِ خود ایک اعلیٰ خاندان کا فرد ہو مگر اس سے اگر ایک ترکاری بیچنے والی یورپی عورت مخاطب ہو جائے تو یہ بدعقلا ہندستانی اپنے تمام خاندانی مراتب کو بھول کر جس کنجڑے قصائی قسم کی نیازمندی سے اس یورپی عورت سے پیش آتا ہے اور اس کی مخاطب کے خوشی سے جس دیوانہ وار انداز میں عید بقر عید کی خوشی سے بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرتا ہے اس احمقانہ بے خودی اور گدھے پن کو یوں لکھتے ہیں کہ:

چھٹی اس مِس کی ہے کہ یہ جادو ہے
دل جوش مفاخرت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے
القاب میں دیکھیے 'ڈیڑھ کلوٗ' ہے

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ یورپی لوگوں کے دوستانہ میل جول سے ضعیف الدماغ ہندستانی ہی مارے مسرت کے قمیض پھاڑ ڈالتے ہیں، اس لیے اکبر نے بھی اس بے عقل طبقے کے

بے شمار گدھوں کو صرف ایک نام ''کلّو'' سے جیسا جامع بنایا ہے وہ ممدوح کی قادرالکلامی اور قوت اختصار کا نادر شاہکار ہے، اس لیے شرحاً یہاں ''کلّو'' سے مراد ہے تمام یورپ زدہ ہندستانی 12 منہ۔

ہندستان میں لفظ ''بابو'' کا جو مفہوم اور جو تصویر دماغ میں آتی ہے اس سے ایک نہایت ہی دبیل، گھٹیل، زٹیل اور حواس باختہ سا محرر سامنے آتا ہے جو ایک واہیات سا کوٹ پہنے ایک میلی گندہ دھوتی اور ''میل خوردہ سی ٹوپی'' اوڑھے دفتر کے کام میں یوں کھویا ہوا ہے گویا ملازمت ہی اس کا مقصدِ پیدائش ہے اور نوکری ہی وجہِ زندگی۔ چونکہ بالاتفاق اس طبقے کے لوگ ''نوکری زدہ'' حاضر باش ''فرماں بردار'' اور قانون و ضابطہ کی حرف حرف پابندی فرمانے کے عادی ہوتے ہیں اور کسی معمولی سی لغزش کو ذاتی قابلیت سے سنبھال لینے کی استعداد نہیں ہوتی اس لیے ملازمت کا زمانہ بے حد پھونک پھونک کر کاٹتے ہیں۔ غرض حد سے گزرے ہوئے تنگ دماغ اور اپاہج ذہنیت کے ہوتے ہیں اس لیے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی بے حد جہاں بین، صلاح و مشورے اور قانون سے کام لیتے ہیں۔ پس ان لوگوں کی زندگی کا ہر کام ان کے ضعف عقل کے ہاتھوں ہوشمندوں کے مذاق کے قابل ہوا کرتا ہے۔ یہ طریقہ موجودہ عہد میں ان لالہ لوگوں کا وارث جائز ہے جن کے دفتری اور ملازمتی واقعات کے بے شمار نتائج آج بھی تفریح کا باعث بنے ہوئے ہیں خصوصاً بعض تو بزدلی، بے ہمتی، خوف اور اندیشہ کے یہ لرزتے ہوئے اور کانپتے ہوئے نمونے ہوتے ہیں۔ انتہا یہ کہ ان کی معمولی سی تو تو میں میں سے بعض اوقات بڑے بڑے مقدمات چل جاتے ہیں۔ ان کی تیز و تلخ گفتگو میں بھی ''ڈرپوک پن'' رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر ٹپکتا ہی رہتا ہے۔ یہ انتہائی قہر و غضب میں الفاظ کو سنبھال سنبھال کر اور گالیوں کو قانون اور گرفتاری کی زد سے بچا بچا کر استعمال کرتے ہیں اور اس پر قانونی خوف کا یہ عالم ہوتا ہے کہ لڑائی کے بعد فوراً کسی وکیل کے پاس جا پہنچتے ہیں اور اس کو تو تو میں میں کی پوری روداد سنا کر دریافت کرتے ہیں کہ میری ان باتوں پر وہ میرا کچھ کر تو نہ سکے گا؟

اسی طرح تو تڑاک کی انتہائی ''رستمانہ حد'' پر بھی ان کے سنبھل سنبھل کر غصہ کا یہ حال ہوتا

ہے کہ:

جی ہاں میں تو گدھے کا بچہ ہوں مگر آپ تو شریف ہیں؟
جی ہاں آپ نے کہا اور میں ابھی ایسا ہی کہہ دوں تو؟
بس بس جانے بھی دیجیے ابھی معاملہ کھول دوں گا تو شرمندہ ہونا پڑے گا آپ کو۔
اچھا تو لیجیے کھڑا تو ہوں ماریئے ماریئے۔
مگر دیکھیے میں پھر عرض کرتا ہوں کہ زبان قابو میں رکھیے میں بھی گورنمنٹ سرونٹ ہوں۔

اب غور کیجیے کہ بابو صاحب کی اس انتہائی شدید جنگ میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس پر مقدمہ چل سکے یا مقابل کو زیادہ تاؤ آئے مگر اس پر بھی بابو صاحب کی گھبراہٹ کا یہ حال ہوتا ہے کہ مزید احتیاط کے طور پر فریق مقابل سے پہلے تھانے میں جاکر رپٹ درج کرا دیتے ہیں۔ پس ایسے بابو صاحبوں کی اس واقعاتی تصویر کو ظالم اکبر نے کس ''موقعہ واردات'' کے ساتھ لکھا ہے۔ طنز اپنی جگہ پر دودھاری تلوار بن گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

برا ہوا کہ رقیبوں میں پڑ گئے بابو
ذرا سی بات ہوئی اور یہ سوئے تھانہ چلے

یہاں ''تھانے'' سے مراد عدالتی چارہ جوئی بھی ہے اور بے آبروئی کا بدلہ لینے کی بہادری ندارد ہونے اور ذریعہ عدالت عزت کا بدلہ لینے کی بزدلی بھی مراد ہے پھر ''بابو صاحب اور رقیبوں میں پڑ گئے'' کا ایک مطلب نہایت درجہ نازک، خفیہ اور بعید از قیاس ہے مگر اکبر کی برق فطرت نگاہ اس صحیح منزل اور پردہ پردہ مقام تک بھی جا پہنچی ہے جہاں واقعی بابو صاحب کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں اور وہ ہوتا ہے کبھی کبھی مزامنہ کا بدلنے کے طور پر۔ بابو صاحب کا کسی ''کوٹھے والی'' کے پاس چلا جانا اور وہاں بعض سر پھرے اور غنڈوں سے بابو صاحب کی ٹکر اور اس سے بابو صاحب کی گھبراہٹ، مگر یہ اتنی دور کی ہے جو معمولی نگاہ والے یقین بھی نہیں کر سکتے مگر خفیہ پولیس کی اطلاعات سے یہ ذخیرہ مل سکتا ہے کہ بعض بابو لوگ بھی موالیوں اور غنڈوں کی آنکھ بچا کر کبھی کبھار کوٹھے پر چڑھ ہی جاتے ہیں لہٰذا اکبر نے اس نقشہ کو بھی کھینچ ہی دیا جو ممدوح کی وسعتِ نظر کا کمال ہے۔

مسلمانوں کو اول تو اس تعلیم غلط ہی نے قلاش بنادیا کہ حبِّ مال و زر مکروہ عمل ہے۔ دوسری وہ جو انیسویں صدی سے پیدائشی بے ہنرے اور بے فکرے واقع ہونے لگے تو دوست نے ان سے منہ موڑ کر یورپی قوموں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ ادھر دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ مفت کی دولت صرف ان کے ہاں رہ گئی جو آج کل کی اصطلاح میں ''سرمایہ دار'' کہے جاتے ہیں اور جن کے ہاں جبر و ظلم سے دولت جمع ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے ہاں جمع مال کے طریقے ہی غلط تھے اس لیے خرچ مال بھی غلط اور گھناؤنے طریق سے ہونے لگا۔ مثلاً یورپ تشریف بھی لے گئے تو وہ ہندستانی جو کلہم انگریزی زبان میں گفتگو کر سکتے تھے مگر عقل و تدبیر میں کورے تھے۔ ادھر ہندستان میں غلامی کی زندگی بسر کرنے سے دماغ سے شاہانہ بلندیاں بھی رفو چکر ہو چکی تھیں اور اب یہ لوگ نرے گھن چکر رہ گئے تھے اس لیے جیسے ہی کہ انھوں نے یورپ ایسی چمکیلی سرزمین میں قدم رکھا کہ ان کے ڈھائی آنے کی عقل پراگندہ ہو کر رہ گئی اور نادیدہ پن سے وہاں کی ہر چیز کو سجدہ کرنے لگے۔ ادھر یورپ کے ہوشمند قوموں نے جو دیکھا کہ ایک عدد ہندستانی گدھے صاحب کچھ صندوق نقرہ و زر کے لادے ہوئے یورپ کے زعفران زار میں گھس آئے ہیں اور اب مارے دہشت کے اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں تو یورپ کے بعض چالاک لڑکوں نے یہ صندوق ان کی پیٹھ سے اتار کر تو رکھے اپنے ہاں کے بینک میں اور خود ان کے گلے میں اپنے عشق کی رسی باندھ کر جو ان کی پشت پر سوار ہو کر روانہ ہوئیں تو ان کے ہندستانی گھروں میں آدھمکیں۔ اب یہاں برادری بھر میں حیرت کا اظہار ہوا۔ یورپی لڑکی چار دن تو رہی ان کے نکاح وکاح میں اور پانچویں دن طلاق نامہ ان کی گردن میں لٹکا کر پھر اپنے وطن یورپ سدھاری۔ اس حالت کو اکبر نے یوں بیان کیا ہے:

سراسر نور تقویٰ سایہ پر قربان کر آئے
بہت اچھا کیا تم نے اگر زر رکھ کے مس لائے

''مس'' انگریزی میں کنواری لونڈیا کو کہتے ہیں اور اردو میں کھوئے ہوئے روپیہ اور سامان کو۔ مطلب صاف ہے اور بے حد جامع یعنی کافی رقم خرچ کر کے جس یورپی کنواری کو لائے ہو وہ

ہندستانی اخلاق اور گرہستی کے حق میں ایک بے کار اور نقصان رساوجود ہے جس طرح ''مس'' ایک کم قیمت دھات ہے اسی طرح ہندستانی مرد کے گھر میں ایک یورپی لونڈیا بے کار بلکہ نقصان رساں ہے۔ یقین نہ ہو تو ان ہندستانیوں سے اعداد وشمار حاصل کرلو جن کے ہاں یہ یورپی پھلجھڑیاں آئی تھیں اور آگ لگا کر بھاگ بھی چکیں۔

سیاسیات ہند کے نازک گوشوں اور ملکی مسائل کے کارآمد حصوں یا بین الاقوامی اصول سیاست پر کچھ کہنا یا لکھنا مزاج وقلم کا ایک ہمت آزما مرحلہ ہے جس پر اردو کے کسی ایک شاعر کو وہ خصوصیت حاصل نہیں جو اکبر کو حاصل رہی ہے یعنی جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اقبال نے اس عنوان پر جو کچھ فرمایا ہے وہ متین وسنجیدہ ہے اس لیے منظوم اظہار خیال میں ابھی تک اکبر ہی کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ اب اس میدان میں اردو کے شعرا کا قدم نہ رکھنا دووجوہ کے تحت ہے ایک یہ کہ سیاسی تحریکات پر کچھ کہنے اور کہنے کے بعد اگر اول فول ہوئے تو گرفتاری حوالات میں ضمانت وعدم ضمانت کے فیصلے کی مدت، وظیفے پڑھ پڑھ کر گزارنا، اس کے بعد عدالتی پیشیوں پر پیشیوں کا سلسلۂ دراز، پھر جیل میں مونج بٹنا، چکی چلانا یا کال کوٹھری میں کبھی کبھی اندھیرے میں مارسیاہ کی ''کرتوڑ پھنکاریں'' یا خدانخواستہ ایام قید ہی سے دق اور مرض دمہ کی کھانسی کا آغاز۔ غرض اسی نوع کی دوسری مشکلات میں جو دماغ شاعر کو سیدھی اردو تک میں اس عنوان پر طبع آزمائی سے ڈراتا ہے چہ جائیکہ ایسے عذاب اندر عذاب عنوان پر ظرافت بھی لائی جائے۔ دوسرے یہ عنوان اس لیے شعرا کے لیے محال رہا کہ سیاست اور بین الاقوامی مسائل پر لکھنے اور کہنے کے لیے ایک ایسے دماغ منور کی ضرورت ہے جو میرے تجربے میں ہندستان کے کارخانوں میں تو بنتا ہی نہیں ورنہ باون برس تک کانگریس ایک ہی منزل میں کیوں اپنے اونٹ باندھے پڑی رہتی۔ اس لیے دماغ ظریف اور دماغ شاعر کا ایک ہی انسان کو مل جانا اردو میں صرف اکبر ہی پر ختم ہو کر رہ گیا اور یوں دس بارہ ظریف اور سیاسی نظمیں تو پنشن خورڈپٹی کلکٹر اور منشی کالکا پرشاد قسم کے لوگ بھی کہہ لیا کرتے ہیں اس لیے اکبر سیاسیات کے جس نازک گوشوں پر کہہ گئے ہیں ان میں خاص کمال یہ ہے کہ کہتے بہت کم تھے مگر ہر مختصر میں غضب کی تفصیلات پنہاں ہوتی تھیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش
یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

اب اس ٹکڑے سے اندازہ کیجیے کہ اکبر سیاسیات بین الاقوامی کے بھی کتنے "پہنچے ہوئے ولی اللہ" تھے۔ اوپر کے تین مصرعوں کو اللہ کے نام پر چھوڑ کر آخری مصرع کا مطلب یہ ہے کہ یورپ میں ڈیڑھ ڈیڑھ گز کی ریاستوں نے بھی ایجاد و اختراع میں کچھ نہ کچھ کر کے دکھادیا مگر ہندستانی اس درجہ بے عقلے اور بے ہنرے ہیں کہ ان کے ہاں کی ہر نوع کی خام پیداوار یورپ کے ایک ایک گوشے میں نئی ترکیب سے ڈھلنے کے لیے پہنچادی جاتی ہے مگر آہ کہ ہندستانی لوگ اپنے ہاں کی ان پیداواروں سے عقل کے زور سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے بلکہ آج تک سارے یورپ کے لیے صرف مال گودام ہی بنے بیٹھے ہیں۔ کہیے شرح کیسی ہے؟

ہندستانیوں کی کم عقلی، نقالی، بے سمجھے بوجھے یورپی تقلید اور یورپی لوگوں کے مقابلہ میں انکے مرعوب اور نادیدے پن کے انداز سے جتنا اکبر وملا رموزی نالاں اور غضبناک ملیں گے جہاں مارے اردو کے تمام ذخائر کو جو ہم دونوں سے زیادہ کسی تیسرے نے لکھا ہو اور خصوصیت سے ہندستانیوں کا وہ طبقہ تو یورپی غلامی نقالی اور یورپ زدگی میں سب سے آگے ہے جس نے انگریزی زبان بھی سیکھ لی ہے اور اسی لیے اسی طبقے میں یورپی نقالی اور یورپ والوں سے دب جانے اور ان کے سامنے سجدہ کر لینے کی جو نالائقی اس طبقے میں ہے وہ غیر انگریزی داں طبقے میں نہیں۔ چنانچہ انگریزی داں طبقے کے اس چھچھورے پن اور غیر انگریزی داں ہندستانیوں کے وقار کو یوں دکھاتے ہیں کہ:

شیخ صاحب دیکھ کر اس مس کو ساکت ہو گئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چست ہو گئے

دیکھا آپ نے؟ یعنی شیخ صاحب کا مقابل ماسٹر ہو ہی نہیں سکتا بجز اس کے کہ اکبر کے سامنے قدیم ہندستانیوں کا وقار اور جدید ہندستانیوں کی یورپی مسائل میں حقارت خیز کم فہمی کا اظہار مقصود تھا اور بس اور ویسے بھی دیکھیے تو شیخ صاحب اپنی تولیہ کی قسم کی داڑھی لے کر کسی یورپی مس یا ہندستانی مس سے مس ہو ہی نہیں سکتے البتہ یہ شرف و توفیق تو ایک ماسٹر صاحب ہی کے نکاح میں آسکتی ہے کہ موصوف اپنی داڑھی مونچھ ندارد صورت اور انگریزی دانی کے بل پر جس مس سے چاہیں قرب حاصل فرمالیں۔ اب ایک نمک مرچ قسم کی یورپی مس سے ہم کلام ہو کر انگریز داں طبقے کے بس کا نہیں کہ اس کے سامنے مارے اے ٹی کیٹ زدگی کے کمترین نیاز مند خاکسار، دعا گو، نمک خوار، نمک پروردہ، مسکین اور اپاہج فقیر کا سا انداز اختیار نہ فرمالیں۔ اب یقین نہ ہو تو ان ہندستانیوں کو دیکھا کرو جو اگر چہ ذاتی حیثیت سے بقلم خود صاحب عزت و وقار ہوتے ہیں مگر جب ان سے کوئی یورپی کنجڑا یا یورپی دھوبن بھی مخاطب ہوتی ہے تو یہ مارے مسرت کے اس سے گفتگو کرتے وقت اس کے خاندان بھر کے بہشتی نظر آتے ہیں۔ مذکورہ شعر میں ''چت ہو گئے'' کے معنی ہیں حیران رہ گئے، گھبرا گئے، ڈر گئے، اول فول ہو گئے، فریفتہ ہو گئے، اپنی حیثیت بھول گئے، سانس پھول گیا۔ غرض وہ سب کچھ ہو گئے جو ایک گھٹیا درجہ کا نوکر اپنے شاندار اور قہار و جبار آقا کے سامنے ہو جایا کرتا ہے۔

اونچے درجے کے لوگوں کے حالات و احساسات معلوم کر لینا تو کوئی کمال نہیں بلکہ ان لوگوں کے پردہ پردہ حالات کی نہایت ہی تفصیلی واردات کو تو ان کے نجو خاں اور ہیرا اچام قسم کے ملازم خانساماں اور بیرے خوب بیان کر دیتے ہیں اور گھر کے ملازم مامائیں اور کھلائیاں البتہ غریبوں کی زندگی کے جزئی اعمال و افکار اور ان پر گزرنے والے حوادث کے نا قابل احاطہ اجزا کو معلوم و محسوس کر لینا ایک ایسے ہی شاعر کا کام ہے جو اس زمانے میں ''شاگرد بنانے'' کا کام نہ کرتا ہو اور شاگردوں کی کثرت پر مریدوں کی سی کثرت پر ناز کرتا ہو۔ اکبر چونکہ اس نوع کی ''شاگرد گر شاعری'' سے بلند تھے اس لیے ممدوح کے احساسات کی پہنائی ملاحظہ ہو:

شکر چشم و گوش کرتا ہوں مگر یارب یہ کیا

آنکھ بھنگے کے حوالے کان مچھر کے سپرد

مطلب ''شکر چشم و گوش'' ایک قلیل الاستعمال سی مولویانہ اصطلاح ہے جن کا کہنا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے غرض قدم قدم پر شکر خدا کرتے رہو۔ اسی طرح اس نے جو اعضائے جسم عطا فرمائے ہیں ان کا بھی شکر ادا کرنا ضروری ہے جیسا کہ شیراز کے بڑے مولوی صاحب سعدی نے فرمایا ہے کہ ''و بر ہر نعمتے شکرے واجب'' اس لیے اکبر اسی اصطلاح میں ہندستانی محکمہ حفظ صحت کی کمزوری پر طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گو میں خدا کے حضور تو اپنی دور بین آنکھ، زود شنوا کانوں کی تندرستی پر شکر گزار ہوں مگر میرے علاقہ کا محکمۂ حفظ صحت اس درجہ فرائض سے بے پروا ہے کہ غیر صاف شدہ حالت سے بھنگے اس کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں کہ دن رات آنکھوں سے جھوے رہتے ہیں اور کان مچھروں کی بھن بھناہٹ اور دادرے، ٹھمریوں کی آوازوں سے فرصت نہیں پاتے۔ مرادی معنی یہ ہیں کہ جب اکبر ایسا شیشن جج اور خان بہادر انسان بھنگوں اور مچھروں سے یوں نالاں ہے تو پھر ہندستان کے ان غریبوں کا کیا حال ہوگا جن کے مکانات تاریک گلیوں، نم خوردہ کوچوں اور گندگی کے بڑے بڑے نالوں کے قریب ہیں؟

مرض طاعون نے سارے یورپ کو چھوڑ کر صرف ہندستان پر جو جو اور جب جب اور جیسے جیسے احسانات فرمائے ہیں ان کی انسان کش تفصیلات سے ہر وہ شخص واقف ہے جو کم سے کم حیدرآباد اور بمبئی میں کچھ دن ہی گزار آیا ہے کیونکہ سنا ہے کہ طاعون کے یہ وہ محبوب مقامات ہیں جن کو کالا چھوڑ کر آج تک تو طاعون گیا نہیں آیا۔ آئندہ محکمۂ حفظ صحت جانے اسی طرح دوسرے شہروں پر طاعون نے جب کبھی یلغار اور جرمنی کے طوفانی حملے کا انداز اختیار کرلیا ہے بس اسی بستی کے پسماندوں اور ان کے صبر جمیل سے دریافت فرمایئے کہ کیسی گزری؟ اس لیے اس سب سے وحشت ناک مرض پر لوگوں نے مختلف اقوال گھڑ گھڑ کر کہنا شروع کر دیا کہ نہیں یہ تو خدائی عذاب ہے اور کسی نے اس حد تک بک دیا کہ حیرت ہے کہ خدا ہو کر بھی خدا کو بندوں پر ترس نہیں آتا وغیرہ۔ پس کہنے والوں کے ایسے گستاخ جملوں سے اکبر ایسے خدا پرست مسلمان سے کیسے چپ رہ جاتا لہٰذا فرماتے ہیں اور طاعون کی تشریف آوری اور بربادی کا جو نام رکھتے ہیں وہ ملاحظہ ہو:

افسوس ہے بدگمان کی آزادی پر
خالق کبھی خوش نہ ہوگا بربادی پر
طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر
یہ تو اک ٹیکس ہے آبادی پر

مرادی معنی یہ ہیں کہ طاعون کوئی خدائی مرض نہیں ہے کیونکہ اللہ بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے بلکہ شک ہوتا ہے کہ اس مرض کو ''انکم ٹیکس'' کا محکمہ یا میونسپلٹی ہی پھیلا دیتی ہے محض ان لوگوں کے لیے جو ٹیکس ادا کرنے سے منکر تے ہیں اور لڑنے مرنے کو تیار۔ اب یہ اور بات ہے کہ طاعون کی لپیٹ میں ٹیکس ادا کرنے والے بھی آ جائیں۔

لغوی معنی یہ ہیں کہ بعض پرانے وقتوں کے لوگوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ طاعون واعون کوئی مرض بالذات نہیں بلکہ کسی راز کے ساتھ پھیلایا جاتا ہے۔ لہٰذا اکبر نے ہر طبقے کی تشفی کے لیے یہ قطعہ عنایت فرما دیا۔

اکبر قوافی کے بادشاہ ہیں اور اس طرح نہیں کہ ان کو قوافی کے لیے کسی خاص تلاش کی ضرورت ہوتی ہو اور وہ گھڑ لیتے ہوں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ایک قافیہ تو ان کے ہاں اتنا بھی بے ساختہ آتا تھا گویا جرمنی کے کسی خاص کارخانے نے خاص واسطے اکبر ہی کے اس قافیہ کو ڈھال کر بھیجا ہے۔ البتہ دوسرے قافیے موصوف نے ہندستانی کارخانوں سے لے کر جڑ دیے ہیں، مگر اس کمالِ قدرت سے کہ ہندستانی قوافی بھی جرمنی ہی کے بنے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں بلکہ جرمنی کی قسم کے قوافی اکبر کے فراہم کیے ہوئے قوافی سے مزید تابناک اور لطف انگیز ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں اکبر کو صرف ہندستان کے شیعہ سنی کا قضیہ حق پر کچھ کہنا تھا جس کا قافیہ سنّی رکھنا پڑا لیکن یہ سنی کے قافیہ کے لیے ظالم نے مّنی کے قافیہ کو جیسا فٹ کیا ہے شاید کسی دوسرے شاعر کے ہاں قوافی کا یہ ''فٹ پن'' نظر آئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

بھائی مجھے کل بات بی مّنی کی
تفریق اڑادو شیعہ و سنّی کی

جیسا موقع ہو بس بٹھادو وہ نگین
ہیرے کی نہ شرط ہو نہ ضد چنّی کی

اب یہاں لفظ ''بی منّی'' نے جو مزا دیا ہے اس کے اثرات کو وہ نظرافت فہم حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر غریب لوگوں کی بستیوں کی ان بوڑھی عورتوں تک پہنچتی ہے جو اپنے اپنے محلے کی خدائی فوجدار بنی پھرتی ہیں۔ ایسی بوڑھی عورتیں تمام محلے میں ''بڑی خالہ''، ''ججانی بی'' اور نانی دادی کے ناموں سے پکاری جاتی ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی خدمت صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ یہ صبح سے شام تک محلے کے ہر گھر میں ناخواستہ گشت فرماتی رہتی ہیں اور جس گھر میں جس قسم کی گفتگو ہو رہی ہو یہ اس میں اپنی ٹانگ اڑا کر اور خواہ مخواہی مشورہ دے کر چلی جاتی ہیں اور ان کے ایسے اول فول مشوروں میں ایک آدھ مشورہ پختہ کارانہ بھی ہو جاتا ہے لہٰذا اکبر مرحوم نے ہندستانی معاشرت اور آداب تمدن کا کتنا منہ بولتا معاملہ باندھا ہے جس سے شعر خواہ مخواہ واقعہ بھی بن جاتا ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ شاعر کے گھر میں شیعہ سنی تفریق پر کوئی مشورہ ہو رہا ہو اور ناگاہ بی منّی قسم کی کوئی بڑی خالہ درانہ داخل ہوئی ہو اور بغیر پنچایت کے موصوفہ نے بھی اپنا مشورہ دے مارا ہو لہٰذا مشورہ کی اہمیت کو تمام پنچایت نے قبول کیا اور حضرت اکبر اس پنچایت کے صدر کی حیثیت سے بول اٹھے کہ:

بھائی مجھے کل بات بی منّی کی
تفریق اڑادو شیعہ و سنّی کی

انسانی نفسیات اور فطرت شناسی میں کمال حاصل ہو جانے کے بعد شاعر صاحب قلم مقبول ہوتا ہے اور بااثر لہٰذا یہ دولت اکبر کو بھرپور ملی اور انھوں نے جو کہا اس کمال صحت اور مہین نظر سے دیکھ کر کہا کہ سننے والا ان کے احساس وواقفیت پر دنگ ہو کر رہ گیا۔ مگر بعض چیزیں اکبر نے ایسی بھی کہہ دی ہیں جن کے سمجھنے کے لیے ایک وسیع نظر اور انسانی واردات کے عمیق تر مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً اردو کی آج تک کی تمام کائنات میں عورت کی جو سیرت مرد کے مقابل دکھائی ہے وہ سب کی سب غلط ہے اور محض دوسروں کے غیر محققانہ اقوال وعقائد، اسی لیے ملا رموزی کو اس ''زنانہ موضوع'' پر ایک بسیط کتاب لکھنا پڑی جس کا اسم گرامی ''ملکات جنسی'' ہے۔ چنانچہ ذیل

کے اکبری شعر میں عورت کے ذوق کا صحیح جذبہ اور مرد کے متعلق ''مسماتی نظریہ'' ملاحظہ ہو:

مار و کژدم رہ گئے کیڑے مکوڑے رہ گئے
صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے

یہ شعر محض ذیل میں آنے والے قافیہ کو سنوارنے کے لیے کہا ہے اس لیے اس شعر کا نہ کوئی مطلب نہ مقصد گویا یہ ''سرکاری شعر'' ہے البتہ ذاتی شعر یہ ہے کہ:

پردہ در کی رائے سن کر بیبیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

اس شعر میں عورت کی وہ عظیم فطرت بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر عورت مرد کا جوڑ ملا ہوا ہے یعنی عورت کو فطرت نے نرم و نازک اور مرد کو سخت و قوی بنایا ہے لہٰذا فطرتاً جوڑا اسی وقت صحیح ہوگا جب ایک دوسرے کی قلت اور کمی کو اس کا ساتھی پورا کرتا ہے۔ چنانچہ فطری عمل یہ ہے کہ مرد کے ہاں نزاکت و لطافت کی کمی ہے اس لیے وہ اس کمی کو عورت سے لیتا ہے اور شاد ہوتا ہے اسی طرح عورت میں سختی اور چھا جانے کی قوت کم ہے لہٰذا وہ مرد کی دبدبہ انگیز اور شیر کی طرح کے کردار کو پسند کرتی ہے، لیکن بدقسمت ہندستانیوں نے بے عقلا ہونے کی وجہ سے عورت کے سامنے مرد کو شیر کی طرح جانے کے عوض بکری کی طرح میں میں کرنے کی جو تعلیم دی ہے اس سے خود عورتیں فطرتاً نفور و نالاں ہیں، مگر عورت کے اس شدت پسند کردار کو سمجھے کون کہ ہندستانی کو سب مل جانے کے ساتھ صرف عقل ہی تو نہیں ملی ہے اسی لیے اردو کے تمام شعرا نے عورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جانے اور نیازمند بنے رہنے کی جو تلقین کی ہے اس کے اثر سے اب یورپ زدہ چھوکرے بھی عورت کو سیدھے ہاتھ پر اور خود کو الٹے ہاتھ پر جگہ دینے کے جو محرک ہیں یا جو یورپی قاعدے کی نقل میں عورتوں کے پیچھے چلتے ہیں یا جو مارے اے۔ ٹی۔ کٹیانہ سعادت مندی کے عورت کے شوہر ہو کر بیٹے کی طرح مؤدب ہو کر رہتے ہیں ان کی طرف سے عورت کے دل کی نفرت کچھ عورت ہی سے دریافت کیجیے۔ پس ایک شعر میں اکبر نے بتایا ہے کہ ہندستانی کم عقلے کو محض یورپی نقالی میں اپنی عورتوں کے ساتھ نرم ہوتے چلے جا رہے ہیں مگر خود ان کی عورتیں ان کی اس ''برخورداری'' سے ان کو حقیر سمجھتی ہیں اس لیے ''نگوڑے'' کے یہاں معنی ہیں ''زنانہ مرد'' اور مرادی معنی ہیں وہ

مرد جو عورتوں کو مردوں ایسی آزادی عطا فرما رہے ہیں اور عورتیں ان کو "پردہ نشین کمپارٹمنٹ" سمجھتی ہیں اور ان کی اس نری پر دل ہی دل میں نفرین بھیجتی ہیں، مگر ہندستان کے یورپ خوردہ مردوں کی عقلوں کا یہ حال ہے کہ وہ تو صرف یورپ کی عورتوں کو بے پردہ دیکھتے ہیں مگر بے پردگی کے نتائج کو تحقیق نہیں کرتے کیونکہ اگر ان میں تحقیق ہی کی قوت ہوتی تو حیرت انگیز ایجادیں نہ کرتے اور دنیا پر چھا جاتے۔

اب اسی بحر و قافیہ میں ظالم ہندستانیوں کی قدیم و جدید کیفیت مزاج و عمل کا ایک سقراطی فلسفہ بیان کرتا ہے مگر الفاظ اور تشبیہات کی ٹانگ توڑ کر:

شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ ابھرے ہیں اب
اونٹ رخصت ہو گئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

مطلب یہ ہے کہ قدیم اور معمر لوگ ہر کام کافی غور و فکر سے کرتے تھے اور گو ان کی ہر رفتار بے حد سست محسوس ہوتی تھی مگر ایسی ہی کارآمد ہوتی تھی جس طرح ایک اونٹ گو آہستہ چلتا ہے مگر کافی بوجھ لاد کر اپنے مالک کے گھر پہنچا دیتا ہے، لیکن پولو کے گھوڑے صرف تیز رفتار ہی کے مالک ہوتے ہیں لیکن قافلے کے بوجھ کو لاد نہیں سکتے لہٰذا غیر نفع بخش عجلت اور ظاہری حسن و نفاست کس کام کی جو جدید کالج زدوں میں پائی جاتی ہے، جن کی زبانیں تو قینچی کی طرح چلتی ہیں مگر میدانِ عمل میں آج بھی یہ کالج زادے ان بوڑھوں کے مقابل نہ علوم کے میدان میں کچھ کر سکے نہ سیاست و اصلاح کے میدان میں۔ جو کچھ اونٹ کی ادا سے حرکت کرنے والے بوڑھے کر گئے۔ لہٰذا "اونٹ" معنی بوڑھا آدمی اور پولو کا گھوڑا معنی "گریجویٹ"۔

امیر اور غریب کی زندگی، ان کے حالات و اثرات کے سوچنے میں اکبر کو ان دونوں طبقوں کی جو نازک کیفیت نظر آئی ہے اس سے موصوف کے رسوخ خیال کی حد ملاحظہ ہو کہ وہ کس قدر گہرے اور پردہ پردہ افکار تک پہنچتا تھا۔ پھر طرفہ کمال یہ کہ ایک شدید و متین کیفیت کے بیان میں کمال نظم و قافیہ اسی معیار ظرافت کا ہے جو موصوف کا پیدائشی ورثہ تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اُدھر سرخی مئے گلگوں کی تھی انڈے کی زردی تھی

ادھر ریش سفید اپنی تھی اور شدت کی سردی تھی

قلاش و مفلس ہندوستان میں ''انڈا مرغی'' امیروں اور یورپی لوگوں کی مخصوص غذا تسلیم کرلی گئی ہے، یعنی ہندستان کے عوام کو انڈا مرغی روزی ہی نہیں، اس لیے مقصد یہ ہے کہ ہندستان میں رہنے والے یورپی اور امیروں کے چہرے تو شراب اور انڈے کے اثرات سے سرخ ہو رہے ہیں اور عام باشندوں کا یہ حال ہے کہ مارے ضعف و نقاہت کے وہ اس طرح کانپ رہے ہیں جس طرح کوئی بوڑھا آدمی سردی کی شدت سے لرزتا ہو اور اس لرزش سے اس کی داڑھی بھی کانپتی ہو۔ غذا کی قلت اور پھس پھسے پن سے جسم میں خون کی تولید نہیں اس لیے غربا میں نوجوانوں کے چہرے بھی سرخ کی عوض سفید محسوس ہوتے ہیں۔ غرض اس شعر میں امیروں کی ''انڈا مرغی خور فراغت'' کا نقشہ ہی نہیں بلکہ غریبوں کی مفلس اور بھوک پیاس سے ماری ہوئی زندگی کا ایک شاعرانہ احتجاج بھی ہے۔ جس کے سمجھنے کے لیے ''مرغ وانڈا کھاؤ امیروں'' کے پاس سمجھ ہی نہیں کیونکہ اگر ان طبقات میں کامل عقل ہوتی تو آج ہندستان کے حق میں نہ اکبر ایسا طنزیاتی دیوان تیار ہوتا نہ ملا رموزی کی یہ تیر ونشتر شرح۔ لہٰذا مئے گلگوں سے مراد سرمایہ داروں کی مفت و جبر کی بے مشقت آمدنی ہے اور چہرہ کی سرخی کے معنی ان کی بے حس اور احمقانہ بے پروا مزاجی۔ ریش سفید سے مراد ہندستانی عوام کا افلاس اور شدید سردی کے معنی ہیں شدید بے روزگاری۔

''ضرب المثل'' بھی ایک جامع علم ہے اور غضب کا حقائق اندوز۔ چنانچہ ہر زبان میں ضرب الامثال کو لوگوں نے جمع کیا اور ضرب المثل گھڑنے یا کہنے والوں کے لفظوں پر نہیں بلکہ ان کی حقیقت میں نظر کے قائل رہے۔ چنانچہ اردو کی ضرب الامثال میں بھی یہی بانکپن ہے کہ وہ جن امور سے متعلق کہی گئی ہیں ان کی صحت و حقیقت سے آج تک سی۔ آئی۔ ڈی والے تک انکار نہ کر سکے اور میری رائے میں سی آئی ڈی والوں سے زیادہ تحقیق کا کام آج کل نہ علما کرتے ہیں نہ محققین نام کے دوسرے لوگ پس اکبر کی زبان پر بھی ایک ضرب المثل جو آئی نہیں کہ آپ نے فوراً ہی اس کو شعر بنا ڈالا مگر جس کمال وسعتِ نظر سے بنایا اس کی داد سی آئی ڈی والوں کے ذمہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز؟

''انجن'' کے معنی سائنس اور علومِ جدیدہ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں ضعیف العقل بی۔اے پاس علوم جدیدہ کی پیداوروں کی چمک دمک اور جدید مصنوعات یورپ کے انوکھے پن کو چونکہ اتنی قلت عقل کی وجہ سے سمجھ نہ سکے اس لیے بغیر کسی ادنیٰ تکلف کے سائنس کے ہر کارنامہ کے سامنے سر جھکا دیا مثلاً ڈاکٹری علاج کے اوزاروں کی چمک دمک، انجکشن آپریشن کی عجلت یا موٹر کار کی تیزی تک تو ان کی نظر گئی لیکن ان جدید مصنوعات کے بھولے پن نقصانات اور عمر طبعی سے پہلے ہلاک کر دینے والے اجزا کو نہ پہچان سکے۔ بس اسی قلتِ عقل کی وجہ سے وہ مذہب کے حقائق اور نازک موڑ کو محض اسی لیے نہ سمجھ سکے کہ ان کے پاس مذہبی حقائق کے سمجھنے کی استعداد نہ تھی جیسا کہ بھینس بین ایسے دلکش باجہ کی آواز سے اس لیے مستغنی اور بے پروا رہتی ہے کہ اس کو اس دلکش باجہ کی آواز کو محسوس کرنے والی لطافت ہی نصیب نہیں لہٰذا اس عہد کے یورپ زدہ ہندستانی اگر مذاہب کے حقائق سے دور اور سائنس کے مظاہر سے مرعوب ہیں تو چنداں حیرت کی بات نہیں، اس لیے انجن کے معنی یورپی مصنوعات اور بھینس کے معنی کم فہم بی۔اے پاس۔

اردو کی شاعری کی موجودہ پستی، تنگی اور خالی خولی پن کا بڑا سبب وہ شعرا اور اساتذہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے دقیانوسی اصول وضوابط سے سرموانحراف نہ خود کیا اور نہ اچھے کہنے والوں کو ایک قدم آگے بڑھنے دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کی شاعری ایسے قدامت پسندوں میں ہنوز اسی کال کوٹھری میں بیٹھی اونگھ رہی ہے جہاں اس کو ان افیونیوں نے بند کر دیا ہے، لیکن اکبر نے ''ضرورت'' کو ایجاد کی مادر مشفقہ تسلیم کرتے ہوئے ان سب کی سیدھی ٹانگ کے ساتھ الٹی ٹانگ بھی توڑ دی اور جس لفظ و کلمے کو اردو کی بے ساختگی میں مانع نہ پایا اس کو باندھ کر بھی چھوڑا اور موصوف کے اس ''شاعرانہ بے تحاشہ پن'' میں اگرچہ بعض انگریزی اور ہندی الفاظ ایسے بھی آگئے جن کو نہ آنا چاہیے تھا لیکن موصوف کے اس سہو کا نقصان اتنا نہیں جتنا ان کے دانستہ طور پر انگریزی اور ہندی الفاظ کے بعض جگہ فٹ کر دینے کے فوائد میں۔ چنانچہ انگریزی کے ایسے الفاظ جواب قطعاً اردو

کے الفاظ بن کر رہ گئے ہیں اکبر کے کلام میں بہت کافی موجود ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان الفاظ کو جس غضب کی بے ساختگی اور معنی آفرینی کے ساتھ باندھا ہے مذاق بلند بھی ان کی داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ چنانچہ لفظ ''نوٹس لینا'' خالص اردو ہے کیونکہ کسی معاملہ میں نوٹس نہ لیا میں اول تو ایک لفظ اردو کا موجود ہی ہے پھر نوٹس بہ معنی جواب لینا اور توجہ کرنا بے حد عام فہم ہے۔ لہٰذا نوٹس لینا، یا نوٹس نہ لینا توجہ کرنے یا بے توجہی کے معنی میں اب ہر اردو والا سمجھتا ہے۔ لہٰذا ذیل کے شعر میں اکبر نے نوٹس کو جس غضب کے برمحل اور حد سے گزری ہوئی بیساختہ مناسبت سے چسپاں کردیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ لفظ اسی موقع اور کیفیت کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اور کس قدر بے قابو ہوکر اور سر پر چڑھ کر فرماتے ہیں کہ:

ممکن نہیں ہے بس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

شعر مذکور میں جو کچکچاہٹ، جو بلبلاہٹ جو ہنہناہٹ اور جو ڈ ناڈٹ بے قابو پن ہے وہ انسانی بے اختیاری اور بحرانی کیفیت کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے گو تہذیباً اور رسماً کوئی انکار کردے تو کردے مگر فطرتاً اور عقلاً انکار محال ہے۔ البتہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اکبر نے جس قانونی خلاف ورزی کو اختیار کیا ہے اس میں 'نوٹس' اور 'کس' کے قوانی خود ہی اشتعال دلانے والے ہیں یا نہیں؟ لہٰذا مجرم شاعر کی کیا خطا جب کہ نوٹس نہ لینے کا سبب اس نے صاف صاف بتا ہی دیا کہ حضور میں کیا کروں اُدھر بھی تو گالوں کا گلگلا پن ملاحظہ ہو۔

یہ تو شعر کی وہ شرح ہے جس پر صرف ''علمائے سو'' کا اتفاق ہے لیکن اکابر فقہا نے اس شعر کے جو معنی اپنے اپنے درس میں بیان کیے ہیں اور جن کو ملا رموزی نے بغداد و رے کا سفر کرکے حاصل کیا ہے وہ یہ کہ اکبر نے اپنے جس سن و سال میں یہ شعر کہا ہے وہ ان کے خضاب لاجواب اور حج بیت اللہ شریف کا سن و سال تھا نہ کہ بوسہ گیری کا لہٰذا مطلب یہ ہے کہ اکبر نوجوانانِ ہند کے اس گروہ کے عاشقانہ اور عیاشانہ طوفان کے ایک کھولاؤ کو دکھا رہے ہیں جو سرمایہ داروں کی اولاد میں صرف یورپ زادیوں کے حسن و جمال سے اُمڈ آتا ہے اور جس کی زد میں وہ ہندستان کی گومتی ندی اور نہر چناب و راوی سے بہہ کر پیرس و لندن میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے چکیلے

گالوں والوں کے عشق میں اپنے تعلقے، جاگیریں اور زمین کے مربعے تباہ کر دیتے ہیں اور جب ان سے یورپی بیوی یا یورپی محبوبہ کے متعلق کہا جائے کہ کیوں تم کو کیا ہندستان میں ایسی عورت نہیں مل سکتی تھی تو وہ اپنی عاشقانہ نالائقی کے جواب میں صرف یہ کہنے پر مجبور ملتے ہیں کہ:

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

لہٰذا ''نوٹس نہ لیا جائے'' کے معنی ہیں وہ کم عقلے ہندستانی صاحبزادے جو باوا کی دولت کے بل پر یورپ جاتے ہیں اور وہاں کی لڑکیوں کی چمک دمک دیکھتے ہی ٹیں ہو کر رہ جاتے ہیں اور ''کس'' کے معنی ہیں ''سول میرج'' یعنی وہ ''اینگلو انڈین نکاح'' جس میں میاں مسلمان تو بیوی عیسائی اور بیوی مسلمان تو میاں آتش پرست۔ اللہ بس باقی ہوس۔

1935 کے بعد سے ہندستانی نوجوانوں میں فلم اور سینما کے ذریعہ جو عشق بازی، ہیضے اور طاعون کے انداز سے پھیلی ہے اس نے عشق وحسن کی رہی سہی آبرو کو بھی جہنم واصل کر دیا مثلاً اردو کے شعروافسانے میں جو پہلا عشق ہندستان میں وارد ہوا تھا وہ نجد وایران کا ساختہ پرداختہ تھا جس میں عقل وفطرت کو دور کا بھی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ آج 1942 تک کی ترقی یافتہ اردو کی غزل کو ملاحظہ فرمایئے اس میں شاعر ترقی پسند تک کی حماقت موجود ملے گی کہ وہ مرد عاشق کو شاعرانہ مشورہ یہ دے گا کہ تو کوچۂ یار کی خاک بن جا اور عشق صادق ہے تو آہ نہ کر اور جوتے کھاتا رہ۔ گویا عورت کے مقابل مرد کو خاکساری کی تعلیم ہی خلاصۂ غزل ہے جو سراسر غیر فطری ہے یعنی عورت مرد کا مردانہ کردار پسند کرتی ہے اور اردو کے شعرا مرد کو عاشقی میں زنانہ کردار اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس عقلی افلاس سے اردو کے وہ تک نہ بچ سکے جو استاذ وقبلہ پکارے جاتے ہیں لیکن تو تھا قدیم اور فرسودۂ نظریہ حسن وعشق، لیکن ''فلمی نظریۂ حسن وعشق'' یا سنمائی افسانوں نے اس سے بھی بارہ بانس آگے بڑھ کر تیر مارا ہے۔ چنانچہ اس عہد کے کالجی صاحبزادوں اور اسی قسم کے صاحبزادیوں کے حسن وعشق میں ایک چیز خاص ملے گی وہ یہ کہ اول تو عشق کے آغاز کی نہ سرراہ ہوں گی نہ نجد وعراق کا کوئی صحرا ہوگا بلکہ عین مجنوں کی تقلید میں آغاز عشق کی پہلی منزل

رجسٹری شدہ کالج ہوگا اور وہیں کی کوئی یکسر حیا باختہ دوشیزہ۔ پھر اس کے بعد ناممکن ہے کہ عاشق کو انجینئری، ڈاکٹری یا لاء کے امتحان کے لیے ولایت نہ جانا پڑے۔ پس اس نوع کی منزل میں جب ہجر و فراق کا دورہ پڑے تو ان حسن و عشق والوں کو سائنٹفک مشورہ یہ دیا گیا ہے کہ جب عاشق یا معشوق کی جدائی جاں گسل ہو تو پیانو پر بیٹھ کر خاصے تال وسُر کے ساتھ کوئی ہجر یہ غزل ڈٹ وٹ کر گاؤ جو سراسر خلاف عقل و فطرت ہے۔ لہٰذا اکبر ایسا بوڑھا اس عہد کے کالج زادوں کے اس عقل سوز نظریۂ ہجر و فراق پر ایک جلی کٹی کہتا ہے اور غضب کے فنانٹ طریقے سے کہتا ہے:

آپ کی فرقت میں کل رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

اب رکھ لیجیے آج کل ایک ہزار اردو کے افسانے۔ اگر ان میں اسی طرح کے ہجر و فراق کے اصول نہ مل جائیں تو اکبر نہیں غیر اکبر کہنا۔ لہٰذا اس سنمائی عشق اور فلمی حسن کے قواعد سے فرقت نام ہے اس تنہائی کا جس میں باپ دادا کی دولت سے سجائی ہوئی کوٹھی کے کسی کمرہ کا سکون حاصل ہو۔ سرمایہ داری کی غاصبانہ فراغتوں اور مرغ تنجن کی بدمستی کا طوفان آئے اور پھر یاد یار کی بیتابیوں کو باوا کے دلائے ہوئے پیانو پر جھوم جھوم کر گایا جائے اور دودو آنے کے نوکروں کو اپنی ان درون خانہ بدمستیوں پر گواہ بنایا جائے اور وہ صبح کو کوٹھی سے نکل کر ان دولت کے مارے ہوؤں کی داستانیں ملا رموزیوں کو سناتے پھریں اور ملا رموزی ایسی شرحیں لکھ کر رہتی دنیا تک ایسوں کے نام پر لاحول اور استغفر اللہ کی لعنت چھوڑ جائیں اور بس۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ایرانی طرزِ غزل نے عاشق کا کردار یہ طے کیا ہے کہ اس کو ایک عالی خاندان مرد ہو کر بھی محبوبہ کا دھوبی اور خانساماں بن جانا چاہیے ثبوتِ وفاداری میں اس کو بھری محفل میں محبوبہ کے جوتے کھالینا چاہیے مگر منہ سے اُف نہ کہنا چاہیے۔ مرد عاشق کا یہ وہ کردار ہے جس کو ایرانی شاعری کی غلامانہ ذہنیت نے پیدا کیا تھا اور چشم بددور اپنے ہندستانی عقلا نے اسی کو لفظاً نقل فرمالیا اور غیرت نہ آئی — مگر حسن نظر ملاحظہ ہو کہ اکبر نے اظہارِ وفا کے اس طرزِ ذلیل کو سیاسیات ہند تک میں برداشت نہ کیا حالانکہ سیاست میں بے وفائی چانٹے کھانے کی بات

ہے، مگر اکبر کی طرح غیور ہندستانیوں کے ایسے فدویانہ اور نمک خوارانہ انداز وفا تک سے پھر جاتا ہے اور کہتا ہے مگر قانونی بے اعتدالی سے بچ کر کہتا ہے کہ:

میرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی برا
ساتھ ہی اس کے علی گڑھ کا یہ حلوا بھی بُرا
آپ اظہار وفا کیجیے تمکین کے ساتھ
لیٹ جانا بھی بُرا ناز کا جلوا بھی بُرا

ان دونوں شعروں میں ''حاصلِ کلام'' صرف یہ بات ہے کہ وہ سرکار ہو یا محبوبہ کوئی ہو کیسی ہی ہو لیکن عزتِ نفس کا ایک حصہ جناب کو بھی ملا ہے لہٰذا اظہارِ وفا کے وقت اس کو نہ بھولیے اور اس طرح اظہارِ وفا کیجیے کہ دیکھنے والے کی نظر میں آپ ''غلام'' اور ڈوم محسوس نہ ہوں۔

پنجاب کا بلوا معنی ذرا سا زوردار احتجاجی جلوس۔
علی گڑھ کا حلوا معنی حد سے گزری ہوئی خوشامد۔
لیٹ جانا معنی گڑگڑا کر خوشامد کرنا۔

تشبیہ واستعارہ انشاء وخطاب کا ایک قادر الاثر صفت وترکیب ہے، لیکن سوال ہے اس کے بہتر طریق پر استعمال کا۔ چنانچہ اکبر نے بھی ایک تشبیہ سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ساتھ ان کے میرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا
بندر کی طرح اونٹ اچھل ہی نہیں سکتا

مرادی معنی یہ ہیں کہ اس زمانے کی کالج زدہ محبوبہ میں کوئی نسائی وقار و وفا نہیں، فلمی عورت عشق وشق کے قابل اس لیے کہ اس میں ہڑدنگا پن ہوتا ہے جو کسی رشتۂ عشق کے وقار و وفا میں مضبوط و مستقل نہیں رہ سکتا، یہ تو آج اس کی بغل میں تو کل اس کی بغل میں لہٰذا ان بازاری ذوق کی ہڑدنگیوں سے دور ہی رہو۔ لغوی معنی یہ ہوئے کہ عہد حاضر کی ہر ترقی نام کی چیز وقتی چمک پھڑک اور اچھل کود رکھتی ہے مگر اس میں کوئی ثبات واستقامت نہیں حتٰی کہ اس زمانے کی انجینئری کے مکانات کوٹھیاں اور بنگلے تک ہر بارش میں دوبارہ تعمیر کے قابل ہو جاتے ہیں مگر ایک حویلی ملا رموزی صاحب ہے جو

آثار قدیمہ کے محکمے میں چلی گئی مگر نہ منہدم ہوئی نہ مرمت کے قابل۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ عہد حاضر کی تعلیم میں اخلاق و سیرت کی استواری اور استقامت نہیں اس لیے اس تعلیم کا مارا ہوا ہندستانی اُن ہندستانیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جو قدیم مشرقی تعلیم سے سنوارے گئے ہیں اور گو وہ بہت سست رفتار ہیں مگر غضب کے صادق العمل اور مستقل کردار کے مالک لہٰذا:

شیخ معنی قدامت پسند لوگ اور بندر معنی بی۔اے فیل یا بی۔اے پاس۔

کالج زادے انگریزی میں کامل ہیں مگر عقل میں ناقص، اس لیے کہتے ہیں جو سطحی نظر والے ہونے کی وجہ سے یہ نہ سمجھ سکے کہ اکبر مخالف قومی نہیں بلکہ مخالف نقالی ہیں چنانچہ وہ خطا و لغزش کو جس شخص میں بھی دیکھتے ہیں اس کو بے جھجک ٹوک دیتے ہیں۔ گویا ایک طرح کے ذرا چڑچڑے مزاج کے تھانیدار ہیں جو ملزم کو پکڑتے ہی جوتوں پر دھر لیتی ہیں عام اس سے کہ ملزم کسی نسل اور کسی خاندان سے ہو۔ چنانچہ موصوف کی یہ ہمہ گیری خود ان قدامت پسندوں تک کو نہ بخش سکی جن میں خود ایک حضرت اکبر تھے۔ پس اس انصاف پسندی کے تحت موصوف نے آج کل کے ایک مولوی صاحب کو دیکھا کہ حضرت علامہ قاضی القضاۃ ہیں تو خاندانی پیرزادے اور قاضی زادے مگر فیشن کا یہ عالم ہے کہ بوٹ اور موزے سے لے کر ولایتی چکن، ولایتی گھڑی، سر کے بالوں میں چھپن چھری کے بالوں ایسی لطافت، پان کے بیڑے میں دنیا جہان کی زعفرانی اور مشک کی مہک اور داڑھی میں فرنچ کٹ کا وہ بانکپن کہ قانوناً داڑھی بھی کہا جائے اور اصولاً کچھ بھی نہیں۔

پس مولویت کی اس جدید مرمت کی فینسی حالت پر ذیل کا لٹھ رسید فرمایا ہے کہ:

شیخ کی وہ دھج نہیں، وہ شیخ کی داڑھی نہیں
دوستی مذہب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں

یعنی مولویانہ طرز معاشرت بھی ہے اور فینسی بھی۔ داڑھی ہے بھی اور نہیں بھی۔ چنانچہ اس شعر کا اطلاق عربی کے ان طلبا پر بھی ہوتا ہے جو خالص مولویانہ نصاب پڑھ رہے ہیں مگر فیشن سے اتنے متاثر و مرعوب ہو چکے ہیں کہ سر کے مولویانہ بالوں کے سلجھانے کو دیسی کنگھے کے عوض فرانس ہی کا فینسی کنگھا اور آئینہ خرید فرماتے ہیں اور اس فیشن پرستی کی تاویل یوں فرماتے ہیں کہ ”ہم

تاریک خیال ملانے نہیں بلکہ روشن خیال مولوی ہیں۔قربان جایئے اس یورپی نقالی کو روشن خیالی کہنے پر۔لہٰذا:

شیخ کے معنی اس شعر میں ہوئے ''فینسی مولوی''۔

سج دھج کے معنی ہوئے انگریزی ہائی اسکولوں کے ہیڈ مولوی کی طرح۔

دوستی مذہب کے معنی ہوئے صرف نماز روزے کی پابندی باقی خیریت۔

اس قدر گاڑھی نہیں کے معنی ہوئے صرف رسمی۔

کسی حقیقت، واقعیت، اصلیت اور سمجھ میں آجانے والی بات کو برجستہ، برمحل، بیساختہ اور زناٹے کے ساتھ کہہ گزرنا کمالِ کلام ہے لیکن اگر وہ بات نظم و شعر میں بھی اتنی ہی برجستہ، اتنی ہی بیساختہ اور اتنی ہی فٹ ہو تو صنعت شعر و نظم ہے، لیکن اس پر اگر وہ ظریف و لطیف بھی ہو تو مافوق الفطرت اقتدار بیان ہے جو اس شعر میں ملاحظہ ہو:

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

پہلے تو ضبطی اور خبطی کے قوافی کا وہ زناٹے کا چانٹ ملاحظہ ہو جو اتنا ہی ڈٹ کر رسید کیا گیا ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں، اس کے بعد کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ اپنے باوا کو خبطی سمجھنے والے ''کالجی اور اسکولی عہد'' ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور کتنے تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے پستی سے ترقی کر کے اپنی پرانی وضع کے باوا ہی سے انکار فرمادیا ہے۔لیکن اکبر کی وسعتِ نظر صرف اسی جگہ تک رُک نہیں گئی ہے بلکہ ان کا مقصد ہے وہ تمام یورپی کتابیں جنھوں نے ایشیا کی ہر بلندی اور بزرگی لیے ہوئے چیز کو حقیر کر کے دکھایا ہے، ادھر بدقسمتی سے ان کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے واقع ہوئے نخالص ہندستانی عرف ماسٹر صاحب اور طلبا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ایسے تمام یورپ زدہ ہندستانی اپنے ہی باوادادا کی پیدا کردہ تہذیب، ان کے تمدن، ان کی معاشرت، ان کی زبان اور ان کے آدابِ زندگی کا مذاق اُڑانے میں یورپ والوں سے بھی لاکھوں کوس آگے ہیں حتّٰی کہ جو ہندستانی اپنی ملکی وضع و قطع ترک کر کے یورپ کی وضع و قطع اختیار کر چکے ہیں ان کا شمار بھی انھی

لوگوں میں ہوسکتا ہے جنھوں نے والد صاحب کو اگر اردو میں خبطی نہ بھی کہا لیکن ان کے انگر کھے کو ترک کر کے سوٹ بوٹ اوڑھ لیا۔ لہٰذا ایشیائی تہذیب میں یہ بھی باپ دادا کو خبطی ہی سمجھتا ہے اس لیے اکبر کا ارادہ تھا کہ ایسی کل کتابوں کو قابلِ ضبطی قرار دے دیا جائے، لیکن یہ موصوف کی تھوڑی سی کم نصیبی تھی کہ ایسی کتابیں ضبط کرانے والے ہندستانی بقلم خود اُسی زہر کے مارے ہوئے تھے جس زہر میں یہ کتابیں گیلی کر کے ہندستان کی دکانوں میں سکھائی گئیں اور ''اعلیٰ تعلیم یافتوں'' نے ان کو سر آنکھوں پر رکھا۔

مذکورہ شعر میں یورپ کی ایسی ہندستانیت سوز کتابوں کا جو اشارہ کیا گیا ہے ان کے جیتے جاگتے اور بولتے ہوئے نمونوں کے متعلق جو فرما گئے ہیں اب کاہے کو کوئی ایسی ہی کہنے والا پیدا ہوگا۔ چنانچہ حقائق گوئی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

فخر یہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے
فخر یہ آپ سنانے لگے نظمِ ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں مرے تھے اے دوست
آپ کے کون تھے ملٹن یہ سنوں حضرتِ من؟

اب شرح سنیے یعنی اب تو کانگریس کی دیسی تحریک سے ہندستانیوں میں قدرے قلیل شعور ملکی بیدار بھی ہوگیا ہے لیکن اکبر کو یہ تکلیف پہنچی تھی آج سے پورے بیس برس اُدھر۔ چنانچہ ہندستانیوں کی بے ہوشی اور غفلت کا یہ وہ تاریک تر عہد تھا جب ہندستان کے جید مشاہیر اور اکابر مصلحین تک اپنے اقوال، اپنی تقریر اور اپنی کتابوں تک کو یورپی مصنفین، یورپی مؤرخین اور یورپی شعرا ہی کے اقوال اور استدلال سے معزز اور قوی تر بنانے کے حق میں مبتلا تھے اور ان کے مقابل عرب و ایران اور مصر و چین کے اکابرینِ تحقیق و کلام کو یہ ہندستانی مجہول و مفلوج سمجھتے تھے جس کا ثبوت 1920 سے اُدھر کی ایسی اکثر کتابیں ہیں جو صرف یورپی اصحاب دماغ کی کتابوں کے ترجموں اور حوالوں سے اٹی پڑی ہیں بلکہ حقیقت اس سے بھی زیادہ تلخ ہے اور وہ یہ کہ کم سے کم زبان اردو میں تو ایک کتاب بھی ایسی نہ ملے گی جو کسی یورپی صاحب کتاب کے ترجمے یا اس کے

حوالوں سے پاک اور خود ہندستانی صاحب کتاب کی دماغی کوشش اور ذاتی غور و فکر کا شاہکار کہا جائے۔ ہاں ان کی ذاتی کتابوں میں ''قاعدۂ بغدادی''، پانا، جانا، کھانا، لانا، ڈھایا، گایا اور ''چل چل رے نوجوان'' قسم کی کتابیں ضرور موجود ہیں۔ پس ہندستانیوں کی اس دماغی مرعوبیت سے بھنا کر اکبر نے جوالہ آبادی لٹھ رسید کیا ہے اس کی ضرب سے ہندستان کے ایک صوبے کا سر بھی نہ ہوگا جو محفوظ رہا ہو۔

اب طنز و طعن کے حساب سے یہ وہ ''طنز شدید'' ہے جس کی مزید شرح میرے خیال میں اس لیے ضروری نہیں کہ اب ہندستان کا صبح کا بھولا ہوا دماغ شام کو پھر ہندستانیت کی طرف ہی آنے کی کوشش میں مبتلا تو ہے البتہ ہندستان کے اکثر دولت مندوں میں یورپییت کا جو غلبہ آج بھی ہے سو یہ قطعہ اس قابل ہے کہ ان کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں کتبہ بنا کر بطریق سوال جڑ دیا جائے تاکہ وہ صبح و شام کے یورپی مشاغل میں اپنے ہندستانی پن کی اس رشتہ داری کو سوچ کر کچھ شرمندہ ہو جایا کریں جو محض فتور عقل کے اثر سے انھوں نے ہندستان میں پیدا ہو کر بھی یورپ کے طور طریقوں سے پیدا کر لی ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ اس حد تک یورپ کے پرستار ہو کر بھی اکبر ہی کے الفاظ میں یہ ہندستانی کوٹھی اور بنگلوں والے آج بھی اس قابل ہیں کہ:

نہ کچھ انتظار گزٹ کیجیے
جو افسر کہے بس وہ جھٹ کیجیے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرہ پہ اپنے گلٹ کیجیے

میری غیرت اور مردانہ فطرت کا تو یہ تقاضا ہے کہ اگر میں مذکورہ شعر کے عین موافق کالا ہندستانی ہوتا یا میں سوٹ بوٹ ڈال کر بھی اس قابل رہتا کہ اپنے چہرہ مجھے گلٹ کرنا پڑتا تب میں انگریز کی طرح تسلیم کیا جاتا تو خدا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یا خودکشی کر لیتا یا اکبر مرحوم ہی کے سامنے سوٹ بوٹ نیلام کر کے ان سے رسید لکھا لیتا کہ ہاں اب تم صحیح معنی کے ہندستانی ہو تب دم لیتا، مگر آپ ہندستانی دماغ کی عقلی بے بسی ملاحظہ فرمائیے کہ آج اتنے روشن زمانے میں بھی کالے کوّے سے بھی کچھ زیادہ ہی کالے اور بدقوارہ، فاقہ زدہ صورت کے ہندستانی یورپی لباس میں جاتے بھی

ہیں تو کہاں کہ خود انہی یورپی لوگوں میں جو دودھ سے زیادہ سفید اور ریشم سے زیادہ نازک ہیں، مگر دماغی طاعون ان کو اپنی اس عقلی کوتاہی سے شرمندہ ہی نہیں ہونے دیتا بلکہ طرفہ جہالت یہ کہ اب تو اللہ سلامت رکھے ہندستان کی ''فینسی والدائیں'' بھی اپنے لاڈلوں کو یورپی وضع ہی کے لباس میں بند کر کے شام کے وقت بغیر گلٹ کیے ہوئے ان کالے اور گندمی بچوں کو ٹھنڈی سڑکوں پر سیر وتفریح کو ارسال فرماتی ہیں۔ لہٰذا شوق انگریز کے معنی ہوئے وہ ہندستانی جن کے جسم و رنگ کا انداز تو ہے فاقہ کشی کا مگر لباس ڈالے رہتے ہیں خوبصورت یورپ والوں کا اور ''گلٹ کرنے'' کے معنی ہیں غیرت ہو تو اپنی اسی فطری کمی پر شرماؤ۔

عظیم تر معلومات اور وسعتِ نظر کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

موکل چھٹے ان کے پنجے سے جب
تو بس قوم مرحوم کے سر ہوئے
پپیہے پکارا کیے پی کہاں
مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

اب شرح جامی سے لے کر شرح واقدی تک اٹھا کر دیکھ جایئے ان اشعار کی تفصیل اور جزئی کیفیت معلوم نہ ہو سکے گی البتہ وہ حضرات ان اشعار پر آج بھی ''نیاز دلائیں گے'' جو ایسے ہندستانی وکیلوں کے مارے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی وکالت کا نرخ گرتا دیکھ کر قوم کی لیڈری اختیار فرمالی اور دماغی بے بسی سے نہ اِنّی الذی نہ اَنّی الذی ہو کر جو ضعیف قوم کی گردن میں لٹکے ہیں تو نہ خود ایک قدم آگے چل سکے نہ غریب قوم کو حرکت کرنے دی۔ اب کہنے کو یہ ننھے منے سے دو شعر ہیں مگر ان میں ہندستانی لیڈروں کی جو افسوسناک تاریخ کہہ دی گئی ہے اس کے اور چمٹ جانے سے شاید ہی کسی لیڈر کا دامن بچ سکے، گویا ہندستانیوں کے نزدیک وکالت کا دوسرا درجہ لیڈری ہے۔ لاحول ولاقوۃ اب ان اشعار میں جو غضب کی بے تاب کر دینے والی حقیقت ہے وہ ان شعروں کے تیور اور ان کے کہنے کا وہ انداز ہے جو اکبر ایسے ''لٹھ مار شاعر'' ہی کے بس کا ہے۔ چنانچہ ذرا وکیل صاحب کی گت ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ۔

جب ہوشیار مؤکلوں نے دیکھا کہ وکیل صاحب جس مقدمہ کا محنتانہ وصول فرماتے ہیں وہی ڈسس ہوکر رہ جاتا ہے تو انھوں نے وکیل صاحب سے کنارہ کشی کی کیونکہ مصرع یوں ہے کہ:

مؤکل چھٹے ان کے پنجے سے جب

گویا وکیل صاحب نے اپنی کرنی میں تو کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن مؤکل خود ہی ان کے پنجے سے نکل بھاگے تب وکیل صاحب کو فکر وکالت سے زیادہ فکر معاش نے ستایا تو آپ نے لیڈری کے میدان میں قدم دھرا۔ مگر اس میدان میں آنے کو بھی اکبر نے جس ٹھیٹ اردو میں دکھایا ہے اس سے وکیل صاحب کی رہی سہی حیثیت عرفی بھی ستیاناس ہوکر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

تو بس قوم مرحوم کے سر ہوئے

اب ملاحظہ فرمالیجیے کہ اردو میں ''سر ہونا'' کے معنی ہیں خواہ مخواہ الجھنا، بے بلائے مہمان ہونا، آپ ہی آپ بات کرنا وغیرہ اس لیے صاف ثابت ہے کہ ایسے دیوالیہ وکیلوں نے قومی لیڈری کو بغیر کسی کے خواہش کیے اختیار فرمایا اور مرحوم قوم کے یہاں معنی ہیں وکیل صاحب کے محلے کے بیوقوف ووٹر، جن کو وکیل صاحب نے ہر فرصت میں یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اگر اب کی بار آپ صاحبان نے نیاز مند کو ووٹ عطا کر کے میونسپلٹی میں بھیج دیا تو وہ کر کے دکھادوں گا کہ آج تک کی ''میونسپلیانہ تاریخ'' میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ اب رائے دہندوں میں آج تک جیسے جیسے لائق فائق لوگ گزرتے چلے آرہے ہیں ان سے ہندستان کا ہر صوبہ ہی لہٰذا مزید شرح کی ضرورت نہیں، لیکن اب جو شہر کے چند ہوشمندوں نے دیکھا کہ وکیل صاحب سے اپنی وکالت تو سنبھالی نہ گئی یہ اللہ کا ناکام بندہ اب میونسپل یا مجلس قانون ساز یا کانگریس اور مسلم لیگ میں کیا کرے گا تو ان غریبوں نے جو کچھ کہا اس کو اکبر نے یوں کہا کہ:

پپیہے پکارا کیے پی کہاں

مگر وکیل صاحب بھی تو تھے مدبر، مفکر، فلسفی اور پیدائشی رہنما ہوتے تو یا وکیل ہی نہ بنتے اور جب وکیل ہوگئے تھے تو وزیر عدل و انصاف اور واضع قانون ہی کے رتبہ تک ترقی کر کے دکھاتے اس لیے وکیل صاحب نے ایک کی نہ سنی اور لیڈر بن گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر اور ایسے وکیل

لیڈر صاحب کو مرے ہوئے برسیں گزر گئیں اور ہندستان غریب ایک آزاد ملک ہونے کے عوض آج تک کانگریس اور مسلم لیگ ہی بنا پڑا ہوا ہے، اللہ معاف فرمائے۔

تعلیم جدید چونکہ عقل وعلم سے خالی ہے بجز اس کے کہ ہندستانی لوگ یورپی زبان میں بات چیت کرلیں۔ علم وعقل تو بڑھی نہیں جو اونچی سوچتے اور اونچی باتیں کرتے، اس لیے ہندستانی اور مشرقی علوم و معارف اور شعروادب کے ماہر بھی ان کی یورپ سے پھوٹی ہوئی آنکھوں میں گھوڑے ہاتھی نظر آنے لگے اور ان کے کمالات کی قدر افزائی اور ان کی عملی ہمدردی کے عوض ہندستان کے سرمایہ داروں اور یورپ زدوں نے یورپی زبان کے اصحاب شعر وتصنیف کی قدر اور ان کی کتابوں پر نقد رقوم نثار کیں انتہا یہ کہ آج کل دولت مندوں میں ذی علم وہی سمجھا جائے گا جس کی الماریاں یورپی اصحاب تصنیف کی کتابوں سے آراستہ ہوں، لیکن خاص بات یہ ہے کہ علوم غیر کی کتابیں فراہم کر لینے پر بھی بقلم خود کم عقل ہونے کی وجہ سے ان لبریز الماریوں پر بھی یورپ کے ہر گوشے میں ایسے ہندستانی آج بھی بدھو اور وفاتی خان ہی مانے گئے اور یورپی کتب کے مطالعہ سے بھی ان ہندستانیوں کی زندگی اور ترقی کی لنگڑی گاڑی ایک بانس کے برابر بھی آگے نہ بڑھی۔ ادھر یہ نقصان ہوا کہ ایسے یورپ نواز ہندستانی ذی علم ہندستانیوں کی نظر میں حقیر اور مخالف وطن قرار پا گئے اور ان کی اس یورپ نوازی سے ہندستانی علوم واصناف علوم کو شدید نقصان پہنچ گیا۔ پس اتنے تمام علمی وادبی حوادث کا مرثیہ ذی ہوش اکبر یوں لکھتے ہیں کہ:

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا
پاکٹ میں یہ بیس روپیہ کا نوٹ گیا
گھر پر کھولا تو بس یہی لکھا تھا
کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

صرف ''نوٹ'' کو قافیہ بنا کر ہندستانیوں کی اپنے شعروادب سے جس کوری ہمدردی اور خالی خولی واہ واہ تک کی سرپرستی کو حضرت اکبر نے اس طرح بتادیا ہے شاید ہی طنز ملیح اور ہجو ملیح کا اس سے بہتر کوئی نمونہ مل سکے۔ لہٰذا شرح شعری یوں ٹھہری کہ اکبر کے کندۂ ناتراش محبوب نے ایک دن اکبر

کے اشعار خوب سنے اور چلتے وقت حضرت اکبر کے روپیہ پیسہ رکھنے والے چمڑے کے بٹوہ کو مان کر اس میں مبلغ ایک پرچہ کاغذ رکھ دیا، مگر چونکہ تھا تو اکبر ایسے خان بہادر اور جج ہائی کورٹ کا محبوب اس لیے رہتا ضرور تھا انگریزی وضع کی کوٹھی میں اور سرمایہ داری کی وکالت کا اکثر حصہ چونکہ مال مفت دل بے رحم قسم کا ہوا کرتا ہے اسی لیے وہ تفریحات ہی پر زیادہ صرف بھی ہو رہا ہے اس لیے اکبر قبلہ کو اس پرچہ سے امید بندھی کہ ہو نہ ہو جب میں خود ایک مانا ہوا ذی مقدرت شاعر ہوں تو یہ تو نہیں ہے کہ ڈھائی ڈھائی آنے پر ریڈیو پر اپنی غزلیں گاتا پھرتا ہوں اور شرماتا بھی نہیں۔ ادھر محبوب بھی سرمایہ دار زادہ یا زادی ہے اور ہندستانی سرمایہ دار زادوں کی فضولیاں اور فضول خرچیاں عدالتوں کے ان ناظروں سے دریافت کیجیے جو ان کی فضولیوں پر ان کی کوٹھیوں پر قرقی کا وارنٹ لے کر جاتے رہتے ہیں اس لیے جب یہ طے ہے کہ ہندستانی امرا کی اولاد کو صحیح راستوں پر روپیہ خرچ کرنے کی بہت کم سوجھتی ہے تو ممکن ہے کہ میرے محبوب نے آج بیس ہی روپیہ کا نوٹ میرے بٹوے میں ڈال دیا ہو اور مارے حجاب محبوبانہ کے مجھ سے نہ کہہ سکا اس لیے اس امید اور مسرت سے اس کی کوٹھی سے باہر آئے تو اب تانگے والے کی موجودگی کی شرم سے یہاں بھی بٹوہ کھول کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا اس لیے تانگے والے سے تو صرف اتنا ہی فرماتے رہے کہ "بھئی ذرا تیز چلا مجھے جماعت سے نماز پڑھنا ہے"، مگر بے تابی یہ تھی کہ کب گھر آئے اور بیس روپیہ کے محبوبی نوٹ کو دیکھ سکیں۔ پس خدا خدا کرکے جب گھر میں داخل ہوئے اور بٹوہ کھول کر وہ پرچہ دیکھا جس کو نوٹ سمجھے ہوئے تھے تو اس پر محبوب کے فونٹین پین کی سبز روشنائی سے صرف اتنا لکھا ہوا تھا کہ:

کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

لہٰذا پرچہ رکھا اس نے سے مراد شاعر ہے قوم کا وہ طبقہ جو امیر و رئیس مشہور ہے مگر قدر علم سے اتنا دور ہے کہ بجز واہ واہ کے اپنے ملکی علوم و فنون کی نقد سرپرستی نہیں کرتا۔ اس شرح سے شارحین یورپ نے بھی اتفاق کیا ہے، اسی لیے آج تک ہندستانیوں کے پاس یورپ کے ماہرین مسمریزم اور "ماہرین فرنیچر" تو بہت ملنے آئے مگر ہندستانی امرا اور دولت مندوں سے نہ ملنے آیا تو آج تک کوئی یورپین شاعر و صاحب تصنیف و تحقیق۔

اکبر فصاحت میں تو رئیس الفصحا تسلیم ہی کر لیے گئے ہیں مگر کبھی کبھی ممدوح کا دماغ بھی وہ بلغ العلا بکمالہ بن جایا کرتا تھا کہ بادصف عمر خضاب لاجواب کے بلاغت سو سو بار نثار اکبر تھی۔ چنانچہ ایک ''طنز بلیغ'' ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ:

میں کچھ واقف نہیں آرام دہ اب کون بندر ہے
کہ پُل موہوم امیدوں کا لفظوں کا سمندر ہے

شرح بے حد صاف ہے یعنی بندر کے معنی الٰہ آباد کے ہر گھر میں کود کر روٹی لے بھاگنے والے لال منہ کے بندر نہیں بلکہ بندر سے مراد جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ جس کو تخفیفاً بندر کہا جاتا ہے مثلاً بوری بندر اور اپالو بندر، اس لیے فرماتے ہیں کہ میں اس بات سے تو واقف نہیں کہ جہاز پر آرام سے سوار ہونے کے لیے کون سا بندر اچھا ہے کیونکہ میں تو جس بندر سے بھی سوار ہو کر یورپ کے جس ملک میں بھی گیا وہاں مجھے میرے نفع کے لیے ایک ہی چیز ملی یعنی امید اور دلاسا یا تحریر و تقریر کا ہجوم، اس لیے میرے نزدیک تو اب بندر کیا بلکہ پل اور سمندر تک ایک موہوم سی چیز ہے۔ بقیہ شرح بندری بحق شارح محفوظ۔

ہندستانیوں کی علم دشمنی، جہالت اور بے ہنری سے بھنا کر ایک ''نوآبادیاتی قطعہ'' فرماتے ہیں جس کی داد اگر وزیر ہند کا سارا عملہ بھی دے تو حق داد عطانہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں کہ:

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے
دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے
بارک کوئی کر دے گی عطا ان کو گورمنٹ
یا کالونی اپنی کوئی آباد کریں گے

حضرت اکبر انگریزی داں تھے، لیکن وہ انگریزی الفاظ کو ٹھیٹھ ہندستانی تلفظ میں جس طرح باندھ جاتے تھے اس کی لطافت سے کچھ وہی حضرات لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو مذاق عالی کے ساتھ ساتھ اس چیز سے بھی واقف ہیں کہ ایک زبان داں جب دانستہ طور پر غلط لفظ یا تلفظ استعمال کرتا ہے تو وہ فی الاصل یا اس لفظ کا مذاق اڑاتا ہے یا اس سے مزاح پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ شعر مذکور میں لفظ ''بیرک'' کو 'بارک' باندھ کر جو معنی پیدا کیے ہیں وہ اصل میں اس جگہ کی تحقیر ہے جس

کو بیرک کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اے ہندستان کے ابوجہلو اگر تم نے علوم و کمالات کچھ بھی حاصل نہ کیا اور ''عقل آزاد'' سے اسی طرح بھیڑ بکری کی طرح چرتے پھرے تو پھر حشر یہ ہوگا کہ گورمنٹ تم کو ''کانجی ہاؤس'' میں بھردے گی اور حکومتی عہدوں اور ترقی کی راہوں پر انہی کو قدم دھرنے دے گی جو عقل کے ساتھ علم کے بھی مالک ہوں گے یا پھر یہ کرے گی تو بہ لحاظ انتظام عام وہ آپ ایسے بے علموں کی ایک علاحدہ ہی نو آبادی بسادے گی جہاں تم کو صبح و شام دور سے گھاس ڈال دی جایا کرے گی اور خود ڈبل روٹی کھائے گی اور علم والے ہندستانیوں کو کھلائے گی۔

حضرت اکبر کے اس قطعے میں ایک اشارہ ان ہندستانیوں کی طرف بھی ہے جو غیر علمی حیثیت سے سیاسیات میں یا علی کہہ کر کود پڑے اور علم نہ ہونے کی وجہ سے نتائج و اثرات کو نہ سمجھ سکے اس لیے قانوناً کالے پانی میں آباد ہونا پڑا اور شرمائے وہ ہندستانی جو آپ کی لیڈری کی نالائقی سے واقف تھے۔ پس بارک کے معنی ہیں جیل خانہ، نظر بندی کا گھر، پولیس کی نگرانی، تھانے میں روزانہ حاضری، حبس دوام بعبور دریائے شور یا کم سے کم پولیس والوں کے وہ للہ فللّٰہ دو چار چانٹے جو وہ کسی سیاسی جلسہ کی ہڑ بونگ میں دو چار بے علم رضا کاروں کے انتظاماً رسید کر دیتی ہے۔

مرادی معنی بارک کے ہیں وہ کوتوالی جس کے میدان یا حوالات میں وہ ہندستانی بند کیے جاتے ہیں جو علم کے ذریعہ نہیں بلکہ فرقہ بندی کی عقل آزاد سے بھڑ کر ہندو مسلم فساد میں ڈٹ جاتے ہیں اور لاٹھی چارج کے بعد سیدھے ہوتے ہیں۔

علم کے معنی ہیں وہ ''سیاسی لیاقت پیدا'' کرنا جس کے نہ ہونے کی وجہ سے بعض ریاستوں کو ''کورٹ آف وارڈز'' ہونا پڑا اور جس کے نہ ہونے سے بعض کو کالے پانی جانا پڑا اور بعض کو وارنٹ گرفتاری، حوالات، ضمانت کی ضبطی اور جائیداد کی قرقی کے بعد بھی وزارت کا عہدہ نہ مل سکا، اس لیے شاعر کا کہنا کہ یارو یہ کیسی سیاسی عقل کی آزادی ہے جو ہر قدم پر چانٹے کھاتے ہو آخر وہ علم سیاست و علم قیادت و رہنمائی بھی تو سیکھ لو جس سے ریاست کا کام بھی چلا سکو اور لیڈر بنو تو ملک بھی آزاد کرا سکو اور جو اسی عقلی آزادی سے بغیر سیاسی تدبر اور سیاسی تدبیر کے اگر اسی طرح آپ سالانہ خطبات صدارت لکھتے رہے اور چندے اور جلوس سے قوم کا بھرکس نکالتے رہے تو حشر یہ ہوگا کہ:

بارک کوئی کردے گی عطا ان کو گورمنٹ
یا کالونی اپنی کوئی آباد کریں گے

ایک ''لیڈر توڑ'' اور لیڈر مار شعر فرماتے ہیں کہ:

سخن سازی کی چالوں میں تو خامہ اُن کا شاطر ہے
مگر جو حالت اصلی ہے وہ پبلک پہ ظاہر ہے

بظاہر اس شعر کی شرح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، مگر شارح کے فرائض فکر بہت زیادہ ہیں اس لی شرح یہ ہے کہ یہ شعر اصل میں ان مست ماروں کے لیے ہے جو عوام پر افسری، لیڈری یا امیری اور دولت مندی کے بل پر حکمراں ہیں مگر اپنے غلط، احمقانہ اور فرعونی جوش کے اثر سے اس کی پروانہیں کرتے کہ عوام خود ان کے لیے کیا رائے رکھتے ہیں، اسی طرح کتنے اونچے طبقے کے ہیں جو اپنی خاندانی کمزوریوں، آبرو باختہ کرتوت کی وجہ سے مخلوق میں بے حد ذلیل و رسوا ہیں مگر محض دولت و طاقت کے بل پر عوام کی رائے طعنہ زنی اور عوام کے فیصلے سے بے پروا ہیں، لیکن آخر کار ایسے بے پروا مزاجوں کا جو حشر ہوا وہ یہ تھا کہ ان کی اولاد تک کو قومی قبرستان میں جگہ نہ ملی اور نعش کو غسل دینے والوں نے غسل دینے سے انکار کر دیا، اس لیے اکبر کا یہ شعر اصل میں وہ تنبیہ الغافلین لٹھ ہے جس کی مار ہر ایسے مرد و عورت کو خوشی سے کھا لینی چاہیے جس کی زندگی کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے ''پبلک'' سے ہے۔

لغوی معنی یہ ہیں کہ لیڈر، رئیس، حاکم اور ہر مقتدر شخص کو اپنے ظاہری کردار و گفتار کی شاطرانہ حیثیت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کو اپنے ان عیوب سے بچنا چاہیے جن کا علم ''پبلک'' کو ہو کیوں کہ عوام کے تعلق کو اسی وقت برقرار رکھا جا سکتا ہے جب ان کے عقائد و اصول کا بھی آپ لحاظ رکھیں ورنہ مطلع ہو جائیے کہ یہ جناب کے سرکاری قصائد کی تعریف اور چالوں کا کوئی اثر نہ ہوگا کیونکہ عوام کو آپ کے درون خانہ عیوب کا بھی تو علم ہے اس لیے جس طرح زاہد کے زہد کا اثر اس کے زہد کو پرکھ لینے کے بعد ہوتا ہے اسی طرح جناب کی ایڈیٹری، لیڈری اور تقریری پاکبازیوں سے پبلک آپ کا پیچھا نہ چھوڑے گی جب تک آنجناب اپنا ظاہر و باطن بھی پبلک کے

ذوق کے موافق ٹھیک ٹھاک نہ کرلیں۔ کیونکہ وہی ایڈیٹر، وہی لیڈر، وہی حکام پبلک کے لٹھ اور اللہ کے آزاد بندوں کی ستیہ گرہ اور بائیکاٹ سے بچے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے ظاہر و باطن اور خاندان تک کے حالات عوام کی مرضی کے موافق رکھا ہے۔ چنانچہ اپنے اس شعر کے ثبوت میں خود اکبر عوام کے خیالات کا ایک اور شعر فرماتے ہیں جو یہ ہے کہ:

کہتے ہیں ترک مذہب انسان کو، بات کیا ہے
تحقیق تو کرو تم حضرت کی ذات کیا ہے

مراد یہ ہے کہ عوام ظاہری حشم و خدم اور تحریر و تقریر کے زور سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ وہ خاندان اور کردار کے بلند ہونے سے متاثر ہوتے ہیں۔

لفظ "ذات" بہ معنی قومیت غلط ہے لیکن اکبر نے محاوراتی انداز میں باندھا ہے اس لیے فی سبیل اللہ معاف۔

وہ جو جاپان کی عینک کے بغیر انسانی عروج و زوال کے مبین اسباب کو تاڑ جاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ زندگی کی مشکلات سے جو گھبرائے گا وہ خدا گنج جائے گا اور جو لوگ زندگی کی مشکلات سے پورے عزم و جلال اور استقلال کے ساتھ جنگ کریں گے وہ اپنے اہم مقاصد کو حاصل کر لیں گے، پس اس ضابطہ مسلمہ کو اکبر یوں کہتے ہیں کہ:

مقصود ہے شغل، کوئی مضمون سہی
پیمانۂ مے نہیں تو افیون سہی
ہنگامۂ موت بھی ہے اک جشن اکبر
گر جنگ نہیں تو خیر طاعون سہی

مقصود صرف اتنا ہے کہ ہجوم اور ہنگامے سے دوچار ہونا ہی علامت کامیابی ہے عام اس سے کہ وہ ہنگامۂ جنگ ہو یا ہنگامۂ موت۔ لہٰذا جن بھائیوں نے مرض طاعون کے جوش و خروش کے زمانے میں آہ و نالے کا شور، جنازوں پر جنازوں کے جلوس، قبروں پر قبروں کی کھدائی ختم خوانی اور قرآن خوانی حافظوں اور مساجد کے ساکن طلبا کا فاتحہ کے پلاؤ پر ڈٹ ڈٹ کے حملے دیکھے ہیں وہ

ان طاعونی ہنگاموں کو ''شغل عظیم'' کہہ سکتے ہیں اور اکبر کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ قوم کے لوگوں کو افیونیوں کے رنگ میں بے عمل مکانوں کی دیواروں سے لگا ہوا اور لگا ہوا دیکھنا پسند نہیں فرماتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اگر عظیم فوائد حاصل کرنے کی آرزو ہے تو گھر سے باہر نکلو اور حالات و مشکلات سے ڈٹ کر جنگ کرو حتٰی کہ اگر تم کو ہمت آزمائی کا کوئی میدان بھی نہ ملے تو ورزش ہی کے طریق سے ہاتھ پاؤں کو چست و چاق بنانے کے لیے تم طاعونی جنازوں ہی میں شرکت کر آیا کرو۔ مگر ملا رموزیوں کا مشاہدہ ہے یہ کہ ہندستانی نسل کا مرد مردانہ کردار و سیرت سے اتنا دور ہو چکا ہے جتنا کہ جرمنی سے لکھنؤ دور ہے لہٰذا وہ تو طاعون کے جنازہ سے بھی اتنے ہی ڈرتے ہیں جتنا کہ وہ توپ اور تلوار کے میدان سے۔

علوم اسلامی کے واقفین اور ان علوم مذہبی کے اہم رموز و نکات سمجھنے والوں کو مولوی صاحب کہتے ہیں اسی طرح شریعت و مذہب کے احکام کی خاص تعمیل کرنے والوں کو متقی کہتے ہیں لہٰذا نہ مولوی صاحب ہو جانا کوئی بڑی بات ہے نہ زاہد و صاحب تقویٰ ہونا کوئی بھاری مہم ہے، مگر موجودہ عہد میں حال یہ ہے کہ مولویت کا نصاب وہ رٹ لیتے ہیں جن میں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی اور تقویٰ و پرہیزگاری کا ''مولویانہ ڈریس'' وہ استعمال فرماتے ہیں جن کی نہ اردو صحیح ہندی، اس لیے ایسے سراپا نااہل لوگوں کا حشر اکبر ان الفاظ میں بتاتے ہیں کہ:

کچہریوں میں ہے پُرسش گریجویٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

اب ملایئے حضرت اکبر کے شعروں کو میری مذکورہ شرح سے یعنی اکبر زمانے سے شکایت فرماتے ہیں کہ تو ''علم دین و تقویٰ'' کی قدر نہیں کرتا اور ملا رموزی کا قول یہ ہے کہ زمانہ تو صرف لیاقت کی قدر کرتا ہے لہٰذا جب مولوی صاحب اور شیخ صاحب میں صحیح اور حسین علم دین اور تقویٰ کی فطری ادا ہی نہیں، وعظ و ارشاد میں جان ہی نہیں تو ان کا حلقۂ قدر شبراتی، وفاتی اور خوشیا قسم کے

جاہل لوگوں سے آگے کیسے بڑھ سکتا ہے اور آخر کار جن لوگوں میں ان علوم واصول کی تکمیل ہے ان کو ہندستان کیوں اپنا سردار تسلیم کر رہا ہے، لہٰذا شیخ جی کے بیٹوں سے مراد وہ الو قسم کے صاحبزادے ہیں جو اپنے بزرگوں کے مذہبی علوم وتقویٰ سے صرف اتنا حاصل کر سکے ہیں کہ زبان عربی تو ایک طرف امامت اور مؤذنی کے صحیح مسائل سے بھی واقف نہیں اور تقویٰ کی منزل میں مولویانہ ڈریس کے اندر وہ سب کچھ کرتے پھرتے ہیں جن پر جگہ جگہ کے مذہب پرست لوگ ان پر دانت پیستے ہیں مگر پولیس کے ڈر سے زیادہ نہیں کر سکتے لہٰذا ایسے پیرزادوں، مولوی زادوں، مفتی زادوں کو اپنی جہالت اور غیر شرعی حالات کو دور کر کے کم از کم انٹرنس پاس ہی کر لینا چاہیے کیونکہ اب تو درس نظامی کی تکمیل بھی محال ہی نظر آتی ہے ورنہ پھرتے رہیے مولویانہ ڈریس پہنے اور عین شین قاف کو حلق کی تہہ سے ادا کرتے ہوئے کوئی دمڑی کو بھی نہ پوچھے گا۔

ہندستانیوں میں ''عقل اعلیٰ'' کا چونکہ یکسر ٹوٹا ہے اس لیے ان کے ہر سوچے اور سمجھے ہوئے معاملہ کا معیار بھی پست، کم، غلط اور مضحکہ خیز ہو جایا کرتا ہے البتہ جس طرح زوردار کا جوتا اور کمزور کی زبان چلتی ہے ٹھیک اسی طرح عقلی ضعف سے زبان میں تیزی آگئی ہے۔ معنی صاف ہیں۔ چنانچہ ہندستانیوں کی ہر تحریک کا پٹ کھول کر دیکھ لیجیے عمل میں تو خاک بھی کچھ نہ ملے گا، لیکن اس تحریک کا ڈھنڈورا پیٹنے کے الفاظ کا وہ طوفان ہوگا، وہ آندھی ہوگی اور وہ چمک اور گرج کہ سننے اور دیکھنے والے لرز جائیں گے مگر نتیجے میں چند دن کے بعد اس تحریک کے دفتر کا ''سائن بورڈ'' اس کے سکریٹری صاحب کی نماز کا تخت بنا ہوا مل جائے اور تحریک گنج شہیداں میں۔

بالکل اسی عقلی ضعف کے اثر سے ہندستانیوں نے بے شمار کھیل اور آوارگی کے اطوار اور مشاغل یہ کہہ کر اختیار فرمائے کہ ان کے پردے میں خدا نے چاہا تو ہم جرمنی فتح کر کے دکھا دیں گے جیسا کہ ہاکی اور فٹ بال کے فوائد بیان کرتے کرتے کئی ماسٹر اور پروفیسر مر بھی گئے مگر ہندستانی طلبا صحت اور غلامی میں جہاں تھے وہیں دھرے رہے۔ پس ایک زمانے میں اسی ٹھاٹھ باٹ اور اسی شان وشکوہ سے مسلمان بھائیوں نے ''کبڈی'' کے کھیل کی تحریک فرمائی تھی اور دعویٰ یہ تھا کہ اس پردے میں، ہم جرمن گیر اور فرانس توڑ سپاہی تیار کر لیں گے مگر اصلیت جو کچھ تھی

اس کوالٰہ آباد میں اکبر نے یوں تاڑ لیا تھا کہ:

ملتا نہیں گوشت خیر ہڈی ہی سہی
کچھ کھیل ضرور ہے پھسڈی ہی سہی
موقع جو پریڈ پر قواعد کا نہیں
چندہ تحصیل کر، کبڈی ہی سہی

مطلب صاف یہ ہے کہ سپاہیوں میں بھرتی ہو کر کچھ نام کرنے سے تو دم نکلتا ہے اس لیے اپنے ''زنانہ پن'' کو چھپانے کے لیے کبڈی ایسے بے کار اور منہ توڑ کھیل کو سپاہیانہ مشق کہہ کر ہم عقلمندوں کو کیوں اور ذلیل فرماتے ہو۔

میں تو سمجھتا تھا کہ میرے کے سَرے ہی سے نظر تیز ہوا کرتی ہے مگر اکبر کو خدا نے جو بال سے بھی سوا مہین نظر عطا فرمائی تھی تو بعض اوقات تو وہ اتنی ہی باریک چیز دیکھ لیتے تھے کہ داد دینے کے لیے گھبرا کر سوچنا پڑتا ہے کہ ماشاء اللہ کہیں یا معاذ اللہ۔ چنانچہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں، ارشاد ہے اور کسی اسکول میں گھس کر ارشاد ہے کہ:

وحشت نئی روشنی سے آخر کو گھٹتی ہے
فکر روزی میں شیخ کی طبع ڈٹی
کرکٹ، جمناسٹک، ٹریننگ کالج
مولنٰا سیکھتے ہیں بالفعل نٹی

ان اشعار میں بے حد گاڑھی بلاغت اور نشتر کی نوک سے بھی تیز طنز ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات پیدائشی کم عقلے ہوا کرتے ہیں اس لیے ان کو نہ اپنا ہوش رہتا نہ زمان و مکان کا۔ پس ان ایسوں میں ایسے حضرات بھی ہیں جو بی۔ اے پاس فرما کر مولویانہ سج دھج میں اسکولی ملازمت فرمالیتے ہیں، بعض نوجوان انگریزی طلبا کو دیکھا گیا ہے کہ وہ انٹرنس پاس کرنے اسکول میں گئے ہوئے ہیں مگر ضعف عقل کے اثر سے تہمد نما پاجامہ اور عبا نما کرتا پہن کر انگریزی اسکول میں سب کا مذاق بنے رہتے ہیں، لیکن خواہ آپ مولوی صاحب ہوں یا مفتی صاحب جس رنگ کے مدرسے میں داخل ہوئے ہیں اس کے قواعد کی تعمیل تو کرنا ہی پڑے گی۔ لہٰذا کرکٹ، جمناسٹک اور دوسری

تربیت جسم کے جو یورپی اعمال انگریزی مدارس میں شرط لازم بنائے گئے ہیں ان کی ہر تعمیل و بجا آوری ہر اُس شخص پر فرض ہے جو اس مدرسہ سے متعلق ہو۔ عام اس سے کہ وہ وضع قطع کے اعتبار سے دیوبندی ہو یا تھانوی، اس لیے اس وضع کے اساتذہ اور طلبا کو اکبر نے جب کرکٹ، جمناسٹک اور دوسرے کھیلوں میں دیکھا تو ان لوگوں کی مولویانہ وضع پر یہ کھیل ایسے ہی معلوم ہونے لگے جیسے کوئی نٹ نیا روپ بھر کر اچھل کود کے کرتب دکھا رہا ہو اس لیے اکبر کا مقصد یہ ہے کہ اے ایسے بیہوش لوگو! جب تمھاری وضع تہمدی ہے تو اعمال و مشاغل بھی ''تہمدی'' ہی رکھو۔

دوسرا طنز وہ ہے جو کو میں نے نشتر کی نوک سے باریک کہا ہے یہ طنز ان مسلمان مدارس پر جن میں خالص دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مشرقی، لیکن ایسے مدارس کے بانیوں میں ایجاد و اختراع اور جدت کی عقل نہیں، اس لیے باوجود یکہ انھوں نے مدارس تو قائم کیے مذہبی و مشرقی مگر ان مدارس کے طلبا کی تندرستی کے لیے کھیل بھی مشرقی ایجاد نہ کر سکے نتیجہ یہ کہ طلبا تو خالص مذہبی و مشرقی سج دھج کے اور ورزشیں یورپ والوں کی ایجاد کی ہوئی، اس لیے جب کسی دینی مدرسہ کے لمبی لمبی زلفوں والے کوئی طالب علم صاحب ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑی بن کر میدان میں تشریف لاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خضر علیہ السلام نے سوٹ پہن لیا ہے، خصوصاً ایسے مدارس کے وہ افغان طلبا اور بنگالی طلبا تو دیکھے نہیں جاتے جو طالب علمی کے نوجوان عہد میں بھی خواجہ حسن نظامی دہلوی ایسے سر کے لمبے لمبے بال اور پٹے رکھ کر بھی طوفان اور آندھی کے مارے ہوئے اور گھبرائے ہوئے انسان کی طرح ہاکی اور فٹ بال میں شریک اور سرگرم نظر آتے ہیں لہٰذا اکبر کو ایسے ہی حلیے کے لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ اے مولوی نما حضرات عقل پر کرم فرما کر یا اپنی وضع کو اتنا اونچا نیچا کر لو کہ کم سے کم اس عہد کے مسلمان تمدن کے آدمی معلوم ہو یا جو مولویانہ عبا ہی ضروری ہے تو پھر خدا کے لیے یہ فرنگی کھیل اختیار نہ فرمایئے کیونکہ کھیل اور وضع کے تصادم سے مذاق نفیس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے اور جناب کے یہ ورزشی کرتب اس وضع پر اچھی خاصی ''نٹی'' معلوم ہوتی ہے جو حد درجہ نیچے طبقوں کی تفریح کا ایک حصہ ہے۔ پس شرح یہ ہوئی کہ اس طرح تو ایسی وضع قطع کے لوگ انگریزی پڑھنے سے چڑتے تھے لیکن جب بغیر انگریزی کے روزی محال ہوگئی تو ان غریبوں نے انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی مدارس میں شرکت کی مگر پیدائشی اور خاندانی قلت عقل کے باعث وضع قطع وہی باقی رکھی جو اب امامت کے وقت قدرے موزوں کہی جاتی ہے اور کھیل وہ

اختیار کیے جو عمومیت سے یورپی یا جدید ہندستانی تمدن کی وضع کے لوؤں پر بچ گئے ہیں، اس لیے آپ کے حلیے پر ایسے کھیل کھیل محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی نٹ بھی آج کرکٹ کھیل رہا ہے یا جیسے کسی پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے داڑھی پر ہیٹ اوڑھ لیا ہو۔

اکبر کی باریکی بینی اور باریک بینی سے زیادہ نفسیات اور فطرتِ انسانی کی واقفیت اور نازک تک مسائل کو ایک ایک شعر میں کہہ گزرنے کی خداساز قابلیت ملاحظہ ہو:

مری فغاں پہ مس ناشناس بول اٹھی
کہ بابوؤں میں تو عادت ہے غل مچانے کی
بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر
یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی

معاذ اللہ کیا داد لکھوں ان اشعار کے نازک تر مضامین کی، مثلاً اوپر کے شعر میں ''مس ناشناس'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ نئی یا ناواقف یورپی لونڈیا بلکہ ''مس ناشناس'' سے مراد ایسی یورپی لونڈیا ہے جو ہندستانی مردوں کے عشق و اظہارِ عشق کے طور طریقوں اور اشاروں کنایوں سے واقف نہیں اور نہ ان کے آہ و نالے سے بظاہر واقف۔ اسی طرح ہندستانیوں نے اپنی دماغی پستی کی وجہ سے جتنی کثیر تعداد میں خود کو ''بابو'' ہو کر دکھایا ہے اتنا موجد و مدبر نہ ہو سکے اس لیے یورپی لونڈیا کی نظر میں اکبر کی وضع وقطع ایک ہندستانی بابو کی سی جو آئی تو اس نے اس بے خبری کے عالم میں ان کو بابو سمجھا اور ان کی فغانِ عاشقانہ کو ایک بابو کی شور کرنے والی پیدائشی عادت۔ اس لیے اس نے اکبر کی ''روتی ہوئی درخواست عاشقی'' کی کوئی پروانہ کی مگر حقیقت میں اکبر نے عورت کے محبوبہ ہونے کے زمانے کی جو ''عورتانہ ترکیب'' اس شعر میں بتادی ہے خدا سے دعا ہے کہ وہ اکبر کو پھر زندہ کر دے۔ یعنی بظاہر باپ دادا کی عمر کے اکبر صاحب نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یورپی لونڈیا سمجھ تو گئی ہے سب کچھ مگر چونکہ عورت کا اُلٹا سیدھا ابھی تک زیرِ تحقیق ہی ہے لہٰذا عورت کے عاشقانہ معاملات کو سمجھ لینے کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ ہر بات الٹی کرتی ہے اور ہر اعلان و اشارہ اوندھا اور اس کے اس پیدائشی الٹے پن کا راز ملا رموزی کی کتاب ''ملکات جنسی'' میں ملاحظہ فرمایئے لہٰذا

''مس ناشناس'' کے معنی ہیں اصل میں ''مسل بالکل شناس'' اور عاشق کی فغاں کو خوب سمجھنے والی یورپی لونڈیا۔ یہ وہ نازک ٹُر ہے محبوب عورت کے طور طریقوں کے اُلٹے پن کا جس کو اکبر نے ہس ناشناس سے دور رہ کر بھی بھانپ لیا۔ دوسرا مصرع ہے:

بابوؤں میں تو عادت ہے غل مچانے کی

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ عاقل آدمی کی پہچان ہے کہ وہ کام زیادہ کرتا ہے اور بات کم، لیکن بیوقوف کی پہچان یہ ہے کہ وہ کام نہیں کرتا بلکہ باتیں زیادہ کرتا ہے اور وہ بھی زور شور سے، اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر چلے جایئے جہاں ایک ریل سے پانچ سو انگریزی سولجر بھی اگر اتریں گے تو پلیٹ فارم کے باہر بھی ان کی باتوں میں آواز نہ آئے گی، لیکن ہر ریل گاڑی سے جس وقت پلیٹ فارم پر ہندستانی صاحبان اترتے ہیں تو مارے شور کے باہر کے تانگوں تک کو سر پر اٹھا لیتے ہیں جو ان کے ضعف دماغ کی طبی دلیل ہے۔ اور دوسرا مطلب اس مصرع کا بے حد علم افزا ہے یعنی جب کوئی یہ معلوم کر لیتی ہے کہ فلاں مرد مجھ سے محبت کرتا ہے تو پھر اس عورت کے دماغی عقائد اس مرد کے لیے بے حد خاص ہو جاتے ہیں۔ مثلاً: عورت سمجھتی ہے کہ اب چاہے میں اس مرد کا گوشت کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاؤں تو بھی یہ میری محبت سے توبہ نہ کرے گا۔ مثلاً: عورت سمجھتی ہے کہ میں جب تک اس کی وفا کو آزما نہ لوں اس وقت تک اس کی محبت کے قبول کر لینے کا اشارہ تک نہ کروں اور اس حمق میں مبتلا ہو کر محبوب عورت اپنے عاشق کو اس قدر طویل اور شدید حالات سے گزارتی ہے کہ اگر خود اس عورت کو آزمائش کی ان سختیوں سے گزارا جائے تو مسماۃ کو چھٹی کا کھایا یاد آجائے۔ اسی طرح اگر مرد اس کے سامنے اپنی تکالیف اور ہجر و فراق کی داستان سنائے تو اس کو اس قدر کم اور معمولی سمجھتی ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ مقصد اس حرکت سے یہ ہوتا ہے کہ میری محبت کی وجہ سے اس کو جو تکالیف ہو رہی ہیں ان کو جتنا زیادہ کہا جائے گا ان سے میرے لاجواب حسن کی تصدیق ہوگی اور لوگ مان لیں گے کہ واقعی غضب کی حسین عورت تھی جب ہی تو فلاں ملا رموزی صاحب اتنے طویل عرصہ تک شدید سختیاں جھیلتے رہے مگر اس کی محبت سے منہ نہ موڑا۔ پس عورت کا یہ وہ ''عورتانہ حمق'' ہے جس کی شدت سے مرد کو اپنا مخالف بنا لیتی ہے۔ یعنی ابتدا میں حد سے زیادہ ناز اور نخرے سے کام لیتی ہے۔ طویل تر آزمائشوں میں مبتلا کرنے سے

خوش ہوتی ہے اس لیے جب مرد کے قبضے میں آتی ہے تو وہ بھی اتفاقاً اس کو جب دُکھ دیتا ہے تو اس طرح فریاد کرتی ہے گویا یہ تو پیدائشی بھولی بھالی تھی مگر مرد پیدائشی ظالم ہے۔ پس اکبر کا آخری مطلب یہ ہے کہ گو میرے اظہار فریاد کو مس صاحبہ نے پلک جھپکتے ہی تاڑ لیا ہے مگر ''عورتانہ عادت'' کی وجہ سے اس کو ''بابوؤں کے شور کی عادت'' کہہ رہی ہیں تاکہ لوگ طعنہ نہ دیں کہ مس صاحبہ تو غضب کی تاڑنے والی ہیں۔

دوسرا شعر بھی ایسے ہی نازک طنز کا حامل ہے، مراد یہ ہے کہ برہمن ناقوس کے بجانے میں اس لیے حق بجانب قرار دیا گیا کہ یہ چیز اس کا جز مذہب ہے یا ضابطۂ مذہب، لیکن شیخ جی جو ناقوسی برہمن کے مقابل ''بگل چی'' بن کر رہے ہیں سو یہ ان کا مذہب اور ضابطہ مذہب نہیں بلکہ ''شوق'' ہے یا مقابلہ کا جوش اور بس۔ لہٰذا امر حقیقت بھی یہ ہے کہ مسلمانوں نے کسی جگہ بھی ہندو مسلم فساد کے موقع پر یہ جھگڑا نہ کیا کہ ان کو بھی کسی مندر کے سامنے سے بینڈ باجا اور تاشے بجاتے ہوئے گزرنے دو، اس لیے اکبر کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح ہندو بھائیوں کے ناقوس سے مسلمان شاکی نہیں اسی طرح اگر کبھی کوئی مسلمان صاحب کسی مندر کے سامنے باجا بجانے میں مست نظر آئیں تو اس کو ان کا ذاتی ''شوق'' ہی تصور فرمائیے گا۔

ذرا پہلے غور سے فرمائیے کہ بین الاقوامی مسائل خصوصاً یورپ ایسی شہرۂ آفاق اقوام کے دوش بدوش مسلمانوں کی عزت و وقعت کے مسئلہ کو ''میاں کلو'' کے نام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے اتنے عظیم الاثر روابط و مراتب کے متعلق کلو ایسے نام کا مسلمان کیا کر سکتا ہے؟ مگر اکبر کی شعری قدرت ملاحظہ ہو:

فقط مذہب سے تم میں عزت و وقعت کی ہے یہ بو\
وگرنہ اور کیا نسبت، کجا ولیم کجا کلو

ملاحظہ فرمایا آپ نے قیصر ولیم جرمنی کے ساتھ کلو کا جوڑ۔ مطلب یہ ہے کہ یورپی اقوام نے سب سے پہلی مرتبہ مسلمان کو رتبہ جہاد و سلطنت آرائی کے عمل سے پہچانا، لیکن ان کی تحریک جہاد کے آگے مذہب اسلام کا مقصد و علم تھا، اس لیے بعد میں مسلمانوں کی کامیابی میں ان کی مذہبی

روح ہی کام کرتی رہی اور یورپی اقوام ان کی عزت و بزرگداشت میں مستعد رہیں۔ اسی طرح
مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں بھی جس چیز نے ان کو تمام دنیا کی اقوام میں معزز و سربلند رکھا وہ بھی
ان کا وہ عظیم انصاف تھا جو انھوں نے قرآن و حدیث سے کیا جس کی عظمت و واقعیت سے آج بھی
محققین مغرب قائل ہیں، لیکن اب جو مسلمانان کو اکبر نے دیکھا کہ وہ قرآن ایسی سائنس توڑ کتاب
کے عوض سنیما اور فلم سے آدابِ زندگی سیکھ رہے ہیں تو اس بالغ نظر مسلمان کے سامنے مسلمانوں
کے عروج کی تاریخ آ گئی اور اس نے بی۔اے زدہ سے لے کر ہندستان کے کلوا تک سے کہہ دیا کہ
تمھاری عزت کی بقا صرف اسلامی اصولِ زندگی سے ہے نہ کہ یورپی نقالی اور سنیما کے تماشوں
سے، اس لیے ''کجا ولیم کجا کلو'' سے مراد یہ ہے کہ اگر تمھارے ساتھ اسلامی ضوابط قومیت نہ ہوتے
تو تم مغربی اقوام کی نظر میں آج تک کس طرح معزز رہتے لہٰذا ولیم کے معنی تمام غیر مسلم اقوام اور
کلو کے معنی ساری مسلمان قوم۔

اب اس کا سبب مرحوم ہی بتا سکتے تھے کہ آخر یہ مسلمانانِ عالم کو نام کے لیے جناب گرامی کو
''کلو'' ایسا کنجڑے قصائیوں کی برادری ہی کا نام کیوں ملا اور کیوں نہیں جناب نے مسلمان قوم کو
خاقان اور سلطان کے قافیے سے سرفراز فرمایا؟ البتہ شارح کی حیثیت سے مرحوم کی جانب سے
جواب دہی کی جو ذمہ داری مجھ نیاز مند کے سر ہے اس کے اثر سے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ
شعر حضرت اکبر نے اس زمانے میں کہا ہے جب مسلمان صاحبان اپنی بے ہنری، جہل مرکب اور
جملہ خواص کے اعتبار سے خاقان اور سلطان کے مرتبے سے گر خود ہی کلو اور بدھو کی زندگی کے
قابل ہو چکے تھے اس لیے اکبر نے کیا غلط کیا جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو ''کلو'' ہی کے نام سے
مخاطب کیا ورنہ جواب دیجیے کہ کیا اندلس اور قسطنطنیہ سے لے کر دنیا کے ہر خطے کی اسلامی حکومتیں
اپنی پچھلی سربلندیوں کو یا کھو چکیں یا کم کر چکیں کہ نہیں؟ اس لیے اس عظیم الاثر مسلمانی ادبا اور تاریخی
تفصیلات کو اگر ایک عالی دماغ شخص نے الٰہ آباد میں صرف ایک شعر میں کہہ دیا تو کمال کلام
و وسعتِ نظر ہے یا فقط کسی امرود فروش کلوا سے مذاق؟

◆◆◆

مشاہیرِ بھوپال

از

ملا رموزی

محلّہ چھاؤنی ولایتیان، بھوپال

اس جلد میں صرف محلّہ چھاؤنی کے مشاہیر کے حالات ہیں، کیونکہ ہر محلّہ کے مشاہیر علاحدہ علاحدہ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

احمد نصیر

ناشر کتاب

فہرست

- مقدمہ — احمد نصیر انصاری 517
- چھاؤنی ولایتیان 521
- علامہ، حافظ، مولوی محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی مرحوم 525
- مفتی عبد الہادی خاں صاحب 529
- ملا رموزی — موجد گلابی اردو 533
- سردار خاں روشنائی کے موجد 543
- محمد سعید خاں عرف شمو خاں نقل و بذلہ سنجی کے ماہر 545
- محمد حسین خاں کبوتر کی پرواز کے موجد 549
- مقفی گفتگو کا موجد 553
- استاد عثمان پہلوان طوفانی کشتی کے ماہر 555
- حفاظ کا مرکز 561
- چھاؤنی کا پہلا لکھ پتی انصاری: 563
  سیٹھ حافظ حاجی محمد عبد الرحمٰن عرف حافظ کلا صاحب مرحوم
- احمد بشیر انصاری 569
- احمد نصیر انصاری 573

مقدمہ

از احمد نصیر انصاری

ہندستان کے شہرۂ آفاق ادیب اور بھوپال کے مایۂ نازش فرزند حضرت استاذی ملا رموزی و"فاضل الٰہیات" نے اپنی تمام عمر ہندستان اور عالمِ اسلام کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں ان کا شکر و صلہ ہندستان اور نوجوانِ ہندستان کے ذمہ ہے۔ البتہ بحیثیت پشتینی بھوپالی کے مجھے یہ بتادینا ہے کہ اردو کے ذریعہ موصوف نے ہندستان کی جملہ سیاسی، معاشی، ادبی اور علمی خدمات میں جو طویل اور لگاتار حصہ لیا ہے اس میں موصوف کا یہ کمال ہی ان کے عالمگیر شہرت کا باعث رہا ہے کہ وہ جو سوچتے ہیں نادر اور جس طرح لکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں اس کے وہ خود موجد ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگست 1945 میں ممدوح نے بھوپال کی مافوق الفطرت صحت بخش آب و ہوا کی تاثیرات پر غور کرنے کے سلسلہ سے یہاں کے طویل العمر اور ایک صدی سے زیادہ عمر و صحت پانے والوں کا جو سلسلہ اخبار "ندیم" بھوپال میں شروع فرمایا اس کی قیمت اور ندرت وجدت کے پیش نظر محترم نمائندہ رائٹر کمپنی نے اس سلسلہ کو تمام دنیا خصوصاً یورپ اور امریکہ تک پہنچایا، جہاں اس سلسلہ کے مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ علاوہ ریڈیو کے شہرۂ آفاق اخبار "ڈیلی کرانیکل لندن" وغیرہ تک میں یہ سلسلہ شائع اور مقبول ہوا۔

گویا عہد حاضر میں پبلک کے رُخ سے یہ پہلا بھوپالی صاحب تحقیق تھا جس کی دماغی کاوش سے میرے وطن عزیز بھوپال کی عظمت کا سلسلہ چار دانگ عالم میں پہنچا۔ اب مزید خوش قسمتی سے رائٹر کمپنی نے اس سلسلہ کی علمی عظمت کے تحت نومبر 1945ء میں اس سلسلہ کے افرادِ صدسالہ کی دوبارہ پرسش کی اور اس سلسلہ سے رائٹر کمپنی نے یہ انصاف نوازش میرے محلے چھاؤنی ولایتیان کو خصوصیت سے امتیازی حیثیت سے مخاطب کیا، جس کو میں اخبار ''ندیم'' بھوپال مورخہ 16 نومبر 1945 سے بطریق ثبوت نقل کرتا ہوں، جس کی اصل عبارت یہ ہے:

''بھوپال میں صدسالہ لوگوں کا محلّہ''

''بھوپال-10 نومبر 1945

صدسالہ لوگوں کا محلّہ جو بھوپال میں غالباً دنیا کا سب سے گرم محلّہ ہے۔ آج اپنے مشہور و معروف باشندگان کی وفات پر غمگین ہو رہا ہے۔ یہ اموات بھوپال کے محلّہ چھاؤنی میں بیون بی صاحبہ اور معروف شاہ خاں صاحب کی علی الترتیب 122 سال اور 110 سال کی عمر میں واقع ہوئیں۔

مرحومین نے اپنی طویل عمر کو اس چھوٹے محلّہ کی حدود میں بسر کیا، جن کے سیدھے سادھے دورہائشی حصے تقریباً ایک درجن صدسالہ عمر والے لوگوں کی رہائش اور دوسرے ایک درجن صدی کے قریب عمر پانے والے لوگوں کی رہائش کے لیے مشہور ہیں۔ اس محلّہ کی نمایاں شخصیتوں میں سے چاند بی بی پہلی صدسالہ ضعیفہ ہیں جن کی عمر 134 سال ہے۔ ان کی پیدائش اس وقت کی ہے جب کہ انگلستان کی عنانِ حکومت جارج سوئم کے ہاتھ میں تھی اور پہلے لارڈ منٹو ہندستان کے گورنر جنرل تھے۔ چاند بی بی صاحبہ نے 132 سال کی عمر میں اپنے 75 سالہ صاحبزادہ کی ہمراہی میں حج اور زیارت خانہ کعبہ کا شرف حاصل کیا۔ چاند بی بی صاحبہ جن کی والدہ ماجدہ کی عمر 115 سال تھی، ان کے چھوٹے بھائی شیخ سردار صاحب 113 سالہ ہیں۔ شیخ سردار جو باعتبار پیشہ مہاوت ہیں، اب تک نہایت ذوق و شوق سے اس روایت کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنے ہاتھی سے دریائے نربدا کے پہلے پُل کو عبور کرا کر ایک سو پچاس روپیہ انعام لیا

تھا۔ دوسری قابلِ ذکر شخصیت اسی محلّہ میں امراؤبی کی ہے، جن کی عمر اس وقت ایک سو دس سال ہے، جنھوں نے مرض پلیگ اور مرض ہیضہ کے مہلک حملوں سے حیات تازہ پائی اور 108 سال کی عمر میں دو زبردست کاربنکل پھوڑوں سے بغیر طبی امداد کے نجات حاصل کی۔ ان میں سے زیادہ تر صد سالہ شخصیتیں اب بھی طبی نقطۂ نظر سے بالکل صحت مند ہیں اور ان میں سے سب بلا استثنا ظاہر کرتے ہیں کہ مخصوص غذا یا ورزش سے ہمیشہ احتراز کیا ہے''۔ (رائٹر)

اس موقع پر بھوپال کے ''پیرانِ صد سالہ'' کے محقق اور مکتشف ملا رموزی نے ''ندیم'' کے نمائندہ کو حسب ذیل انٹرویو دیا ہے:

''نسلی تندرستی اور خصوصی انسانی صحت کے حیرت ناک نمونے جس تعداد میں بھوپال نے پیدا کیے ہیں اس پر سائنس اور علمی دنیا کی مبارکباد بھوپال کو حاصل ہونی چاہیے۔ میری اس تحقیق سے انسانی قویٰ جسم اور نظام صحت کا غایت درجہ ترقی یافتہ جو ذخیرہ بھوپال کے سو سال سے زیادہ عمر والے افراد سے حاصل کیا جاسکتا ہے وہ طبی سائنس کے لیے ایک دعوتِ تحقیق ہے، جس پر کسی وقت علمی اور طبی دنیا متوجہ ہوگی''۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ:

''میں کارکنانِ رائٹر کمپنی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری اس علمی تحقیق کو تمام دنیا تک پہنچایا۔ ان حضرات کی بہترین تندرستی والی اولاد اور مزید اتنی ہی عمر کے بھوپالی ابھی اور باقی ہیں، جن کو میں کتابی صورت میں اپنے علمی مقدمہ کے عنقریب پیش کروں گا''۔

یہ ہے رائٹر ایسی عالمگیر خبر رساں کمپنی کی وہ تحریر جو دنیا کے ہر حصے میں شائع ہوئی۔ ہندستان کے تمام انگریزی، ہندی اور اردو کے اخباروں میں یہ تحریر و اطلاع شائع ہوئی۔ اب چونکہ اس تحریر سے میرے وطن کو عموماً اور میرے محلّہ کو خصوصاً ایک عظیم علمی و تاریخی امتیاز حاصل ہوا جس کا ذریعہ پبلک کارکن حضرت ملا رموزی تھے۔ لہٰذا میرے وطن پسند جذبۂ احترام و عقیدت نے تقاضا کیا کہ میں بھوپال اور اپنے محلّہ کے اس لائق احترام علمی محسن سے درخواست کروں کہ اسی

طرح کا کچھ اور دیجیے جو آج کے بیدار و جوان بھوپال کے ذریعہ یہاں کی آنے والی نسلوں تک پہنچے تاکہ وہ اپنے شاندار اور باکمال اسلاف کے شاندار کارناموں اور کمالات کے عین مطابق کل خود بھی شاندار اور باکمال ہونے کی ترغیب پائیں۔ پس میری اس درخواست پر قبلہ ملا رموزی صاحب نے وہی کیا جو ان ایسے عدیم المثال محقق کے شایانِ شان تھا، اس لیے موصوف نے منظور فرمالیا کہ وہ ایسے تمام بھوپالیوں کے حالات قلمبند کردیں گے جن میں دماغ وعمل کی کوئی امتیازی خصوصیت ہو، مگر پبلک ذرائع کی قلت وکوتاہی سے وہ شہرت عام نہ پاسکے اور اس سلسلۂ تحریر کی ترکیب یہ بتائی کہ ہر محلے کے ایسے باکمال اور پیدائشی بھوپالیوں کے سلسلہ کو اسی محلہ کے نام سے منسوب کیا جائے تاکہ اہلِ محلّہ کا افتخار وشرف مجموعی تاریخ بھوپال میں بھی واضح رہے۔ لہٰذا میں بھوپال کے جملہ محلوں کے بزرگوں اور بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے محلے کے اصحابِ امتیاز واہلِ کمال کے اسی انداز کے حالات حضرت ملا رموزی صاحب کو پہنچادیں جس طرح کے حالات موصوف نے اس جلد میں بہم پہنچائے ہیں۔ ایسے تمام حضرات کے نام بھی اس ہمیشہ رہنے والے تاریخی سلسلہ میں پیش کردیے جائیں گے جو اس سلسلہ کی تکمیل میں ملا صاحب کا ہاتھ بٹائیں گے۔ نیز یہ سلسلہ اضلاع بھوپال کے اصحابِ کمال کے لیے بھی ہے لہٰذا اضلاع بھوپال کے باشندے بھی حصہ لیں۔

12 مارچ 1946

نیاز مند

احمد نصیر انصاری

صدر جمعیۃ انصار، محلّہ چھاؤنی ولایتیان، بھوپال

ناظم نشرواشاعت دائرۂ علمیہ، بھوپال چھاؤنی

چھاؤنی ولایتیان!

وہ نام رکھنے والا خوش بخت وخوش نصیب اور ذہین و بالغ نظر مانا جاتا ہے جو کسی نام کے وضع کرتے وقت اس میں معنویت اور بلندی کا لحاظ رکھے اور نام کو 'مہمل' بے معنی اور پست نہ ہونے دے، لیکن اس کے لیے خود نام رکھنے والے کا ذی علم اور بالغ نگاہ ہونا ضروری ہے۔ بے معنی اور مہمل ناموں سے خود نام رکھنے والوں کی ذہنی بے مایگی اور پستی کا پتہ چلتا ہے اور نام کی شوکت و معنویت سے نام رکھنے والے کی رفعتِ نگاہ اور ذہنی حسن کا اندازہ ہوتا ہے اس لیے خوش ہوں کہ میرے محلے کے نام میں اتنی نمایاں معنویت ہے کہ شرح وتسمیہ کی ضرورت نہیں۔

لفظ ولائتی اردو والوں کا وہ عرف عام ہے جو غیر ہندستانی کے لیے آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ عربی لفظ ولایت سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ملک کے بھی لیتے ہیں۔ اہلِ فارس نے صوبے کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ چھاؤنی کا لفظ بھی واضح ہے یعنی وہ قطعۂ زمین جس میں فوج رہے۔ چھاؤنی کی ابتدا کے وقت بھوپال کی قدیم آبادی انگریزوں کی کثرت سے اگر دو چار ہوتی اور اس محلے میں اتنے ہی انگریز آباد ہوتے تو وہ ان کے لیے بھی لفظ ''ولائتی'' استعمال کر سکتی تھی، لیکن چونکہ اس وقت یہاں افغانستانی آئے، اس لیے ان کو بھی ولائتی کہا گیا۔

فاتح بھوپال سردار نواب دوست محمد خاں غفران مکان کے افغانستانی لشکروں اور انکے

صاحبزادوں کے افغانستانی لشکری، سردار اور ان کی اولاد کے جو سلسلے بھوپال کے مختلف اضلاع اور قطعات میں آباد ہوتے جارہے تھے انہی کے سلسلے کی ایک کڑی محلہ چھاؤنی ولایتیان کی آبادی ہے۔

یہ علاقہ دارالملک بھوپال کی مسجد جامع سے جانب مشرق تقریباً دو دو قدم بعد سے شروع ہوتا ہے جس کی حدود اربعہ یہ ہیں:

مشرق میں پاترہ ندی تک، مغرب میں کملا کشنا تیلی کے مکان تک جنوب میں اسلام پورہ تک اور شمال میں نوبہار کے کھیتوں تک وسط میں 1946 میں عجائب خانہ کی سنگین عمارت ہے۔ اس کے اندرونی علاقہ میں مسجد باجوڑیاں کے مغربی رُخ پر ایک پوری پٹی مومن پورہ کے نام سے ہے جو قدیم ایام میں حدودِ عجائب خانہ کے اندر مسجد شہامت خان کے محاذ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مومن پورہ محض اس لیے مشہور ہوا کہ اس میں کپڑے کی صنعت کا کام کرنے والے مسلمان آباد ہوئے۔ اس آبادی اور چھاؤنی کی افغان آبادی میں بجز کاروباری فرق کے کوئی دوسرا فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلامی مسلک وعقیدہ کی رو سے چھاؤنی کے تمام پٹھان اہلِ سنت والجماعت اور مومن انصار بھائی بھی اہلِ سنت والجماعت۔

چھاؤنی کا یہ علاقہ بھوپال کے تاریخی جنگی میدانوں کا وسط ہے۔ یعنی اس کے ہر چہار سمت بھوپال کے تاریخی معرکے ہوئے ہیں، جن میں ہزاروں فوجیوں اور سرداروں نے دونوں مقابلے کیے ہیں۔ مثلاً چھاؤنی کے جنوبی رخ سے ملا ہوا محاذ جنگ جگوا کھوا کا محاذ جنگ تھا، جس کا جنوبی سرا موجودہ ہاتھی خانے کی عمارت تک تھا۔ چھاؤنی کے مشرقی رُخ پر گوبند پورہ کا وہ عظیم میدان جنگ ہے جس میں 1790 میں ستر ہزار فوج معرکہ آرا ہوئی تھی اور اسی معرکہ میں وزیر محمد خاں اور غوث محمد خاں نے بالا راؤ کو شکست دی تھی، جو چالیس ہزار فوج سرونج سے لے کر آیا تھا اور حملہ آور ہوا تھا۔ چھاؤنی کے غربی حصہ میں اتوارہ دروازہ سے منگل وارہ تک وہ محاذ جنگ تھا جس کے سرے پورے چھاؤنی کو احاطہ کرتے ہوئے نوبہار کے میدانوں کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھے۔ اس محاذ پر یعنی نوبہار کے میدانِ جنگ میں کریم خاں پنڈارے کو وزیر محمد خاں نے شکست دی اور منگل وارہ سے اتولدہ ہوتے ہوئے محلہ گنوری تک جو محاذ پھیلا ہوا تھا اور جس میں چھاؤنی اتوارہ کے رخ

پردان سنگھ کماندار نے اور گکھوری کی فصیل پر صدق علی خاں ناگپوری نے وزیر محمد خاں کی افواج پر محاصرہ کی صورت میں حملہ کیا تھا اور آخر کار وزیر محمد خاں ہی فاتح رہے۔ یہ وہ عظیم معرکہ تھا جس میں پٹھان عورتوں نے غضب کی شدت سے شہر کی مدافعت کی تھی۔ گویا ان جنگی میدانوں کے چہار گوشہ حساب سے محلہ چھاؤنی ولایتیان جنگی محاذوں کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے جنگی آثار اور اس کی افغانستانی آبادی کی یادگار ہیں اس محلّہ کی مسجد ''باجوڑیاں'' ہے، جو افغانی النسل قبیلہ باجوڑ کا نام ہے۔

اس قطعۂ زمین کے ارضی عناصر۔ اس علاقہ سے پیدا ہونے والے پانی کے چشموں میں اور اس کی آب و ہوا میں جو بیش قیمت کیمیاوی اجزا و اثرات ہیں، ان کی صحت اور توانائی کا ثبوت تو چھ، سوا صدی کی عمر والے مرد اور عورتیں ہیں جن کے جسم کی نشو و نما اس قطعۂ زمین میں ہوئی۔ پیداوار کی مقدرت یہ ہے کہ باوجود سادہ اور بے حد بے عمل لوگوں کے کاشت کرنے پر بھی اس علاقہ کے کھیت تمام دارالملک کو سبزی ترکاری بہم پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد یہاں کے خام مکانوں میں یہاں کی مٹی کی عمر اور توانائی کا اندازہ کرنا ہو تو خود میرے مکان میں تشریف لائیے جس کی ایک دیوار میں پورے اسّی برس پہلے کا ایک خام پلاسٹر میری دادی صاحبہ مرحومہ کے ہاتھ کا آج بھی علیٰ حالہٖ موجود ہے۔ جس کو حضرت والد صاحب قبلہ اپنی والدہ کی یادگار کے طور پر ہمیشہ عزیز رکھتے تھے اور اس کی حفاظت فرماتے تھے۔ اور اب اس تاریخی پلاسٹر کی حفاظت، میں اور میرے بہن بھائی کرتے ہیں۔ ان اجزاء کے مختصر بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ علم الابدان اور فلکیات و ارضیات کے علوم کے ماہر سمجھ لیں کہ اس قطعۂ زمین پر چونکہ خصوصی فلکی شعاعی نظام اثر انداز ہے اس لیے یہ قطعہ بیش قیمت دھاتوں اور جواہر کے قوام کی تاثیرات کا مالک ہے، اس لیے اس علاقہ کے پیدا ہونے والوں کے نظم دماغ و نظم جس میں عام لوگوں کے مقابل خاص ملکات کی مقدرت کام کرتی ہے جیسا کہ اس کے افراد کے حالات سے واضح ہوگا۔ اس علاقہ کے بیش قیمت پانی کے چشموں کے نام یہ ہیں:

کنواں قائم خاں، کنواں بخشی باغ جمال محمد خاں، جھریا شفا شاہ۔

◆◆◆

علامہ، حافظ، مولوی محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی مرحوم

حضرت العلام قبلہ مولوی محمد برکت اللہ صاحب مغفور کی محلہ داری کی حد تک مجھے میرے والد قبلہ محمد صالح صاحب مغفور سے جو حالات معلوم ہوئے وہ یہ ہیں۔ حضرت قبلہ علامہ محمد برکت اللہ صاحب مغفور کی تاریخ ولادت 7 جولائی 1854 ہے۔ بیرونِ اتوارہ دروازہ سے چل کر محلّہ چھاؤنی ولایتیان کی مسجد تجا نور خاں صاحب کی مشرقی دیوار سے مشرقی سمت پورے 75 قدم جہاں ہو رہے ہوں، وہاں قبلہ علامہ محمد برکت اللہ صاحب مغفور کا مکان تھا، جس کے صدر دروازہ پر آج 1946 میں عجائب خانہ کی شمالی دیوار بنی ہوئی ہے۔

علامہ مغفور کے والد قبلہ خود فارسی کے جید عالم تھے اس لیے علامہ نے اردو فارسی کی تعلیم قبلہ والد صاحب ہی سے پائی اور ابتدائی عربی بھی موصوف ہی سے پڑھی۔ اس کے بعد جب قبلہ کے والد بزرگوار موتی محل کے نگراں مقرر ہوئے تو قبلہ علامہ نے حضرت قاضی عبدالحق صاحب مغفور سے علوم دینیہ کی تحصیل کا سلسلہ شروع فرمایا۔ پیدائشی غیر معمولی ذہانت اور حد سے گزری ہوئی محنت پسند طبیعت کے اثر سے اسباق کا یہ عالم تھا کہ صبح کو دو سبق قبلہ قاضی صاحب سے ان کے مکان پر پڑھتے تھے اور دو راستہ میں دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے واپسی پر۔ قبلہ علامہ کے شریکِ تعلیم میرے والد صاحب قبلہ بھی تھے اور جناب حضرت شاہ صاحب جو بعد میں قبلہ علامہ کے

بہنوئی ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب نے قبلہ علامہ کی حیرت ناک ذہانت کو محسوس فرماتے ہوئے تعلیم کے زمانے ہی میں علامہ کو حفظ قرآن کریم کا مشورہ دیا۔ علامہ نے بغیر استاد کے دوسرے ہی دن سے مسجد بڑھ والی واقع محلہ چھاؤنی ولائیتیان میں حفظ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پورے چھ ماہ میں تمام قرآن حفظ یاد کر کے موتی محل کی چاندنی پر تراویح کی صورت میں سنایا۔ مطالعہ کے شوق کا ایک واقعہ میرے والد صاحب قبلہ سناتے تھے تو علامہ کی یاد سے ان کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قبلہ والد صاحب نے بتایا کہ علامہ کے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کے نیچے گوشت کی دو چھوٹی چھوٹی سی گیندیں بن گئی تھیں جو ان کے وضو کرتے وقت صاف نظر آتی تھیں۔ کہنیوں پر گوشت کی یہ گیندیں اس لیے بن گئی تھیں کہ شب کے مطالعہ میں جب علامہ کو نیند آتی تو مطالعہ کی فکر اور شوق سے علامہ اپنی کہنی کو موتی محل کی چاندنی کے پختہ فرش پر اس زور سے رگڑ دیتے تھے کہ بعض اوقات خون نکل آتا تھا اور اس رگڑ کی سوزش سے علامہ کی نیند کا غلبہ کافور ہو جاتا تھا۔ چونکہ وہ عرصہ تک اسی طرح کہنیوں کو زخمی کر کے مطالعہ کرتے رہے اس لیے طوالت کے باعث کہنیوں کا اتنا گوشت مردہ ہو گیا تھا۔ یہ تھی طلب علم و تحصیلِ علم میں علامہ کی مستعدی، جس کو میرے زمانۂ تعلیم میں میری تشویش و تحریص اور مستعدی کے لیے قبلہ والد صاحب دہراتے ہوئے بار بار فرماتے تھے کہ "پڑھو تو برکت کی طرح پڑھو ورنہ چھوڑ دو"۔

قبلہ علامہ کو بچپن ہی سے سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا لیکن ساتھ ہی وہ تعلیمی سلسلے اور اسباق کے ناغہ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے آخر جمعرات سے جمعہ کے آخر تک کے وقفہ میں وہ اسلام نگر اور سیہور جایا کرتے تھے۔ چونکہ مالی حالت بڑے آدمیوں کی طرح علامہ کی بھی بہتر تھی اس لیے یہ سفر بغیر سواری کے ہوتا تھا۔ لیکن شوق علم ملاحظہ ہو کہ پیادہ پا سفر میں تھکن دور کرنے کی جو منازل مقرر کی گئی تھیں ان میں جتنی دیر ٹھہرتے اتنی دیر تک علامہ کوئی تاریخی کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے تاکہ سیر و سفر کے لمحات بھی معلومات بڑھانے کا باعث ہوں۔

حضرت قبلہ کو قدیم مسائل علم میں اجتہاد کا ایک دلکش سلیقہ حاصل تھا، اس لیے علامہ کا طرزِ بحث علمی حلقوں میں بے حد مقبول و مشہور ہو چکا تھا اور بعض ممتاز اصحابِ ثروت نے اپنے بچوں کی تعلیم کافی اصرار سے علامہ سے شروع کرادی تھی مگر علامہ کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ ہر ماہ

تعلیم کا معاوضہ وصول کرنے کے لیے میرے والد صاحب قبلہ بچوں کے والدین کے پاس جاتے تھے کیونکہ علامہ کو جو شخص اپنے بچہ کی تعلیم کا معاوضہ نہیں دیتا تھا علامہ خود نہ اس سے مطالبہ کرتے تھے اور نہ اس بچہ کے سبق کو ترک کرتے تھے۔

اب علامہ علوم متداولہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قبلہ قاضی مولوی عبدالحق صاحب کی بعض تفاسیر کی جانچ فرما رہے تھے کہ فطرت نے اپنا کام کیا۔ یعنی عین انہی دنوں علوم اسلام کی تعلیم کے شوق میں ہنڈیہ ہردے کے اسٹیشن ماسٹر جناب بابو قادر بخش صاحب بھوپال میں تشریف لائے اور چونکہ بھوپال کے تمام تعلیمی حلقوں میں علامہ ہی کی فراست اور تعلیمی تبحر کا چرچا تھا اس لیے بابو قادر بخش صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی کہ علامہ کو علم ہوا کہ بابو صاحب انگریزی داں ہیں علامہ نے فوراً طے فرمالیا کہ علامہ بابو صاحب کو عربی پڑھائیں اور بابو صاحب علامہ کو انگریزی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ایک سال کے سلسلہ کے بعد علامہ نے محسوس کیا کہ وہ کسی دوسرے شہر میں جا کر انگریزی میں کمال حاصل کریں۔ اس لیے یہی بابو قادر بخش صاحب علامہ کا وسیلۂ سفر بن گئے اور علامہ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھوپال سے محض طلب علم کے جذبہ سے رخصت ہو گئے اور حیدرآباد پہنچے۔ اس موقع پر ایک نہایت دل شکن حادثہ پیش آیا کہ آپ کے والد صاحب مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ میرے والد صاحب نے متعدد ذرائع سے قبلہ علامہ کو بھوپال لانے کی کوشش کی مگر اُدھر تو علامہ نے آنے سے انکار کر دیا اور اِدھر علامہ کے والد صاحب کا علامہ کی یاد میں یہ عالم ہوا کہ غشی کے عالم میں جب کبھی بھی افاقہ ہو تو یہ فرما کر اپنی چارپائی اپنے مکان کے دروازے سے باہر نکلواتے تھے کہ ''مجھے دروازہ پر بٹھا دو۔ برکت آئے گا تو مجھے دیکھ کر مکان پہچان لے گا ورنہ وہ پھر پڑھنے کے لیے واپس چلا جائے گا''۔

میرے والد صاحب قبلہ علامہ کے مستفسرین کو جب یہ واقعہ سناتے تھے تو بہت کانپی آواز سے رونے لگتے تھے حتّٰی کہ اسی عالمِ اشتیاق میں علامہ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا مگر علامہ جو گئے تو پھر نہ آئے۔

علامہ متوسط قد کے گندم گوں اور نہایت گٹھیلے جسم کے بزرگ تھے۔ فوق الفطرت حافظہ کے

مالک، بحث وتنقید میں ان سے کوئی بازی نہ لے جاسکتا تھا۔ اجتہاد و جدت پیدا کردینے کی صلاحیت بہت نمایاں تھی۔ بے حد خموش و صابر، سادہ لباس اس حد تک تھے کہ عین عنفوانِ شباب میں بھی کبھی کوئی خوبصورت کپڑا نہ پہنا۔ البتہ ایک مرتبہ ایک بوٹ جوتا پہنا، جس کو پہن کر وہ موتی محل کی پختہ چاندنی پر چلے تو اس کی کھٹ کھٹ کی آواز سے متاثر ہوکر میرے والد صاحب قبلہ سے یہ جملے ارشاد فرمائے کہ:

''بھیا دیکھیے تو اس جوتے کی آواز سے جسم میں کام کرنے کی کتنی تیزی پیدا ہوتی ہے۔ کتنا عمدہ جوتا ہے''۔

اس پر والد صاحب قبلہ نے فرمایا کہ یہ جوتا کرسٹانوں کا ہے اس لیے اگر اس کو واپس کردو تو ہم تم کو دہلی کی چکن کا کرتا بنادیں گے۔ علامہ نے دوسرے ہی دن جوتا واپس فرمادیا اور چکن کا کرتا لینے سے بھی انکار فرمادیا۔ ان کو تالاب، ندی اور کنوئیں میں نہانے کا شوق بہت زیادہ تھا اور گھوڑے کی سواری کا۔ اس کے سوا ان کو کوئی شوق نہ تھا۔

◆◆◆

مفتی عبدالہادی خاں صاحب

چھاؤنی ولایتیاں کی دینی و اسلامی عظمت کی تاریخ جس طرح شہرۂ آفاق مبلغ اسلام قبلہ علامہ برکت اللہ مغفور سے شروع ہوتی ہے اس میں مزید اضافہ کا باعث حکومتِ بھوپال کے موجودہ مفتی حضرت مولانا حاجی حافظ محمد عبدالہادی خاں صاحب کی ذاتِ گرامی ہے۔

حضرت موصوف 29 شعبان 1302ھ مطابق 13 جون 1884 سات بجے صبح چھاؤنی ولایتیان متصل چوکی مہندی والی پیدا ہوئے۔ یہ مکان بھوپال ریلوے اسٹیشن سے منگلوارہ جمعراتی جانے والی سڑک پر واقع ہے اور میرے پیدائش والے مکان سے ٹھیک 63 قدم کے فاصلہ پر۔ حضرت قبلہ کے والد مولانا عبدالاحد خاں صاحب اور موصوف کے چچا قبلہ مولانا عبدالصمد خاں صاحب اپنے وقت کے مستند علما اور صاحب قلم تھے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تالیفات کی صحت کا کام مولانا عبدالصمد خاں صاحب ہی کے ذمہ تھا۔ حضرت قبلہ مولوی عبدالاحد خاں صاحب نے سب سے پہلے قبلہ مفتی صاحب کو حفظ قرآن محترم کے لیے وقف فرمادیا اور حضرت مفتی صاحب قبلہ نے انتہائی انہماک اور مستعدی سے اس ذمہ داری کو بجالاتے ہوئے حافظ قرآن کا شرف امتیاز حاصل کیا۔ چھاؤنی ولایتیان میں اس وقت بجز سپاہیانہ زندگی کے علمی زندگی اور علمی و تعلیمی احساس نہایت درجہ مضمحل تھا لیکن اس ماحول میں رہ کر بھی حضرت مفتی

صاحب کمال استطاعت سے تعلیمی مشاغل کے سلسلہ کو کامیاب بناتے رہے۔ ابتدائی فارسی وعربی کی تعلیم حضرت والد صاحب قبلہ ہی سے پائی۔ اتفاق کہ عین انہی دنوں بھوپال کے علم دین کا ایک ماہتاب جو اپنی روشنی سے بھوپال کو جگمگا رہا تھا حضرت مفتی صاحب کی طرف متوجہ ہوا یعنی مشہور رئیس العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ وہ محترم بزرگ تھے جو علاوہ مفتی عارف باللہ اور جلیل القدر صاحب تقریر ہونے کے مشائخ میں بھی ایک مخصوص جلالتِ قدر کے مالک تھے۔ راقم التحریر کو حضرت شاہ صاحب قبلہ کے ''ترجمۃ القرآن'' کے سلسلہ میں شریک رہنے اور آپ کی مسجد میں قرآن خوانی کا شرف حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانانِ بھوپال میں خصوصاً اور مسلمانانِ ہند میں عموماً حضرت شاہ صاحب قبلہ کے رتبۂ اتقا و اثر کا جو منظر میرے سامنے ہے، بہت کم اصحابِ علم کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ پس حضرت شاہ صاحب قبلہ کی توجہ نے قبلہ مفتی صاحب کے علمی اور ذہنی کمالات میں ایک امتیازی روشنی پیدا کر دی اور خود مفتی صاحب قبلہ نے بھی جس کمالِ ذہانت اور زہد و ورع کا شوق دیا اس نے حضرت شاہ صاحب قبلہ کے قلبِ مبارک میں مزید جگہ حاصل کر لی اور ممدوح نے حضرت مفتی صاحب قبلہ کو اپنی دامادی کا اعزاز و شرف بخشا۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ ایسے رئیس الاقطاب کے داماد ہو جانے کو چھاؤنی کے باشندوں نے اپنا شرف و امتیاز تصور کیا۔

اب چونکہ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو حضرت شاہ صاحب قبلہ کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض کا خصوصی موقع حاصل تھا، اس لیے چند دن ہی میں اہلِ بھوپال میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کی عظمت و سربلندی کا احساس بیدار ہوا اور خود مفتی صاحب قبلہ نے علومِ دین کے درس کے سلسلہ سے یہاں کے متعدد مدارس میں جن علمی و دینی استعدادوں کا ثبوت بہم پہنچایا تھا ان کے پیشِ نظر بتدریج آپ کے سرکاری مراتب میں بھی اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ چھاؤنی ولایتیان کی اس جلیل القدر شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے یہ امتیاز عطا فرمایا کہ حکومت نے 1930 میں آپ کو اس رتبۂ اعلیٰ پر فائز فرمایا۔

حضرت قبلہ مفتی حافظ حاجی محمد عبدالہادی خاں صاحب کے موجودہ مناصب اور علم دین کی متعدد ذمہ داریوں اور مشاغل کی مختصر شرح یہ ہے کہ آپ علاوہ عظیم سرکاری فرائض کی انجام دہی

کے دینی علوم کی بعض بیش قیمت کتابوں کی تالیف وتدوین اور ترجمہ کی خدمت میں بھی شبانہ روز محو ومنہمک رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ممدوح کے سلسلۂ تحریر میں ذیل کی چیزیں بے حد خاص ہیں:

1۔ ''تفسیر مدارک'' کا مکمل حاشیہ اور شرح عربی میں جس کے تین پارے طبع ہو چکے۔

2۔ ''خطبات حمیدیہ'' جو بھوپال کی تمام مساجد میں پڑھے جاتے ہیں۔

3۔ ''تفسیر حمیدی'' زیر تالیف۔

4۔ ''فتاویٰ حمیدیہ'' زیر تالیف۔

عالمِ اسلام یعنی تمام مسلمان ممالک میں بھوپال کی محبت وشہرت کا سبب یہاں کی دینی منزلت اور دینی درس وتحریر ہے۔ جس کے ذریعے از ہندستان تا بہ افغانستان، ترکی، مصر وعراق اور مراکش اس خطۂ اسلامی کی تشریف وتوقیر مسلّم ہے۔ پس حضرت مفتی حافظ حاجی محمد عبدالهادی خاں صاحب مدظلہ کا یہ امتیاز کم نہیں کہ ان اسلامی ممالک خصوصاً افغانستان وچینی ترکستان، تاشقند وخیوا وغیرہ تک آپ کے کامیاب طلبا وشاگرد جا پہنچے ہیں۔ ممدوح کے مسلّمہ امتیاز عالمانہ وفقیہانہ کے اعتماد کے سلسلہ سے حکومت نے آں محترم کو بھوپال اور وسطی ہند کی واحد اسلامی درسگاہ جامعہ احمدیہ کا مہتمم، ممتاز صحت وقرأت قرآن کے مدرسے عبیدیہ کا مہتمم مقرر فرمایا ہے۔

بھوپال میں درس قرآن اور ترجمۃ القرآن کا جو مقدس ومحترم سلسلہ اسلاف سے چلا آرہا ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کا پایۂ ارشاد وترجمہ فقط وقیع ومستند ہے بلکہ آں محترم ہی کو یہ شرف استقامت حاصل ہے کہ آں محترم اپنے محترم خسر قبلہ شاہ عبدالعزیز صاحب مفتی ریاست ومحدث رحمۃ اللہ علیہ کی مستند ترجمہ پر کامل تیس سال سے کتاب الٰہی کے مطالب وبصائر سے مسلمانوں کو مستفید فرما رہے ہیں۔

بھوپال کی تاریخی مسجد جامع میں ہر نماز جمعہ کے بعد آں محترم کا وعظ وبیان بھی ایک ایسا عظیم الصدر سلسلۂ خدمت اسلام ہے جس کے باعث آں محترم کو تمام اسلامی حلقوں کا احترام حاصل ہے۔

ان مراتب جلیلہ پر پہنچ کر باوجود اپنی عظیم دینی ذمہ داریوں کے حضرت مفتی صاحب قبلہ اپنے اخلاقی مراتب میں بھی کمالِ خصوصیت کے مالک ہیں۔ مثلاً وہ اپنے عزیز محلہ سے آج بھی

وہی انس رکھتے ہیں جو بچپن کی فطرتِ صحیحہ ہے۔ وہ اپنے اسلاف کی قبور پر جاتے ہیں۔ محلے کے بزرگوں کا ادب بجالاتے ہیں اور محلّہ کے چھوٹوں سے غایت درجہ شفقت اور قدیم انداز یگانگت سے پیش آتے ہیں، کبر و غرور اور خواہ مخواہی زیادہ رعونت سے بہت بلند ہیں۔ ہندو مسلمان اور دوسری تمام قوموں سے اس کمال محبت سے پیش آتے ہیں کہ بعض اوقات مسلمانوں سے زیادہ ہندو بھائی ممدوح کے احترام میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

غرض ممدوح کی محترم ذات ہے جس نے عہدِ حاضر میں بھی محلّہ چھاؤنی کے دینی امتیاز کو باقی رکھا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو تادیر سلامت باکرامت رکھے۔ آمین!

حضرت محترم کی چھ اولادیں ہیں۔ بڑے صاحبزادے عزیز حافظ مولوی محمد عبدالباری خاں صاحب مولوی فاضل۔ گو ابھی عہدِ عنفوانِ شباب ہے لیکن چھاؤنی کی ذہانت کی فوق العادت صفت مشترک کے یہ لائق احترام نمونہ ہیں۔ چنانچہ یہ ذہانت ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اپنے والد قبلہ سے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کے بعد الہٰ آباد یونیورسٹی سے مولوی، عالم، فاضل ادب، فاضلِ دینیات کی ڈگری حاصل کی، پھر جامعہ احمدیہ سے درس نظامی کی تکمیل کی سند حاصل کی اور باقاعدہ علمائے کرام کے ہم رتبہ اور لائق افتا۔ اس کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور انگریزی میں میٹرک کی سند حاصل کی اور ایف۔ اے تک انگریزی کی تکمیل کی۔ یہ تبحر علمی ہے محلّہ چھاؤنی ولایتیان کے اس ذرہ کا جو آفتاب ہونے کو آفتاب قریب ہوتا جارہا ہے۔

اب سوال تھا کہ کہیں علوم قدیمیہ وعلومِ جدیدہ کی اسناد کے انبار حاصل کرکے قوائے عمل میں جمود واضمحلال نہ آجائے تو یہ بھی نہ ہونے دیا اور عہدِ حاضر کی بیدار ذہانت اور عملی استعداد کے ثبوت کے طور پر بھوپال کے 1945 والے انتخاب بلدیہ میں حلقہ نمبر 7 سے کھڑے ہوئے اور چونکہ عوام وخواص بھوپال، ان کی وسعت علم ونگاہ کے معترف تھے۔، اس لیے وہ بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے اور ان سطور کی تحریر کے وقت وہ میونسپل کمشنر ہیں۔

◆◆◆

ملّا رموزی

موجد گلابی اردو

ملّا رموزی نے اپنے دل و دماغ کی تمام جوان صلاحیتوں کے ساتھ ہندستانی آبادی کے جملہ شعبۂ حیات و حرکت کی جو لگاتار خدمات انجام دی ہیں ان کی مدت اس تحریر کے وقت یعنی 1946 میں پورے تیس برس کی ہوتی ہے، لہٰذا جس شخص نے اپنی تمام ذاتی اور خاندانی ترقی کی مقدرتوں کو اتنے طویل عرصہ تک پورے ہندستان کی صلاح و فلاح پر خرچ کیا ہو اس کا اعتراف اور اس پر تبصرہ بھی پورے ہندستان کی غیرت اور انصاف کے ذمہ ہے۔ البتہ رموزی کے ہم وطن کی حیثیت سے اس کی صرف وطنی زندگی کے لیے کچھ کہوں گا اور اس کی ذاتی سیرت تک۔

احمد نصیر انصاری کو مجھ سے شروع میں ملّا رموزی ہی نے ملایا تھا۔ عرصہ کے بعد آج یہی احمد نصیر انصاری مجھ پر مسلط ہیں اور فرمائش ہے کہ آپ ملّا رموزی پر کچھ لکھ دیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا یہ تقاضا اس لیے ہے کہ یہ میرے اور ملّا رموزی کے بے باک اور غایت درجہ محبت میں ڈوبے ہوئے شبانہ روز کے تعلقات اور میری اس کی حد سے گزری ہوئی بے محابا اور بے تکلف دوستی کے آزاد تبصرے خود سنتے رہے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ میں اسی رنگ میں رموزی کو لکھ بھی دوں۔

ادھر رموزی سے جب میں نے کہا تو اس نے اپنی فطرت کے عین مطابق یہ جواب دیا کہ ''جو تیرا جی چاہے وہ کر۔ مجھے نہ تیرے لکھے کی پروا نہ ان کے لکھے کا غم''۔ لہٰذا ملاحظہ فرمایئے لاکھوں ہندستانیوں کے ہردلعزیز ملا رموزی کی داستان حیات۔

یہ مضمون و کتاب اور شعر و تقریر کے ذریعہ ہندستان کی متحدہ قومیت کی دیوانہ وار خدمت کرنے والا اور اس مقصد پر اپنے خاندان اور اپنی اولاد تک کے مالی مستقبل کو برباد کرنے والا بے ہوش شخص 21 مئی 1896 مطابق 7 ذی الحجہ 1216 ھ کو دن کے دس بج کر دس منٹ پر محلّہ چھاؤنی ولایتیان چوکی مہندی والی کے متصلا مکان کی شمالی سمت والی ایک کال کوٹھری سی جگہ میں پیدا ہوا، جو آج اسی کی آنکھوں کے سامنے کھنڈر بنی پڑی ہے اور میں 18 جولائی 1896 کی صبح کو عین طلوع آفتاب کے بعد پیدا ہوا ہوں۔ بس میرے اور اپنے اس مختصر سے پیدائشی فرق پر یعنی مجھ سے کلہم ایک ماہ 27 دن بڑا ہونے پر مجھے کھائے جاتا ہے، نگلے جاتا ہے اور مارے ڈالا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ تو مجھ سے چونکہ ایک ماہ 27 دن چھوٹا ہے اس لیے میرا ادب کر اور تعظیم۔ بڑے ہونے والے لوگوں کی پیدائش کے مسلمہ قانون کے عین مطابق یہ ایک بے حد غریب مگر غضب کے خوددار باپ کے گھر پیدا ہوا۔ مذہبی عقیدت اور مذہبی ماحول و ترغیبات کے تحت یہ اور میں حفظ قرآن محترم کے لیے مسجد سلطانی اندرون اتوارہ اور مدرسہ عدالت بھوپال میں شانہ بشانہ رہے جہاں ہم دونوں کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ ہم دونوں آئندہ کیا ہوں گے۔ اس لیے میں نے نہ اس کی علمی ذہانت کے نوٹ لکھ کر اپنے پاس رکھے نہ اس کے علمی مذاق کی یادداشتیں۔ البتہ یہ مجھے بھی یاد ہے اور رموزی کو بھی کہ یہ دن بھر پڑھنے سے بہت گھبراتا تھا۔ مدرسہ سے کافی بھاگتا ہی کیا تھا مجھے اور دوسرے طلبا کو بھی ساتھ لے بھاگتا اور تمام دن حبیب گنج اسٹیشن کے چٹیل اور پہاڑی میدانوں نو بہار اور شہر کے مشرقی باغات میں لیے پھرتا۔ کبھی خود اور کبھی ہم سے ہمارے گھروں سے چوری کراتا۔ روٹیاں سالن منگاتا۔ پیسے منگاتا۔ باغات کے پھولوں کو خود چراتا اور ہمیں چوری کی ترغیب دیتا۔ لڑنے مرنے کے موقع پر ہمیشہ خود آگے رہتا اور ہماری اور اپنی تعلیم کے سلسلہ کو اتنا بے ربط کرا دیتا کہ ہم گھر جاتے تو والدین کی مار کھاتے اور مدرسہ میں استاد کے چانٹے، لیکن اب اس انتہا درجہ کی غنڈہ گردی پر بھی یہ مکمل حافظ ہو گیا اور میں اور میرے اس کے

تین ساتھی 28-27 پارے حفظ کر کے بے تکمیل ہی رہ گئے۔ یہی حال اس کا مدرسہ سلیمانیہ کی طالب علمی میں رہا۔ جملہ اساتذہ اس کو سزائیں دے کر تھک سے جاتے مگر یہ درجہ کے تمام لڑکوں کی کتابیں چرا کر دوسرے درجہ کے لڑکوں کو دے دیتا۔ ان کے گھروں پر جا کر ان کے جرمانے کے نام سے ان کے والدین سے پیسہ لے آتا۔ مٹھائی لیتا اور تمام دن باغ امراؤ الدولہ کے کنویں پر نہایا کرتا۔ راتوں کو گانے ناچ کی ایک محفل نہ چھوڑتا، مگر جب سالانہ امتحان ہوتا تو یہ پاس ہو جاتا اور ساتھی رہ جاتے۔ کچھ دن اس کو لال مینا پالنے اور پکڑنے کا شوق ہوا، مجھے بھی اس کا شوق دلایا، میں گدھا بھی اس کے کہے میں آ گیا۔ اب مدرسہ اور تعلیم تو گئی بھاڑ میں، میرے اس کے ہاتھوں میں لالوں کے پنجرے اور پنچھی اور دن بھر نوبہار کا علاقہ۔ محرم کی راتوں کے تماشوں میں یہ ایک دو مرتبہ غنڈوں سے ضرور لڑائی مول لیتا تھا۔ کبھی مارتا اور کبھی مار کھاتا اور میں پریشان اِدھر اُدھر بچتا پھرتا۔ پھر اس کو اچانک پہلوانی کا شوق ہوا تو یہ میاں مقصود علی خاں فرزند راجہ عبدالعلی مرحوم کے اکھاڑہ میں لنگوٹ باندھ کر گھنٹوں ورزش کرتا۔ اسی عرصہ میں راجہ سید مقصود علی صاحب مرحوم کے دوست قبلہ مولانا عبدالحلیم صدیقی، ناظم جمعیۃ علما ہند کو لینے کے لیے بھوپال میں مولانا آزاد سبحانی آئے۔ رموزی چونکہ قبلہ عبدالحلیم صاحب کا بھی شاگرد ہو چکا تھا اس لیے آزاد سبحانی صاحب نے کچھ بھانپ لیا ہوگا وہ قبلہ عبدالحلیم صاحب کے ہمراہ اس کو بھی کانپور کے مدرسہ الٰہیات میں لے گئے۔ دو تین برس کے بعد کیا سنتا ہوں کہ رموزی نے فاضل الٰہیات کی سند حاصل کر لی اور وہیں سے اس نے اخباروں میں مضمون لکھنا بھی شروع کر دیا۔ یہ 1917 کا واقعہ ہے۔

آخر 1918 میں آپ بھوپال تشریف لائے۔ اب میں بھی ایک معزز جگہ ملازم ہو چکا تھا اس کو جو دیکھا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ اس میں لکھ پڑھ کر کوئی تبدیلی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بے ساختہ گالیاں دیں۔ یہ جس زمانے میں اتنی بڑی سند لے کر آیا تھا اس وقت کے اس کے لباس، وضع قطع اور کمالِ خلوص کا وہی عالم تھا جو بچپن میں تھا۔ پھر یہ ملازم ہوا تو اس کا وہی عالم رہا۔ پھر یہ ''گلابی اردو'' کے مضامین کی لاجوابی سے سارے ہندستان کی آنکھ کا نور بن گیا تو بھی اس کی بے ساختگی، آزادی، بے پرواہ مزاجی، لباس و وضع کی سادگی کا وہی عالم رہا۔ پھر اس نے ہندستان

کے بڑے بڑے شہروں کے بڑے بڑے جلسوں اور اسٹیجوں پر تقریریں کیں تب بھی یہ وہی رہا۔ پھر اس کے اعتراف کمال پر اخباروں، رسالوں اور لیڈروں کے بڑے بڑے تبصرے شائع ہوئے تب بھی یہ وہی رہا۔ پھر یہ امراء و رؤسا کی مجالس کا رکن بنا تب بھی یہ وہی رہا۔ پھر یہ یورپ کی بعض مشرقی علمی و ادبی مجالس کا رکن بنا تب بھی یہ وہی رہا۔ پھر یہ بعض رؤسا کا اتالیق بنا تب بھی یہ وہی رہا۔ پھر یہ ہندستان بھر کی شہرت و محبت کا مرکز بنا تب بھی وہی رہا۔ پھر یہ مالی تباہیوں اور خاندانی حوادث و ذمہ داریوں کا شکار ہوا تب بھی وہی رہا۔ پھر یہ متاہل زندگی کا مالک ہوا اور چار بچوں کا باپ تب بھی وہی رہا۔ پھر اس کو پبلک خطابات ملے تب بھی یہ وہی رہا۔ اور جب کہ اس کے کمال دماغی کا سارا ہندستان معترف اور اس کا وطن اس کی قدر کمال کو محسوس کر رہا ہے تب بھی یہ وہی ہے۔ نہ اس کے ہاتھ سے مذہب گیا نہ اسلاف کی سادگی، نہ غریبوں کی دوستی میں کمی آئی نہ اس کے بچپن کی بے باکیوں میں فرق۔ البتہ ایک بات جو اس سے شروع ہی سے نہ ہو سکی وہی آج بھی نہ ہو سکی یعنی اس کی مالی معذوریاں نہ اس سے شروع میں دور ہو سکیں نہ اب ہوئیں۔ نتیجہ میں یہ تو دیوانہ سہی لیکن اس کے متعلقین کا ضرور خون ہوا۔

یہ آج پچاس کی عمر کو پہنچ کر بھی عنفوانِ شباب کی مستیوں، بے باکیوں اور بے پرمزاجیوں کا مالک ہے۔ اس کے بے شمار تبصرہ نگاروں میں مجھے مولوی لیاقت حسین ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی پونہ کے یہ جملہ بے حد صحیح معلوم ہوئے کہ یہ شخص اپنے کردار اور مقصد میں بے انتہا اجڈ، اکھڑ، نڈر، منہ پھٹ، بے باک اور سیاسی اصطلاح میں آخری درجہ کا متشدد اور انتہا پسند ہے۔ اسی لیے اس کی دوستی آج تک کسی سے پٹی ہی نہیں۔ جب جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے۔ البتہ ان تمام باتوں میں ایک خاص بات ضرور ہے وہ یہ کہ جو کہتا ہے غضب کی طاقت اور دلیل کے ساتھ۔ آپ اس سے بحث کر کے دیکھیے اس کمال شدت سے بولے گا گویا کچا کھا جائے گا مگر دلیل کی گرفت اتنی ناقابلِ شکست ہوگی کہ بجز اقرار شکست کے شاید ہی جو آپ سے کچھ بن آئے۔ سرپھرے پن کی حد ملاحظہ ہو رئیسوں اور اصحابِ ثروت کی آرام دہ کوٹھیوں میں نہیں ٹھہرتا۔ تقریر کے بلاوے پر بڑے شہروں میں نہیں جاتا، کسی دعوت اور تقریب میں نہیں ملتا۔ ریڈیو پر بولنے کی کوشش کی گئی نہیں بولا۔ کتابوں کی تجارت کو کہا گیا نہیں کی، رسالوں اور اخباروں

کی ایڈیٹری ملی نہیں کی تھی کہ بعض پرچوں نے اعزازی طور پر اپنے سر ورق پر نام لکھنے کی اجازت چاہی نہیں دی یعنی اس کے تمام معاصرین ایڈیٹر بن گئے، مصنف و مؤلف بن گئے، لیڈر بن گئے، مگر یہ آج تک صرف مضمون نگار ہی دھرا ہوا ہے۔ اس کی سیاسی بصیرت اور بین الاقوامی معلومات کی ایک ہی سند بس ہے کہ اس نے بھوپال کے اخبار ''ندیم'' میں ہٹلر کی شکست کا بہ دلائل اس وقت اعلان کیا تھا جب اچھے اچھے مبصرین ہٹلر کے دبدبے سے رائے بدل چکے تھے، مگر آخر کار اسی کا کہا پورا ہوا۔

اس سے مقامی سیاست اور کونسل کی ممبری کے لیے لوگوں نے بے مقابلہ کامیابی کا یقین دلا کر خواہش کی اس نے ایک نہ سنی۔ اس سے بھاری معاوضہ پر بعض نے مضمون نگاری سیکھنے کی خواہش کی نہیں سکھائی۔ بس اس کا تمام جسم سمٹ کر ایک ایسی خودداری اور ایک ایسا اعتماد بن گیا ہے گویا جو یہ کر رہا ہے وہی صحیح اور برحق، باقی دوسروں کا سوچا ہوا حماقت، لیکن اس کی اس استقامت کا اب ایک صلہ قریب آ گیا ہے اور وہ یہ کہ دنیا اس کی انفرادیت اور استقامت کی ضرور قائل ہو گئی ہے۔ اور اردو میں اس کو صفِ اول کے لکھنے والوں کا اعزاز و امتیاز مل گیا اور وہ بھی دائمی۔

یہ مزاجی طور پر بڑا ملنسار، مخلص، صاف باطن، ہمدرد، مداح اور مصلح مگر معاً کھسیانہ، غضبناک اور فیصلہ کرنے میں حد سے گزرا ہوا تیز۔ میں عرصہ تک ان متضاد اجزا کو نہ سمجھا اور اس سے جنگ کرتا رہا، لیکن بعض حالات میں یہ کچھ کہہ سکتا تھا مگر میں نہیں سمجھ سکتا تھا اور میں کہہ سکتا تھا اور یہ جواب نہیں دے سکتا تھا، لیکن 38 برس کے لگاتار قرب نے سب کچھ کہہ دیا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بے سمجھائے بھی سمجھ لیا۔ ان الجھے ہوئے فقروں کا یہ مطلب ہے کہ وہ بے حد ذہین ذکی الحس ہے۔ اس لیے جب وہ بھوپال سے لے کر امریکہ تک کے افسانوں کی زندگی اور احساسات پر نہایت صحت سے لکھتا رہا ہے تو کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ہی قوم کے ماحول اور کردار یا اپنے ہی خاندان اور دو معقول کو سمجھنے سے قاصر رہتا۔ اس لیے میں نے قدرے دیر میں سمجھا کہ وہ آخری درجہ کا مخلص ہے اور آخری درجہ کا حساس، اس لیے وہ اپنے ماحول کے متضاد عمل اور کردار سے جب ٹکراتا ہے تو اس میں بھی متضاد کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے جلد خوش ہوتا

ہے اور جلد ناراض۔ یعنی جس تیزی سے اس کے خاندان اس کے دوستوں اور اس کے عملی ماحول یعنی ہندستان کے حالات واعمال بدلتے ہیں اس کی یکسر بے ذرائع گھریلو زندگی جو عذاب انگیز کروٹ لیتی ہے اس کے دل ودماغ میں بھی ان سب چیزوں کے اثرات کے ردوقبول کی بجلی بھڑکتی اور کوندتی رہتی ہے۔ چنانچہ کون ہے جو اقرار نہ کرے گا کہ ملا رموزی نے بے حد کام کیا ہے، اس لیے اس کو بے حد آرام کی بھی ضرورت ہے، مگر آرام کے عوض اس کے گھر میں یہ لوگ ہیں صادق، ساجد، سلطان، شوکت، صابرہ، صغیرہ، انوری۔ یہ اُس کے جفاکش بہن، بھائی اور بیوی ہے۔

سوانح نگاروں کا دستور ہی ہو گیا ہے کہ وہ صرف صاحب سوانح تک کا سب کچھ لکھتے ہیں، لیکن کبھی اس کے ان عزیزوں کے لیے کچھ نہیں لکھتے جن کی خدمت ونوازش سے صاحب سوانح نگاروں کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ کسی صاحب امتیاز کی گھریلو زندگی کی فراغتیں کن افراد کے دم سے حاصل ہوتی رہیں۔

ملا رموزی ان معنی میں بے حد بدنصیب انسان ہے کہ اس کی ذات سے اس کے خاندان کو مالی فراغتیں نصیب نہ ہوئیں، لیکن اس لحاظ سے وہ بڑا خوش نصیب ہے کہ اس کے صادق، ساجد، سلطان ایسے جانثار بھائی بھانجہ صابرہ، صغیرہ ایسی وسیع النظر وزندہ دل بہنیں اور انوری بیگم ایسی سراپا قربانی بیوی حاصل ہوئی۔ یہ وہ بہن بھائی ہیں جو اس کے چوبیس گھنٹے کے رفیق ومونس ہیں۔ وہ جب انسانوں کی بے رخی سے دکھی ہو جاتا ہے، جب اس کی ویران اور اداس زندگی اس کو مضمحل کرتی ہے تو یہ حوصلہ مند جانثار اس کا دل بڑھاتے ہیں۔ میری اس بات کے پیچ وخم کو کون سمجھے گا کہ جس چراغ کے سامنے بیٹھ کر رموزی لکھتا ہے اور دنیا کو شاداب وروشن راستہ بتاتا ہے اس چراغ میں اس کی بیوی اپنا خون جلاتی ہے اور چربی۔ اور یہ دنیا جہاں کا مغرور ومتکبر اور آگ ہی آگ رموزی غلاموں کی طرح کے عاجز لہجے میں مجھ سے بار بار اقرار کر چکا ہے کہ میں کبھی کا مر چکا ہوتا اگر یہ حوصلہ مند بہن بھائی اور یہ پروانہ بیوی نہ ہوتی۔ وہ جتنا سوچتا ہے اور جتنا تو یہ تو لکھ سکتا ہے اس رفتار کی رکاوٹوں کی طوالت نے آخر کار اس کو دنیا کی ہر چمکیلی اور شاندار چیز سے شدت کے ساتھ نفرت دلا دی ہے۔ اسی لیے وہ اب نہ دوست کی سنتا نہ دشمن سے ڈرتا۔ گویا وہ خودداری اور خودفہمی

کے اس مقام تمکنت سے گزر رہا ہے جہاں خود اعتمادی وخود پسندی کی نورانی سیرت کا جلال ہی جلال کام کرتا ہے اور جمال ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ البتہ وہ تاجدار بھوپال اعلیٰ حضرت نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ، علیا منزلت کرنل ثریا جاہ نواب گوہر تاج بیگم ولیۃ العہد بھوپال اور حکام بھوپال کا معترف ہے۔

اس کی اس سیرت کے بعد اس کی علمی فطرت کے مشاہدے نے اس سے زیادہ کسی دوسرے کی علمی اور دماغی کاوشوں کا قائل نہ ہونے دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے معاصرین کو میدانِ عمل کی جو وسعتیں حاصل ہیں وہ اس جھونپڑے میں پڑے ہوئے مغرور ومتکبر کو کہاں حاصل۔ حد ہے کہ اس کے گھر میں کتب خانہ ہے نہ اس کے محرر اور منشی۔ سفر کر کے علمی لوگوں سے ملنے کے عوض یہ شہر سے باہر جانے سے بھی گھبراتا ہے۔ حد ہے کہ اس نے 1931 سے 1946 تک کل دو سفر کیے ہیں جس میں آخر کے سفر میں خود میں بھی اس کے ساتھ تھا، لیکن اس درجہ بے مایہ گوشہ نشینی میں بھی اللہ ہی جانے یہ کس طرح درجہ اول کا جوہری بن گیا اور نجومی بھی۔ یہ شاعر بھی ہو گیا اور محقق بھی۔ چنانچہ اس عرصہ کی اس کی لکھی ہوئی ذیل کی کتابیں ملاحظہ فرمائیے جو سراپا علمی ہی علمی ہیں، ظرافت نام کو نہیں۔

مسلم لیگ کا نظامِ داخلی
جواہر کے اصول وخواص
دیوانِ شعر وغزل
عورت کی اصلیت، فلسفۂ عشق

ملا رموزی کی یہ وہ کتابیں ہیں جن میں نہ دنیا کی کسی کتاب کے اقتباس وترجمہ سے مدد لی گئی ہے نہ مشاہیر کے روندے ہوئے اقوال واصول کی نقل ہے بلکہ ان کتابوں کی ایک ایک سطر رموزی کی محققانہ اور اجتہادی ذہانت کے وہ نظریے اور حقائق ہیں جن کے ملاحظہ کے بعد معلوم ہوگا کہ اس نے اردو کو تالیف وترجمہ کے طنز سے بچا کر تصنیف کا سرمایہ بھی دے دیا۔ چونکہ اس کی تحریروں کا تعلق سارے ہندستان سے ہے اس لیے ان پر تبصرہ بھی ہندستان ہی کے ذمہ ہے۔ میں تو اس کی ذاتی زندگی، ماحول اور افتادِ دماغ کے چند خاکے پیش کر رہا ہوں۔ لہٰذا معلوم کیجیے کہ اس

کی علمی فطرت یہ ہے کہ تقریباً ابتدا ہی سے ''پنج سالہ نظام'' کی ترکیب سے کام کرتا ہے۔ یعنی ہر پانچ سال کے بعد وہ اپنی تحریر کا طرز و موضوع بدل دیتا ہے اور جو جدید موضوع لیتا ہے اس پر وہ دھواں دھار اور اس استقامت سے لکھتا رہتا ہے گویا نہ اس سے پہلے اس نے کچھ لکھا نہ اب لکھے گا۔ جیسا کہ وہ 1939 سے 1946 تک جنگ ہی جنگ پر لگا تار لکھتا رہا۔ وہ جس موضوع پر لکھتا ہے اس کا اسلوب تحریر حتیٰ کہ جدید مصطلحات تک ایسی دلکش وضع کرتا ہے کہ آخر کار دوسرے اس کی مصطلحات کی نقالی پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اسی کی وضع کردہ مصطلحات اردو میں اضافہ کا باعث بن کر رہتی ہیں جیسا کہ آج کل کے لکھنے والوں میں اس کے ذخیرۂ وضع اصطلاحات لیے ہوئے جملے اور فقرے ملیں گے۔

علمیات اور تحقیق مسائل میں ڈٹ کر کام کرنے کی مقدرت یہ ہے کہ جب اس نے بھوپال کے طویل العمر انسانوں کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تو بھوپال کا شاید ہی کوئی تاریک سے تاریک مقام ہوگا جہاں دم توڑنے والے طویل العمر بھوپالیوں کے بستر تک یہ نہ جا پہنچا ہو حتّٰی کہ لوگوں کو خوشامد کر کے یہ دیہات تک اپنے ساتھ لے گیا جس میں ایک مرتبہ میں بھی اس کا شریکِ سفر تھا۔ بالآخر اس نے اس سلسلۂ تحقیق کو مقامِ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ جواہر پر ستاروں کے اثرات کی تحقیق کے پیچھے پڑا تو پہاڑوں، خوفناک جنگلوں، ندیوں کے کناروں اور خونخوار درندوں کے علاقوں میں نجومی حسابات کے چند اوراق اور ہیئت کے چند نقشوں کو بغل میں دبائے اس اطمینان سے گھومتا رہا گویا باغ میں ٹہل رہا ہے۔ ''عورت کی اصلیت'' پر کتاب لکھنے کی سوجھی تو اس عنوان پر اتنا بولتا رہا اور اتنی بحث کی کہ میں نے یہ تک کہہ دیا کہ اب تیرے پاگل ہونے کی تاریخ قریب آ چکی ہے۔

ملا رموزی کو سمجھنے کے لیے چند رسالوں اور چند اخباروں کو پڑھ لینا کافی نہ ہوگا۔ جو صاحب 1917 سے 1946 تک اردو کے کل رسالے اور کل اخبارات میں اس کو تلاش کریں گے وہ کامل ملا رموزی کی صورت میں پاسکیں گے اور اسی وقت آپ یہ اندازہ کریں گے کہ یہ بے پناہ لکھنے والا بھوپالی ہندستان کے کس کس گوشے میں کن کن عنوانات اور اسالیب بیان سے ملک وقوم کی لگاتار خدمت انجام دیتا چلا آ رہا ہے۔ اسی لیے میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ رموزی کو صرف

''ادیب'' سمجھنے والے کم نظر ہیں جب کہ اس کے مضامین کی ابتدا شعر وافسانے سے نہیں بلکہ خالص برطانوی ہند کی چوٹی کی سیاست سے ہوئی ہے۔ بہ یک لحہ اس کی ''گلابی اردو'' کے سارے ہندستان میں مقبول ہونے کا راز ہی یہ ہے کہ وہ خالص سیاست ہی پر لکھتا تھا۔ اور آج 1946 میں بھی دارالحکومت ہندستان دہلی کے اخبار ''انجام'' اور ''جنگ''۔ لکھنؤ کے ''تنویر''، بمبئی کے ''الہلال''، ''سلطان''، ''انقلاب'' اور ''خلافت'' وغیرہ میں دیکھ لیجیے کہ وہ سیاست ہند پر اسی طوفانی انداز سے لکھ رہا ہے یا نہیں؟ خود ''گلابی اردو'' کا طرز تحریر بتاتا ہے کہ یہ طرز بیان شعر و افسانے اور علم وادب کا ہے ہی نہیں۔ پھر اس تحریر والے کو ادیب کہیں یا سیاسی؟ آپ یوں کیجیے کہ ذرا اس سے مل کر سیاست پر گفتگو تو کیجیے۔

ہاں یہ اس کا امتیازی کمال ہے کہ وہ بہ یک لحہ سیاسی بھی ہے اور ظریف بھی۔ ول فیلسوف بھی ہے اور ادیب بھی اور اب کتاب ''عورت کی اصلیت'' لکھ کر تو اس نے منوالیا کہ وہ محقق بھی ہے اور پیدائشی۔ لہٰذا حسد اور تنگ نظری کو دور کرنا پڑے گا اور انصاف وحقیقت اس کے اس امتیاز کو منواتے رہیں گے۔ اس کی ہنرمندانہ ذہانت اور پیش بینی اور پیش گوئی کا یہ عالم ہے کہ بقول چودھری رحم علی ہاشمی لکھنوی ''جو لکھ دیتا ہے وہ خط تقدیر ہی بن کر رہتا ہے''۔ یہ پہلا بھوپالی صاحب تحقیق ہے جس نے بھوپال کے پیدائشی محاورات پر غلط کاروں کے اعتراض کا علمی جواز و جواب پیش کیا اور سب سے پہلے بھوپال کے مقامی الفاظ ومحاورات کو ''لغاتِ بھوپال'' کے نام سے مرتب کر کے اسی ٹکسالی بھوپالی زبان میں قصائد، نظمیں، چار بیت اور عبارتیں کی عبارتیں لکھیں جو آنے والی بھوپالی نسل کے ہاتھ میں بطریق سند پہنچیں گی اور اس کی یہ وہ علمی کاوش ہے جس کا مقدمہ علمی آپ اخبار ''ندیم'' بھوپال مورخہ یکم جنوری 1945 میں ملاحظہ فرمایئے تب پتہ چلے گا کہ بھوپال کا یہ ہوش مند فرزند اپنے دماغ کے خداداد کمالات ہی کے صدقہ تاریخ وادبیاتِ ہند کا ایک ممتاز رکن بن کر رہا اور آج اس کی ادیبانہ تحریریں ہندستانی درس گاہوں میں شریک درس ہیں اور اساتذہ اس کے اسالیب انشاء کو مقابلہ کے طریق سے طلبا کو سمجھا رہے ہیں۔

ہندستان کی سیاست کا کوئی حلقہ نہیں جو اس کی سیاسی چٹکیوں اور نکتہ آفرینیوں کا معترف نہ ہو۔ حد ہے کہ اصحاب ذوق اس کے دیکھنے کو بھوپال آتے ہیں۔

اس کی ادبیانہ صلاحیتوں کا اعتماد یہ ہے کہ وہ برحمتِ شاہانہ اعلیٰ حضرت قدر قدرت تاجدار بھوپال خلد اللہ تعالیٰ ملکۂ بھوپال کے ایک شاہی کمیشن کا ممبر مقرر ہوا پھر وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی ایک کمیٹی منعقدہ بھوپال میں پبلسٹی آفیسر مقرر ہوا اور اس تحریر کے زمانے میں بھی وہ بھوپال لجسلیٹو کونسل اور گورنمنٹ بھوپال کے منتخبہ بورڈ کا ممبر ہے۔

یہ ہیں محلہ چھاؤنی بھوپال میں پیدا ہونے والے ملا رموزی کی ذہنی فتوحات، جن کے مستقبل کے لیے مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ ابھی وہ اور شاندار ہوگا۔

حیات

7 ربیع الثانی 1365 ہجری مطابق 12 مارچ 1946

سردار خاں
روشنائی کے موجد

چوکی مہندی والی یعنی میرے مکان سے جانب شمال یہ حضرت پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب افغانستان کے سلسلۂ باجوڑ سے تھا۔ یہ ویسے ایک سیدھے سادے افغان تھے اور غیر تعلیم یافتہ لیکن دماغی ذہانت اور جدت میں خداساز قابلیت کے مالک تھے۔ ان کے مکان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ محلے کے متعدد حضرات ان کے گرد جمع رہتے تھے۔ مزاج کے بے حد منسکر اور خلیق تھے۔ دُبلے پتلے سن رسیدہ۔

تقریباً 1902 اور 1903 میں وفات پائی۔ مگر اپنی ذہانت کی یادگار چھوڑ گئے۔ یعنی موصوف کی خودساختہ روشنائی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آخر اٹھارہویں صدی تک مصطفائی اور الف خانی روشنائی کا بھوپال میں بے حد کم رواج ہوا تھا اور لکھائی کا کام دفاتر سرکاری اور مہاجنی حلقوں تک محدود تھا، جن کے ہاں کھاتے وغیرہ لکھے جاتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک دوست نذر محمد خاں نے ان سے کہا کہ ہمارے سیٹھ جی کو روشنائی کی بڑی ضرورت ہے جس کے لیے وہ کہتے تھے کہ میرے ہاں ایک روپیہ روز کی روشنائی ہو تو بھی کم ہے۔ سردار خاں کے دماغ میں ایجاد و اختراع کی نہ معلوم کون سی روشنی آئی اور ممدوح نے وعدہ کیا کہ کل ہی دس روپیہ کی روشنائی تیار کردوں گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ روشنائی موصوف نے ببول بڑھ اور بعض ایسے اجزا سے ترکیب دے کر ایجاد فرمائی کہ ہر شخص ان کی اس ایجاد پر حیران رہ گیا اور جب ان کی روشنائی کے نمونے سرکاری دفاتر اور مہاجنی حلقوں میں گئے تو بے حد مقبول ہوئے۔ اور اب سردار خاں کا روزانہ معلوم تھا کہ وہ رات کو روشنائی بناتے تھے اور دن کو ایک مٹی کے چھوٹے گھڑے میں لے کر پہلے مہاجنوں کے حلقوں اور مکاتب میں پہنچاتے تھے اور دو پہر سے سہ پہر تک وہ سرکاری دفاتر میں روشنائی بہم پہنچانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔

جب سردار خاں صاحب کی روشنائی کی کافی شہرت ہوگئی تو متعدد اشخاص نے چاہا کہ ان سے ان کی خودساختہ روشنائی کا نسخہ حاصل کریں اس لیے ایسے حضرات ان کے حلقے میں داخل ہوئے اور متعدد اور مختلف چالاکیوں سے اس نسخہ کو معلوم کرنے اور اُڑا لے جانے کی کوشش میں مصروف رہے، لیکن سردار خاں صاحب کسی کے پھندے میں نہ پھنس سکے۔ افسوس کہ یہ لاجواب اختراع سردار خاں صاحب کے غیر علمی ماحول کے باعث نہ ترقی کر سکی نہ کسی دوسرے کو معلوم ہوسکی ورنہ اس کے ذریعہ جہاں لاکھوں روپیہ کی تجارت ہوتی وہاں بھوپال کی ایک بلو بلیک توڑ صنعت دنیا میں نام پیدا کرتی۔

سردار خاں صاحب نے اس صنعت کو اس وجہ سے اور بھی ترقی نہ دی کہ اس وقت کا ماحول بے حد قناعت پسند اور ضروریات کی اشیاء بے حد ارزاں تھیں، اس لیے روشنائی سے چونکہ ان کے مصارف زندگی کافی طور پر پورے ہوتے تھے اس لیے ان کو مزید دولت وثروت کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ پھر بھی ان کی ذہانت نے بھوپال کی تاریخ کو ایک اختراع اور ایک ایجاد ضرور عنایت فرمائی جس کے احترام میں وہ قابلِ شکر ہیں اور علمی دنیا کے لائقِ فخر انسان۔

ان کے تین صاحبزادے تھے، جن کی عرفیتیں مجھے یاد ہیں، اصل نام یاد نہیں رہے۔ بڑے صاحبزادے نبی، دوسرے جینھی اور تیسرے کی تھے۔ دو کے انتقال کا تو مجھے علم ہے، تیسرے صاحبزادے عرصہ سے نظر نہیں آتے۔

◆◆◆

محمد سعید خاں عرف شمو خاں
نقل و بذلہ سنجی کے ماہر

ان کے والد کا نام محمد یوسف خاں صاحب تھا۔ ان کی پیدائش کا مکان متصل عجائب خانہ ہے جہاں آج کل عجائب خانہ کا باغ ہے۔ اس مکان کی شمالی دیوار پر عجائب خانے کی شمالی دیوار ہے اور اسی کے سامنے سے ایک کوچہ مسجد باجوڑیاں کی طرف ہے۔

ان کے والد صاحب قبلہ چھاؤنی میں بے حد بااثر اور ممتاز لوگوں میں تھے۔ اسی لیے چھاؤنی والے ان کو یوسف خاں بھیا بھی کہتے تھے۔ لفظ ''بھیا'' اس وقت بھوپال میں صرف ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا تھا جو اپنے حلقے میں بااثر اور کسی نہ کسی طرح قائدانہ مقدرت رکھتے تھے۔ یہ بے حد خلیق، ملنسار اور کثیر احباب والے تھے۔ اسی لیے موصوف کے مکان کے بیرونی حصہ میں ہر وقت ایک مجمع سا رہتا تھا۔ یوسف خاں بھیا بذات خود بڑی سادہ سپاہیانہ اور شکاری وضع کے بزرگ تھے۔ شمو خاں مرحوم میں جو بے ساختہ ظرافت نمایاں تھی وہ ان کا پدری ورثہ تھی اور خود یوسف خاں بھیا بھی بے حد ظریف اور قصہ گو بزرگ تھے اسی لیے ان کی ٹولی میں ہر وقت لوگ موجود رہتے تھے۔

افسوس کہ قدیم ماحول کی وجہ سے شمو خاں صاحب مرحوم کی تعلیم نہ ہوسکی البتہ وہ خدا ساز ذہانت وظرافت کے مالک تھے۔ ان میں نقل انعال کی ذہانت اس قدر برجستہ اور بے ساختہ پیدا ہوتی تھی کہ سامعین وناظرین حیران رہ جاتے تھے۔ ان کی ذات اور ظرافت نے بھوپال کی مجلسی زندگی میں نمایاں حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ان کی بذلہ گوئی، نقل اور لطائف کے مقابل محفل رقص وسرود کے تمام دوسرے ارکان معطل سے ہو جاتے تھے اور مقبول سے مقبول طوائف اور بہتر سے بہتر موسیقی کے اساتذہ کو روک کر شرکاء ان کی نقل ولطیفہ کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے بھوپال کی شادی بیاہ کی کوئی مجلس نہ تھی جس میں شمو خاں صاحب انتہائی کوشش اور بڑے سے بڑے معاوضہ پر نہ بلائے جاتے ہوں، حتّٰی کہ ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی کی شہرت جب اونچے حلقوں میں پہنچی تو امرائے شہر میں یہ بڑے اشتیاق سے بلائے گئے اور بھاری معاوضہ وصول کرنے لگے۔

انھوں نے اپنی لطیفہ گوئی اور نقل وبذلہ گوئی سے بیرونِ بھوپال بھی بڑی بڑی تقاریب اور مجالس میں داد وکمال پائی۔ ذہانت اور برجستہ گوئی اس قدر نادر انداز سے پیدا ہوتی تھی کہ عوام تو ایک طرف خواص عش عش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات گفتگو اور زبان قصہ کو قوافی کی ترتیب سے بولنے لگتے تھے جو شعر گوئی کا انتہائی کمال ہے۔ کمال کلام آرائی کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے اعضا اور جسم کے ہر حصہ کو پیچ وخم دینے پر بھی اتنی مقدرت تھی کہ صاحب نقل وواقعہ کے انداز کا جسم اور حلیہ بنا لینے میں ان کو قدرے تکلف نہیں ہوتا تھا اور ظرافت وبذلہ سنجی کی پیداوار اس افراط سے تھی کہ متین سے متین گفتگو بھی جگہ جگہ ظریف فقروں سے شگفتہ ہوتی رہتی تھی۔

احساس واحاطہ کی قوت اس حد تک تھی کہ دردناک اور رنجیدہ حوادث کی نقل سے خود متاثر ہو جاتے تھے۔ ان کی زندگی اور نقل کے سلسلے سے خود میرا اور بعض دوسرے اہل کا ایک خاص عقیدہ یہ ہے کہ جب انھوں نے پلٹن کی ملازمت ترک کر کے شادی بیاہ کی مجالس میں جا کر ایک ایسے فقیر کی نقل کی جو نابینا تھے اور اپنے چہرہ کی خرابی کو مارے حجاب کے ایک ٹاٹ کا ٹکڑا ڈال کر چھپاتے تھے اور سڑکوں پر سوال کرتے پھرتے تھے تو اس کی معذوری کی نقل سے بعض لوگوں نے شمو خاں صاحب کو منع کیا کہ وہ معذور فقیر کی نقل نہ کریں، لیکن وہ اپنے مزاج کی بے باکی سے باز نہ آئے اور ہر محفل میں اس معذور فقیر کے بھیک مانگنے کی نقل کرتے رہے حتّٰی کہ ایک بے حد معمولی سے

آشوب چشم کے سلسلہ سے شمو خاں صاحب کی آنکھیں بھی خراب ہونے لگیں اور ان کے دماغ سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کے خیال و اہتمام کو فطرت نے اس طرح دور کر دیا کہ جب بھی وہ علاج کراتے بہت جلد اس کی پابندی سے اُکتا جاتے اور علاج چھوڑ دیتے نتیجہ وہی ہوا جو فطرت کا منتظم ضابطہ ہے یعنی شمو خاں صاحب بھی نابینا فقیر کی طرح کافی بینائی سے محروم ہو گئے اور باوجودیکہ ان کو متعدد امراء کا قرب و حضور اور اشتیاق حاصل رہا مگر وہ آنکھوں کی محرومی کو ان کی مقدرت علاج سے بھی دور نہ کر سکے۔ بارے وہ اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی کے سلسلہ سے بھوپال کے عوام و خواص میں جو شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے اس کے لحاظ سے گویا وہ شاہ ظرافت تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جس طرف سے گزرتے تھے ان سے بات کیے بغیر لوگ صرف ان کو دیکھ کر ہنسنے لگتے تھے جو ان کی ظریفانہ قابلیت کا کمال کشش تھا۔

افسوس کہ بھوپال اور بیرونِ بھوپال کی شادی بیاہ ایسی مسرت ہی مسرت محافل کو اپنے کلام وافعال سے شاداب پانے والے اس بذلہ سنج انسان نے انتہائی مالی تباہیوں میں 16 را کتوبر 1945ء کو انتقال فرمایا اور چونکہ میں خود ان کے جنازہ میں شریک تھا اس لیے اس صاحبِ کمال ظریف کے جنازہ کی اداسی بے حد دل شکن اور دنیا کی بے مہری کا عبرت ناک ثبوت تھی۔ مرحوم سے تین اولادیں ہیں جن میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔

افسوس کہ آپ کی والدہ صاحبہ آپ کے انتقال کے بعد بھی زندہ رہیں اور تقریباً اس صدمہ کو ایک ماہ 28 دن برداشت کر کے 12 دسمبر 1945 کو راہیِ ملکِ باقی ہوئیں۔ اناللہ۔

◆◆◆

محمد حسین خاں
کبوتری پرواز کے موجد

متصل مکان سردار خاں روشنائی ساز محلہ چھاؤنی کا جو شمالی رُخ نوبہار سے متصل ہے یہ ان کا مکان تھا اور اسی جگہ سے اس موجد کے کمالِ فن کا آغاز ہوا۔

آپ کو کبوتر بازی سے فطری لگاؤ تھا اور اس عہد میں کیا آج بھی کبوتر بازی بعض خاص صورتوں میں نفع رساں یا کم سے کم بری چیز نہیں سمجھی جاتی۔ اسلاف نے اس پرند کی غیر معمولی ذہانت سے پیغامبری کا کام بھی لیا ہے اور ان کے بعد آج یورپ نے بھی ایشیا کے اس ذریعۂ خبر رسانی سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔

محمد حسین خاں مرحوم نے عوام کی طرح اس شوق پر قناعت نہ کی بلکہ اس میں غضب کی ایجاد سے کام لیا اور اگر ماحول سازگار ہوتا تو وہ اس پرند کی تربیت کے بعض نادر اصول بھی وضع کرتے اور آنے والوں کے فائدہ کے لیے چھوڑ جاتے۔ مگر محض بے حد ذوق سے انھوں نے کبوتروں کو ایک لکڑی کی سیٹی کے ذریعہ اُڑنے کی یہ حیرت ناک تعلیم دی کہ ایک قد آدم چھتری پر ان کو بٹھانا شروع کیا اور بعض وقت چھتری کے عوض ایک قد آدم لکڑی پر ایک آڑی لکڑی فٹ کر کے اس پر بٹھایا جس کو کبوتر بازوں کی اصطلاح میں اڈہ کہتے ہیں۔ جب کبوتر اس اڈہ پر بیٹھنے کے عادی ہو جاتے تو یہ

بانس لے کر کھڑے ہو جاتے اور کبوتروں کو مٹھی میں دبا کر زیادہ زور سے اوپر کے رُخ پر چھوڑتے۔
اب اگر کبوتر جلد اڈے کی طرف لوٹتے تو یہ بانس سے ان کو روک کر پھر اونچی پرواز پر مجبور کرتے۔

یہ طریق پرواز میں نے خود دیکھا تھا لیکن کم عمری کے باعث میں ان کے اس طریق تعلیم کو نہ دریافت کر سکا نہ یاد رکھ سکا کہ وہ کس طرح سیٹی کی آوازوں کے اتار چڑھاؤ، آواز کی تبدیلی اور آواز کی تعداد سے کبوتروں سے یہ غضب کا کام لیتے تھے کہ سیٹی کی ایک آواز سے کبوتر پہلے مکانوں کے برابر پرواز کرتے تھے۔ پھر دوسری آواز سے وہ پوری تعداد میں دو ٹکڑوں یا دو جماعتوں میں تقسیم ہو جاتے تھے اور تیسری آواز سے وہ کافی سے زیادہ بلند ہو جاتے تھے حتیٰ کہ نظر ان کی بلندی کو معلوم کرنے سے قاصر رہتی تھی۔ میرے خیال میں بلندی کے معیار میں اور بھی کبوتر باز ان سے بازی لے جاتے ہوں گے، مگر ان کے اس کمال کا جواب شاید آج بھی نہ ملے کہ محض ان کی سیٹی کی آواز سے اتنی عظیم بلندی سے کبوتر تین طرح کے کام کرتے تھے۔ ایک یہ کہ معاً پرواز کو درجہ درجہ کم کر کے نیچے آتے تھے اور سیٹی کی خدا جانے کس نوع کی آواز سے اتنی بلندی سے پر توڑ کر نیچے آتے تھے کہ دیکھنے والے کو محسوس ہوتا تھا گویا آسمان سے بجلی کی رفتار سے گیندیں زمین پر گر رہی ہیں۔
تیسری آواز کے کمال کا جواب میں نے آج تک دیکھا تو کیا سنا بھی نہیں اور وہ آواز تھی باز اور بہری ایسے شکاری پرندوں سے کبوتروں کو بچانے کی۔

اس کا کمال یہ تھا کہ جب کبھی پرواز کے عالم میں کوئی باز یا بہری استاد کے کبوتروں پر حملہ کرتی تو جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دونوں شکاری پرندوں سے پھر شاطر سے شاطر کبوتر کا بچ رہنا محال ہو جاتا ہے لیکن میں تو اس جادو سے اب بھی حیران ہی ہوں کہ جیسے ہی کہ باز یا بہری استاد کے کبوتروں پر حملہ کرتی، استاد انتہائی اطمینان سے بلند تر کبوتروں کو سیٹی کی کمانڈ سے بچانا شروع کر دیتے تھے اور تنہا میں نہیں بلکہ حملہ کے وقت محلے والے اور راہگیر تک جمع ہو کر بہری کے طوفانی حملوں سے استاد کے بچانے والی سیٹی کی آوازوں اور کبوتروں کا عین اس سیٹی کی آوازوں کے مطابق بہری کو دھوکے دینا دیکھ کر عش عش کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ ایسے ہی ناقابلِ فہم اصول سے صحیح سلامت نیچے اتر آتے تھے اور بہری و باز کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔
استاد کا دوسرا کمال یہ کہ وہ ہر سال عشرۂ محرم کے دن کربلا کے میلے میں عین بڑے تالاب

کے کنارے اپنے کبوتروں کا اڈہ گاڑتے تھے اور کبوتر اڑاتے تھے۔ یہاں ان کا کمال یہ تھا کہ ہزارہا انسانوں کے ہجوم کے بالکل وسط سے یہ کبوتر اڑتے اور پورے تالاب، احمد آباد اور عیدگاہ کے پہاڑ پر پرواز کر کے اسی وقتی اڈے پر واپس آجاتے تھے، جو سال بھر میں صرف ایک دن ہزاروں انسانوں کے ہجوم کے بیچ میں گاڑا جاتا تھا۔

استاد محمد حسین مرحوم کا یہ کمال جتنا بھی نادر اور یادگار ہے اس کے بعد ان کو ایک خاص فن کا موجد تسلیم کرنا اصولاً صحیح اور مسلّم ہو جاتا ہے، لیکن موصوف کا کمال اسی جگہ ختم نہیں ہوتا بلکہ موصوف کو دوسرے بے شمار پرندوں اور سانپ سے بھی اس غضب کا شغف تھا کہ تصور حیران رہ جائے۔ چنانچہ مجھے خبر نہ تھی کہ میں ان کے جن کمالات کو ایک تماشائی بچہ کی طرح دیکھ رہا ہوں کبھی خود مجھے ان کے ان موجدانہ اور محققانہ کمالات پر لکھنا ہوگا ورنہ بعید و محال نہ تھا کہ میں ان سے ان کے تمام اصول و قواعد معلوم کر لیتا۔ چنانچہ ممدوح کا کمال حیوان دانی ملاحظہ ہو کہ ایک مرتبہ موصوف خدا جانے کہاں سے اور کس ذریعۂ تحقیق سے ایسی چڑیا پکڑ لائے کہ اس کو پچاس پچیس آدمیوں کے سامنے گلا گھونٹ کر مار ڈالتے اور جب مجمع کا ہر شخص اسے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق مردہ تسلیم کر لیتا تو استاد اس مری ہوئی چڑیا کو ہاتھ میں دبا کر پھونک مار کر اوپر کی طرف پھینک دیتے اور چڑیا پھینکتے ہی پرواز کرنے لگتی اور پھر استاد کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جاتی۔

اسی طرح موصوف ہر قسم کے سانپ کو اس تیزی سے ہاتھ سے پکڑ لیتے تھے کہ دیکھنے والا لرز جاتا تھا۔

جناب گرامی میاں محمود علی خاں صاحب اور جناب گرامی ننھو میاں صاحب جاگیردار شاہ جہاں آباد بھوپال بہ فضل خدا ہنوز بقید حیات ہیں، یہ دونوں معززین شہر استاد محمد حسین خاں صاحب مرحوم کے کمالات اور امتیازی کارناموں کے ملاحظہ فرمانے والے ہیں۔ خصوصاً ننھو میاں صاحب جن کے ہاں استاد مرحوم رہتے تھے۔ استاد کے مافوق العادت کمالات اور غیر معمولی تندرستی اور قوت کا ذکر فرماتے ہوئے بار بار فرماتے تھے کہ استاد انسان نہیں جن تھے۔ چنانچہ استاد کی قوت و تندرستی کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ تین مانی گیہوں سے بھری ہوئی گاڑی کو شانے کے زور سے اس طرح اٹھائے رہے کہ گاڑی والے نے نئی لکڑی گاڑ کے پہیے میں فٹ کر دی۔

ایک مرتبہ تجو میاں صاحب کے والد بزرگوار کے ہمراہ شکار میں گئے۔ موصوف نے سامر پر گولی چلائی وہ گر گیا۔ استاد ذبح کرنے گئے تو وہ تڑپ کر بھاگا اور یہ اس کی کمر پر سوار ہو گئے۔ وہ سخت جھاڑیوں اور کانٹے دار درختوں سے رگڑ کھاتا ہوا بھاگا مگر استاد اس کی کمر پر سوار رہے اور کمر سے نیچے نہ گرے حتیٰ کہ وہ ایک پہاڑی کی نشیب میں گر کر مر گیا تو استاد بھی زخموں کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر گئے۔

ہر قسم کے پھوڑے پھنسی اور خراش پر وہ سرخ مرچ پیس کر لگا لیتے تھے اور اس کی اذیت کو محسوس تک نہیں کرتے تھے۔ آخری کمال یہ کیا کہ جنگل سے ایک سامر کے بچہ کو لائے، جب وہ بڑا ہوا تو گھوڑے کی طرح اس پر سواری شروع کی اور شاہی باورچی خانے کی ملازمت میں اسی سامر پر سوار ہو کر باورچی خانے جایا کرتے تھے۔

استاد مرحوم کے مرچ سے زخموں کو اچھا کرنے کے سلسلے سے تجو میاں صاحب نے ایک واقعہ اور سنایا جس سے میری حیرت کی حد نہ رہی گویا مرحوم کو تمام جانوروں کے سائنٹفک خواص کی پہچان کا خدا جانے کوئی الہامی ملکہ تھا جس کے تحت انھوں نے داد جیسے موذی مرض پر گھاس میں پیدا ہونے والے ایک چھوٹے سے کیڑے تیلن کو داد پر مل کر اچھا کر کے دکھا دیا۔

مرچ سے پھوڑے کے اچھا کرنے اور سامر کو گھوڑے کی طرح استعمال کرنے سے مجھے خیال ہوا کہ شاید کوئی وقت آئے اور بھوپال میں استاد کی ان دونوں ایجادوں پر غور کر کے انسانی وسائل زندگی میں اضافہ کیا جائے جب کہ دونوں چیزیں انسان کے حق میں استاد مفید ثابت کر گئے۔

استاد مرحوم کے پاس سانپ کے کاٹے کی ایک جڑی تھی جس کو معا پی لینے سے زہر اثر نہیں کرتا تھا۔ اس لیے ایک مرتبہ استاد کو سانپ نے کاٹا۔ اُس وقت موصوف کے پاس وہ جڑی نہیں تھی، دیر میں استعمال کرنے سے زہر کے اثرات باقی رہ گئے تھے جن کے سلسلہ سے استاد قبلہ ایسا موجد و محقق اشیاء تین ماہ بعد رحلت فرما کے عالم باقی ہوا۔ انا للہ

مرحوم پہلوان اور غضب کے شہ زور تھے۔ منگلوارہ میں آپ کا اکھاڑہ بھی تھا۔ اس فن میں بھی آپ خصوصی کمالات کے مالک تھے۔ اب موصوف سے ایک صاحبزادے ہیں جن کا نام فرزند علی صاحب ہے اور لوہے بازار بھوپال میں ٹیلر ماسٹری کا کام کرتے ہیں۔

◆◆◆

مقفیٰ گفتگو کا موجد

ذہانت اور اختراعی وایجادی برجستہ گوئی کا یہ عجیب العجیب مالک محلہ چھاؤنی ولاینیان میں پیدا ہوا اور الحمدللہ کہ موصوف ہنوز بقید حیات ہیں، لیکن کہیں باہر چلے جانے کے سبب ان کے حالات اور ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا، اس لیے تکمیل فہرست کے طور پر یہ سادہ صفحات ان کی یاد میں چھوڑے جا رہے ہیں۔

استاد عثمان پہلوان
طوفانی کشتی کے ماہر

صحت اور تندرستی کی بقا اور اس کے اضافہ میں ہندستان میں پہلوانی کے فن کو فنون لطیفہ میں جو رتبہ حاصل ہے اس کا انتہا سے زیادہ دل خوش کن حاصل یہ ہے کہ میرے ان سطور کے لکھتے وقت یعنی مارچ 1946 میں تمام دنیا کی شہ زوری اور مردانہ طاقت اور تندرستی کا ریکارڈ تمام دنیا کے شہ زوروں سے مقابلہ کر کے ہندستان ہی نے گاما پہلوان کے ذریعہ حاصل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا کی متمدن قومیں تسلیم کرتی ہیں کہ مردانہ ورزشوں کے ذریعہ قسم اعلیٰ کی جسمی طاقت اور لاجواب تندرستی میں ہندستانی پہلوانی کے فن کو مرتبہ اعلیٰ حاصل ہے، لیکن اس پر بھی ہندستانیوں کی کوتاہ نظری کا یہ عالم خاص طور پر لائق مضحکہ ہے کہ جدید نسل کے نوجوانوں کو اس مسلم الثبوت طریق تندرستی کو ترک کر کے یورپی ورزشوں سے تباہ کرایا جا رہا ہے اور اس پر لے درجہ کی حماقت کا نام روشن خیالی رکھا گیا ہے۔

بارے استاد محمد عثمان پہلوان اسی فن اعلیٰ کے امتیازی رکن اور صاحب ایجاد ہیں۔ موصوف محلہ چھاؤنی ولایتیان متصل مکان چچا عبدالصمد صاحب مرحوم، اس مکان میں پیدا ہوئے جو آج

کل محمد یوسف خاں صاحب عرف ''لالودادا'' یا پٹھان کا مکان ہے۔ یہ مکان بڑی چھاؤنی کے سلسلۂ مکانات میں مومن پورہ کے انتہائی جنوبی رخ پر واقع ہے۔ محمد عثمان خاں صاحب کے بڑے بھائی حافظ کبرے کے نام سے منسوب تھے جن کا ذاتی اور نہایت مشہور اکھاڑہ اتوارہ دروازہ کے اندر تھا، اس لیے محمد عثمان خاں صاحب کو یہ شوق گویا خاندان ہی سے بطریق سلسلہ اور ورثہ ملا۔

جس زمانہ میں محمد عثمان خاں صاحب نے پہلی کشتی لڑی ہے یہ وہ وقت تھا جب وسطی ہند اور راجپوتانہ کی بعض ہندو ریاستوں کے رئیسوں کو بھی اس فن سے خاصا لگاؤ تھا۔ خصوصاً ریاست اندور اور ریاست ٹکڑائی اس فن کی سرپرستی اور قدر افزائی کے اچھے مرکز تھے۔ اسی لیے ان ریاستوں کی اس فن سے متعلق قدر افزائی کی شہرت سے ہندستان کے ہر گوشے کا پہلوان اور نامور زور آور انسان یہاں پہنچ کر داد شہ زوری حاصل کرتا تھا۔ عثمان خاں صاحب کو شروع ہی سے ایک خاص نعمت یہ حاصل تھی کہ ان کا جسم اس قدر جاذب نظر اور حسین تھا کہ ہر دیکھنے والا محض ان کی تندرستی کے حسن سے متاثر ہو کر خود پہلوان ہونے پر حریص ہوتا تھا۔ ان کی دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے میں نے اس کتاب میں ان کو شامل کیا، کشتی لڑنے کا وہ خصوصی ڈھنگ تھا، جس کو آج کل کی اصطلاح میں ''طوفانی کشتی'' کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں خود ان کی کشتیوں میں شریک رہا ہوں اور ریاست اندور تک میں ان کی کشتی دیکھی ہے۔ لہٰذا ان کی کشتی کی انتہائی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس دنگل میں ان کی کشتی کا اعلان ہوتا تھا اس کشتی کے دنگل کی ایک ہی آمدنی سے ٹھیکہ دار مالدار بن جایا کرتا تھا۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ ان کی کشتی والے دنگل میں ہمیشہ مقرر ٹکٹ کی تعداد ختم ہو جایا کرتی تھی اور ٹھیکہ دار صرف زبانی اجازت دے کر تماشائیوں کو دنگل میں جگہ دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ان کی طوفانی کشتی کا یہ عالم تھا کہ ان کا مقابل لنگوٹ باندھ کر جیسے ہی دنگل کے علاقہ میں قدم دھرتا یہ اس کو اکھاڑے کے اندر تک نہیں جانے دیتے تھے اور بس کمال یہ تھا کہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید پلک جھپکتے ہی میں اس کو چاروں شانے چت کر کے رکھ دیا۔ میں نے ان کشتی ہارے ہوئے پہلوانوں سے خود سنا ہے کہ وہ ان کے داؤ کے جادو کو سمجھنے اور خود اس کا توڑ کرنے سے پہلے ہی ان کے داؤ کی طوفانی ترکیب سے چت ہو جاتے تھے۔

میری کتاب میں استاد ممدوح کا تذکرہ ان کی مذکورہ بالاخصوصیت اور امتیازی کشتی کے سلسلہ سے کیا گیا ہے، لیکن اس پر مزید خصوصیت ان کا ایک داؤ بنام "لوکان" ہے۔ یہ داؤ کشتی کے فن میں قدیم داؤ ہے، لیکن جس طرح قدیم علما کے ترجمہ کو "گلابی اردو" کے عنوان خصوصی سے مجھ نیاز مند نے اپنالیا عین اسی طرح اس قدیم داؤ پر استاد عثمان پہلوان نے وہ قدرت حاصل کی کہ ان کی کشتی کی ذہانت کو چار چاند لگ گئے اور پنجاب ایسی پہلوان گر سرزمین کا نامور سے نامور پہلوان ان کے اس داؤ کا نہ توڑ کر سکا نہ بچ سکا۔ یعنی وہ اس کمالِ قدرت سے اپنے مقابل پر یہ داؤ کرتے تھے کہ اس فن کے بہترین مبصرین بغور دیکھنے پر بھی ان کی اُس نازک ترکیب کو محسوس و معلوم نہ کر سکتے تھے جس پر اس داؤ کی کامیابی منحصر تھی۔ پھر اس داؤ میں ان کا طوفانی انداز اور بجلی کی طرح کے اتار چڑھاؤ اور دھوکے، مقابل کے دماغ کو پل کے پل میں شکست کر دیتے تھے کہ وہ ان کے داؤ کا توڑ ہی گویا بھول جاتا تھا۔

عثمان پہلوان کے اس داؤ نے دور دور شہرت پائی اور بے شمار کارآزمودہ پہلوان اس کا توڑ کرنے آئے مگر ان کے اس خداداد داؤ کا توڑ نہ کر سکے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ جس طرح استاد موصوف دوسرے پر داؤ پر داؤ کا تار باندھ دیتے تھے عین اسی طرح وہ مقابل کے تیز اور لگا تار داؤ سے بھی اس کمال عجلت اور استادی سے بچتے رہتے تھے کہ بے شمار ناظرین صرف ان کے مسلسل بچتے رہنے پر حیران رہ جاتے تھے۔ ان کی کشتی کا ایک بے حد حیران کن اور دلکش انداز یہ تھا کہ جب مقابل ان پر کوئی پُر غضب حملہ سا کرتا تھا تو یہ عین اس جگہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ رہتے تھے۔ جہاں مضبوط سے مضبوط پہلوان چیخ پڑتا تھا۔

واضح ہو کہ دنگل اور کشتی میں شدید چوٹ آجانا، سخت قوت سے مقابل کو ضرب لگانا قانونی جرم نہیں ہے۔ ادھر پہلوانوں میں عموماً رحم دل ہو کر مقابلہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے میں نے خود دیکھا ہے کہ فنِ کشتی کے خلاف بعض پہلوانوں نے استاد کو بدحواس کر دینے کے عوض داؤ کے ذریعہ سخت ضربات لگانا شروع کر دیا، جس سے استاد کو غصہ اور دل تنگ ہو جانا چاہیے تھا، لیکن تمام بھوپال گواہ ملے گا کہ استاد پر جتنی شدید ضربات لگائی جاتی تھیں استاد اتنے ہی زیادہ حسین اور ہوشمند بنتے جاتے تھے اور عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ کبھی مقابل کی کسی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے تھے۔ حالانکہ ان کو

بدلہ لینے کا حق حاصل تھا۔ چنانچہ بہ سبیل تذکرہ ان کی عالی ظرفی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ استاد عثمان پہلوان میرے محترم چچا سید عبدالصمد صاحب کے شاگرد ہیں جو معلے جناب نواب احتشام الملک بہادر غفران مکان کے استاد و معتمد خصوصی تھے اور نواب سر عالی جاہ کے استاد و معتمد خصوصی، اس لیے چچا صاحب قبلہ مجھے بھی ایک دنگل میں اپنے ہمراہ لے گئے۔ قبلہ چچا صاحب قدیم متوسلین شاہ کے انداز میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہا کرتے تھے اور گھوڑے پر سوار ہو کر کسی جگہ جاتے تھے تو معلی جناب نواب احتشام الملک بہادر کا عطا فرمایا ہوا ایک جواہر بار چھرا کمر سے باندھے رہتے تھے۔ چنانچہ ممدوح کے مرتبہ اور فن دانی کے لحاظ سے محمود علی استاد نے ان کو کشتیوں کا جج بنا کر اکھاڑے کے قریب ان کی کرسی لگادی اور چچا میاں مرحوم تمام کشتیوں کے فیصلے فرماتے رہے۔ آخر میں ان کے شاگرد یعنی استاد عثمان پہلوان کی کشتی شروع ہوئی۔ اتفاق سے ان کا مقابل بے حد طاقتور ہی نہیں بلکہ غضبناک اور ان کی شہرت و مقبولیت کا حاسد تھا۔ اس لیے اس نے پوری طاقت سے عثمان پہلوان کو اپنے نیچے لا کر نہایت بے رحمی سے ان کا ایک ہاتھ توڑ ڈالنے کی کوشش شروع کی، مگر یہ ترکیب چونکہ کشتی کے قواعد کے اندر تھی اس لیے اس کو عوام نہ سمجھ سکے۔ مگر قبلہ چچا صاحب چونکہ خود اس فن کے ماہر تھے وہ تاڑ گئے، اس لیے انھوں نے ایک آدھ مرتبہ اس پہلوان کو منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آیا تو قبلہ چچا میاں اس قدر برافروختہ ہوئے کہ مجھے اپنا چھرا دے کر سر سے سیلا اتار کر خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے اور اپنے شاگرد کی محبت میں غضبناک ہو کر اس مارنے والے پہلوان پر جھپٹے جس پر تمام تماشائیوں نے چچا جان کی تائید کی اور دنگل میں اس پہلوان کے خلاف شدید ناراضگی پھیل گئی اور بڑی دشواری سے مجمع قابو میں آیا، لیکن تمام دنگل اور اپنے اتنے بڑے بااثر استاد کی حمایت حاصل ہونے پر بھی عثمان پہلوان شدید ضربات برداشت کر کے مقابلہ میں اُسی دلکش تبسم اور جرأت سے ڈٹے رہے اور جب کوئی کہتا کہ مقابلہ کو برابری پر ختم کر دیا جائے تو عثمان پہلوان جھنجھلا کر فرماتے کہ ہرگز نہیں آپ لوگ ہٹ جائیں اور میرے مقابل کو دل کھول کر مجھ پر حملہ کرنے دیں، میں تھوڑی دیر میں بتادوں گا کہ کشتی کسے کہتے ہیں۔ نتیجہ یہی نکلا کہ مسلسل ضربات کھانے پر بھی عثمان پہلوان نے حوصلہ نہ ہارا اور اپنے داؤ کا موقع نکالتے رہے حتیٰ کہ چند ہی منٹ میں پورے دنگل نے دیکھا کہ استاد عثمان پہلوان اپنے مقابل کو نہایت واضح شکست دے کر اپنے استاد سید عبدالصمد صاحب قبلہ

کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ غرض بھوپال کی ورزشی تاریخ میں استاد عثمان پہلوان کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسرے بھوپالی پہلوان کو حاصل نہیں۔

موصوف نے چونکہ کشتی کے فن میں جو طوفانی انداز اختیار کیا تھا وہ حیرت ناک اور امتیازی کمال تھا، اس لیے استاد نے نہ فقط بھوپال بلکہ بڑودہ، سورت، جبل پور، کانپور، الٰہ آباد، متھرا، بروائی اسٹیٹ اور اندور میں بھی اپنے کمالِ فن کے کافی اور کامیاب مظاہروں سے ان حدود کے باشندوں سے کافی انعامات حاصل کیے۔

بھوپال میں استاد عثمان خاں شہریار اسلام اعلیٰ حضرت تاجدار بھوپال دام اقبالہٗ کے الطافِ خسروانہ اور بے پایاں نوازشوں کے بے حد معترف و شکرگزار ہیں۔

استادفنِ کشتی کے سوا جسم کے جوڑ اتر جانے، ہڈی کو جوڑ دینے، رگ پٹھوں کی خرابی کو دور کر دینے میں جو یدِ طولیٰ رکھتے ہیں وہ بجائے خود موصوف کا دوسرا امتیازی کمال ہے۔ چنانچہ خود مجھے اپنے ہاتھ کی ایک تکلیف میں استاد کے نسخہ نے جو فائدہ دیا میں اس پر موصوف کی امتیازی ذہانت کا پرجوش طریق پر معترف ہوں اور بفضل خدا آج بھی استاد اپنے اس فنی کمال علاج سے روزانہ معذورین کی بے معاوضہ خدمت میں معروف رہتے ہیں۔ خدا صحت عطا فرمائے۔ آمین۔

◆◆◆

حفاظ کا مرکز

بھوپال اور چھاؤنی اپنے اس مختصر سے حلقے پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ چھاؤنی کا یہ وہ مغربی حلقہ ہے جس میں خصوصیت سے مومن انصار برادری آباد ہے، جن کے مکانوں کے سلسلہ کے کہیں وسط میں، کہیں کناروں پر اور کہیں مکان اندر مکان کی صورت میں چھاؤنی کے پٹھانوں کے مکانوں کا سلسلہ ہے۔ بعض ایسے مکانات بھی ہیں جن کی ایک دیوار کا مالک پٹھان اور دوسری کا ایک انصاری بھائی ہے۔ یہ حضرات ہمیشہ سے نہایت درجہ مذہبی شغف وعقیدے کے لائق صد احترام لوگ رہے ہیں اور چونکہ اس محلّہ کے آبادکاروں کی ذہنیت اور ماحول بھی مذہبی تھا اس لیے اسلامیات کے ہر عنوان کی زندگی میں یہ دونوں جماعتیں بے حد شیر وشکر ہیں اور بجز کاروباری ترقی کے ایک دوسرے کے تمدنی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور دینی شعبات عمل وزندگی میں کبھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا گیا۔

بھوپال کے اس محلّہ چھاؤنی ولا یتیان کے اس حلقے نے اسلامیات خصوصاً حفاظتِ قرآن کی خدمت کے سلسلہ سے بھوپال اور محلّہ چھاؤنی کے شرف واعزاز کو نہ فقط حدود بھوپال میں سربلند فرمایا بلکہ اس محلّہ کے حفاظ ہندستان اور افریقہ تک کے دور دراز گوشوں میں پہنچ کر خود جس حد تک نامور اور معزز ہوئے اس سے بھوپال کی اسلامی عظمت وشہرت کو تاریخ اسلامیات میں چار چاند

لگ گئے۔

اسی کروڑ مسلمانوں کا بے اختلاف یہ عقیدہ ہے کہ قرآن ایسی الہامی اور الٰہی کتاب کے حفظ یاد کر لینے کا علمی سبب یہ ہے کہ اس خدائی کتاب کے نزول کے وقت لکھائی چھپائی کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ مکے مدینے میں اس معرکہ آرا کتاب کی بکمال صحت طباعت کے امکانات و وسائل کم محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے مسلمانوں کے خلیفۂ اول سیدنا صدیق اکبرؓ نے اس کتاب مقدس کو سینوں میں محفوظ رکھنے کی ابتدا کی۔ چونکہ اس عمل سے مقصود کتاب الٰہی کی بکمال صحت حفاظت تھی اسی لیے دینداروں میں حافظ قرآن کے مراتب بے حد معزز و محترم تسلیم کیے گئے ہیں جس سے مسلمانوں کے کسی عقیدے اور قبیلے کے فرد کو انکار نہیں۔

محلّہ چھاؤنی ولایتیان بھوپال کی اس برادری کے بزرگوں نے جس کمال عزم و قناعت سے اپنی صنعتِ پارچہ بانی کو محفوظ رکھا اس سے کہیں زیادہ جوش و ولولے کے ساتھ وہ حفظِ قرآن میں بھی نہ فقط اس زمانے میں ثابت قدم رہے بلکہ آج بھی یہ شرف تنہا اسی محلّہ کو حاصل ہے کہ اس میں درس قرآن کے متعدد مکتب جاری ہیں اور شبہ نہیں کہ اس سلسلۂ محترم کے بقا و استحکام اور قدر افزائی میں محترم فرمارو ایانِ بھوپال نے بکمال شغف و احترام کافی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

حفاظ کے اس مرکز کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ہر سال ماہ رمضان المبارک میں یہاں کے حفاظ کو قرآن خوانی اور تراویح کے لیے ہندستان کے ہر گوشے میں بصد تکریم و توقیر بلایا جاتا ہے جس سے اس مرکزِ دینی کی یاد مسلمانانِ ہند کے دلوں میں تازہ رہتی ہے۔ تعداد حفاظ کے لحاظ سے جتنے حفاظ اس محلّہ نے پیدا کیے ہندستان میں اس کی مثالیں ہوں گی تو ضرور لیکن کم۔

◆◆◆

چھاؤنی کا پہلا لکھ پتی انصاری:

سیٹھ حافظ حاجی محمد عبدالرحمٰن عرف حافظ کلا صاحب مرحوم

میرے اس سلسلۂ تحریر کا تنہا یہی مقصد نہیں ہے کہ یہ امتیازی بھوپالیوں کا ایک ''شاہنامہ'' سا بن کر رہ جائے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ان حضرات کے کمالات اور امتیازی کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے شمع اصلاح وترقی بھی بنایا جائے اور خود پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ان بزرگوں اور بھائیوں کے حالات پڑھ کر خود کو ان کا صحیح جانشین ثابت کریں۔

چنانچہ روپیہ اور ثروت کو دنیا کی زندگی میں جو رتبہ اعلیٰ حاصل ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لہٰذا علم وہنر کے بیش قیمت نمونے نامکمل سے رہ جاتے اگر میرے اس سلسلہ میں ایک آدھ نمونہ روپیہ اور اس کے حصول وصرف کا اسی امتیازی حیثیت سے نہ مل جاتا جو میرے اس سلسلہ کی شرط اول ہے یعنی امتیازی اور اجتہادی حیثیت۔

چنانچہ خوش ہوں کہ مجھے میرے مکان کے قریب ہی حافظ کلا صاحب مرحوم کی مالی ترقی کی امتیازی مثال مل گئی۔ مرحوم تقریباً 1886 میں محلّہ چھاؤنی متصل مسجد موسنان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب مرزا جی کے نام سے مشہور تھے اور اسلامی وضع اور اخلاق کے قابل مثال نمونہ تھے۔ آداب اسلاف کے بے حد پابند، اس لیے حافظ کلا صاحب مرحوم کی تعلیم وتربیت بھی اسی

انداز کی ہوئی۔ چنانچہ حافظ کلا صاحب نے سب سے پہلے حفظ قرآن فرمایا اور اس کے ساتھ ہی اردو کی تعلیم بھی پائی۔ مرزا جی صاحب غلہ کے بہت بڑے تاجر تھے، مگر حافظ کلا صاحب کو شروع ہی سے اپنی برادری کے کاروبار سے لگاؤ تھا۔ وہ ایک دولت مند کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے تھے مگر ان کے والد نے شروع ہی سے ان کو محنت کی زندگی اور بے حد سادہ وضع کی معاشرہ کا عادی بنایا تھا۔ اس لیے انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی برادری کے کام کو سنبھالا یعنی خود پگڑی بکتے تھے اور پگڑی کے سوت کا کاروبار کرتے تھے حتیٰ کہ ابتدائی حالت سے گزر کر موصوف نے بیرونِ بھوپال پگڑی، سیلے اور منڈیل کے کاروبار کا آغاز کیا۔

یہ زمانہ 1911 سے 1934 تک کا وہ زمانہ ہے جب راجپوتانہ اور وسطی ہند کی تمام آبادی اور ہندو ریاستوں کے امراء و روٗسا اور دولت مندوں میں سر کے لباس میں پگڑی، سیلے اور منڈیل کو کافی اہمیت حاصل تھی اس لیے موصوف نے بھوپال کی تمام انصاری برادری کی اس صنعت کو راجپوتانہ اور وسطی ہند کی ہندو منڈیوں میں پہنچانے کا کاروبار شروع کیا اور ہزاروں کی تعداد میں پگڑی، سیلے اور منڈیل براہِ اندور اسٹیٹ، رتلام، اجین، گوالیار اور اجمیر فروخت کرنے کا بندوبست فرمایا۔ اِدھر اندرونِ بھوپال جملہ انصار بھائیوں کو اس صنعت کے جملہ لوازم فراہم کرنا شروع کر دیا۔ جن گھرانوں میں مالی کمزوریوں کے باعث یہ صنعت کمزور ہوگئی تھی ان کو مالی امداد اور قرض دے کر کام کرنے کے قابل بنایا۔ قرض اور امداد کے اصول حد سے سوائے وہ آسان اور قابلِ برداشت رکھے جس کی وجہ سے بھوپال اور سیہور میں بے شمار بھائی اپنے کرے ہوئے کاروبار کو دوبارہ ترقی دینے کے قابل ہوگئے۔ خصوصاً عورتوں کو پردہ اور گھر کے اندر رہ کر ہی روزی کمانے کے باعزت وسائل حاصل ہونے سے روزی اور کام کی تمام سہولتیں فراہم ہوگئیں کیونکہ حافظ صاحب کو میں نے خود دیکھا تھا کہ وہ سوت اور دوسرے لوازم خود لے کر گھر گھر جاتے تھے اور انتہائی رازدارانہ انداز سے انصاریوں کے گھروں میں تقسیم کرتے تھے۔ گو لوگ ان کے زیرِ بارِ کرم تھے اور ان کے قرضدار بھی، مگر حافظ صاحب نے کسی کے ساتھ کبھی بھی کسی سرمایہ دارانہ دباؤ اور سختی سے کام نہ لیا۔ حتیٰ کہ ان لوگوں سے اس نوع کا ربط وضبط رکھا کہ اکثر اوقات ان کے زیرِ اثر کام کرنے والوں کے گھروں میں کھانا بھی کھاتے تھے اور اس گھر کے ہر رکن سے انتہائی مساویانہ اور

برادرانہ انداز سے مذاق ودل لگی بھی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے زیر اثر کام کرنے والے گھرانوں کے بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں ان کی عزت کرتی تھیں۔ اسی خلق وصلاحیت سے وہ بیرون بھوپال کی ہندو مسلمان تجارتی منڈیوں میں کام کرتے تھے جس کی وجہ سے تمام لکھ پتی ہندو مسلمان تاجر حافظ صاحب کے نہ فقط اس وقت بلکہ آج تک مداح ومعترف ہیں۔

اب ان کے کاروبار نے کافی ترقی کی اور انھوں نے اپنے سلسلۂ تجارت کو بمبئی، احمد آباد گجرات اور کلکتہ تک ترقی دے دی اور سوت کے وسیع لین دین کو ہاتھ میں لیا اور شبانہ روز کے سفر اور طویل گشت کے سلسلہ سے وہ دنوں باہر رہنے لگے اور ہزاروں روپیہ کا نفع ایک ہی سودے سے حاصل ہونے کا زمانہ بھی آ گیا۔ اور اب وہ مالی اور کاروباری حیثیت سے تمام مومن برادری میں امتیازی حیثیت کے تاجر قرار پا گئے۔

میں نے حافظ کلا صاحب کو جہاں اس کتاب میں ان کے اس امتیاز کی بنا پر لیا ہے کہ انھوں نے ایک بے حد معمولی درجہ سے ترقی کر کے خود کو لکھ پتی کی حیثیت تک پہنچایا وہاں میں نے ان کو اس لیے بھی اس کتاب کے لیے منتخب کیا ہے کہ ان کی سیرت اور ان کا کردار، ان کے تمول سے بھی زیادہ امتیازی اور دوسروں کے لیے شمع راہ ہوگا۔ چنانچہ اس کمال عمل کو ملاحظہ فرمایئے تاکہ وہ ابتدا میں جس معمولی انداز کی پگڑیوں کی ایک گٹھری اپنے کاندھے پر لاد کر بھوپال کے چوک بازار کی سڑک پر بحیثیت ایک دکاندار کے بیٹھا کرتے تھے اس مزدورانہ انداز کو انھوں نے درجۂ اول کے سرمایہ دار اور متمول ہونے پر بھی قائم رکھا اور کبھی اس مشقت مزدوری اور تیسرے درجہ کی حیثیت سے نہ گھبرائے نہ شرمائے۔ عین اسی طرح وہ ہزاروں روپیہ کا مال لانے اور لے جانے میں عمر بھر نہ ریل کے دوسرے درجہ میں سوار ہوئے نہ کبھی عمر میں سفر میں آرام کے لیے ایک ملازم ساتھ رکھا۔ ان کے ساتھ سفر کے نہ شاندار ناشتے ہوتے تھے نہ دلکش اور فینسی صندوق، بلکہ تجارتی مال کو ریل کے ذریعہ پارسل کر کے وہ ایک بستر اور ضروری ناشتہ ہاتھ کے رومال میں باندھ کر لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہو جاتے تھے حتی کہ میں نے دیکھا کہ جب ان کا سوت کا کاروبار کافی سے زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے رنگون تک اپنے تجارتی سلسلہ کو ترقی دی اور اس سلسلہ سے وہ متعدد بار رنگون، برما اور آسام بھی گئے، مگر اتنی ہی سادگی اور تنہائی سے جس طرح وہ بھوپال کے چوک بازار جایا کرتے

تھے۔ اسی طرح اتنے بڑے وسیع کاروبار کے تمام تحریری اور حساباتی سلسلوں کو بھی وہ ذاتی طور پر درست رکھتے تھے اور انھوں نے اپنی ذاتی محنت کو کبھی دوسروں پر تقسیم نہیں کیا حالانکہ مالی حیثیت سے اگر وہ اپنے محرروں کا ایک بڑا عملہ رکھتے تو ان کے لیے بے حد آسان تھا، مگر اصلیت یہ تھی کہ ان کے کاروبار کے عروج تک ان کے والد صاحب حیات تھے جو خود حاجی تھی اور اسلامی اصول زندگی اور اسلامی سادگی کے مجسمہ، اس لیے حافظ کلا صاحب اپنے نیک باپ کے سعید بیٹے تھے اور خود بھی اسوۂ رسول علیہ السلام کے مقلد، لہٰذا انھوں نے مالی ترقی کی کسی منزل میں بھی اسلامی سادگی کو جو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو اس کے فوائد ملاحظہ ہوں۔

نمبر ایک:۔۔۔ محلے اور برادری کے جملہ عورت مرد، شہر اور بیرون شہر کے تمام ذی عزت حلقے ان کے مالی عروج کے ساتھ ان کی اس سادگی کے بے حد مداح و معترف تھے۔ ہر شخص ان کے اس کمال سادگی کی تعریف کرتا تھا کیونکہ اس سادگی کا لازمہ ہی یہ تھا کہ وہ بے حد خلیق اور ملنسار بھی تھے۔

نمبر 2:۔۔۔ یہ کہ انھوں نے اپنی سادہ وضع قطع سے غریبوں کے حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی اور اپنے غریب کارندوں میں وہ حد سے سوا مقبول اور عزیز تھے۔ وہ ہر غریب سے غریب گھر میں کافی بے تکلفی سے معمولی سے معمولی فرش پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے غیر معمولی عروج کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔

نمبر 3: محض اس سادگی اور حسن خلق سے وہ اپنے شہر کی تمام دوسری برادریوں میں بھی کافی محبت اور عزت سے دیکھے جاتے تھے۔

حافظ کلا صاحب کی ایک امتیازی قابلیت یہ تھی کہ انھوں نے اتنی عظیم کامیابی اور ترقی اپنی عمر کے بے حد ابتدائی دور ہی میں حاصل کر لی تھی۔ وہ ابھی 35-30 ہی کی عمر میں تھے کہ انھوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ وہ اپنی مسجد میں ہر سال پورا قرآن پاک خود ہی سناتے تھے اور قرآن مختر مکانی یاد تھا گویا وہ عظیم تجارتی مصروفیتوں میں بھی قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، اسی لیے ان کا شمار بھوپال کے جید حفاظ میں تھا۔ وہ ختم قرآن پاک کے دن اس کی مسرت میں کافی روپیہ صرف فرماتے تھے۔ حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔

اب وہ خدا کے کرم سے مالی حیثیت سے لاکھوں روپیہ کا لین دین کرنے والوں میں شمار ہونے لگے تو انھوں نے عین اسلامی احکام کے مطابق زکوٰۃ کے روپیہ سے خالص اسلامی آداب کے مناسب اس روپیہ سے صحیح سے صحیح مستحقین کی امداد فرمائی۔

موصوف کی غریبوں کی امداد کی ترکیب اور تدابیر ایک روشن خیال انسان کے لیے بے حد لائق تقلید ہے۔ یعنی وہ ہزاروں روپیہ غریبوں کی امداد پر اس کمال ضبط سے خرچ فرماتے تھے کہ گھر کے لوگوں کے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوتا تھا۔ سینکڑوں بیواؤں، برادری کی نادار کنواری لڑکیوں کی شادی، یتیموں کی پرورش، اپاہجوں کی امداد اس طرح کرتے کہ خود ان کے گھروں پر خموشی سے جاتے، ان کو علاوہ نقد کے کپڑے اور دوسری اشیائے ضرورت خود بنوا کر دیتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن اپنے گھر میں پندرہ بیس آدمیوں کے لیے نہایت مرغن اور پُرتکلف کھانے پکواتے اور سب کو اپنے ساتھ بٹھا کر یہ قیمتی کھانے کھلاتے، اس کمال خموشی سے کہ ہم اہلِ محلہ کو بھی خبر نہ ہوتی۔ موصوف کی سادگی اور خدمتِ خلق نے ان کو بھی وہ عظیم فائدہ دیا جو شاید کسی ان کے ہمعصر کو ملنا محال تھا۔ چنانچہ اب ان کے تمول اور احترام کا یہ عالم تھا کہ بھوپال کے متعدد کاروباری حضرات حکام اور ذی مقدرت سے ذی مقدرت لوگ ان کے قرضدار بن گئے، مگر لوگوں کو قرض دینے کے سلسلہ کو بھی حافظ صاحب نے ایسا ہی پوشیدہ رکھا جس طرح وہ دوسرے نیک امور کی تکمیل کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

حافظ صاحب ان تمام حالات پر بلا کے ظریف اور خوش طبع آدمی تھے۔ وہ بچوں، بوڑھوں اور ساتھیوں سے مذاق کیے بغیر نہ رہتے تھے۔ وہ جس مجلس میں ہوتے تھے پوری مجلس ان کی ظرافت سے گلزار بنی رہتی تھی۔

وہ لکھ پتی ہونے پر بھی کبھی کسی کھیل تماشے میں نہ جاتے تھے۔ گھر تک میں ان کی نشست میں نہ کوئی شانداری تھی نہ فینسی فرنیچر۔ بزرگوں کے لیے مکانوں میں خالص قدیم طرز کی نشست تھی۔ البتہ ان کو ''گوٹ'' یعنی بیرونِ شہر چند ساتھیوں کے ساتھ جا کر کھانا پکانے اور کھانے کا بے حد شوق تھا اور مچھلی کے شکار کے بے حد شائق تھے، لیکن مچھلی کا شکار بھی وہ جال اور بندوق کے عوض ''بنسی'' سے کرتے تھے۔ رات رات بھر وہ بھوپال کے خوفناک جنگلوں سے ہو کر گزرنے والی

ندیوں پر مچھلی کے شکار کے سلسلہ سے گھوما کرتے تھے حتی کہ اسی مچھلی کے شوق نے ان کی زندگی کا اس طرح خاتمہ کر دیا کہ ایک مرتبہ مچھلی کھاتے ہوئے ان کے حلق میں مچھلی کا کانٹا موت کا سبب بن کر پھنس گیا جو دنیا جہان کی تدبیروں سے نہ نکل سکا حتی کہ اسی تکلیف سے ان کی وفات واقع ہوئی۔ اناللہ۔

موصوف نے دو اولادیں چھوڑی ہیں جن میں ان کے فرزند ارشد مولانا عبدالشکور اور حافظ عبدالجبار ان کے صحیح جانشین اور ان کی سیرت کے بہترین نمونہ ہیں۔ مولوی عبدالشکور صاحب ان کے نقشِ قدم پر چل کر بہت کامیاب زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔

◆◆◆

احمد بشیر انصاری

بیسویں صدی عیسوی نے ہر غیر منتظم، بے علم و بے ہنر اور انگریزی زبان سے ناواقف فرد کو اطلاع سی دی تھی کہ اگر وہ بیسویں صدی کے پیدا کردہ ماحول کو قبول نہ کرے گا تو خود اس کا ماحول تاریک رہے گا اور مستقبل افسردہ۔ یہ وہ احساس تھا جس کے اثرات کو ہندستان کی اکثر آبادی نے قبول کیا اور بعض نے نہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ صحیح کون تھا اور غلط کون البتہ مجھے تو اپنے افراد تحریر میں صرف ایک ہی کردار کی تلاش ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں صفات مشترک اور صفات عام کے ساتھ ساتھ کم سے کم ایک صفت بے حد خاص ہو اور بس۔ سو اس لحاظ سے جماعت مومن انصار بھوپال محلہ چھاؤنی ولایتیان کے ماحول سے احمد بشیر انصاری کو تنہا انگریزی زبان کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو جانا ہی ان کی ایسی ہی صفت خاص ہے جیسے کہ قبلہ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے انگریزی زبان کو اس وقت حاصل کیا تھا جب بھوپال میں اس زبان کا کوئی ماحول ہی نہ تھا۔ بالکل اسی طرح چھاؤنی کے مومن انصار بھائیوں کے زبردست دینی اور قدامت پسند ماحول میں یہ سب سے پہلے انصاری ہیں جنھوں نے اپنے ہی وجدان و میلانِ طبع سے انگریزی کی تعلیم شروع کی۔

مجھے ان کی خدمت گزار کے سلسلہ سے یہ امتیازی مسرت حاصل ہے کہ میں نے لگا تار

تقاضوں اور کوشش کے بعد ان کی تاریخ پیدائش کا پتہ چلا لیا اور ان کا زائچہ تیار کر دیا۔ چنانچہ یہ 26 جولائی 1905 کو محلہ چھاؤنی ولا یتیان متصل مسجد تنہا نور خاں صاحب مرحوم پیدا ہوئے۔ بد بختی سے ان کے خاندان میں صرف ان کی محترم والدہ صاحبہ حیات تھیں اور والد صاحب کا انتقال ان کی تین برس کی عمر میں ہو گیا تھا۔ پس مجھے کیا بے شمار حضرات کو اس بات کا تجربہ ہے کہ جن لوگوں کے والدین کی امداد و سرپرستی کسی نہ کسی سبب سے ختم و مضمحل ہو جاتی ہے وہی بے یار و مددگار لوگ دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے عظیم شخصیت کے مالک ہو جایا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح احمد بشیر کے بچپن کی بے یار و مددگار زندگی ان کے بچپن کا یکسر غیر علمی ماحول مجھے یاد ہے کہ میں جب بھی ان کے اس ماحول کو یاد کرتا ہوں تو مجھے شدید حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح فطرت نے اس بچہ کو اس ماحول سے نکال کر علی گڑھ یونیورسٹی اور روٴسا و امرا اور اصحاب علم کے ماحول میں پہنچا کر جماعت مومن انصار چھاؤنی ولا یتیان کے اعزاز علمی میں مزید اضافہ کا باعث بنا دیا؟۔

بشیر صاحب ایک دُبلے پتلے مگر غضب کے چست و چاق نوجوان ہیں اور جدید علوم و اصول اور جدید تجربات سے متعلق ہونے پر حریص۔ لہٰذا انھوں نے 1927 میں بھوپال سے رختِ سفر باندھا اور بغیر کسی امداد و سرپرستی کے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے مدارج میں داخل ہو گئے۔ یہ داخلہ جہاں ان کی علمی تشنگی کو سیراب کر دینے کا زمانہ تھا وہاں علی گڑھ میں غیر وطنی ماحول کی بیچارگی اور شدید مالی رکاوٹ سے ان کو جوانی کی بے تجربہ زندگی سے اکتا کر وطن واپس آجانا چاہیے تھا جب کہ ان کو نہ ایک پیسہ مالی امداد ملتی تھی نہ علی گڑھ سے کوئی وظیفہ۔ لیکن فطرت اگر معاونت کرے تو پھر اس شخص کو ترقی سے کون باز رکھ سکتا ہے اس لیے اس شدت کے دورِ ابتلاء و آزمائش میں حصولِ علم کا یہ شائق نوجوان جس پامردی اور جلالتِ عزم سے علی گڑھ کی ناآموزدہ سرزمین میں ڈٹ گیا، وہ اس کے کردار کی وہ بلندی ہے جو لوگوں کو دنیا میں رہنما، مصلح، ہادی، پیشوا، سردار، محقق اور بادشاہ تک بنا دیتی ہے اور فاتح۔

اس مسافرتِ علمی میں احمد بشیر انصاری نہایت عزم و ثبات حواس سے ایف۔ اے کی تعلیم میں مصروف ہو گئے اور دوسرے بچوں کو پڑھا کر اپنی روزی پیدا کرتے رہے۔ پردیس میں بیس بائیس برس کی کچی عمر میں اتنی دماغ آزما تعلیم خود بھی پابندی سے جاری رکھنا اور اسی وقت میں

دوسروں کو پڑھانا اور ہمت نہ ہارنا میری کتاب کی شرطِ تحریر کا قابلِ کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ بلکہ میں تو اس حد تک کہوں گا کہ احمد بشیر انصاری نے طلبِ علم میں جس مردانہ جرأت و استقامت کا ثبوت دیا اور حوادث کا جس بہادری سے مقابلہ کیا وہ ہر طالبِ علم کا کردار ہونا چاہیے۔

بارے 1928 میں فطرت ان کی طرف متوجہ ہوئی اور بھوپال سے نواب زادہ یمین الملک کرنل محمد رشید الظفر خاں صاحب بہادر یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے علی گڑھ میں مقیم ہوئے اور موصوف نے احمد بشیر انصاری کے علمی شوق کی اطلاع پا کر ان کو اپنی ہی کوٹھی میں جگہ دی اور تمام سلسلۂ تعلیم کے دوران میں ان کے ساتھ ایک حقیقی بھائی کا سا سلوک کر کے امراء اور اصحابِ مقدرت کے لیے علمی لوگوں کی قدر کرنے کا جو سلیقہ پیش فرمایا ہے اس کی لاجوابی اور عظمت پر تاریخ بھوپال ہمیشہ خراجِ تحسین و شکر ادا کرتی رہے گی۔ افسوس کہ مومن برادری کے اس جوہرِ گراں مایہ کے لیے ایف۔ اے کے بعد اپنی متاہل زندگی کی ذمہ داریوں نے مزید تعلیم کی سہولت نہ دی اور یہ عام بھوپالی عادت کے مطابق ملازمت میں داخل ہو گئے۔

لیکن فطرت چونکہ شروع ہی سے ان سے دوسرے کام لینا چاہتی تھی اس لیے اگرچہ ملازمت کر چکے تھے مگر ہر وقت اُکتائے سے نظر آتے تھے اور مجھ سے ملازمت اور آزاد زندگی پر کافی بحث کرتے رہتے تھے۔ اب چونکہ ان میں جدید تعلیم کی مادی سہولتوں کے سمجھ لینے کی صلاحیت بیدار ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے اپنی برادری میں بھی جدید تعلیم اور جدید زندگی کی جدوجہد کا آغاز کا اعلان کرنا شروع کر دیا اور جہاں تک انگریزی تعلیم کا بھوپال کی مومن انصار جماعت سے تعلق ہے بشیر انصاری ہی اس جماعت کے سب سے پہلے نوجوان ہیں جنھوں نے خود کو 'علیگ' کے امتیاز کے قابل بنایا اور اسی اولین امتیاز سے میں نے ان کو مشاہیر چھاؤنی کی فہرست میں شامل کیا، یعنی بیسویں صدی عیسوی کے اوائل ایام میں مومن انصار برادری کی بھوپالی شاخ میں جن جدید اقدامات کا رجحان پایا جاتا ہے ان میں ہر مومن انصار بشیر انصاری کے اس اولین امتیاز کو قابلِ فخر مثال بنانے سے مسرت محسوس کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے برادری کی داخلی زندگی کو موجودہ عہد کے منافع سے متمتع ہونے کے سلسلہ سے بھی اس برادری کے آغاز کاروں کی صف میں کام کیا۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی یہ ہے کہ انھوں نے ترک ملازمت کے بعد اپنی برادری میں جدید صنعتی ترقی کے رواج کے لیے حکومتِ بھوپال کے وظیفہ سے بمبئی کالج میں جدید مشینی پارچہ سازی و پارچہ بانی کی تعلیم میں سند حاصل کی اور آج بھوپال کی مومن انصار برادری صنعت پارچہ بانی میں جو کامیابیاں حاصل کررہی ہے اس میں بشیر انصاری کی جدوجہد کو ابتدا و آغاز کا امتیاز حاصل ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے اور برادری کے جملہ افراد کو تجارت و صنعت پارچہ سے متمتع ہونے کے لیے سینٹرل جیل بھوپال کے سرکاری عہدۂ فیکٹری منیجر سے مستعفی ہوگئے اور ترک ملازمت کرکے خود تاجر پارچہ بن گئے۔ خدا مزید ترقی دے۔ یہ امتیاز اولین ہے چھاؤنی ولایتیان کی مومن برادری کے ایک رکن کا جس نے انتہائی حسرت و تنگ دامنی کے ماحول سے محض اپنی ذاتی استقامت سے خود کو ایک سربلند اور آزاد تعلیم یافتہ تاجر تک پہنچادیا جس کی مزید ترقی اور فراغت اب امر یقینی ہے۔ کاش اس کی مزید مثالوں کا سلسلہ اس برادری میں کثیر و طویل ہوتا رہے۔

◆◆◆

احمد نصیر انصاری

محلّہ چھاؤنی ولایتیان بھوپال کے اس نوجوان سیاسی کارکن کے حالات لکھنے کے سلسلہ سے مجھے یہ مسرت حاصل ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش کی تحقیق پر میں نے انھیں متوجہ کیا جس میں یہ کامیاب ہوئے۔ چنانچہ ان کی تاریخ پیدائش 6 مئی 1914 ہے۔

ان کے والد جناب حاجی قبلہ جمعدار شیخ جہانگیر صاحب انصاری ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر ملازمت روبکاری فرماں روا بھوپال میں نیک نامی سے گزاری۔ احمد نصیر انصاری بھی اپنے خاندانی ملازمتی ماحول کے تاثر سے سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے تھے، لیکن فطرت ان سے جماعتی اصلاح وسربلندی کا کام لینا چاہتی تھی اس لیے باوجودیکہ ان کا ماحول خالص غیر علمی اور مشغلہ ملازمت تھا لیکن حصولِ علم کا شوق ان میں محض خداداد اور وہبی تھا۔ جس کے اثر سے یہ ملازمتی جکڑ بندی سے گھبرانے لگے اور طلبِ علم کی تڑپ اُن کو ہر آن اور ہر لحہ ستانے لگی، مگر حیرتناک خصوصیت یہ ہے کہ اس جوانی اور جذباتی عہدِ عمر میں چونکہ ان کا کوئی مصلح اور رہبر نہ تھا اس لیے اپنے ساتھیوں کے ماحول سے متاثر ہوئے تو پہلوانی اور موسیقی سے دلچسپی لینے لگے۔ نتیجہ یہی نکلتا کہ وہ پہلوان اور موسیقی داں ہوجاتے، اُدھر خدا کے فضل سے متمول اور صاحبِ جائیداد باپ

کے لختِ جگر تھے لہٰذا ہو سکتا تھا کہ سر مڑھی جوانی کے ہاتھوں اپنے شفیق باپ کی ثروت اور جائیداد کو اپنے غلط رو جذبات پر لٹا کر خود بھی تباہ ہو جاتے، لیکن فطرت جس کی حفاظت و رہبری کرے اس کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ سب کچھ کرتے تھے اور اپنے ہر عمل میں کافی آزاد و مختار تھے، لیکن اس پر بھی ان کے دل میں حصولِ علم کی ایک بے تاب کر دینے والی تڑپ تھی جو ان کو اس شغلِ مسعود کی طرف مائل کرتی تھی۔ آخر کار وقت آیا اور انھوں نے اپنے ہی شوق سے سلسلۂ تعلیم کا آغاز کیا اور ذہانت چونکہ کافی تھی اس لیے بہت جلد اپنے ساتھیوں میں ممتاز حد تک تعلیم میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن 1930 میں بھوپال میں بھی کافی تعلیمی میدان تیار ہو گیا تھا اور متعدد شعبات تعلیمی درس و تدریس کا کام کر رہے تھے اس لیے چھاؤنی کے چند بچے، طبیہ آصفیہ کالج کے طالب علم تھے جن میں سے بعض ان کے دوست تھے انھوں نے احمد نصیر کی علمی صلاحیت اور شوق کو معلوم کر کے ان کو طبی تعلیم پر آمادہ کر کے اس طبی درس گاہ میں ان کا نام تک لکھا دیا۔

وہ وقت تھا جب مومن انصار برادری کے اس جو ہر قابل نے مجھے متوجہ کیا اور انھوں نے مجھ سے اپنی طبی تعلیم پر استصواب رائے کیا۔ میں نے اس نوجوان کی ذہنی استعدادوں اور بے پایاں شوقِ علم کا اندازہ کرتے ہوئے ان کو رائے دی کہ وہ طبی تعلیم کے عوض پہلے مشرقی علوم کی بے حد مقرر تحصیل پر متوجہ ہوں اور پنجاب یونیورسٹی کے ادیب، فاضل اور منشی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے پھر انگریزی سیکھیں۔ چونکہ اب فطرت ان کو جلد میدانِ اصلاح و عمل میں لانا چاہتی تھی اس لیے انھوں نے غضب یہ کر دکھایا کہ باوجود متاہل زندگی کے معاً ترکِ وطن کر کے لاہور جا پہنچے اور وہاں اورینٹل کالج کے بورڈنگ میں باقاعدہ داخل ہو کر ایک مستعد طالب علم کی زندگی میں داخل ہو گئے۔ چھاؤنی کی مسلمہ سی ذہانت اور غیر معمولی دماغی صلاحیت موجود ہی تھی اس لیے ادیب عالم کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب ہو گئے۔

اب ان کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ اِدھر لاہور ایسے قومی تحریکات کے مرکز نے ان میں قومی اور سیاسی تحریکات کا جذبہ اور بیداری بھی دی اس لیے اس مرتبہ جو یہ مجھ سے ملے تو ان میں ترکِ ملازمت، خدمتِ خلق اور اپنی جماعت کی اصلاح و ترقی کا ایک طوفانی جوش تھا، اس لیے مجھے بڑی مسرت ہوئی مگر میں نے ان کے جذبات کا رُخ بدلتے ہوئے ان کو قدرے قلیل انگریزی سیکھ لینے

پر توجہ دلائی اور اس عرصہ میں ان کے والد بزرگوار کو ان کے بچہ کے شاندار اور نامور مستقبل کو سنوارنے پر متوجہ کرتا رہا۔ پس شبہ نہیں کہ اس موقع پر ان کے والد صاحب قبلہ جناب حاجی شیخ جہانگیر صاحب انصاری نے اپنے معتقدات کے مقابل میرے مشوروں پر اپنے بچہ کی کافی مدد کی اور ذاتی طور پر بھی وہ ان کے لیے ہر لحہ کوشاں رہے اور عین اسی موقع پر اعلیٰ حضرت تاجدار بھوپال نے ان کے تعلیمی شغف کے وقوف پر ان کی کافی مالی سرپرستی فرمائی، جس کے نتیجہ میں یہ میٹرک کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے۔ یہ ان کا تعلیمی ماحول تھا لیکن ان کو اپنی برادری کی تباہ حالی اور قدیم صنعت پارچہ بانی کو ترقی دینے کا شوق اور جذبہ، تعلیمی مشاغل پر بھی غالب تھا اس لیے یہ عملی طور پر تعلیم کے زمانہ میں بھی ایسی تجاویز سوچتے رہتے تھے جن سے ان کی برادری کی نئی نسل میں بھی جدید تعلیم اور جدید صنعت کا احساس بیدار ہو۔ اس مقصد کے لیے یہ متواتر جلسے اور تقریریں کرتے رہتے تھے۔ ان کے اس اصلاحی مقصد میں ان کے شرکاء اور رفقائے کار میں خود ان کے والد بزرگوار اور جناب شیخ محمد عرب انصاری، جناب حافظ منشی پناہ محمد صاحب انصاری، جناب احمد بشیر صاحب انصاری علیگ، جناب منشی حبیب الرحمٰن صاحب انصاری وکیل و ناظر ہائی کورٹ اور جناب منشی حفیظ الرحمٰن صاحب، جناب منشی حکیم عبدالرحمٰن صاحب انصاری میونسپل کمشنر بے حد خاص تھے۔ جنھوں نے مومن انصار برادری کو جدید ماحول میں ڈھالنے کی لگاتار کوشش کیں حتی کہ احمد نصیر صاحب انصاری کی تحریک پر اس جماعت کی اصلاح و ترقی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت انصاری چھاؤنی کی بنیاد رکھی گئی اور مختلف و متعدد تحریکات کے متعدد و مختلف نظام ہائے کار بنتے اور جاری ہوتے رہے اور جس طرح کہ ہر ابتدائی تحریک کی فطرت مختلف رنگ بدلتا ہے عین اسی افتاد اور ضابطہ سے جماعت انصار کے بھی مختلف اور متعدد چولے بدلے گئے، اختلافات اور ردِعمل کے حوادث بھی کھڑے ہوئے، مشکلات اور اضمحلال کے دور سے بھی پڑے مگر احمد نصیر انصاری کی طوفانی تڑپ اور ان کے رفقائے کار کی حوصلہ مندی ان سب پر غالب آتی رہی اور آخرکار اس عظیم کام کرنے والی صنعتی اور اسلامی برادری میں ایک شعور بیدار ہوا اور احمد نصیر انصاری اور ان کے ساتھیوں نے اس جماعت کے بے کار بچوں کی تعلیم کا ایک مضبوط نظام بنا کر ''مدرسہ سلام الدین خاں'' کے نام سے تعلیم کا آغاز کر ہی دیا۔

اس درس گاہ کے نام کی شرح یہ ہے کہ یہ درس گاہ منسوب ہے بھوپال کے ممتاز وزیر داخلہ

وزیر انصاف عالی مرتبت امین الملک سلام الدین خاں بہادر بی۔اے، ایل۔ایل۔بی سے جس کا یہ مطلب ہے کہ یہ احمد نصیر انصاری ہی کی تڑپ اور ان کے ساتھیوں ہی کی وسعت نگاہ تھی جس نے اپنی جماعت کی اصلاح و امداد کے لیے سرکاری حلقوں کی ہمدروی حاصل کرنے کی کوشش کا راستہ دکھایا اور میرے نزدیک احمد نصیر اور ان کے ساتھیوں نے جتنی طویل مدت تک اکابرین بھوپال کی ہمدروی حاصل کرنے کی جدوجہد اور لگاتار آمد و رفت کی ہمت کو برقرار رکھ کر اس درسگاہ کے ساتھ ہی مدرسہ صنعت و حرفت اور دوسرے مشاغل صنعت و وظائف کو حاصل کر کے چھوڑا اور حضرت محترم نجم الانشاء عالی مرتبت کے۔ایف۔حیدر صاحب وزیر مالیات اور دوسرے جلیل القدر حکام کی نوازشیں حاصل کیں۔ یہ ان کا ایسا کردار ہے، جس کے اثر سے مومن برادری کی آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کے ناموں کو شکر و محبت سے یاد کرتی رہیں گی۔

اس موقع تک احمد نصیر انصاری کی اصولی حیثیت یہ تھی کہ وہ انجمن جمعیۃ انصار بھوپال کے صدر تھے۔ وہ جمعیۃ انصار کے صنعتی سلسلہ کی تمام سرکاری امداد کے جواب دہ نگراں تھے اور ان ذمہ داریوں میں ان کی معاون جماعت کی روح جناب شیخ محمد عرب انصاری، جناب شیخ جہانگیر انصاری، جناب حافظ منشی پناہ محمد انصاری، جناب حکیم عبدالرحمٰن صاحب انصاری میونسپل کمشنر، جناب احمد بشیر انصاری علیگ اور جناب حبیب الرحمٰن وکیل تھے۔ جن کی زیر نگرانی ''عابدہ دی ونگ اسکول'' کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اور اب متعدد تباہ حال مومن انصار بھائی اس کارخانے کا کام کرنے لگے تھے اور یہ خصوصی امتیاز و افتخار احمد نصیر انصاری ہی کو حاصل ہے کہ ان کی اور جماعت کی سرگرمی سے مومن انصار محلہ چھاؤنی ولایتیان بھوپال نے سب سے پہلے اپنی محدود صنعتی زندگی کو جدید و وسیع زندگی سے بدلا۔

اب چونکہ ان کا دماغی ماحول اصلاحی و سیاسی بن چکا تھا اور ان کا چوبیس گھنٹہ کا وظیفہ برادری کی اصلاح اور تمام کمزور فرقوں کی ترقی تھا حتی کہ اسی عرصہ میں انھوں نے برادری کے بڑے مرکز سے رشتہ جوڑنے کے لیے برطانوی ہند کے مختلف شہروں کے سفر کیے جن میں احمد بشیر انصاری (علیگ) ان کے برابر کے شریک رہے۔ اس لیے ان سفروں نے اور برطانوی ہند کے عظیم سیاسی انقلابات نے ان میں ایک قدم اور بڑھانے کی جولانی پیدا کردی اور اب جو وہ مجھ سے ملتے تھے تو مومن انصار برادری کے خصوصی موضوع سے بڑھ کر وہ وسیع اسلامی برادری کے

سیاسی انقلابات پر بھی بحث کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس وسعتِ نگاہ وعمل کے سلسلہ سے نہ فقط خود بلکہ اپنے چھوٹے بھائی احمد بشیر انصاری کو تجارت پیشہ طبقہ کی زندگی میں پہنچا دیا اور اب ان کے صرف دو کام تھے۔ تجارت اور قومی اصلاح۔ میں خوش ہوں کہ اب ان کی نگاہ میں تنہا مومن انصاری برادری ہی نہیں نہ ان کے مسلک میں چھوٹے اور بڑے فرقہ کی تحدید ہے بلکہ وہ عام مسلک خدمت اور ہر مذہب وملت کے انسانوں کی خدمت گزاری کے جذبے سے سرشار ہیں اور آئے دن کوئی نہ کوئی تجویز اور نظام عمل ایسا لاتے ہیں جس میں کسی نہ کسی طرح عام انسانوں کی بھلائی موجود ملتی ہے۔ میرے اصول میں ان کی اس حد تک کی بیداری اور ترقی ہی بھوپال کی مومن انصار برادری میں ان کے امتیاز کے لیے کافی تھی۔ اور وہ آسانی سے میری طے کردہ اصل کتاب کے عین مطابق کہ بھوپال میں 1945 کے بلدیہ کے انتخابات کا اعلان ہوا یعنی میونسپل بورڈ کی رکنیت کے لیے عوام سے نمائندے منتخب کیے جانے کا وقت آیا۔

اب بھوپال کا سیاسی ماحول اور عوام کے حقوق اور خود حکومت بھوپال کے انتظامی حالات کافی ودانی ترقی کر چکے تھے اور مزید ترقی اور تبدیلی کے امکانات کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس لیے احمد نصیر انصاری جو پہلے سے اس موقع کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے، اپنے حلقے سے اس انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے اور اس سلسلہ سے انھوں نے مومن انصار برادری میں جو سیاسی شعور بیدار کیا اس کا مستقبل شاید بلدیہ تک ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آئندہ غیر محدود حد اور غیر محدود زمانے تک ان کے پیدا کردہ سیاسی رجحان کا احساس ان کی برادری کے ارکان میں ترقی کرتا جائے گا۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ 1945 کے انتخاب بلدیہ میں انھی کی برادری کے ایک ہوش مند رکن جناب منشی حکیم عبدالرحمٰن صاحب انصاری اس انتخاب میں کامیاب ہوئے۔

اب احمد نصیر صاحب انصاری کے نظامِ عمل میں فرقہ بندی سے بہت آگے اور تمام مخلوق کو فائدہ پہنچانے والے مختلف نظام ہائے عمل ہیں، جن میں فی الحال وہ ایک ''دائرۂ علمیہ'' اور ایک رسالے یا اخبار کی تجویز کو ترقی دینے کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ اور مجلس قانون ساز بھوپال کی رکنیت انتخاب میں شرکت کی تیاری کر رہے ہیں۔ خدا ان کے مستقبل کو زیادہ کامیاب و روشن فرمائے۔ آمین۔

◆◆◆

خطوطِ رموزی

(اپنے ظریفانہ رنگ میں)

مصنفہ

ضیاء الملک ملاّ رموزی فاضل الٰہیات ایم۔آر۔اے۔ایس۔لندن

فہرست

◆ مقدمہ (مولوی لیاقت حسین) 583

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''خیام'' لاہور 589

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''خیام'' لاہور 595

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''خیام'' لاہور 601

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''خیام'' لاہور 607

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''نگارستان'' دہلی 813

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''عصرِ جدید'' کلکتہ 617

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''صبح دکن'' حیدرآباد 625

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''ہمدرد صحت'' دہلی 635

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''کائنات'' لکھنؤ 643

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''صدائے نسواں'' دہلی 649

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار ''دیہاتی'' انبالہ 653

◆ خط بنام ایڈیٹر صاحب ''صدائے نسواں'' دہلی 661

- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''مستورات'' کانپور 667
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''مستورات'' کانپور 673
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''مسیحا'' راپور 677
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''خیام'' لاہور 681
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''ارمغان'' دہلی 687
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''ارمغان'' دہلی 691
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' پشاور 695
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''الجمعیۃ'' دہلی 703
- خط بنام ایڈیٹر صاحب ''الخلیل'' دہلی 707

مقدمہ

(از حضرت مولوی لیاقت حسین صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی، مولوی فاضل (پونہ)

مجھے فخر ہے کہ ہندستان کے شہرۂ آفاق ادیب مُلّا رموزی کے تیسرے اسلوبِ نگارش پر **کچھ لکھنے** کا مجھے موقع مل رہا ہے۔

میں نے کئی بار لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ جو لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے مُلّا رموزی کو صرف ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ خود اپنی علمی بے بسی کا ثبوت دیتے ہیں جب کہ امرِ حقیقت یہ ہے کہ مُلّا رموزی پہلے محقق ہیں، فلسفی ہیں، مدبّر ہیں اور بعد میں ادیب و انشا پرداز اور یہ وہ علمی دولت ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی اور علم و فضیلت ذہن کی یہی وہ نادر و نایاب دولت ہے جس کے اثر سے ملا رموزی اپنی تحریر و تقریر میں جو کہتے ہیں وہ حکیمانہ اور جو سناتے ہیں وہ اچھوتا۔

ان کا پہلا طرزِ تحریر ''گلابی اردو'' اسی لیے شہرتِ دوام کا ذریعہ ہوا کہ گو یہ طرزِ انشا کسی وقت میں دوسرے اصحابِ علم کا طریقِ خطاب و کلام تھا، مگر بے حد خشک و بے اثر، لیکن ملا رموزی نے اس طرز کو جب اپنایا تو اس میں عہدِ جدید کی سیاست اور بین الاقوامی مسائل کے جن ناقابلِ حد عقدوں کو حل کر کے دکھایا وہ عوام و خواص کی حیرت، مقبولیت، فائدہ اور دلچسپی سے گزر کر بجائے

خود ایک اسلوب انشا کی جگہ پا گیا، کیوں؟

صرف اس لیے کہ ہوش مند اور وسیع العلم ملا رموزی نے اس طرزِ انشا میں وہ چیزیں پیش کیں جو ہر شخص چاہتا تھا، مگر دوسروں کے کلام میں نہیں ملتی تھیں اور لاکھوں انسانوں کی دل کی کہہ دینا نفسیات اور فلسفۂ اجتماع کے ایک بہترین ماہر ہی کا کام ہے، اسی لیے ملا رموزی اور ان کے ساتھیوں میں یہ فرق آج تک موجود ہے کہ دوسرے جو کچھ لکھتے ہیں وہ وہ لکھتے ہیں جو ان کے جی میں آتا ہے اور ملا رموزی وہ لکھتے ہیں جو دوسروں کے جی میں آتا ہے، مگر وہ اس کو اس سلیقہ سے نہیں کہہ سکتے جس سلیقہ سے ملا رموزی کہہ گزرتے ہیں اور اسی لیے ان کی تحریر پڑھنے والے یہ کہنے پر مجبور ملتے ہیں کہ:

تو نے وہ کہہ دی کہ گویا یہ بھی میرے جی میں تھی

اور اس نوع کی تحریریں لکھنا اصل میں ملا رموزی کے مافوق الفطرت فلسفی اور محقق و مدبر ہونے کا صدقہ ہے۔

عہدِ جہل و غلامی کی فطرت کند ذہنی، بلادت، بے حسی، بے علمی اور سطحی امور سے دلچسپی ہے اور تقلید و نقل، یہی وجہ ہے کہ اردو میں اخبار اور رسالے اور شعر و افسانہ کو جو بھی اختیار کرتا ہے وہ یورپ ہی کے اخبار اور رسالے اور شعر و افسانہ کے رنگ میں ڈھالتا ہے یعنی اصحابِ فکر و قلم تو ہیں مگر سب کے سب نقال۔ نہیں ہے تو کوئی موجد۔ یہ وہ کمی ہے بلکہ بے بسی اور بے مائیگی جس کے بل پر اردو کی آنے والی نسلوں کو یورپ طعنہ دے سکتا ہے کہ تمھاری اردو میں جو کچھ ہے وہ ایران و عرب کا ہے یا پھر یورپ کا۔ بدقسمتی سے ہمارے تصنیفی ادارے بھی بیٹھے تو نقل علوم و افکار کے نام سے یورپ ہی کے محققین و اصحابِ فکر کے پیدا کردہ نتائج کے تراجم تک گئے اور بس۔ لیکن مصنفین اردو میں ایسے کتنے ہیں جنھوں نے یورپی محققین کے حوالے بغیر خود اپنی تحریر کو ہندستانی حالات و حقائق کے مطابق کوئی ایجادی تحریر بنا کر پیش کیا ہو؟

بے شبہ اردو میں بعض اصحابِ طرز خصوصی اور موجد بھی ہیں لیکن ان کی قلت میں درجہ یاس افزا ہے کہ بیان سے شرم آتی ہے۔ پس اردو کے ایسے ویران اور بے مایہ میدان میں قدم دھرتے ہی ملا رموزی جو آفتابِ شہرت ہو گئے اس کا راز یہی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں لاکھوں ہندستانیوں

کی دل کی کہتے ہیں اور اتنے جدید ولذیذ انداز سے کہتے ہیں جو دوسرے نہیں کہہ سکتے۔

بالکل یہی کمال ان کے اس ''طرز خطوطی'' میں موجود ہے، یعنی اردو میں باہمی خط و کتابت کے جو آداب وضوابط پچھلے بزرگ وضع فرما گئے تھے وہ آج کی نسل کے لیے مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن ملا رموزی نے ان ہی آداب وضوابط کو استعمال کیا لیکن اس کمال جدت و ندرت اور اس درجہ حکیمانہ گر بتاتے ہوئے کہ اونچے سے اونچے درجہ کے اخباروں اور رسالوں نے ان کے ان خطوط کو بہ معاوضہ قبول کیا۔

سیاستِ حاضرہ، بین الاقوامی مسائل، قومی ضروریات، مذہبی امور وضوابط کے جو دریا در یا ذخائر ملا رموزی کے مضامین میں ملتے ہیں، ان سے انکار کی جرأت تو ان کے مخالفین میں بھی نہیں، لیکن ایک نئے اور اچھوتے سلیقے سے ان باتوں کو مضمون یا خط کے رنگ میں ڈھال دینا ہی وہ قدرت قلم ہے جس کی طاقت سے ملا رموزی عوام وخواص کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

مثلاً آیئے اور پرانے طرز خط نویسی کے ایک لفظ ''دیگر احوال'' کو لیجیے۔ جس کے سہارے ملا رموزی ہندستان سے یورپ اور یورپ سے امریکہ، افریقہ اور سارے ایشیا میں گھوم آتے ہیں اور وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جو ان تمام براعظموں میں ہو رہا ہے اور پھر دیکھیے تو ''دیگر احوال'' پر موجود ہیں۔

وہ دن گئے جو کسی مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کے لیے لمبی لمبی منطقی تمہیدیں ادق اور نا قابلِ فہم ضوابطِ انشا میں ڈھال کر ایک سلسلہ کلام شروع کیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی ادق اور علمی کتابیں اور مضامین آج تک سینکڑوں شرحوں اور تفصیلوں ہی کی محتاج پڑی ہوئی ہیں اور انسان اُن کے فوائد سے محروم ہے البتہ آج اسی تحریر کو قبولِ عام کا رُتبہ وامتیاز ملتا ہے جو عام انسانوں کے فہم وذہن کے موافق ہو۔ خواہ وہ کسی ضابطۂ انشا سے پیش کی جائے۔

پس اس عقلی وفطری قاعدہ سے ملا رموزی اردو میں سب سے پہلے صاحبِ قلم ہیں جنھوں نے اپنے مضامین میں نہ کبھی تمہید وافتتاحیہ کی کوشش کی اور نہ کبھی مقرر کردہ عنوان کے تابع رہے بلکہ ایک عنوان کے تحت وہ کام کی ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو عنوان کی مطابقت سے زیادہ ضروری اور مفید تھیں۔ مثلاً ستمبر 1933 میں اپنے دوست محمد احمد خاں صاحب ایڈیٹر رسالہ ''مسلم'' جالندھر کو

ان کی بہن کے انتقال پر تعزیت کا خط لکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اصولاً اس خط میں صرف عزا و ہمدردی کے خیالات ہونا چاہیے تھے، مگر وہ اس خط میں حصولِ تاج وتخت کے گر بھی بتاتے ہیں۔ امتحان میں کامیابی کا ذریعہ بھی بتاتے ہیں۔ امیروں کو غریبوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں۔ والدین کو تربیتِ اولاد کے طریقے بھی سکھاتے ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی کے فوائد بھی بتاتے ہیں اور تعزیت نامہ کی عبارت بھی لکھتے جاتے ہیں۔

اب فرمایئے کہ کم علم اور بے عمل قوم کو ایسے مضامین کی ضرورت ہے، یا وہ مضامین جو ادق الفاظ و اصطلاحات اور نا قابلِ فہم آداب وضوابط انشا کے تحت لکھے جاتے ہیں؟ ممکن ہے کہ ادق مضامین کی ضرورت بھی ہو، لیکن ہو۔

ملا رموزی کے تمام اسالیب انشا کی کامیابی کا راز اصل میں ملا رموزی کی خداداد قوت استقلال و استقامت عمل ہے، یعنی وہ جس کام کو شروع کرتے ہیں اس کو اس کی حد تک پہنچانے میں وہ اس درجہ ثابت قدم، باہمت، پر جوش اور لگا تار کوشش کرنے والے ہیں کہ اس راہ میں ان کو پہاڑوں کی بلندی، طوفانوں کی دہشت اور بجلی اور آندھی کی ہولناک رُکاوٹ بھی نہیں روک سکتی۔ وہ خوف وخطر، اندیشے اور دشمن کو کبھی خاطر ہی میں نہیں لاتے جو لکھتے ہیں، لکھتے ہی چلے جاتے ہیں، جو کہتے ہیں کہتے ہی رہتے ہیں، خواہ مخالف کتنی ہی مخالفتیں کرے اور خطرات کتنا ہی ڈرائیں، بلکہ خود ان کا مقولہ ہے کہ:

> ''خطرات کے پیدا ہونے ہی سے مقابلہ کی ہمت بھی پیدا ہوتی ہے، جس کو عوام نہیں سمجھتے''۔

اسی لیے ان کا ہر اسلوب نگارش کامیاب اور ایجادی ہو کر رہا اور آج مخالفوں نے بھی ان کو اردو کا صاحب طرز امام تسلیم کر ہی لیا۔

ملا رموزی کے اسالیب انشا میں عوام وخواص کے لیے جو فریفتگی اور دلدادگی ہے اس کا بڑا اہم جز ملا رموزی کا وہ دماغ ہے جس کو اگر ''بحر العلوم'' کہیں تو غلط نہیں۔ یعنی غضب ہے کہ انسانوں کی ضروریات کے اتنے گوشے ان کے سامنے کھلے رہتے ہیں گویا وہ دن رات ان ہی حالات کے مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ ان کے احاطۂ علم اور بصیرت کا وہ

مافوق الفطرت ملکہ ہے جو عین مضمون نگاری کے وقت مستعد ہوتا ہے، لیکن جس عنوان کے لیے مستعد ہوتا ہے اُس کا کوئی گوشہ نہیں جانے دیتا۔

ملا رموزی اب شاعر بھی ہو چکے ہیں اور بعض خالص فلسفہ کی کتابوں کے مصنف بھی، لیکن ان کے تمام ذخائر تحریر کی جان ان کا سلیقۂ بیان، اس کی رنگینی، دلکشی، ندرت وجدّت اور طاقت ہے۔

یہاں ان کے کمالات میں سے ایک اچھوتا کمال ملاحظہ ہو۔ یعنی عام اصحابِ قلم جس مضمون کو خاص اور آخری قابلیت سے لکھتے ہیں، اس کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "قلم توڑ دیا" اور "حق ادا کر دیا" لیکن ملا رموزی جو کچھ لکھتے ہیں وہ ہمیشہ تھوڑا لکھتے ہیں یعنی جتنا اور جس طرح وہ لکھ چکے ہیں، اس سے سوا لکھنے اور اس سے بہتر کہنے پر وہ بعد میں بھی مستعد ملتے ہیں اور ان کے اس کمال کا اندازہ صرف ان کی بہاروں سے بجی ہوئی اور معلومات سے مزین ومنور گفتگو ہی ہوسکتا ہے اور میں نے اسی لیے ان کے اندازِ کلام کی جدّت وندرت کے ساتھ "طاقت" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ یعنی جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو اس وقت وہ اپنے مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپ، ذی علم، بالغ نظر اور شیر نظر آتے ہیں۔ وہ گفتگو یا بحث میں کسی مسئلہ کو منوانے کے لیے جو بہار بہار انداز کلام شروع کرتے ہیں، اس میں جگہ جگہ وہ بپھرے ہوئے اور غضبناک شیر کا انداز اس حسن سے پیدا کرتے ہیں کہ سامع اور مخالف کو سر تسلیم خم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ مگر اس طرح کا سامع خود رنگین ہو جاتا ہے اور یہی انداز اُن کے مضامین میں بھی موجود ہے کہ بہار بہار ظرافت کے ساتھ ساتھ جب وہ کسی حقیقت کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو تحریر کے تمام خطرات سے یکلخت بے پروا اور نڈر ہو جاتے ہیں اور یہی اندازِ کلام ان کی تقریروں میں بے شمار افراد دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ان کی تقریر کے بیچ میں ہزاروں انسان جس درجہ باغ و بہار بن جاتے ہیں اسی طرح مسائل میں ان کی شدتِ بیان سے سہم بھی جاتے ہیں، مگر ملا رموزی کی گفتگو کی اس بہار کا اندازہ صرف ان ہی کو ہے جو ان کی جادو میں ڈوبی ہوئی گفتگو سن سکے ہیں، مضامین سے کامل اندازہ ناممکن ہے۔

ملا رموزی کی قدرت کلام وبیان میں ان کی اس قدرت کا سب کو اقرار ہے کہ وہ عہد جدید

کے تمام مضامین نگار حضرات میں درجہ اول کے فصاحت نگار اور غایت درجہ کی سلاست کے مالک ہیں۔ حد ہے کہ آج اُن کی کتابوں اور مضامین سے بچے، نوجوان اور بوڑھے یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ ملکۂ خصوصی ہے جو صرف فطرت ہی سے کسی کو عطا ہوتا ہے اور یہ خطوط تو اس طرزِ خصوصی کی جان ہیں۔ ان خطوط کی سطر سطر سے جو بے تکلف انداز کلام نمایاں ہے، مسائل و نصائح میں جو سادگی، برجستگی، سلاست اور فطری بے ساختگی موجود ہے، کون ہے جو اس سے لطف اندوز نہ ہوگا؟:

''بریں شرش برافشاند فلک عقدِ ثریا را''

لیاقت حسین

◆◆◆

(1)

ایڈیٹر ''خیام'' لاہور کے نام

محترم مدیر ''خیام''!

اگر کسی مرد کو زن مرید کے عوض ''زن پسندی'' کا ذوقِ سلیم عطا ہو اور اوپر سے بیوی بھی کتب بینی کا مذاق بلند رکھتی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کی ڈاک بڑی مبارک ڈاک سمجھی جائے گی، اس لیے میں نے تیزی سے آپ کے ''جنگ نمبر'' کو بقلم خود ہی الف سے ی تک پڑھ لیا۔ اس نمبر سے مجھے قدرتی طور پر لگاؤ ہے یعنی نجوم کے حساب سے میں ''سنگھ راشی'' ہوں یعنی شیر کے خصائل کا مالک ہوں۔ اس لیے جنگ و جدل، قتل و قتال، بمباری، تارپیڈو، مقناطیسی سُرنگ، مشین گن، ہاؤٹنزر گن، 75 میل دور مار کرنے والی توپ، شعاعِ مرگ، زہریلی گیس، بندوق، سنگین، تلوار، چاقو، محنت، کوہ وقار، استقلال اور بہادر بیوی گویا میری زندگی کے بہترین مرغوبات ہیں اور خدا کی شان کہ ہندستان میں یہی چیزیں ناپید ہیں۔ یعنی نادار، اس لیے ''جنگ نمبر'' کے اعلان ہی سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا آج کل میں خود فرانس کی میجنو لائن پر ہٹلر کا مقابلہ کر رہا ہوں اور جیسے ہی ''خیام'' کا ''جنگ نمبر'' شائع ہو گا، میں اسے شکست دے دوں گا۔ وہ تو کہیے بیوی نمبر 4 کی محبت اور قانون کا ڈر تھا ورنہ اس نمبر کے ہجر و فراق میں میرا افیون کھا کر جان دے دینا زیادہ مشکل نہ تھا۔

الحمدللہ کہ یہ نمبر مل گیا اور تمام ڈاک خانوں کی دست و برد، بھول چوک اور گھر والوں کے لٹا لینے، چرا لینے، پار کر دینے، غائب کر دینے، دبا لینے اور چھپا لینے سے بھی محفوظ رہا ورنہ میرے اور میری چھوٹی بیوی کے مرجانے میں تو کسر ہی نہ تھی کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جو عشق ریڈیو، سینما اور پارک کی تفریحات سے ہے وہ اردو کے اخباروں اور رسالوں سے کہاں، اس لیے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر میں صرف میں اور میری چھوٹی بیوی ہی اردو کے اخبارات اور رسالے پڑھتی ہے، اسی لیے قدرت نے اسے میرے لیے اور مجھے اس کے لیے پیدا کیا اور آپ کو ہم دونوں کے لیے عمدہ عمدہ نمبر تیار کرنے لیے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ اس نمبر کے پہلے ورق پر توپ اور تلوار کی تصویر دینے کے عوض آپ نے جو عورت ذات کی تصویر دے دی تو میں آپ کے ''نفسیت داں'' ہونے کا قائل ہو گیا۔ جی ہاں ممکن تھا کہ ورق اوّل پر توپ اور تلوار دیکھ کر کالج کے بعض ''ریشم زادے'' بھاگ جاتے یا غش کی سی کیفیت طاری ہو جاتی جیسا کہ ان کے جسم کی فینسی آرائش اور نزاکت سے پتہ چلتا ہے۔ اس تصویر سے میں نے دوسرے معنی یہ لیے گویا آپ ہندستان کے نوجوانوں سے ''تصویراً'' کہہ رہے ہیں کہ اگر تم نے ہٹلر کی انسانیت سوز جنگ میں، ہٹلریت کی تباہی میں حصہ نہ لیا تو ممکن ہے کہ ہندستان کے بہادر گھرانوں کی عورتیں، ہٹلریت کی تباہی کے لیے نکل آئیں! مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہندستان میں تعلیم تو خیر جو ہے سو ہے، لیکن ایسے نازک علمی اشارے کنایے سمجھنے والے کہاں؟

الحاصل آپ نے تو اپنا فرض ادا کر دیا، اس لیے عرض ہے کہ ''جنگ نمبر'' ملا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔ جنگ نمبر کے صفحہ اول عرف سرِ ورق پر رنگ و جمال اور عورت کے شباب و ادا کا جو منظر آپ نے پیش کیا ہے الحق کہ غضب کا عشق خیز و عشق انگیز و عشق افروز و عشق آرا ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ بڑے مولوی صاحب نے عشق کو بھی مکروہ تحریمی قرار دیا ہے اور اسی لیے بے عشق و محبت شادی بیاہ کے گھرانے افیون کھا کر دھڑا دھڑ خودکشی کر رہے ہیں، مگر مولوی صاحب کو ذرا پروا نہیں اور یہ اس لیے کہ خود انھوں نے کبھی عورت کے دل کی نزاکتوں اور اس کی نگاہ و ادا کے عقل افروز تیر کھائے ہوں تو وہ جانتے کہ عشق و محبت سے حاصل ہونے والی عورت اور عشق کرنے والا مرد ہی فطرت کا وہ صحیح جوڑا ہوتا ہے جو نسل و عقل غرض زمانہ بھر میں ایک مفید اور حیرت خیز

انقلاب برپا کرسکتا ہے اور یہ رسم و رواج کے مارے ہوئے میاں بیوی تو ایک طرح کے ''پالتو جانور'' یا ''گھریلو مواشی'' ہوتے ہیں جو کھاتے پیتے اور دودھ دیتے ہیں، مگر انسانیت کے لیے تو وہی دماغ کام کرتے ہیں جو عشق و محبت کی طاقت سے میاں بیوی بنے ہوں۔ مگر خدا جانے عشق و محبت کی شادیوں کے لیے بھی گورنمنٹ کو کوئی کارخانہ کھولنا پڑے گا یا ہم کو آپ کو چندہ کے ذریعہ اس کام کو چلانا پڑے گا، کیونکہ یہ پرانی رسم والے تو اب روپیہ لے لے کر لڑکیوں کی قبریں بنائے جارہے ہیں، اسی طرح ان کے قصبہ کے شرمیلے لڑکے ہیں جو غریب بے پسند کی بیویوں کے گلے سے باندھے جارہے ہیں۔ پھر سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ بڑے مولوی صاحب کے رنگ کے جتنے ہیں چار بیویوں تک تو اجازت دینے میں بڑے حاکم بلکہ صوبہ بھر کے گورنر جنرل معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان سے کہہ دوں کہ ایک ہی بیوی عشق کر کے حاصل کروں تو بس پھر میں ہوں اور ان کی بلغم ملی ہوئی گالیاں۔

الحاصل ''جنگ نمبر'' سے یہ تو ثابت کیا جاسکتا تھا کہ جنگ جرمنی کی غرض صرف لمبی چوڑی زمین حاصل کرنا ہے، چاہے انسان کی تہذیب و تمدن اور مکانات پیوند زمین ہوجائیں۔

ثابت کیا جاسکتا تھا کہ موجودہ جنگ کے تفصیلی اسباب یہ ہیں اور اس جنگ کو روکنے کے لیے برطانوی مدبرین اور فرانسیسی وزرا اور ملا رموزی وغیرہ نے یہ کیا۔

ثابت کیا جاسکتا تھا کہ جنگِ حاضرہ میں اگر ہندستان نے حصہ نہ لیا، تو ہندستان کے امن و سکون اور اس کی موجودہ ترقی کو بھی شدید نقصان سے سابقہ پڑے گا۔

ثابت کردیا گیا کہ تار پیڈو اس کو کہتے ہیں اور ''سمندر پھاڑ بم'' یہ ہیں۔

ثابت کردیا گیا کہ بحیرۂ روم کو اگر آپ لوگ کوئی بہت بڑا تالاب سمجھے ہوئے تھے تو یہ غلط تھا، بلکہ اصل بحیرۂ روم اور اس کے سیاسی و جغرافیائی اور بین الاقوامی جھگڑوں کے اسباب یہ ہیں۔

مگر جنگ نمبر میں یہ ثابت کرنا وزیر جنگ کے بس کا بھی نہیں تھا کہ جنگ کے عین وسط میں عشق و عاشقی کے معاملات بھی طے ہوجاتے ہیں، مگر آپ نے غضب کیا کہ اس جنگ نمبر میں یہ عقدہ بھی حل کر کے رکھ دیا کہ عشق کو جنگ پر بھی غلبہ حاصل ہے اور ایک حسینہ یا دوشیزہ عظیم الشان جنگی انسانوں کے دلوں کو اس طرح غلام بنا کر جنگ کا پانسہ بدل دیتی ہے، یا خود جنگ کرتی ہے یا

جاسوسی کے ذریعہ بڑی بڑی جنگ کو روک دیتی ہے، یا دشمن کے راز اپنی حکومت کو پہنچا دیتی ہے۔ یعنی عورت کی مقدرت اور اس کی جادو اثر طاقت کا یہ وہ حصہ ہے جس کو جنگ نمبر کی اگر جان کہا جائے تو بڑے مولوی صاحب کا کیا نقصان؟ پس آپ کے اس عقدہ کو حل کر دینے کے بعد میرے ذمہ یہ رہ گیا کہ اب میں ان اسباب پر غور کروں اور دنیا کو آگاہ کروں کہ دنیا کی حسین سے حسین دوشیزۂ شباب و جمال جیتی جاگتی پری اور ناز وغمزہ کی کوئی آخری ساحرہ، یا کوئی خلد افروز نوجوان لڑکی یا مصطفیٰ کمال پاشا، اسٹالین، ہٹلر، جاپان، مسولینی، فرانکو اور ملا رموزی کو اپنے اپنے مقاصد اور ارادوں سے باز کیوں نہیں رکھ سکی؟ اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آخر دنیا کے تمام پرستانوں اور دوشیزہ لڑکیوں کے تمام جمالیاتی معجزے اور کرامتیں کیوں ناکام رہیں؟ پس حسین لڑکیوں کی اس ناکامی کے اسباب کی تحقیق میں یہ نیاز مند ملا رموزی مصروف ہے۔ اگر ''خیام'' کا پھر کوئی جنگ نمبر شائع ہوا تو یہ نیاز منداس میں بتادے گا کہ حسین سے حسین لڑکی بھی اس وجہ سے مشاہیر عالم اور ملا رموزی کے دل پر قبضہ کر سکتی!

حقیقت یہ ہے کہ ''سمندری سیاست'' موجودہ جنگ اور اسلامی دنیا'' بحری آلات''، ''فرانس کا خط دفاع اور اس کے بانی کے حالات''، ''مشاہیر جنگ''، ''جرمنی کا عروج وزوال''، ''جرمنی کی نوآبادیاں''، ''اسٹالن کے پراسرار عزائم''، ''آلات حرب'' وغیرہ ایسے قیمتی مضامین ہیں جن کے ذریعہ عام اخبار بین لوگوں کو معلومات کے بڑے بڑے ذخیرے مل سکتے ہیں۔ اور وہ بھی ٹکہم چار آنہ میں، مگر مصیبت تو یہ کہ ہندستان کے نوجوان تو علم اور اخبار سے کہیں سوا سنیما پر مرتے ہیں اور اب مرتی بھی ہیں۔ خصوصاً انگریزی لکھے پڑھوں میں اردو سے زبانی ہمدردی تو اب مذہب سے زیادہ ہوگئی ہے، مگر اصلیت میں یہ طبقہ اب بھی اردو کے اخباروں سے کوسوں دور ہے۔ کاش آپ کے جنگ نمبر کو گورنمنٹ پولیس کی طرف سے ڈنڈے کے زور سے خرید کرایا جائے تو بہت ہی بہتر اور قرین انصاف ہو یا پھر اتنا انتظار کیجیے کہ مجھے کہیں کا کوتوال ہو جانے دیجیے تو پھر اپنے حلقہ میں آپ کے جنگ نمبر کے خریدار پیدا کر کے دکھادوں گا کہ ایسے حسین وجمیل اخبار کی یوں قدر کرتے ہیں۔ مگر خیر زندہ دلان پنجاب کے جنگی اور مردانہ ذوق سے امید ہے کہ وہ میرے کوتوال ہونے سے پہلے ہی اس جنگ نمبر کی کئی اشاعتیں مقبول کرا کے چھوڑیں گے ورنہ غضب

ہوگا کہ سانڈے کا تیل، دانتوں کا منجن، آنکھوں کا سرمہ، سفوف ہاضم اور ''قیامت نامہ'' تو لاکھوں روپیہ کا فروخت ہوجائے۔ حد یہ ہے کہ جنگ ہونے پر بھی نوجوان میں سنیما اور فینسی اشیا کی خریداری برابر ہوتی رہے اور جنگ نمبر ایسے محققانہ اور زندگی آرا اخبارات فروخت نہ ہوں۔

مگر یہ سب قصور ہے ان ہندستانی پروفیسروں اور ہندستانی ماسٹروں کا جنھوں نے اپنے ہندستانی شاگردوں کے دلوں میں اُردو کی وقعت ہی نہ بڑھائی اور آج بھی ان کے سامنے یورپی لباس ہی میں استادی کی شان دکھانے کو اپنے دماغ کی بڑی اونچی اُڑان سمجھتے ہیں حالانکہ عقل ان کی اس تقلید پر ہنستی ہے۔

امید کہ آں محترم مع الخیر ہوں گے اور اس طرف بھی سردی کم ہوگئی ہوگی۔ میں نے تو معصوم بچوں سے دعا کرائی تب کہیں اس طرف سردی قدرے کم ہوئی ہے اور بھئی کتنے دنوں سے لکھ رہا ہوں کہ اگر اس طرف خالص گھی کی فصل شروع ہوگئی ہو تو چند سیر ہی اپنے بھتیجے کے عقیقہ کے لیے بھیج دیجیے کہ یہ تقریب محض خالص گھی نہ ملنے کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔ خورد وکلاں کو درجہ بدرجہ سلام ودعا۔ اور ہاں بھئی وہ خود یاد آئی یعنی برادر محترم حافظ محمد عالم صاحب سے بعد سلام واشتیاق ملاقات کے کہہ دیجیے کہ آپ کو بچے بہت یاد کرتے ہیں۔ آخر اس خاموشی کا کیا مطلب؟

المرقوم 7 فروری 1940

◆◆◆

(2)

ایڈیٹر ''خیام'' لاہور کے نام

محترم بی۔کام شبلی! بڑے ہوتو مدظلکم اور چھوٹے ہوتو سلکم!

''خیام'' کا سالنامہ اس طرح ملا جس طرح کسی بدنصیب عاشق کو برسوں کی مایوسی اور تکلیف کے بعد اس کی محبوبہ اچانک مل جائے۔ میں نے مارے خوشی کے بغیر بسم اللہ کے اس کو پڑھنا شروع کیا۔

واضح ہو کہ جنگ جرمن شروع ہو چکی ہے۔ ہندستانی مرد اور عورتیں گویا اپنے اپنے پیدائش کے دن سے آج تک جنگ، میدانِ جنگ اور آلاتِ جنگ سے اتنے دور ہیں کہ ان کے محلّہ میں اگر پٹاخہ کی آواز ہو جائے تو موٹی موٹی عورتیں تک اپنے بچوں کو کلیجہ سے لگا کر کمروں میں ''خدا خیر کرے'' کہہ کر بھاگ جاتی ہیں اور بند ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے جب سے جرمنی کی جنگ شروع ہوئی ہے اچھے اچھوں کے حواس خراب ہیں۔ یعنی میں نے تو جنگ کی گھبراہٹ کا یہاں تک اندازہ کیا کہ جس طرح بازاروں میں تاجروں نے اشیائے تجارت کا نرخ اونچا کر دیا ہے اسی طرح بعض کوٹھی اور بنگلہ والوں نے جنگ جرمنی کے نام سے غریبوں اور حاجت مندوں سے اپنی گفتگو کا نرخ بھی اونچا کر دیا ہے۔ یعنی جنگ ہو رہی ہے چھ ہزار میل دور اور کام بند کر بیٹھے ہیں ہندستانی۔ یعنی جو ضرورت ظاہر کیجیے جواب ملتا ہے کہ جنگ کا معاملہ طے ہو جانے

دیجیے پھر دیکھا جائے گا۔ غرض ایک کروڑ کہوں کہ ایک ارب خطرے ہیں جو جنگ سے ہندستانیوں کے دماغوں کو کھارہے ہیں۔ پس گویا میں اور میری شیر دل چھوٹی بیوی ہے جو کسی خوف کی پروانہیں کرتی۔ البتہ اتنا تجربہ ضرور ہوگیا کہ جنگ کے زمانہ میں غیر انگریزی دان بیوی سے زیادہ خطرناک نہ بم ہے نہ مشین گن، نہ جرمنی کا توپ خانہ، نہ فرانس کے سپاہی۔ وجہ ظاہر ہے۔ یعنی ایسی بیوی پر نہ ریڈیو کی خبروں کا اثر، نہ اخباروں کی اطلاع کو وہ سمجھے۔ البتہ سمجھے تو وہ سمجھے جس سے اس کو خدا سمجھے یعنی ایسی ہی بیوی ہوتی ہے جو جنگ کے حالات کو سمجھنے پر تُل جائے تو شوہر سے بہتر سمجھ لے اور نہ سمجھنے پر ڈٹ جائے تو شوہر تو ایک طرف سسر بھی سمجھائے تو نہ سمجھے، لیکن وہ تو میں یوں زندہ ہوں کہ میں اپنی بیویوں کو خود چاہتا ہوں۔ بیوی تو وہ مصیبت اور تباہی میں رہتی ہے جو اپنے لیے خود پسند نہ کر سکے یا پھر خود پسند کرے، لیکن بیوی وہ نفع میں رہتی ہے جس کے گھر کے آس پاس شوہر ہی بقلم خود گھومتا پھرے، کیونکہ اس طرح پھر عمر بھر شوہر ہی کو خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ اور جو بیوی خود شوہر پسند کرتی ہے وہ عمر بھر شوہر کی غلام رہتی ہے۔ پس اب جو میں خود بیوی کا مرید ہوں تو خاص معاملہ پڑا ہے منطقی بیوی سے اور میں چاہتا تھا فلسفی بیوی۔ تو ایسی صورت میں علمی قاعدہ سے مصیبتیں میرے حصہ میں آئی ہیں اور راحتیں منطقی بیوی کے حصہ میں۔ مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ سالنامہ خیام ان کی خدمت میں جا کر علم منطق کی وہ ادق اور مشکل کتاب بن گیا، جس سے عاجز آ کر اکثر عربی کے طلبا عربی زبان کے علوم کو ترک کر کے لوہاری، نجاری اور بیکاری کے کمالات کو حاصل کر لیتے ہیں، مگر نہیں پڑھتے تو منطق، اس لیے ملاحظہ فرماتے ہی بس میں تھا اور اس طرف سے:

"تو یہ سالنامہ کون صاحب نکالتے ہیں؟"

"یہ تو بہترین پرچہ ہے"

"اس سے پہلے آپ نے مجھے اس کے اور پرچے کیوں نہیں دکھائے؟"

"اس پر تو خاصا روپیہ خرچ ہوتا ہوگا"

"یہ کتنی تعداد میں چھپتا ہے؟"

غرض ہر سوال میں آپ کی تشریف آوری اور جواب دہی کی ضرورت تو تھی مگر میری

ضرورت ایک سوال میں موجود نظر آئی تو میں نے ادب سے عرض کیا کہ اگر کبھی کبھار بیوی سے کوئی کام غلط ہوسکتا ہے تو مان لیجیے کہ اس مرتبہ ہم دو مردوں نے مل کر یہ حماقت کی ہے کہ ایک نے سالنامہ ''خیام'' تیار کر دیا اور دوسرے نے آپ کی خدمت میں پیش کر کے آپ کے سوالوں کا پہاڑ اپنے ترکی ٹوپی کے قابل سر پر اٹھالیا۔ اب جس طرح اس غریب کا خدا حافظ، اسی طرح آپ کے سوالوں کے جوابات کا بھی خدا حافظ!

اب سوال تھا اس کا کہ مجھ ایسا عورت نواز کسی عورت کا دل دُکھا سکتا ہے؟ سو یہ بس کا نہیں تھا، اس لیے میں نے سالنامہ کو یوں ''بیان'' کیا کہ اس کے مضامین کی ترتیب بے حد ضابطہ لیے ہوئے ہے، تصاویر کے فن سے میں خود ناواقف ہوں، اس لیے ان کے لیے آپ خود فیصلہ فرمالیں۔

ظاہری شکل وصورت، کاغذ اور لکھائی چھپائی اتنی بہتر ہے کہ اگر بی۔ اے کے نصاب میں یہ سالنامہ داخل ہوتا تو میں محض اس کی خوبصورتی کی وجہ سے دس مرتبہ بی اے کا امتحان دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔

مشہور لوگوں کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے تو جب ابوالکلام آزاد ایسے رئیس المشاہیر شاعر کی غزل تک اس میں موجود ہے تو اب اس کے بعد گاندھی جی کی غزل ہی اور رہ جاتی ہے ورنہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک اردو کا اخبار اپنے سالنامہ میں کیا ستارۂ مشتری اور ناہید لے آئے؟

''دنیائے اسلام کا سیاسی مستقبل'' مولوی اظہر امرتسری نے اس کمال جامعیت سے لکھ دیا ہے کہ نہ گھومے عالمِ اسلام میں ان کا مضمون ہی پڑھ لیا اور سارے عالمِ اسلام کی سیاسی زندگی معلوم کر لی۔ نہ پاسپورٹ حاصل کرنے کی مصیبت میں مبتلا ہوئے نہ غیر حکومتوں نے جاسوس تصور کیا۔ حالانکہ بعض کم تجربہ عورتیں ہر مضمون نگار کو خوفناک ڈاکو سمجھتی ہیں اور ڈرتی ہیں گویا یہ مضمون نگار اسی لیے پیدا ہوئے کہ جس نے اس سے بات کی کہ اس نے مضمون لکھا، یہ تجربہ نہ ہونے کا اثر ہے۔

سالنامہ میں ایک افسانہ ''نگاہیں'' ہے۔ یہ افسانہ پروفیسر سید اختر صاحب ایم۔ اے

اور ینوی کا لکھا ہوا ہے۔ اس افسانے نے میری اور میرے چار فاضل دوستوں کی جان لینے میں کمی نہیں کی۔ وہ تو کہیے کہ گورنمنٹ کی مداخلت سے ہم پانچوں بروقت خودکشی سے روک دیے گئے اور مجھے زیادہ لحاظ تھا اپنی چھوٹی بیوی کی محبت کا ورنہ اس افسانہ کو پڑھ کر مر ہی گیا ہوتا۔ ارے بھئی غضب خدا کا اس شخص نے صرف نگاہوں سے ایک کامل عشق کو جس قدرت کلام سے پورا کر دکھایا ہے اور عورت کی عاشقانہ اور محبوبانہ فطرت، جذبات، حرکات اور نفسیات کا جس فطری اور قلبی دھڑکنوں تک اس پروفیسر کی نظر جا پہنچی ہے، میری رائے میں تو ایک عورت نہیں جو اس افسانے کے ایک نقطہ سے انکار کرے اور ایک مرد نہ ہوگا جو اس کے ایک شوشہ سے انکار کرے اور ویسے تو ایسی عورتیں بھی ہیں جو اپنی اولاد تک کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور ایسے ہی مرد بھی ہیں جو میرے اس لکھے پر بھی اس سالنامہ کو نہیں دیکھتے۔ حیران ہوں کہ اس افسانہ کی تعریف میں کیا لکھ دوں۔ بس یہ لکھتا ہوں کہ میری ساری عمر میں جتنے افسانے پڑھ کر میں اب تائب ہوا تھا، اس افسانے نے پھر افسانہ خواں بنا دیا اور پولیس کے سامنے عہد کرنے کو تیار ہوں کہ پڑھوں گا تو صرف پروفیسر سید اختر اور ینوی کا افسانہ ورنہ دعائے گنج العرش اور مولانا اشرف علی قبلہ کی بہشتی زیور ہی بہت ہے۔

بات یہ ہے کہ اردو میں آج جو انبار در انبار افسانے نکل رہے ہیں یا شائع ہو رہے ہیں، وہ کم علموں، ناتجربہ کاروں اور بے نظر نوجوانوں کی جذباتی پیداوار ہوتے ہیں، اسی لیے وہ عقل و فطرت اور عام عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہی حال اردو کی غزل کا ہے، جس میں 99 فیصدی واردات وواقعات یا تو حد سے گزرے ہوئے پیش پا افتادہ، بازاری اور درجہ سوم کے ہوتے ہیں یا پھر یکسر خلاف عقل و عادت۔ اور اردو میں ایسی خرافات ایسے ہی دماغوں کا صدقہ ہے جو خود کم علم، ناتجربہ کار اور غیر محقق ہیں، لیکن سید اختر صاحب کا افسانہ مرد و عورت کے عشق کا وہ اہم ترین افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے داد تحقیق و نظر کو بکمال قدرت پورا کر دیا۔ غضب پر غضب یہ کہ ایک مشرقی عورت، ایک نوجوان عورت اور ایک باحیا عورت صرف نظر کی کشش سے جن فطری مدارج سے گزر کر اپنے عاشق یا اپنے محبوب تک آتی ہے اس کو کہہ دینا تو شاید میرے لیے بھی آسان تھا مگر جزئیات کے ساتھ لکھ دینا صرف اختر ہی کے بس کا تھا۔ منزل حسن و عشق میں عورت کے حجابات،

عورت کی مشکلات، عورت کے احساسات اور عورت کے دل کی دھڑکنوں تک پہنچ کر عورت کے اقدامات کو درجۂ تکمیل تک پہنچا دینے میں اختر کے موئے قلم نے جو نزاکتیں دکھائی ہیں وہ فطرت کی نبّاضی کی ایک ایسی لاجواب مثال ہے جس کو سمجھ لینے کے لیے 1939 میں بھی عاشق ہوکر اس افسانہ کو پڑھنا ضروری ہے۔ بے عاشق ہوئے اور غیر محقق ہوکر ناممکن ہے جو اس افسانہ کو سمجھا سکے۔ واقعہ یوں ہے کہ صرف نظر کی حرکت سے عشق کو بھانپ لینا صرف ایک نوجوان لڑکی ہی کا کام ہے، گاندھی جی کے بس کا روگ نہیں۔ پھر محبت کرنے والے کے لیے شوہر تو کیا ساری دنیا کے خطرات، مشکلات، موانع، حجابات اور جان تک دے دیتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی جس بہادری، جس ہمت، جس دلیری، جس بے جگری اور جس استقلال سے کام کرتی ہے ہٹلر اور مسولینی بھی اس ہمت سے کام نہیں لے سکتے، اس لیے عورت اپنے سے عشق کرنے والے کے لیے جس درجہ مہربان اور محبت کرنے والی ہے دنیا میں کسی اور سے نہیں۔ اسی لیے میں ایسے افسانوں کا قائل نہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت محبت قبول کرکے بھی محض حالات کی نامساعدت کے باعث اپنے عاشق تک نہ پہنچ سکی۔ یہ عورت کی صحیح فطرت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے ورنہ عورت کی پیدائش ہی محبت ہے اور محبت ہی اس کی موت اور وہ محبت کی موت سے کبھی نہیں ڈرتی بشرطیکہ اس سے محبت کرنے والا بھی عالی دماغ ہو، بہادر ہو اور اس کا سچا پرستار۔ الحاصل آپ نے سالنامہ میں اس افسانہ کو شائع فرما کر کم سے مجھ پر تو بڑا احسان فرمایا۔ اللہ اس کے بدلے گورنمنٹ سے آپ کی اور اختر صاحب کی جاگیر اور منصب کرا دے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ''خیام'' کے پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں اگر اس سالنامہ کو صرف اختر صاحب ہی کے افسانے کی خاطر خرید لیں تو میں سمجھوں گا کہ ہندستان بھی جمالیات اور آرٹ کا قدر دان ہو چکا ہے۔ مصیبت تو صرف یہ ہے کہ خود محبت کرنے والوں میں ابھی حسن و عشق کی وہ قدر و قیمت نہیں جو آرٹ نے لگائی ہے۔ یہاں تو عاشق کو تھکا تھکا کر مار ڈالنا عین حسن ہے اور محبوبہ کو تیل ڈال کر آگ لگا دینا عین عشق ہے۔ حالانکہ عاشق کا رُتبہ عورت کے لیے تاج و تخت کے رتبہ سے بلند ہونا چاہیے اور محبوبہ کا رتبہ عرش و کرسی سے کچھ ہی نیچے۔ سو یہ بات اس افسانہ میں موجود ہے۔

اب رہے آپ کے سالنامہ کے دوسرے افسانے، سو اگر میں ان سب افسانوں کی تعریف خود ہی لکھ دوں تو پھر کس کو ضرورت ہے کہ وہ عشق و جمال، علم و حکمت اور شعر و شراب کے اس دل کشا ذخیرہ کو خود ملاحظہ فرمائے۔

◆◆◆

(3)

ایڈیٹر صاحب ''خیام'' کے نام

محترم مدیر ''خیام''!

محترم حافظ محمد عالم صاحب مدیر ''عالمگیر'' و ''خیام'' سے میری اس وقت سے دوستی ہے جب آپ بچے ہوں گے۔ موصوف چوں کہ اگلے وقتوں کے بزرگوں کی تربیت اور اسلامی اخلاق کا وہ نمونہ ہیں جو ایم۔ اے کے نصاب میں نہیں ہے، اس لیے آپ ان اصول پر حامل ہیں جن میں مروّت، پیار، وفا، وضعداری اور حسنِ سلوک کی بجا آوری نصف حج کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ پس رمضان شریف کی اس پہلی رات کو جس کے لیے قدیم وضع کے مسلمان سال بھر دعائیں مانگتے ہیں کہ آ جائے اور مسٹر قسم کے لوگ اس کے تصور تک سے گھبراتے ہیں۔ مجھے قبلہ خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے اخبار ''منادی'' کے ساتھ حافظ محمد عالم صاحب مدیر ''خیام'' کا یہ خط ملا کہ:

مکرمی! سلام مسنون!

میں کل صبح پنجاب میل سے جو 8 بج کر 35 منٹ پر دہلی سے چھوٹتا ہے بمبئی جا رہا ہوں، غالباً یہ گاڑی نو دس بجے کے درمیان بھوپال پہنچتی ہے۔ اگر آپ سے بھوپال اسٹیشن پر ملاقات ہو جائے تو زہے نصیب!

(محمد عالم)

واضح رائے عالی باد کہ یہ خط رمضان کی پہلی رات کو ملتا ہے اور اب رمضان کی یہ رات کسی طرح بھی ملتوی نہیں کرائی جاسکتی ہے۔ ادھر حافظ صاحب قبلہ کی طرح ملا رموزی بھی حافظِ قرآن ہے اور یہ سال اس کے حفظ قرآن کا چوبیسواں سال ہے۔ لہٰذا وہ تراویح پڑھتا نہیں بلکہ پڑھاتا ہے۔ پھر تراویح بھی پہلی رات کی۔ ادھر آپ جانتے ہیں کہ مسلمان سیاسی معاملات میں خاک نہیں مگر وہ مذہب کے نام پر آج بھی اتنا مشہور ہے کہ بے مقدرت بھی ہزاروں کی تعداد میں حج کو جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ بے مقدرت بھی ہزاروں کی تعداد میں حج کو جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ بے استطاعت حج کس نے فرض کیا ہے، اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر امامت چھوڑ کر حافظ صاحب کی ملاقات کو جاتا ہوں تو تمام نمازی میرے خلاف علم بغاوت بلند کردیں گے اور نہیں تو بائیکاٹ، عدم تعاون، ستیہ گرہ، نان وائلنس اور بھوک ہڑتال سے کام لیں گے اور یہ بھی نہیں تو کم سے کم مجھے دہریہ، ملحد، قادیانی اور وہابی تصور فرمائیں گے اور ظاہر ہے کہ آج کل کے مسلمان صاحبان کے جہاد کا سارا زور ان فرقوں کی تباہی اور ان کو برا بھلا کہنے پر صرف ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ میں تراویح چھوڑ کر حافظ صاحب سے ملاقات کروں گا اور ادھر تمام محلے کے انگوٹھوں کے نشانات کے ساتھ میرے خلاف پوسٹر، اعلان، اشتہار، مضامین، اشعار اور پمفلٹ تک شائع ہوجائیں گے کہ ملا رموزی نے عمر بھر قوم اور ملک کے لیے جو کچھ کیا وہ گیا بھاڑ میں مگر ہاں وہ بے نمازی وڑھ منڈا اور وہابی ہے، لہٰذا اس کا بائیکاٹ، اس لیے میں نے منافقوں کی طرح یا آج کل کے بعض دولت مندوں کی طرح دل میں طے کرلیا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر جاؤں گا مگر نمازیوں سے نہ کہوں گا کہ مجھے جلد جانا ہے۔ ہاں وہ جو آج کل کے دولت مندوں کے لیے میں نے کہا ہے سو اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسے دولت مند زندہ ہیں جو ملاقات کے وقت آپ کے لیے بڑے ملنسار، بڑے بے تکلف نظر آئیں گے۔ ان کے اس برتاؤ سے آپ طے کرلیں گے کہ اب کیا ہے دوستی ہوگئی، یارانہ ہوگیا، خوب ملتے رہیں گے، بڑا نفع دیں گے، لیکن آئندہ جہاں آپ نے اسی اعتماد سے ان سے ملنا چاہا کہ پھر ان سے اونچا منافق، غیر مہربان اور آپ کی ملاقات سے بھاگنے والا نہ ملے گا۔ یہ کیوں محض اس لیے کہ ایسے لوگ آپ ایسے اخبار نویسوں، مضامین نگاروں اور شاعروں کے ملنے سے یوں گھبراتے ہیں کہ خود اخبار نویسی کا فن جانتے نہیں، شعر و مضمون کے صحیح

الفاظ اوران کے معنی تک سے بے خبر ہوتے ہیں، اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی اخبار نویس ان کے خلاف کچھ نہ لکھ دے اور اوپر سے ان کے آس پاس کے جاہل دوست بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ اخبار نویسوں اور شاعروں سے دور ہی رہنا، اس لیے ایسے دولت مندوں کے اخلاق منافقانہ ہو جاتے ہیں اور وہ کسی حد سے گزری ہوئی بے بسی کے عالم ہی میں ہم سے آپ سے ملتے ہیں۔ اب ان سے لاکھ کہیے کہ ہم لوگ ہر ایک کے لیے تھوڑا ہی لکھتے ہیں تو بھی ان کو یقین نہیں آتا اور یہ گھبراتے ہی رہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ ان غریبوں کے پاس دولت ہوتی ہے، ہمارے آپ کے برابر علم نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی آپ نے دیکھا ہے کہ کافی علم غریبوں میں ہوتا ہے، اس لیے دیکھ لیجیے آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں مصطفیٰ کمال، رضا شاہ پہلوی، اسٹالین، ہٹلر، مسولینی، گاندھی اور حضرت ملا رموزی کی جو شہرت ہے وہ دولت مندوں کی نہیں حالانکہ یہ سب غریبوں کے بچے ہیں اس لیے میں نے بجائے سات پارے پڑھنے کے پانچ پاروں پر تراویح ختم کر دی اور ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

پُر لطف بات یہ تھی کہ ایڈیٹر صاحب ''خیام'' نے اپنی گاڑی کا وقت نو دس کے درمیان لکھا تھا مگر نو بجے سے پہلے ہی روانہ ہو گیا اور یہ ہر غریب آدمی کرتا ہے محض اس لیے کہ اس کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچنے اور پہنچانے کے لیے نہ خدام ہوتے ہیں نہ موٹر کاریں۔ ادھر دنیا کی فطرت اندھی واقع ہوئی ہے یعنی طے شدہ کی بات ہے کہ یوں تو ریل ہمیشہ لیٹ آئے گی، لیکن جس دن آپ کو گھر پر دو منٹ بھی دیر ہو جائے گی اس دن کے برابر ری صاحبہ عمر میں کسی وقت کی پابند نہ ہوں گی اور وقت سے بھی ایک آدھ سیکنڈ پہلے ہی گزر جائے گی۔ پس میں روانہ ہوا اور ایڈیٹر صاحب سے اسٹیشن کی مُبہم چھ منٹ کی گفتگو کا خاکہ بنانے میں محو ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ کہوں گا کہ دیکھیے یوں میں کس لائق ہوں، مگر ہاں وہ جو ایک قدر دان طبقہ میرے مضامین اور غزلوں کو کافی محبت سے پڑھتا ہے خصوصاً میری انگریزی داں بیوی نمبر 4، تو اس لیے براہِ کرم میرے مضامین اور غزل کو ''خیام'' میں ذرا نمایاں جگہ عطا فرمایا کیجیے، نہیں نہیں حافظ صاحب تعریفی نوٹ کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خواہ مخواہ لوگوں کو یہ فارسی بولنے کا موقع ملے گا کہ:

''من ترا حافظ بگویم تو مرا حافظ بگو''

اس لیے دل بڑھانے والا نوٹ تو کیا ہاں مگر ذرا نمایاں جگہ۔

پھر کہوں گا اور مشرقی تعلیم کے اثر سے، بڑی دبی زبان سے کہوں گا کہ براہِ کرم میرے معاوضہ کا معاملہ.... جی ہاں میں خودغرض کررہا ہوں کہ جب ''خیام'' اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، مگر بھولیے نہیں کیونکہ میں ہوں قوم کا مسلمان اور مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ ان کے علمی و قلمی خدام کو بس بقدر قوت لا یموت اور ایک سائیکل کافی ہے، چاہے ان کے ساتھ بارہ بچے اور چار بیویاں ہوں البتہ بھاری تنخواہ کے مستحق تو ریلوے کے ملازمین اور موٹر ڈرائیور ہوا کرتے ہیں، کیونکہ یہ غریب ادیبوں اور مضامین نگاروں سے کہیں سوا قابل ہوتے ہیں۔ ملا رموزی تو صرف مذاقیہ مضامین لکھتے ہیں جن سے نہ علم و ادب کو فائدہ نہ ملک و قوم کو نفع!

اس کے بعد ریل کے جانے کا وقت ہو جائے گا تو مارے گھبراہٹ کے ہماری آپ کی گفتگو یوں ہونے لگے گی کہ اچھا خدا حافظ اب آپ گاڑی میں بیٹھ جائے دیکھیے وہ سگنل ہو گیا، نہیں نہیں ابھی تو دو منٹ اور ہیں، دیکھیے مگر مضامین کا سلسلہ بند نہ ہو، میں انشاء اللہ سب سے پہلے آپ ہی کو معاوضہ دوں گا، اچھا خدا حافظ۔ مگر ابھی تو گارڈ نے سیٹی نہیں دی، جی ہاں جی ہاں ضرور ضرور مگر یہ تو فرمائیے کہ وہ آپ کی بیوی نمبر 2 تو خیریت سے ہیں۔ میں ان کا حال دریافت کرنا تو بھول ہی گیا۔ کیا واقعی آپ نے دوسرا نکاح فرمالیا ہے یا یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ اس پر میں ایک مرتبہ ''آہ'' کروں گا اور کہوں گا کہ حافظ صاحب بس نہ پوچھیے اس بیوی نمبر 2 کی تفصیل، السلام علیکم۔ مگر خدا کے لیے مضامین نہیں تو ظالم خیریت ہی کا خط تو لکھ دیا کرو۔ وہ آپ کے لاہوری احباب اکثر دریافت کرتے ہیں خاص کر مولانا ظفر علی خاں، مولانا سالک، مولانا حکیم یوسف حسن، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، پطرس تو دہلی میں ''ریڈیو رساں'' بن گئے ہیں۔ جی ہاں امتیاز علی تاج اچھے ہیں، کہتے تو تھے کہ میں ملا رموزی سے شرمندہ ہوں کہ اپنے نکاح میں ان کو بلانا بھول گیا۔ خیر انشاء اللہ کسی بچہ کے ختنہ میں تار کے ذریعہ بلاؤں گا۔ جی ہاں لالہ کرم چند اچھے ہیں مگر آپ سے شاکی ہیں کہ آپ ان کے اخبار ''پارس'' کو بھول گئے۔ آیئے نا تو پھر لاہور۔ آجکل وہاں کا موسم بھی اچھا ہے اور وہ آپ کے پہلے میزبان ''خاں صاحب'' حفیظ جالندھری اور مولانا حفظ الرحمٰن

بھی آپ کو یاد فرماتے ہیں، خدا حافظ۔ مگر دیکھیے وہ معاوضہ کا معاملہ نہ بھول جایئے گا۔ بیٹھے بیٹھے دیکھیے سیٹی ہو چکی ہے۔ آپ مضامین کی طرف سے اطمینان رکھیے، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے اور ہاں دیکھیے بمبئی سے واپسی پر ایک دن کے لیے میرے ہاں ضرور قیام فرمایئے گا گو اس مرتبہ کی بارش سے مکان جو منہدم ہو گیا ہے تو آج تک مرمت نہیں ہو سکی کیونکہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ ملا رموزی کو جو کچھ مل رہا ہے وہ بہت ہے۔ حالانکہ اس میں سے 25 روپیہ اس ماہ کم ہو گئے ہیں۔ بنا اللہ، کیا 25 روپیہ آپ کے کم کر دیے گئے۔ لاحول ولا قوۃ جب تو کہتا ہوں کہ آپ لاہور تشریف لے آیئے اور ''خیام'' کو سنبھالیے اچھا خدا حافظ۔ ''خیام'' کو اپنا ہی سمجھیے۔ السلام علیکم، ضرور ضرور انشاء اللہ واپسی کی اطلاع ایک ہفتہ پہلے ہی دوں گا، السلام علیکم، کیا ہوا؟ گاڑی چلتے چلتے رُک گئی۔ جی ہاں کوئی امیر مسافر آ گیا ہو گا، جس کو انگریزی میں فرسٹ کلاس مسافر کہتے ہیں اور دنیا میں جو کچھ ہے سو امیروں کے لیے ہے۔ ہمارے آپ کے لیے تو عقبیٰ میں ہے چلیے دو منٹ اور مل گئے مگر ملا صاحب یہ سنکر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ آپ کے 25 روپے کمک ہو گئے۔ آہ اہل ہنر کی قدر نہیں مگر کیا ان کے اجرا کی کوئی ترکیب نہیں ہیں۔ ''خیام'' میں کچھ لکھوں؟ نہیں نہیں یہ کوئی تنخواہ نہیں تھی بلکہ ایک خاتون دیتی تھیں جو تاجر ہیں اور اس مرتبہ ان کو تجارت میں خاصا نقصان ہوا، اس لیے غریب نے بڑی معذرت کے ساتھ یہ رقم بند کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ عورت کا دل کتنا، اسی لیے تو وہ ذرا سے حالات بدل جانے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتی ہے اور وعدہ خلافیوں پر اتر آتی ہے اور نام یہ ہے کہ عورت کے برابر نہ کوئی مضبوط نہ وفادار! السلام علیکم دیکھیے خط السلام علیکم۔

یہ اور اسی قسم کے خیالات کو لیے میں بڑے شوق سے ایڈیٹر صاحب ''خیام'' سے ملنے جا رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پہلے پھاٹک کو بند پایا، گھبرا کر سائیکل کو 80 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگایا، مگر آپ جانتے ہیں کہ آجکل جب انگریزی تعلیم نے عورت تک کی عادتیں بدل دی ہیں تو سائیکل بھی آخر مؤنث ہے کہ وہ پنجاب میل روانہ ہوا اور میں ایک مایوس مسافر کی طرح پھاٹک ہی پر ٹھہر گیا اور دل میں فطرت کے اس یکسر اوندھے ضابطہ کو گالیاں دینے لگا کہ جس کو چاہو وہی نہیں ہوتا ہے۔ اور بھئی قسم لے لو یہی پنجاب میل کی بگھی ڈھائی ہزار مرتبہ لیٹ آئی ہے اور لیٹ بھی کیسی کہ دس دس گھنٹہ مگر آج وہ جو مجھے اس سے کام تھا تو یوں وقت پر آئی گویا آفتاب تھی کہ وقت پر طلوع

ہو کر رہی۔ اِدھر دوسری پشیمانی کہ حافظ محمد عالم صاحب دل میں کہتے جاتے ہوں گے کہ ملا رموزی جو خود کو باغی، نمک حرام، بے وفا اور فرعون سامان لکھا کرتا ہے تو ہے بھی سچ کہ دیکھو میرے وقت پر اطلاع دینے کے باوجود نہ آیا، اس لیے میں نے ریل کی پٹری سے قریب ہو کر حافظ صاحب کے پنجاب میل کے انجن کے نمبر نوٹ کر لیے جو 414 تھے۔ اب جھانسی سے دریافت فرمالیجیے کہ 5 رنومبر کی شب کو بھوپال سے جو پنجاب میل گزرا اس کے انجن کے نمبر 414 تھے یا نہیں؟

◆◆◆

(4)

ایڈیٹر صاحب ''خیام'' لاہور کے نام

محترم حافظ محمد عالم صاحب مدیر مجلّہ ''عالمگیر''! السلام علیکم!

آپ کا وہ خط آثار قدیمہ کے محکمہ کو پیش کر دینے کے قابل ہو چکا ہے جس میں جناب گرامی نے اخبار ''خیام'' کے جاری فرمانے کا ارادہ لکھا تھا اور مجھ قدیم نمک خوار سے اس کے لیے مضمون طلب فرمایا تھا، میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ خیام کا پہلا پرچہ دیکھ لوں تو لکھوں، مگر جس طرح قبلہ خواجہ حسن نظامی کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ اپنی کتابوں کو اپنی ہی زندگی میں فروخت ہوتا دیکھ کر اپنی اولاد کی اولاد کو بھی دیکھ لیں، ضروری نہیں ہے کہ میں بھی اسی طرح اخبار ''خیام'' کو دیکھ لیتا، اس لیے وہ اس خط لکھنے سے پہلے آیا نہ اب آیا۔ البتہ بعض ایسے لوگوں سے خبر ملی کہ ''خیام'' جاری ہو گیا جو مقامی اخبار فروشوں سے صرف اس لیے بڑے خلوص سے ملتے رہتے ہیں کہ وہ ان کے اخبارات کو روزانہ مفت چاٹ جاتے ہیں اور اخبار فروش مارے مشرقی مروّت کے تمام حروف تہجی میں سے ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ اب جو یہ خبر ملی کہ ''خیام'' جاری ہو چکا ہے، مگر مجھے نہ ملا تو معاً سمجھ گیا کہ یہ سہو ہے۔ جناب کے مہتمم صاحب لاسلکی کا، یعنی مہتمم نشر و اشاعت کا، لیکن پھر جو غور کیا تو سمجھ گیا اور دل میں توبہ کی کہ بے چارے مہتمم صاحب نشر و اشاعت کی خطا نہیں،

بلکہ خود حافظ صاحب ہی کی خطا ہے کہ موصوف نے جس وقت مجھے بڑے لاڈ پیار سے لکھا تھا کہ
''خیام'' جاری ہو رہا ہے اگر اسی وقت مہتمم صاحب اشاعت سے فرما دیتے کہ دیکھو بھئی مہتمم
صاحب اخبار ''خیام'' جیسے ہی کہ اخبار خیام کا پہلا پرچہ چھپ چھپا کر، کٹ کٹا کر، سل سلا کر تیار ہو،
سب سے پہلے اپنے ملا رموزی صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے، پھر بھی مہتمم صاحب
مجھے ارسال نہ فرماتے تو بے شبہ وہ خطاوار گردانے جاتے، لیکن جب اس غریب سے آپ کہنا ہی
بھول جائیں تو میں ان کی شکایت کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کروں؟ ہاں یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ
بعض ''غریب غربا'' قسم کے صاحبان اہتمام و اشاعت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک پرچہ مضامین
نگاروں کے نام روانہ کر کے پھر بھول جاتے ہیں اور تقاضوں پر تقاضے وصول ہونے پر جب تک وہ
مضامین نگاروں کے نام کو رجسٹر میں درج فرما کر پتہ کی چٹ چھپوا نہیں لیتے، پرچہ پابندی سے نہیں
بھیجتے، مگر غالباً آپ کے مہتمم صاحب اشاعت ایسے نہ ہوں گے، لہٰذا اس طرح بھی آپ ہی کی خطا
ثابت!

الحاصل مجھے تو اطلاع مل ہی چکی تھی کہ ''خیام'' کا پہلا پرچہ جاری ہو چکا، یعنی چھپ کر،
لیکن مجھ سے چھپ کر فروخت ہو رہا ہے، اس لیے حسب وعدہ مجھے لکھنا پڑا، اب سوال یہ تھا کہ کیا
لکھوں، جب کہ خیام تو سامنے ہے نہیں۔ معاً خیال آیا کہ جس طرح مجھ ملا رموزی کو ہر نادیدہ
ایڈیٹر یوں لکھ دیتا ہے کہ ''گو جناب سے شرف نیاز حاصل نہیں لیکن غائبانہ تعارف ضرور حاصل
ہے اس لیے امید ہے کہ جناب اپنے تازہ افکار سے ہمارے پرچہ کو زینت عطا فرمائیں گے''۔ اسی
طرح مجھے بھی چاہیے کہ اخبار ''خیام'' کو دیکھے بغیر ''اس پر غائبانہ اظہار خیال لکھوں'' اور وہ دیکھیے
تاکہ اپنے ہاں کی اردو کی تمام غزلوں میں یہی تو ہوتا چلا آیا ہے کہ شاعر صاحب والد اور نانا کی عمر کو
پہنچ کر بھی عاشق ہی بنے رہتے ہیں۔ حالانکہ عمر کا یہ زمانہ توبہ و استغفار کا زمانہ ہوتا ہے، مگر وہ جو نزع
تک بھی اس حرکت سے باز نہیں آتے تو اسی لیے کہ وہاں ہوتا و تا کچھ نہیں ہے بس تصور اور اندازہ
سے ایک محبوب یا محبوبہ طے کر لیتے ہیں اور اس پر غائبانہ طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں۔ یہی تو راز
ہے جو اردو کی غزل حد سے سوا غیر عقلی، غیر واقعاتی بلکہ غیر فطری تک ہوتی ہے۔
جب میں لاہور میں مقیم تھا تو آپ نے چور نظر سے میرے آس پاس ایسے شعرا دیکھے

ہوں گے جنھوں نے اس غیر فطری شاعری پر لعنت بھیجتے ہوئے نہایت درجہ صحیح اور واقعاتی شاعری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا ورنہ آپ بھی خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ سچ فرمایئے کہ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے یا آپ نے کسی تعلیم یافتہ محبوب سے یا محبوبہ سے محبت کی ہو اور وہ محبت کا اظہار ہوتے ہی بعض کوتوالوں اور تھانیداروں کی طرح بے وفا، بے مروّت، بے رحم، ستمگر، جفاجو، جفاکار، جفاپیشہ، ستم شعار مکار اور حد یہ ہے کہ ہرجائی اور رقیب نواز بن گئی ہو، تو بہ تو بہ آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں مگر خدا کے لیے کسی سے کہیے گا نہیں، یہ میرا بہت بڑا راز ہے کہ میں نے جس محبوب یا محبوبہ سے اظہارِ عشق کیا اس نے میرے ساتھ وہ وفا کی، وہ محبت کی اور وہ عشق کیا کہ کوتوالی والے تک حسد کرتے تھے، البتہ ایک محبوبہ ایسی ملی جس کو میں "پتھر کی بنی ہوئی محبوبہ" کہتا ہوں، کہ گو میں نے اس کے لیے سینکڑوں غزلیں لکھیں مگر اس نے ملاقات تو در کنار اپنے قلم سے ایک آدھ تشفی نامہ تک مجھے نہ بھیجا، سو میں نے معلوم کر لیا کہ اس غریب کو یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا تھا کہ ملا رموزی سے دور ہی رہنا ورنہ وہ اخباروں میں تیرے خلاف مضامین لکھ دے گا۔ ادھر وہ تھی کم تجربہ بس آ گئی کہنے میں، ورنہ وہ دل سے میری آج بھی بے حد قدر دان ہے، لیکن یہ آپ کی اردو کی غزل نے تو شروع سے لے کر آخر تک یہی بتایا ہے کہ محبوبہ ظالم، جفاکار، عیار اور بے وفا ہوتی ہے سو اس کا سبب یہ ہے کہ اردو کے شعرا کو کوئی نصیب نہ ہوا اور وہ جو کہتے رہے فقط غائبانہ لہٰذا "خیام" پر میں بھی غائبانہ نظر ڈالوں تو غصہ نہ ہو جایئے گا۔ مطلع عرض ہے:

مثلاً میں نے دل میں سوچا کہ آپ ہیں آدمی ذی شعور، ذی ہوش، ذی مقدرت، جدت پسند، اگر چہ گستاخی معاف آپ عمامہ ہی باندھتے ہیں جو جدت پسندی کا جانی دشمن ہے، لیکن یہ تو کوئی بات نہیں، مجھی کو دیکھیے کہ میں یہ مضمون تہہ باندھ کر لکھ رہا ہوں تو کیا میں جدت پسند نہ رہا، اس لیے میں نے طے کیا کہ آپ نے اس اخبار میں ضرور جدت سے کام لیا ہوگا اور کچھ نہیں تو اس کا پیمانہ اتنا طویل و عریض رکھا ہوگا کہ جب دو آدمی اس کو منہ کے سامنے تان کر کھڑے ہوتے ہوں گے تب تیسرا آدمی اس کو پڑھتا ہوگا اور اس طرح اردو کا یہ اخبار "پائنیر"، "ٹائمز" اور "اسٹیٹس مین" سے بڑھ گیا ہوگا اور مسلمان بھی فخر سے کہیں گے کہ ہمارا اخبار بھی اتنا بڑا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے اشتہارات بھی کیا ہوں گے؟

میں نے پھر سوچا کہ آپ نے اس اخبار کی لکھائی چھپائی پر اتنی کافی رقم صرف کی ہوگی کہ اگر کافی خریدار نہ ملے تو آپ بند ہی کر دیں گے، جیسا کہ ''عالمگیر'' کی نظر پر در لکھائی چھپائی کا آپ کے یہاں بندوبست ہے، مگر قحط زدہ لکھائی چھپائی کو آپ پر برداشت نہ فرمائیں گے۔

میں نے پھر سوچا کہ آپ نے اس کے صفحۂ اول پر حضرت خیام کی تصویر ضرور دی ہوگی، اگرچہ وہ تصویر ایسی ہی ہوگی جیسی کہ شاہنامہ والے فردوسی کی تصویر عمامہ بند ہے اور دیکھنے سے شیخ سدّو یاد آ جاتے ہیں۔ ان کی تصویر میں ان کے پاس شراب کی ایک صراحی اور ایک مٹی کا پیالہ رکھا ہوگا اور ان کے منہ کے سامنے لاہور کے وائی۔ ایم۔ سی ہال کا مشاعرہ منعقد ہوگا، جس میں برادر محترم سالک مدیر ''انقلاب'' بڑے دبدبے سے صدر بنے ہوں گے اور حضرت حفیظ ہوشیار پوری تعارف کی تقریر فرما کر بیٹھے ہوں گے کہ جناب احسان بن دانش نے اپنی نظم شروع کر دی ہوگی اور لالہ کرم چند صاحب ایڈیٹر ''پارس'' قدآدم ہوکر داد عطا فرما رہے ہوں گے۔ آہ لالہ کرم چند کس درجہ شریف اور وسیع المشرب ہندو ہے جس نے قیامِ لاہور میں ملا رموزی کے لیے علاوہ دعوتِ ولیمہ کے قوالی کی محفل تک منعقد کرائی اور میری نمک حرامی دیکھیے کہ وہ دن اور آج کا دن جو اس غریب کو ایک خط بھی لکھا ہو۔ مضمون دینا تو گویا کفر ہے، مگر پھر خیال آیا کہ آپ نے اخبار خیام کے صفحۂ اول پر اتنے بڑے مشاعرہ کی تصویر یوں نہ دی ہوگی، کہ خیام مرحوم کو مشاعروں سے تعلق نہ تھا بلکہ میخانہ سے تھا اور آپ کے شہر میں رہتے ہیں ایک چھوڑ دو وہابی یعنی علامہ ظفر علی خاں اور علامہ حسین میر کاشمیری لہٰذا یہ لوگ اخبار پر میخانہ کی تصویر کس طرح برداشت کرتے۔

تو پھر سوچا کہ ان لوگوں کی مخالفت کے تاؤ میں شاید آپ نے مسجد شہید گنج کی تصویر دے کر مسلمانوں کو پھر سے بھڑکانے کی کوشش کی ہو، مگر پھر سوچا کہ آپ ٹھہرے آدمی غیر سیاسی اس لیے آپ نے تصویر ہی نہ دی ہوگی کہ ہاں وہ آپ خود بھی تو حافظ صاحب ہیں، پھر سوچا کہ اس اخبار کے صفحۂ اول پر تو ہوگا اشتہار حضرت عامل کریم الدین صاحب عملیاتی کا، یا جلی حروف میں لکھا ہوگا ''بھلّہ دی ہٹی'' اور صفحۂ آخر پر تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ''عالمگیر بک ڈپو کے اشتہارات ہوں گے، جن میں میری کتابوں کی قیمت میں رمضان شریف کی آمد کی خوشی میں رعایت کی گئی ہوگی۔

میں نے پھر سوچا کہ اس کے سرِ ورق پر ایک ایڈیٹر کے عوض لفظ ادارہ لکھا ہوگا جس میں تین چار نام تو ہوں گے مولویوں کی طرح کے اور ایک نام ضرور بی۔اے ہوگا، میں نے پھر سوچا کہ اس کے مقالہ مدیری کی اردو میں چاہے اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن بے ضرورت 95 فیصدی انگریزی الفاظ ضرور ہوں گے اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ حیدرآباد کے اخباروں کی طرح ہر انگریزی جملے، فقرے اور لفظ و اصطلاح کے بدل میں اردو کا جملہ فقرہ ہو کہ اس کے لیے اوّل تو خالص ہندستانی ذوق کی ضرورت ہے اور پھر اتنی فارسی عربی صلاحیت کی کہ بے ساختہ اردو کے الفاظ گھڑے جا سکیں، اسی لیے باوصف اردو کی سب سے بڑی خدمت گزار مشہور ہونے کے پنجابی صحافت ہی نے اردو میں سب سے زائد انگریزی الفاظ کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

پھر میں نے سوچا کہ خیام کے عملۂ ادارت میں ہر قابلیت کے لوگ ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک ظرافت نگار صاحب ضرور ہوں گے جو بہرۂ ظرافت کھولے ہر وقت خریداروں کو ہنسانے کی کوشش میں مبتلا ہوں گے اور ہاں یہ تو بھول ہی گیا کہ اس اخبار میں اگر تصاویر کا انتظام فی الوقت نہ ہوگا تو بھی سینما کے اشتہارات تو ضرور ہوں گے اور ان میں کسی نہ کسی ایکٹرنی کی تصویر ہوگی۔

الحاصل یہ ایک ترچھی سی یا ہلکی سی غائبانہ نظر ہے جو میں نے اس وقت ڈالی ہے۔ جب صبح کے چار بج رہے ہیں اور ایک چھوڑ دو مریض ملیریا کے مارے ہوئے میری ''لکھائی کی جگہ'' کے قریب اس خوبصورتی سے کھانس رہے ہیں گویا کھانسی کے فن میں کمال کر کے دکھانے والے ہیں، اس لیے ان کی کھانسی کی جھنجھلاہٹ میں اگر میرے اندازہ میں کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں اور ویسے جی چاہے تو آپ بھی میرے خلاف دس مضامین لکھ دیجیے گا۔

اپنی ایک شاعری بھی روانہ کرتا ہوں، اس کو دوسری اشاعت میں چھاپ دیجیے گا اور تھوڑی بہت تعریف بھی لکھ دیجیے گا کیونکہ اگر میں اپنی غزل آپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر سناتا تو آپ تکلفاً بھی داد عطا فرماتے لہٰذا اب لکھ کر ہی سہی ہاں اگر ''خیام'' مجھے مل گیا تو انشاء اللہ اس پر حاضرانہ نظر بھی ڈالوں گا۔ والسلام۔

◆◆◆

(5)

ایڈیٹر صاحب ''نگارستان'' دہلی کے نام

محترم مدیر ''نگارستان'' دہلی!

بعد سلام مسنون آں کہ معلوم ہو کہ الحمد للہ تا دمِ تحریر ہذا یہاں پر خیریت ہے اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب۔

دیگر احوال یہ ہے کہ اس طرف موسم خراب ہو رہا ہے، یعنی مدت مدید و عرصہ بعید سے یہاں بارش نہیں ہوئی ہے، جس سے دن میں گرمی شدید ہوتی ہے اور ذی ہوش لوگوں کو تکلیف مزید۔

مذہب کو سائنس پر ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ نماز اور دعا سے بارش ہو سکتی ہے اور نیاز مند کا خیال ہے کہ جب تک مان سون پیدا نہ ہوگی مر بھی جایئے تو بارش نہ ہوگی اور مان سون کا قرآن پاک میں بھی تذکرہ ہے۔ اِدھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب انسان کے مظالم اور سیہ کاریاں ملک جمن، حبشہ، ہسپانیہ، البانیہ، سلوا کیا اور ڈینزگ تک پہنچ جاتی ہیں اور جمعیۃ الاقوام کا دوزخ ان کو جلا تا نہیں تو ایک بارش کیا جاڑا تک بند ہو جائے گا اور ہم آپ لحافوں اور روئی کے کپڑوں کی خرید کے عذاب سے بچ جائیں گے، مگر ہاں سچ فرمایا آپ نے کہ آپ کو ان سیاسی باتوں سے کیا تعلق، آپ تو ٹھہرے فلمی آدمی، مگر اپنی تاریک خیالی سے میں سنیما سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ البتہ میری بیوی نمبر 2 سنیما بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور میں قرضدار ہوا چلا جا رہا ہوں۔ خیر تو دیگر احوال یہ ہے کہ خدا تندرستی دے بارش

ہو یا نہ ہو، مضمون نگاری اور عشق بازی کا سلسلہ بند نہیں ہوگا۔ بس ڈر ہے تو قحط سالی کا کیونکہ قحط سالی میں عشق بازی کے خلاف سعدی علیہ الرحمۃ کی یہ دفعہ 144 نافذ ہو جاتی ہے کہ:

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

مگر میری رائے میں یہ سوال ہے جغرافیہ دانی کا۔ یعنی سعدی علیہ الرحمۃ نے قحط سالی میں عشق بازی بند ہونے کا واقعہ دمشق کے متعلق لکھا ہے اور ہم آپ ہیں الحمد للہ ہندستان میں اور ہندستان میں اللہ میاں کا دیا سب کچھ ہے، صرف عقلِ سلیم ہی نہیں ہے، اسی لیے تو دیکھ لیجیے کہ ہر ہندستانی کے مصارف اس کی آمدنی سے دو چند ہی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ہندستان میں ہر کام وہ شخص کرتا ہے جو اس کام کا اہل نہیں ہوتا۔ دور نہ جایئے ایڈیٹری ہی کا کام لے لیجیے کہ اس پختہ کارانہ کام کو بھی ہندستان کے ایسے نوخیز و نوعمر لڑکے چلا رہے ہیں جو آٹھویں نویں جماعت سے تعلیم چھوڑ کر بھاگ آئے ہیں اور بعض پرچوں کے اِدھر نہ اُدھر خالص چیف ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں۔ ایسے نوخیز ایڈیٹروں کے ذریعہ زبان اردو میں جو گندہ، حیا سوز، بیکار اور خلافِ عقل و فطرت ذخیرہ جمع ہو رہا ہے اس پر آنے والی نسل کے پختہ کار محرم سے زیادہ روئیں گے۔ مثلاً آپ آج کل کے رسالوں کے افسانوں ہی کو لے لیجیے کہ لکھے تو جا رہے ہیں انبار در انبار مگر ہوتے ہیں سب غلط، خلافِ فطرت اور خلافِ واقعہ۔ ایسے افسانوں میں جو جذبات، واردات اور واقعات دکھائے جاتے ہیں ان سے ہندستان کی معیاری شرافت، حیا اور خودداری پر جو ضرب لگ رہی ہے اور یہاں کے باوقار حسن کی جیسی تحقیر ہو رہی ہے، یہ غریب نوعمر افسانہ نگار کیا جانیں کہ ایسے گندہ، فحش اور دور از حقیقت افسانوں سے ہندستانی حسن کے وقار کو کتنا صدمہ پہنچ رہا ہے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا ملا، حال معلوم ہوا، یعنی وہ جو آپ نے میری نظم پر ایک ملاحظہ لکھا ہے، اس کی تعریف میں دوسروں کے سبق کے لیے کرتا ہوں، یعنی ہندستان میں عقل سلیم کے کامل اور کثرت سے نہ ہونے کے نتائج بد زندگی کے ہر حصہ سے نمایاں ہیں۔ مثلاً ہندستان کے باکمالوں کو دیکھیے اور ہندستان کے قومی خدام کو ملاحظہ فرمایئے، جو محض قوم کی غفلت اور ناقدردانی سے تباہ ہیں۔ بعض اُلو کی قوم کے لوگ اور لگائیاں قدر کے معنی دولت کے سمجھتے ہیں۔ جی نہیں بلکہ

قدر کے معنی داد اور حوصلہ بڑھانے کے ہیں۔ سو ہندستانیوں میں یہ بھی نہیں البتہ وہ یورپ کے باکمالوں کو داد دیتے ہیں۔ پس ہندستانیوں کی اس تنگ دلی اور برادر فراموشی کا یہ اثر ہے کہ قومی خدام اور باکمال لوگ بھی اپنا کمال دکھانے کے عوض بکرا بکری کی تجارت شروع کر دیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ایسی ناقدرداں قوم کو اپنے کمال سے کیوں فائدہ پہنچائیں جو الفاظ کے ذریعہ بھی دل بڑھانے میں کنجوس ہے، مگر آپ کے ملاحظہ سے ثابت ہوا کہ آپ خود باکمال ہیں اور نفسیات انسانی کے ماہر اور بڑے فیاض حوصلہ، اس لیے دوسروں کے کمال اور محنت کی داد دیتے ہیں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ میں ''نگارستان'' میں اپنے مضامین کی بارش شروع کر دوں تو التماس ہے کہ اوّل تو ویسے ہی موسم ہے قحط کا، دوسرے جب مضمون نگاری کے بالکل بیچ میں ایک چھوڑ چار بیویاں پھاند پڑیں تو مضمون نگار شوہر مضمون نگاری کے عوض اپنا سر تو پھوڑ لے گا مگر مضمون نہ لکھ سکے گا۔ وہ تو بھائی جان یہ میری چھوٹی بیوی کی قدردانی کا صدقہ ہے جو آج میں شعر بھی کہہ رہا ہوں ورنہ وہ اوپر کی تین بیویوں نے تو مجھے سنیما کے خرچ ہی سے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ ادھر قرض روپیہ لے کر مجھے دو سہولتیں حاصل ہیں ایک تو یہ کہ جب تک قرض دینے والے کی جان ہی نہ جانے لگے اس وقت تک میں لیا ہوا روپیہ واپس نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ اللہ کا دیا بیویوں کا جہیز کافی ہے، اسی لیے کہا کرتا ہوں کہ ظالمو! شادی پر شادی کیے جاؤ اور یہ انگریزی قاعدہ سے بات بات پر طلاق کی عادت ترک کر دو۔

اسی طرح اگر جہیز میں سسرال سے زیور، برتن اور روپیہ کے عوض اونٹ ہی اونٹ ملیں تو شکریہ کے ساتھ قبول کر لو، مگر شادی سے انکار نہ کرو۔ آپ خود ہی سوچیے کہ دس بارہ اونٹ فروخت کر کے ایک سنیما گھر کھولا جا سکتا ہے کہ نہیں؟

لہٰذا جب بیوی کے جہیز کے اونٹوں سے سنیما گھر جاری کر دیا جائے گا تو قرض بھی ادا کر دیا جائے گا اور آمدنی بھی ہوگی، مگر مشکل تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان تو محض دولت مند بیوی چاہتے ہیں اور وہ بھی خود مفلس اور قلاش ہو کر اور میرا تجربہ ہے کہ افلاس کے عالم میں نماز روزہ تک صحیح نہیں ہوتا، بیوی تو پھر دنیوی چیز ہے۔

خیریت تو کہنا یہ تھا کہ ذرا بیویوں کی مصروفیت سے فرصت پالوں تو انشاءاللہ ''نگارستان''

میں مضامین کی بارش تو کیا وہ طوفان اٹھاؤں کہ دہلی بھر" پانی روک نماز" پڑھنے پر مجبور ہو جائے ورنہ اس وقت تک غزلوں سے تو چوکتا نہیں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ میں سنیما میں تماشہ کرنے والی لڑکیوں سے اتنا ہی واقف ہوں کہ وہ خوبصورت اور فیشنی ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے نماز روزہ کی عادت سے واقف نہیں، کیونکہ وہ مجھ سے دور ہیں اور ان سے دور۔ ممکن ہے کہ بعض ان میں مذہبی ہوں اور بعض غیر مذہبی۔ پھر بھی سنیما میں تماشہ کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں سے ملک کو یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ یہ دونوں غیر ہندستانی لباس وغیرہ ہندستانی اشیائے آرائش سے ملکی کپڑے اور ملکی وضع قطع کو بگاڑ رہے ہیں۔

بھئی اگر یہ سنیمائی لڑکیاں لونڈر کے عوض اپنے لکھنوی اصغر علی محمد علی صاحبان کی دکان کا عطر استعمال فرمائیں تو اس طرح ملکی صنعت کو ترقی ہوگی۔

غرض ہر چیز میں جب تک "ملکی پن" اور "قومی پن" کا لحاظ نہ رکھا جائے گا اس وقت تک میں اور میری چھوٹی بیوی نہ سنیما کا تماشہ دیکھیں گے نہ سنیما پر کچھ لکھ سکیں گے۔

اب تو یہ فرمایئے کہ آپ کی طرف کا موسم کیسا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہندستان چونکہ بے ہنری اور افلاس کا گھر ہے اس لیے اس میں بارش کے زمانہ میں بھی اگر خاک ہی اُڑتی رہے تو تعجب نہ کیجیے۔

بھلا بے ہنری سے بے ہنری ہے کہ لاکھوں نوجوان لڑکے محض بے ہنری کی وجہ سے بیویوں سے محروم ہیں اور لاکھوں لڑکیاں ہیں جو بے ہنری کی وجہ سے اچھے شوہروں سے خالی۔ خیر سچ فرمایا آپ نے کہ ہم کو، آپ کو اور لیڈروں کو قوم کی ایسی کمزوریوں سے کیا تعلق۔

اچھا تو پھر مہربانی فرما کر اس طرف کا حال لکھیے اور خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا یہ پہنچا کر کہہ دیجیے کہ انشاء اللہ ملا رموزی صاحب "نگارستان" میں لکھتے رہیں گے۔ زیادہ بخیر دعا اور کیا کہا جائے مکرر آں کہ اگر اس طرف گھی کا نرخ گر گیا ہو تو "بواپسی ہذا" جلد مطلع کیجیے گا۔ سہ مکرر آں کہ گھر میں جناب کو دعا کہتی ہیں اگر جناب موصوف سے چھوٹے ہیں اور جو بڑے ہیں تو سلام و آداب!

◆◆◆

(6)

ایڈیٹر اخبار ''عصر جدید'' کلکتہ کے نام

محترم مدیر ''عصر جدید''!

بعد سلام مسنون آں کہ گزارش ہے کہ خط آنجناب کا شرف صدور لایا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔ الحمدللہ کہ یہاں بھی تادم تحریر ہٰذا ہر طرح خیریت ہے۔ صرف ذرا چیچک کا موسم تیز ہو گیا ہے، جس سے کم عمر بچے ضائع ہو رہے ہیں، مگر خدا کا کرم کہ اتنے ہی پیدا بھی ہو رہے ہیں، لہٰذا اوسط برابر، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو نہ خوشی اور نہ غم۔ البتہ خیریت اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب۔

دیگر احوال یہ ہے کہ زمانہ ہے جنگ جرمنی کا اور ہم آپ اس سے پہلے کی جنگ عظیم میں بھی خاصے ہوشمند تھے اور اب تو الحمدللہ نہ خالص ہوش مند ہیں، فرق صرف یہ ہوا کہ 1914 کی جنگ عظیم میں نیاز مند کے حبالہ عقد عرف نکاح میں صرف ایک مولویوں کے مزاج سے جلتی بیوی تھی، جس سے میرے انگریزی کاموں میں قدرے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اس لیے وہ جو حضرت غالب نے فرمایا ہے کہ:

بیویاں چار جب نہ ہوں غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

سواس قاعدہ شعری سے میں نے تین کا اضافہ اور کرلیا، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جنگ کے خاتمہ پر چار اور کروں گا۔ اب آپ سوال فرمائیں گے کہ آخر یہ بیویوں کی اتنی بڑی فیکٹری قائم فرمانے سے مجھ ناچیز کا کیا مطلب؟ سو قصہ یہ ہے کہ ٹھہرا آدمی قومی، مصلح، حکیم الامت، لیڈر، رہبر، حاذق الملک اور آج کل کی اصطلاح میں ڈکٹیٹر، اس لیے میرے تجربات زندگی کل کے دن مجربات جالینوس اور سقراط کا کام دیں گے، اس لیے میں نے طے کیا کہ معلوم کیا جائے کہ چار بیویوں کی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے یا چار شوہروں کی، مگر افسوس کہ چار شوہروں والی تحریک ابھی یورپ ہی میں چل رہی ہے اور جنگ کی وجہ سے شاید ابھی کچھ دن اور یہ ہندستان میں داخل نہ ہوسکے، مگر چار بیویوں کی تحریک ہندستان میں بہت پرانی ہے بلکہ امرائے ہند میں سنا ہے کہ چالیس سے چار سو بیویاں تک بیک وقت رکھنے کی تحریک بھی کامیاب ہوچکی ہے اور لکھنؤ یا دہلی میں سنا ہے کہ ایسے مکانات اب بھی موجود ہیں جن میں اتنی بیویوں کے جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ آپ کے کلکتہ اور لاہور کا حال معلوم نہیں۔ قصہ کوتاہ جرمنی کی جنگ اور اٹلی کے حملۂ حبشہ کے وقت فوجی سپاہی بڑھانے کی معقول ضرورت کو بھی اگر کسی شوہر کے شامل حال کردیا جائے تو کثرتِ ازدواج کی ضرورت خوبصورت بھی نظر آتی ہے اور قومی خدمت بھی۔ البتہ میں ان شوہروں کا سخت مخالف ہوں جو ''بیوی بغرض بیوی'' نہیں بلکہ ''بیوی بغرض زیور'' کرتے ہیں یا ''بیوی بغرض سنیما''۔

بارے آپ یہ تو طے فرماہی لیں گے کہ میں بیویوں کے بارے میں اتنا زیادہ غلط کار نہیں ہوسکتا جتنا کہ بے علم لوگ سمجھ سکتے ہیں، مگر کافی خردمندی استعمال کرنے پر بھی اور مواقع پر نہ سہی تو کم سے کم عید بقرعید کے موقع پر ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ بیویوں کے معاملہ میں تھوڑی بہت کسر رہ گئی یا برا کیا جو چار کیں یا یہ کہ شریف ہوں تو اب نہ کروں گا یا کروں گا تو انگریزی داں نہ کروں گا یا انگریزی داں کروں گا تو انگریزی داں سسرال سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا یا پھر سرے سے غیر انگریزی داں بیوی کا نام بھی نہ لوں گا۔

غرض ہزاروں تجربات ہیں جو زیادہ بیویوں کے سلسلہ سے حاصل ہوتے ہیں اور خرچ صرف اتنا ہوتا ہے کہ شوہر حسین دماغ اور اعلیٰ درجہ کی نفسیاتی قابلیت کا ماہر ہو۔ سو الحمدللہ کہ آپ

سب بھائی مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ نیاز مند شوہر عرف ملا رموزی عورتوں کے نازک احساسات، ان کی واجبی ضروریات، ان کے جدید اور فیشنی خیالات کا کتنا زبردست ماہر ہے۔ بعض اوقات تو مجھے اپنے لیے یہ شبہ ہوتا ہے گویا میں بھی جرمنی سے ''بیویات'' کی ڈگری لے کر آیا ہوں، اس زعم کا نتیجہ یہ ہے کہ میری بیویاں مجھ سے خوش اور میں ان سے خوش۔ البتہ چاروں سسرالوں کی خوشی کا نہ مجھے علم نہ میری بیویوں کو اس کی پروا۔

اب وہ جو میں نے کہا ہے کہ بیوی یا بیویوں کے امتحان کا موقع یا تو وہ ہے جب وہ بیس برس کی عمر تک کسی تقریب میں شرکت کے لیے اپنے شوہر سے کچھ طلب کریں یا پھر ان کی کوئی سنیما دیکھنے والی سہیلی ان کی دعوت پر ان کے گھر آئے یا خود ان کے بچے کی کوئی تقریب ہو یا پھر عید، بقرعید۔ میں نے عمر کی قید یا پنچر اس لیے لگادی ہے کہ اس وقت تک عقلی قوی کامل نہیں ہوتے، اس لیے ان مواقع پر شوہر زیادہ خطرہ میں رہتا ہے۔ البتہ بیس سے تیس تک کی عمر والی بیوی ان مواقع پر اپنے شعور کے موافق کام کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عمر کی غیر انگریزی داں بیوی زیادہ خطرناک ہے یا خالص انگریزی داں؟ میری ناچیز رائے میں عید بقرعید کے لیے نہ غیر انگریزی داں بیوی نقصان دیتی نہ خالص انگریزی داں بلکہ خطرناک تو ہے وہ غریب جس نے آج کل کے انگریزی مدرسوں میں کلہم سات آٹھ درجوں تک کی انگریزی پڑھی ہو اور ماں باپ کی دولتمندی، لاڈ پیار اور خودمختاری کے ہاتھوں تعلیم چھوڑ بیٹھی ہو یا اسی جگہ سے افسانہ نگار اور شاعرہ بن گئی ہو۔ پس اب یہ بیوی شوہر کے حق میں الاماں بھی بن سکتی ہے اور الحفیظ بھی۔ اور اس پر سے ماں باپ بھی اگر یورپی زندگی کے نقال ہوں تب تو:

نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن!

ایسی بیویوں کی خاص پہچان یہ ہے کہ ان کے والد اور بھائی وغیرہ اپنا اسلامی نام بھی اردو میں یوں لکھتے ہیں۔ مثلاً ایس ایم غفور، جی آئی پی آر قادر، ای آئی آر محی الدین اور ایسی بیوی خود بھی اپنے دستخط اس طرح کرتی ہے مثلاً: بی بی سی آئی آر پروین، این ڈبلیو آر گلزار۔ اس قسم کی بیوی کے گھر اگر ریڈیو بھی ہو اور اس کے خاندان کا ایک آدھ مرد ولایت میں تعلیم پا رہا ہو تب تو شوہر کی خیریت صرف گورنمنٹ کے قانون میں ہے۔ اب اگر ان حالات والی بیوی کے گھر عید بقرعید کا

سوال آجائے اور اس کا ایک آدھ بچہ بھی ہو تو مان لیجیے کہ اب نہ ایک ولایتی دکان باقی رہے گی نہ زیور اور سینما کے تماشوں اور اعلیٰ درجہ کے ولایتی فرنیچر کے مصارف۔

اب ایسی بیوی اور مولوی وضع کی بیوی کے مصارف کا فرق صرف اتنا ہے کہ مولوی وضع بیوی کے بچے عموماً بے اندازہ ہوتے ہیں لہٰذا عید کے مصارف بھی زیادہ اور ریڈیو اور پیانو قسم کی بیوی کے اولاد کم اور بھاری فیشن کے مصارف۔ گویا ایک بیوی کے اور چار بیویوں کے مصارف کچھ اس طرح جمع ہو جاتے ہیں کہ ایک بیوی والا بھی عید پر قرضدار نظر آتا ہے اور چار بیویوں والا بھی مقروض، اس لیے گر بیویوں کو ''نارمل حد'' تک رکھا جائے تو قدرے عافیت سے گزرتی ہے ورنہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔

میری بیویوں میں مذکورہ بالا اقسام کا ہر نمونہ موجود ہے۔ البتہ بیوی نمبر 3 میں خاص بات یہ ہے کہ یہ غریب بے شمار معاملات میں ''غیر جانبدار'' رہتی ہے۔ اس کا زیادہ زمانہ سسرال میں کٹتا ہے یعنی اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی ہے تو وہ میرے حق میں سسرال ہو جاتی ہے اور جو میرے غریب خانہ میں رہتی ہے تو اس کے حق میں سسرال ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا وہ ہر وقت سسرال ہی میں رہتی ہے۔ اس لیے عید اور بیوی کے تجربات میں اس مرتبہ یہ اضافہ ہوا کہ بیوی کا جس حد تک تعلق ہے وہ شوہر کے لیے ہمیشہ جنت ہے۔ البتہ سسرال کا وجود شوہر کے لیے بے حد خطرناک ہے بشرطیکہ شوہر سسرال سے زیادہ غریب ہو۔ مثلاً اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے گھر کے عوض اپنے ماں باپ کے گھر میں عید کا تہوار منائے تو اس کو عید سے کچھ دن پہلے اپنے شوہر سے اس قسم کی گفتگو کرنا ہی پڑتی ہے کہ:

> ''ڈیڑھ سال میں تو آج جا رہی ہوں۔ اماں کو تو دیکھو کہ وہ ہر وقت تمھارے اور بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتی ہی رہتی ہیں۔ اب میں جاؤں تو ان کے بچوں کے لیے کچھ نہ لے جاؤں۔ خیر ان کے بچے تو میرے بہن بھائی ہیں لیکن وہ غفوراً خالہ کو کیا منہ دکھاؤں گی جو پڑوسن ہو کر حقیقی خالہ کا حق ادا کر رہی ہیں۔ اچھا جانے دیجیے اور محلے کے بچے مجھے بڑی آپا کہتے کہتے تھکتے ہیں تو کیا آج تہوار پر بھی ان کا سلام لیتی رہوں''؟۔

بیوی کی اس نوع کی گفتگو میں کسی کسی جگہ شوہر کو بھی یوں بولنا پڑتا ہے کہ:

''بس بس رہنے دیجیے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہر چیز کا نرخ چہار گونہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اگلا قرض ادا نہیں ہو سکا اور خیر یہ سب کچھ سہی مگر میں تو تمھاری فینسی زندگی کے ہاتھوں ہلاک ہوا جاتا ہوں۔ حد یہ ہے کہ تم خود مسلمان کی بیٹی ہو اور مسلمان کی بیوی، مگر اپنے بچوں کو سر سے پاؤں تک انگریزوں کے بچے بنا کے رکھا ہے۔ لباس دیکھو تو انگریزی، ان کی غذا دیکھو تو انگریزی، ان کے کھلانے والی عورتیں دیکھو تو انگریزی، ان کی تعلیم و تربیت دیکھو تو انگریزی، حالانکہ ماں باپ ہر حال میں ہندستانی۔ اچھا میں یہ بھی برداشت کر لیتا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ تم نے ہندستانی عورت ہو کر بھی جب اسی مہینہ میں اپنے لیے خالص انگریزی عورتوں کی طرح سلیپنگ سوٹ تیار کرا لیے اور تین بھاری ساڑیاں خرید لیں تو اب میں عید منانے کے لیے مزید روپیہ کہاں سے لاؤں۔ وہ موٹر پر لاٹری کا ٹکٹ جاری کر دینے پر بھی فروخت نہ ہوئی۔ ابھی اس کی فکر ہے ورنہ پھر سینما جانے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی اور طعنہ دو گی کہ اچھے تاریک خیال شوہر سے سابقہ پڑا ہے جو کمبخت عورت کا سینمائی حق چھینتا ہے۔ ریڈیو کی مشین کا روپیہ الگ دینا ہے ورنہ شام سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہو گی۔ انگریزی وضع کے برتن کم ہو گئے ہیں وہ پورے نہ کروں گا تو کہو گی میں ایسے گھر میں سہیلیوں کو کیا دعوت دوں جس گھر میں آج کل کی ضرورت کے برتن تک نہ ہوں۔ حالانکہ یہ تمام دولت برباد کرنے والی زندگی آپ نے صرف یورپ والوں سے چرائی ہے اگر خود ایجاد کر کے اختیار فرماتیں تو میں بھی فخر کرتا اور ہندستان بھر میں تمھاری دھوم ہوتی کہ ماشاءاللہ فلاں ہندستان زادی نے اپنی دماغی قابلیت سے ایسی تہذیب، ایسا تمدن اور ایسا معاشرتی نظام ایجاد اور مرتب کیا جو ہندستانیوں کی ملکی اور قومی خصوصیات فطری کے عین موافق ہے۔ میں ایسی بیوی پر فخر کروں جو سر سے پاؤں تک یورپی عورت کی نقال بنی رہے اور فخر کرے کہ میں بھی ''ایڈوانس'' لڑکی ہوں''۔

اس حد تک کی گفتگو کے دو ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ یا تو میاں بیوی عمر بھر کے لیے دو جانیں اور ایک قالب ہوجاتے ہیں یا پھر ان کا معاملہ بغیر قاضی و مفتی کے طے نہیں ہوتا۔ میری بیوی نمبر 3 کی یہ صفت ہزار درجہ شکر و ستائش کی مستحق ہے کہ وہ یورپ گھوم آئی ہے۔ ''پانیئر'' اور ''ٹائمس آف انڈیا'' پڑھ لیتی ہے، مگر نمازی پرہیز گار ہونے کے ساتھ ساتھ خالص ہندستانی فطرت و عادت بنی رہتی ہے۔ چھری کانٹے سے کھانا جان کر بھی ہاتھوں سے کھاتی ہے اور ہندستانی لباس کی عادی ہے۔ دولت کی قدر جانتی ہے اور خالص کھادی کے لباس میں بسر کرتی ہے۔ اس مرتبہ کی عید کے مصارف جو ایک جوشیلے دولتمند دولہا دُلہن کے مصارف سے کسی طرح کم نہ تھے محض بیوی نمبر 4 کی قابلیت سے بچ گئے، جو ممکن ہے کہ میرے ہی کسی آنے والے نکاح اور ولیمہ میں صرف ہوں۔ اس بیوی نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی مصارف پر جو تقریر کی وہ بے خلوص لیڈروں کی تقریر سے زیادہ اثر والی تقریر تھی، حالانکہ چارپائی پر بیٹھ کر تقریر کرنے سے بجز گاندھی جی کے تمام دوسرے لیڈر ہچکچاتے ہیں۔ مثلاً بیوی نے تقریراً فرمایا کہ:

اُس بیوی کو میں بیوی ہی تسلیم نہیں کرتی جو ملا رموزی ایسے خوش فکر شوہر کی جان پر قرض کی فکر کا بوجھ ڈالے۔

وہ بیوی ہی نہیں جو عید کے مصارف کے نام پر قرضدار ہوجائے۔

وہ بیوی ہی نہیں جو پورے سال میں عید کے مصارف کے لیے روپیہ جمع نہ کرسکے۔

وہ بیوی ہی نہیں جو سنیما کا تماشہ تو دیکھے مگر قوم کی خدمت کے قابل نہ ہو اور اس میں گھریلو اور قومی اصلاح و خدمت کی لیاقت نہ ہو۔

وہ بیوی ہی نہیں جو ریڈیو پر اپنا وقت برباد کرتی ہو اور اپنے گھر سے نکل کر شہر اور محلہ کی عورتوں کی اصلاح نہ کرتی ہو یا نہ کرسکتی ہو۔

وہ بیوی ہی نہیں جو ہندستانی نسل کی ہو کر یورپی وضع قطع پر مرتی ہو۔

وہ بیوی ہی نہیں جو علوم مذہب سے یکسر بے گانہ ہو اور انگریزی میں اپنا نام لکھتی ہو۔

وہ بیوی نہیں جس کے اولاد کم اور مصارف زیادہ ہوں۔

وہ بیوی ہی نہیں جو کرسمس بھی مناتی اور عید بھی۔

البتہ بیوی وہ ہے جو ایک باوقار زندگی اور مشہور عزت کی مالک ہو۔ بیوی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنی دماغی قابلیت سے ایک قوم کی سردار اور بزرگ بن کر رہے اور اس کا شوہر محض اس کی دماغی قابلیت کی وجہ سے اس کی بیوی بن کر رہے، نہ تو یہ اس کا فرماں بردار اور بالکل اسی طرح:

وہ شوہر نہیں جو اپنی بیوی کو تنہا ولایت یا سینما جانے کی اجازت دے۔

وہ شوہر نہیں جو خود غیر ملکی وضع قطع اختیار کرے اور بیوی کو بھی اس غیر ملکی رنگ میں رنگ جانے دے۔

وہ شوہر ہی نہیں جو بیوی کی خوشنودی کے لیے خود ہی بیوی بنا رہے۔

وہ شوہر ہی نہیں جو بیوی کے صلاح مشورہ بغیر دنیا میں جو چاہے کرتا رہے۔

وہ شوہر ہی نہیں جو خود بے جا مصارف کا عادی ہو اور بیوی کے مصارف ادا کرنے کے عوض اس کو تقریروں اور نصیحتوں سے خوش کرنا چاہے۔

الحاصل جب بیوی نمبر 3 کی تقریر کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس مرتبہ کی عید اسی بیوی کی صدارت میں مناؤں۔

اب جناب کی جو رائے ہو مطلع فرمایئے اور خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ عید مبارک

◆◆◆

(7)

ایڈیٹر اخبار ''صبح دکن'' حیدرآباد کے نام

جناب گرامی ایڈیٹر صاحب اخبار ''صبح دکن'' حیدرآباد دکن سلامت!

بعد ادائے مسنون آں کہ معلوم ہو کہ الحمد للہ تا دمِ تحریرہٰذا یہاں پر ہر طرح خیریت ہے اور خیریت آں محترم کی مع خورد و کلاں کے بدرگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا آیا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل کیا، مگر آپ نے یہ نہ لکھا کہ یہ خط آپ نے بعد عرصۂ دراز اور انتظار بسیار کے کیوں لکھا؟ مگر ہاں سچ ہے کہ مصروفیت آں محترم کی شب روز بہت ہے، جس کا اعتراف اس طرف کے حکام عالی مقام کو بھی ہے اور لاریب کہ آپ اپنی خدمات مفوضہ اور کارہائے متعلقہ کو بہ کمال اہتمام اور مستعدی انجام دیتے ہیں عرف بجالاتے ہیں اور کچھ شک نہیں کہ آپ کی مستعدی ویسے بھی لائق ثنا و ستائش تھی اور آج کل اس لیے زیادہ سے زیادہ قابلِ شکر و تعریف ہے کہ مسلمانوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو 99 فیصدی مستعدی ہی مفقود نظر آتی ہے اور کسی قوم یا جماعت سے مستعدی کا فنا ہو جانا اور اپنے اعمال و وظائف اور فرائض کی بجا آوری میں سست، کاہل، بے حوصلہ، بے پروا، غافل اور بے خبر ہو جانا گویا اُس قوم میں طاعون، ہیضہ اور کالے بخار کے پھیل جانے کے برابر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں

کاہلی، سستی اور غفلت نے کیوں رواج پایا تو اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ بازاروں میں خالص گھی بہت کم فروخت ہوتا ہے اور موسموں میں اعتدال نہیں رہا بلکہ اس کے اسباب بے شمار ہیں اور ان کا اس جگہ مع تفصیل وحواشی بیان کرنا اسی وقت مناسب ہوتا جب میں آپ کے مطبع کے پاس ایک مطبع منشی نول کشور آنجہانی کے جانشینوں اور قائم مقاموں سے بھی قائم کرالیتا۔ البتہ مسلمانوں میں کاہلی، سستی اور بے عملی کی کیفیت پیدا ہونے کے چند اسباب محض خورد وکلاں کی آگاہی کے لیے آپ کو لکھتا ہوں۔ آپ سے ہو سکے تو آپ کسی مسجد میں جا کر مسلمانوں کو سنا دیجیے گا اور مسجد والے اپنے خورد وکلاں کو سنا دیں گے کیونکہ معاملہ ہے خیر کا۔

پس مسلمانوں میں ہر قسم کی برائی، خرابی، کمزوری، لغویت، بیہودگی خصوصاً غیر مستعد کیفیت کا پہلا سبب ''اسلامی جامعہ عامہ'' کا فقدان ہے یا یوں کہیے کہ ان میں مرکزی زندگی کا فقدان ہے اور جب کوئی جماعت مرکزی زندگی سے دور ہو جاتی ہے تو اسے لاکھ ہوائی جہازوں میں بھر کر آسمان کی طرف بلند کیجیے وہ دنیا میں بلند اور سرافراز نہیں ہو سکتی۔ یوں کہیے کہ بمبئی اور کلکتہ میں لوگ 20 منزل والے مکانوں میں رہتے ہیں جو ملا رموزی کے مکان سے یقیناً بہت بلند ہیں اور اس کا ملا رموزی کی بیوی کو غم بھی ہے اور افسوس بھی۔

دوسرا سبب جہاں تک مجھے سی آئی ڈی والوں نے بتایا ہے یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحیح علوم اور کمالات کے حصول کا فقدان ہے، یعنی وہ علوم وکمالات کے حصول پر جس طرح حریص نہیں رہے اسی طرح وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی امداد وسرپرستی کے بغیر ترقی کے لیے جفاکش اور بڑے حوصلہ بھی نہیں رہے۔ اسی لیے میں نے نہایت عمدہ عینک سے انھیں ہر جگہ دیکھا ہے کہ یہ نوجوان ہو کر بھی ''تعلیمی وظائف'' کے لیے فدوی، کمترین، خاک پا، تابعدار، فرماں بردار، نیازمند، نیاز آگیں، نیاز کیش، دعا گو، نمک خوار، نمک پروردہ، غلامانِ غلام خود کو لکھ لکھ کر درخواستیں دیتے پھرتے ہیں اور بعض تو خود کو ''کفش بردار'' تک لکھ دیتے ہیں، مگر وظیفہ لیے بغیر محض اپنی ہمت، جفاکشی اور اولوالعزمی سے نہ تعلیم پانے پر تیار نہ صنعت وحرفت کے لیے مستعد۔ معنی یہ ہوئے کہ قوم کا مجموعی حوصلہ بمبئی کے چور بازار میں نیلام ہو چکا۔ یہاں تک کہ خود مجھ سے ایک دن گورنمنٹ بیٹھی قسمیں کھا کھا کر اور حلف اٹھا اٹھا کر کہہ رہی تھی کہ ملا صاحب اگر مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ

امداد و اعانت اور سر پرستی کی جتنی درخواستیں مسلمان نوجوانوں کی آتی ہیں دنیا کی کسی ایک قوم کے نوجوانوں کی اتنی درخواستیں نہیں آتیں۔ پھر امداد طلبی اور زر طلبی کی ان درخواستوں کی عبارتوں کی ذلت محتاجی، پستی اور بے چارگی کو علمی نقطۂ نظر سے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیج کر تحلیل کرایا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم کے مجموعی حوصلہ کے ساتھ قوم کی غیرت اور خودداری کا خون بھی سرد ہو چکا۔

چوتھا سبب نئے اور پرانے آداب و اصول زندگی کا آپس میں ٹکرانا ہے۔ یعنی بد قسمتی سے غدر 1857ء کے بعد بھی جو بزرگ باقی رہ گئے تھے ان میں سے بعض نے اور بعض نے نہیں تو کل نے اور کل نے نہیں جو جتنے آپ کو یاد ہوں اور جتنے مجھے یاد ہوں انھوں نے مسلمانوں کو جو کچھ سکھایا، سمجھایا، پڑھایا، اس میں یہ بھی یقین دلایا کہ مسلمان کے لیے دنیا دوزخ اور عقبیٰ جنت، لہٰذا اسے دنیا میں ایک ہی کام کرنا چاہیے یعنی قدم قدم پر شکر ادا کرے اور جو کچھ اور جتنا مل جائے اسے بھی دوسروں کو تقسیم کر کے کھائے اور اوپر سے پھر ایک شکر بجالائے اور خود کو ہمیشہ گنہگار، سیہ کار، ناکارہ، بے چارہ اور حقیر فقیر کمترین سمجھتا رہے اور جہاں تک ہو سکے بزرگوں کو جھک کر سلام کرتا رہے۔

یہ وہ آدابِ زندگی ہیں جو بد قسمتی سے یورپ کی اقوام کے آدابِ زندگی سے ٹکرا گئے جن کے ہاں دوستانہ خط و کتابت تک میں خود کو ذرۂ ناچیز، کمترین اور ہیچمدان لکھنا خودداری اور عالی حوصلگی کی توہین ہے، اسی لیے میں نے سنا ہے کہ یورپ والے اپنی ہر قسم کی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ صرف ایک ہی لفظ لکھتے ہیں اور وہ بھی ایسا جس سے انکسار، عاجزی، پستی اور بے حوصلگی کی بو تک نہیں آتی، لیکن اپنے ہاں کے آداب میں غریب بیوی تک خود کو کنیز اور خادمہ لکھتی ہے تو پھر جس قوم کے آداب و القاب تک میں پستی اور بے حوصلگی موجود ہو، اس قوم سے مستعدی کا مطالبہ کرنا ہی غلط۔ اور یہ آپ ضرور مانتے ہیں کہ الفاظ اور آداب کا اثر انسان کے خواص پر ضرور ہوتا ہے جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی والے ''الفاظ کا اثر خواص پر'' والے لیکچروں کو لالٹین کے ذریعہ دکھایا کرتے ہیں۔ وہ تو خدا کا کرم ہے کہ اخبار اور رسالہ والے مجھے ضیاء الملک لکھنے لگے ورنہ میں خود پہلے اپنے آپ کو خاکسار لکھا کرتا تھا۔

پانچواں سبب ہندستانی مسلمانوں کے بے عمل اور غیر مستعد ہونے کا یہ ہے اور اس سے

مری بیوی کو بھی اتفاق ہے کہ ہندستان میں مذہب اسلام کے نام سے بے شمار غلط تر کتابیں، وعظ، بیانات، روایات اور رسوم کو رواج دیا گیا جنھیں اصل اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں اور طرفہ مصیبت یہ کہ یہ خطرناک اور عقائد وخیالات کو کچھ سے کچھ بنا دینے والا سلسلہ اس روشنی اور بیداری کے زمانہ میں بھی باقی وجاری ہے اور سی آئی ڈی والوں کو خبر تک نہیں۔ بس وہ تو ملا رموزی کی رپٹ لکھاتے پھرتے ہیں۔ یعنی غلط تعلیم سے غلط خواص پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا روایات وعقائد جب غلط تو شوہر بھی غلط اور بیوی بھی غلط۔

چھٹا سبب مسلمانوں کے غیر مستعد ہونے کا یہ ہے اور اس سے تمام یورپین حکومتوں کو اتفاق ہے کہ جب یہاں کا مسلمان ملازمت اور تجارت وغیرہ کے لیے انگریزی سیکھنے پر مجبور ہوا تو آپ ہی بتائیے کہ وہ بی۔اے پاس کرتا یا حقائق مذہب ونکات اسلام سے لبریز کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ پھر طرفہ مصیبت یہ کہ دونوں کی زبان غیر۔ یعنی مذہبی تعلیمات کے لیے پہلے عربی پڑھیے اور انگریزی علوم کے لیے پہلے انگریزی۔ وہ تو جناب ایک آپ ہی کا نصیب اور مقدر سکندر نکلا کہ قدر قدرت سلیمان شوکت اعلیٰ حضرت تاجدار دکن میر سر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ نے عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم مادری وملکی زبان کو قرار دے کر "تاریخ ترقی ہند" میں ایک کبھی نہ مٹنے والا باب قائم کرلیا ورنہ جائیے اور دیکھ لیجیے کہ ہر جگہ مذہب اسلام کا نصاب تعلیم عربی میں ہے اور بی۔ اے کا انگریزی میں اور میری عزیز از جان بیوی کے بی۔اے پاس نہ ہونے کا بڑا سبب یہی ہے کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

لہٰذا جب مسلمان بی۔اے کے لالچ میں پھنس گیا تو مذہب اسلام کے دنیا جہان سے بہتر و برتر اصولِ زندگی سے وہ اتنا ہی واقف ہونے لگا کہ اپنی چھوٹی اور بے عقل اولاد کو بچپن میں روزے نماز کے مسائل پڑھا کر خوش ہو گیا کہ اولاد "دینیات" سے واقف ہو گئی اور جب اولاد عقل، زندگی اور ترقی کے اہم راز اور نکات سمجھنے کے قابل ہوئی تو اسے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے جرمنی بھیجا جانے لگا ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جس قوم میں روزانہ پانچ وقت نماز باجماعت ایسا عمل فریضہ قرار دیا گیا ہو اس سے زیادہ جفاکش، محنتی اور مستعد قوم اور کون ہو سکتی ہے؟ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ صرف تعلیماتِ اسلام کے ان ترقی بخش رازوں کو بی۔اے کی مصروفیت کے باعث نہ سمجھنے کا یہ

نتیجہ ہے کہ اس درجہ مستعد بنانے والے فریضہ نماز سے آج مساجد اگر آباد ہیں تو صرف کنجڑوں، مُلا ہوں، کسانوں، حمالوں، حجاموں اور غریبوں عرف مزدوروں سے اور دولت مند تاجر، تعلیم یافتہ اور ذی مقدرت مسلمان ہیں کہ اپنی کوٹھیوں، بنگلوں، اٹاریوں اور دولت خانوں میں بیٹھے تاش کھیلا کرتے ہیں۔ تو پھر جس قوم کے ذی مقدرت اور ذی ہوش افراد نماز با جماعت ایسے مستعد تر بنانے والے فریضہ سے یوں جی چراتے ہوں، اس قوم میں مستعدی پیدا ہوگی یا اس انگریز قوم میں جس کی عورتیں تک ہوائی جہاز چلاتی ہیں، مگر نہ خطرہ سے ڈرتی ہیں نہ محنت سے جی چراتی ہیں۔

پس مذہب اسلام کی اہم تعلیمات سے گریز کر کے جو مسلمان بے حوصلہ، بے ہمت اور عیش پسند بنے ہیں اس کا سبب وہی ہے یعنی مرکزی زندگی کا فقدان، یعنی جب تک اصحاب مقدرت بانس بریلی کے لٹھ کے ذریعہ اسلامی اصول و احکام کی پابندی نہ کرائیں گے۔ مسلمانوں کو کیا خوف ہوگا جو مغرب کی نماز ٹھنڈی سڑک کی تفریح چھوڑ کر ادا کرتے پھریں گے مگر جناب ایک آپ کی خادمہ نہیں، نہیں آپ کی بچی، یعنی میری بیوی ہے جو میرے پانچ برس کے ولی عہد کو ابھی سے مذہبی باتیں سکھا سکھا کر، سنا سنا کر، بتا بتا کر اور سمجھا سمجھا کر مارے ڈالتی ہے۔ یہاں ''مارے ڈالتی'' سے مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ سکھاتی ہے۔

مگر لاحول ولاقوۃ دیکھیے مارے زکام کے جو میرا دماغ خراب ہے تو میں خط میں کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا لکھ گیا۔ لہٰذا یہ تو بتایئے کہ آپ کے ہاں کی بارش اور فصل کا کیا حال ہے اور آپ نے اپنی زمین کا کیا بندوبست کیا ہے۔ بھئی مجھ سے کیا دریافت کرتے ہو میں تو مسلمان قوم کا مضمون نگار ہوں اس لیے مجھے نہ کسی نے جاگیر میں زمین دی نہ معافی میں کھیت، اس لیے میں کیا بتاؤں کہ یہ بارش فصل کے لیے کیسی ہے، میں تو اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ الحمدللہ اس بارش سے ملیریا اور انفلوانزہ خاصا ترقی کر رہا ہے اور میں ہوں کہ دواؤں اور حکیموں کی فیس ادا کرتے کرتے مرا جا رہا ہوں۔ ہاں اگر ہندوؤں کے لیے ایسی زندگی خوشی اور حکمت پیدا کرنے والی مضمون نگاری کروں گا تو ان کے ہاں کے ایک مسٹر برلا ہی مجھے اتنی جاگیر دے دیں گے کہ میں آپ کو دس لاکھ ایکڑ زمین کے تجربات بتا دیا کروں گا بشرطیکہ آپ سی آئی ڈی والوں کو میرے تجربات نہ بتا دیا کریں۔ البتہ مواشی کے متعلق اتنا تجربہ ضرور ہے کہ انسان اگر مواشی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ بارش

کے موسم میں کافی تعداد میں ''مرغا مرغی'' پال لے، اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ بارش میں گھر میں کثرت سے مرغا مرغی ہونے سے بدمزاج اورلڑاکا بیوی کا مزاج رات کو ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور شوہر پر نازل ہونے والا غصہ دن بھر مرغا مرغیوں پر چلانے اور بھگانے میں خرچ ہو جاتا ہے، اس لیے ملازمت سے تھکا ہوا شوہر رات بھر سکون سے سوتا ہے کیونکہ بیوی کو مارے مرغا مرغیوں کے شوہر پر غصہ کرنے کی فرصت ہی نصیب نہیں ہوتی اور ویسے آپ کی مرضی چاہیں تو آپ اونٹ پال لیں کیونکہ مسلمانوں کے غیر مستعد ہونے کا ساتواں سبب یہ ہے کہ انھوں نے غلام اور مفتوح ہو کر آزاد اور فاتح اقوام کی نقل وتقلید شروع کر دی۔ بھلا یہ بھی کوئی خردمندی اور زیرکی ہے کہ انگریز بھائی بڑی تجارت اور بھاری تنخواہ کے ذریعہ ریشم کا سوٹ پہنتا ہے لیکن مسلمان نہ آزاد ہے نہ فاتح نہ تاجر اعظم ہے نہ بھاری تنخواہ والا، لیکن وہ بھی ہے کہ ریشم کا سوٹ ڈالے آپ پر بھی دندناتا ہے اور مجھ پر بھی۔ اور تو اور سنا ہے کہ اب تو مسلمانوں کی 25 فیصدی عورت ذاتیں ہیں کہ یورپی وضع قطع اختیار کرتی جاتی ہیں۔ اب اگر ریاضی کا یہ سوال عثمانیہ یونیورسٹی کے استادوں کو دے دیا جائے اور دریافت کیا جائے کہ کیوں بھئی استاد! بتاؤ تو کہ دو قوموں کا لباس اور تمدن تو ایک ہے، لیکن مالی حیثیت میں ایک زیادہ اور دوسری کم تو حاصل ضرب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کی کمر اس خوبصورت لباس سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔ نہ اسے ڈاکٹر انصاری صاحب جوڑ سکیں گے نہ ڈاکٹر بوس۔ پھر جس قوم کی مالی حالت افسردہ اور پست ہوگی ڈاکٹروں سے رائے لے لیجیے کہ اس قوم کی دماغی حالت بھی افسردہ اور پست ہوگی اور جب دماغی حالت افسردہ ہوگی تو میری بیوی کی یہ رائے صحیح ہوگی کہ مفلس قوم ہمیشہ بے حوصلہ اور غیر مستعد ہوتی ہے۔

دیگرا حوال یہ ہے کہ اب تو سنا ہے کہ مسلمان مکانات بھی یورپ کی وضع کے بنواتے ہیں لہٰذا جب مکان یورپ کی وضع کا ہوا تو اس کی آرائش کا سامان بھی یورپ ہی سے آئے گا۔ اور جب زندگی کی ہر چیز یورپ سے آئے گی تو ملک کی دولت ملک میں رہے گی یا یورپ جائے گی، پس جب گھر کی دولت یورپ جائے گی تو گھر میں فراغت کے عوض فاقہ رہنے لگے گا اور جب ملک میں فاقہ رہے گا تو قوم میں انگڑائیاں، جمائیاں اور غنودگی پیدا ہوگی یا مستعدی؟ اور ہاں بھائی جان وہ خوب یاد آئی اور وہ بھی ایک مولوی صورت کے سی آئی ڈی نے یاد دلائی کہ بعض ذی مقدرت

مسلمان اس نخرہ اور اطمینان سے شراب بھی نوش فرماتے ہیں گویا ہندستان سے لےکر جرمنی تک انھیں کا قبضہ، لہٰذا نوش کیجیے قسم اول کی شراب۔

پس جن دماغوں پر شراب مسلط ہو اور وہ بھی قدرے مذہب اور جماعت کا خوف اور ندامت لیے تو ایسے افراد میں مستعدی کے عوض بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ آپ چاہیں جہاں کے کوتوال صاحب سے دریافت کرلیں کہ چوری کے ہر عمل کا اثر خواص وحواس کو بزدل یعنی کمزور بناتا ہے۔ لہٰذا مسلمان لاکھ دہریہ ہوکر بھی جب ''شراب کھائے گا'' تو اس کے دل ودماغ پر ندامت اور خوف کی ایک لرزش ضرور باقی رہے گی، لہٰذا شراب اسے وہ نفع کبھی نہ دے گی جو ملا رموزی کو، نہیں نہیں انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمنیوں کو دیتی ہے، جن کے ہاں شراب پیتے وقت نہ مذہب کا خوف ہوتا ہے نہ جماعت کا، مگر ہاں آپ نے اپنے خط میں یہ نہ بتایا کہ آپ کے ہاں چاول اور ماش کی دال کا کیا نرخ ہے؟ مگر ہاں سچ فرماتے ہیں آپ کہ مسلمانوں میں جب تجارت کا ذوق بھی نہیں تو ان چیزوں کا نرخ کس طرح معلوم کیا جائے۔ بے شبہ مسلمان تو گھر بیٹھے جاگیر یا پھر ملازمت پر مرتا ہے۔ اچھا تو پھر یہ ہی بتائیے کہ اس طرف دیسی اور قدیم ورزش سے زیادہ دلچسپی ہے یا یورپی ورزش کو پسند کیا جاتا ہے؟ میری اور دواخانہ یونانی دہلی کی یہ رائے ہے کہ ہندستان گرم ملک ہے اس کے باشندوں کے لیے مشقت شاقہ ہمیشہ مضر اور مہلک ثابت ہوگی اور ہاکی، فٹ بال اور کرکیٹ کے کھیل یقیناً محنت شاقہ ہیں جنھیں ہندستانیوں کا دھوپ اور گرمی سے مارا ہوا جسم کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا اور نہ عملاً میں نے کسی شخص کی عمر اور توانائی کو سو برس تک اس لیے محفوظ اور دراز دیکھا کہ وہ ہاکی یا فٹ بال کھیلتا تھا، بلکہ ان نوجوانوں کو بجائے توانا اور تندرست دیکھنے کے میں ہر وقت ٹنچر لگاتے دیکھا کرتا ہوں اور سنیما کے نقصانات کا تو تذکرہ ہی نہ کیجیے۔ بڑی بدنصیبی تو یہ ہے کہ غلامی کے عہد میں ذہن ودماغ چونکہ ماؤف، مسخ اور مفلوج ہوتا ہے لہٰذا یورپ کی ہر چیز کو قبول اور اختیار کرتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ ہندستانیوں کے مذہب، آداب، اخلاق، معاشرت، آب وہوا اور طبعی خواص کے موافق بھی ہے یا نہیں۔ بس جس طرح اور جس رنگ سے یورپ کی چیز جہاں سے اترتی ہے اسی طرح بغیر کسی غور اور اصلاح کے ہندستانی قبول فرمالیتے ہیں۔

بھلا اردو کے ان رسالوں کو بھی علمی و ادبی رسالے کہا جا سکتا ہے جو صرف سنیما میں کام کرنے والی عورتوں کی تصاویر شائع کرتے ہیں اور وہ بھی لے دے کر سنیما کی تین چار عورتیں ہیں جنھیں سو سو مرتبہ اور سو سو طرح سے یہ بے علم رسالے شائع کرتے رہتے ہیں۔ پھر جن رسالوں کا تصویری معیار یہ ہو خدا کے لیے گورنمنٹ سے مشورہ کر کے ذرا بتایئے کہ اس قوم میں تقریر کی روح کس طرح بیدار ہوگی۔ یہی حال اردو کے "ادب لطیف" کا ہے اور بھئی اتنا بڑا ساون کا مہینہ نکل گیا آپ اردو کے تمام رسالے جمع کر کے دیکھ لیجیے زیادہ سے زیادہ چار چھ پرانی نظمیں ہوں گی جو ساون کی شباب اور جوانی میں ڈوبی ہوئی بہاروں پر شائع ہوئی ہوں گی۔ سو وہ بھی سب کی سب مردوں کے قلم کی۔ حالانکہ یہی وہ موسم ہے جب شباب والے شراب اور حسن والے رنگ بن جایا کرتے ہیں۔ زمین کی وسعتیں ہوتی ہیں جو حسن و شادابی اور رنگ و خوشبو کے پھر سے جوان بنا دینے والے خزانے لٹاتی ہیں۔ حسن و جوانی والوں کے دلوں میں ارمان اور آرزو ایک میٹھا درد بن جاتا ہے اور بارش کی مستیوں میں ڈوبی ہوئی ہوائیں، جب انھیں گدگداتی ہیں تو وہ رسالوں میں فرضی شوہروں کے نام مضامین لکھتی ہیں اور چوری سے ملا رموزی کے نام خط۔ مگر آپ نے دیکھا کہ بے چینی، بے تابی، بے قراری، بے حجابی، بے اختیاری اور بے خودی کا یہ موسم اس طرح نکل گیا گویا یہ بھی عالمگیر جنگ ختم ہونے کی تاریخ تھی کہ تمام دنیا اس کے احترام میں دو منٹ تک دم بخود کھڑی رہی اور ریل گاڑیاں بھی بند رہیں، تو پھر جس قوم میں غیر مستعد، بے دل، بے حوصلہ، بے ہمت، بے عمل اور بے دم رہنے کے اتنے اسباب ہوں اس میں آپ کا اتنے رنگین سالنامے شائع کرتے رہنا بس یوں کہیے کہ حیدرآباد کی سرزمین ہی کی اولوالعزمی ہے اور شاہ دکن کا زندگی بخش پرتو۔

دیگر احوال یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی والوں سے ملاقات ہو تو میرا بہت بہت سلام کہیے گا اور کہیے گا کہ ملا رموزی آپ کو بہت یاد کرتا ہے اور ان سے یہ بھی دریافت کیجیے گا کہ اس خالص ملکی اور وطنی زبان والی درسگاہ میں استاد یورپ کا لباس پہن کر تو نہیں جاتے۔ اگر خدانخواستہ جاتے ہوں تو ان سے علاحدہ بلا کر کان میں کہہ دیجیے گا کہ یہ عمل اصولاً غلط ہے اور بس۔ اور بھئی اگر دیکھو کہ وہ میری اس بات سے خفا ہوتے ہیں تو فوراً الفاظ واپس لے لیجیے گا۔

امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ ہاں طلبا بھی اگر دیسی وضع کا لباس استعمال کریں تو ان کا سراسر فائدہ ہی ہے اور ویسے وہ استاد اور طلبا ہیں اور میں فرماں بردار مگر آپ نے یہ نہ بتایا کہ آپ کے یہاں یورپ کے سگار اور سگریٹوں پر سالانہ کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے؟ باقی سب خیریت ہے۔ اس مہینہ کے لیے تو انشاء اللہ گھی اور چاول کافی ہیں اور ویسے اگر خالص گھی مل جائے اور آپ خود بازار جا کر اور خود نرخ طے کر کے لائیں تو ایک ٹین اپنے ہمراہ لیتے آیئے گا۔ معاف کیجیے گا مجھے آج کل کے ملازم اور خانساماں وغیرہ پر بھروسہ نہیں۔ حالانکہ آج کل کے فیشن ایبل لوگ جاہل اور نوجوان ملازموں اور خدام پر بعض اوقات اتنا بھروسہ کرتے ہیں کہ پورا گھر ان کے سپرد کر کے چلے جاتے ہیں اور نتائج کو ہم آپ اخباروں میں پڑھا کرتے ہیں۔ جی بالکل غلط ہے کہ میرے زکام اور ملیریا میں مبتلا ہونے پر کسی نے مجھے خفیہ خط لکھا تھا۔ آپ کے بھتیجے عرف میرے لڑکے کا سلام قبول ہو، کبھی کبھی تو اپنی اور قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کی خیریت لکھ دیا کیجیے۔ خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام اور ہاں وہ بھی آداب عرض کرتی ہیں اور بچوں کو دعا کہتی ہیں۔

زیادہ حدِ ادب۔

◆◆◆

(8)

ایڈیٹر صاحب ''ہمدرد صحت'' دہلی کے نام

''ہمدرد صحت'' کے محترم ناظرین و ناظرات کو بعد سلام مسنون اور شوقِ ملاقات کے اگر ملاقات ممکن ہو سکے تو معلوم ہو کہ الحمدللہ تا دمِ تحریر ہذا یہاں ہر طرح تو نہیں مگر ہاں زیادہ مقدار میں خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ سب کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے اس لیے کہ یہاں اپنی ہی فکروں اور بیوی نمبر 2 کی جدائی اور بے مروّتی کے غم سے کسے فرصت۔

دیگر احوال یہ ہے کہ 28 فروری یا بھائی خدا معاف کرے 29 فروری مگر سنا ہے کہ 29 فروری کو ایک مارچ ہوا کرتی ہے تو خیر ایک مارچ 1935 کی صبح کو، مگر صبح کو کیوں اچھے خاصے بجے ہوں گے کوئی دس سوا دس کہ میں جمیعۃ علمائے ہند کے مہمان خانہ سے اٹھا اور قبلہ محترم حکیم حاذق حاجی مولوی عبدالحمید صاحب مالک ''ہمدرد دواخانہ دہلی'' و ایڈیٹر رسالہ ''ہمدرد صحت دہلی'' کی ملاقات کے لیے ممدوح کے دواخانہ پر گیا اور یہاں سے ممدوح کے کمرہ تک اس طرح پہنچا گویا کوئی کسان ہندستان کے وائسرائے کے جمال اندر جمال کوٹھی میں گھس گیا ہو اور گھبرا رہا ہو۔ وہ تو بال بال بچ گیا ورنہ ممدوح کے دروازہ کے باہر ایک مشینوں کے کارخانہ میں گھس گیا ہوتا کہ اسے اپنی خردمندی سے میں ''مطبع ہمدرد صحت'' سمجھ بیٹھا تھا۔ غرض خدا خدا کر کے ہمدرد دواخانہ کی عمارت میں

داخل ہوا اور پھر گھبرانے لگا اس حد تک کہ بار بار واپس ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔ اب یہ گھبراہٹ محض اس وجہ سے تھی کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر یعنی بہ حلف مذہبی کہتا ہوں کہ میں نے آج تک ہندستانی طب کا اتنا عظیم الشان، نفیس، مرتب، مزین، مفرح اور رنگین دواخانہ نہیں دیکھا۔ یہاں دواخانہ سے مراد شربت نیلوفر، عرق گاؤزبان، خمیرہ گاؤزبان اور حب مقوی باہ کی وہ رنگین اور نفیس بوتلیں اور شیشیاں نہیں ہیں جو عطاروں اور حکیموں کی دکانوں اور دواخانوں میں خریداروں کی نظریں کھینچنے کے لیے برابر برابر رکھی جاتی ہیں بلکہ یہاں تو ستم یہ تھا کہ یہ ادویہ کا وہ عظیم الشان ذخیرہ تھا جو لاکھوں طبی اصول و ضوابط کے ذریعہ تیار ہو کر مریضوں تک اللہ کافی اللہ شافی بنا کر پہنچایا جاتا ہے اور یقیناً قسمت کے مارے ہوئے ہیں وہ ہندستانی عطار جو ہمدرد دواخانہ سے اپنی دکان کے لیے دوائیں نہیں خریدتے کہ بھلا اس ذخیرہ کے رکھنے، جمانے، بنانے اور روانہ کرنے کی جگہ جب اتنی حسین و دلفریب ہو کہ ملا رموزی ایسا بادشاہوں کے محلات کو خاطر میں نہ لانے والا انسان اس کوٹھی کی صفائی اور ترتیب کے حسن سے مبہوت ہو کر رہ جائے تو بھاڑ ہی جھونکتے رہیں گے وہ عطار جو اس دواخانہ سے دواؤں کا ذخیرہ نہ خریدیں گے یا اس ذخیرے پر کوئی اعتراض کریں گے۔

القصہ دریافت کرتا کرتا، ڈرتا اور بدتمیزوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اس عمارت کی بالائی منزل پر ایک صاحب کی رہنمائی سے چڑھا۔ اوپر پہنچا تو اس منزل کی صفائی، چمک دمک اور زرق برق سی حالت کو دیکھ کر پھر سہم گیا اور سوچا کہ کہیں کوئی سی آئی ڈی والا تو پیچھے نہیں لگا ہوا ہے جو مجھے دواخانہ کہہ کر کسی بڑے رئیس کی کوٹھی میں بھیج رہا ہے تاکہ پکڑا جاؤں اور عدالت سے سزا پاؤں؟

مگر دل کو یہ کہہ کر ہمت دی کہ لاحول ولا ملا رموزی آخر تو قبلۂ محترم حکیم مسیح الملک محمد اجمل خاں مغفور سے لے کر قبلۂ محترم حکیم محمد احمد خاں صاحب اور قبلۂ محترمہ ارسطوئے ہند حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا اور قبلۂ محترم حکیم عبدالحئی انصاری ایسے جلیل القدر حکماء کی کوٹھیوں میں بھی جب جاتا آتا رہتا ہے اور الحمدللہ کہ آج تک ان کوٹھیوں سے نکالا نہ گیا تو بڑھ خدا کا نام لے کر، انشاء اللہ اس کوٹھی سے بھی تجھے شربت ہی شربت ہی ملیں گے۔ بس یہ سوچتا تھا کہ ناگاہ خود کو ایک ایسے کمرہ میں پایا جسے اس کی لطافت، رنگینی، تجمل، صفائی اور حسن و تہذیب کے لحاظ سے اگر اس دواخانہ کا ''نقش رنگین و نگارخانہ'' کہیں تو غلط نہیں، یعنی یہ کمرہ جناب محترم حکیم حاجی

عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ ''ہمدردِ صحت'' کا کمرہ تھا جسے طبی محاورے میں مطب بھی کہتے ہیں۔ چونکہ میری فطرت میں بالکل تو نہیں مگر ہاں کبھی کبھی جو صاف لکھ جانے اور کہہ گزرنے کے جراثیم شامل ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اس درجہ حسین و رنگین کمرہ میں بیٹھ کر ورق اور سل اور دمہ وغیرہ ایسے مکروہ امراض کے مریضوں کا علاج کرنا کمرہ کی نہیں تو اس کی لطافت اور نفاستوں کی توہین ضرور ہے۔ البتہ اس کمرہ کو ایڈیٹری کے لیے خاص کر دینا تو ذہن و دماغ اور فنِ اشیا کی قدردانی ہے لیکن کھانستے ہوئے اور ہانپتے ہوئے مریضوں کا اس کمرہ میں داخل ہونا کسی طرح مناسب ہے نہ موزوں اور جو اس پر بھی یہ کمرہ مطب ہی بنا رہا تو سمجھوں گا کہ حسن کی قسمت اور نصیب ہی میں لکھا ہے کہ وہ تاریکی اور گندگی سے وابستہ اور متعلق رہے۔ اسی لیے دیکھ لیجیے کہ امیروں کی اولاد ہمیشہ موٹر ڈرائیوروں اور خدمت گاروں ہی سے خوش رہتی ہے اور ملا رموزی سے اسی بہانے سے دور رہتی ہے کہ کہیں وہ اخباروں میں لکھ دیں مگر اس درجہ حسین کمرہ کو غربا کا مطب بنا دینا کیا محترم حکیم صاحب کا وہ خلق رنگین اور اسلامی مساوات اور غریب نوازی کا وہ لائق احترام عمل نہیں جس سے آج 99 فیصدی مسلمان امراء اور دولت مند محروم ہی نہیں دور ہیں۔ کیا دولت مند مسلمانوں میں غرباء سے اس درجہ قربت و خدمت کے بے شمار ہونے نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں؟ کیا دولت مند اور امراء قسم کے مسلمانوں کی کوٹھیوں، ان کے محلات اور ان کے بنگلوں پر غریب مسلمان اس درجہ آزادی اور بے تکلفی سے جاسکتے ہیں جس طرح غرباء حکیم صاحب کے اس شاہی محل سے ہمسر کمرہ اور کوٹھی میں بے حجابانا آتے جاتے رہتے ہیں اور صرف آتے ہی نہیں بلکہ اوپر سے خدا جانے کتنے روپیہ نقد کی دوائیں بھی ''لوجہ اللہ'' لے جاتے ہیں اور ایک آپ کے دولت مند اور امراء قسم کے مسلمان ہیں جن کی کوٹھیوں، محلات اور بنگلوں پر انگریزی کتے اور شاہانہ ریاکاریوں کو دیکھ کر غریب اور مظلوم مسلمانوں کی تو ہمت ہی نہیں کہ وہ ان کے دروازوں سے بھی قریب ہوسکیں اور ایک اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب تھے کہ دن بھر محلّے کے لونڈے ان کے دروازہ پر کھیلا کرتے تھے، شور مچاتے تھے اور بعض اوقات تو مولوی صاحب کے مکان پر پتھر پھینک دیتے تھے، مگر مولوی صاحب مرحوم و مغفور تھے کہ کبھی ان بچوں پر خفا نہ ہوتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی یونہی جھوٹ موٹ ان لونڈوں کو مسجد تک بھگا آتے تھے اور بس۔ مگر اب جو مسلمانوں نے یورپ والوں کا چلن لیا ہے تو اس حد تک

ان کے غلام اور نقال بن گئے ہیں کہ پاجامہ سے لے کر اپنے مکانات تک یورپ والوں کی وضع قطع کے بناتے ہیں، اسی لیے دیکھ لیجیے کہ ایسے نقال اور اپنی دیسی وضع کو ترک کرنے والے پہلے کے لوگوں سے زیادہ بیمار ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ جلد جلد مرتے بھی رہتے ہیں۔ اور ویسے بھی دولت مندوں میں جاہ و دولت کے لالچ سے کافی سے زیادہ عمر گزر جانے پر شادی کرتے ہیں، لہٰذا طبی قاعدہ سے ایسے لوگوں کی قبل از وقت وفات پر انا للہ پڑھنا بھی بے کار۔

غرض میں جو محترم حکیم صاحب کے اجلاس پر پہنچا تو اس اجلاس کی نفاستوں اور قبلہ حکیم صاحب کی دارا شکوہ کے انداز کی نشست میں بقلم خود یہ محسوس کرنے لگا گویا قبلہ حکیم صاحب کسی دبدبہ انگیز عدالت کے صدر ہیں اور میں ایک کسان ہوں جو بغیر وکیل کے اچانک ممدوح کے سامنے آ گیا ہوں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ نہ میں یہ سمجھا کہ حکیم صاحب قبلہ یہی ہیں اور مجھے تو ملا رموزی سمجھنے اور ملا رموزی جاننے کے لیے سی آئی ڈی میں بھی برسوں ملازمت کیجیے تو بے کار۔

بے کاریوں کہ میں نے جو کم نہ زیادہ بیس برس تک دماغی اور علمی و ادبی بھاڑ جھونکا ہے تو میرے چہرے کی طبعی ساخت بدل گئی ہے اور دریافت کر لیجیے ڈاکٹر انصاری صاحب سے کہ جو لوگ دماغی اور علمی کام کرتے ہیں ان کے چہرے سے خون سمٹ کر دماغ کی لالٹین میں چلا جاتا ہے اور وہاں جل جل کر چہرہ کو خشک اور بھدا کر دیتا ہے۔ ادھر افکار و آلام اور مشکلات کا مقابلہ جو سینہ تان کر کیا ہے تو دُبلے پن میں بھی سارے ہندستان میں یا میرا نمبر اول ہے یا حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا، ادھر آج کل کے مضمون نگاروں، ادیبوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کی جو وردی ہوا کرتی ہے، اسے مصنوعی اور دکھاوے کی چیز سمجھ کر میں نے کبھی استعمال نہ کی۔ یعنی نہ یورپ کی فیشن ایبل ''عینک'' پہنتا نہ شیروانی کی اوپر والی جیب میں روشنائی بھرا انگریزی قلم لگائے پھرتا، نہ نازک سی گھڑی کلائی پر باندھتا، نہ شیروانی کے پورے بٹن لگاتا، نہ زیادہ لچکدار چال چلتا، بس سیدھا سادہ مرد مجاہد اور کائنات کو ہر لمحہ ٹھکرا دینے والا آوارہ گرد آدمی بنا پھرتا ہوں اور گستاخی معاف جب سے یہ بیوی نمبر 4 کا ''عشق'' لگا ہے اور ان بیوی صاحب نے جانتے بوجھتے میری جانب سے جو چپ سادھ لی ہے، تو اس وقت سے تو میری رہی سہی انسانیت بھی ندارد ہے۔ بس صبح و شام ''توکلت علی اللہ'' بنا پھرتا ہوں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محترم حکیم صاحب مجھے فوراً ہی پہچان

جاتے۔ بس پہچانے بھی ہوں گے تو اتنا کہ ہوگا کوئی الفت کا نہیں، نہیں کھانسی زکام کا مارا ہوا مریض، اس لیے موصوف کے ایسے تیور دیکھ کر میں نے ہی بے حیا بن کر عرض کیا کہ ایڈیٹر صاحب ''ہمدرد صحت'' کون ہیں؟ اس پر ممدوح نے ''میں ہوں'' اس درجہ دھیمی آواز سے کہا گویا مجھ سے نہیں بلکہ اپنے ہی دل سے فرمار ہے ہیں کہ ''میں ہوں ایڈیٹر ''ہمدرد صحت''۔ اب میں نے جو یہ دیکھا اِدھر اپنی خاکسار قسم کی حیثیت کو دیکھ کر خیریت اسی میں سمجھی کہ فوراً ہی کہہ دیا کہ ''میں ملا رموزی ہوں''۔ اب کیا تھا محترم حکیم صاحب کی علمی قدردانی اور اسلامی تواضع کا دریا اُمنڈ آیا، مگر نہایت درجہ سکون اور وقار کے ساتھ۔ یہ ہمارے آپ کی طرح نہیں کہ:

اخا ملا رموزی صاحب کہا اور مارے محبت کے بے طرح لپٹ گئے، لٹک گئے، چمٹ گئے اور کہنے لگے خیریت تو ہے؟

اچھے تو رہے؟

کب تشریف لائے؟

اماں بہت دن میں نظر آئے۔

کہو وہ ننھے میاں کی والدہ کہاں ہیں؟

اماں بڑے بے مروّت ہو مہینوں خط کا جواب نہیں دیتے!

اچھا تو بتاؤ کہ کھانا کھا کر آئے ہو یا لاؤں کھانا؟

خیر یہ تو بتاؤ کہ آج کون سے سینما میں چلو گے؟

دوست اب کی مرتبہ تو تم نے گورنمنٹ کی خوب ہی خبر لی ہے۔ اپنے مضمون میں! حق تو یہ ہے کہ دوست خوب لکھتے ہو!

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہندستان میں تمھارا جواب نہیں؟

غرض محترم حکیم صاحب نے بکمال خلوص و کرم اپنا تحریری کام چھوڑ دیا، خیریت دریافت فرمائی اور اس بات پر اظہار افسوس فرمایا کہ میں چار پانچ دن سے دہلی میں موجود ہوں مگر قبلہ حکیم صاحب کو اطلاع نہ ہوئی۔

اس کے بعد میں نے یہ تو پوشیدہ رکھا کہ میں بغیر سواری اور ناشتے کے چار چھ میل گھوم کر آ رہا

ہوں، اس لیے مارے شدید پیاس کے محرم کی دسویں تاریخ بنا ہوا ہوں بلکہ صرف اتنا عرض کیا کہ ''ذرا پانی منگا دیجیے'' اب اللہ ہی جانے اس حسنِ انتظام کی خفیہ ترکیب کو کہ محترم حکیم صاحب نے مطب کے کسی دوسرے حصہ میں ربر کے ذریعہ بولنے والی گھنٹی تو ضرور بجائی مگر اس میں یہ کچھ بھی نہ کہا کہ دیکھو بھائی ملازم لوگو ہوشیار! ملا رموزی صاحب تشریف فرما ہیں، ایسے ویسے صاحب نہیں لہٰذا ان کے لیے سادہ پانی لانے کے عوض شیشہ کے نہایت صاف ستھرے گلاس میں اتنا ہی حسین شربت لانا کہ دیکھیں تو جامِ جم سمجھیں اور نوش فرمائیں تو بغیر غدود بدلے پھر سے ایسے حسین نوجوان ہو جائیں کہ ان کے حسن کے سامنے پاؤڈر لگا کر حسین صورت بنانے والیاں بھی شرمائیں۔ پھر انتظامی مستعدی یہ کہ ایک دو باتوں کے بعد ہی میری سیدھی پسلی سے شربت کا سرخ گلاس لیے ایک بزرگ اس تہذیب سے پیدا ہو گئے جیسے خط کے آخر میں کسی نے حدادب لکھ دیا ہو۔

اب یہاں سے علماء و حکماء میں اختلاف ہو گیا ہے یعنی:

علمائے کرام کی جماعت کا خیال ہے کہ اس روح افزا شربت کے گلاس کو دیکھ کر ملا رموزی صرف اس لیے خوش ہوا کہ اسے پیاس کی حالت میں شربِ حلال کا ایک گلاس مل گیا، لیکن حکماء کا قول ہے کہ اس گلاس کے رنگ، اس کے مزے، اس کی مٹھاس، اس کی طبی لطافت اور اس کے پینے پر اس کی امنگ، ترنگ، طراوت اور دماغ کو بے شمار شادابیاں اور جوانیاں دینے والی ترکیب سے ملا رموزی کو اس کی بیوی نمبر 4 یاد آ گئی، اس لیے اس نے مست و بےخود ہو کر:

ایک بار غفور کہا اور چڑھا گیا

پس الحق کہ جوانی اور شباب سے بھرے ہوئے اس گلاس کا مجھ ناقدر دان مسلمان قوم کے ادیب کا وہ حال ہوا جو مجلس قانون ساز کے امیدوار ارکان کا کافی رائیں حاصل ہو جانے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اب ملا رموزی کا دماغ تھا علم و فراست اور ادب و لطافت کے موج موج اور رنگ رنگ سمندر تھے جو امنڈے چلے آ رہے تھے۔ ادھر حکیم صاحب قبلہ نے از راہِ عنایت علم نوازی کہیں اپنے عملۂ ادارت میں اطلاع کر دی کہ ملا رموزی تشریف فرما ہیں، تو ہو رہا تھا کہ ممدوح کے علم دوست، ارکانِ ادارت و طبابت میرے آس پاس منڈلا رہے تھے اور گفتگو میں سینکڑوں موضوعات تھے جو چھڑ جانے اور شروع ہو جانے کو بے قرار تھے، مگر اس ہیجانی اور بحرانی سی ملاقات اور گفتگو کے عین وسط میں حکیم صاحب قبلہ کی اس مستعدی اور مرتب دماغی صلاحیت اور بلندی کا مجھے معترف ہونا

پڑا کہ جی تو چاہ رہا تھا کہ ملا رموزی ہو اور ہم ہوں، مگر ساتھ ہی مطلب کا تھا وقت، لہٰذا مریضوں کا جو سلسلہ جاری تھا تو حکیم صاحب بار بار مجھ سے اجازت طلب فرما کر ان کی نبض، ان کی بیماری کی تفصیل، ان کے نئے پرانے نسخوں کی لکھائی، ان کے پرہیز اور ان کو طبی مشورے یوں عطا فرما رہے تھے گویا یہ تمام چیزیں بھی ہماری ملاقات کے ضروری اجزاء ہیں اور ہم لوگوں ہی سے متعلق ہیں، پس ممدوح کے اس انہماک اور اس پر میرے ساتھ اس درجہ توجہ اور خلوص کو محسوس کر کے میں نے ممدوح کو یوں فرصت دی کہ اپنی وفات سے قریب پہنچا دینے والی نبض دکھائی اور عرض کیا کہ میری چند شکایات بھی سن لیجیے۔

محترم حکیم صاحب نے دونوں ہاتھوں کی نبض دیکھی اور میرے عرض کیے بغیر فرمایا کہ آپ کے جگر میں سخت حرارت ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ممدوح کی اس خداداد فراست اور طبی کمال پر میری حیرت کا وہی عالم ہوا جو 1932 میں حکیم حاذق قبلہ مولوی عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا صاحب اور ممدوح کے خلف ارشد قبلہ حکیم عبدالحی صاحب انصاری بی۔ اے کو اپنی نبض دکھا کر ہوا تھا کہ طب ہندستانی کے ان یگانۂ روزگار ماہرین نے بھی میرے عرض حال کیے بغیر میری صحت کی پوری کیفیت خود ہی بیان فرما دی تھی یا آج قبلہ حاجی حکیم عبدالحمید صاحب، مالک ہمدرد دواخانہ دہلی میں یہ کمال پایا کہ صرف نبض دیکھ کر ممدوح نے میری صحیح کیفیت معلوم فرمالی۔ بس اس وقت جی چاہ رہا تھا کہ اگر دس دن کے لیے بھی ہندستان بھر کی کوتوالی مجھے مل جائے تو میں ان انگریزی خوردہ ہندستانی مرد اور عورتوں کو مزا چکھا دوں جو دہلی کے ان ارسطو دماغ حکماء کو چھوڑ کر ڈاکٹری علاج پر مرتے ہیں۔ خیر حشر بھی یہ ہوتا ہے کہ نہ کامل صحت ہوتی ہے، نہ مرض جاتا بلکہ روزانہ چیرے پھاڑے جاتے ہیں اور گاڑھی کمائی ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتی ہے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد انجمن حمایت الاسلام کے چندہ سے تعلیم پاتی ہے۔

نبض کے بعد محترم حکیم صاحب نے میرے دل و جگر کا معائنہ فرمایا اور اس میں بھی اپنی طبی ذہانت اور فنی کمال کا حیران کن ثبوت بہم پہنچایا۔ جس وقت ممدوح میرے دل و جگر کے خراب ہونے کے اسباب معائنہ فرما رہے تھے میں مسلمانانِ ہند خصوصاً دولت مند مسلمانانِ ہند کی اپنے قومی، علمی اور ملکی کارکنوں سے یکسر بے پروا مزاجی اور اپنی بیوی نمبر 2 کی یکسر بے التفاتی پر فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

اگر یہ دونوں اپنے علمی و قلمی کارکنوں کو نوازتے رہتے اور نوازتی رہتیں تو آج ملا رموزی کو پھر سے جوان بنانے کے لیے محترم حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ایسے طبیب حاذق کو کیوں اپنا بیش قیمت وقت ضائع کرنا پڑتا اور حکیم نابینا ایسے حکیم کامل کو ملا رموزی کے لیے اتنا وقت نکالنا پڑتا؟

بارے دل و جگر کی خرابی ثابت ہونے پر میں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے دل و جگر خراب نہیں ہوئے بلکہ علم کش اور آوارہ منش مسلمان دولت مندوں کے دل و جگر خراب ہوئے ہیں اور دیکھ لینا کہ ''تاریخ وطن'' میرے اس طبی معائنہ کو انھی الفاظ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے گی جن میں ان حکمائے عصر کے یہ احسانات بھی محفوظ ہوں گے۔

معائنہ کے بعد حکیموں کے مطب کے قاعدہ سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب دس بارہ آنے کا کاغذی نسخہ مل جائے، جس میں گلِ نیلوفر، عناب، گاؤزبان اور خمیرہ مروارید لکھا ہوگا، میں اسے بازار سے خرید دوں گا اور غریب بیوی اسے ''کوفتہ بیختہ شب درآب ترکردہ صباح مالیدہ ہمراہ خمیرہ مروارید نوشانند'' کرنے میں مصروف رہے گی۔ مگر ہمدرد دوا خانہ کا حسنِ انتظام یا حکیم صاحب قبلہ کی علمی فیاضی کہ ابھی میں اسی خیال میں تھا کہ ایک صاحب بادام کا تازہ بہ تازہ تیل، ہلیلے کا لطیف مربّہ اور سفوف کشیزی کے تین مرتب و مزین ڈبے لے کر آ گئے اور مجھے پیش کر دیے۔ میں نے کہا قیمت، جواب ملا کہ ''نذر''۔

اب آپ لوگ اور لگائیاں قبلہ کی طرف منہ کر کے کہیے کہ قبلہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد صحت دہلی اور قبلہ حکیم نابینا صاحب دہلوی اور قبلہ حکیم عبدالحی صاحب انصاری کے ان نقد اور طبی احسانات پر میں اپنے کو ان کا ممنون اور زیر بار کرم سمجھوں یا ان مسلمان دولت مندوں کا جو میرے مضامین کی لاکھوں بہاروں، رنگینیوں، لطافتوں، ظرافتوں اور حکمتوں کے صرف اتنے قدر دان ہیں کہ تیرے میرے سامنے کبھی کبھار اتنا کہہ دیا کہ ''ہاں ملا رموزی بھی خوب لکھتے ہیں'' اور بس۔ حالانکہ اب تو میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ وہ بیوی نمبر 1 ہی مجھ پر مہربان ہو جائیں تو باغ و بہار سے اونچی کتابیں لکھ دوں، مگر وہاں دشمنوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ سب کچھ کرنا مگر ملا رموزی ہی سے قریب نہ ہونا، لہٰذا ان کے اس وہم کو ان سے 24 ہزار میل دور رہ کر کون مٹائے؟

اس لیے امید ہے کہ آپ کی طرف بھی ہر طرح خیریت ہوگی۔ بزرگوں کو سلام، چھوٹوں کو دعا، بچوں کو درجہ بدرجہ پیار اور بیماروں کو ہمدرد دوا خانہ دہلی کی دوا۔ زیادہ حد ادب۔ ◆◆◆

(9)

ایڈیٹر رسالہ ''کائنات'' لکھنؤ کے نام

بعد سلام مسنون آں کہ معلوم ہو کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے اور مزدور کے ہاں خیریت نہیں تو ''غیر خیریت'' کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اس کے ہاں بجز افلاس کے اور دھرا ہی کیا ہے، اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو آج کل اس کو ڈاکخانوں میں محفوظ کرا دیتے ہیں۔ اب ہماری آپ کی طرف سے مارے جائیں تو ڈاکخانہ والے اور نہ مارے جائیں تو ڈاکخانہ والے اور خیر و عافیت آنجناب کی مع خورد و کلاں کے درگاہ خداوند کریم اور گورنمنٹ سے شب و روز نیک مطلوب۔

دیگر احوال یہ ہے کہ وہ آپ کے اور میرے بزرگ یا یوں کہیں تو موزوں ہوگا کہ وہ آپ کے ہمارے خدائی فوجدار حضرت محوی لکھنوی مدظلہ آج کل میری غزل اور نظم سے خاصے خوش ہو رہے ہیں اور رباعی میں یوں نہیں کہتا کہ اس کو شاعر کے بڑھاپے کی علامت سمجھتا ہوں۔ قصیدہ میں یوں نہیں کہتا کہ اب اکبر بادشاہ اور خان خاناں کی طرح اس کا نقد صلہ دینے کے عوض لوگ باگ آغا خاں کی گھوڑ دوڑ کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں، سو قصہ کوتاہ ممدوح نے میری غزل یا نظم آپ کی خدمت میں بھیج دی۔ آپ کی طرف سے مجھے ''رسالہ کائنات'' نمبر 2 بھیج دیا گیا۔ چلیے عوض معاوضہ گلہ ندارد کی فارسی پوری ہوگئی، مگر مجھے لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اب گوالیار میں تو یہ معلو ہو ہی گیا

اور وہ بھی حضرت خواجہ حسن نظامی ایسے بزرگ کے بالکل منہ کے سامنے کہ آپ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، اس لیے کہ آپ محسوس فرمائیں کہ ملا رموزی یوں تو مانا ہوا نمک حرام قسم کا مضمون نگار ہے، مگر افوہ کہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے رسالہ میں بھی بے معاوضہ کچھ نہیں لکھتا، اس لیے اٹھا اور شب کے دو بج کر دس منٹ پر یہ مضمون لکھا کہ سند ہو، کیونکہ آج کل مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ رمضان شریف کا مہینہ ہے، اس ماہ میں دن رات طبیعت موزوں ہی رہا کرتی ہے۔ ادھر آپ کو معلوم ہے کہ میں برسات کی رات کا آوارہ گرد ہوں۔ وہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی سو بار تو آپ نے بھی سنا ہی ہوگا کہ ملا رموزی سی آئی ڈی میں ملازم ہے، اس لیے راتوں کو گھر پر نہیں ملتا، مگر آپ کی ہماری یکسر ناقدر دان قوم نے کبھی یہ دریافت نہ فرمایا کہ آخر ملا رموزی کو یہ رات ہی کے وقت اس کا دولت خانہ ایسا کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتا ہے وہ رات بھر گھر پر نہیں ملتا؟ حاصل کلام عین تہجد کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں۔

اچھا ''کائنات'' ملا، حال معلوم ہوا، اس کا صفحہ اول دیکھ کر آنکھوں کو نور اور اس کے اندر کے صفحات دیکھ کر دل کو سرور حاصل ہوا۔ ارے بھئی میں تو یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ یہ خدا نے آپ کو اتنا قدر دان لکھنؤ کس طرح دے دیا کہ اس درجہ حسین رسالہ آپ نے شائع کر دیا اور قرضدار نہ ہوئے۔ یہاں تو بھائی اپنی چند حجامت بنی ہوئی سی کتابیں چھپوائی ہیں تو آج تک مہاجن کی قسط سے نجات نہیں ہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بیوی نمبر 3 کے تھوڑے سے زائد حسین سرورق کا رسالہ جاری فرما دیا۔ اللہ عمر دے اور اقبال۔ اور لکھائی چھپائی کی رنگینی رعنائی اور دلکشی کا تو جواب ہی نہیں۔ اس پر بھی اگر اس کو مسلمان لوگ نہ خریدیں تو خدا ان سے سمجھے یا ان کو سمجھے۔ وہ بات یہ ہے کہ ہم آپ رہتے ہیں انگریزوں کے ہندستان میں اور سمجھے یہ بیٹھے ہیں اور وہ بھی ڈاکٹر اقبال صاحب کے دھوکہ دینے پر کہ:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

اس لیے ہمارے اوپر انگریز بھائیوں کی تہذیب کا جو اثر پڑ رہا ہے تو ہم آپ سنیما کا تماشہ بھی دیکھتے ہیں اور اردو کے رسالوں اور اردو کے اخباروں کو خود گالیاں دے کر انگریزی کے رسالے اور اخبارات اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔ خیر بھائی خدا پر بھروسہ کر کے رسالہ جاری رکھیے

اور جواب حکومت وفاقی کا دور شروع ہو رہا ہے تو انشاء اللہ ہر طرف اردو ہی اردو ہو گی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ کے ذریعہ میں تمام محترم شعرا سے جھگڑا مول لینا چاہتا ہوں تا کہ یہ تمام بھائی میرے خلاف سخت سے سخت مضامین کا سلسلہ شروع کر دیں۔ وہ اس طرح کہ میں نے جو شاعری شروع کی ہے اس کے وجوہ بیان کرتا ہوں۔ بس دیکھ لیجیے گا کہ ایک ادبی جھگڑا کھڑا ہو جائے گا اور اگر اس میں لکھنؤ کے اخباروں نے بھی حصہ لیا پھر تو بغیر پولیس کی امداد کے یہ رفع ہو تو ہو مگر دفع نہ ہو گا۔

یعنی میں نے اردو کی شاعری میں صرف صنفِ غزل کو لیا ہے اور اس کے حسبِ ذیل عیوب کو دور کرنے کے لیے بقلم خود شاعر نہیں بلکہ کلیم غزل گو بنا ہوں، مثلاً میرا خیال ہے کہ علم و بصیرت اور تحقیق و ترقی کے حساب سے عہدِ حاضر عقلی بلندی کا ایک رنگین زمانہ ہے جب کہ انسان نے ذہنی اور عقلی ترقی میں کمال پایا ہے، مگر اردو کی غزل حسبِ ذیل اسقام سے بھری پڑی ہے، مگر غزل گو حضرات نے توجہ نہیں کی۔ مثلاً:

ہندستان کی وہ لاکھوں انسانوں کی جماعت جو غزل سنتی ہے یا پڑھتی ہے خود ہی افلاس و امراض جہالت اور بے روزگاری کے ہاتھوں مضمحل اور پریشان اور مایوس ہے کہ اوپر سے غزل میں آپ ہجر و فراق اور محبوبہ کے مظالم کی وہ داستان سنائیں کہ مشاعرہ سے گھر تک روتے ہوئے جائے بغیر چارہ نہ رہے تو یہ غزل کیسی؟

غزل میں رقیب کا کردار کیا قوم میں بے حیائی اور بے شرمی کو رواج نہیں دیتا؟ بھری محفل میں محبوبہ بن کر سنور کر بیٹھی ہے۔ یار لوگ آوازے کس رہے ہیں اور بے حیا عاشق صاحب ایسی محبوبہ پر فخر فرما رہے ہیں اور غزل کے ذریعہ تمام دنیا کو اس قسم کی محفل کی تفصیل سنا رہے ہیں اور اچھے اچھے ایم۔ اے پاس لوگ ان تہذیب سوز حالات کو سن کر کہہ رہے ہیں کہ ذرا پھر ارشاد ہو۔ کیا یہ قوم کی ذہنی موت نہیں ہے؟ عاشق انسان ہے مگر غزل کہتا ہے تو طوطا، مینا، بلبل اور فاختہ بن کر کسی گھونسلہ میں بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے تمام واقعاتِ عشق بیان کرتا ہے اور بجلی جب گرتی ہے تو اسی کے آشیانہ پر ایک انسان کو گھونسلہ سے کیا واسطہ۔ کیا غزل کا یہ کردار قوم میں بے عقلی اور حماقت کو رواج نہیں دیتا؟ عاشق صاحب انسان ہیں مگر جب دیکھیے کوتوالی کے عوض صیاد کے پنجرہ میں بند

ہیں اور پنجرہ میں بیٹھ کر صیاد کے مظالم بیان فرمار ہے ہیں اور آب ودانہ کا مطالبہ ہے۔ کیا غزل کے اس کردار سے جہالت کو رواج نہیں ہوتا؟

عورت کی فطرت اور سیرت سراپا مروّت و وفا اور رحم و کرم ہے، مگر ایک غزل گو عاشق نہیں جس کو اسی کی محبوبہ نے سر بازار نہیں تو سرِ محفل ذلیل نہ کیا ہو، کیا یہ عورت کی سیرت پر خلاف عقل و فطرت حملہ نہیں ہے؟

کیا عشق کا مقتل آج تک کسی شہر میں نظر آیا، کیا زخمی عشاق کا شفا خانہ کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اگر یہ تمام خرافات، تشبیہات اور استعارے ہیں تو سہی مگر علم و عقل کے اس ترقی پذیر زمانہ میں تو انھیں ختم ہو جانا چاہیے اور ان کے عوض عہدِ حاضر کے لوازم حسن و عشق کو نظم کرنا چاہیے جیسا کہ عربوں نے اپنے وقت کا محمل نظم کیا تو ہونا چاہیے کہ ہم اپنے وقت کا موٹر کار نظم کریں۔

بس یہ اعتراضات ہیں میرے آج کل کی غزلوں پر اور اس کے جواب میں میں نے جو غزلیں کہی ہیں، ان کا دیوان مکمل ہو گیا ہے۔ دعا کیجیے کہ کوئی علم نوام تعلقہ دار، راجہ مہاراجہ مجھے اپنا جانشین مقرر کر لے تو اس دیوان کو شائع کر دوں گا۔

اچھا میرے یہ اعتراضات ہیں غزل پر۔ غزل کے واقعی اقسام ہیں، مگر شام کے وقت امین آباد کے باغیچہ کے سرے پر کھڑے ہو کر بہ آواز بلند کہہ دیجیے گا کہ میرے ان اعتراضات کے جوابات وہ حضرات نہ دیں جن کی عمر چالیس برس سے آگے نکل گئی ہے کیونکہ ایسی عمر کے ہندستانی تو غیب سے رونے کے لیے تیار رہتے ہیں اور غزل کے یہ جھگڑے ہیں ان کے بس کے جن کے سینے جوانی اور عشق و عاشقی کے جہنم سے دہک رہے ہیں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ''کائنات'' کے دوسرے نمبر میں آپ نے لکھنؤ کے نمائشی مشاعرہ کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس کی پہلی طرح منسوخ ہو گئی جو یہ تھی کہ:

تجھ کو وفا سے کام کیا تو تو نظر چرائے جا

سو اچھا ہی ہوا کہ یہ طرح بدل دی گئی کیونکہ طرح کا مصرع ہی غلط تھا، اصل شعر یوں ہے کہ:

میری تباہیوں کا کیا عشوہ طرازیاں تو ہیں
تجھ کو وفا سے کیا غرض تو تو نظر چرا بھی جا

یہ شعر حضرت احمد مجددی بھوپالی کا ہے۔

اچھا دوسری طرح ہے:

ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں!

ترجمہ یہ ہوا کہ: ہمارے اندر منصور کے ہلکے برتن پن کی نقل نہیں ہے۔

ترجمہ چونکہ عمدہ ہے اس لیے میں نے بھی اس طرح پر غزل کہی ہے اور چونکہ گوالیار میں آپ کی آواز کا داؤد علیہ السلام پن دیکھے ہوئے ہوں، اس لیے آپ ہی کو یہ غزل بھی روانہ کرتا ہوں، اگر مشاعرہ میں آپ دیکھیں کہ لوگ میرے ہر شعر پر وجد فرما کر کہہ رہے ہیں کہ ملا رموزی صاحب کو چبوترہ پر کھڑا کیجیے، نظر نہیں آتے، ذرا اور اونچا کیجیے، تب تو کہہ دیجیے گا کہ یہ غزل حضرت ملا رموزی صاحب کی ہے اور میرے اشعار پر لوگ یہ کہہ رہے ہوں کہ اے سبحان یہ حضرت شاعر کب سے بن گئے؟

اماں ہمارے سامنے کا لونڈا ہے۔

جی ہاں وہ امان اللہ خاں مرحوم کا داماد۔

ارے بھئی اس سے تو کہو کہ میاں تم اپنی گلابی اردو ہی لکھتے رہو، تم غزل کہنا کیا جانو۔

پس اگر یہ رنگ دیکھو، تو میری غزل کو فوراً اپنی غزل کہہ دینا اور میرے تخلص کے عوض اپنا تخلص فٹ کر دینا۔ میں یہاں سے حلف کرتا ہوں کہ کسی سے نہ کہوں گا کہ جو غزل لکھنؤ کے مشاعرہ میں شوکت صاحب نے چلا چلا کر ''براڈ کاسٹ'' کی تھی وہ قرآن مجید کی قسم مجھ مُلا رموزی کی تھی۔

اب رہا میری غزل میں کم سے کم اشعار کا ہونا سو اس کا سبب یہ ہے کہ میں حسن و عشق میں ''مردار خوار قسم کے'' حالات کو نظم نہیں کرتا، مثلاً میں محبوبہ سے یہ درخواست نہیں کرتا کہ تو مجھے جلائے جا، دفن کیے جا، غارت کیے جا، نہ میں اس کا طالب ہوں کہ مجھے عشق میں محبوبہ تو نہ ملے مگر ہاں غم، فراق اور دردِ عشق مل جائے۔ نہ میں غزل میں منطق و فلسفے کے نکات حاصل کرتا نہ میں سوز و تپشِ عشق سے تپ دق کا مریض ہونا چاہتا، اس لیے میری غزل کے اشعار کمتر ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس طرح کی ردیف ہے ''نہیں'' گویا اس نے خود شگفتہ اشعار کو بند کر دیا۔ اب تو ہر چیز میں یہی رونا پڑے گا کہ ''طور نہیں، حور نہیں، نور نہیں'' اور یہ میں کرتا نہیں کہ ایک طرح

کے تمام شگفتہ اور غیر شگفتہ قوافی باندھ کر ہی رہوں، ورنہ بتایئے کہ حسن وعشق میں مزدور، مقہور، کافور، مذکور، مسطور اور مستور وغیرہ کس شگفتگی سے نظم کروں۔ یہ تو بوڑھے شعرا کا دستور رہا ہے کہ وہ جرمنی تک سے جا کر ایک ایک قافیہ تلاش کر کے لاتے تھے اور باندھ کر چھوڑتے تھے، مگر میں تو صرف شگفتہ قافیے باندھتا ہوں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ الحمد للہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ صرف یہ ہوا ہے کہ بیوی نمبر دو سے میرے دشمنوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ ملا رموزی مکار ہے، غدار ہے، جاسوس ہے، سی آئی ڈی میں ملازم ہے۔ جس کے قریب جاتا ہے اسی کے خلاف مضمون لکھ دیتا ہے، اس لیے اس سے دور ہی رہنا۔ اِدھر اس غریب کی عقل اور تجربہ ابھی کم ہے۔ وہ خود نہیں سمجھ سکتی کہ یہ ملا رموزی کا دشمن ہے۔ خود ملا رموزی سے مل کر ان غلط باتوں کی اصلاح کر لوں، اس لیے میں بھی ہوٹل میں کھانا کھا لیتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ ایک دن انشاء اللہ میرے دشمن ہی ذلیل ہوں گے بشرطیکہ وہ اللہ کی بندی مجھ سے مقابلہ تو کرائے اور ویسے تو جناب لوگ گاندھی جی تک کے لیے کہتے ہی رہتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ سے ملے ہوئے ہیں۔

تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

◆◆◆

(10)

ایڈیٹر صاحب ''صدائے نسواں'' دہلی کے نام

مدیر محترم مجلّہ ''صدائے نسواں'' دہلی!

بعد سلام مسنون آں کہ معلوم ہو کہ یہاں کچھ کچھ خیریت ہے اور غریبوں کے ہاں کچھ کچھ نہیں تو ہر طرح خیریت کس طرح ہو سکتی ہے۔ اصل خیریت تو ہوتی ہے دولت کی اور وہ بھی بغیر سود اور قرض کی دولت سے اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے اور کوتوالیوں اور مجسٹریٹوں سے شب و روز نیک مطلوب!

دیگر احوال یہ ہے کہ ''صدائے نسواں'' کا عید نمبر آیا۔ دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''صدائے نسواں'' آپ کی ریاست میں آ کر صحیح معنی کا رسالہ بن گیا۔ مضامین نگار آپ نے اتنے جمع کر لیے کہ جب چاہیں آپ کسی حکومت پر دھاوا بول دیں۔ بات یہ ہے کہ آپ بقلم خود ذی علم ہیں، وسیع تجربہ ہے اور مردم شناس ہیں اور او پر سے قدر دان، اس لیے آپ کو بہتر سے بہتر مضمون نگار اور خیر خواہ انسان مل گیا اور ایک میری بیوی نمبر دو ہیں جو ایک ہی وہم میں مبتلا ہو کر مجھ سے دور ہو چکی ہیں اور وہ وہم یہ ہے کہ دنیا میں اگر امریکہ اور افریقہ والے بھی کچھ لکھتے ہیں تو وہ سمجھتی ہیں کہ وہ بھی ملا رموزی ہی نے لکھا ہے۔ اور اگر فرانس سے کوئی شخص اعتراض کرتا

ہے تو وہ سمجھتی ہیں کہ یہ اعتراض بھی ملا رموزی ہی نے کیا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ موصوفہ آپ کی طرح وسیع تجربہ اور وسیع نظر کی مالک نہیں ہیں، اس لیے میں نے بھی ان کے دماغ کو خدا کے حوالہ کر کے ان کے خیال کو ترک کر دیا ہے ورنہ آپ ہی بتایئے کہ اگر میرے مخالفین کے کہنے پر آپ بھی بھروسہ کر لیں تو آج آپ کے اور میرے درمیان یہ عشق کس طرح باقی رہتا؟

دیگر احوال یہ ہے کہ زنانہ رسالے اردو میں اب اتنے ہو گئے ہیں کہ اگر انھیں جمع کر لیں تو ہم آپ اگر بڑی حکومت پر نہیں تو کسی چھوٹی موٹی ریاست یا کسی تعلقہ پر کامیاب حملہ کر سکتے ہیں، مگر ایک کمی ہے، وہ یہ کہ ان رسالوں میں ظریف مضمون نگار عورتیں نہیں ہیں اور میں ان تمام مردوں کو بے حد جاہل اور چھچھورا سمجھتا ہوں جو اپنی بیوی یا لڑکی کے نام سے خود مضمون لکھتے ہیں۔ اس حرکت سے غریب عورتوں کی انشاء پردازی کا اعتبار کم ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ تو بعض محکمات کا ہے جن میں بعض نالائق افسر ہوتے ہیں تو ان کے ہاں ان کے بے بس ماتحت لوگ ان کی طرف سے مراسلہ، حکم، فیصلہ اور دوسرے تحریری کام کر کے خود رکھ دیتے ہیں اور افسر صاحب ان کے لکھے پر اس گھمنڈ کے ساتھ لال روشنائی سے دستخط کرتے ہیں گویا یہ تمام تحریری کام خود افسر صاحب ہی نے کیا ہے، مگر افسر صاحب کو خبر نہیں کہ ان کے نام سے احکام، مراسلے اور فیصلے لکھنے والے ماتحت دفتر سے باہر نکلتے ہی دنیا کے تمام ملا رموزیوں سے کہہ دیتے ہیں کہ ان کے نام سے ہم لکھتے ہیں اور وہ صرف دستخط کرتا ہے۔

سو جو شوہر یا باوا ایسا ہو کہ وہ اپنی عورتوں کے نام سے خود لکھتا ہو، سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی عورتوں کے اعتبار کو کم کرتا ہے۔ بارے اگر عورتوں میں ظریف و لطیف مضمون نگاری کا شوق ہو جائے تو چند دن بعد کسی ایک زنانہ رسالہ کو ملا رموزی صاحب کی ضرورت باقی نہ رہے اور عورتوں کو ظریف و لطیف تحریروں کی ضرورت زائد ہے کہ عورتیں ہی زائد پریشان، مشکلات اور مصائب میں مبتلا رہتی ہیں۔ شوہر والیوں کو اپنے بے وفا اور بے پرواشوہروں کا طاعون تباہ کر رہا ہے اور نوجوان لڑکیوں کے حق میں بوڑھی والدہ صاحبہ اچھا خاصا مراق اور مالیخولیا بنی رہتی ہیں، جہاں لڑکی نے چھم کی آواز پیدا کی کہ والدہ صاحبہ نے اس کے پاؤں پر نصیحت کی کلہاڑی رسید کی کہ کیوں تو نے زور سے قدم رکھا، جس سے تیری چوڑیاں بولیں۔ اور اگر کسی گھر میں نانی صاحبہ اور دادی صاحبہ بھی

زندہ ہیں تب تو سمجھ لیجیے کہ اب اس گھر کی نوجوان لڑکی کا فاتحہ تک ہو چکا۔ اگرچہ بوڑھی عورتیں نوجوان لڑکیوں کے حق میں کیمیا کا نسخہ ہیں، مگر ان کی بکواس اور بیجا اعتراضات سے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اس لڑکی پن سے تو لڑکا ہو جانا منظور۔

اس لیے ضرورت ہے کہ عورتیں ظریف اور ہنسانے والے مضامین بھی لکھیں مگر یہ نکتہ سب کو بتا دیجیے کہ وہی عورت ظریف اور ہنسانے والے مضامین لکھ سکتی ہے جو فطرتاً اور قدرتاً ہنسانے والی ہو اور جن کے اندر قدرتاً ظرافت کی قوت نہیں وہ لاکھ کوشش کریں ان میں یہ سلیقہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ امید کہ اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھ کر ظریف عورتیں ظریف مضامین لکھنے شروع کر دیں گی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ میں تصاویر نہیں، تو میں یوں رائے نہیں دیتا کہ آپ کے محلہ ہی میں حضرت محترم قبلہ مولانا احمد سعید صاحب، ناظم جمعیۃ علماء ہند بھی رہتے ہیں، اگر ممدوح کو معلوم ہو جائے کہ ملا رموزی نے تصویر چھاپنے کے حق میں رائے دی ہے تو وہ آئندہ جمعیۃ العلما کے دفتر میں میرا قیام وطعام حرام کر دیں گے، جس میں از قیام جمعیۃ تا ایندم یہ نیاز مند مقیم ہوتا ہے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے ''صدائے نسواں'' میں ادبی چیزیں پیش کر کے عورتوں کی ذہنی زندگی کو گویا شفا بخش دی۔ یعنی اگر صرف اصلاحی اور اخلاقی مضامین ہوتے اور عاقبت کا خوف ہی بڑھایا جاتا تو عورتیں کل مرنے والی ہوتیں تو آج ہی مر کر رہ جاتیں، مگر غنیمت ہے کہ آپ نے ''تمنائے محبت'' اور ''نشاطِ روح'' کے عنوان سے بھی چند غزلیں شائع کر کے عورتوں کو بھی چند لمحات ذہنی اور فکری جوانی کے عطا کر دیا۔ آپ کی اس ترکیب سے خاکسار کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ بھی ''صدائے نسواں'' کے لیے اپنی ایک غزل پیش کرتا ہے۔

اب میری غزل بازی کے دوسرے اہم اسباب میں سے ایک سبب آپ بھی سن لیجیے۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہندستانی باشندے انگریز بھائیوں کی رعایا ہیں اور رعایا ہمیشہ بادشاہ قوم کی نقل کرتی ہے، لہٰذا جب ہندستانیوں کے بادشاہ ایرانی تھے، اسی زمانہ میں اردو میں غزل بازی شروع ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسی غزل ایرانی لوگ کہتے تھے ویسی ہی غزل ہندستانی کہنے لگے اور غلامانہ دماغ ہونے کی وجہ سے ہندستانیوں کو آج تک توفیق نہ ہوئی کہ وہ خود سوچتے کہ ہم جو غزل کہہ رہے ہیں وہ عقل اور فطرت کے موافق ہے یا نہیں؟ لہٰذا اس نہ سوچنے سے اردو کی غزل میں ہزاروں حماقتیں

روزانہ بھردی جاتی ہیں اور اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹران کو آنکھ بند کر کے روزانہ چھاپ دیتے ہیں جن کو پڑھنے والے دماغی حیثیت سے مہملات پسند بن رہے ہیں۔ مثلاً اردو کی غزل میں محبوب کو ''رقیب نواز'' کہا جاتا ہے۔ اب فطرت اور عقل کی رو سے اگر مرد کا محبوب عورت ہو سکتی ہے تو بتایئے عورت فطرتاً ایک کے سوا دوسرے سے کب محبت کرتی ہے۔ لہٰذا اس کو رقیب نواز کہنے سے عورت کی سیرت کی توہین ہوئی یا نہیں؟ پھر اردو کی غزل میں محبوب کو ظالم، مکار، عیار، ستم شعار، بے وفا اور بے مروت کہا جاتا ہے۔ اب عقل اور فطرت کی رو سے بتایئے کہ عورت جس سے محبت کرتی ہے یا جو شخص عورت سے محبت کرتا ہے اس پر عورت کب ظلم کرتی ہے۔ اس کے خلاف واقعات تو بتاتے ہیں کہ اگر عورت محبت کرتی ہے تو پھر وہ محبت والے پر اپنا جان و مال تک قربان کر دیتی ہے۔ بس حد ہے کہ شوہر اگر بے وفا ہے اور دوسرا شخص اس سے سچی محبت کرتا ہے تو وہ بے وفا شوہر تک کو کلہاڑی سے ختم کر کے محبت کرنے والے کا ساتھ دیتی ہے، مگر اردو کے بیہوش شاعر تو اپنی غزل میں روزانہ عورت کو بے وفا، مکار، غدار، عیار اور بے مروّت لکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ یا تو مردوں سے محبت کرتے ہیں یا رنڈیوں سے۔ کیونکہ بے مروّت اور بے وفا تو مرد ہوتے ہیں، جیسے کہ آپ یا میں یا پھر رنڈی ہوتی ہے جو پیسہ کمانے کی وجہ سے ہر شخص کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتی ہے اور اصل میں کسی ایک کی وفادار نہیں ہوتی۔ لیکن ایک شریف عورت اگر کسی سے محبت کرے یا اس سے کوئی محبت کرے تو وہ دونوں حالتوں میں عورت سے زائد باوفا، بامروّت اور صاحبِ کرم و نوازش مرد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس فطری دلیل کی رو سے اردو کی ایسی تمام غزلیں عورتوں کی توہین ہیں جن میں محبوب کے نام سے اصل میں عورت کو رقیب نواز یا ظالم اور بے وفا کہا جاتا ہے۔ مگر لاحول ولاقوۃ آپ کہیں گے کہ میں خط میں عورت کی وفاداری کی کیوں تعریف کرتا ہوں، اس لیے معلوم ہوا کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ اور ہاں بھئی وہ خوب یاد آئی کہ اگر دہلی میں خالص گھی کا نرخ ارزاں ہو تو مجھے ضرور اطلاع دینا کیونکہ مجھے جن چیزوں کا شوق ہے ان میں خالص گھی اور رولز رائس موٹر کار کی سواری اور وہ بھی چاندنی رات میں، اس لیے اگر آپ کے ہاں رولز رائس موٹر کار کا نرخ ارزاں ہو گیا ہو تو براہ کرم خود خرید کر میرے نام اس پتہ پر بھیج دیجیے گا اور ہاں ایک اور چیز کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ فقط۔

◆◆◆

(11)

ایڈیٹر صاحب ''دیہاتی'' کے نام

رسالہ ''دیہاتی'' شہر ملتان کے ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کا 25 ماہ فروری 1930 کا لکھا ہوا کارڈ جس میں کہ آپ نے بجائے اردو کے انگریزوں کی زبان میں اپنا نام اور پتہ اور عہدہ اور تاریخ لکھی تھی، ملا جس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر ہم زبانِ انگریزی سے واقف نہ ہوتے تو آپ کے کارڈ کا مضمون تو ہم خود پڑھ لیتے اور آپ کا نام، پتہ، تاریخ اور عہدہ دوسروں سے پڑھواتے پھرتے۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اور بہت خوشی ہوئی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ ''دیہاتی'' کو ہم جب پڑھتے ہیں تو بھئی مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ ہمیں یہ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بہت یاد آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خدا نے ہمیں بھی دو چار بچوں کا باپ بنایا ہے، مگر وہ ہمارے بچے تو نکلے حد سے زیادہ نالائق، اس لیے کہ ہمارے بچوں کی ماں نے تو پڑھا ہے اسکول میں اور اسی وجہ سے ان کے مزاج میں ہر قسم کا نخرہ موجود ہے۔ خود بھی کمخواب کا پاجامہ، ریشم کی قمیص اور ریشم کے موزوں کے ساتھ انگریزوں کا بنایا ہوا کالے رنگ کا پمپ جوتا پہنتی ہیں اور سر پر تو وہ دوپٹہ بس ہمارے سامنے اوڑھے پھرتی ہیں ورنہ ویسے وہ دن بھر گھر میں بے دوپٹہ پھرتی رہتی ہیں کیونکہ آج کل تو عورتوں نے بھی اسکول کے

لڑکوں کی طرح سر کے بال کٹا دیے ہیں۔ اچھا ہے کٹا دیجیے، اپنی طرف سے خدا کرے یہ ننگی پھرنے لگیں تو ہمیں اس سے کیا مطلب۔ تو بس جناب اس لیے جب کسی بچہ کی ماں خود ہی بڑی فیشن والی اور بڑی نخرے والی ہوگی تو وہ اپنے بچوں کو بھی اپنے ایسا ہی بنائے رکھے گی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہماری طرف کے اکثر بچے چست پاجامہ، ریشم کی نازک سی قمیص، بھڑک والی قیمتی کپڑے کی شیروانی، پہنے آنکھوں پر بے ضرورت چشمہ لگائے، کلائی پر عمدہ گھڑی باندھے اور ہاتھ میں نازک سی چھڑی لے کر جب بازار جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوہ قاف کی کوئی پری سودا خریدنے جارہی ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔

مگر شجاعت، بہادری اور ہمت کا یہ حال ہے کہ اگر ان لونڈوں کو ہم آپ ذرا کھینچ کر ایک درجہ اوّل کا جانثار سید فرمادیں تو تین میل دور جاپڑیں اور جب تک ڈاکٹر علاج نہ کریں تو ہوش ہی نہ آئے تو ایسے لڑکے ہونے سے تو لڑکی ہو جانا اچھا ہے۔

دوسری قسم کے بچے وہ بھی ہوتے ہیں جو کالجوں میں پڑھتے ہیں، اپنے چہرہ پر ایک بال باقی نہیں رہنے دیتے۔ داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی صاف کرتے ہیں۔ قیمتی چشمہ لگاتے ہی اور دن رات انگریزوں کا کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں۔ بائیسکل کے بغیر چل پھر نہیں سکتے۔ ہاتھ میں ہر وقت اخبار ''پانیئر'' رہتا ہے۔ اپنی مادری زبان کی جگہ انگریزوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں، مگر حوصلے، محنت، کوشش اور تکلیف کے نام سے ان کا کوٹ پتلون تک لرز جاتا ہے۔ بس ہوٹلوں میں بیٹھے شاعروں کے ساتھ نارنگی کا شربت پیا کرتے ہیں۔ ان سے اگر جھوٹ کو کہہ دیجیے کہ وہ لڑائی ہوگئی یا وہ پولیس آگئی تو سائیکل پر بیٹھ کر ایسے بھاگتے ہیں کہ اپنے گھر کے بڑے کمرہ میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ خیر صاحب وہ غیب کا حال تو خدا جانے، مگر سنا یہ ہے کہ اس قسم کے لونڈے آپ کے پنجایت میں بہت زیادہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دشمن نے ہم سے ایسا کہہ دیا ہو۔

بس اس لیے ہمیں یہ کسانوں کے بچے بہت زیادہ پسند ہیں اور پسند اس لیے ہیں کہ ان غریبوں کو جتنے بھی میلے گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے آپ چاہیں پہنادیں، یہ خوشی خوشی پہن کر کھیت پر چلے جاتے ہیں۔ یہ بچے انگریزوں کے بنائے ہوئے ''جرمنی کھلونے'' خرید کر اپنے ماں باپ کی دولت برباد نہیں کرتے، بلکہ کھیتوں پر بیٹھ کر پتھروں اور گھاس یا لکڑیوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ کھیتوں کے

کانوں سے یہ نہیں گھبراتے۔ دھوپ سے یہ بیمار نہیں ہوتے۔ کنوئیں میں گر جانے سے یہ نہیں ڈرتے۔ صبح ہی صبح چائے پینے اور بسکٹ کھانے کے لیے یہ نہیں روتے۔ روزانہ بازار سے مٹھائی، میوہ اور پھول کے کپڑے خرید کرلانے کے لیے یہ شور نہیں کرتے۔ کوٹ، پتلون، انگریزی ٹوپی، موزے، مفلر، ٹائی اور بائیسکل کو تو یہ بے چارے جانتے بھی نہیں کہ یہ چیزیں مرد ہوتے ہیں یا عورتیں؟ اور شیر، تیندوے اور دوسرے خون پی جانے والے جنگلی جانوروں کو تو یہ بچے بکری بکرا، مرغی مرغا، گھوڑی گھوڑا اور گدھی گدھا سمجھتے ہیں۔

اور بھئی غضب خدا کا یہ بچے گیارہ گیارہ بجے رات کو جنگل میں بہنے والی ندی پر چلے جاتے ہیں اور وہاں چاندنی رات کے کھیل کھیلتے رہتے ہیں، مگر چا ہو کہ یہ ڈر جائیں، چمک جائیں، لرز جائیں، کانپ جائیں، سہم جائیں یا جھجک جائیں تو استغفراللہ پڑھیے۔ ان کے پاس تو ڈر، خوف، بزدلی اور کم ہمتی کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

اور ایک ہم آپ ہیں کہ نو بجے رات ہی کو پولیس کے گشت کرنے والے سپاہی کی آواز سے ڈر کر پلنگ سے نیچے گر جاتے ہیں۔ اور یاد ہوگا کہ شہروں میں اگر کبھی زیادہ رات کو تھیٹر، یا سینما کا تماشہ دیکھ کر ہم یا آپ تنہا گھر آتے ہیں تو کیسا دل دھڑ کتا رہتا ہے۔ اور یہ اسکول کے جوان جوان لونڈے تو بغیر اپنی جماعت کے لڑکوں یا شاگردوں کے تھیٹر سے گھر واپس ہی نہیں آتے۔ تو اس حساب سے یہ کسانوں کے بچوں کے دل و دماغ میں ہمت، حوصلہ، بہادری، دلیری، محنت پسندی، صبر اور ہر حال میں خوش رہنے کی قوتیں بہت کافی ہوتی ہیں۔ کتابوں میں پڑھا ہے کہ جن لوگوں کے بچوں میں بچپن ہی سے ہمت، دلیری، بہادری، صبر اور قوت اور محنت کو پسند کرنے کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں وہی دنیا میں بادشاہ کا وزیر، کوتوال اور تھانیدار ہوتے ہیں، جیسے آپ نے سنا ہوگا کہ ملک ترکستان کے بادشاہ آج کل مصطفیٰ کمال پاشا ہیں، یہ بھی ایک غریب کسان ہی کے بیٹے ہیں۔

بس اپنی ہمت اور بہادری سے 1921 میں یونان کی فوجوں سے خوب خوب جو لڑائی لڑے تو بس جناب ترکستان کے بادشاہ بنادیے گئے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ 1923 میں ملک ایران کے بادشاہ رضا خاں پہلوی بنائے گئے یہ بھی ایک معمولی سپاہی کے لڑکے تھے، مگر بچپن ہی سے ان

کے اندر ہمت، حوصلہ، بہادری اور محنت کرنے کی عادت تھی۔ انھوں نے بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں اور ملک ایران کے بادشاہ ہو گئے۔

غرض قصہ کون کہے! یہ کسانوں کے بچے بڑی بھولی اور پیاری صورت کے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مکاری، دھوکہ، فریب، بے ایمانی، دغابازی، چوری، قمار بازی، غرور، اکڑ، بناوٹ اور خودغرضی کی عادتیں نہیں ہوتیں، مگر ہاں یہ بچے بہت کم عمر ہی سے چلم اور حقہ پینا سیکھ جاتے ہیں تو اس عادت سے آپ ایک دن جا کر ان سب کو منع کر دینا۔ کیونکہ کسانوں کے بچے شہروں کے رہنے والوں سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں۔ ہر شہر کے آدمیوں کو بادشاہ سلامت یا کوتوال سمجھتے ہیں اور صورت دیکھتے ہی گھروں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں شہروں میں رہنے والے انسان ایک طرح کے بھوت ہوتے ہیں یا ظالم۔ ہمارے خیال میں کسانوں کے بچے ہمیں اور آپ کو بھوت تو کیا سمجھتے ہوں گے مگر ہاں ظالم ضرور سمجھتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ آج تک شہروں کے رہنے والے کسانوں کو ایک طرح کا غلام بلکہ جانور سمجھا کرتے تھے، مگر اب کچھ دن سے یورپ کے رہنے والوں نے اپنے ہاں کے مزدوروں اور کسانوں کی جو قدر اور عزت کو بڑھانا شروع کیا تو ہندستانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ بھی بے چارے کسانوں کو تعلیم، تربیت، تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت کے ذریعہ ترقی دینا چاہتے ہیں اور چونکہ اس سے پہلے ہم آپ بھی کسانوں کو ''گنوار'' بلکہ گنوار کالٹھ سمجھتے تھے، اس لیے یہ تھانیدار اور تحصیلدار لوگ جب دیہات میں جاتے تھے تو ان بے چارے کسانوں سے پہلے تو تو تڑاق سے پیش آتے تھے، پھر انھیں گالیاں دیتے تھے، پھر مارتے تھے اور پھر درخت سے باندھ کر ان سے بغیر روپیہ دیے گاڑی، بیل، آٹا، گھی، لکڑی، فرش، لحاف، چارپائی اور لالٹین تک لے لیتے تھے اور یہ بے چارے جاہل اور بے پڑھے کسان مارے ڈر کے منہ سے اُف بھی نہیں کہتے تھے اور اگر کبھی اُف یا اُفو کہہ دیتے تھے تو یہ تھانیدار لوگ انھیں اور زیادہ مارتے تھے۔ ہوتے ہوتے پھر ہم آپ بھی جب گاؤں جاتے تو ان جاہل اور بے خبر کسانوں سے تھانیداروں ہی کی طرح پیش آتے۔

بس اس کا اثر یہ ہوا کہ کسان اور ان کے بھولے بچے ہمارے آپ کے نام سے لرزنے لگے اور یہ اسی زمانہ کا ڈر ان کے دلوں میں اب تک بھرا ہوا ہے، اس لیے آپ آج تمام دیہات

کے بچوں کو پیار کر کے اور گود میں لے کر سمجھا دیجیے کہ وہ آئندہ کسی سے نہ ڈریں۔ جو شخص ان سے "تو" کہہ کر بولے تو ان بچوں کے ہاتھوں میں جو چیز بھی ہو یہ اُس "تو" کہنے والے کے منہ پر ماردیں اور اس کی کوئی پرواہ نہ کریں، اگر مقدمہ چلے گا تو ہم اور آپ مقدمہ چلانے والے سے سمجھ لیں گے کیونکہ صاحب یہ تو بڑی ہی زیادتی ہے اور ظلم ہے کہ شہر کے رہنے والوں کے بچوں کو تو ننھے میاں، اچھن میاں، پیارے میاں، دلارے میاں اور بانکے میاں کہا جائے اور انھیں کوئی تھانیدار آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور یہ بے چارے کسانوں کے بچوں کو جو چاہے چانٹا رسید کردے اور جو چاہے گالی دے دے۔ حالانکہ کسانوں کے بچے بھی آخر انسانوں ہی کے بچے ہیں۔ کچھ گیہوں اور چاول کے بچے تو ہیں نہیں تو دیکھیے کہ خط کس قدر لمبا ہو گیا۔ حالانکہ ہمیں آپ سے اور بھی ضروری باتیں کہنا تھیں۔ خیر تو اتنا اور سن لیجیے کہ...

یہ کسانوں کے بچوں کے دلوں سے شہر والوں کا خوف دور کر دیجیے مگر انھیں اتنا بھی آزاد نہ کر دیجیے کہ یہ اپنے پڑھانے والے استاد پر بھی کسی دن لٹھ لے کر دوڑ پڑیں کیونکہ صاحب استاد کا رتبہ تو باوا سے بھی بڑا ہوتا ہے اور جو بچہ کہ اپنے استاد کو ناخوش کرے گا وہ اور اس کا اصل باوا دوزخ میں جھونک دیا جائے گا اور اس کی تمام کھیتی جل کر خاک ہو جائے گی۔ تو ہاں وہ خوب آئی، اصل میں کہنا یہ تھا کہ کسانوں کے بچوں سے پہلے آپ کسانوں ہی کو سمجھا دیجیے کہ دیکھو میاں کسانو! اگر اپنی اور اپنی اولاد کی خیریت چاہتے ہو تو سب سے پہلے یہ کام کرو کہ اپنے دلوں کو بہادر بناؤ، پھر ذرا صاف اور عمدہ قسم کا لباس پہننا اختیار کرو، کیونکہ اچھے لباس کے اختیار کرنے سے دوسروں کے دلوں پر بھی اثر پڑتا ہے اور خود بھی دماغ میں ترقی کا خیال پیدا ہوتا ہے، مگر یہ نہیں کہ تمام کسان بھائی کل ہی سے نازک نازک سی شیروانیاں اور لکھنوی ٹوپیاں استعمال فرمانے لگیں یا پھر فرنگیوں کے کوٹ پتلون پہننا شروع کر دیں، مگر ہاں یہ بھی نہیں کہ بالکل ہی ننگ دھڑنگ پھرتے رہیں۔ پھر یہ کریں کہ اپنے بچوں کو لکھا پڑھا کر طاق کر دیں کیونکہ اب آ گیا ہے زمانہ ایسا کہ کسانوں ہی کے بچے ہندستان کے بڑے بڑے افسر ہوا کریں گے اور کھیتی باڑی کا کام کریں گی عورتیں یا بوڑھے۔

اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ کسانوں کے بچوں کو روزانہ تازہ تازہ اخبارات پڑھ کر سنائے جائیں اور ہم تو ان کسانوں کو "دیندار" ہی نہیں سمجھتے جو روزانہ اخبارات نہ پڑھتے ہیں نہ

سنتے ہو ایڈیٹر صاحب! ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس میں آپ کا بھی تھوڑا بہت قصور ہے کیونکہ یہ تو آپ کو چاہیے کہ آپ جا کر ہر گاؤں میں اخبارات کا بندوبست کر دیں کیونکہ یہ اخبار والے تو اخبار نکالتے ہیں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے روپیہ کمانے کے واسطے اور لکھتے یہ ہیں کہ ہم تو جناب قوم کے خادم ہیں، خیر خواہ ہیں، مگر جناب ان کی مکاری اور خود غرضی کو کوئی ہم سے آ کر دریافت کرے تو ہم اسے بتائیں کہ اخبار والے کس قدر خود غرض ہوا کرتے ہیں۔

بس ان کی دوستی سے تو پولیس والوں کی دوستی اچھی، کیونکہ یہ بے چارے بعض وقت رات کو بغیر روشنی کے بھی ہر جگہ جانے کی اجازت تو دے دیتے ہیں، لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان اخبار والوں سے اپنا کوئی کام لے لیں تو یہ لوگ اول تو آپ کے ایسے خطوط کے جوابات ہی نہ دیں گے او جو جوابات بھی دیں گے تو اپنے مطلب کے مگر لاحول ولاقوۃ۔

دیکھیے! ہم کیا لکھ گئے۔ خیر تو آپ ان کسان بھائیوں سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ اپنے بچوں کو اب کھیتوں اور جنگلوں میں جانور بنا کر نہ پھرائیں، بلکہ انھیں دنیا میں سب سے بڑا آدمی بنانے کی فکر کریں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ فوراً انھیں لکھنا پڑھنا سکھائیں اور جب یہ کسان لوگ اپنے پاس کے شہر میں کسی کام کے لیے جایا کریں تو اپنے بچوں کو ضرور ساتھ لے جایا کریں تاکہ وہ شہر کے بچوں کا لباس، ان کی بات چیت، ان کا سینہ تان کر چلنا دیکھ لیا کریں تو ان کے اندر بھی انسانیت پیدا ہوگی اور ان کسانوں سے کہنا کہ خدا کے لیے آپ لوگ اپنے بچوں کی حجامت تو جلد جلد بنوا دیا کیجیے۔

اماں بعض کسانوں کے بچوں تو اس درجہ گندے اور میلے ہوتے ہیں اور ان کے پاس سے ایسی بدبو آتی ہے جیسے لاہور کی نالیوں سے آتی رہتی ہے اور ان بچوں کے ناخن تو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ مصافحہ کرنے سے ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے اور سر کے بالوں کو دھونا اور ان کے اندر خوشبو کا تیل ڈالنا تو یہ لوگ جانتے ہی نہیں حالانکہ سر کے بالوں کو صاف رکھنے سے عقل بڑھتی ہے۔

مگر صاحب ان کسانوں پر ہمیں اس وقت بہت تاؤ آتا ہے جب یہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور نوجوان بچوں کو اپنے ہی پاس بٹھا کر چلم اور حقہ پلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بیہودگی اور گناہ کی بات ہے اور ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اب اس طرف کے کسانوں کے بچے شراب بھی پیتے

ہیں۔بس تو پھر جانے دیجیے، ہم بھی ان سے بات کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ جناب تمام ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں دیوانہ ہو کر آگرہ کے پاگل خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے۔

ہاں اگر یہ بچے شراب کی جگہ دودھ پیا کریں تو ان میں کا ہر بچہ کیسا خوبصورت، موٹا تازہ اور ہٹا کٹا ہو جائے اور اس سے تمام گاؤں کے لوگ مارے خوف کے بات تک نہ کر سکیں۔

غرض قصہ کون کہے۔ کسانوں کی بھولی صورت والے بچے کیسے عمدہ ہوتے ہیں۔ پھر یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں تو پھر ان سے زیادہ بہادر، ان سے زیادہ ایماندار، ان سے زیادہ خوبصورت کون ہو؟

تو امید ہے کہ آپ ہماری طرف سے ان کسانوں سے کہہ دیں گے کہ تم اپنے بچوں کی تعلیم کو بڑی دولت سمجھو اور جس قدر جلد ہو انھیں لکھا پڑھا کر طاق اور الماری بنا دو۔

افسوس کہ آپ کو اصل بات تو لکھی ہی نہیں، خیر انشاء اللہ زندہ ہیں تو دوسرے خط میں لکھ دیں گے۔

◆◆◆

(12)

ایڈیٹر صاحب ''صدائے نسواں'' دہلی کے نام

رسالہ ''صدائے نسواں'' دہلی کے مہتمم طباعت واشاعت کو بعد حمد ونعت اور سلام مسنون کے معلوم ہو کہ آج سے کوئی تین ماہ پہلے جناب کا ''نامہ مضمون شامہ'' ملا تھا اور خوب یاد ہے کہ میں نے اس کے جواب میں ایک کارڈ اپنے ہاں کے ڈاکخانہ میں بقلم خود جا کر ڈالا تھا، اب اگر وہ آپ کو نہ ملا یا آپ نے اس کا جواب نہ دیا تو یہ جھگڑا تو ہم آپ طے کرلیں گے عاقبت میں۔ اب تو قصہ یہ ہے کہ ''صدائے نسواں'' مجھے برابر مل رہا ہے اور آج یہ تیسرا نمبر ملا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر رسالہ چار اوپر ساٹھ صفحات کا ہوتا ہے تو کل صفحات کا شمار ہوا ''چونسٹھ تیے ایک سو انیس'' گویا مجھ سے مضمون حاصل کرنے کے لیے ہر ماہ آپ کی جانب سے میرے نام 64 صفحات کا مطبوعہ خط آیا کرتا ہے جواب بڑھ کر 119 صفحات کا ہو چکا، مگر اس پر بھی میری بے رُخی، بے مہری، بے توجہی، بے پروا مزاجی، بے اعتنائی، بے مروّتی اور بے وفائی کا یہ عالم ہے کہ میں دنیا جہان میں لکھتا ہوں مگر نہیں لکھتا تو آپ کے ''صدائے نسواں'' کے لیے، مگر بھائی جان اگر آپ مسلمان ہوں تو یقین کرنا کہ یہ کچھ بھی نہیں، بلکہ میں تو اسی سیاسی تعلیم وتربیت کا مارا ہوا ہوں جس میں بتایا جاتا ہے کہ چاہے بقلم خود بھوکے مر جاؤ مگر دوسروں کو روٹی دیتے رہو، گھر میں فاقہ ہو مگر قوم کے لیے ایثار

کرتے رہو۔ حالانکہ مکے مدینے کے اسلام میں صاف صاف لکھا ہے کہ جب اپنی حالت اچھی ہو تو دوسروں کے لیے کچھ کرو، مگر آپ نے منشی نول کشور صاحب آنجہانی کے زمانہ کے مطابع میں چھپی ہوئی کتابوں میں لکھا دیکھا ہوگا کہ مسلمان کو تو ہر حال میں ایثار ہی سے کام لینا چاہیے، اس لیے مجھ پر جو اسی قسم کا اثر ہے تو عرصہ سے خود کو آپ کے سامنے شرمندہ سا محسوس کرتا تھا اور دل میں کہا کرتا تھا کہ بے چارے ''صدائے نسواں'' والے کس قدر شریف لوگ ہیں کہ میرے مضمون نہ لکھنے پر آج تک نہ منہ سے اُف کہتے نہ اُفوہ! اور رسالے ہیں کہ برابر پہنچ رہے ہیں۔ خیر تو قصہ مختصر یہ کہ آج خدا کے فضل سے اس قابل ہوا ہوں کہ جناب کی خدمت میں خط لکھوں اور مضمون پھر بھی نہ لکھوں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ تادم تحریر ہذا یہاں پر اس طرح خیریت ہے کہ بارش شروع ہوگئی ہے گویا میرے حق میں مچھر، زکام، کھانسی، ملیریا اور مکان کی دیواریں گرنی شروع ہوگئی ہیں۔ اب اگر اس طرح کی خیریت آپ کی طرف خیریت مانی جاتی ہو تو سمجھ لیجیے کہ یہاں تادم تحریر ہذا خیریت ہے اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب۔ حالانکہ یہ جھوٹ کہ شب و روز نیک مطلوب۔ اصل قصہ یوں ہے کہ ''صدائے نسواں'' میں کیا میں تو ''صدائے مرداں'' تک میں لکھنے کو حاضر ہوں، مگر وہ آپ کے اور میرے قبلہ مولانا شوکت علی مدظلہٗ چھوڑیں جب، یعنی وہ جو سال سوا سال سے حضور ممدوح نے آپ کی آنکھوں کے سامنے مجھے اخبار ''خلافت'' کے عملۂ ادارت میں جوڑ سا دیا ہے اس وقت سے آج تک آپ روزانہ دیکھتے ہوں گے کہ اس اخبار کے میرے ننھے میاں کی قمیص کے برابر دو کالموں میں مجھے لکھنا پڑتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ممدوح کے ارشاد سے انکار، اعراض، اغماض، سرکشی، سرتابی اور سردمہری گویا گورنمنٹ سے بغاوت کرنے کے برابر ہے لہٰذا جب تک کہ میں نے اور آپ نے گورنمنٹ سے ڈر کر چلنے کی قسم کھائی ہے اس وقت تک قبلہ مولانا شوکت علی مدظلہٗ سے بھی ڈرنا ہی پڑے گا اور جس دن خدانخواستہ ان سے سرکشی کریں گے اسی دن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں ڈٹ کر قوالیں سنیں گے تو اس مصروفیت سے تو میں اتنا نہیں گھبراتا۔ بھائی جان گھبراتا تو ہوں میاں زکام اور نزلہ سے، جو اس موسم میں نہ غریب کو چھوڑے نہ امیر کو، بس فرق یہ ہے کہ امیر اگر طاعون میں

بھی مبتلا ہو جائیں تو ان کے ڈاکٹر سلامت اور نوکران کے لیے بے ایمانی سے دعا کرنے کو تیار، لیکن اگر یہی زکام مجھے آپ کو ہو جائے تو حکیم کے ہاں بغیر موٹر کار کے بقلم خود ہی جائیے اور دعا گوئی کے عوض اپنی ذاتی بیوی کا یہ طعنہ گراموفون کی طرح ہر وقت سنتے رہیے کہ بس اتنی سی زکمیہ میں یہ حال؟

اب آپ ہی فرمائیے کہ اس حالت میں مضمون لکھوں یا زکام لکھوں؟ لہٰذا میں نے اس زکام میں ایک کام شروع کیا ہے اور اصل میں یہی کام تھا جس کی رنگین مصروفیت کے باعث میں جناب کو خط نہ لکھ سکا، مگر آپ کہیں گے اور فی البدیہہ کہیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو جب کہ تم نے خط نہ لکھنے کا سبب اوپر کچھ اور بتایا ہے اور اب کہتے ہو کہ ایک اور کام تھا، تو جواب یہ ہے کہ میں نے عرصۂ دراز سے جھوٹ بولنا یوں شروع کر دیا ہے کہ میں نے دیکھا اور عرصۂ دراز تک دیکھا کہ آج کل کے کچھ کم سوا امیر، دولت مند اور حاکم اس درجہ خوبصورت جھوٹ بولتے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر آپ کو موقع ملے تو امیروں، دولت مندوں اور حاکموں سے مل کر دیکھیے اور خصوصیت سے کسی کام کے لیے ان سے وعدہ لیجیے۔ پھر دیکھیے کتنا جھوٹا وعدہ کریں گے کہ عمر بھر آپ ان کے حق میں بد دعا ہی کرتے رہیں۔ اسی طرح امیروں، دولت مندوں اور حاکموں کے پاس رہنے والے، جانے والے اور ان پر اثر رکھنے والے بھی 99 فیصدی وہ سفید جھوٹ بولتے ہیں کہ چاندکی چاندنی میں بھی وہ سفیدی نہ ہوگی۔ آپ ان کو یوں آزمائیے کہ جس دولت مند یا حاکم پر ان کا اثر ہو اس سے کسی فائدہ کی خاطر ملنے یا اس سے کچھ حاصل کرنے یا اس سے ملاقات کے لیے ان بااثر لوگوں سے کہیے۔ یہ بڑے زور سے آپ کو یقین دلائیں گے کہ میں کل ہی آپ کے لیے سفارش کروں گا، مگر بجائے سفارش کے یا تو یہ وہاں چپ رہیں گے یا اگر ان کو یہ ڈر ہو گا کہ سفارش کرنے سے کہیں آپ خود نہ طلب کر لیے جائیں تو یہ الٹی آپ کی برائی کر دیں گے اور آپ سے آ کر کہہ دیں گے کہ میں نے بہت زور سے آپ کی سفارش کر دی ہے، مگر افسوس کہ فی الحال کوئی صورت کامیابی کی نہیں، لیکن دوسرا موقع آنے دیجیے میں پھر سفارش کروں گا۔ اب اگر ایسے لوگوں کے جھوٹ بولنے پر آپ کو یقین نہیں تو میرے سر پر دہلی کی جامع مسجد رکھ کر مجھ سے قسم لے لیجیے کہ ہاں ایسے بااثر لوگ صرف جھوٹ ہی نہیں بولتے بلکہ آپ کا راستہ روکنے کے لیے اپنے حاکم، اپنے

دولت مند سے آپ کی برائی بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ نہیں کوئی دس جگہ کا تجربہ تو مجھے ہے کہ مجھ سے سفارش کا کہہ کر گئے اور وہاں جا کر میرے خلاف یہ کہا کہ ملا رموزی اول تو بے حد حقیر و فقیر محتاج، مسکین اور نقش بند قسم کا انسان ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مضمون نگار ہے، اسے قریب ہی نہ آنے دیجیے ورنہ خدا جانے کب آپ کے خلاف کچھ لکھ دے اور مجھ سے آ کر کہا کہ میں نے بہت زوردار الفاظ میں آپ کی سفارش کر دی ہے۔ تو جب اونچے لوگوں کے جھوٹ کا یہ عالم ہو تو پھر میرے آپ کے جھوٹ بولنے پر گورنمنٹ کون سا مارشل لا جاری کر دے گی۔ اس لیے ہو سکے تو آپ بھی موقع بہ موقع جھوٹ بول لیا کیجیے ورنہ میری طرح دولت مندوں سے دور رہنا پڑے گا اور یار لوگ پلاؤ کھاتے رہیں گے لہٰذا سن لیجیے کہ جس رنگین کام کو میں نے شروع کیا ہے وہ میری جدید سے بھی جدید رنگ کی شاعری ہے۔

اب آپ گھبرائیں گے کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی جو آپ ملا رموزی سے یکا یک شاعر بن گئے؟ سو جواب یہ ہے کہ ہم آپ ٹھہرے ادیب، لہٰذا نثر نگاری کے ساتھ شعر گوئی بھی ہمارے جزو عمل ہے لیکن میں نے اپنی ایک شاعری کو ایک ایسے ضابطہ کے ساتھ شروع کیا ہے جس کی مثال آج تک کی اردو شاعری پیش نہیں کر سکتی بجز حضرت جوش ملیح آبادی کے کہ ان کے ہاں تو چند چیزیں جان شاعری ہیں۔ باقی کے یہ جتنے بھی شعرائے اردو ہیں ایک ایسی بھول میں مبتلا ہیں کہ معاذ اللہ۔

اب مری شاعری کا خلاصہ سن لیجیے۔ وہ یہ کہ یہ شاعری میں نے عورت ذاتوں کی حمایت اور حفاظت میں شروع کی ہے۔ یعنی اردو کی شاعری نے عورت کے خلاف جو گندہ، غلط اور خلاف فطرت ذخیرہ جمع کیا ہے میں نے اس کا جواب اپنی شاعری میں دیا ہے۔ اب یہ آپ کو اس وقت معلوم ہوگا جب میرا دیوان میرے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوگا اور انشاء اللہ اسی وقت دنیا بھر کی عورتوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے حق میں آج تک کی اردو شاعری کس درجہ گندہ، ناپاک اور خلاف عقل و اخلاق تھی اور ملا رموزی نے کتنا لاجواب جواب دیا ہے۔ اب آپ یہ دریافت نہ کیجیے کہ میں اس دیوان کو کب شروع کروں گا کیونکہ دیوان تو انشاء اللہ اکتوبر 1935 تک تیار ہو جائے گا۔ رہا اس کے مطبع سے چھپ کر بازار میں ملنے کا سوال، سو یہ میری بیوی کے جہیز کے زیور پر موقوف

ہے یعنی اگر وہ نیک بخت اپنا زیور گروی رکھ کر روپیہ دینے پر راضی ہوگئی تو دیکھ لیجیے کہ اکتوبر 1935 میں آپ ہی کے شہر دہلی کی جمعیۃ العلما کا مہمان بن کر اس دیوان کو چھپوا رہا ہوں گا ورنہ پھر اخبار ''خلافت بمبئی'' میں بیٹھے میری غزلیں اور نظمیں ملاحظہ فرماتے رہیے گا۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ اپنے رسالہ میں جو شذرات لکھتے ہیں ان میں واقعاتی ملاحظات کے ساتھ ساتھ بااثر اور طاقتور خطابت کے ساتھ ہر ماہ عورت ذاتوں کی موجودہ تمدنی اور اخلاقی غلط کاریوں پر وہ زنانے کی ڈانٹ عطا فرمایا کیجیے کہ ان کے دانتوں میں پسینہ آجایا کرے جیسا کہ میں اخبار ''خلافت'' میں امیروں، دولت مندوں، مسلمان حاکموں اور بڑے لوگوں کو درست کرتا رہتا ہوں۔ یہ مقصد آپ کے رسالہ کے عام اصلاحی مضامین سے حاصل نہ ہوگا جب تک کہ آپ بقلم خود ایسی غلط رو بہنوں کو ڈانٹ نہ دیجیے گا اور ہاں آپ دہلی میں ''گلی چوڑی والان'' میں جو رہتے ہیں تو میری بیوی نمبر تین کے لیے آپ جو چوڑیاں ارسال فرمائیں گے وہ شکریہ کے ساتھ قبول کی جائیں گی کیونکہ باوجود انگریزی جاننے کے اس اللہ کی بندی اور مجھ اللہ کے بندے نے آج تک نہ اپنی وطنی وضع قطع ترک کی اور نہ نماز سے ہم لوگ بھاگتے ہیں کیونکہ یورپی وضع قطع تو وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو دماغ کے کمزور ہوتے ہیں۔ بس جہاں انھوں نے کسی خود سے بڑے آدمی کو دیکھا فوراً اس کی نقل کرنے لگے۔

جی ہاں گیہوں اور خالص گھی کا نرخ چڑھتا اترتا رہتا ہے، مگر آپ یہ تو فرمائیں کہ آپ کو گیہوں کتنے اور گھی کتنا درکار ہے۔ بس اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دہلی پھر دہلی ہے وہاں کی ہر چیز میں بلندی ہے۔ حد ہوگئی کہ جب وہاں کی بھینس تک ہاتھی کو ''نورچشمی'' اور وہاں کا بیل اونٹ کا لخت جگر معلوم ہوتا ہے تو پھر وہاں کے گیہوں اور گھی اے سبحان اللہ! خدا ہر مسلمان کو اور مجھے کھلائے۔

اب میرے خیال میں تو آج کل کے زکام اور بخار سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ اچھا ہے کہ یا تو زکام شروع ہوتے ہی آدمی کسی مضبوط دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے یا حکیم نابینا صاحب قبلہ کے ہاں کی گولیاں کھاتا رہے۔ امید ہے کہ آپ اس تھوڑے لکھے کو بہت جان کر اپنی خیریت سے بواپسی ڈاک مطلع فرماتے رہیں گے۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام!

◆◆◆

(13)

ایڈیٹر صاحب ''مستورات'' کانپور کے نام

محترم مدیر مجلّہ عزیز ''مستورات'' کانپور۔ سلام و رحمت!

آپ کا نامہ محترم ملا تھا، میں نے معقول معذرت پیش کر دی تھی۔ برادرم مولوی ابو محمد ثاقب کا گرامی نامہ ملا تھا، میں نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ ان دونوں کے بعد میں آج اس قابل ہوا ہوں کہ مضمون تو انشاء اللہ اب میری بیوی نمبر چار ہی لکھا کریں گی، میں چند سطور آپ کے رسالہ کے متعلق پیش کر دوں۔

لہٰذا دیگر احوال یہ ہے کہ الحمد للہ تادم تحریر ہٰذا یہاں پر ہر طرح تو نہیں مگر ہاں خیریت ہے اور خیر و عافیت آں محترمہ کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب۔ حاصل کلام رسالہ ''مستورات'' مجھے اور میری بیوی نمبر دو کو مل رہا ہے۔ اب یہ ظاہر کرنا مشکل ہے کہ آپ کے رسالہ کی متعلق میری رائے زیادہ بہتر ہے یا اُن کی؟ کیونکہ اس طرح ایک ساتھ رائے کے اظہار میں خطرہ ہے کہ ہم دونوں میں خدانہ کردہ شکر رنجی ہو جائے۔ بارے اتنا میں بتا سکتا ہوں کہ اگر میں یہ لکھ دوں کہ آپ کا رسالہ نہایت عمدہ ہے تو وہ بھی دوسرے دن لکھ دیں گی کہ آپ کا رسالہ بہت ہی عمدہ ہے کیونکہ ہزار کچھ ہو مگر وہ اللہ کی بندی ہے میری قدرداں۔ خیر آپ ہم میاں بیوی کو تو

چھوڑیے خدا پر اور اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا پر۔ اب تو معلوم کیجیے کہ میں آپ کے رسالہ سے زیادہ آپ کے اس عمل اور حوصلۂ عمل کا مداح، معترف، مقر اور ممنون ہوں جو آپ اس کے اجراء و اہتمام کے سلسلہ سے ظاہر فرمارہی ہیں اور ہر آن آپ کا یہ ولولۂ عمل لیئے لیئے گراموفون باجہ سننے والی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے درس و موعظت ہے کہ آپ کے بیشتر اوقات قومی اصلاح و خدمت کے لیے خاص اور وقف ہیں جیسا کہ ''مستورات'' میں آپ کے بقلم خود مضامین کی کثرت سے پتہ چلتا ہے اور مبارکباد قبول کیجیے کہ یہ شرف واعزاز اور امتیاز آپ کو اور صرف آپ کو حاصل ہے کہ آپ اپنا رسالہ محض اپنی ذاتی صلاحیت کے بل پر نکال رہی ہیں ورنہ بلند طبقات کی خواتین الا ماشاء اللہ قسم کی عورتوں کو چھوڑ کر باقی کی عورتوں کے اوقات جس طرح گزرتے ہیں یا بقول سی آئی ڈی والوں کے جس طرح رائیگاں جاتے ہیں، کچھ نہ پوچھیے ان کو ملا رموزی سے اور کچھ دریافت کیجیے اس کی بیوی نمبر دو سے؟ وہ تو مجھے بھی مسلمان عورتوں کی جلد از جلد ترقی، ان کی فوری اصلاح اور ان کی اعلیٰ تعلیم و مذہبیت کا خیال یوں نہ ہوتا کہ آپ جانتی ہیں کہ مجھے ایک جلیل القدر اسلامی روزنامہ ''خلافت'' بمبئی کے لیے روزانہ پورے دو کالم لکھنا پڑتا ہے اور نہ لکھوں تو دنیا جان سکتی ہے کہ مولانا شوکت علی قبلہ ویسے ہی کیا کم ہیں، اور اگر کسی پر غصہ ہوں تو ان کے غصے کو مجھ ایسا پھولوں سے تلنے والا آدمی کیا خاک روک سکتا ہے۔ اس کے بعد اور کتنے رسالے اور اخبارات ہیں جن کے لیے ملا رموزی مضامین کی پن چکی بنا رہتا ہے، مگر وہ تو آپ دعا دیجیے میری بیوی نمبر دو کو اللہ اس کی انگریزی پڑھی ہوئی بندی نے مجھے ایک دن توجہ دلائی کہ:

عالیجناب!

آپ نے عورتوں کی غلط کاریوں پر تو وہ کچھ لکھا ہے کہ لاریب آنے والی نسلیں آپ کے لیے سراپا سپاس رہیں گی مگر کچھ ان کے لیے بھی لکھیے جو نہ فقط نیکوکار و ذی علم ہیں بلکہ ان کے لیے بھی جو کام کرنے کی استعداد رکھتی ہیں مگر ناقدر ملا رموزیوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتی ہیں اور اِدھر ہندو عورتوں کی ترقی کا بھونچال ہے کہ صوبۂ بہار کی طرح مسلمان عورتوں کو تہہ و بالا کرنے کے لیے بڑھا رہا ہے۔ بس جناب اس صاحبِ فہم و فراست بیوی کو مجھے اس طرف متوجہ کرانا تھا کہ میرے سامنے آپ کا رسالہ ''مستورات'' آ گیا اور میں نے اس رسالہ کے جذبہ کو بے حد

توقیر و احترام کی نظر سے دیکھا کہ یہ رسالہ مسلمان خواتین کو ترقی کی دعوت دے رہا ہے، مگر مذہب محترم کے اصول پر۔

کچھ شک نہیں کہ مسلمان خواہ آج ترقی کریں خواہ محرم کے بعد۔ وہ جب تک اپنے مذہب اور اپنی تاریخ کے اصول پر نہ چلیں گے نہ وہ ترقی کریں گے نہ میری بیوی۔ اب اصل خرابی تو ہے استادوں کی ورنہ کون مسلمان ہے جو اپنی لڑکی کو شروع میں دین کی تعلیم نہیں دلاتا، مگر خدا محفوظ رکھے یہ مولوی صاحب قسم کے بوڑھے استادوں سے کہ یہ اللہ کے عربی پڑھے ہوئے بندے جو کتاب پڑھاتے ہیں اس بری طرح اور اس درجہ موٹی عربی کے قاعدہ سے کہ نہ لڑکا سمجھ سکتا نہ لڑکی بس وہ تو کتاب کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور اندھے حافظ جی کی طرح ہل ہل کر کچھ فرماتے جاتے ہیں، ان کی بلا سے پڑھنے والی سمجھے یا نہ سمجھے۔ پھر دین کے مسائل سمجھانا تو خالص عربی اصطلاحات و محاورات میں یعنی انھیں مثال تک اردو کی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے استادوں سے پڑھنے والا لڑکا اور پڑھنے والی لڑکی اپنے استاد کے مرجانے کی دعا کرتی رہتی ہے اور بعض جگہ تک تو یہ ہوا ہے کہ تیز دماغ لڑکیوں نے روزہ کی افطاری میں زہر ملا کر ایسے استادوں کا خاتمہ کر دیا ہے اور خدا خدا کر کے ملا رموزی کی کوششوں سے پھانسی سے بچی ہیں۔ لہٰذا آپ جو مسلمان عورتوں کو مذہب کی تعلیم دلایئے تو خدا کے لیے پہلے اس زمانہ اور اس روشنی کے استاد بھی بہم پہنچایئے تا کہ اس زمانہ کی اولاد اصل مذہب کا رنگ قبول کر سکے اور اس میں صحیح مذہبی ذہنیت پیدا ہو۔ پس مبارک ہو کہ آپ کے رسالہ کے مضامین اور نظموں کا رنگ ایسا ہی ہے۔

دوسرا کام اگر ہو سکے تو یہ کیجیے کہ مسلمان عورتوں کو یقین دلایئے کہ ہندو عورتیں تعلیم پا رہی ہیں، مگر اس طرح کہ جس علم کو شروع کرتی ہیں اسے تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں یہ برابر کی خامی موجود ہے کہ ہر علم و ہر زبان کے حصے پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب اگر ابوالفضل کا والد ہوں تو میں اور والدہ ہوں تو میں اور مسلمان عورتوں میں خدا نے چاہا تو لاکھوں عورتیں اور کروڑوں لڑکیاں ایسی موجود ملیں گی جو نہ اردو میں کامل نہ انگریزی میں ماہر، نہ فارسی میں طاق نہ عربی میں محراب اور پھر اس ادھورے پن پر خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی سمجھتی ہیں اور روشن خیال بھی۔ اور اس طرف ہندو عورتوں کا یہ حال ہے کہ کوئی بمبئی میں ہوتا تو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے

اجلاس میں ہندولڑکیوں اورعورتوں کو دیکھتا کہ کس مستعدی اور قابلیت سے وہ اس بلند مجلس مردوں کے برابر کام کررہی تھیں، کہ بس پولیس والوں ہی سے دریافت کیجیے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دس بارہ برس میں ہندوعورتیں ''ہرفن مولا'' ہوجائیں گی اور مسلمان عورتیں یہ اپنے مردوں کی غلام بنی رہیں گی یا پھراس بے راہ روی سے آزادی چاہیں گی کہ گورنمنٹ کوان کی بندش کے لیے بنگال آرڈیننس نافذ کرنا پڑے گا۔

پس مبارک ہو کہ آپ کے رسالہ کے مضامین میں علم و ہنرمندی سکھانے کا ایسا اعتدال موجود ہے جواز بسکہ مسلمان عورتوں کے مستقبل کو میری بیوی نمبر دو کے دماغ کی طرح آراستہ اور مہرمنور بناتا ہے، مگر افوہ! معاف کیجیے کہ میں ان باتوں میں پڑ کر اصل خط لکھنا بھول گیا۔ سو:

دیگر احوال یہ ہے کہ:

آپ کے غلام عرف ننھے میاں کے لڈو، جلیبی اور پھلوں کے روزانہ مصارف کا اب یہ حال ہے کہ اگر میرا یہ لڑکا دو چار برس اور زندہ رہ گیا تو انشاءاللہ مجھے کسی مہاجن کے قرض میں ضرور قرق کرا کر چھوڑے گا۔ بھلا خرچ ایسا خرچ ہے کہ دنیا صبح کی نماز پڑھتی ہے اور وہ جاڑے سے کانپتا ہوا دروازہ سے باہر پیسہ لیے جلیبی والے کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ اب اگر اس پر اپنی بیوی نمبر ایک سے کچھ کہہ دیجیے تو معاملہ خلع تک پہنچ جانے کے لیے تیار رہتا ہے اور ویسے بھی غریب گھرانوں میں جو کام کیا جاتا ہے انتہا کے درجہ تک، یہ تو امیروں ہی میں ہوتا ہوگا کہ ہر کام سلیقہ سے ہو، کیونکہ اس میں بھی خطا غریب مردوں کی ہے جن کو نہ اولاد کی صحیح تربیت کا سلیقہ نہ بیوی کی اصلاح کا گر معلوم اور ملا رموزی ان دونوں درجوں کے بیچ میں زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ وہ تو اگر بیوی نمبر چار کا موتیوں سے تولنے والا دماغ اور اس کی جواہر سے زیادہ قیمتی توجہات مجھے حاصل نہ ہو جاتیں تو میں اکیلے ننھے میاں ہی کی تربیت کا گھوڑا بن کر رہ جاتا۔ غرض یہ کہ ہم دونوں میاں بیوی نے مل کر یہ رائے قائم کی ہے کہ آپ کے رسالہ میں جو مخرب اخلاق و نظر تصاویر نہیں تو یقیناً اسی نوع کے رسائل محمود بھی ہوں گے اور مقبول بھی اور ظاہر ہے کہ علم و ادب اور فہم و فراست سے متعلق اگر میں نہیں تو کم سے کم میری بیوی نمبر چار کوئی رائے قائم کرے تو اس کے حسن اور وزن کو تو آپ بھی تسلیم فرمائیں گے؟ پھر ادھر تو ایک ادیب اور اُدھر اس کی بیوی

نمبر چار کا بہاروں ہی بہاروں سے شاداب دماغ۔ اسی لیے تو میں کہا کرتا ہوں کہ اگر یہ مہر منیر سے زیادہ غلطانیوں، لمعانیوں، تابانیوں اور درخشانیوں سے بنی ہوئی بیوی میرا ساتھ دے دے تو وہ جرمنی کے تیس مار خاں جناب ہروان ہٹلر سے اگر جرمنی کا تخت نہ چھین لاؤں تو "مستورات" میں مضمون ہی نہ لکھنے دیجیے گا۔

جناب والا! مسلمان عورتوں کے ترقی نہ کرنے کا بڑا سبب تو یہی ہے کہ ان غریبوں کے کمالات کی صحیح داد دینے والے نہ شوہر نہ گورنمنٹ، بس یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ "عورت ناقص العقل" ہوتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر عورت ناقص العقل ہوتی تو ہندستان ایسے طول طویل علاقہ پر کس طرح حکومت کرتی اور "گورنمنٹ" کیوں کہلاتی "گورنمعا" نہ مشہور ہوتا؟

بہرحال آپ کی طرف اگر خالص گھی ملتا ہو اور موٹر کاروں کا نرخ ارزاں ہو تو ایک ٹین خالص گھی کا اور ایک موٹر کار زمرد، الماس، مرجان، نیلم، یاقوت، ہیرے، جواہر اور پکھراج کی بنی ہوئی میرے نام اور روانہ کر دیجیے گا۔ رہا معاملہ قیمت کا تو یہ تنخواہ پر لے لیجیے گا یا عاقبت میں۔ آخر میں عرض کروں گا کہ "مستورات" میں کشیدہ کاری کا سلسلہ بھی لائق تعریف ہے۔ خدا کرے مسلمان مستورات گھر کے ہنر ہی میں طاق ہو جائیں بی۔اے تو جب ہوں گی، ہوں گی۔ امید ہے کہ آپ بھی بخیریت اور زکام کھانسی سے محفوظ ہوں گی۔ اب میری اور ان کی جانب سے تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام اور پیار، مگر خدا کے لیے لفظ "تمام" سے یہ مطلب نہ لیجیے گا کہ کانپور کے لاکھوں خورد و کلاں، بلکہ صرف اپنے گھر کے اور زیادہ سے زیادہ میرے محترم خان بہادر حافظ محمد حلیم صاحب اور ان کے خلف ارشد محمد بشیر صاحب بی۔اے، بی۔کام ہارابیٹ لاء کے خورد و کلاں کو سلام و دعا۔

◆◆◆

(14)

ایڈیٹر صاحب ''مستورات'' کانپور کے نام

بھائی احسن عثمانی کو بعد سلام سنت اسلام کے از طرف ملا رموزی معلوم ہو کہ یہاں پر سب خیریت ہے، صرف اس نیک بخت کو کھانسی زکام کی شکایت ہے اور میرے اس اکلوتے بیٹے کی آنکھیں آشوب کر آئی ہیں۔ جس غریب کو میں نے پچھلے سال اپنی بیوی نمبر دو کی خیریت سے آمد پر صدقہ کا بکرا بنا دیا تھا، وہ غریب بال بال بچ گیا اور اس اللہ کی بندی نے شکریہ تک ادا نہ کیا، بچہ کو بلا کر پیار کرنا کیسا؟

اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ رب العزت سے شب و روز نیک مطلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا آیا، آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، مگر یہ معلوم کر کے ''از حد فکر'' ہوئی کہ میرا بھیجا ہوا مضمون جناب کو نہیں ملا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اخباری کام کا جتنا بڑا بھاڑ میں جھونکتا رہتا ہوں اس کی وجہ سے میرے پاس اتنی زیادہ ڈاک آتی ہے گویا میں ملا رموزی کے عوض صدر ڈاکخانہ بن جاتا ہوں اور جس وقت میں اپنی ڈاک ڈاکخانہ سے خود وصول کرتا ہوں تو اس وقت اچھا خاصا ڈاکیہ معلوم ہوتا ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ میری ڈاک کا بھی وہ بندوبست ہے جو یا تو وائسرائے ہند کی ڈاک کا ہوگا یا پھر میرا، اس لیے میرے گھر کے ڈاکخانہ سے لے کر مرکزی

ڈاکخانہ تک کے ملازمین میری ڈاک کے بندوبست میں یوں مستعد نظر آتے ہیں جس طرح بعض مسلمان لڑکیاں نماز سے پہلے سینما کے تماشے کے لیے مستعد نظر آتی ہیں، اس لیے کہ جہاں میرا ایک کارڈ بھی اِدھر سے اُدھر ہوا کہ میں نے تمام ڈاکخانوں سے جنگ شروع کر دی اور یہ دنیا جانتی ہے کہ میں جس کے پیچھے پڑ جاؤں یا اس کو ختم یا پھر خود پھانسی پر لٹکنے کو تیار رہتا ہوں۔ وہ تو کہیے کہ میں بیوی نمبر دو کے معاملہ میں کمال صبر سے کام لے رہا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آخر وہ غرور اور خاموشی سے کب تک کام لیتی ہے؟

دیگر احوال یہ ہے کہ میں نے جو مضمون جناب والا کو روانہ کیا تھا، اس میں یہ لکھا تھا کہ میں اب عورتوں کے معاملات پر مضمون لکھنا چھوڑ چکا ہوں، وہ اس لیے کہ ابھی ہندستان میں عورت ذات بہ لحاظ تعلیم و تربیت بہت پیچھے ہے، اس لیے اس میں علمی اور اصلاحی خصوصاً طنزیہ مضامین کے سمجھنے کی لیاقت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے تمام اصلاحی مضامین کو عورتوں نے تو خیر سمجھا جیسا کچھ سمجھا، مگر جناب لڑکیوں نے صرف یہ سمجھا کہ ملا رموزی جو کچھ لکھتا ہے وہ صرف عورتوں کے خلاف لکھتا ہے یا دولت والوں کے خلاف لکھتا ہے۔ بس جناب یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پھول سے زیادہ نازک دل ٹوٹ گیا۔ وہ تو خدا مہر معاف کرنے کی توفیق دے میرے ننھے میاں کی والدہ کو کہ اس غریب نے فوراً اس کو جوڑ دیا ورنہ آج میں یہ چند سطور بھی مارے تاؤ کے نہ لکھتا اور لکھوں تو کیسے کہ آج بیس برس سے لکھ رہا ہوں اور آپ کو بھی قسم دیتا ہوں کہ آپ ہی بتائیے کہ میں نے کس عورت کے خلاف لکھا اور کس کا بھانڈا پھوڑا بجز اس کے کہ جو لکھتا ہوں عام عورتوں کی اصلاح کے لیے لکھتا ہوں، مگر وہ نیک بخت یہی سمجھتی ہے کہ اگر ملا رموزی سے بات کی تو فوراً یہ مضمون میں لکھ دے گا لہٰذا جب اس کی کم عقلی کا یہ حال ہے تو ایسی مضمون نگاری کو دور سے بھی سلام اور قریب سے بھی سلام۔ بیشک میں جانتا ہوں کہ میرے خلاف اس کے گھر کے معتبر نائی نے بہت کچھ کہا ہے۔ حالانکہ یہ اس کا معتبر نائی باہر آ کر خود اس کی برائیاں اور عیب بیان کرتا ہے، مگر اس کو یہ کون بتائے کہ تو جس معتبر نائی پر بھروسہ کرتی ہے وہ باہر سے تیرے خاندان بھر کا مخالف ہے، اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ اچھا اس کو خاموش ہی رہنے دو، ایک دن تو سچ کا اثر ہو کر ہی رہے گا، لہٰذا یہ سوچ کر میں نے ''عورتانہ مضمون نگاری'' بند کر دی ہے۔ اللہ ہم کو تم کو معاف فرمائے اور اس

کے عوض یہ کام کیا کہ اب شاعری کر رہا ہوں۔ شاعری کے ذریعہ بھی عورتوں کی ایک بڑی بھاری خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ اس طرح کہ اردو میں آج تک کی غزل کی شاعری نے عورت کے کردار کو بے وفا، مکار، عیار، غدار اور خاصا آوارہ اور ظالم و جابر قرار دیا ہے، لیکن میں نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں عورت کے فطری جذبات، وفادارانہ رجحان اور طبعی واردات کو اس طرح پیش کیا ہے جس طرح کہ ان کو پیش ہونا چاہیے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ جو عورتیں کہ اپنے گھر کے ملازم پر کامل بھروسہ کر کے دوسروں کی نہیں سنتی ہیں وہ آخر کار نقصان پاتی ہیں کیونکہ جو ملازم زیادہ اعتبار کے قابل سمجھا جانے لگتا ہے وہی دھوکے بھی بہت دیتا ہے۔ اسی لیے انگریز لوگ ہر نوکری پر ایک آدمی کو صرف پانچ برس رکھتے ہیں اور اس کو بدل دیتے ہیں۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ عورتوں کو آزادی نہ دیجیے، مگر کیا ایسی آزادی دے دی جائے کہ ہر گلی کوچہ سے ان کے نام پر لعنت کی آوازیں آئیں۔

بھائی جان! حال یہ ہے کہ اول تو تعلیم ہی نہیں۔ دوسرے تعلیم جس کو کہا جاتا ہے وہ صرف اتنی ہوتی ہے کہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لی اور غنڈوں کی قسم کی اردو لکھ لی، نہ "پانیئر" کا کوئی علمی مضمون سمجھ سکیں نہ اونچے درجہ کی اردو میں صحیح خط لکھ سکتی ہیں۔ ایک دو قسم کے کیک بسکٹ بنانا سیکھ لیا۔ کم علم اور کم تجربہ عورتوں کے کلب میں دو چار ہاتھ انگریزی پٹے کے دکھا دیے اور آزادی طلب فرمانے لگیں اعلیٰ تعلیم یافتہ مردوں کے برابر۔ ہاں بے شبہ جو عورتیں عمر کی پختگی کو پہنچ کر اعلیٰ تعلیم و ہنر مندی کا ثبوت دیں ان کے لیے میں یہاں تک تیار ہوں کہ وہ پردہ سے باہر آ کر کام کریں اور میں پردہ نشین بن جاؤں لیکن اگر نوعمری اور ناکتخدائی کے زمانہ میں سنہری، روپہلی گھڑی، ڈانس، ہارمونیم، سنیما اور گھوڑ دوڑ میں حصہ لینا چاہیں تو میری رائے نہیں۔ ہاں آپ کی رائے سے مجبور ہوں اور یہ تو اب جانے ہی دیجیے کہ فلاں مدرسہ میں اعلیٰ مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ ارے بھئی جب خاندان بھر کا رنگ مذہبی نہیں تو لڑکی تعلیم پا کر کیا خاک کر سکتی ہے۔ اسی لیے کتنے کمبخت اور منحوس گھرانے ہیں جن میں شادی بیاہ کے لیے دولت مند لڑکی اور دولت مند لڑکا تلاش کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسی تلاش میں ہزاروں نقصانات پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر فطری قاعدہ سے جو لڑکی دولت مند سے بیاہی جائے گی وہ اس لیے سکھ نہ پائے گی کہ اس کے میاں دولت کی وجہ سے شرابی

ہوں گے اور کبابی بھی۔ پھر جتنی خوبصورت لڑکی ہو گی اتنے ہی خوبصورت میاں ہوں گے۔ ایسی صورت میں خوبصورت شوہر خوبصورت بیوی کی کیا قدر کرے گا؟

دیگر احوال یہ ہے کہ اگر آپ کے اور محترم بیگم صاحبہ کے سامنے میرا خط پڑھا جائے تو اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھیے گا اور چمڑے والے تاجروں سے زیادہ میل جول رکھیے گا۔ یہ حضرات قومی کاموں میں خاصی دولت صرف کرتے ہیں۔ مجھے تو الحمدللہ ضرورت نہیں۔ والسلام۔

◆◆◆

(15)

ایڈیٹر صاحب ''مسیحا'' رامپور کے نام

محترم مدیر و سرد بیر ''مسیحا'' ادام اللہ دواخانہٗ و شفاخانہٗ!

بعد دعائے ترقی درجات مطب وادویہ کے التماس ہے کہ خطوط آپ کے ملے۔ حالات سے آگہی ہوئی۔ الحمد للہ تادمِ تحریر ہٰذا یہاں پر خیریت کے قسم کی ایک چیز ہے تو مگر نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیریت ہے یا غیر خیریت۔ یعنی اگر صبح سے شام تک کم علم، بے ذوق، کم نظر، کم ظرف، ناقدردان، حاسد، منافق اور در پردہ سخت مخالف دوستوں میں رہنے کا نام خیریت ہے تو بیشک میرے گھر میں ہر طرح خیریت ہے اور خیر و عافیت آں محترم کی مع خورد و کلاں کے درگاہ الٰہی سے شب و روز نیک مطلوب اور جو خیریت اس کا نام ہے کہ ایک فردوس نظر کوٹھی ہو، ایک رولز رائس کار ہو، ایک ذخیرہ شراب ہو، ایک جنت نہیں تو ناز بردار حور ہو، ایک ہمدرد حلقۂ احباب ہو، ایک ذاتی مطبع ہو، ایک اخبار اور ایک رسالہ ہو، ایک آزاد اور ایماندار قلم ہو تو اس حساب سے الحمد للہ اپنے خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے ہاں خیریت ہے اور بس۔ ہاں میرے ہاں تو ایک پرانے قبرستان میں تین سو تین سو روپیہ کا مکان ہے، جس میں مل کے مزدور بھی رہیں تو روتے ہی رہیں۔ دن رات روزی کمانے اور اس میں اضافہ کی فکر ہے۔ اولاد ہے کہ طوفان کی طرح امنڈی چلی آرہی ہے۔ بیوی نمرود کی بے

مہری، بے وفائی، بے توجہی کا غم علاحدہ۔ نہ مضمون نگاری میں کوئی معاون، نہ غزل صاف کرنے کے لیے کوئی منشی۔ ان حالات میں مسلمانانِ ہند کا تقاضا ہے کہ ان کو ہنساتا ہی رہوں اور وہ بھی مفت۔ تو سن لیجیے کہ اس مرتبہ بقرعید کی نماز پڑھ کر میں نے مسلمانوں کی دماغی خدمت سے توبہ کر کے ہندوؤں کی خدمت گزاری کی قسم کھالی ہے کہ ان کے ہاں کسی آشرم اور بھنڈار میں بھی جارہوں گا تو یہ لوگ مجھے اتنی جوانیاں دے دیں گے کہ میں پھر کچھ دن اس بوڑھے ہندستان کو باغ و بہار بناتا رہوں۔ حد ہے کہ میں پہلے سنا کرتا تھا کہ عورت ذات بڑی قدر دان، فیاض اور ہمدرد ہوتی ہے، اس لیے میں نے مردوں کو چھوڑ کر عورتوں کی خدمت شروع کی، مگر صلہ یہ پایا کہ ان میں میرے خلاف جذبہ پیدا ہو گیا اور آج تمام دنیا کی عورتیں ہیں کہ میرے خلاف اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ محض اس لیے کہ میں ان کی غیر اخلاقی کمزوریوں کو کیوں بیان کرتا ہوں۔ اب بتائیے ایسے حالات میں ''مسیحا'' کے لیے کیسے مضمون لکھوں اور وہ بھی مسلسل۔ تو میں عرض کروں کہ اب کچھ دن آپ مجھے ملا رموزی کے عوض ایک ماہوار رسالہ سمجھ لیجیے اور میرے اندر شائع ہونے کے لیے ایک مضمون لکھ دیا کیجیے، اللہ بھی اجر دے گا اور میں بھی شکر گزار ہوں گا بھلا ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ مضمون کے لیے مجھے خط پر خط بھیجتے رہیں مگر نہیں بھیجتے تو خمیرہ مروارید، حبِ جواہر اور یاقوتی۔ ارے بھئی جانے دو کچھ تیتر اور طاؤس ہی ذبح کر کے بھیج دیا کیجیے تاکہ میرے دل و دماغ کی جوانی قائم رہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں دل و دماغ کی جوانی کے تمام مواقع اور محرکات یا تو مکروہ، معیوب، غیر مباح قرار دے دیے گئے ہیں یا غیر شائستہ اور مخربِ اخلاق کہے جاتے ہیں۔ حالانکہ جوانی انھیں اعمال و محرکات میں ہے جن کو جماعت نے مکروہ اور غیر شائستہ قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ نقب زنی اچھی چیز ہے اور شراب نوشی میں دل و دماغ کی جوانی ہے، مگر ہاں جس قوم میں عشق و محبت کی زندگی نہ ہو اور شائستہ محبت کے مواقع بند ہوں، اس میں نہ زندگی ہو سکتی نہ خوش فکری و خوش ذوقی۔ جس جماعت کی شعری زندگی اور شاعرانہ تخیل افسردہ، ناکام اور ہجر و فراق کے جذبات سے آگے نہ جا سکی ہو، جس کے شعراء کے تخلص یاس، حسرت، زخمی، وحشی، مجنوں ہوں اس قوم میں زندگی، جوانی، امنگ، ترنگ، مستی، سرجوشی کہاں سے آئے گی۔ جس قوم کے شعرا، دفتروں کے محرر چھٹی جماعت تک کے تعلیم یافتہ اور منشی جی قسم کے

بوڑھے ہوں اس میں بلند نظری اور ذوقِ سلیم کے عوض رات دن آہ وزاری، گریہ وفغاں کے سوا اور کیا ہوگا؟۔

دیگر احوال یہ ہے کہ میں جس وقت یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اس وقت میرے دماغ پر بقر عید کے اثرات ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا تہوار ہے، مگر عالم یہ ہے کہ عید کے تیسرے دن سے جس مسلمان کو دیکھیے اتنا خشک، اتنا متین، اتنا سنجیدہ اور اتنا فکرمند ہو جاتا ہے گویا اس کے خاندان میں کبھی کوئی خوشی آئی ہی نہ تھی۔ وہ جو عید کے دن مبارک سلامت کے معانقے ہوتے ہیں، اگر تیسرے دن کے بعد کوئی معانقہ کرے تو گدھا سمجھا جاتا ہے۔ پس جس قوم کے تہوار بھی اس درجہ افسردہ ہو کر منائے جاتے ہوں، اس کے ہاں محنت، جفاکشی، بہادری، عالی حوصلگی اور فیاضی نہ ہوگی کہ یہ تمام قوتیں مسرت، خوش دلی، خوش فکری اور دماغ کی جوانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اچھا تو اب آپ اس قوم کی اصلاح یوں کیجیے کہ اپنے ہاں آنے والے مریضوں کا نسخہ یوں لکھا کیجیے:

ھو الشافی

گاؤزبان، عناب، تخم خطمی، عشق ومحبت، ظرافت، گل نیلوفر، بنفشہ تفریح، مذاق دل لگی، شربت بزدری، خوش لباسی، قہقہہ، روزانہ غسل تخم کاہو۔ شب درآب تر کردہ وصباح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند۔

پس اگر آپ نے اس افسردہ، مایوس، متین اور سنجیدہ قید کے مریضوں کو یہ مجرب، مقوی اور ''مسہی'' نسخہ بیس برس پلا دیا تو پھر دیکھ لیجیے گا کہ اس کے زندہ رہنے، طویل عمر پانے اور محنت برداشت کرنے کی بے شمار قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ اور ہاں آخر میں ذیل کا پرہیز بھی لکھ دیجیے گا یعنی ہر مریض ان اشیاء سے ڈرتا ہے:

''تیل، ترشی، ہر قسم کی دال، بدصورت بیوی، مفلس سسرا، تاریک مکان، گندی ہوا، آج کی اردو غزل، رُلانے والی قومی نظم، کمزور جانور کا گوشت، امیر لوگوں کے معتبر ملازمین، اور خدام، اور موٹر ڈرائیور، ہر قسم کے پرائیویٹ سکریٹری اور خاندان کے بڑے بوڑھوں سے''۔

پس جو مریض ان چیزوں سے پرہیز کریں گے، ان کی صحت ہمیشہ جان رہے گی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے رسالہ ''مسیحا'' کو جس جذبہ سے نکالا ہے، خدا اس میں برکت عطا فرمائے۔ بس ایک بات غلط کی یعنی جن لوگوں نے آپ کے رسالہ پر اعتراضات کیے ان کا جواب دیا۔ یہ بہت بڑا سہو ہے، خطا ہے اور گناہ ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہندستانی لوگ ہیں غلام اور غلامی کے خواص یہ ہوتے ہیں پست خیالی، کم ظرفی، تنگ دلی، بغض و کینہ، حسد اور عیب جوئی۔ یہی وہ خواص ہیں جن کی وجہ سے آج ملا رموزی ایسی قوم کو بروقت ہنسانے اور جوان رکھنے والا انشاء پرداز مالی تباہیوں سے برباد ہو رہا ہے۔ محض اس لیے کہ قوم کی فطرت غیر فیاض اور غیر حوصلہ مند ہے، اس لیے آپ یہ مذکورۂ بالا نسخہ ضرور پلاتے رہیے۔ مجھے تو میرا وہ عشق کافی ہے جو غزل بن کر سارے ہندستان کو جوان بنا رہا ہے اور اردو سے رُلانے والی غزلوں کو تباہ کر رہا ہے۔ امید ہے کہ آں محترم بعافیت ہوں گے۔ ہاں بھئی! اگر آپ کو شکار کا شوق ہو تو پچاس ساٹھ طاؤس مار کر مجھے روزانہ بھیج دیا کیجیے۔ مجھے ان کے گوشت سے عشق ہے، مگر الحمد للہ تمام عمر میں دو چار مرتبہ سے زائد کبھی نصیب نہیں ہوا۔

ہو سکے تو وہاں کے تمام شکاری بھائیوں سے میرا درجہ بدرجہ سلام کہہ دیجیے گا۔ شاید ان میں کوئی بامروّت اور فیاض شکاری نکل آئے۔ آئندہ جو رائے عالی ہو تعمیل کی جائے۔ اب مضمون کی طرف سے اطمینان رکھیے۔ بچوں کو پیار۔

◆◆◆

(16)

ایڈیٹر صاحب ''خیام'' لاہور کے نام

دلنواز، دل پسند، دلچسپ، دل کشا، دلربا، دلگیر اور دل خوش کن صورت کے کاغذی غلاف میں ''خیام'' کا ''سال تمام کن نمبر'' ملا۔ ڈاکخانہ کے قاعدہ کے موافق اس غلاف کا منہ کھلا ہوا تھا، اس لیے راستہ میں بڑی آسانی سے اس کو کسی نے چرالیا، جس سے یقین ہے کہ اسی طرح آپ کے کئی پرچے چوری ہوگئے ہوں گے۔ اس قسم کی چوری اور پرچوں میں بھی ہوتی ہے، جس کی شکایات ڈاکخانوں میں بھی ہوئیں اور مضامین کے ذریعہ بھی ظاہر کی گئیں لیکن یار لوگ باز نہیں آتے۔ اب اس چوری کے اسباب یہ ہیں کہ ہندستانیوں میں منشی جی کے درجہ تک تعلیم ہے اور تعلیم بھی اتنی کم ہے کہ دماغ بھی نقشہ نویسی، قانون گوئی، عرضی نویس، خزانچی، تحویلداری، تا کہ داری اور کمپاؤنڈری سے اونچا نہیں ہوسکتا لہٰذا ایسی چوری اونچی تعلیم کے لوگ نہیں کرتے اور جو کہیں اونچی تعلیم کے لوگ بھی ایسی چوری میں مبتلا نظر آئیں تو تاڑ جائیے کہ ہندستان میں گیہوں، چاول چاہے کتنے پیدا ہوں مگر ہندستانیوں میں فاتح قوم کا لباس اور طرزِ زندگی اختیار کرنے سے کافی افلاس موجود ہے۔ بھلا جب ایک ہندستانی سو روپیہ ماہوار پر پچاس روپیہ کا سوٹ پہنے گا اور بال بچوں کو بھی پالے گا تو اس کے پاس بھاری نمبر خریدنے کے دام کہاں سے آئیں گے؟ اس لیے

رسالوں، اخباروں اور کتابوں کے چوروں کو برا نہ کہیے بلکہ اس جدید تعلیم و تربیت کو بُرا اور ناقص کہیے جو غیر ملکی زندگی اختیار کرنے پر مستعد بناتی ہے اور یورپین تمدن کے باعث غلامی زدہ ہندستانیوں میں فارغ البالی کا نام تک نہیں۔ اب طرفہ مصیبت یہ کہ ہندستانی اسی قلیل آمدنی پر گرمی میں پہاڑوں پر رہنے، چشمہ لگانے اور نازک اور حسین گھڑی باندھنے پر حریص ہوتے جارہے ہیں۔ اب ذرا اور انتظار کیجیے کیونکہ عورتوں کی ایک فوج اور تیار ہو رہی ہے۔ جب یہ برسرِ کار آجائے گی تو ہندستان کے افلاس میں چار تو کیا آٹھ چاند دور سے نظر آئیں گے کیونکہ تنخواہ کا مقرر کرنا تو ہر حال میں افسروں ہی کے اختیار میں ہوگا اور وہ بی۔ اے پاس ہندستانی ہی نہیں جو تنخواہ سے زیادہ خرچ نہ کرے۔

مجھے اس معاملہ میں ہندو بھائیوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی بے حد پسند ہے اور سچ پوچھیے تو کسی زمانہ میں یہ زندگی مسلمانوں کی تھی، یعنی کھادی اور کھدر کا سادہ لباس، روزانہ غسل اور سادہ غذا، مگر آج ہندو قوم لباس اور خوراک سے کئی کروڑ روپیہ نقد بچارہی ہے اور بینکوں میں جتنا روپیہ ہندو بھائیوں کا جمع ہے بدنصیب اور بے عقل مسلمانوں کا نہیں، اسی لیے مسلمان کا ہر کام چندہ سے ہوتا ہے، مگر ان کو شرم نہیں کہ وہ چندہ کے رسمی لفظ سے صحیح معنی کا بھکاری اور گدائی پیشہ انسان بن رہا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں یہ چھٹی ساتویں جماعت کی لڑکیاں بھی غضب کی فینسی لڑکیاں بنی چلی جارہی ہیں اور بے حس۔ بے ہوش اور بے خرد والد صاحب خوش ہیں کہ میری لڑکی ''ترقی یافتہ لڑکی'' اور ''روشن خیال لڑکی'' ہوگئی ہے حالانکہ ترقی یافتہ اور روشن خیال لڑکی وہ ہوتی ہے جس کے اندر لباس اور سنگھار سے زیادہ عقل و علم ہو۔ اب جو ''خیام'' کا ''سال تمام کن نمبر'' آیا تو اس کے غلاف کی رنگینی ہی سے میری منجھلی بیوی نے اس کو گھورا، مگر میں ہوں اسی بیوی کا شوہر جو مغرور و متکبر نہ ہو جو میری قدر دان ہو اور وفادار، اس لیے میری ساری ڈاک کا انتظام میں نے اپنی چھوٹی بیوی کے ذمہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی غریب نے کل شام کو روزہ افطار کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ:

> ''کیا جس طرح موتمر فلسطین قاہرہ میں اس وقت منعقد کی گئی جب شورش پسند فلسطینی عربوں کی حجامت شروع ہوگئی، اسی طرح آپ بھی ''خیام'' کے ''سال تمام نمبر'' پر

اس وقت کچھ لکھیں گے جب اس پر لکھنے کا وقت گزر جائے گا؟"

آپ جانتے ہیں کہ میں تقریباً چھ سال سے اپنی چھوٹی بیوی کا فرماں بردار ہوں، فوراً ہی تعمیل کی اور میری ویسے بھی رائے ہے کہ ہر دو تین بیوی والے شوہر کو چاہیے کہ وہ کم سے کم رمضان کے مہینہ میں بیویوں کی فرماں برداری اور ناز برداری سے منہ نہ موڑے۔ اب جو آپ کا یہ نمبر دیکھا تو اس کے سرِ ورق کی تصویر نے اس کے کارکنوں کے حسنِ ذوق کی توقیر بڑھادی۔ اس تصویر میں جو کچھ ہے وہ ہندستانی پن ہے۔ جو حضرات کہ یورپ کی تصاویر سے اپنے پرچوں کو مزین اور منور فرماتے ہیں، وہ کم نظر لڑکوں کو چاہے خوش کر لیں مگر وہ بالغ نظر ہندستانیوں کو خوش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو خصوصیت اور نظر کی پسندیدگی ملکی اور وطنی چیز میں ہوتی ہے وہ غیر ملکی میں نہیں، اسی لیے میں نے چاروں شادیاں وطن اور ملک ہی کی لڑکیوں سے کیں ورنہ مجھے بھی فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی قدرداں لڑکیاں مل رہی تھیں اور یہ اس لیے کہ یورپ کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ اس دنیا کے مشہور عملی لوگوں سے شادی کرنا اپنی عزت و شہرت کا سبب سمجھتی ہیں، لیکن ہندستان کی بعض فینسی اور پاؤڈر لگانے والی لڑکیاں صرف کھلنڈرے، دولت منداور عہدہ دار شوہر کو پسند فرماتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت منداور عہدہ دار قسم کے شوہر میں قدردانی اور بیوی شناسی کی قابلیت تو ہوتی نہیں، وہ شادی کے چند دن بعد ہی بیوی کو طاق پر رکھ کر کراچی، مدراس، دہلی، کانپور اور الٰہ آباد کی طرف جا کر کسی اور سے محبت شروع کر دیتا ہے اور یہ بیٹھی گنڈے تعویذ فرماتی رہتی ہیں اور یہ میرا تجربہ ہے کہ مربھی جائے تو گنڈے تعویذ اور عملیات سے کچھ نہیں ہوتا۔ سو آپ کے "سال تمام نمبر" کی یہ ہندستانی اور ایشیائی حسن لیے ہوئے تصویر اپنے جمالِ دوشیزدگی کے اعتبار سے اس درجہ بھی لطیف و جمیل ہے کہ اس پورے ورق کو نوچ لینے کو جی چاہا، مگر وہ اللہ کی بندی سامنے ہی بیٹھی رہی، اس لیے نوچ کر، بنوا کر، دیوار پر لٹکانے اور روزانہ گھورنے سے محروم رہا۔ اس کے بعد میں نے مولوی ماہر القادری مدظلہ کی نظم کو پڑھا۔ مولوی صاحب ممدوح کے کلام میں اُمنگ، مستی، جوانی اور زندگی کا جوش ہے اور آج مسلمان قوم کو اُمنگ اور جوش کی یوں ضرورت ہے کہ افلاس اور غلامی کے صدمات نے اس کی عملی کائنات کو برباد کر دیا ہے، اس لیے میں غزل اور نظم کے اس کردار کو قوم اور ادبِ اردو کے حق میں زہر سمجھتا ہوں، جس میں ہجر و فراق اور بے وفائی کے صدمات کی

آہیں اور فریادیں ہوں اور ہجر و فراق کا پرانا غزلی کردار عقلاً اور فطرتاً بھی غلط ہے۔ یعنی اگر ایک مرد ایک صحیح الدماغ عورت سے محبت کا اظہار کرے تو یہ عورت کی فطرت ہی نہیں کہ محبت کرنے والے کو کوتوالی میں بند کرادے اور رقیبوں کے ساتھ سنیما کا تماشہ دیکھتی رہے اور محبت کرنے والا حوالات میں بیٹھا ہجر و فراق اور درد و گداز کے اشعار کہتا رہے۔ یہ کردار تو اس وقت کا ہے جب ہندستان میں ریل گاڑی نہیں تھی، اس لیے ملاقاتیں محال تھیں۔

افسانہ نگاری کے عنوان سے میں یوں گھبراتا ہوں کہ اردو کی بدقسمتی سے آج کل اردو کے چند پرچوں میں وہی اہلِ قلم زیادہ ہیں جو ہنوز بقلم خود صاحبزادے دھرے ہوئے ہیں، اس لیے ان کے افسانوں میں زیادہ حصہ یورپی تراجم کا ہوتا ہے جو ہندستانی فطرت و مزاج اور آدابِ عشق و محبت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا اور جو طبع زاد افسانے تحریر فرمائے جاتے ہیں ان میں نوجوان ہونے کی وجہ سے حسن و عشق کے فطری اور نازک جذبات، خواص اور واردات نہیں دکھا سکتے۔ ایسے نوعمروں اور نوخیزوں کے افسانوں کی کل کائنات صرف کالج کی لڑکی اور کالج کا لندن رسیدہ لڑکا ہوتا ہے۔ ایک کوٹھی، پائیں باغ، سنیما میں ملاقات اور لاحول ولاقوۃ ہاں میرے دیرینہ ملاقاتی منشی پیارے لال شاکر عرف ''پلشم'' کا افسانہ صحیح افسانہ ہے۔ اس میں ہندستانی خواص و حقائق کا جو ذخیرہ ہے وہ اپنی جگہ فٹ ہے اور ایسے تمام مضامین اور افسانے صحیح اور لاجواب ہیں جن کی بڑی مقدار آپ نے غضب کی محنت سے اس نمبر میں جمع کر دی ہے۔

میں جن مضامین میں کھو گیا وہ اس نمبر کے سیاسی اور بین الاقوامی معلومات لیے ہوئے مضامین ہیں۔ عمر خیام کی تصویر جس میں اس کی محبوبہ سو رہی ہے، اس درجہ قابلِ قدر ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ہندستان کی تمام محبوبہ نام کی لڑکیوں کو بس اسی طرح دیکھا جائے جس طرح اس تصویر میں دکھایا گیا ہے، یعنی سب کو سلا دیا جائے۔ خاص کمال یہ ہے کہ آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار کا سال تمام نمبر اس اہتمام سے شائع کیا ہے جو ایک ماہانہ رسالہ کا سال تمام نمبر بھی ہو سکتا ہے اور نظم اور مضامین کی کثرت سے یہ نمبر ایک مستقل کتاب بھی ہے۔ اب سوال ہے اس کی خریداری کا۔ سو قیمت بھی آپ نے کلہم اجمعین آٹھ آنہ رکھی ہے اِلّا ابلیس!

خاص الخاص خوبی اس کی بے حد روشن لکھائی، چھپائی، حسین کاغذ، صاف اور روشن تصاویر

ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی نہ خریدے تو خدا کرے اس کے گھر میں آٹھ آنہ سے زیادہ رقم کی چوری ہو جائے اور چور نہ کوتوال کے ہاتھ آئے اور نہ عامل کریم الدین صاحب عملیاتی کے۔

اب اس سے زیادہ میں اس نمبر پر یوں نہیں لکھتا کہ جب سب کچھ ملاّ رموزی ہی لکھ دے گا تو خریدار کیا پڑھیں گے؟ البتہ اتنا ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی طرف کے مسلمانوں کے کان کھول کر کہہ دیجیے، خاص کر ان سے کہہ دیجیے جو وزنی عمامے باندھ کر، عبا پہن کر وعظ کہتے ہیں، نماز پڑھاتے ہیں، خطبہ پڑھتے ہیں، اخبار چھاپتے ہیں یا لیڈری کرتے ہیں کہ دیکھو بھائی رمضان میں روزہ رکھ کر دو باتوں کا لحاظ رہے۔ ایک تو مزاج میں غصہ، تاؤ، خفگی اور جھنجلاہٹ پیدا نہ ہو، عورتوں اور بچوں کو کھانے کو نہ دوڑو۔ دوسرے عید کے لیے قیمتی لباس نہ خریدو ورنہ جہنم کا حوض بنائے جاؤ گے، جس میں ان اطالویوں، جاپانیوں اور سوڈٹین جرمنوں کے لیے ایندھن جلایا جائے گا، جنھوں نے فوجی قواعد کو توڑ کر بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں، بوڑھوں پر مظالم ڈھائے ہیں۔ اور ہاں روزہ کے بعد رات بھر کھانے اور مرغن غذاؤں اور قیمتی مقویات سے بھی منع فرما دیجیے گا کیونکہ روزہ کا مقصد ہی معدہ کو خالی کرنا ہے، لبالب کرنا نہیں۔ والسلام۔

◆◆◆

(17)

ایڈیٹر صاحب ''ارمغاں'' دہلی کے نام

السلام علیکم، رسالہ ''ارمغان'' دہلی کے ایڈیٹر صاحب!

آج رسالہ ''ارمعان'' دہلی کے اندر رکھا ہوا آپ کا وہ خط ملا جس کی سطر سطر سے اسلامی خلق، اسلامی انکسار، اسلامی تہذیب اور مشرقی آداب کی دلنواز جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس لیے سو کام چھوڑ کر جواب دینے کو جی چاہا۔ مگر دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ رسالہ ''ارمغان'' دہلی پر رائے لکھو، بس اسی سے جھجک کر رہ گئے کیونکہ آج کل چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے علی گڑھ کی تعلیم اور اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ جب کسی رسالے، اخبار یا کتاب پر رائے لکھو تو ایمان، عقل، انصاف اور دیانت کو چھوڑ کر بس یہ لکھ دو کہ سبحان اللہ اور ہماری فطرت کچھ اس درجہ بھی ''ایمان والی'' واقع ہے کہ بغیر سچ لکھے رہا نہیں جاتا اور جب سچ لکھتے ہیں تو ''ہندو مسلم فساد'' کا خطرہ پیدا ہوتا ہے اور صاحب دنیا کچھ کہے ہم اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فسادات میں کوتوالی تک جانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

دیگر احوال یہ ہے کہ جس خط کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی یہی ہوا کہ ہم نے ایمانداری سے جو کچھ لکھا تھا ایڈیٹر صاحب نے وہ تو دیا کاٹ اور جو بے ایمانی سے لکھا تھا وہ دیا

چھاپ اور جو غلط اور خلاف واقعہ تحریریں شروع کردیں تو پھر یہ ہمارے ساتھ چوبیس گھنٹے رہنے والی ننھے میاں کی والدہ سے یہ جھگڑا کون مول لے اور وہ سچ تو کہتی ہیں کہ جب آپ میری کمزوریوں پر لکھنے سے چوکتے نہیں تو پھر آپ کے یہ رسالے وسالے اور ایڈیٹر وڈیٹر کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہاں تو دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے چونکہ بے حد شریفانہ خط لکھا ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا۔

اے صاحب! آج کل یہ صحافت اردو میں جو چند ''والیٹر قسم کے ایڈیٹر'' پیدا ہو گئے ہیں تو یہ افلاطون زادے کرتے یہ ہیں کہ ہمارے نام یکا یک اپنا اخبار یا رسالہ یوں جاری کر دیتے ہیں کہ ہمیں براہِ راست ایک کارڈ بھی نہیں لکھتے، بس صرف پرچہ جاری کر دیتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ بس جیسے ہی ہمارا پرچہ ملا رموزی صاحب کے پاس پہنچا وہ ہاتھ جوڑ کر اسی وقت مضمون بھیج دیں گے۔ لاحول ولاقوۃ۔ تو گویا آج کل ان لونڈوں کے نزدیک مضمون نگار کی بس یہ قدر و منزلت ہے کہ اسے ایک خط لکھنا بھی جاگیر دینا سمجھتے ہیں۔ لاہور، بلند شہر، علی گڑھ، دہلی اور غیر شہروں سے بعض نہایت خوبصورت رسالے اور اخبارات ایسے آرہے ہیں جن کے ایڈیٹروں نے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ چونکہ ایڈیٹروں کی اس حرکت کو ہم مضمون نگاروں کی توہین بالقصد بذریعہ اخبار بغیر خط بطریق تکبر سمجھتے ہیں اس لیے واللہ ایسے تمام پرچے ہم اپنے ہاں کے ''اندھے حافظ جی'' کو دے دیتے ہیں، جو انھیں چوک کی ''طلسم ہوشربا والی دکان'' پر لے جا کر غنڈوں سے پڑھوا کر سنتے ہیں اور اُلٹی ہمیں عمدہ عمدہ دعائیں دے جاتے ہیں اور واللہ کہ اگر بغیر خط کے ہمیں کوئی خزانہ بھی روانہ کر دے تو ہم اس زور سے اٹھا کر اس کے منہ پر رسید کریں کہ تیس دن تک ڈاکٹر انصاری صاحب کا علاج کراتے پھریں، مگر لاحول ولاقوۃ دیکھیے بات پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اس لیے:

دیگر احوال یہ ہے کہ بس علومِ اسلامی یا علومِ مشرقی کی تعلیم نہ ہونے سے ہندوستانیوں کے اخلاق میں غرور، خود پسندی، بے ایمانی، خود غرضی کی جو ذلیل قوتیں پیدا ہوگئی ہیں یہ ان ہی کا اثر ہے کہ آج کل کی دوستی میں حسنِ وفا، ثبات، پختگی، ہمدردی اور احسان و خدمت کا پتہ نہیں اور اخباری دوستوں میں تو بجز ''تجارتی دوستی'' کے اور کچھ بھی نہیں اور ہم نے تو ان اخباری دوستوں کو اتنا آزمایا ہے کہ آپ دس سال تک بھی نہیں آزما سکتے۔ بس یہ تو اس وقت تک کے دوست ہیں

جب تک کہ آپ ان کے پرچہ میں مفت اور کثرت سے مضامین لکھتے رہیں تو ان لوگوں کی اسی حرکت سے اردو میں بلند پایہ مضمون نگار پیدا نہیں ہوتے۔ پھر چونکہ صحافتِ اردو پر کوئی احتساب اور نگرانی نہیں، قوم میں علم اور صحیح واقفیت اور اصول پسندی نہیں، اس لیے ہر معمولی سا مضمون نگار چند دن کی مشق کے بعد کسی اخبار یا رسالہ کا ایڈیٹر بن جاتا ہے۔ غرض قصہ کون کہے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ہمیں جو بات آپ کے رسالہ میں سب سے پہلے پسند آئی وہ آپ کا ترکی قسم کا نام ہے یعنی ''اشرف صبوحی'' کیونکہ ہمارے چھوٹے بھائی کا نام بھی ''صادق صحی'' ہے اور دوسرے کا ساجد وقفی'' اور یہ نام ہیں ترکی قوم کے مسلمانوں سے ملتے جلتے، اس لیے ہمیں بہت پسند ہیں اور دیکھیے کہ ترکوں کے ناموں سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ ترکوں کے جتنے نام آپ دیکھیے گا اس قدر شاندار اور حسین ہوں گے کہ سبحان اللہ اور اسی سے یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ ترکی قوم کے تمام افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور اسی لیے ان کے بچوں کے نام نہایت علمی اور ادبی ہوا کرتے ہیں۔ اور ایک یہ اپنے غلام ہندستان میں رکھے جاتے ہیں جسے جہل اور ''غنڈے پن'' کی علامت نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً شیخ محمد گھسیٹا، بدھو، اچھن، مولا بخش، چین الدین۔ اب غور فرمایئے کہ یہ تمام نام کس درجہ بے معنی اور مہمل ہیں اور ایسے ہی ناموں سے اقوام وافراد کی ذہنی پستی اور جہالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ کے رسالہ کی لکھائی، چھپائی پسند آئی... فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ ہر نظر فریب مطالعہ سے خوش ہوتی ہے۔ اس رسالہ کا ''قد وقامت'' بھی موزوں ہے... یہ نہیں کہ اس عہد علم وترقی میں ایک گز لمبا چوڑا رسالہ چھاپا جائے۔ پھر اس رسالہ کی تصاویر پسند آئیں اور یہ اس لیے کہ آپ نے بجائے رنڈیوں کی تصویریں چھاپنے کے مشاہیر اور اربابِ کمال کی تصویریں چھاپی ہیں اور یہ آج کل دوسرے رسالے نہایت ہی خوبصورت اور حسین عورتوں کی تصویریں چھاپتے ہیں تو ایک طرح سے بداخلاقی کے ذوق کو رواج دیتے ہیں کیونکہ ابھی قوم کے مذاق میں اتنی بلندی اور علمیت تو ہے نہیں کہ وہ رنڈیاں ایسی رنگین اور عریاں تصویروں میں فنی نکات واثرات کی تلاش کرے۔ بس اس سے ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایسی عریاں تصویریں رسالوں سے نکال کر دیواروں پر لٹکا دیتے ہیں اور دن بھر انھیں کھڑے غور سے دیکھا کرتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ بس تھیٹر اور

سنیما جانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے مگر آپ کی تصاویر سے یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا چاہتا ہے کہ میں بھی دنیا میں حضرت مولوی نذیر احمد مرحوم کی طرح صاحب کمال وثروت بن جاؤں، تو میری تصویر بھی اسی طرح رسالوں میں شائع ہوگی۔

پھر آپ کے مضامین کی ترتیب پسند آئی کہ آپ نے چھوٹے چھوٹے مگر متعدد اور مختلف مضامین اسی چھوٹے سے رسالہ میں کافی سے زیادہ جمع فرما دیے ہیں اور لیاقت کی بات بھی یہ ہے کہ چھوٹے مضامین میں بڑی بات کہی جائے اور آسان عبارت میں موٹا سا علمی نکتہ سمجھا دیا جائے۔

پھر آپ کے ایسے عمدہ رسالہ کی اس بات سے بہت حیرت ہوئی کہ آپ فقط ''مبلغ 13 آنہ'' میں سال بھر تک اس رسالہ کو خریداروں تک پہنچاتے ہیں، کمال کرتے ہیں یعنی صرف مبلغ ایک روپیہ سالانہ چندہ رکھا ہے۔ بھئی اگر اب بھی اسے قوم نہ خریدے تو سمجھ لیجیے کہ ابھی ہندستانیوں میں تعلیم اور معاشیات کی نکتہ سنجیوں کی خاصی کمی ہے۔ ہاں اتنے معمولی چندہ میں تو اس رسالہ کو بنیے اور بقال ایسے بخیل لوگ تک خریدنے پر تل جائیں گے، پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنے ہی چندہ میں ہم اسے باتصویر بنائیں گے۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔

پھر آپ کے رسالہ کی دو باتیں ناپسند آئیں۔ ایک یہ کہ کاتب کو تنہائی میں ڈانٹ دینا اور کہنا کہ دیکھ بھائی مسلمان! آئندہ کتابت میں صحت کا کافی لحاظ رکھنا اور بعد کتابت کاپی کا مقابلہ اور پتھر پر بھی صحت کا خیال رکھنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض مضامین کی زبان میں اغلاط ہیں اور جب مضمون میں زبان، محاورے اور قواعد کی اغلاط رائج اور شائع ہوں گی تو اس سے زبان اور ادب کو نقصان پہنچے گا اور ایسا رسالہ اصولاً ادبی رسالہ نہ کہلائے گا اور علمی کہنا تو بالکل فضول ہو جائے گا۔

باقی سب خیریت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کے رسالے اور حوصلہ کو ترقی اور حسنِ قبول عطا فرمائے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ مضامین میں زبان اور قواعد کی اغلاط کی خود اصلاح فرما دیا کیجیے کیونکہ رسالہ نکلتا ہے دہلی سے اور یہاں کی زبان کو بے حد صحیح ہونا چاہیے۔ بے ضرورت انگریزی الفاظ بھی نکال دیا کیجیے گا اور دیکھو بھئی جو آپ کو کہیں خواجہ حسن نظامی صاحب مل جائیں تو ہمارے بہت بہت اور درجہ بدرجہ سلام کہہ دینا۔ ◆◆◆

(18)

ایڈیٹر صاحب رسالہ ''ارمغان'' دہلی کے نام

حضرت سلامت ایڈیٹر صاحب ''ارمغان'' دہلی کو بعد سلام مسنون کے معلوم ہو کہ الحمد للہ تادم تحریر ہٰذا یہاں پر ہر طرح خیریت ہے۔ صرف چار مہینہ سے تنخواہ نہیں ملی ہے اور اسے خیریت سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ ملازم رکھنے والے نے ہمارے یا آپ کے ہاتھ تو جوڑے نہ تھے کہ جناب آپ تو میری ملازمت اختیار ہی فرما لیجیے بڑا احسان ہوگا، اس لیے ملازمت کے معنی ہوئی ''اپنی حماقت'' اور وہ جو کہا ہے نا کہ: ''خود کردہ را علاجے نیست!'' سو اس لیے آپ کی خیریت درگاہ خداوند کریم سے ''کبھی کبھی'' نیک چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی ہماری خیریت کے معاملہ میں ایسا ہی عمل فرماتے ہوں گے۔ کیونکہ آج کل کا ہے زمانہ خود غرضی کا۔ دور کیوں جاتے ہیں آپ یہ اپنی برادری کے برادران ہی کے برتاؤ کو دیکھ لیجیے کیا؟ یعنی یہی اخبار نویس برادری آج کل جس ڈھنگ سے چل رہی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، یعنی اگر آپ مضمون نگار کی حیثیت سے اس برادری میں داخل ہو جائیں تو یہ ''اخباری برادر'' آپ کے مغز کا ایک ایک حصہ پانی کر کے اس سے اپنے اخبار کی زینت بڑھائیں گے اور ہر وقت آپ کو خوشامد سے بھرے خطوط

لکھنے پر تیار رہیں گے بشرطیکہ آپ بہتر سے بہتر مضمون انھیں مفت دیتے رہیں، لیکن اگر آپ نے ان سے معاوضہ کا مطالبہ کیا تو سمجھ لیجیے کہ آدھی دوستی اُس وقت سے ختم اور جو خدانخواستہ ان اخباری بھائیوں نے آپ کو" تجارتی اغراض" کے تحت معاوضہ دینا منظور کرلیا تو پھر آپ کے ساتھ برتاؤ یوں شروع ہوگا گویا آپ ان کے ملازم اور خانساماں ہیں۔ اب اگر اس صورت میں آپ کی کسی سے چل جائے تو پھر ان اخباری بھائیوں کے اخبارات آپ سے مکہ شریف تک دور رہیں گے۔ آپ کا کوئی ایسا مضمون ہرگز نہ شائع فرمائیں گے جس میں آپ نے اپنے کسی دشمن کا توڑ کیا ہو محض اس تجارتی خوف کے تحت کہ کہیں آپ کا دشمن ان کے اخبار کے پیچھے نہ پڑ جائے اور جو ان کے اخبار پر کوئی حملہ کردے تو یہ آپ کو اس کے خلاف لکھنے پر ہاتھ جوڑ جوڑ کر آمادہ کریں گے اور خود تو اس کے خلاف ایسا لکھیں گے کہ گالیوں کا فن بھی توبہ کرلے۔ استغفراللہ کیا فرماتے ہیں آپ ہم اور ایسے اخبار نویسوں سے صلح کرلیں۔ اے صاحب بزدل کہنا بزدل جو کبھی آپ ہمیں آنکھ مارتا دیکھیں۔ لاحول ولا کوئی بات بھی ہے وہ تو کہیے کہ یہ بھی خدا کا فضل ہی ہوا کہ ہمیں اس بظاہر مصلح قوم برادری کے ایسے تلخ اور منافقانہ تجربات ہوگئے اور یہ جو آپ کو آج لکھ رہے ہیں تو کیوں؟ بس اسی لیے کہ وقتِ ضرورت کام آئے اور آنے والے سیدھے سادے نیک دل، وضعدار اور وفادار مضمون نگاروں کے دھوکہ سے محفوظ رہیں۔

صاحبِ عالی! بات یہ ہے کہ ہندستان سے اب جو مذہبی تعلیم فنا ہوگئی ہے تو ظاہر ہے کہ ہندستانیوں کے اخلاق وخواص کو بھی بدلنا چاہیے اور دوستی، وفاداری رواداری، اخوت، طرفداری، حمایت، وضعداری اور جان نثاری کے جن بلند، برتر جذبات کو مسلمانوں کی دینی تعلیم ابھارتی اور بیدار رکھتی ہے، اُتنا نہ تو یہ" پانا، جانا" کی کتاب ابھارتی ہے اور نہ یہ" ایف اے ٹی فیٹ، فیٹ معنی موٹا" والی کتاب۔ کیا فرمایا آپ نے" علم وادب" اے بھائی جان اردو میں علم وادب کیسا؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ کے ملک میں صحیح معنی کے عالم، محقق اور صاحبِ بصیرت لوگ پیدا بھی ہوتے ہیں یا نہیں تو پھر صحافت اردو میں علم وادب کا نام ایک طرح کا مذاق ہے۔ ہاں اگر آپ یورپ، ترکی، ایرانی، عراقی اور مصری اخبارات اور رسائل کے مقابل رکھ کر پڑھیں تو پتہ چلے کہ صحافتِ اردو میں کس حیثیت کا علم وادب پیش کیا جارہا ہے۔ بس صاحب خدا کا نام لیجیے، بس یوں

سمجھ لیجیے کہ صحافتِ اردو میں ''الفاظ کا ذخیرہ'' بہت خاصا جمع کیا جا رہا ہے، رہے علوم یا ٹھوس تحقیق تو اس کا وجود نہ اخباراتِ اردو میں نہ رسائل اردو میں، مگر اس کے اسباب ہیں چنانچہ:

نمبر ایک یہ کہ اخبار ''الہلال'' کلکتہ اور رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ کو ملک میں سب سے سوا، اعتبار، اقتدار اور وقعت کیوں حاصل ہے؟ بس اس لیے کہ ان پرچوں نے جو بلند مضامین پیش کیے؟ محض اس لیے کہ ان کے ایڈیٹروں نے واقعی معنی کے علوم حاصل کیے اور اس طرح کہ ان علوم کو باقاعدہ تکمیل کی، پھر مطالعہ کو وسعت دی نتیجہ یہ ہوا کہ نام پایا، بخلاف ان کے یہ پڑی ہے آپ کے سامنے ساری صحافتِ اردو یا اردو کے اخبار اور رسالے۔ اب معلوم فرما لیجیے کہ کیسے کیسے ماشاء اللہ اور چشم بددور قسم کے علما اور محقق اس میں کام کر رہے ہیں؟ تو بس پھر عوام کی بدمذاقی کا رونا رونا اصولاً غلط ہے، اس لیے کہ بھائی جان عوام تو تابع ہوا کرتے ہیں خواص کے اور خواص انھیں نہیں کہتے جو موٹر کاروں میں بیٹھ کر سنیما کا تماشہ دیکھنے جاتے ہیں بلکہ خواص انھیں کہا جاتا ہے جو اربابِ فضل و کمال ہوتے ہیں۔

ہاں ہاں مانتے ہیں بھائی کہ اب چند دن سے صحافتِ اردو میں نظری انقلاب عرف طباعتی اور کتابتی رنگینیاں پیدا ہو گئی ہیں، مگر وہ بھی اس قلت کے ساتھ کہ ابھی ان کے وجود کا اقرار کثرت کے مقابل جائز نہیں، مگر لاحول ولا... قصہ کہاں سے کہاں جا پہنچا، تو ہاں ہم نے جو آپ کو عرصہ سے خط نہیں لکھا تو وہ اسی لیے کہ بھائی جان اس اللہ کی بندی نے تنگ کر رکھا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی اللہ کی بندی مخالف ہو جائے تو بس خدا ہی حافظ ہے، اس اللہ کے بندہ کو وہ یاد نہیں آخر کار وہ بے چارہ بادشاہ ایران اسی قسم کی اللہ کی بندی کے معاملہ میں پیرس میں جان گنوا بیٹھا۔ یہ اندور ریاست کے مہاراجہ کا معاملہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ اے صاحب وہ تو جب تک شادی بیاہ میں لڑکے اور لڑکی کی ذاتی پسند اور آزادانہ انتخاب کا طریقہ رواج نہ پائے گا اس وقت تک 95 فیصدی گھرانے ایسے ہی تباہ ہوتے رہیں گے۔

کیا فرمایا آپ نے اخبار نویسی کی تعلیم؟ اے بھائی جان! قسم لے لیجیے ہم سے کہ ہزار بار تو مضامین میں لکھ چکے کہ جب تک ہندستان میں ہندستانی کالج اور یونیورسٹی میں باقاعدہ اخبار نویسی کا نصاب جاری نہ کیا جائے گا، اخبار نویسی کا بی۔اے اور ایم۔اے نہ ہوگا ہندستانی صحافت دنیا

میں کوئی اعتبار اور اقتدار حاصل نہ کرے گا، مگر جناب کہے کون اور سنے کون؟ کیا یہ اسمبلی کے ممبر لوگ۔ بس جانے بھی دیجیے ان لوگوں کا قصہ خواہ مخواہ کچھ کہہ دیں گے تو آپ ہی ہمیں الٹا قائل کرنے کھڑے ہو جائیں گے۔ ارے بھئی ان کا فرض ہے کہ یہ اسمبلی میں چلا چلا کر کہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اخبار نویسی کی تعلیم شروع کرو اور ہم ''نمک'' بنانا شروع کر دیں گے، مگر آپ دیکھتے ہیں اور تو اور وہ حیدرآباد سے آتے ہوئے حضرت سلامت راس مسعود صاحب تک سے اب تک کسی نے اس بات کو نہ کہا۔ خیر وہ تو ہم ہی علی گڑھ جائیں گے تب یہ بات آگے بڑھے گی۔

لیجیے اب ''وہ'' پھر سر پر سوار ہیں کہ جس طرح ہو میری چند باتیں سن لیجیے اور مان لیجیے کہ دنیا کے سارے ٹیلی فونوں میں بیوی ہی ایک ایسی ٹیلی فون ہوتی ہے اور جب سناتی ہے اور جو سناتی ہے فقط یہ کہ روپیہ لاؤ روپیہ۔ خدا جانے اس طبقہ کو دنیا میں کبھی سلیقہ بھی آئے گا یا نہیں۔ بس بات یہ ہے کہ ہندستان کے مرد ہوں یا عورتیں جب تک ادھوری تعلیم پائیں گے اور پائیں گی ایسے ہی رہیں گے اور ایسی ہی رہیں گی۔ بس تو پھر جانے دیجیے ہم ذرا ''اُن'' کی بھی سن لیں، آخر کو جناب کو وہ ہی ہیں کہ کہا ہے۔

◆◆◆

(19)

ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' پشاور کے نام

مجلہ ''ادیب'' پشاور کے تمام ''عید نمبری خریداروں'' کو اللہ کے لکھے پڑھے بندے ملا رموزی کی طرف سے پہلے عید کی مبارکباد پہنچے، پھر سلام مسنون پہنچے اور پھر یہ ''دیگر احوال'' پہنچے کہ مجلہ مصور ''ادیب'' مجریہ شہر پشاور کا عید نمبر ملا۔ وہ شہر پشاور جہاں انگریزی قوم کی بہت زیادہ فوجیں رہتی ہیں اور رہتی چلی جائیں گے جب تک ہندستان پر انگریز بھائیوں کا قبضہ ہے۔ پس الحق کہ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا اور یہ اس لیے کہ شہر پشاور جسے جاہل ہندستانی ''پشور'' اور افغانی لوگ ''پخور'' کہتے ہیں، وہ مقدس و محترم شہر ہے جہاں سے ملا رموزی کے آبائی وطن ''کنٹر'' واقع افغانستان کو راستہ جاتا ہے اور آپ دیکھ لینا کہ جس دن یہ ملا رموزی صاحب شہر پشاور میں پہنچ گئے کہ واہ ملا رموزی صاحب آپ جو سادات کنٹر کے رکن ہو کر پشاوری ہوٹل میں قیام فرما ہیں اور ہم جو اپنے آبائی اور قومی وطن افغانستان کو چھوڑ چھاڑ کر اس پشاور میں پڑے انگریزوں کی ملازمتیں کر رہے ہیں تو آخر ہمارے یہ ''پشاوری غریب خانے'' پھر کس کام کے، جب آپ ہمارے مہمان نہ ہوں؟ اور یہی وہ شہر پشاور ہے جس میں بوڑھوں کو جوان بنا دینے

والے تازہ پھل اور میوے اگر انگریز بھائیوں کے کھانے سے بچ جاتے ہیں تو اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ہمیں اور آپ کو ساری عمر بھی نہیں مل سکتے ۔ تو ان اعتبارات سے ہمیں اس شہر سے جو محبت ہے لندن سے بھی نہیں، اس لیے اب جو سنا کہ پشاور سے رسالہ ''ادیب'' جاری ہوا تو خواہ مخواہ اس سے بھی محبت شروع ہوگئی اور یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کو دنیا کے جس رسالہ سے جتنی محبت زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ اس پر لکھتا ہے۔ اس لیے:

دیگر احوال یہ ہے کہ مجلّہ ادبیہ ''ادیب'' پشاور اپنی علمی و نظری دلفریبیوں کے ساتھ صوبۂ سرحد کے باشندوں کے لیے ایک ایسی دولت ہے جس کے لیے تمام باشندگانِ سرحد کو ''سجدۂ شکرانہ چاہیے'' مغربی اقوام کے ہندستان پر حکمران ہونے کے بعد یعنی آج پورے دو سو برسوں میں علمی و فکری ارتقا نے ذہنی مشاغل کو وہ شباب پہنچایا ہے جو سلاطین مغلیہ کے سلسلۂ حکمرانی میں اکبر بادشاہ غازی کے عہد میں سنا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عہدِ حاضر میں علم و فن کا حصول ہی ایک ذریعہ ہے نجات اور سربلند کا اور ایک سبب ہے علو و کامرانی کا۔ پھر ان علوم کی تحصیل جو وطنی، قومی یا مذہبی کہلاتے ہیں ایک ایسا شرف ہے جو اگر حاصل ہو جائے تو انسانی برگزیدگی بھی اسے حاصل کرنے والے کے لیے خاص ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس زبان کی حفاظت و ترقی اور تبلیغ و تحصیل بھی ہمارے واسطے ضروری ہے جس کے اندر ہماری تاریخ، ہماری قومی روایات اور مذہبی احکام محفوظ ہوں۔ پس مجلّہ مقدس ''ادیب'' کے مقاصد میں باشندگانِ سرحد کے لیے علم و فنون اور ادب و زبان کی تبلیغ و ترویج کا داخل ہونا ایک ایسا مقصد ہے جس کا احترام ہر ہندستانی پر لازم ہے۔

برادرانِ پنجاب نے صوبۂ اودھ کے تمام ''واللہ چنانچوں'' پر جو فضیلت حاصل کی ہے وہ اسی لیے کہ اگر چہ پنجابی بھائیوں کی گھر کی بولی پنجابی زبان ہے مگر انھوں نے کسب فضائل کے لیے زبانِ اردو کو اپنی مادری زبان قرار دے کر اسے یوں آفتاب بنا دیا کہ خود آفتاب بن گئے۔ کیونکہ کسی غیر ملک کی زبان کو اپنی زبان بنالینا دماغی شرف و اعزاز تو ہے لیکن خطا و ذلت نہیں، اس لیے باشندگانِ سرحد یا افغان نوجوانوں کا زبانِ اردو کو اپنی زبان بنالینا ایک ہم کیا تمام دنیا کے ''ملا رموزیوں'' کے نزدیک لائق توصیف و تعریف عمل ہے۔

پس مجلّہ ادبیہ ''ادیب'' اصل میں نشانی ہے باشندگانِ سرحد کی فکری صلاحیت اور ذہنی عروج

و بیداری کی۔ پھر اگر گرامی منزلت برادرانِ سرحد زبانِ اردو کو اسی شغف و شیفتگی کے ساتھ قبول و اختیار کرتے رہے اور اخبار ''پانیئر'' سے محبت کم کر دی تو تاریخ ہند میں ان کی عظمتیں محفوظ نہ ہوں گی تو کیا گورکھا پلٹن کے سپاہیوں کے اشعار اس میں محفوظ کیے جائیں گے؟

کوئی شک نہیں کہ ارکان ''ادیب'' نے جس نظر نواز و دماغ آرا اہتمام کے ساتھ ''ادیب'' کو جاری کیا اس سے صوبۂ سرحد کے باشندوں کے اسی بلند و برتر حوصلے کا مزید ثبوت مل گیا، جس کے لیے بھی سرحدی بھائی صرف جرمنی کی لڑائی یا شنواری بغاوت میں مشہور ہوئے تھے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس وقت ملا رموزی صاحب کی لال رنگ کی الماری میں کوئی ایک اوپر دس رسالوں کے ''خاص نمبر''، ''عید نمبر'' اور ''سالگرہ نمبر'' رکھے ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک بے مثل بھی ہے اور بے مثال بھی، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایڈیٹر صاحب رسالہ ''ادیب'' کی خوشامد میں یہ کہہ دیں کہ جتنا اچھا ''ادیب'' کا عید نمبر ہے دنیا کے کسی رسالہ کا نہیں۔ البتہ چند اعتبارات ہیں جنھیں دوسرے رسالوں کے مقابل صرف ''ادیب'' کے لیے یا اس کے عید نمبر کے لیے خاص کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

(1) صرف تین ماہ کی مدت۔

(2) پشاور سے لے کر بمبئی اور حیدر آباد تک کے مضمون نگاروں کا اجتماع۔

(3) معیارِ ترتیب کی انتہائی بلندی۔

(4) مصارف زیادہ اور آمدنی کم۔

(5) کتابت و طباعت کی لاجوابی و دلفریبی۔

(6) تصاویر کی نفاست و ندرت۔

(7) پشاور سے باہر کتابتیں، طباعتی اور تصویری اہتمام اور پھر پشاور سے وقت کی پابندی۔

بس اب ان باتوں کے بعد ''ادیب'' کو سربلند بنانے کے لیے صرف یہ رہ جاتا ہے کہ خدانخواستہ ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' اپنی جان اور دے دیں ورنہ آپ ہی بتایئے کہ اور کیا رہ گیا؟

مگر لاحول ولا کہنا کیا تھا اور کیا کہہ گئے؟ تو:

دیگر احوال یہ ہے کہ ''ادیب'' کا عید نمبر بابت ماہ مارچ 1930ء بھی ملا اور ہمیں کامل یقین

ہے کہ پشاور سے لے کر ہمارے گھر تک کے تمام ڈاک خانے والے یا تو کہیں چلے گئے تھے اور عید نمبر خود بخود تمام ڈاکخانوں سے گزرتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا یا پھر یہ عید نمبر عین دوپہر کے وقت ہر ڈاکخانہ میں پہنچا ہوگا۔ اور اب جو گورنمنٹ آف انڈیا مقام شملہ پر پورے عیش کے ساتھ لکھنے پڑھنے کے لیے جا رہی ہے تو دوپہر کے وقت میں ''بقدر غنودگی'' حرارت پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ عید نمبر کے گزرتے وقت تمام ڈاکخانے والے بیٹھے اونگھ رہے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس دلفریب و دلنواز عید نمبر پر کسی ''ڈاک خانیے'' کی نظر پڑتی اور وہ اسے چرا نہ لیتا۔ کیونکہ اس عید نمبر کا سرِ ورق ہی جمالِ فطرت کی جن رنگینیوں کا نکھار بنا ہوا ہے وہی اس قابل ہے کہ ہر ڈاکخانے والا اسے اپنے پانچ روپیہ ماہوار کرایہ کے مکان میں لٹکا کر اس مکان کو ''نگار خانہ چینی'' بنا لیتا۔ اس عید نمبر کے سرِ ورق پر فلک بوس پہاڑوں کے پاس ایک مسجد، مسجد کی بلندی پر ''ہلال عید'' پھر مسجد کے کنارے دریا اور دریا کے مقابل خطہ گلزار کی شادابیاں اور ان رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے درختوں کی ایک شاخ پر بلبل کا جوڑا، پھر اس فردوس آفریں منظر پر شفق سرخ اور فیدۂ شام کی عالمتابیاں جس کمالِ دلفریبی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں واللہ کہ کسی دوسرے رسالے کے خاص نمبر پر ایسا منظر نظر نہیں آیا اور نہ جناب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس سرِ ورق پر مولوی محمد اسماعیل مرحوم کی اردو کی پہلی کتاب کا جوار کا درخت اور باریک ہڈیوں والا آدمی بنا دیا جاتا۔ اس لیے اگر اس سرِ ورق کے نقاش کو خدا کبھی وائسرے ہند بنائے تو ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' کو بھی وزیر ہند بنا دے جنھوں نے اس منظر کے انتخاب میں سلامت ذوق اور حسنِ نظر کا یہ دل کشا ثبوت پہنچایا۔

اس کے بعد صفحہ چار پر ایک تصویر ہے، جس کا نام ہے ''آہو چشم'' اس تصویر سے متعلق حضرت اظہر امرتسری کی ایک نظم ہے اور واللہ کہ اس تصویر اور اس نظم کی صحیح داد دینا ایک خوش فکر ادیب کے بس کی بات نہیں، اس لیے کہ ان دونوں کے اندر حسن و رعنائی اور جمالِ محبوبی کی جس قدر رقیاستیں پیدا کی گئی ہیں ان کے اندازہ کے لیے محترم اظہر امرتسری ہی کی یہ موتیوں کی لڑیاں ملاحظہ ہوں:

لباسِ لالۂ و گل میں ہے وہ محوِ خود آرائی
نہاں تھا سینۂ صحرا میں جو طوفانِ زیبائی

شگفتہ پھول پر رقصاں ہیں یوں امواج نکہت کی
کہ دامانِ شفق پر ہیں شعاعیں مہر فطرت کی
کھڑی ہے اک حسینہ اس ریاضِ روح افزا میں
کہ حورِ خلد ہے جلوہ نما گلزار دنیا میں
ہجوم کیف سے گردش میں ہے یوں چشمِ جانانہ
کوئی دیکھے تو جانے کررہا ہے رقص میخانہ
سرورِ حسن جو چشمِ خمار آگیں میں پلتا ہے
پیامِ بے خودی بن کر نگاہوں سے اُبلتا ہے

اس کے بعد ایک تصویر میں چنگ و رباب اور شراب ناب کا جو جوان بنا دینے والا منظر دکھایا ہے وہ زندگی کو دنیوی فکر والم اور رنج وافسردگی سے کچھ اس خوبی سے پاک رکھنے کی تعلیم دیتا ہے کہ مرحبا۔ اس تصویر میں طالب ومطلوب کو دنیا کے آلام وعلائق سے اس طرح دور اور بے پروا دکھایا ہے گویا دنیا بس نام ہے مستی اور بے خودی اور شراب ورباب کا۔ باقی تمام ہندستانی یورپ کے خریدے ہوئے گدھے ہیں اور زندگی وزندہ دلی سے منشی تلوک چند۔ ان سرتاسر حسن ورنگ اور وجد وکیف تصاویر کے بعد حضرت شوکت تھانوی، میاں محمد اسلم، میر ولی اللہ اور ملا رموزی کی تصاویر ہیں۔ گویا زبانِ اردو، صحافتِ اردو، ادبِ اردو کے یہ ''چار یار'' علی بابا چالیس چور سے زیادہ اب جو مشہور ہو چکے ہیں تو اس قابل سمجھے جانے لگے کہ انھیں بھی رسالوں میں وقتِ ضرورت مع ٹوپی اور شیروانی کے چھاپ دیا جائے، سو چھاپ دیے گئے۔ غنیمت ہے کہ رسائلِ اردو اور اخباراتِ اردو میں سر کھپانے والے اور اپنے اپنے بال بچوں تک کو ''خدا حافظ'' کہہ کر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں اب ان کی تصویریں شائع ہونے لگیں ورنہ ایک طبقہ اب بھی ایسا زندہ ہے جس میں کے ایک نے اسی جنوری 1930 کے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں وہ 308 قبل مسیح کے سیر مہدی مجروح کی تصویر چھاپ دی۔ سچ ہی کہ گزرے ہوئے خدّامِ ادب کا حق ہماری 1930 والی گردنوں پر برابر سوار ہے، مگر کوئی دیکھے ہم آج کل کے مضمون نگاروں کی نوکریاں، دفاتر کی حاضریاں اور پھر ہماری مضمون نگاریاں اور اس زمانہ کے خدّامِ ادب کی کوئی پڑھے تاریخ میں۔

درباردار یاں، جاگیرداریاں اورآنے جانے کے لیے اس وقت کے معارف نواز بادشاہوں کی دی ہوئی سواریاں، تو جی چاہے گا کہ لاؤ اوران آج کل کے مضمون نگاروں کے گھر موتیوں سے بھردیں کہ ان حالات پر بھی جو یہ ''آج کل والے'' لکھتے ہیں کمال کرتے ہیں۔اس لیے ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' نے جو آج کل کے مستعدار بابِ قلم کی تصاویر کو عید نمبر میں جگہ دی تو حق یہ ہے کہ انھوں نے اُدبائے اردو کی حوصلہ افزائی کا حق ادا کردیا۔بس ان تصاویر میں اگر ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' سے ہمیں کوئی شکایت ہے تو صرف اس قدر کہ اگر ملا رموزی کی تصویر کو قبلہ گاہی میر ولی اللہ صاحب مدفیوضہ کی تصویر کے برابر نہ چھاپا جاتا تو آپ کے عید نمبر کی خوبصورتی میں کوئی کمی رہ جاتی؟ اماں غضب خدا کا اس فرق کو بھی محسوس نہ کیا کہ ملا رموزی قبلہ وکعبہ میر ولی اللہ صاحب کے برابر کھڑا ہو کر مضمون نگار معلوم ہوگا یا قبلہ میر صاحب کا منجھلا طولعرہ؟

نظری لحاظ سے حضرت شوکت تھانوی کی تصویر میں آج کل کے ''مضمون نگارانہ فیشن'' کی تمام باتیں موجود ہیں۔''از قسم سر کے انگریزی بال اور موٹا سا چشمہ'' تیور بتاتے ہیں کہ تصویر والا اس وقت ''بالکل تصویر کھنچوا رہا ہے''۔

قبلہ گاہی میر ولی اللہ صاحب کی تصویر کے تیور بتاتے ہیں کہ تصویر کھنچواتے وقت آپ نے سانس کے آنے جانے کی بھی ممانعت کردی تھی۔ملا رموزی کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو عمر میں شاید پہلا ہی موقع ملا ہے تصویر کھنچوانے کا،اس لیے بڑے شوق سے کھڑے کھنچوار ہے ہیں۔ میاں محمد اسلم صاحب کی تصویر کہتی ہے کہ ''خیر بھائی کھینچ لو'' ان تصاویر کے بعد قدر قدرت... غازی امان اللہ خاں بادشاہِ افغانستان ، فاتحین ٹل... غازی عبدالرحمٰن مغفور... شہنشاہ جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ، خیبر ریلوے کا منظر اور کابل کے قافلے وغیرہ ایسی تصاویر ہیں جن سے رسالہ ''ادیب'' کی سرحدی اور غازیانہ نسبتیں اور خصوصیات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہیں اور ملا رموزی کے لیے صرف یہی تصاویر قابلِ صد احترام وعزت یا تو اس لیے ہیں کہ یہ ان کے وطن عزیز کے تاثرات کو بیدار کرتی ہیں یا اس لیے عزیز ہیں کہ ان کے دیکھنے سے اسلامی ہند کے ان نسوانی مزاج اور نسوانی لباس والے نوجوان طلبا میں کچھ تو حیا وغیرت پیدا ہوگی جن کی نسوانی ''فیشن ایبلیت''— جو سچ پوچھو تو اپنے شجاع و بہادر بزرگوں کی ناک ہی کٹوا کر رکھ دی ہے۔اماں سچ تو کہتے ہیں کہ یہ آج

کل کے اسکولوں اور کالجوں سے جو نوجوان لونڈے نکلتے ہیں وہ نزاکت و رعنائی کی ''لچکدار کمانی'' ہی بن کر تو نکلتے ہیں۔ وہ سینے تان کر اور شانے اُبھار کر کب چلتے ہیں جو ان کے بزرگوں کی مردانہ شان تھی۔

اب رہا عید نمبر کے مضامین کا ''دیگر احوال'' تو ان پر واقعی اور ایماندارانہ تنقید لکھنے کے لیے یا تو یہ کیجیے کہ اتنی دیر آپ آ کر ہمارے ذمہ کے مضامین کے ڈھیر لگاتے جایئے کہ ہم اس عید نمبر کے 170 صفحات کی نہایت باریک سطروں کے ایک ایک نقطہ کو بیٹھ کر پڑھ لیں یا پھر آپ ان اہم علمی، ادبی، تاریخی، ناولی اور غزلی مضامین کو پڑھ کر ہمارے پاس بھیج دیجیے اور ہم ان پر تنقید لکھ دیں۔ البتہ رسمی طور پر جو کچھ دیکھا ہے اس کے بیان کر دینے ہی کو آپ تنقید سمجھ لیجیے اور وہ یوں ہے کہ اس عید نمبر میں حضرت مولوی اعظم حمدی سیالکوٹی کا ترجمہ ''شخصیت کا اثر'' ایک قیمتی چیز ہے جو ''ادیب'' کی آئندہ اشاعتوں میں بھی جاری رہے گا۔ ترجمہ بڑی فصیح اور آسان اردو میں ہے اور ترجمہ کا یہی فاضلانہ طریق ہے۔ بس حضرت حمدی کی جگہ ہم ہوتے تو انگریزی قسم کے ناموں کو بھی ہندستانی ناموں سے بدل دیتے کہ ہمارے نزدیک اردو میں ہر ایک چیز اردو والوں ہی کی اچھی ہوتی ہے۔

حضرت تاجور ایڈیٹر رسالہ ''ادبی دنیا'' کے اشعار پر حضرت نشتر جالندھری کا تبصرہ اصولی تنقید کے لحاظ سے کہاں تک صحیح ہے، سوبجز علمی اور عروضی اعتراضات کے باقی کی عبارت میں وہی جذبہ نمایاں ہوگیا ہے، جسے تنقید سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی مضمون نہایت علم افزا ہے اور کام کا۔

''اصلاحاتِ شعری'' اور ''عرفی شیرازی'' والے مضامین دماغوں میں عالمانہ نور پیدا کرنے والے ہیں۔ نظموں میں حضرت اظہر امرتسری اور ایڈیٹر صاحب ''ادیب'' کی نظمیں شعری لطافتوں کا ایک شباب آراء ذخیرہ ہے، جو اردو کو نصیب ہوا ہے۔ باقی کے مضامین اور نظموں کی لاجوابیاں آپ خود پڑھ کر معلوم کیجیے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ پھر ''ادیب'' کے عید نمبر کی جتنی جلدیں شائع ہوئی ہیں، ان کو تو منگا کر اپنے صندوق میں بند کر لیں اور آپ لوگ صرف ہماری اس تنقید کو پڑھ کر بیٹھ جائیں۔

مگر لاحول ولا دیکھا آپ نے کہ ہم پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئے، لکھنا تھا آپ بھائیوں کی

خیریت کا خط اور لکھ گئے جانے کیا۔ اماں کہنا یہ تھا کہ خدا اگر بیوی دے تو اسکول کی پڑھی ہوئی اور ایک ادیب کی بیوی جتنا ذی علم اور جتنا خوش ذوق ہونا چاہیے اسے تو آپ خوب جانتے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ عید نمبر کی تمام تصاویر تو نوچ لیں اپنے ننھے میاں کے تماشہ کے لیے اور اس کے اُدھڑے اوراق لا کر رکھ دیے ہماری میز پر... نتیجہ یہ ہوا کہ سر پکڑ کر منیجر صاحب ''ادیب'' کو لکھ دیا کہ بھائی دو جلدیں ''ادیب'' کے عید نمبر کی اور ہمارے نام وی۔ پی کر دو تا کہ سند رہیں ہماری اُن کی جہالت کی۔ تو اس پر منیجر صاحب ادیب نے بکمال قدر دانی فوراً ہمارے نام مبلغ 10 روپے کا پارسل بھیج دیا۔ اب دیکھیں اس پارسل کو ہم دام لے کر وصول کرتے ہیں یا ڈاکخانے والے؟

تو بھائی معاف کیجیے گا، کہنا یہ تھا کہ آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ اماں عید بقرعید پر تو مل لیا کرو۔ بچے بھی بہت یاد کرتے ہیں۔ باقی سب طرح خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ سب کی درگاہ خداوندی سے شب روز نیک چاہتے ہیں۔ اب آپ ہماری خیر و عافیت جس طرح چاہتے ہوں اسے 'بواپسی بڈا'' لکھ دیجیے۔

◆◆◆

(20)

ایڈیٹر صاحب اخبار ''الجمعیۃ'' دہلی کے نام

ایڈیٹر صاحب اخبار ''الجمعیۃ'' دہلی زادلطفہ!

آپ یقین فرمائیں یا نہ فرمائیں کیونکہ وہ تو کہا ہے نا کہ ''فیہا'' یعنی یہ کہ دنیا کا جس قسم کا بھی ملا رموزی ہوگا وہ غریب دن بھر نوکری فرمائے گا تو لامحالہ وہ مضمون نگاری نہ کر سکے گا اور جب وہ مضمون نگاری نہ فرما سکے گا تو پھر کسی کو کیا غرض کہ وہ اپنے قلم سے ایک عالم آرا مضمون لکھ کر اسے ملا رموزی کے نام سے شائع کرادے۔ اس لیے یقین فرمایئے کہ ہم عرصہ دراز سے دن کی روشنی کو کچہری اور رات کی راحت بخش تاریکی کو اتوار کا دن سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس وقت جو یہ خط آپ لکھ رہے ہیں تو ہماری دو سال کی خرید کی ہوئی ''ٹائم پیس'' گھڑی میں بات رات کے مبلغ تین بجے ہیں اور وہ جو ہمارے دروازہ کے سامنے مولوی عثمان صاحب مرحوم کا لگایا ہوا نیب کا درخت ہے، اس پر ''طیور'' صبح خواں'' کے حیات پرور نغمے شروع ہو چکے اور وہ آپ کی خادمہ پڑی پلنگ پر خراٹے لے رہی ہے۔ اب ذرا سوال کیجیے کہ ایسی وہ کون سی مصیبت تھی جو ہم اس وقت یہ خط لکھنے بیٹھ گئے اور اپنے سونے کو طاق پر رکھ دیا؟

سو دیگر احوال یہ ہے کہ دوسرے مضامین سے فارغ ہو کر ہم پلنگ پر لیٹ کر چند ضروری

اخبارات کوڈاکٹر ایس کے برمن کلکتہ والے کی نیند لانے والی گولیاں سمجھ کر جو پڑھتے ہیں تو ذرا جلد نیند آجاتی ہے ورنہ بغیر اخبار پڑھے جاگے وہ وقت آجاتا ہے جب رات بھر کے آئے ہوئے گیدڑ شہر سے جنگل کی طرف واپس جاتے ہوئے صاف صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ تو بس اخبارات میں 11 جون 1930 کا اخبار ''الجمعیۃ'' بھی تھا، اس کا صفحہ دو کیا دیکھا کہ دنیا آنکھوں میں سیاہ ہوگئی۔ یہ پڑھ کر کہ حضرت محترم مولانا احمد سعید صاحب قبلہ پر بمبئی میں حملہ کیا گیا۔ حاشا کہ اس خیال سے صدمہ نہیں ہوا کہ یہ حملہ اپنے مولانا احمد سعید صاحب پر کیا گیا۔ کیونکہ ایسے ویسے حملوں کے لیے اللہ پاک نے اپنے مولانا صاحب کو بھی کوئی معمولی سا تن و توش تو دیا نہیں جو کوئی خطرہ ہو یا اس لیے افسوس نہیں ہوا کہ حملہ کرنے والے بمبئی کے غنڈے تھے، دہلی کے کیوں نہ ہوئے، بلکہ جس خیال نے نیند حرام کردی اور دنیا تاریک نظر آئی وہ یہ تھا کہ ایک ایسی شخصیت پر حملہ کیا گیا جو خدائے عرش و فرش کے اس اشرف کائنات نبی کا نائب اور امانت دار ہے جس کے غلاموں کے لیے کائنات عالم کی تمام سربلندیاں سجدہ ریز و سرنگوں نظر آتی ہوں۔ پھر حملہ کرنے والے بھی کون ہوں کہ مسلمان! فیاویلتا و یاحسرتا۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی عظمت و برگزیدگی اس لحاظ سے کیا کم ہوسکتی ہے کہ وہ ان علوم و رموز کے ماہر ہیں جو براہ راست ورثہ کہے جاتے ہیں امام الاتقیا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، لیکن جب اس سعادت و برگزیدگی پر حضرت مولانا کے نام کے ساتھ لفظ ''ناظم جمعیۃ العلما'' بھی لکھا جائے تو ان کی عظمت کے احترام پر اگر ملا رموزی کے ماں باپ بھی فدا ہو جائیں تو یہ فدیہ براہ راست نبی گرامی جاہ علیہ السلام کے لیے ہوگا نہ کہ حضرت مولانا احمد سعید کے لیے۔

تو پھر کیا آج ملا رموزی کو اپنا قلم ہمیشہ کے لیے یہ کہہ کر توڑ دینا چاہیے کہ مسلمانوں میں اب مسلمان کہلانے کی صلاحیت نہیں رہی۔ پھر وہ کس قوم کی خدمت کے لیے اپنے قلم سے کام لے؟

صحیح کہ حضرت مولانا کے اعمال و افکار سے بعض مسلمانوں کو پہاڑوں کے برابر اختلاف ہے، لیکن وہ اس پر بھی اس کمینگی اور اس سفلہ پن کے مستحق تو نہیں تھے جو بمبئی میں ان کے ساتھ روا

رکھا گیا۔ پھر وہ بمبئی جو ''باب المکہ'' بھی کہلاتی ہے اور باب الہند بھی، جہاں کی اسلامی عبادت گاہیں سارے ہندستان کی اسلامی عبادت گاہوں سے زیادہ کثیر، حسین اور آباد۔ جہاں اسلامیانِ ہند کی قابل صد احترام تحریکِ خلافت کا مرکز ہے، جہاں حجاج اور زائرین بیت الحرام کی راہ میں آنکھیں بچھانے والوں کی تعداد ناقابلِ احاطہ ہے، مگر اس حادثہ نے ان چیزوں کی عظمت تو کم نہیں کردی۔ البتہ بمبئی کے نام پر یہ ایک ایسا تاریخی داغ آ گیا جسے صحیح معنی کی تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کرسکتی، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ تاریخِ اسلام ایسے گھناؤنے واقعات اور ایسے اشرار سے کبھی خالی نہیں رہی ہے۔ خود امام الہدیٰ صدر دیوانِ حشرؐ کے بابرکت عہد میں وہ مکہ شریف کے مشہور اعلا حضرت بھیا ابوجہل موجود ہی تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ اختلافِ افکار و اختلافِ عمل کی کیا یہ ایک صورت کارآمد بھی ہوسکتی ہے؟ اور اگر خدانہ کردہ اس صورت سے کوئی کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو کیا ایسے محرکین خدا و رسولؐ اور عالمِ اسلام کی نظر میں کوئی وقعت بھی پاسکتے ہیں؟ اور جوانھوں نے اپنے خیال میں ایسے اعمال کا کوئی اجر و نتیجہ قرار دے ہی لیا ہے تو پھر اے اخبار ''الجمعیۃ'' کے ایڈیٹر صاحب لائیے اور آپ ان لوگوں کے نام بقید ولدیت وقومیت و سکونت ملّا رموزی کو بتا دیجیے جنھوں نے ناموسِ شریعت پر حملہ کو بھی ثواب اور کارِ خیر قرار دیا ہے تاکہ ملّا رموزی کا قلم بھی ان کے مقابل وہ کچھ لکھتا رہے جو اس نے آج تک نہ یزید کے لیے لکھا ہو نہ ابوجہل کے لیے کہ ملّا رموزی بھی ایسوں کے خلاف لکھنے کو دارین کی سعادت سمجھتا ہے۔ خواہ یہ ملّا رموزی کی لیاقت سمجھی جائے یا حماقت۔

مگر ہاں صاحب وہ خوب یاد آئی یا یاد آیا کہ اس کمینہ حملہ کے بعد حضرت قبلہ مولانا نے تو اسی عفوِ مصطفوی اور ضبط و بردباری سے کام لیا جس کی ان کے علم و منصب سے توقع تھی، مگر وہ آخر کو شہر بمبئی کی پولیس بھی تو مسلمان ہے تو آخر اس نے ان غنڈوں کا تعاقب کس نمبر کی موٹر کار پر سوار ہوکر کیا؟ براہِ کرم اس موٹر کے نمبر بھی ہمیں بتا دیجیے کیونکہ اس وقت تک فقط ان صاحبِ ایمان و استقلال حضرات کا تذکرہ ہوا ہے جنھوں نے شریعتِ اسلامیہ کے اس جلیل القدر حامل کو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بچایا ہے، جس سے ان کے مدارج و مراتب خدا اور رسولؐ کے نزدیک کہیں

بلند و برتر ہو چکے۔ اب تو اس عفو و درگزر اور ضبط و صبر پر حضرت مولانا قبلہ کی خدمت میں ہدیۂ شکر و مبارکباد پیش کرنا ہے اور ان غنڈوں کی تحقیق اور مان لیجیے کہ یہ غنڈے ہرگز ہرگز بمبئی کے نہیں ہوں گے، پھر بے چارے بمبئی والوں کو مفت میں کچھ کہنا غلط ہے۔ اگر آپ سے ہو سکے تو شہر شہر پھر کر ذرا ان کا پتہ چلا لیجیے اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ یہ معاملہ ہمیں راز کے لفافہ میں لکھ کر روانہ کیجیے گا ورنہ جناب پھر آپ سمجھتے ہی ہیں زیادہ کہنے کی کیا ضرورت؟ اور بھئی کہہ دینا کہ مولانا صاحب آپ کو بچے بہت بہت اور درجہ بدرجہ سلام کہتے ہیں۔

◆◆◆

(21)

ایڈیٹر صاحب اخبار ''الخلیل'' دہلی کے نام

جناب گرامی ایڈیٹر صاحب اخبار ''الخلیل'' دہلی!

بعد سلام مسنون کے معلوم ہو کہ یہاں پر بفضل خدا ہر طرح خیریت ہے۔ فقط بارش کی وجہ سے ہمارا مکان دس پانچ جگہ سے گر گیا ہے، مگر ہاں مکان کے گر جانے کو خیریت اور خیروعافیت سے کیا تعلق۔ بس تو پھر آپ یہی سمجھ لیجیے کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ البتہ آپ کی خادمہ آج کل ذرا مضمحل سی رہتی ہے جو موسم کی خرابی کا اثر ہے، مگر ہاں اس کو بھی ہماری خیریت اور خیروعافیت سے کیا تعلق، اس لیے اس کے بعد بھی آپ یہی سمجھے رہیے کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔

اس لیے دیگر احوال یہ ہے کہ بس وہ کوئی تین ہفتے پہلے تو آپ کا خط آیا تھا جو اس خبر پر مشتمل تھا یا خبر اس پر مشتمل تھی کہ اخبار ''الخلیل'' انشاءاللہ جلد سے جلد روزانہ ہونے والا ہے۔ صاحب کیا عرض کریں کہ کس قدر خوشی ہوئی اور وہ آپ کی خادمہ تو اس خبر سے بہت اور ''نہایت بہت'' خوش ہوئی کیونکہ اس اللہ کی بندی کو یہ خیال ہوا کہ ''الخلیل'' اگر روزانہ ہو گیا تو تصاویر بھی روزانہ دیکھنے میں آئیں گی اور وہ تصاویر بھی کیسی کہ جن کے اندر فیشن کی باتیں دکھائی جاتی ہیں۔ تو بس اس سے

اندازہ فرمالیجیے ہماری ''اُن'' کے ذوق کا، مگر ہمارا خیال ہے کہ ایک ہماری ہی ''وہ'' کیا آج کل یہ جتنی اسکول یافتہ ہوتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو اگر کوئی شوق ہے تو بس ''فیشن کی چیزوں کا'' اور یہ دیکھتے نہیں ہیں آپ کے آج کل کے اسکول اور کالج میں پڑھنے والے سفید سفید رنگ کے لونڈے بھی تو فیشن کی ایسی چیزیں پہنے پھرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ نیلم پری اور جانکی بائی الہٰآباد والی معلوم ہوتے ہیں اور یہ جو آج کل ہر شریف آدمی آپ کا ہمارا قرضدار بنا ہوا ہے وہ ایسی ہی عورتوں اور لونڈوں کے طفیل۔ تو خیر جانے دیجیے انھیں چولھے بھاڑ میں کیونکہ وہ ہم اصل بات کو لکھنا ہی بھولے جاتے ہیں، اس لیے آپ تو یوں سمجھیے کہ:

دیگر احوال یہ ہے کہ 24 جولائی 1930 کا اخبار ''الخلیل'' آیا تو کیا خود ہی ڈاکخانہ سے جا کر لائے۔ بس صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ صفحہ 17 پر ایک نہایت اور ''بہت ہی نہایت عمدہ'' مضمون ہے کہ چھپا ہوا ہے اور اس کی سطروں میں ایک جگہ صاف صاف یہ لکھا ہوا ہے کہ ''ملا رموزی صاحب بدمذاق اخبار دیکھنے والوں اور بدمذاق خریدنے والوں کے خلاف کچھ لکھتے ہیں، بلکہ وہ ایڈیٹروں کے خلاف ہی اُلٹا لکھتے ہیں''۔ اور ہاں یہ لکھا تھا کہ ''ملا صاحب کو ہم ایک اچھا سیاسی آدمی سمجھتے ہیں''۔ بس جناب اس عبارت کو پڑھنا تھا کہ اپنی سیاسی زندگی اور سیاسی ذوق کی بربادی پر آنکھوں سے آنسو جاری ہونے والے ہی تھے کہ معاً ''اُن'' کا خیال آگیا اور ہم نے کہا کہ اگر ملا صاحب آپ نے اپنی سیاسی زندگی کو یاد کر کے ایک آنسو بھی گرایا تو یہ خیال کریں گی کہ ہو نہ ہو اس بارش میں گرنے والے مکان کی دوبارہ تعمیر کی فکر سے رو رہے ہیں، مگر جناب ہوتا کیا ہے، دل تو بے کار سا ہو گیا اور لکھنے والے کے حق میں دل سے دعا نکلی، جس نے ہماری تحریروں سے ہمارے صحیح ذوق کا اتنا صحیح اندازہ تو کر لیا ورنہ جناب آج کل کے اخبار اور رسالے پڑھنے والے اوّل تو یہی نہیں سمجھتے کہ وہ اخبار پڑھ رہے ہیں یا کسی آدمی کو پڑھ رہے ہیں۔

بس اگر وہ پڑھتے ہیں تو یہ کہ پشاور میں کتنے آدمی گرفتار ہوئے۔ ظفر علی خاں کے خلاف کوئی مضمون ہے یا نہیں۔ ملا رموزی نے کوئی ہنسانے والی بات لکھی ہے یا نہیں۔ ''الخلیل'' میں کوئی برہنہ تصویر بھی ہے یا نہیں۔ یا اس میں کوئی ایسا فسانہ بھی شائع ہوا ہے جس میں کسی حسینہ کو لے بھاگنے کا طریقہ بتایا گیا ہو۔ اور جو کچھ بہت ہی زیادہ لیاقت سے پڑھا تو یہ سمجھے کہ ہندستانی برطانیہ

سے ہندستان کو سو برس میں بھی آزاد نہیں کرا سکتے اور دیکھ لینا کہ کل پرسوں تک سارے ہندستان میں ہندو راج ہو جائے گا یا مسلمان راج اور جو اس سے بلند قابلیت سے اردو کے اخبار کو پڑھا تو بس یہ نتیجہ نکالا کہ لیجیے یہ فلاں خبر اس اخبار میں آج شائع ہوئی ہے، حالانکہ ''پائنیر'' میں یہ خبریں پرسوں ہی پڑھ چکا تھا۔ گویا ''پائنیر'' اخبار ایک طرح کا عامل کریم الدین عملیاتی لاہوری ہے، جن کے دفتر میں ملاقات سے آنے والی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

مگر خیر صاحب ہمیں ان باتوں سے کیا کام۔ کہنا تو یہ ہے کہ ہمارے محترم ''پنجاہ سالہ مضمون نگار'' سے آپ بعد سلام مسنون آں کہ ہماری جانب سے بہت زیادہ جھک جھک کر کہہ دیجیے گا کہ آپ کے ارشاد کے موافق ہم انشاء اللہ خریداران اخبارات اردو کے خلاف نہایت زناٹے کے ساتھ ایک مضمون رسالہ ''عالمگیر'' لاہور کے ''ستمبر نمبر'' میں لکھ دیں گے، آپ پڑھ لینا اور خدا کی ذات سے توقع ہے کہ یہ اس قدر زوردار اور بے باک مضمون ہوگا کہ پھر یا تو اردو اخباروں کے خریدار آپ کی مرضی کے موافق اردو کے اخباروں کی قدر پہچانیں گے یا پھر مارے شرم و حیا کے جس کنوئیں اور دریا میں گورنمنٹ اجازت دے دے گی ڈوب مریں گے۔ مگر غیرت دار ہوں گے تو پھر زندہ نہ رہیں گے اور اگر گھر میں ہماری ''اُن'' کے درمیان چل نہ گئی یا ''چھڑ نہ گئی'' تو انشاء اللہ اسی کے ساتھ اردو زبان کے ''ایڈیٹروں'' پر بھی ایک مضمون لکھ دیں گے، جس سے ان بے چاروں کی مشکلات کا گورنمنٹ کو بھی علم ہو جائے گا۔ بس افسوس یہ رہے گا کہ جمعیۃ الاقوام کو یہ مضمون نہ پہنچا سکیں گے، جس سے وہ بھی سمجھ لے کہ دیسی اخباروں کا دیگر احوال کیا ہوتا ہے، کیونکہ سنا ہے کہ یہ جمعیۃ الاقوام یہاں سے کئی ماہ کے فاصلہ پر رہتی ہے اور روزانہ کسی سے ملتی بھی نہیں۔

بس یا تو وہ ملتی ہے ملک شام سے۔ سو وہ بھی حکومت فرانس کے ذریعہ۔ یا پھر وہ ملتی ہے حکومت جرمنی کے تاوانِ جنگ سے۔ سو وہ بھی اتحادی حکومتوں کی معرفت۔ یہ نہیں کہ آپ صبح بھی اس سے جا کر مل آئیں اور شام کو بھی اسی کے ساتھ چائے پینے بیٹھ جائیں۔

اس لیے امید ہے کہ ہمارے پنجاہ سالہ مضمون نگار بھائی اب ہم سے خوش ہو جائیں گے اور ہمارے مکان کی از سرِ نو تعمیر کے حق میں دعا فرمائیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہم نے یہ آدھا خط کیوں لکھا ہے، سو اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم آج کل اپنی تازہ ترین کتاب ''عورت ذات'' کے چھپوانے اور فروخت کرنے کے معاملات میں پھنسے ہوں گے یا یہ کہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کے لیے لوگوں کی خوشامد کرتے پھرتے ہوں گے یا دو چار مزدوروں کے ساتھ اپنا مکان بنواتے ہوں گے، اس طرح کہ خود بھی پتھر اور مٹی اٹھا کر مزدوروں کو دیتے جاتے ہوں گے اور راہ گیروں کی نظر بچا کر ایک آدھ پتھر خود بھی جما دیتے ہوں گے۔ یا پھر خرچ کی زیادتی پر غور کرتے کرتے سو جاتے ہوں گے یا اپنی ''اُن'' سے اس معاملہ کا کوئی جھگڑا مول لے لیتے ہوں گے، جس کے تصفیہ سے تین دن فرصت ہی نہ ملے۔ یا پھر ان تمام افکار سے تنگ آ کر اِدھر اُدھر تفریح کرتے پھرتے ہوں گے کہ ایسے ہی حالات تو ہوا کرتے ہیں آپ کی اردو کے مضمون نگاروں کے۔ اب یہ آپ کی قابلیت ہے کہ ہمارے اس آدھے خط کا سبب جس چیز کو چاہیں بنا لیں۔

◆◆◆

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ : ڈاکٹر سیدہ جعفر

صفحات: 823

قیمت : -/233 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ و تنقید)

مصنف : احمد کفیل

صفحات: 284

قیمت : -/104 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اول)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات: 354

قیمت : -/118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات: 368

قیمت : -/133 روپے

دھونیا لوک

مترجم : عنبر بہرائچی

صفحات: 80

قیمت : -/64 روپے

ہندوستانی تہذیب

مصنف : ابنِ کنول

صفحات: 399

قیمت : -/131 روپے

₹ 235/-

ISBN: 978-93-5160-025-1

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025